

جلد اول

«صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِي أُصَلِّي»

”تم دیکھو نماز کرو، جیسے تم نے مجھے نماز ادا کرتے ہوئے دیکھا ہے۔“

فِقْهُ الصَّلَاةِ

نمازِ نبوی مدلل

www.KitaboSunnat.com

تالیف

فضیلہ شیخ مولانا محمد منیر قمر



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
قُلْ أَطِيعُوا اللّٰهَ
وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مجلس التحقیق الاسلامی اربنہ
معدت البریری

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب و سنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی
کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے
درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

✉ KitaboSunnat@gmail.com

🌐 www.KitaboSunnat.com

«صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي»

”تم ویسے نماز ادا کرو، جیسے تم نے مجھے نماز ادا کرتے ہوئے دیکھا ہے۔“

فِقْهُ الصَّلَاةِ

(جلداول)

نمازِ نبوی مدلل



تدوین و تبییض

حافظ ارشاد الحق و ام محمد شکیلہ قمر حفظہما

تالیف

فضیلۃ الشیخ مولانا محمد منیر قمر

ناشر

ام سلال قرآنی پبلی کیشنز
سیالکوٹ روڈ گوجرانوالہ

مکتبہ کتاب و سنت
ریحانِ حنیفہ - دہشک

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب

فِیْقَةُ الصَّلَاةِ

(جلد اول)

نمازِ نبویِ مدلل

تدوین و تبییض

حافظ ارشاد الحق و ام محمد شکیلہ قمر رحمۃ اللہ علیہا

تالیف

فضیلۃ الشیخ مولانا محمد منیر قمر رحمۃ اللہ علیہ

طبع: _____ مئی 2016ء

کمپوزنگ: _____ عدنان قمر سلمہ اللہ

سیٹنگ: _____ ابوسفیان عزیز می

تعداد: _____ 800

ناشر

احسن القرین پبلی کیشنز

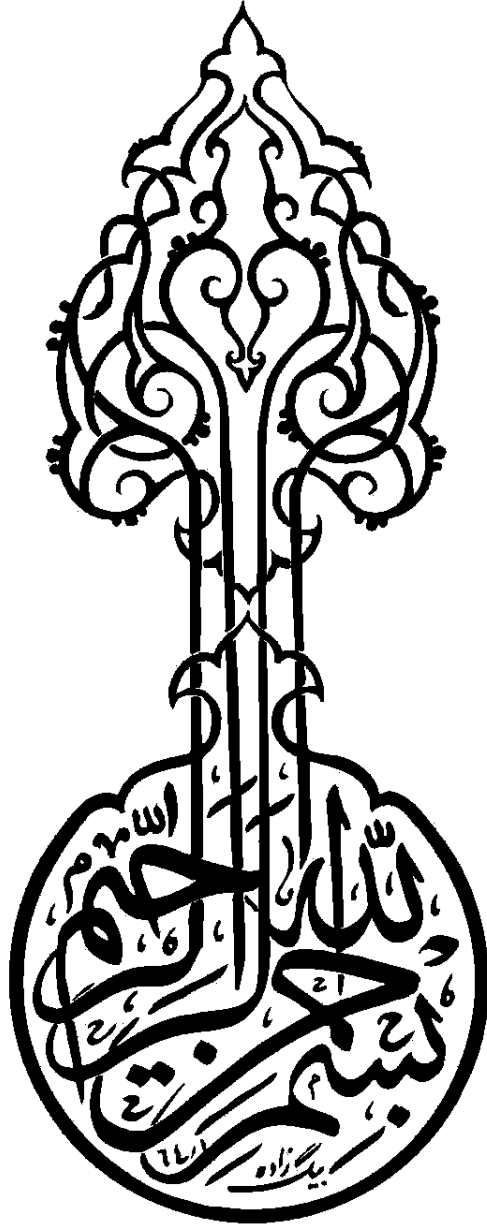
سیالکوٹ روڈ گوجرانوالہ

مکتبہ کتاب و سنت

ریحان چیمبرہ - ڈیسک

055-3823990 / 0321-6466422





فہرست مضامین

27..... ❁ مقدمہ از حافظ ارشاد الحق (رکن مرکز الدعوة والارشاد۔ دہلی)

29..... ❁ حرف آغاز

آغاز کتاب

31..... ❁ طہارت کے بنیادی احکام قرآن کریم میں

31..... ❁ ①، ② جنابت (جماع و احتلام) سے طہارت و غسل کا حکم:

31..... ❁ ③ حیض و نفاس سے طہارت و غسل کا حکم:

32..... ❁ ④ پیشاب اور پاخانے سے طہارت کا حکم:

32..... ❁ ⑤ لباس کی طہارت کا حکم:

32..... ❁ ⑥ جائے نماز کی طہارت کا حکم:

32..... ❁ ⑦ عام طہارت کا حکم:

33..... ❁ ⑧ وضو کا حکم:

33..... ❁ ⑨ تیمم کا حکم:

33..... ❁ فلسفہ تیمم:

34..... ❁ ⑩ ذریعہ طہارت؛ ل۔ پانی:

35..... ❁ ب۔ پاک مٹی:

36..... ❁ ⑪ معنوی طہارت کا حکم:

- 37..... ❁ اوقات نماز قرآن کریم میں
- 37..... ❁ ① نماز فجر و مغرب اور عشا:
- 37..... ❁ ② نماز پنج گانہ:
- 38..... ❁ ③ نماز جمعہ:
- 38..... ❁ ④ نماز تہجد:
- 38..... ❁ ⑤ نماز میں پابندی وقت:
- 38..... ❁ ⑥ عدم پابندی کا انجام:
- 39..... ❁ ⑦ تذکار نماز:
- 40..... ❁ نماز باجماعت قرآن کریم میں
- 41..... ❁ مطلق پانی کی اقسام و احکام
- 41..... ❁ پہلی قسم:
- 43..... ❁ دوسری قسم:
- 44..... ❁ تیسری قسم:
- 47..... ❁ چوتھی قسم:
- 47..... ❁ غیر مطلق پانی کی اقسام:
- 48..... ❁ پہلی قسم:
- 48..... ❁ دوسری قسم:
- 48..... ❁ تیسری قسم:
- 48..... ❁ چوتھی قسم:
- 48..... ❁ ① کسی پاک چیز کی آمیزش والا پانی:
- 50..... ❁ ② مستعمل پانی:
- 50..... ❁ پہلا مسلک:

- 54..... ❁ دوسرا مسلک:
- 56..... ❁ مرد و زن کا اکٹھے غسل اور وضو کرنا:
- 61..... ❁ تیسری قسم:
- 62..... ❁ پہلی شکل:
- 62..... ❁ دوسری شکل:
- 68..... ❁ بہتے ہوئے پانی کا حکم:
- 69..... ❁ گھی کا حکم:
- 71..... ❁ قلتین کی مقدار:
- 73..... ❁ جھوٹا پانی
- 73..... ❁ جھوٹے پانی کی اقسام:
- 73..... ❁ ① مسلمان کا جھوٹا:
- 76..... ❁ ایک جاہلانہ عادت:
- 77..... ❁ دلائل جواز:
- 81..... ❁ ② غیر مسلم کا جھوٹا:
- 82..... ❁ مخلوط معاشرے:
- 83..... ❁ اسلامی احکام کی وسعت:
- 85..... ❁ ③ غیر مسلم اہل کتاب کا جھوٹا:
- 85..... ❁ پہلا قول:
- 86..... ❁ اہل کتاب کا کھانا:
- 87..... ❁ اہل کتاب عورتوں سے نکاح:
- 90..... ❁ غیر اہل کتاب کفار و مشرکین کا جھوٹا:
- 91..... ❁ اہل کتاب اور غیر اہل کتاب کفار و مشرکین کے برتنوں کا حکم

- 91..... ❁ 1- پہلا قول اور اس کے دلائل:
- 94..... ❁ 2- دوسرا قول اور اس کے دلائل:
- 96..... ❁ ان دلائل کا جائزہ
- 96..... ❁ ① پہلی دلیل:
- 96..... ❁ جائزہ:
- 98..... ❁ ② دوسری دلیل:
- 99..... ❁ جائزہ:
- 99..... ❁ ③ تیسری دلیل:
- 100..... ❁ جائزہ:
- 101..... ❁ ④ چوتھی دلیل:
- 101..... ❁ جائزہ:
- 101..... ❁ 3- تیسرا قول:
- 102..... ❁ نتیجہ:
- 102..... ❁ گوہ کا گوشت:
- 104..... ❁ کفار و مسلمین کے باہمی تعلقات کی نوعیتیں:
- 104..... ❁ قرآن کریم کی نظر میں:
- 106..... ❁ غیر مسلم افراد سے ترکِ موالات کا حکم الہی:
- 108..... ❁ غیر مسلم قرابت داروں سے ترکِ محبت:
- 109..... ❁ چند مثالیں:
- 111..... ❁ شبہہ و تعارض کا ازالہ اور موالات و مواسات کا فرق
- 112..... ❁ ① موالات:
- 112..... ❁ ② مواسات:

- 114..... ❁ (۳) مدارات:
- 115..... ❁ (۴) معاملات:
- 117..... ❁ قرونِ اولیٰ میں مسلم اور غیر مسلم خوش گوار تعلقات کی چند مثالیں
- 118..... ❁ تخلیقِ انسانی کا بنیادی مقصد اور عدم موالات میں شدت کی وجہ:
- 121..... ❁ عدم موالات کے حکم میں شدت کا سبب:
- 123..... ❁ (۱) کفار و مشرکین کی تقلید اور پیروی:
- 125..... ❁ غیروں کی تقلید سے منع کرنے کی حکمت:
- 126..... ❁ چند مثالیں:
- 126..... ❁ (۲) شرک اور بت پرستی:
- 127..... ❁ (۳) بے پردگی اور مرد و زن میں اختلاط:
- 127..... ❁ (۴) کھانا کھانے کا حیوانی انداز:
- 128..... ❁ (۵) بائیں ہاتھ سے کھانا کھانا:
- 129..... ❁ (۶) کتے پالنے کا رواج:
- 130..... ❁ (۷) بیہود و نصاریٰ کی پیروی:
- 133..... ❁ حیوانات اور پرندوں کا جھوٹا
- 133..... ❁ (۱) حلال جانوروں کا جھوٹا:
- 134..... ❁ (۲) دیگر جانوروں کا جھوٹا:
- 134..... ❁ پہلا قول:
- 136..... ❁ دوسرا قول:
- 138..... ❁ (۳) بلی کا جھوٹا:
- 142..... ❁ (۴) خنزیر کا جھوٹا، نجس اور ناپاک ہے:
- 142..... ❁ ایک غلط افواہ:

- 143..... گتے کا جھوٹا: ❁
- 147..... کپڑے، بدن یا جگہ کو پیشاب سے پاک کرنے کا طریقہ ❁
- 148..... شیرخوار بچے کے پیشاب کا حکم: ❁
- 150..... حلال جانوروں کے پیشاب اور پاخانے کا حکم: ❁
- 154..... طہارت کی اہمیت اسلام کی نظر میں ❁
- 157..... اقسامِ حدث اور اسبابِ غسل ❁
- 157..... حدثِ اصغر: ❁
- 158..... حدثِ اکبر: ❁
- 161..... حیض و نفاس اور استحاضہ کے بعض احکام ❁
- 161..... حیض آنے کی عمر: ❁
- 161..... حیض کی مدت: ❁
- 162..... نفاس: ❁
- 163..... نفاس کی مدت: ❁
- 164..... حیض و نفاس کی حالت میں نماز اور روزے کا حکم: ❁
- 167..... غسل کا حکم اور اس کا طریقہ ❁
- 167..... غسل کب واجب ہوتا ہے؟ ❁
- 168..... مسنون اور مستحب غسل: ❁
- 168..... غسل کا مسنون طریقہ: ❁
- 171..... عورتوں کا غسل حیض کے لیے چوٹیاں کھولنا: ❁
- 173..... قضاے حاجت کے آداب ❁
- 173..... اول: ❁
- 174..... دوم: ❁

174.....	سوم:	✽
175.....	چہارم:	✽
176.....	پنجم:	✽
176.....	ششم:	✽
177.....	ہفتم:	✽
178.....	ہشتم:	✽
178.....	نہم:	✽
179.....	دہم:	✽
180.....	یازدہم:	✽
181.....	دوازدہم:	✽
181.....	سیزدہم:	✽
183.....	بعض وضاحتیں	✽
183.....	پہلی وضاحت:	✽
184.....	دوسری وضاحت:	✽
184.....	تیسری اہم وضاحت:	✽
186.....	اسباب و موجبات یا نواقض وضو اور وضو سے قبل چند امور	✽
186.....	① ہاتھ دھونا:	✽
187.....	② ناک جھاڑنا:	✽
188.....	③ مسواک کرنا:	✽
189.....	مسواک کے طبی اور روحانی فوائد:	✽
192.....	وضو کا مسنون طریقہ	✽
192.....	فرضیت وضو:	✽

- 193..... فضیلتِ وضو: ❀
- 196..... وضو کا مسنون طریقہ: ❀
- 199..... اعضاء وضو کو دھونے کی تعداد: ❀
- 201..... تین بار سے زیادہ دھونے کی ممانعت: ❀
- 204..... وضو کے ارکان و فرائض اور سنن و مستحبات ❀
- 204..... وضو کے ارکان و فرائض: ❀
- 204..... وضو کے سنن و مستحبات: ❀
- 205..... ① نیت: ❀
- 205..... اس حدیث کی عظمت و رفعت: ❀
- 207..... نیت کے الفاظ کی شرعی حیثیت: ❀
- 209..... ② بِسْمِ اللّٰهِ پڑھنا: ❀
- 211..... دورانِ وضو کی دوسری دعائیں: ❀
- 214..... اثنائے وضو باتیں کرنا: ❀
- 217..... اعضاء وضو کو دھونے میں تیامن: ❀
- 218..... ③ کلی کرنا اور ناک صاف کرنا: ❀
- 222..... ⑤ منہ دھونا: ❀
- 222..... چہرے کی حدود: ❀
- 223..... ڈاڑھی کا خلال: ❀
- 224..... ⑥ گہنیوں سمیت دونوں ہاتھ دھونا: ❀
- 224..... مدرج جملہ: ❀
- 226..... ⑦ انگلیوں کا خلال: ❀
- 228..... انگوٹھی اور چوڑیوں کا ہلانا: ❀

- 230..... ❁ ناخن پالش کا حکم:
- 232..... ❁ عمامہ یا پگڑی پر مسح کرنا:
- 234..... ❁ ٹوپی کا حکم:
- 235..... ❁ عورتوں کے دوپٹے کا حکم:
- 236..... ❁ کانوں کا مسح کرنے کے لیے نیا پانی لینا
- 237..... ❁ گردن کا مسح:
- 241..... ❁ ۱۵ ٹخنوں سمیت پاؤں دھونا:
- 241..... ❁ ایڑیاں دھونے پر توجہ دینا:
- 246..... ❁ مصنوعی اعضا کی صورت میں غسل اور وضو کے احکام
- 246..... ❁ مصنوعی دانتوں کا حکم:
- 247..... ❁ مصنوعی اعضا کے وضو کا حکم:
- 247..... ❁ پلاسٹر پر مسح:
- 251..... ❁ عام فقہاء و محدثین کا مسلک:
- 253..... ❁ امام ابوحنیفہ اور علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہما کا مسلک:
- 255..... ❁ پلاسٹر یا پٹی پر مسح کرنے کی شرائط:
- 255..... ❁ 1- پہلی شرط:
- 255..... ❁ 2- دوسری شرط:
- 255..... ❁ 3- تیسری شرط:
- 226..... ❁ 4- چوتھی شرط:
- 226..... ❁ پلاسٹر یا پٹی پر مسح کے نواقض:
- 257..... ❁ ① ناقضِ اول:
- 257..... ❁ ② ناقضِ ثانی:

- 257..... ❁ موزوں پر مسح اور پلاسٹر پر مسح میں فرق:
- 258..... ❁ ڈامر لگانے کی صورت میں وضو کا حکم:
- 259..... ❁ غسل و وضو میں مصنوعی بالوں کے جُوڑوں یا وِگوں کا حکم:
- 267..... ❁ وِگ لگانے کی ممانعت:
- 267..... ❁ عورتوں کو بال کٹوانے کی ممانعت:
- 270..... ❁ دیگر محققین کی رائے:
- 275..... ❁ حرمت و لعنت کا سبب:
- 279..... ❁ وِگ پر مسح کا حکم:
- 279..... ❁ وِگ کے ساتھ غسل کی صورت:
- 282..... ❁ غسل حیض و جنابت میں فرق کی توجیہ:
- 282..... ❁ موزوں پر مسح:
- 284..... ❁ جرابوں پر مسح اور احادیثِ رسول:
- 285..... ❁ آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم:
- 286..... ❁ آثارِ تابعین اور اقوالِ ائمہ رضی اللہ عنہم:
- 287..... ❁ احناف کا مسلک:
- 288..... ❁ امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کا رجوع:
- 290..... ❁ لفظِ جراب کی لغوی تحقیق:
- 291..... ❁ مسح کی شرط:
- 292..... ❁ مقامِ مسح:
- 292..... ❁ کیفیتِ مسح:
- 294..... ❁ مسح کی مدت:
- 296..... ❁ مسح کی مدت کا آغاز کب ہوتا ہے؟

- 299..... ❁ نوافلِ مسح:
- 300..... ❁ ۱۲۔ موالات یا تسلسل
- 303..... ❁ ۱۳۔ ترتیب
- 304..... ❁ ایک آدھ گھونٹ پانی پینا:
- 307..... ❁ شرم گاہ پر پانی کا چھینٹا مارنا:
- 312..... ❁ تکمیل وضو کی دعا:
- 313..... ❁ تولیے وغیرہ کا استعمال:
- 314..... ❁ وضو کے بعد:
- 316..... ❁ مکروہ کہنے والوں کے دلائل اور ان کا جائزہ
- 321..... ❁ ”تحیة الوضوء“ کی دو رکعتیں:
- 325..... ❁ ایک وضو سے کئی نمازیں:
- 328..... ❁ تیمم
- 329..... ❁ تیمم کا اجمالی طریقہ:
- 330..... ❁ تیمم کی مشروعیت میں حکمت:
- 331..... ❁ تیمم اور قرآن کریم:
- 335..... ❁ تیمم اور احادیثِ رسول ﷺ:
- 335..... ❁ تیمم اور اجماعِ امت:
- 335..... ❁ حیض اور جنابت میں تیمم:
- 337..... ❁ مریض اور تیمم:
- 338..... ❁ سخت سردی اور تیمم:
- 340..... ❁ اعادہ نماز کا وجوب اور عدم وجوب:
- 342..... ❁ آیت تیمم کا سبب نزول:

- 344..... ❁ مقیم اور تیمم:
- 346..... ❁ صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رضی اللہ عنہم کے آثار:
- 348..... ❁ ایک انتہائی نادر صورت:
- 352..... ❁ طریقہ تیمم:
- 354..... ❁ پھونک مارنا:
- 355..... ❁ زمین پر ہاتھ مارنے میں تکرار:
- 356..... ❁ دو مرتبہ زمین پر ہاتھ مارنا اور اس کے دلائل کا جائزہ:
- 360..... ❁ فریقین میں محاکمہ:
- 363..... ❁ ہاتھوں کا مسح کہاں تک؟
- 364..... ❁ صرف ہاتھوں تک:
- 365..... ❁ کہنیوں تک:
- 367..... ❁ قیاسی دلیل:
- 368..... ❁ جنس ارض:
- 368..... ❁ پہلا قول:
- 369..... ❁ دوسرا قول:
- 371..... ❁ اس اختلاف کا سبب اور لفظ ”صعید“ کی لغوی تشریح:
- 374..... ❁ راجح بات:
- 375..... ❁ جنس ارض:
- 375..... ❁ ٹرین وغیرہ کی دیواروں پر تیمم:
- 376..... ❁ ایک تیمم سے متعدد فرضی و نفل نمازیں اور تلاوت وغیرہ:
- 378..... ❁ وقت تیمم:
- 379..... ❁ تیمم سے صرف ایک نماز اور اس کے دلائل کا جائزہ:

- 381..... علامہ ابن حزم کی تحقیق کا نچوڑ: ❀
- 382..... علامہ نواب صدیق حسن خان والی بھوپال کی تحقیق: ❀
- 383..... حضرت حسن بصری، امام بخاری امام ابن المنذر رحمہم اللہ: ❀
- 384..... یتیم کرنے والے کا امامت کروانا: ❀
- 388..... نواقض یتیم اور نواقض وضو ❀
- 388..... نواقض یتیم: ❀
- 388..... نواقض وضو: ❀
- 388..... ①، ② پیشاب اور پاخانہ: ❀
- 389..... سلس البول: ❀
- 391..... ③ خروج ریح یا ہوا کا آنا: ❀
- 393..... ④ سلس الریح: ❀
- 395..... شرم و حیا کے مسائل ❀
- 396..... شرم و حیا اور علم: ❀
- 398..... ⑤ خروج مذی: ❀
- 399..... خروج مذی سے متعلقہ احادیث: ❀
- 401..... ⑥ ودی: ❀
- 402..... جریان اور لیکوریا، یا سیلان الرحم: ❀
- 402..... سلس الاحتمام: ❀
- 403..... ⑦ خون استحاضہ: ❀
- 403..... ⑧ شرم گاہ کو چھونا: ❀
- 403..... پہلی رائے: ❀
- 406..... دوسری رائے: ❀

- 407..... ❁ مسلکِ اوّل کی ترجیح کی وجوہات:
- 412..... ❁ بچے کا پاخانہ دھونا:
- 413..... ❁ ⑨ نیند:
- 414..... ❁ ایک عجیب واقعہ:
- 415..... ❁ مطلق نیند کے بارے میں دیگر علما کے اقوال:
- 416..... ❁ دیگر اقوال:
- 419..... ❁ تعارض اور اس کا حل:
- 419..... ❁ نیند اور اونگھ کا فرق و حکم:
- 422..... ❁ خصائصِ مصطفیٰ ﷺ:
- 423..... ❁ ⑩ زوالِ عقل یا بے ہوشی:
- 423..... ❁ ⑪ اونٹ کا گوشت کھانا:
- 424..... ❁ قائلینِ نقض کے دلائل:
- 426..... ❁ قائلینِ عدم نقض کے دلائل:
- 429..... ❁ غیر نواقضِ وضو (جن اشیاء سے وضو نہیں ٹوٹتا):
- 429..... ❁ ① آگ پر پکی ہوئی اشیا کا کھانا:
- 432..... ❁ ہاتھ دھونا اور کلی کرنا:
- 434..... ❁ ② عورت کو چھونا:
- 440..... ❁ قائلینِ نقض کے دلائل اور ان کا جائزہ:
- 440..... ❁ پہلی دلیل:
- 440..... ❁ لمس کا معنی:
- 440..... ❁ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر مفسرینِ کرام کی آرا:
- 441..... ❁ امام ابن کثیر اور طبری رحمہما:

- 442..... تفسیر مجاہد: ❀
- 443..... زاد المسیر: ❀
- 443..... تفسیر قرطبی: ❀
- 443..... ایک درمیانی راہ: ❀
- 443..... فی ظلال القرآن: ❀
- 444..... فتح القدر: ❀
- 444..... تفسیر روح المعانی: ❀
- 444..... تفسیر المنار: ❀
- 445..... تیسیر الکریم الرحمن: ❀
- 445..... احسن التفاسیر: ❀
- 446..... معارف القرآن: ❀
- 446..... ترجمہ شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ: ❀
- 447..... تفسیری فوائد مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ: ❀
- 447..... ترجمہ بریلوی وحاشیہ مراد آبادی: ❀
- 447..... تفہیم القرآن: ❀
- 447..... خلاصہ کلام: ❀
- 448..... بدایۃ المجتہد: ❀
- 448..... قائلین نقض کی دوسری دلیل: ❀
- 450..... قہقہہ: ❀ (۳)
- 451..... میت کو اٹھانا: ❀ (۴)
- 453..... (۵)، (۶) سریا مونچھوں کے بال کاٹنا اور ناخن تراشنا: ❀
- 453..... (۷) قے کرنا: ❀

- 455..... ❁ اولاً:
- 456..... ❁ ثانیاً:
- 456..... ❁ ثالثاً:
- 456..... ❁ ⑧ تفسیر:
- 458..... ❁ مرسل روایت کی حیثیت:
- 459..... ❁ ⑨ خون:
- 469..... ❁ ⑩ ایذاے مسلم:
- 471..... ❁ ⑪ صلیب اور ضم کو چھونا:
- 472..... ❁ غسل اور وضو کے لیے پانی میں احتیاط:
- 475..... ❁ اوقات نماز:
- 475..... ❁ اوقات نماز پنج گانہ قرآن کریم کی روشنی میں:
- 478..... ❁ اوقات نماز پنج گانہ حدیث شریف کی روشنی میں:
- 482..... ❁ نماز فجر:
- 491..... ❁ وقت فجر کے سلسلے میں احناف کا مسلک:
- 493..... ❁ جمع و تطبیق:
- 495..... ❁ نماز ظہر:
- 499..... ❁ ظہر و عصر کا وقت معلوم کرنے کا طریقہ:
- 500..... ❁ نماز عصر کا وقت اور ایک اشکال کا حل:
- 504..... ❁ نماز عصر کو جلدی ادا کرنا:
- 506..... ❁ مختلف احادیث میں تطبیق:
- 508..... ❁ نماز عصر کا اول وقت:
- 510..... ❁ وقت مغرب:

- 514..... وقتِ عشا: ❀
- 518..... نمازِ عشا کا افضل وقت: ❀
- 519..... اوّل وقت: ❀
- 521..... آخری وقت: ❀
- 528..... طویل الاوقات علاقوں میں نماز ❀
- 528..... حدیثِ اوّل: ❀
- 528..... طویل الاوقات علاقوں (قطبین) میں نماز اور روزے کے اوقات سے متعلق بعض اہم
اداروں کے فیصلے: ❀
- 530..... ممبرانِ فقہ اکیڈمی: ❀
- 536..... اوقاتِ نبی یا مکروہہ: ❀
- 537..... بعد از فجر و عصر: ❀
- 537..... حدیثِ اوّل: ❀
- 537..... حدیثِ ثانی: ❀
- 538..... حدیثِ ثالث: ❀
- 541..... فجر کی دو سنتیں: ❀
- 541..... حدیثِ اوّل: ❀
- 543..... حدیثِ دوم: ❀
- 543..... حدیثِ سوم: ❀
- 544..... حدیثِ چہارم: ❀
- 545..... آثار: ❀
- 546..... فجر کے بعد سے مراد: ❀
- 548..... طلوعِ فجر یا اذانِ فجر کے بعد عام نوافل: ❀

- 549..... ❁ تحیۃ المسجد اذان فجر کے بعد:
- 550..... ❁ نماز وتر، طلوع فجر کے بعد:
- 552..... ❁ عصر کے بعد قضاے نواہت و فرائض اور سنن راتبہ:
- 554..... ❁ دوام عمل یکے از خصائص مصطفیٰ ﷺ:
- 556..... ❁ تحقیق روایت:
- 558..... ❁ عدم اطلاق:
- 560..... ❁ عصر کے بعد سے مراد:
- 561..... ❁ نماز طواف:
- 562..... ❁ سوئے رہ جانے یا بھول جانے والے کی نماز:
- 564..... ❁ طلوع اور استوائے اور غروب کا وقت:
- 565..... ❁ نماز جنازہ اور تدفین کی کراہت:
- 568..... ❁ حدیث ثانی:
- 569..... ❁ حدیث ثالث:
- 569..... ❁ حدیث رابع:
- 571..... ❁ پہلا اثر:
- 571..... ❁ دوسرا اثر:
- 571..... ❁ تیسرا اثر:
- 571..... ❁ استثنائی صورتیں:
- 573..... ❁ اس دن کی فجر و عصر:
- 577..... ❁ سورج کے عین سر پر ہونے کے وقت نماز کی کراہت ہونے سے جمعہ کے دن کا استثنا:...
- 578..... ❁ پہلا قول:
- 578..... ❁ دوسرا قول:

- 578..... تیسرا قول: ❀
- 580..... دوسری دلیل: ❀
- 582..... بعض دیگر مواقع کراہت: ❀
- 583..... کراہت میں تفاوت: ❀
- 584..... فرضوں کی قضا: ❀
- 585..... قضا نماز کے لیے اذان: ❀
- 587..... وقت کراہت میں قضا: ❀
- 589..... مانعین اذان کے دلائل کا جائزہ: ❀
- 590..... پہلا جواب: ❀
- 590..... دوسرا جواب: ❀
- 590..... سرّی و جہری نمازوں کی قضا: ❀
- 591..... قضا نماز کی اقامت و جماعت: ❀
- 594..... ایک اشکال اور اس کا حل: ❀
- 596..... قضا نمازوں کو پڑھنے میں ترتیب: ❀
- 596..... قضا اور ادا میں ترتیب: ❀
- 597..... تنگ وقت والی حاضر نماز پہلے یا قضا پہلے؟: ❀
- 598..... جب حاضر نماز کی جماعت کھڑی ہو؟: ❀
- 599..... قضا نماز اور خطبہ جمعہ: ❀
- 600..... متعدد قضا نمازوں کے پڑھنے میں ترتیب: ❀
- 601..... قائلین وجوب کے بعض دیگر دلائل کا جائزہ: ❀
- 604..... خلاصہ کلام: ❀
- 604..... وتر اور سنتوں کی قضا: ❀

- 610..... ❁ عشا سے پہلے سونا اور بعض استثنائی صورتیں:
- 612..... ❁ عشا کے بعد باتیں کرنے کی کراہت اور استثنائی صورتیں:
- 618..... ❁ خلاصہ کلام:
- 619..... ❁ نماز میں پابندی وقت قرآن کریم کی روشنی میں
- 620..... ❁ نمازِ وسطیٰ:
- 621..... ❁ علمائے تفسیر کی تصریحات:
- 622..... ❁ امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ:
- 622..... ❁ امام قرطبی رحمہ اللہ:
- 623..... ❁ علامہ آلوسی رحمہ اللہ:
- 623..... ❁ علامہ محمد رشید رضا:
- 624..... ❁ امام شوکانی رحمہ اللہ:
- 624..... ❁ امام ابن کثیر رحمہ اللہ:
- 625..... ❁ نمازِ فجر کہنے والوں کے دلائل اور ان کا جائزہ:
- 626..... ❁ نمازِ ظہر کہنے والوں کے دلائل اور ان کا جائزہ:
- 627..... ❁ نمازِ عصر کہنے والوں کے دلائل:
- 628..... ❁ حدیثِ اول:
- 628..... ❁ حدیثِ دوم:
- 629..... ❁ حدیثِ سوم:
- 629..... ❁ حدیثِ چہارم:
- 629..... ❁ حدیثِ پنجم:
- 630..... ❁ حدیثِ ششم:
- 630..... ❁ آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم:

- 630..... اثرِ اوّل: ❁
- 630..... اثرِ ثانی: ❁
- 631..... اثرِ ثالث: ❁
- 631..... اثرِ رابع: ❁
- 631..... اثرِ خامس: ❁
- 631..... آثارِ تابعین رضی اللہ عنہم: ❁
- 631..... خلاصہ کلام: ❁
- 632..... نماز میں پابندیِ وقت حدیث شریف کی روشنی میں ❁
- 632..... ترکِ عصر پر وعید: ❁
- 633..... محافظتِ عصر و فجر: ❁
- 635..... فضیلتِ عصر و فجر کے اسباب: ❁
- 636..... محافظتِ فجر و عشا: ❁
- 640..... نمازِ ظہر کی فضیلت اور اس پر محافظت: ❁
- 640..... نمازِ مغرب کی فضیلت اور اس پر محافظت: ❁
- 643..... مصادر و مراجع ❁



پیش لفظ

إِنَّ الْحَمْدَ لِلَّهِ نَحْمَدُهُ وَنَسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَ
سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا مَنْ يَهْدِهِ اللَّهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يَضِلَّ فَلَا هَادِيَ لَهُ وَأَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ
إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ. أَمَّا بَعْدُ:

زیر نظر کتاب مولانا محمد منیر قمر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ان تقاریر کا مجموعہ ہے، جو متحدہ عرب امارات کی
ریاست ام القیوین کے ریڈیو اسٹیشن کی اردو سروس سے نماز کے بارے میں روزانہ نشر ہونے والے
پروگرام ”دین و دنیا“ کے تحت نشر کی گئی ہیں اور بعد میں ان کو ترتیب دے کر کتابی شکل دی گئی ہے جو
آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

ان تقاریر میں ہمارے فاضل دوست مولانا قمر صاحب نے موضوع اور اس کے متعلقات کے
بارے میں کچھ تفصیلی گفتگو فرمائی ہے، جو نہایت ہی مفید اور مدلل ہونے کے ساتھ ساتھ آسان ہے۔
بندہ عاجز نے افادہ عام کے لیے ان ریڈیائی تقاریر کو ترتیب دیا ہے اور ”مَا لَا يَدْرُكَ كُلُّهُ
لَا يَتْرُكُ جُلُّهُ“ کے تحت مختصر سا تخریج کا کام بھی کیا ہے۔ بعض جگہ جہاں کہیں اصل کتب کا حوالہ
نہیں تھا، وہاں اصل کتب کا حوالہ دے دیا ہے۔

مولانا محمد منیر قمر صاحب نے یہ پروگرام مختلف کتب حدیث و فقہ اور ان کی شروحات کو سامنے
رکھ کر بڑی محنت و کاوش سے تیار کیے ہیں۔ اس لیے کتب حدیث کے حوالے دیتے وقت تخریج یا حاشیہ
میں مذکور کتب میں سے کسی ایک مصدر یا مرجع کی نص سے مطابقت ہوگی اور بعض جگہ اگر کوئی حدیث
بخاری و مسلم کی ہے تو صرف ان دونوں ہی کے تذکرے پر اکتفا کیا گیا ہے، البتہ بعض جگہوں پر
دوسری کتب حدیث کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ اس تقصیر و کوتاہی کی وجہ کتابت میں جلدی اور وقت کی کمی
کے ساتھ ساتھ میرے اپنے فرائض منصبی بھی ہیں۔

ہاں اگر ترتیب میں کوئی خلل یا تخریج و تحقیق میں کوتاہی ہو تو بندہ اس کا معترف ہے اور احباب

سے گزارش ہے کہ اس پر مطلع فرمائیں، تاکہ آئندہ طباعت میں اس کا ازالہ کیا جاسکے۔
مولانا قمر صاحب نے حتی المقدور کوشش کر کے صحیح احادیث سے استدلال کرتے ہوئے ان پروگراموں کو پیش کیا ہے اور موقع بہ موقع ضعیف احادیث کی نشان دہی بھی کی ہے۔

ہاں! انسان علم میں کتنا ہی پختہ کیوں نہ ہو، پھر بھی اس کا علم ناقص ہے اور رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق ہر انسان خطا کار ہے۔ اس لیے اہل علم حضرات سے التماس ہے کہ اگر وہ کسی ضعیف حدیث پر اطلاع پائیں تو نشان دہی فرمائیں۔ ہم ان کے شکر گزار ہوں گے اور ان شاء اللہ آئندہ ایڈیشن میں ہم ان اہل علم و تحقیق حضرات کی آراء کا احترام کرتے ہوئے اس کی اصلاح کر دیں گے۔
اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے اپنے فضل و کرم اور رحمت سے مجھے یہ کام کرنے کی توفیق بخشی

اور دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کام کو پورا کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین ثم آمین
آخر میں میں اپنے فاضل دوست مولانا محمد منیر قمر صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے نماز کے بارے میں پیش کیے گئے پروگراموں کا تقریری مجموعہ ترتیب دینے کے لیے میرا انتخاب کیا اور اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کے علم و عمر میں برکت فرمائے اور انھیں مزید نیکی و خدمت دین کی توفیق بخشے۔

قارئین سے التماس ہے کہ مؤلف و ناشر کے ساتھ ساتھ بندہ کو بھی نیک دعاؤں میں یاد رکھیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنے فضل و کرم سے ہماری اس محنت و کاوش کو شرف قبولیت سے نوازے اور آخرت میں ہمارے لیے ذریعہ نجات بنائے اور قارئین کے لیے اس کتاب کو نفع بخش بنائے۔ آمین ثم آمین

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِهِ وَصَحْبِهِ أَجْمَعِينَ وَمَنْ تَبِعَهُمْ
بِحَسَنٍ إِلَى يَوْمِ الدِّينِ.

حافظ ارشاد الحق

رکن مرکز الدعوة والارشاد۔ دہلی

۱۰/۱۱/۱۴۱۳ھ

حرف آغاز

إِنَّ الْحَمْدَ لِلَّهِ، نَحْمَدُهُ وَنَسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَ
سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللَّهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ، وَمَنْ يَضِلَّ فَلَا هَادِيَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنْ لَا
إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ.

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ وَ لَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَ أَنْتُمْ

مُسْلِمُونَ﴾ [آل عمران: ۱۰۲]

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَ خَلَقَ مِنْهَا
زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَ نِسَاءً وَ اتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ
وَ الْأَرْحَامَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا﴾ [النساء: ۱]

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَ قُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ﴿٦٦﴾ يُصْلِحْ لَكُمْ
أَعْمَالَكُمْ وَ يُغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَ مَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَ رَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا
عَظِيمًا﴾ [الأحزاب: ۷۰، ۷۱] أمَّا بعدُ:

معزز قارئین! السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

اللہ کی توفیق و عنایت اور اس کے فضل و کرم سے عرصہ پانچ سال کے دوران میں ہم نے
مختلف مواقع کی جملہ سات سو چھیاسی (۷۸۶) نشستوں میں ریڈیو متحدہ عرب امارات، ام القیوین کی
اردو سروس سے ”نماز“ کے احکام و مسائل اور اس کے متعلقات کے بارے میں تفصیلات جو مسائل و
احکام طہارت یا اوقات نماز اور نماز باجماعت سے متعلق ہیں، اس پہلی جلد میں پیش کی ہیں اور دوسری
تیسری جلد بھی اس کے ساتھ ہی زیر طباعت ہے۔ اس طرح ”مسائل و احکام نماز“ سے متعلقہ تمام
ضروری تفصیلات جو ریڈیو سے نشر ہوئیں، وہ ایسی ہی کئی جلدوں میں مرتب ہو کر آپ کے سامنے

آجائیں گی۔ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ، وَبِيَدِهِ التَّوْفِيقَ وَالسَّدَادَ.

اس کتاب کی ترتیب و تہیض کے سلسلے میں جتنی محنت ہمارے فاضل دوست جناب حافظ ارشاد الحق صاحب (فاضل مدینہ یونیورسٹی۔ مقیم الذید۔ شارجہ) نے کی ہے، وہ انتہائی قابل ستائش ہے، جس پر ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ فَجَزَاهُ اللّٰهُ فِي الدَّارَيْنِ خَيْرًا.

اس کتاب کی پہلی طباعت و اشاعت کے سلسلے میں شارجہ کے ہمارے ایک دوست جناب عبدالعزیز صاحب مبین رحمۃ اللہ علیہ کی مساعی جلیلہ انتہائی قابل قدر ہیں کہ انھوں نے اپنے اثر و رسوخ اور تعلقات کو بروئے کار لاتے ہوئے دہئی کے بعض محیر تجار (جو اپنا نام تک ظاہر کرنا پسند نہیں کرتے) سے اس کے اخراجات کا انتظام کروایا تھا، جب کہ زیر نظر یہ کمپیوٹرائزڈ ایڈیشن اللہ کے ایک بندے نے اپنی والدہ محترمہ رانی مختار بیگم کے ایصالِ ثواب کے لیے شائع کروایا ہے۔ عَفَرَ اللّٰهُ لَهَا وَرَحِمَهَا وَأَدْخَلَهَا الْفِرْدَوْسَ الْأَعْلَىٰ. وَبَارَكَ اللّٰهُ فِيْمَا رَزَقَهُمْ وَزَادَهُمْ مِنْهُ وَكَثَّرَ أَمْثَالَهُمْ.

تمام قارئین سے درخواست ہے کہ اپنی نیک دعاؤں میں یہ بھی شامل رکھیں کہ اللہ تعالیٰ مصنف و مرتب اور مشار الہم اہل خیر اور الدال علی الخیر سب کی مساعی کو شرف قبول سے نوازے، اور اس کتاب کو تمام قارئین و سامعین کے لیے مفید بنائے۔ آمین

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ابوسلمان محمد منیر قمر

أم القیوین

www.mohammedmunirqamar.com

متحدہ عرب امارات

۱۹/۵/۱۴۱۳ھ

۳/۱۱/۱۹۹۳ھ



طہارت کے بنیادی احکام قرآن کریم میں

قرآن کریم اصول کی کتاب ہے اور اس میں طہارت کے احکام و مسائل سے متعلق بنیادی اُمور بھی آگئے ہیں، جنہیں یہاں ہم الگ سے ذکر کر رہے ہیں اور آگے چل کر متعلقہ مقامات پر ان کی تفصیل بھی آجائے گی۔

1، 2 جنابت (جماع و احتلام) سے طہارت و غسل کا حکم:

﴿وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَأَطْهَرُوا﴾ [المائدة: 6]

”اگر جنابت (جماع یا احتلام) کی حالت میں ہو تو نہا کر پاک ہو جاؤ۔“

﴿أَوَلَمْ تَسْتَمِ الْأُنثَىٰ﴾ [المائدة: 6]

”یا تم نے عورتوں کو ہاتھ لگایا (جماع کیا) ہو۔“

﴿وَلَا جُنُبًا إِلَّا عَابِرِي سَبِيلٍ حَتَّىٰ تَغْتَسِلُوا﴾ [النساء: 43]

”اور جنابت کی حالت میں بھی (نماز کے قریب نہ جاؤ) جب تک کہ غسل نہ کر لو الا یہ کہ راستے سے گزرتے ہو۔“

3 حیض و نفاس سے طہارت و غسل کا حکم:

﴿وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ قُلْ هُوَ أَذَىٰ فَاعْتَزِلُوا مِنَ النِّسَاءِ فِي الْمَحِيضِ وَ

لَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّىٰ يَطْهَرْنَ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ﴾ [البقرة: 222]

”اور تم سے حیض کے بارے میں دریافت کرتے ہیں، کہہ دو کہ وہ تو نجاست ہے، سو

ایام حیض میں عورتوں سے کنارہ کش رہو اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں اُن سے مقاربت نہ کرو۔ ہاں جب (وہ غسل کر کے) پاک ہو جائیں تو جس طریق سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں ارشاد فرمایا ہے، اُن کے پاس جاؤ، کچھ شک نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والوں اور پاک صاف رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔“

4 پیشاب اور پاخانے سے طہارت کا حکم:

﴿أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِّنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ﴾ [المائدة: 6]

”یا تم میں سے کوئی شخص رفعِ حاجت (پیشاب و پاخانہ) کر کے آئے۔“

5 لباس کی طہارت کا حکم:

﴿وَتِيَابَكَ فَطَهِّرْ﴾ [المدثر: 4] ”اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھو۔“

6 جائے نماز کی طہارت کا حکم:

1 ﴿وَعَهْدَنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَنَّ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ

وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ﴾ [البقرة: 125]

”اور ابراہیم و اسماعیل کو کہا کہ طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لیے میرے گھر کو پاک صاف رکھا کرو۔“

2 ﴿وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ﴾ [الحج: 26]

”اور طواف کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں (اور) سجدہ کرنے والوں کے لیے میرے گھر کو صاف رکھا کرو۔“

7 عام طہارت کا حکم:

1 ﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ﴾ [البقرة: 222]

”اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والوں اور پاک صاف رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔“

2 ﴿وَيُنزِلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً لِّيُطَهِّرَ كُمْ بِهِ﴾ [الأَنْفَال: 11]

”اور تم پر آسمان سے پانی برسایا، تاکہ تمہیں اُس سے (نہلا کر) پاک کر دے۔“

﴿فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَهَّرِينَ﴾ [التوبة: 108]

”اُس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ پاک رہنے والوں ہی کو پسند کرتا ہے۔“

8 وضو کا حکم:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ

إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ﴾ [المائدة: 6]

”مومنو! جب تم نماز پڑھنے کا قصد کیا کرو تو منہ اور کہنیوں تک ہاتھ دھولیا کرو اور سر کا مسح کر لیا کرو اور ٹخنوں تک پاؤں (دھولیا کرو)۔“

9 تیمم کا حکم:

﴿وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِّنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ أَوْ

لَمَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَ

أَيْدِيكُمْ مِّنْهُ﴾ [المائدة: 6]

”اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا کوئی تم میں سے بیت الخلاء میں سے ہو کر آیا ہو یا تم عورتوں سے ہم بستر ہوئے ہو اور تمہیں پانی نہ مل سکے تو پاک مٹی لو اور اُس سے منہ اور ہاتھوں کا مسح (تیمم) کر لو۔“

فلسفہ تیمم:

﴿مَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ حَرَجٍ وَلَكِنْ يُرِيدُ لِيُطَهَّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ

نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾ [المائدة: 6]

”اللہ تعالیٰ تم پر کسی طرح کی تنگی نہیں کرنا چاہتا، بلکہ یہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کرے اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کرے تاکہ تم شکر کرو۔“

10 ذریعہ طہارت؛ (پانی:

کنویں، ٹیوب ویل اور ہینڈ پمپ وغیرہ کا پانی:

﴿وَلَمَّا وَرَدَ مَاءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ أُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُونَ﴾ [الفصص: ۲۳]
 ”اور جب وہ (موسیٰ) مدین کے کنویں پر پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ بہت سے لوگ پانی
 پلا رہے ہیں۔“

﴿أَوْ يُصْبِحَ مَاءُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيعَ لَهُ طَلْبًا﴾ [الكهف: ۶۱]
 ”یا اس (نہر) کا پانی گہرا ہو جائے تو پھر تم اُسے نہ لاسکو۔“

﴿قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَصْبَحَ مَاءُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَأْتِيكُمْ بِمَاءٍ مَّعِينٍ﴾ [الملک: ۳۰]
 ”کہو کہ بھلا دیکھو تو اگر تمہارا پانی (جو تم پیتے اور برتتے ہو) خشک ہو جائے تو (اللہ کے
 سوا) کون ہے، جو تمہارے لیے شیریں پانی کا چشمہ بہا لائے؟“

﴿وَجَعَلْنَا فِيهَا رِوَاسِيَ شِمِخْتٍ وَأَسْقَيْنَكُم مَّاءً فَرَاتًا﴾ [المرسلات: ۲۷]
 ”اور اس (زمین) پر اونچے اونچے پہاڑ رکھ دیے اور تم لوگوں کو بیٹھا پانی پلایا۔“

سوتوں، چشموں اور دریاؤں کا پانی:

﴿وَإِنَّ مِّنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهَارُ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَاءٌ يَشَقُّ فَيَخْرُجُ
 مِنْهُ الْمَاءُ﴾ [البقرة: ۷۴]

”اور پتھروں میں سے تو کوئی ایسا بھی ہوتا ہے، جس میں سے چشمے پھوٹ بہتے ہیں۔ کوئی
 پھٹتا ہے اور اس میں سے پانی نکل آتا ہے۔“

﴿الْمُ تَرَى أَنَّ اللَّهَ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَلَكَهُ يَنَابِيعَ فِي الْأَرْضِ﴾ [الزمر: ۲۱]
 ”کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ آسمان سے پانی نازل کرتا ہے، پھر اس کو زمین میں چشمے بنا
 کر جاری کرتا ہے؟“

بارش، اولوں اور برف وغیرہ کا پانی:

﴿وَيُنزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً لِّيُطَهِّرَ كُمْ بِهِ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ

الشَّيْطَانُ ﴿[الأنفال: ۱۱]﴾

”اور وہ (اللہ تعالیٰ) تم پر آسمانوں سے پانی نازل فرماتا ہے، تاکہ اس سے تمہیں پاک کرے اور تم سے شیطان کی ڈالی ہوئی نجاست دور کر دے۔“

﴿وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَهُورًا﴾ [الفرقان: ۴۷]

”اور ہم نے آسمان سے پاک پانی نازل کیا۔“

﴿وَأَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَاءً ثَبَّاجًا﴾ [النبا: ۶۴]

”اور نچڑتے بادلوں سے موسلا دھار مینہ برسایا۔“

﴿۵﴾ ندی، نالوں اور سیلاب وغیرہ کا پانی:

﴿أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَسُوقُ الْمَاءَ إِلَى الْأَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهِ زُرْعًا﴾

[السجدة: ۲۷]

”کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم بخرزین کی طرف پانی رواں کرتے ہیں، پھر اُس سے کھیتی پیدا کرتے ہیں۔“

﴿۶﴾ دریاؤں اور سمندر کا پانی:

﴿وَهُوَ الَّذِي مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هَذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَهَذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ وَجَعَلَ

بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَحِجْرًا مَّحْجُورًا﴾ [الفرقان: ۵۳]

”اور وہی تو ہے جس نے دو دریاؤں کو ملا دیا، ایک کا پانی شیریں ہے پیاس بجھانے والا اور دوسرے کا کھارا چھاتی جلانے والا اور دونوں کے درمیان ایک آڑ اور مضبوط اوٹ بنا دی۔“

﴿وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرَانِ هَذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَائِغٌ شَرَابُهُ وَهَذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ﴾

[الفاطر: ۱۲]

”اور پانی کے دونوں ذخیرے یکساں نہیں۔ ایک میٹھا اور پیاس بجھانے والا ہے، پینے میں خوشگوار، اور دوسرا سخت کھاری کہ حلق چھیل دے۔“

ب۔ پاک مٹی:

طہارت اور پاکیزگی حاصل کرنے کے لیے پانی کے بعد دوسری چیز پاک مٹی بھی ہے، جس کا

ذکر قرآن کریم میں دو جگہ ان الفاظ میں آیا ہے:

﴿فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا﴾ [النساء: ۴۳، المائدة: ۶]

”اور پھر پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے کام (تیمم کر) لو۔“

﴿11﴾ معنوی طہارت کا حکم:

اس سے قبل جسم، لباس اور مقام (جائے نماز) سے متعلق ظاہری طہارت کے احکام ذکر کیے گئے ہیں اور آگے معنوی طہارت (شرک و بدعات اور اصنام و اوثان سے طہارت) کا حکم بیان کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

﴿1﴾ ﴿وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَنْ لَا تُشْرِكْ بِي شَيْئًا﴾ [الحج: ۲۶]

”اور (ایک وقت تھا) جب ہم نے ابراہیم کے لیے خانہ کعبہ کو مقام مقرر کیا (اور ارشاد فرمایا): کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرنا۔“

﴿2﴾ ﴿وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ﴾ [المدثر: ۵] ”اور (اصنام و آثام کی) ناپاکی سے دُور رہو۔“



اوقاتِ نماز قرآنِ کریم میں

قرآنِ کریم کے متعدد مقامات پر نمازِ پنج گانہ اور ان کے اوقات کی طرف اشارے کیے گئے ہیں۔ مثلاً:

1 نمازِ فجر و مغرب اور عشا:

﴿وَأَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفِي النَّهَارِ وَزُلْفًا مِّنَ اللَّيْلِ﴾ [ہود: ۱۱۴]
 ”اور دن کے دونوں کناروں (صبح اور شام کے اوقات میں) اور رات کی چند (پہلی) ساعات میں نماز پڑھا کرو۔“

2 نمازِ پنج گانہ:

﴿اقِمِ الصَّلَاةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلَى غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْآنِ الْفَجْرِ إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا﴾ [بنی اسرائیل: ۷۸]
 ”(اے نبی!) سورج کے ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک (ظہر، عصر، مغرب، عشا کی) نمازیں اور صبح (فجر) کو قرآن پڑھا کرو، کیونکہ صبح کے وقت قرآن پڑھنا موجبِ حضور (ملائکہ) ہے۔“

﴿وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوبِهَا وَمِنْ آنَاءِ اللَّيْلِ فَسَبِّحْ وَأَطْرَافَ النَّهَارِ﴾ [طہ: ۱۳۰]
 ”اور سورج کے نکلنے سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے اپنے رب کی تسبیح و تحمید کیا کرو اور رات کی ساعات (اولین) میں بھی اُس کی تسبیح کیا کرو اور دن کے اطراف

(دوپہر کے قریب ظہر کے وقت) بھی۔“

﴿۳﴾ ﴿فَسُبْحَانَ اللَّهِ حِينَ تُمْسُونَ وَحِينَ تُصْبِحُونَ ﴿۱۷﴾ وَ لَهُ الْحَمْدُ فِي

السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَعَشِيًّا وَحِينَ تُظْهِرُونَ﴾ [الروم: ۱۷، ۱۸]

”تو جس وقت تم کو شام ہو اور جس وقت صبح ہو اللہ کی تسبیح (نماز) پڑھو۔ اور آسمانوں اور زمین میں اسی کی تعریف ہے اور تیسرے پہر بھی اور جب دوپہر ہو (اُس وقت بھی نماز پڑھا کرو)۔“

3 نمازِ جمعہ:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ

اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ [الجمعة: ۹]

”مومنو! جب جمعے کے دن نماز کے لیے اذان دی جائے تو اللہ کی یاد (نماز) کے لیے جلدی کرو اور (خرید و) فروخت ترک کر دو، اگر سمجھو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔“

4 نمازِ تہجد:

﴿وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَكَ﴾ [الإسراء: ۷۹]

”اور بعض حصہ شب میں بیدار ہوا کرو (تہجد کی نماز پڑھا کرو) اس حال میں کہ آپ کے لیے وہ زائد ہے۔“

5 نماز میں پابندیِ وقت:

﴿إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَوْقُوتًا﴾ [النساء: ۱۰۳]

”بے شک نماز کا مومنوں پر اوقات مقررہ میں ادا کرنا فرض ہے۔“

6 عدم پابندی کا انجام:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ

وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ﴾ [المنافقون: ۹]

”مومنو! تمہارا مال اور اولاد تم کو اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں اور جو ایسا کرے گا تو وہ لوگ خسارہ اٹھانے والے ہیں۔“

﴿فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهْوَاتِ فَسُوفَ يَلْقَوْنَ غِيًّا﴾ [مریم: ۵۹]

”پھر ان کے بعد چند ناخلف اُن کے جانشین ہوئے، جنہوں نے نماز کو (چھوڑ دیا گویا اُسے) کھو دیا اور خواہشاتِ نفسانی کے پیچھے لگ گئے۔ سو عن قریب ان کو گمراہی (کی سزا) ملے گی۔“

﴿فَوَيْلٌ لِلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ﴾ [الماعون: ۴، ۵]

”تو ایسے نمازیوں کے لیے خرابی اور بربادی ہے۔ جو نماز کی طرف سے غافل رہتے ہیں۔“

7 تذکارِ نماز:

قرآن کریم کے کتنے ہی دوسرے مقامات پر بھی نمازوں اور ان کے اوقات کا کسی نہ کسی انداز سے تذکرہ آیا ہے۔ مثلاً دیکھیے:

- | | |
|------------------------|----------------------|
| ① البقرہ (آیت: ۱۸۷) | ② آل عمران (آیت: ۳) |
| ③ الانعام (آیت: ۵۲) | ④ یوسف (آیت: ۱۶) |
| ⑤ الزّعد (آیت: ۱۵) | ⑥ مریم (آیت: ۱۱، ۳۱) |
| ⑦ الکہف (آیت: ۲۸) | ⑧ ص (آیت: ۱۸) |
| ⑨ التّور (آیت: ۳۶، ۵۸) | ⑩ الغافر (آیت: ۵۵) |
| ⑪ ق (آیت: ۳۹) | ⑫ القدر (آیت: ۵) |
| ⑬ الفجر (آیت: ۱) | ⑭ العصر (آیت: ۱) |

مذکورہ مقامات پر نمازوں اور ان کے اوقات کی طرف مختصر اشارات آئے ہیں، جبکہ ان کی تفصیلات کتبِ حدیث میں موجود ہیں، جو آگے چل کر متعلقہ مواقع پر آجائیں گی۔ ان شاء اللہ.



نمازِ باجماعت قرآنِ کریم میں

﴿1﴾ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّكْعِينَ ﴿البقرة: ۴۳﴾
”اور نماز پڑھا کرو اور زکات دیا کرو اور (اللہ تعالیٰ کے آگے) جھکنے والوں کے ساتھ جھکا کرو۔“

﴿2﴾ حَفِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ وَقَوْمُوا لِلَّهِ قَنِينًا ﴿البقرة: ۲۳۸﴾
”اور سب نمازوں کی حفاظت کرو اور درمیانی نماز کی اور اللہ کے لیے فرماں بردار ہو کر کھڑے رہو۔“

﴿وَاِذَا كُنْتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلَاةَ... الخ﴾ [النساء: ۱۰۲]
”اور (اے پیغمبر!) جب تم ان (مجاہدین کے لشکر) میں ہو اور ان کو نماز پڑھانے لگو..... الخ۔“



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مطلق پانی کی اقسام و احکام

بنیادی طور پر پانی کے حصول کے صرف دو ہی طریقے ہیں:

- ① پانی زمین سے حاصل ہوا ہو، جیسا کہ سمندر، دریا، نہر، کنویں، ٹیوب ویل یا ہینڈ پمپ وغیرہ سے حاصل کیا جاتا ہے۔
 - ② پانی کے حصول کا دوسرا طریقہ آسمان سے برسنے والا پانی لینا ہے، خواہ وہ بارش کی شکل میں برے یا اولے اور کہر کی شکل میں ہو اور اس برف سے پگھلنے سے پانی حاصل ہوتا ہے۔
- زمین اور آسمان سے حاصل ہونے والے اس تمام پانی کو ”مائے مطلق“ کہا جاتا ہے، جو فی نفسہ تمام ائمہ و فقہاء اور محدثین کرام کے نزدیک بالاتفاق نہ صرف پاک و طاہر بلکہ مطہر بھی ہے، یعنی یہ خود پاک ہونے کے ساتھ ساتھ دوسری اشیا کو پاک کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ یہ تو ہوا مطلق پانی کا عام حکم، اب اس پاک پانی کی مختلف صورتوں کے لحاظ سے چار قسمیں ہو سکتی ہیں۔

پہلی قسم:

ان چار قسموں میں سے مطلق پانی کی پہلی قسم وہ پانی ہے، جو بارش، اولوں اور برف سے حاصل ہو۔ یہ پانی پاک و طاہر اور مطہر بھی ہے، کیوں کہ قرآن کریم میں ارشادِ الہی ہے:

﴿وَيُنزِلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً لِّيُطَهِّرَ كُمْ بِهِ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ وَلِيَرْبِطَ عَلَى قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْأَقْدَامَ﴾ [الأنفال: ۱۱]

”اور تم پر آسمان سے پانی برسا دیا، تاکہ تمہیں اُس سے (نہلا کر) پاک کر دے اور شیطانی نجاست کو تم سے دور کر دے اور اس لیے بھی کہ تمہارے دلوں کو مضبوط کر دے اور اس سے تمہارے پاؤں جمائے رکھے۔“

یہ آیت پہلے معرکہ حنق و باطل غزوہ بدر کے وقائع پر مشتمل ہے، جس کے الفاظ ﴿وَيُنزِلُ عَلَيْكُمْ﴾

مِنَ السَّمَاءِ مَاءً لَيَطْهَرُكُمْ بِهِ ﴿﴾ میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ آسمان سے برسنے والا پانی طاہر و پاک ہے اور مطہر بھی ہے، یعنی جس سے دوسری اشیا بھی پاک کی جاسکتی ہیں۔
سورة الفرقان میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَهُورًا ﴿۴۸﴾ لِنُحْيِيَ بِهِ بَلْدَةً مَّيْتًا وَنُسْقِيَهُ مِمَّا خَلَقْنَا أَنْعَامًا وَأَنْآسِيَ كَثِيرًا ﴿۴۹﴾﴾ [الفرقان: ۴۸، ۴۹]

”اور ہم آسمان سے پاک (اور شفاف) پانی برساتے ہیں، تاکہ اس سے شہر مردہ (زمین افتادہ) کو زندہ کر دیں اور پھر ہم اسے بہت سے چوپایوں اور آدمیوں کو جو ہم نے پیدا کیے ہیں، پلاتے ہیں۔“

ان کلمات کا مفہوم بڑا واضح ہے کہ آسمان سے نازل ہونے والا ہر شکل کا پانی طاہر و مطہر ہے، کیوں کہ لفظ ”طہور“ محض پاک کو نہیں، بلکہ پاک کرنے والی چیز کہا جاتا ہے، جیسا کہ تفسیر ولغت اور شروح حدیث کی کتب میں مذکور ہے۔^①

اسی طرح نبی کریم ﷺ کی ایک دعاے استفتاح کے الفاظ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بارش، برف اور اولوں سے حاصل شدہ پانی طاہر و مطہر ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داؤد و نسائی و ابن ماجہ، مسند احمد و ابی عوانہ اور سنن دارمی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نماز کی تکبیر تحریمہ کہنے کے بعد قراءت سے پہلے کچھ دیر خاموش رہتے۔ میں نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، آپ تکبیر اور قراءت کے درمیان سکوت میں کیا پڑھتے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: میں یہ دعا کرتا ہوں:

«اللَّهُمَّ بَاعِدْ بَيْنِي وَبَيْنَ خَطَايَايَ كَمَا بَاعَدْتَ بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ، اللَّهُمَّ نَقِّنِي مِنَ الْخَطَايَا كَمَا يَنْقِي الثُّوبُ الْأَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ، اللَّهُمَّ اغْسِلْ خَطَايَايَ بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ»^②

① دیکھیں: تفسیر القرطبي (۷/ ۳۹) زاد المسير لابن الجوزي (۶/ ۹۴) نيل الأوطار (۱/ ۱۴- ۱۶) مختار الصحاح (ص: ۳۹۹)

② صحيح البخاري مع الفتح (۲/ ۲۲۷) صحيح مسلم (۵/ ۹۶) المطبعة المصرية) سنن أبي داود، رقم الحديث (۷۸۱) و صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (۸۶۰) إرواء الغليل (۱/ ۴۱، ۴۲)

”اے اللہ! مجھ میں اور میری خطاؤں میں اتنی دوری کر دے، جتنی دوری تو نے مشرق و مغرب کے مابین کی ہے۔ اے اللہ! مجھے خطاؤں سے اس طرح پاک کر دے، جیسے سفید کپڑا میل سے پاک کیا جاتا ہے۔ اے اللہ! مجھ سے میری خطاؤں کو پانی، برف اور اولوں سے دھو دے۔“

اس دعائے نبوی ﷺ کے آخری کلمات بارش، اولوں اور برف سے حاصل ہونے والے پانی کے طاہر و مطہر ہونے کی واضح دلیل ہیں۔ اس حدیث میں مذکور اس دعا کے الفاظ کتنے پیارے ہیں! ہمیں بھی چاہیے کہ ”سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ“ کے ساتھ ساتھ اپنی نمازوں میں یہ دعا بھی کرتے رہیں، جس میں ثنا کے علاوہ خطاؤں سے طہارت کی دعا بھی شامل ہے۔

دوسری قسم:

مطلق پانی کے تحت آنے والی دوسری قسم سمندر کا پانی ہے اور اسی کے حکم میں دریا اور نہروں کا پانی بھی آجاتا ہے۔ ایسے پانی کے طاہر و مطہر ہونے کی دلیل نبی اکرم ﷺ کا وہ ارشاد گرامی ہے، جو سنن ابو داؤد و ترمذی و نسائی و ابن ماجہ، مسند احمد، موطا امام مالک، صحیح ابن خزیمہ و ابن حبان کے ساتھ ساتھ مستدرک حاکم، سنن دارقطنی، مصنف ابن ابی شیبہ اور سنن داری میں مذکور ہے اور اس حدیث کو کبار ائمہ حدیث میں سے امام بخاری، ترمذی، حاکم، ابن حبان اور ابن المنذر اور اسی طرح امام طحاوی، بغوی، خطابی، ابن مندہ اور دیگر کثیر محدثین کرام رحمہم اللہ نے صحیح قرار دیا ہے۔^(۱)

اس حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ کسی شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا:

«إِنَّا نَزَكَبُ الْبَحْرَ وَنَحْمِلُ مَعَنَا الْقَلِيلَ مِنَ الْمَاءِ فَإِنْ تَوَضَّأْنَا بِهِ عَطِشْنَا، أَفَنَتَوَضَّأُ بِمَاءِ الْبَحْرِ؟»

”ہم سمندر کا سفر کرتے ہیں اور اپنے ساتھ تھوڑا سا پانی لے جاتے ہیں۔ پس ہم اگر اس پانی سے وضو کریں تو خود پیا سے رہ جائیں۔ کیا ہم سمندر کے پانی سے وضو کر لیا کریں؟“

اس پر نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۱) إرواء الغلیل (۱/ ۴۳)

«هُوَ الطَّهُورُ مَاؤُهُ، الْحِلُّ مِيتَتُهُ»^(۱)

”سمندر کا پانی پاک و طاہر اور مطہر ہے اور اس کا مردہ حلال ہے۔“

اس حدیث میں جہاں مذکورہ پانی کے طاہر و مطہر ہونے کا ثبوت ہے، وہیں بظاہر تمام بحری جانوروں کے حلال ہونے کا بھی پتا چلتا ہے، جیسا کہ شافعیہ کا مسلک ہے۔ البتہ یہ ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے، جس کی تفصیل تو کسی دوسرے موقع پر آئے گی، لیکن یہاں صرف اتنا ذہن میں رکھیں کہ مچھلی جو بحری جانوروں میں سے ہے، وہ زندہ شکار کی جائے تو بھی اسے ذبح کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی اور اگر وہ بے جان حالت میں ہاتھ لگے تو بھی وہ بہر حال پاک و حلال ہے۔ اس حدیث کے الفاظ کہ ”سمندر کا مردہ بھی حلال ہے۔“ ان میں اس مچھلی کی طرف بھی اشارہ ہے۔ یوں حدیث شریف کے مذکورہ الفاظ کا مفہوم بھی بہ آسانی سمجھ میں آجاتا ہے۔

تیسری قسم:

مطلق و عام یا طاہر و مطہر پانی کے تحت آنے والی تیسری قسم آب زمزم ہے، اس تیسری قسم کے پانی (آب زمزم) کو تو صرف پاک و طاہر اور مطہر کہنا ہی کافی نہیں، بلکہ اس کے برعکس آب زمزم تو بڑے فضائل و برکات والا پانی ہے۔

﴿۱﴾ جیسا کہ کتب حدیث میں سے مسند احمد میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«صَبَّ مَاءٌ زَمَزَمَ عَلَيَّ رَأْسِي»^(۲)

”آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آب زمزم اپنے سر مبارک پر بھی ڈالا۔“

﴿۲﴾ اسی آب زمزم کے بارے میں سنن ابن ماجہ، مسند احمد اور سنن بیہقی میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«مَاءٌ زَمَزَمَ لِمَا شَرِبَ لَهُ»^(۳)

﴿۱﴾ حوالہ جات سابقہ۔ نیز دیکھیں: صحیح سنن أبي داود، رقم الحديث (۷۶) و صحیح سنن الترمذی، رقم

الحديث (۵۹) و صحیح سنن النسائی، رقم الحديث (۳۲۱) و سنن ابن ماجہ، رقم الحديث (۱۸۶)

الموطأ مع شرحه المسوی (۹۳/۱) المنتقى مع النيل (۱۴/۱/۱) الفتح الرباني (۲۰۱/۱)

﴿۲﴾ مسند أحمد، الفتح الرباني (۲۰۳/۱، ۷۲/۱۲)

﴿۳﴾ حسنه الحافظ ابن حجر، و صححه المنذري والدمياطي، كما في الحاوي للفتاوى للسيوطي (۱/)

(۲۵۳) و صححه الألباني في الإرواء (ص: ۱۲۳) و السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (۸۸۳)

”آب زمزم ہر اس مرض و غرض کے لیے مفید ہے، جس کی نیت کے لیے یہ پیا جائے۔“
 [3] نیز صحیح مسلم، مسند ابو داؤد طیالسی، مسند احمد، مسند بزار اور معجم طبرانی صغیر میں نبی اکرم ﷺ کا
 ارشاد ہے:

«إِنَّهَا لَمُبَارَكَةٌ، وَهِيَ طَعَامٌ طُعِمَ، وَشِفَاءٌ سُقِمَ»^①

”یہ بڑا بابرکت پانی ہے۔ یہ بھوکے کے لیے غذا کا کام دیتا ہے اور یہ بیماری سے شفا کا
 موجب ہے۔“

صحیح مسلم (باب فضائل ابی ذرؓ) اور مسند احمد (۵/ ۱۷۵) میں بھی یہ حدیث تو موجود ہے، البتہ
 ان دونوں میں صرف «شِفَاءٌ سُقِمَ» کے الفاظ نہیں ہیں۔

[4] اسی حدیث میں ارشاد نبوی ﷺ کے یہ الفاظ بھی مروی ہیں:

«خَيْرُ مَاءٍ عَلَى وَجْهِ الْأَرْضِ مَاءٌ زَمَزَمٌ»^②

”یہ آب زمزم روئے زمین کا سب سے عمدہ اور افضل پانی ہے۔“

[5] زوائد احمد اور مسند احمد میں حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے آب زمزم کا ڈول
 منگوا یا:

«فَشَرِبَ مِنْهُ وَتَوَضَّأَ»^③ ”آپ ﷺ نے اس سے پیا اور وضو بھی فرمایا۔“

اہل علم اور خصوصاً علامہ ابن قیمؒ نے ”زاد المعاد“ میں آب زمزم کے فضائل و برکات
 کے ساتھ ساتھ اس کے کئی مادی و باطنی فوائد بھی ذکر کیے ہیں، جن کی تفصیل ”زاد المعاد“ کی تحقیق
 والی طباعت (۴/ ۳۹۳، ۳۹۴) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

[5] آب زمزم کے فضائل و برکات اور فوائد و خواص کی اہمیت کا اندازہ تو اسی بات سے ہو جاتا ہے کہ
 ”تاریخ کبیر امام بخاری“ (۳/ ۱۸۹) سنن ترمذی، رقم الحدیث (۹۶۳) مستدرک حاکم (۱/ ۲۸۵)
 سنن بیہقی (۵/ ۲۰۲) اور مسند ابی یعلیٰ (۲۹۲) میں حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے:
 ”نبی اکرم ﷺ آب زمزم کے مشکیزے بھر بھر کر ساتھ لے جایا کرتے تھے اور مریضوں

① صحیح الجامع الصغیر (۱/ ۴۷۸) رقم الحدیث (۲۴۳۰)

② صحیح الجامع، رقم الحدیث (۳۳۲۲)

③ فقہ السنة (۱/ ۱۸) الإرواء (۱/ ۴۵) وحسنہ الألبانی و صححہ أحمد شاکر فی تحقیق المسند.

کو پلاتے اور ان پر چھڑکا کرتے تھے۔“

﴿7﴾ سنن کبریٰ بیہقی (۲۰۲/۵) اور مصنف عبدالرزاق، رقم الحدیث (۹۱۲۷) میں مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے تو تاکید فرمائی تھی:

«إِهْدِ لَنَا مِنْ مَاءٍ زَمَزَمَ وَلَا تَتْرُكْ فَيَبْعَثُ إِلَيْهِ بِمَزَادَتَيْنِ»

”ہمیں آب زمزم کا ہدیہ بھیجتے رہو اور یہ سلسلہ ترک نہ کرو اور وہ آپ کو (ہر مرتبہ) دو مشکیزے بھر کر بھیجا کرتے تھے۔“

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ سلف صالحین اپنے ساتھ آب زمزم لے جایا کرتے تھے۔^①

جیسا کہ آج تک حجاج کرام اپنے ساتھ پانی لاتے ہیں۔ البتہ یہ جو حجاج کرام اپنے لیے کفن کا کپڑا آب زمزم میں تر کر کے لاتے ہیں اور کرنسی کے سکے بھگو کر لاتے ہیں اور سمجھا جاتا ہے کہ اس طرح برکت حاصل ہوگی اور نجات حاصل ہو جائے گی، تو یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، خلفا و صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رضی اللہ عنہم کسی سے بھی ثابت نہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فعل بے کار اور بدعت ہے۔^② ویسے بھی مال و دولت میں برکت دینا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور اگر عقائد و اعمال درست نہ ہوئے تو آب زمزم میں بھیگا کفن ذریعہ نجات نہیں بن سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ضرور بتا جاتے اور پھر عبداللہ بن ابی کا واقعہ مشہور ہے۔ صحیح بخاری میں ہے:

”اسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کرتہ مبارک بطور کفن پہنایا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نماز جنازہ پڑھانے کی تیاری بھی کر لی اور حضرت عمر فاروق نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا جنازہ نہ پڑھانے کا مشورہ بھی دیا، مگر پھر بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا جنازہ پڑھایا اور اس کی تدفین میں شرکت فرمائی، مگر اس کی نجات نہ ہو سکی، حتیٰ کہ قرآن حکیم کی آیات نازل ہو گئیں کہ اس شخص کی مغفرت نہیں ہوگی۔ چاہے آپ ستر مرتبہ اس کا جنازہ پڑھائیں، کیونکہ اس کے عقائد و اعمال درست نہ تھے۔“

① المناسک للآلبانی (ص: ۴۲)

② السنن و المبتدعات (ص: ۱۱۳) حجة النبی صلی اللہ علیہ وسلم للآلبانی (ص: ۱۱۹)

اس واقعے کی تفصیلات مطلوب ہوں تو تفسیر کی کتابوں میں سورۃ التوبہ (آیت: ۸ تا ۸۴) کی تفسیر دیکھ لیں اور پھر اندازہ فرمائیں تو کفن بھگو کر لانے کی حقیقت خود بہ خود واضح ہو جائے گی۔^(۱)

چوتھی قسم:

طاہر و مطہر، مطلق پانی کی چوتھی قسم سے مراد وہ پانی ہے، جو کسی جگہ دیر تک ٹھہرا رہے اور اس کے تادیر ٹھہرے رہنے اور درختوں کے پتوں اور کائی و مٹی وغیرہ کے اثرات سے اس کے رنگ میں بھی تغیر واقع ہو جائے، مگر اس میں کوئی نجاست و گندگی نہ پڑی ہو تو وہ پانی بھی پاک و طاہر اور مطہر ہی رہے گا۔ علامہ ابن رشد رحمۃ اللہ علیہ نے ایسے پانی کے طاہر و مطہر ہونے پر اہل علم کا اتفاق نقل کیا ہے اور اسی بات کا اظہار امام ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ نے ”المغنی“ میں کیا ہے۔^(۲)

نیز امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر ”الجامع لأحكام القرآن“ (۱۳ / ۷ / ۴۴) میں یہی بات ذکر کی اور لکھا ہے کہ علمائے کرام کا اس بات پر اتفاق ہے:

«فَاتَّفَقَ الْعُلَمَاءُ أَنَّ ذَلِكَ لَا يَمْنَعُ مِنَ الْوُضُوءِ بِهِ»

”یہ (درختوں کے پتوں، کائی اور مٹی وغیرہ کا پانی میں مل جانا) اس پانی سے وضو کرنے میں مانع نہیں ہے۔“

اسی سے بڑی بڑی جھیلوں اور تالابوں کے اس پانی کا حکم واضح ہو گیا، جو مدتوں ٹھہرے رہتے اور مختلف اسباب سے اس میں پتے وغیرہ گرنے اور کائی اُگ آنے سے اس کا رنگ قدرے بدل جاتا ہے۔

غیر مطلق پانی کی اقسام:

مطلق یا عام پانی کے تحت آنے والے پانی کی چار قسمیں بیان کی جا چکی ہیں، جن کے پانی کو بالاتفاق پاک و طاہر اور مطہر قرار دیا گیا ہے۔ اب آئیے مطلق پانی کی ان چار قسموں کے علاوہ غیر مطلق پانی کی چار قسموں کے بارے میں بھی باری باری شریعت اسلامیہ کا حکم معلوم کریں کہ وہ پاک ہیں یا ناپاک؟ اگر وہ پاک ہیں تو وہ محض طاہر ہیں یا مطہر بھی کہ جس سے غسل و وضو جائز ہوتا ہے؟ اس اعتبار سے اس پانی کی بھی چار ہی قسمیں ہیں۔

(۱) تفسیر ابن کثیر (۲ / ۴۱۴ تا ۴۱۶ اردو) و التجرید الصریح (۱ / ۹۴)

(۲) بدایۃ المجتہد (۱ / ۳۴ - ۳۵) المغنی (۱ / ۲۲ - ۲۳)

پہلی قسم:

وہ پانی جس میں آٹا یا صابن جیسی کسی پاک چیز کی آمیزش ہو جانے سے اس کا رنگ معمولی سا بدل جائے۔

دوسری قسم:

ان میں سے دوسری قسم کا وہ پانی ہے، جسے ایک مرتبہ وضو یا غسل کے لیے استعمال کیا جا چکا ہو، جسے ”مستعمل پانی“ کہا جاتا ہے۔

تیسری قسم:

تیسری قسم کا وہ پانی ہے، جسے کسی انسان یا حیوان نے جھوٹا کر دیا ہو۔

چوتھی قسم:

وہ پانی ہے، جس میں قلیل یا کثیر مقدار میں کوئی نجاست گر گئی ہو۔
یوں تو آج الحمد للہ تقریباً ہر جگہ وافر مقدار میں پانی میسر ہے، لہذا کسی صاف ستھرے اور غیر مشتبہ پانی کو چھوڑ کر کسی شبہ والے پانی کو استعمال کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی، مگر شریعت اسلامیہ جو نکتہ قیامت تک کے لیے اور دنیا جہان کے چپے چپے پر بسنے والے لوگوں کے لیے ہے، لہذا اس کے اصول و قواعد بھی ابدی اور عالمگیر ہیں، پھر پانی کے کثیر اور وافر ہونے کے باوجود آج بھی ایسے کئی علاقے موجود ہیں، جہاں پانی کی تنگی و قلت موجود ہے اور سفر کے دوران میں بھی کبھی اس قلت سے سامنا ہو سکتا ہے، لہذا غیر مطلق پانی کی ان چاروں اقسام کے بارے میں بھی معلومات ہونا ضروری ہے۔

1 کسی پاک چیز کی آمیزش والا پانی:

غیر مطلق پانی کی پہلی قسم وہ ہے، جس میں آٹا یا صابن وغیرہ مل گئے ہوں، جیسا کہ عموماً گھروں میں ایسا ہی ہو جاتا ہے، لہذا کسی پاک چیز کی آمیزش والے ایسے پانی کو پاک و طاهر اور مطہر قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ امام ابن قدامہ نے ”المغنی“ میں ذکر کیا ہے:
”چاروں ائمہ کرام سمیت تمام محدثین و مجتہدین اور جمہور اہل علم کا یہی مسلک ہے۔“

صرف امام زہری رحمۃ اللہ علیہ سے کچھ اختلاف منقول ہے۔ ان کے نزدیک یہ پانی پاک و طاہر ہے، مگر مطہر نہیں، یعنی اس سے غسل و وضو نہیں کیا جاسکتا۔^①

ان کا یہ مسلک جمہور اہل علم میں منفرد ہونے اور حدیث شریف کے موافق نہ ہونے کی وجہ قابل قبول نہیں، کیوں کہ صحیح بخاری و مسلم، سنن اربعہ اور دیگر کتب حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی وفات پر ان کے غسل و کفن کا واقعہ مذکور ہے، جس کے ضمن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

«إِعْسَلْنَهَا ثَلَاثًا أَوْ خَمْسًا أَوْ أَكْثَرَ مِنْ ذَلِكَ - إِنْ رَأَيْتَنَ - بِمَاءٍ وَ سِدْرٍ
وَأَجْعَلَنَّ فِي الْأَخِيرَةِ كَافُورًا أَوْ شَيْئًا مِنْ كَافُورٍ»^②

”انہیں تین مرتبہ یا پانچ مرتبہ اور اگر مناسب ہو تو اس سے بھی زیادہ مرتبہ پیری کے پتوں والے پانی سے غسل دو اور آخری مرتبہ غسل دیتے وقت پانی میں کافور بھی ملا لینا۔“

معلوم ہوا کہ کافور اور پیری کے پتوں والے پانی کا اگرچہ معمولی سارنگ بدل جاتا ہے، مگر اس کے باوجود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے طاہر و مطہر ہی قرار دیا ہے، کیوں کہ میت کو غسل صرف اسی پانی سے دیا جاسکتا ہے، جس سے زندہ آدمی کا بھی غسل و وضو کرنا صحیح ہو۔

اس کے علاوہ سنن نسائی و ابن ماجہ، صحیح ابن حبان، ابن خزیمہ، سنن بیہقی اور مسند احمد میں حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ اغْتَسَلَ هُوَ وَ مَيْمُونَةَ مِنْ إِنَاءٍ وَ أَحَدٍ (قَصْعَةٍ، وَ فِي رِوَايَةٍ:
جَفْنَةٍ) فِيهَا أَثَرُ الْعَجِينِ»^③

”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے ایک ایسے برتن والے

① المغني (١/٦٥)

② التجريد الصريح (١/٩٣) صحيح مسلم مترجم اردو (١، ٢/٣٧٩) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٦٩٤) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١٧٧٧، ١٧٧٨) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٧٨٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٤٥٨)

③ صححه الألباني في الارواء (١/٦٤) و صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٣٣٤) و صحيح سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٧٨)

پانی سے غسل کیا، جس میں آٹے کا اثر نظر آ رہا تھا۔“

ان دونوں حدیثوں میں مذکور پانی میں پاک اشیا کی ملاوٹ پائی گئی۔ اس کے باوجود نبی کریم ﷺ نے اپنے قول و عمل مبارک سے اسے مطہر قرار دیا ہے، البتہ اہل علم نے یہ شرط لگائی ہے کہ کسی پاک چیز کی آمیزش اتنی زیادہ نہ ہو کہ وہ پانی کو مطلق پانی کی حدود ہی سے نکال دے۔ ہاں، جب تک وہ مطلق پانی کی حدود میں رہے گا، طاہر و مطہر رہے گا، لیکن اگر اس کا پوری طرح رنگ ہی بدل گیا تو وہ مطلق پانی کی تعریف سے نکل جائے گا، تب وہ طاہر تو ہے مگر مطہر نہیں ہوگا اور اس سے غسل و وضو صحیح نہیں ہوگا۔ البتہ اس سے برتن اور کپڑے وغیرہ دھوئے جاسکتے ہیں۔

2 مستعمل پانی:

غیر مطلق پانی کی دوسری قسم وہ پانی ہے، جو غسل یا وضو میں ایک مرتبہ استعمال کیا جا چکا ہو۔ اسے ”مستعمل پانی“ کہا جاتا ہے۔ اس پانی کے طاہر و مطہر یا محض طاہر ہونے میں اہل علم میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض اہل علم نے ایسے پانی کو طاہر اور مطہر قرار دیا ہے کہ اس سے دوبارہ بھی غسل و وضو کیا جاسکتا ہے، جبکہ بعض دیگر اہل علم کے نزدیک مستعمل پانی طاہر تو ہے، مگر مطہر نہیں ہے۔

پہلا مسلک:

مستعمل پانی کا طاہر و مطہر ہونا مالکیہ اور ظاہریہ کا مسلک ہے۔ البتہ مالکیہ کے نزدیک دوسرے پانی کے ہوتے ہوئے مستعمل پانی سے غسل یا وضو کرنا مکروہ ہے اور مستعمل کی موجودگی میں تیمم کرنا منع ہے۔ امام حسن بصری، زہری اور ابراہیم نخعی رحمہم اللہ کا بھی یہی مسلک ہے۔

امام ابن قدامہ اور امام شوکانی رحمہم اللہ کے بقول ایسے پانی کے بارے میں امام ابو حنیفہ، امام احمد اور امام شافعی رحمہم اللہ سے دو الگ الگ روایتیں ملتی ہیں۔ ایک میں طاہر و مطہر اور دوسری میں صرف طاہر کہا گیا ہے۔ علامہ ابن حزم کے حوالے سے امام شوکانی اور یہی ابن قدامہ نے بھی لکھا ہے کہ ”امام عطاء، سفیان ثوری اور ابو ثور کا بھی یہی مسلک ہے۔“^①

مستعمل پانی کو طاہر و مطہر قرار دینے والوں کا استدلال متعدد احادیث سے ہے۔ مثلاً صحیح

① المغنی (۳۱/۱) تفسیر القرطبی (۷/۱۳/۴۸) فتح الباری (۱/۲۹۶) البدایہ (۱/۴۰) نیل الأوطار (۱/۲۳)

بخاری و مسلم، سنن ابوداؤد، دارمی، بیہقی اور مسند احمد میں حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«مَرَضْتُ فَاتَانِي النَّبِيُّ ﷺ هُوَ وَ أَبُو بَكْرٍ الصِّدِّيقُ مَاشِيَيْنِ، وَقَدْ أُعْمِيَ عَلَيَّ فَلَمْ أَكَلِمَهُ، فَتَوَضَّأَ فَصَبَّهُ عَلَيَّ فَأَفَقْتُ»^①

”میں بیمار ہو گیا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پیدل چل کر میری عیادت کے لیے تشریف لائے۔ جبکہ مجھ پر غشی طاری تھی لہذا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی بات نہ کر سکا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو فرمایا اور وضو کا پانی مجھ پر چھڑکا تو مجھے افاقہ ہو گیا۔“

یہ الفاظ مسند احمد کے ہیں، جبکہ صحیح بخاری و مسلم میں مروی ہے:

«جَاءَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَعُودُنِي وَأَنَا مَرِيضٌ لَا أَعْقِلُ، فَتَوَضَّأَ وَ صَبَّ وَضُوءَهُ عَلَيَّ»^②

”میری بیماری کی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری عیادت کے لیے تشریف لائے، جبکہ میں کوئی بات نہیں سمجھتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو فرمایا اور وضو کا پانی مجھ پر چھڑکا۔“

ایسے پانی کے طاہر و مطہر ہونے کے قائلین کا کہنا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے وضو کے پانی کا چھڑکنا اس بات کی دلیل ہے کہ مستعمل پانی طاہر و مطہر ہی ہوتا ہے۔ صحیح بخاری اور مسند احمد میں صلح حدیبیہ کا واقعہ مذکور ہے۔ راوی حدیث نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عقیدت و محبت کی تصویر کشی کرتے ہوئے متعدد امور بیان کرتے ہیں، جن میں سے ایک یہ امر بھی ہے:

«وَإِذَا تَوَضَّأَ كَادُوا يَقْتَتِلُونَ عَلَيَّ وَضُوءَهُ»^③

”جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو فرمایا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا آپ کے وضو والے پانی کو حاصل کرنے کے لیے یہ حال تھا کہ قریب تھا کہ باہم جھگڑ پڑیں۔“

مسند احمد میں ہے:

«لَا يَتَوَضَّأُ وَضُوءًا إِلَّا ابْتَدَرُوهُ»^④

① مسند أحمد، الفتح الرباني (۱/ ۲۰۹)

② صحيح البخاري مترجم أردو (۳/ ۲۹۳) الإرواء (۱/ ۵۴) نيل الأوطار (۱/ ۱۸-۱۹)

③ صحيح البخاري مع الفتح (۱/ ۲۹۴) الفتح الرباني (۱/ ۲۰۹) النيل مع المنتقى (۱/ ۱۹) الإرواء (۱/ ۵۲)

④ مسند أحمد (۴/ ۴۲۳)

”آپ ﷺ جب وضو کرتے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس پانی کو حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔“

اس مسلک کے قائلین کا کہنا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ ﷺ کے پانی کو اس شوق و محبت سے ہاتھوں ہاتھ لیتے اور اپنے جسم پر ملتے جاتے تھے، مگر آپ کا انھیں اس فعل سے روکنا ثابت نہیں ہے، جو مستعمل پانی کے طاہر و مطہر ہونے کی دلیل ہے۔

4 صحیح بخاری اور مسند احمد میں حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بِالْهَاجِرَةِ، فَأُتِيَ بِوَضُوءٍ فَتَوَضَّأَ فَجَعَلَ النَّاسُ يَأْخُذُونَ مِنْ فَضْلِ وَضُوءِهِ فَيَتَمَسَّحُونَ بِهِ»^①

”نبی مکرم ﷺ (ایک مرتبہ) دوپہر کے وقت ہمارے پاس تشریف لائے۔ آپ ﷺ کو وضو کے لیے پانی دیا گیا تو آپ ﷺ نے اس سے وضو فرمایا تو لوگ آپ ﷺ کے وضو سے گرنے والے پانی کو اٹھانے اور اسے اپنے جسموں پر ملنے لگے۔“

5 اسی موضوع کی ایک حدیث بھی صحیح بخاری میں مذکور ہے:

« دَعَا النَّبِيُّ ﷺ بِقَدَحٍ فِيهِ مَاءٌ، فَغَسَلَ يَدَيْهِ وَوَجْهَهُ وَمَجَّ فِيهِ، ثُمَّ قَالَ لَهُمَا (يَعْنِي أَبَا مُوسَى وَبِلَالًا): اشْرَبَا مِنْهُ، وَأَفْرِغَا عَلَيَّ وَجُوهَكُمَا وَنُحُورَكُمَا»^②

”نبی اکرم ﷺ نے ایک پیالہ منگوا لیا، جس میں پانی تھا۔ آپ ﷺ نے اس سے اپنے دونوں دست مبارک اور چہرہ اقدس کو دھویا اور کلی کا پانی بھی اسی میں ڈالا، پھر آپ ﷺ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری اور حضرت بلال رضی اللہ عنہما کو حکم فرمایا: اس پانی کو پیو اور اپنے چہروں اور گلوں پر بھی ڈال لو۔“

6 نیز صحیح بخاری (۲۹۶/۱) ہی میں مروی ہے کہ حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

« ذَهَبَتْ بِي خَالَتِي إِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ! إِنَّ ابْنَ

① صحیح البخاری مع الفتح (۲۹۲/۱) الفتح الرباني (۲۰۹/۱) و النيل (۱۹/۱)

② صحیح البخاری مع الفتح (۲۹۵/۱)

اِخْتَبَى وَجَعَ فَمَسَحَ رَأْسِي وَدَعَا لِي بِالْبَرَكَةِ، ثُمَّ تَوَضَّأَ فَشَرِبْتُ مِنْ وُضُوئِهِ»
 ”مجھے میری خالہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے گئیں اور اس نے کہا: اے اللہ کے
 رسول (ﷺ)! میرا یہ بھانجا بیمار ہو گیا ہے، تو آپ ﷺ نے میرے سر پر اپنے دست
 مبارک کو پھیرا اور میرے لیے برکت کی دعا فرمائی، پھر آپ نے وضو فرمایا، تو میں نے
 آپ ﷺ کے وضو والے پانی سے پانی پیا۔“

7 سنن ابو داود، ترمذی، ابن ماجہ اور مسند احمد میں مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی کسی زوجہ محترمہ

نے آپ کے سامنے وضو کے لیے پانی کا برتن رکھا اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا:

«إِنِّي غَمَسْتُ يَدِي فِيهَا، وَأَنَا جُنُبٌ»

”میں نے بہ حالت جنابت اس پانی میں اپنا ہاتھ ڈبویا ہے۔“

تب آپ ﷺ نے فرمایا:

«الْمَاءُ لَا يَجُنُبُ»^① ”پانی جنبی نہیں ہوتا۔“

نیز مسند احمد میں ہے:

«الْمَاءُ لَا يَنْجُسُ» ”پانی نجس نہیں ہوتا۔“

8 ایسے ہی ایک روایت، جو ضعیف ہے، سنن ابن ماجہ، دارقطنی اور مسند احمد میں مذکور ہے کہ

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

«إِعْتَسَلَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مِنْ جَنَابِيهِ، فَلَمَّا خَرَجَ رَأَى لَمْعَةً عَلَى مَنْكِبِهِ

الْأَيْسَرِ لَمْ يُصِبْهَا الْمَاءُ، فَأَخَذَ مِنْ شَعْرِهِ فَبَلَّهَا ثُمَّ مَضَى إِلَى الصَّلَاةِ»^②

”نبی ﷺ نے غسل جنابت فرمایا۔ جب آپ ﷺ غسل فرما کر نکلے تو دیکھا کہ

آپ ﷺ کے بائیں کندھے پر تھوڑی سی جگہ خشک رہ گئی ہے۔ آپ نے اپنی زلفوں کو

نچوڑا اور اس پانی سے اس جگہ کو گیلایا اور پھر نماز کے لیے چل دیے۔“

① صحیح سنن أبي داود (١٦/١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٧٠) سنن الترمذی، رقم الحديث (٦٥)

المغني (٣١/١، ٣٣) النيل و المنتقى (٢٦/١) صحیح الجامع، رقم الحديث (١٩٢٧)

② الفتح الرباني (١٣٨/٢) و المغني أيضاً.

یہ آخری حدیث تو ضعیف ہے، لہذا قابل استدلال نہیں اور پہلی صحیح احادیث میں غسل یا وضو میں استعمال ہونے والے پانی سے دوبارہ وضو کر لینے کی صراحت ہی نہیں ہے، بلکہ صراحت صرف اس بات کی ہے کہ وہ پانی پاک ہے، نجس نہیں، یعنی طاہر ہے۔ البتہ اس کے مطہر (دوسرے کو پاک کرنے والا) ہونے کا واضح ثبوت نہیں۔ پھر مذکورہ واقعات میں سے سوائے ایک زوجہ محترمہ کے ہاتھ ڈبونے والے واقعے کے، سب کے سب نبی اکرم ﷺ کی ذات اقدس سے تعلق رکھتے ہیں، اگرچہ صریح دلیل نہ ہونے کی وجہ سے اس معاملے کو خصائصِ مصطفیٰ ﷺ میں سے تو شمار نہیں کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے۔^①

دوسرا مسلک:

بعض دیگر احادیث میں نبی اکرم ﷺ نے ایسے پانی سے غسل و وضو کرنے سے منع فرمایا ہے، جس سے ایک مرتبہ غسل یا وضو کیا جا چکا ہو، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا پانی خود تو طاہر ہے، لیکن مطہر نہیں۔ یہ عام ائمہ اور علمائے احناف، اسی طرح حنابلہ اور شافعیہ کا مسلک ہے۔ امام لیث رحمۃ اللہ علیہ، اوزاعی، مشہور مذہب کے مطابق امام ابو حنیفہ، ظاہری مذہب، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، ایک روایت کے مطابق امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا بھی مسلک یہی ہے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے معروف روایت میں یہی مسلک منقول ہے۔^② اس مسلک والوں کا استدلال بھی متعدد صحیح احادیث سے ہے۔

① ان کی پہلی دلیل وہ حدیث ہے، جو صحیح بخاری و مسلم، سنن ابی داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور سنن داری میں مروی ہے، جس میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«لَا يَغْتَسِلُ أَحَدُكُمْ فِي الْمَاءِ الدَّائِمِ وَهُوَ جُنْبٌ، فَقَالَ: كَيْفَ يَفْعَلُ يَا أَبَا هُرَيْرَةَ؟ قَالَ: يَتَنَاوَلُهُ تَنَاوُلًا»^③

① نیل الأوطار (۲۰/۱)

② المغني (۳۱/۱) البداية لابن رشيد (۴۰/۱) مؤسسہ ناصر و نیل الأوطار (۲۲/۱-۲۳)

③ صحیح مسلم مع شرحہ للنووي (۱/۳-۱۸۸-۱۸۹ واللفظ لہ) صحیح البخاری مع الفتح، رقم الحدیث (۲۳۹) صحیح سنن ابی داؤد (۱/۱۶) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۲۱۵) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۵۸) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۳۴۴) مشکاة المصابیح (۱/۱۴۸) صحیح الجامع رقم الحدیث (۷۷۳۵)

”تم میں سے کوئی جب جنابت کی حالت میں ہو تو کھڑے پانی میں (داخل ہو کر) غسل نہ کرے۔ سننے والے لوگوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ (راوی حدیث) سے پوچھا: اے ابو ہریرہ! تو پھر وہ آدمی کیسے نہائے؟ تب انھوں نے طریقہ بتاتے ہوئے فرمایا: وہ پانی میں سے (چلو وغیرہ بھر کر) نکالے (اور باہر بیٹھ کر نہائے)۔“

② سنن ابی داؤد اور مسند احمد کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

«لَا يَبُولَنَّ أَحَدَكُمْ فِي الْمَاءِ الدَّائِمِ وَلَا يَغْتَسِلُ فِيهِ مِنَ الْجَنَابَةِ»^①

”تم میں سے کوئی شخص کھڑے پانی میں ہرگز پیشاب نہ کرے اور نہ اس میں جنابت کی حالت میں غسل کرے۔“

یہاں کھڑے پانی میں غسل جنابت سے روکا گیا ہے، جس سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ غسل جنابت سے چونکہ وہ پانی خراب ہو جاتا ہے اور دوسرے کے غسل و وضو کے قابل نہیں رہتا، بلکہ خود ایسے آدمی کو طہارت کا فائدہ نہیں دے گا، کیوں کہ اس کے پانی میں داخل ہوتے ہی وہ پانی اپنی طہوریت کھو دے گا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے پانی سے غسل جنابت سے منع فرمایا ہے، اسی حدیث کی بنا پر امام ابو یوسف اور ایک غیر معروف بلکہ متروک روایت میں امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ نے مستعمل پانی کو نجس قرار دیا ہے۔^②

غالباً امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ نے تو اس رائے سے رجوع کر لیا تھا اور صرف امام ابو یوسف اکیلے ہی اس کے قائل رہ گئے تھے، یہی وجہ ہے کہ علامہ ابن رشد نے ”بداية المجتهد“ میں یہ رائے امام ابو یوسف کی طرف منسوب کرتے ہوئے لکھا ہے:

«شَدَّ أَبُو يُوسُفَ... فَقَالَ: إِنَّهُ نَجِسٌ»^③

”امام ابو یوسف ایسے پانی کی نجاست کی رائے میں شاذ اور تہارہ گئے ہیں۔“

اختلاف اس کے مطہر ہونے میں ہے کہ اس سے صرف غسل وضو نہیں کیا جاسکتا اور دوسرے

① صحیح سنن ابی داؤد (۱۶/۱) رقم الحدیث (۶۳) صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (۵۷) المتتقی

مع النیل (۲۲/۱) صحیح الجامع، رقم الحدیث (۷۵۹۰)

② المغنی (۲۲/۱)

③ بداية المجتهد (۴۰/۱)

استعمال میں لایا جاسکتا ہے، کیوں کہ وہ پلید و نجس نہیں ہوتا، جیسا کہ پہلے مسلک کے دلائل کے طور پر ذکر کی گئی احادیث سے معلوم و واضح ہوتا ہے۔ نیز اگر مستعمل پانی نجس و پلید ہو جاتا تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ نبی اکرم ﷺ اور صحابہ و صحابیات رضی اللہ عنہم بڑے بڑے پیالوں اور ڈبوں وغیرہ سے وضو کرتے، کیوں کہ اس طرح یقیناً مستعمل پانی کے چھینٹے تو پانی کے بڑے برتن میں گر جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابراہیم نخعی رضی اللہ عنہ (استاذ امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ) کا ارشاد ہے:

«وَلَا بُدَّ... مِنْ ذَلِكَ»^① ”اس کے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔“

الغرض صحاح و سنن کی مذکورہ حدیث سے یہ دلیل لی گئی ہے کہ مستعمل پانی خود تو پاک رہ جاتا ہے، مگر اس میں غسل و وضو کے لیے پاک کرنے کی صلاحیت نہیں رہتی، اسی لیے نبی اکرم ﷺ نے کھڑے پانی میں (خصوصاً جب کہ وہ کم مقدار میں ہو) غسل جنابت کرنے سے منع فرمایا ہے۔

مرد وزن کا اکٹھے غسل اور وضو کرنا:

اسی مسلک کی دوسری دلیل وہ حدیث ہے، جو سنن اربعہ یعنی سنن ابی داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور مسند احمد و مسند ابوداؤد طیالسی میں مروی ہے، جس میں حضرت حکم بن عمرو غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

﴿أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نَهَى أَنْ يَتَوَضَّأَ الرَّجُلُ بِفَضْلِ طَهُورِ الْمَرْأَةِ﴾^②

”نبی اکرم ﷺ نے عورت کے وضو سے بچے ہوئے پانی سے مرد کو وضو کرنے سے منع

کیا ہے۔“

﴿سنن نسائی و ابن ماجہ میں «طَهُورِ الْمَرْأَةِ» کے بجائے «وَضُوءِ الْمَرْأَةِ» کے الفاظ ہیں، دونوں حدیثوں کا ایک ہی ہے۔^③

اس حدیث سے یوں دلیل لی گئی ہے کہ عورت کے وضو کرنے سے چونکہ وہ پانی مستعمل ہو جاتا ہے اور مطہر ہونے کی صلاحیت کھو دیتا ہے، اس لیے آپ ﷺ نے ایسے مستعمل پانی کے ساتھ

① المغنی (۲۳/۱)

② سنن أبی داؤد، رقم الحدیث (۸۲) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۵۴) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۳۷۳)

③ الفتح الربانی (۲۱۱/۱) المنتقی مع النیل (۲۵/۱) حسنه الترمذی و صححه الألبانی فی الإرواء (۴۳-۴۴)

وضو کرنے سے منع فرمادیا۔

❖ ایک تیسری حدیث سنن ابی داؤد و نسائی، مسند احمد اور سنن بیہقی میں مروی ہے، جس میں نبی اکرم ﷺ کی صحبت میں چار سال رہنے والے ایک صحابی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے روزانہ کنگی کرنے اور غسل خانے میں پیشاب کرنے سے منع کیا اور ارشاد فرمایا ہے:

«وَأَنْ تَغْتَسِلَ الْمَرْأَةُ بِفَضْلِ الرَّجُلِ، وَأَنْ يَغْتَسِلَ الرَّجُلُ بِفَضْلِ الْمَرْأَةِ، وَلِيُغْتَرِفَا جَمِيعًا»^①

”اور عورت کو مرد کے اور مرد کو عورت کے بچے ہوئے پانی سے غسل کرنے سے بھی منع فرمایا اور چاہیے کہ میاں بیوی اکٹھے غسل کر لیں۔“

یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ غسل خانے میں پیشاب اس وقت منع ہے، جبکہ وہ صرف غسل کے لیے ہو اور پانی کی نکاسی کا خاص انتظام نہ ہو، لیکن اگر موجودہ حماموں یا باتھ رومز کی طرح وہاں پیشاب، پاخانے اور غسل کے لیے الگ مخصوص جگہ بنی ہو تو وہاں پیشاب سے چھینٹوں کا کوئی احتمال نہیں رہتا، لہذا پیشاب کیا جاسکتا ہے اور جمہور فقہاء کے نزدیک یہ جائز ہے۔^②

ایسے ہی مستعمل پانی طاہر، لیکن غیر مطہر ہونے کے بعض دیگر قیاسی قسم کے دلائل بھی نقل کیے گئے ہیں۔^③

ان مذکورہ بالا احادیث سے تو استدلال بھی تب درست ہوتا، جب یہ کوئی زیر بحث مسئلے میں فیصلہ کن ہوتیں، حالانکہ اس کے برعکس صحیح مسلم اور مسند احمد میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

❶ «كَانَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَغْتَسِلُ بِفَضْلِ مَيْمُونَةَ»^④

”رسول اللہ ﷺ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے غسل سے بچے پانی سے غسل فرماتے تھے۔“

❷ سنن ابن ماجہ اور مسند احمد میں خود حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے طریق سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

① سنن ابی داؤد، رقم الحدیث (۸۱) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۲۳۲) الفتح الربانی (۲۱۰/۱)

② تہذیب معالم السنن لابن القیم علی عون المعبود (۱۱۸/۱) و غایة المقصود أيضاً.

③ دیکھیں: نیل الأوطار (۲۳/۱)

④ صحیح مسلم مع شرحہ النووی (۶/۴ - ۷) الفتح الربانی (۲۱۲/۱) المنتقى مع النيل (۲۶/۱)

«إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ تَوَضَّأَ بِفَضْلِ غُسْلِهَا مِنَ الْجَنَابَةِ»^①

”رسول اللہ ﷺ نے ان کے غسلِ جنابت سے بچے ہوئے پانی سے وضو فرمایا۔“

اسی طرح اس سلسلے میں تیسری حدیث بھی ہے پہلے بھی گزر چکی ہے۔

۳] نبی کریم ﷺ کی کسی زوجہ محترمہ رضی اللہ عنہا نے ایک ٹب والے پانی سے غسل کیا۔ پھر نبی اکرم ﷺ

اس سے غسل یا وضو کرنے لگے تو انھوں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول ﷺ! میں جنابت سے تھی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ الْمَاءَ لَا يَجْنُبُ» ”بے شک پانی جنبی نہیں ہوتا۔“

۴] نیز صحیح بخاری و مسلم میں مروی ہے:

«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ وَ مَيْمُونَةَ كَانَا يَغْتَسِلَانِ مِنْ إِنَاءٍ وَاحِدٍ»^②

”نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کی زوجہ محترمہ ام المومنین حضرت ميمونه رضی اللہ عنہا ایک ہی برتن

سے غسل کیا کرتے تھے۔“

۵] نبی اکرم ﷺ کی دوسری زوجہ محترمہ ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا بیان صحیح بخاری و مسلم اور

دیگر کتب حدیث میں منقول ہے:

«كُنْتُ أَعْتَسِلُ أَنَا وَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مِنْ إِنَاءٍ وَاحِدٍ مِنَ الْجَنَابَةِ»^③

”میں اور رسول اللہ ﷺ ایک ہی برتن سے غسلِ جنابت کیا کرتے تھے۔“

۶] آپ ﷺ کی ایک اور زوجہ محترمہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا بیان بھی صحیح بخاری

و مسلم اور دیگر کتب حدیث میں مروی ہے، جس میں وہ فرماتی ہیں:

«كُنْتُ أَعْتَسِلُ أَنَا وَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مِنْ إِنَاءٍ وَاحِدٍ تَخْتَلِفُ أَيْدِينَا فِيهِ مِنَ

الْجَنَابَةِ»^④

”میں اور رسول اللہ ﷺ ایک ہی برتن سے (بیک وقت) غسلِ جنابت کیا کرتے تھے،

① سنن ابن ماجہ رقم الحدیث (۳۷۲)

② صحیح البخاری مترجم (۲۰۱/۱) و مسلم مع شرح النووی (۶/۴) نیل الأوطار (۲۶/۱)

③ صحیح مسلم مع شرح النووی (۷/۴/۲) نیل الأوطار (۲۷/۱)

④ صحیح مسلم (۶/۴/۲)

حتیٰ کہ ہمارے ہاتھ (پانی لیتے ہوئے) ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے تھے۔“
ایک ہی برتن سے ایک ہی وقت میں اکٹھے بیٹھ کر غسل کرنے کی وضاحت و صراحت بھی
موجود ہے، چنانچہ اسی حدیث میں بخاری شریف کے الفاظ بھی موجود ہیں:

«مِنْ اِنَاءٍ وَاحِدٍ نَغْتَرِفُ مِنْهُ جَمِيعًا»

”ہم اکٹھے ہی ایک برتن سے پانی کے چلو لیتے تھے۔“

صحیح مسلم میں تو اور بھی صراحت ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں:

«مِنْ اِنَاءٍ بَيْنِي وَبَيْنَهُ وَاحِدٍ فَيَبَادِرُنِي حَتَّى اَقُولَ: دَع لِي دَع لِي»^①

”ایک ہی برتن سے جو میرے اور آپ ﷺ کے درمیان پڑا ہوتا تھا اور آپ ﷺ جلدی
پانی لیتے جاتے، حتیٰ میں کہتی: میرے لیے بھی چھوڑ دیں، میرے لیے بھی چھوڑ دیں۔“

سنن نسائی شریف میں مروی ہے:

«مِنْ اِنَاءٍ وَاحِدٍ يَبَادِرُنِي وَابَادِرُهُ حَتَّى يَقُولَ: دَع لِي، وَ اَنَا اَقُولُ: دَع لِي»^②

”ایک ہی برتن سے ہم نہاتے اور ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے،
حتیٰ آپ ﷺ فرماتے، میرے لیے بھی پانی چھوڑ دو اور میں عرض کرتی کہ میرے لیے
بھی پانی چھوڑ دیں۔“

یہ تو نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے بارے میں احادیث ہیں، جب
کہ بعض دیگر احادیث میں عام مردوں اور عورتوں کا بھی ایک برتن سے اکٹھے وضو کرنا ثابت ہے، مگر
ان احادیث کو اہل علم نے نزولِ حجاب یعنی پردے کا حکم نازل ہونے سے پہلے کے زمانے کے ساتھ
خاص کیا ہے۔ البتہ محرم مردوزن کے لیے یہ حکم مطلق ہے۔

④ چنانچہ سنن ابی داؤد میں قبیلہ بنی جہینہ کی ایک صحابیہ حضرت امّ حدیہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

«اِخْتَلَفْتُ يَدِي وَيَدُ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ مِنْ اِنَاءٍ وَاحِدٍ»^③

”ایک برتن سے وضو کرتے ہوئے میرے اور رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ باہم چھو گئے۔“

① صحیح مسلم مع شرح النووی (۶/۴/۲)

② صحیح سنن النسائي، رقم الحديث (۲۳۳) نیل الأوطار (۱/۲۷)

③ نیل الأوطار (۱/۲۷) صحیح سنن أبی داؤد، رقم الحديث (۷۱)

سنن ابی داود ہی کی دوسری حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

«كَانَ الرَّجَالُ وَالنِّسَاءُ يَتَوَضَّؤُونَ فِي زَمَانِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ (قَالَ مُسَدَّدٌ) مِنْ الْإِنَاءِ الْوَاحِدِ جَمِيعًا»^①

”نبی اکرم کے زمانے میں مرد اور عورتیں وضو کیا کرتے تھے اور ایک راوی حدیث مسدّد نے وضاحت کی ہے کہ سب اکٹھے ایک ہی برتن سے کرتے تھے۔“

ان آخری دو حدیثوں کے حکم کو نزولِ حجاب سے پہلے کے زمانے کے ساتھ خاص کیا گیا ہے اور حکم حجاب کے بعد یہ میاں بیوی کے لیے مطلق ہے۔

ان مذکورہ احادیث کے پیش نظر اہل علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ میاں بیوی دونوں اکٹھے ایک ہی برتن سے غسل و وضو کر سکتے ہیں۔^②

فتح الباری (۱/۳۶۴) میں حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے داودی کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ وہ اکٹھے غسل والی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میاں بیوی ایک دوسرے کی شرم گاہ کو دیکھ سکتے ہیں اور اس بات کی تائید صحیح ابن حبان کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے، جس میں مشہور فقیہ و عالم اور معروف تابعی امام عطاء اللہ رحمۃ اللہ علیہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس سلسلہ میں پوچھتے ہیں، تو ان کے جواب میں وہ یہی حدیث بیان کر دیتی ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس مسئلے میں یہ نص (قاطع) ہے۔^③

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے جدامجد ”المنتقى“ میں فرماتے ہیں:

”اکثر اہل علم نے عورت کے غسل سے بچے ہوئے پانی سے مرد کو غسل کرنے کی بھی رخصت دی ہے اس معاملے میں رخصت والی احادیث، عدم رخصت والی احادیث سے زیادہ صحیح ہیں، تو مرد کے بچے ہوئے پانی سے عورت کا غسل و وضو کرنا بالاولیٰ درست ہوگا۔ البتہ دونوں طرح کی احادیث ہونے کی وجہ سے صحابہ و ائمہ میں دونوں قسم کی آرا

① صحیح سنن ابی داود، رقم الحدیث (۷۲) نیل الأوطار (۱/۲۷)

② فتح الباری شرح صحیح البخاری (۱/۳۶۴) نیل الأوطار (۱/۲۷)

③ فتح الباری (۱/۳۶۴)

موجود ہیں، ان دونوں طرح کی احادیث میں اہل علم نے مطابقت یوں پیدا کی ہے کہ نعت والی احادیث سے نہی تنزیہی مراد ہے، تحریمی نہیں، یعنی اگر ایسے پانی سے غسل و وضو کر لے تو جائز ہے اور اگر نہ کرے تو یہ زیادہ بہتر ہے، یہ بھی تب ہے کہ جب عورت پہلے غسل کر لے اور پانی بچ جائے، لیکن اگر اکٹھے ہی غسل کریں تو بلا اختلاف جائز ہے۔^① جیسا کہ ابھی ذکر ہوا ہے۔

المختصر مرد و زن کے اکٹھے غسل و وضو کرنے یا ایک دوسرے کے بچے ہوئے پانی سے غسل و وضو کرنے کے جواز کی تفصیل پر غور کیا جائے تو تھوڑی مقدار کے مستعمل پانی کے بارے میں بھی فیصلہ ہو جاتا ہے کہ اگرچہ نفاست پسند طبائع ایسے پانی سے غسل و وضو میں تاثر کریں، جیسا کہ فریقِ ثانی کا مسلک بھی ہے، لیکن بعض مذکورہ دلائل کی رو سے وہ پانی طاہر و مطہر ثابت کیا گیا ہے اور پہلے فریق کے اس مسلک والے ائمہ و فقہاء کے علاوہ امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ جیسے مجتہدین و شارحین حدیث اور امام قرطبی و علامہ ابن عبدالبر جیسے علما سے بھی اس پانی کے طاہر و مطہر ہونے کی طرف میلان ہی کا پتا چلتا ہے۔^②

تیسری قسم:

اسی سلسلے کی تیسری قسم وہ پانی ہے، جس میں کوئی نجاست گر گئی ہو، مثلاً جھیل کا پانی ہے یا وہ تالاب جو شہروں اور دیہات سے دور جنگلات اور صحراؤں وغیرہ میں بارش وغیرہ کے پانی سے بنے ہوں یا پانی کا حوض ہے، چاہے وہ کہاں بھی ہو، ان میں سے کسی میں کوئی نجس اور ناپاک چیز گر جائے تو اس پانی کا کیا حکم ہے؟

اس کی تفصیل میں جانے سے قبل یہ بات واضح کر دیں کہ شہروں اور دیہات سے دور پانی جانے والی جھیلوں اور تالابوں یا حوضوں کے ساتھ ”دور“ کی قید ہم نے اس لیے ذکر کی ہے کہ آس پاس میں پائے جانے والے تالاب وغیرہ عموماً ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں نالیوں کا گندہ پانی جمع ہوتا ہے اور اس پانی کے نجس و ناپاک ہونے میں تو اختلاف کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ دیگر مذکورہ شکلوں میں پائے جانے والے پانی کی بھی دو شکلیں ہیں۔

① تفصیل کے لیے دیکھیں: نیل الأوطار (۱/۲۶-۲۷)

② نیل الأوطار (۱/۱۸-۲۷) تفسیر القرطبی (۷/۱۳-۴۸-۵۱)

پہلی شکل:

نجاست کے اثر سے جس پانی کے رنگ، بو یا ذائقے میں فرق آجائے، اگر ان تینوں میں سے کوئی ایک بھی تبدیل ہو جائے تو وہ پانی ناپاک ہو جاتا ہے، جیسا کہ سنن ابن ماجہ، دارقطنی اور بیہقی میں ایک حدیث ہے:

«إِنَّ الْمَاءَ طَهُورٌ لَا يُنَجِّسُهُ شَيْءٌ إِلَّا مَا غَلَبَ عَلَى رِيحِهِ وَطَعْمِهِ وَكُوْنِهِ»^①
 ”پانی پاک ہے اور اسے کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی، سوائے اس کے کہ اس کی بو یا ذائقہ یا رنگ بدل جائے۔“

محدثین کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک یہ حدیث ضعیف ہے۔ حافظ ابن حجر رضی اللہ عنہ شارح بخاری نے اپنی دوسری کتاب ”بلوغ المرام“ میں ابو حاتم سے اس کے ضعیف ہونے کا قول نقل کیا ہے اور امام نووی رضی اللہ عنہ نے تو اس کے ضعیف ہونے پر تمام محدثین کا اتفاق نقل کیا ہے۔^②
 لہذا محض یہ حدیث ہی ہوتی تو استدلال درست نہ ہوتا، لیکن امام ابن المنذر اور دیگر علماء و محدثین نے اس بات پر تمام علمائے اُمت کا اجماع نقل کیا ہے کہ ان اوصاف میں سے کسی ایک کے بھی بدل جانے سے وہ پانی ناپاک ہو جاتا ہے اور یہ اجماع اُمت ہی دراصل یہاں دلیل و حجت ہے۔^③
 ان اوصاف میں سے کسی بھی ایک کے بدل جانے پر اس کے ناپاک ہو جانے میں یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ کم ہو، بلکہ کم ہو یا زیادہ، ہر حالت میں ناپاک ہو جاتا ہے۔

دوسری شکل:

جس پانی میں نجاست گر جائے، اس کی دوسری شکل یہ ہے کہ نجاست گرنے سے اس کا رنگ یا بو یا ذائقہ کچھ بھی تبدیل نہیں ہوا، اب اس پانی کے بارے میں کیا حکم ہے؟
 اس سلسلے میں اہل علم کے تین اقوال ہیں اور یہ پانی کے قلیل یا کثیر ہونے میں اختلاف کی

① سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۵۲۱)

② تفصیل کے لیے دیکھیں: نصب الراية للزيلعي (۹۴ / ۱) التلخیص الحبير للحافظ ابن حجر (۱ / ۹۴) و

بلوغ المرام مع السبل (۱ / ۱۸) المغني (۱ / ۳۹) المجموع للنووي (۱ / ۱۶۰-۱۶۱)

③ کتاب الإجماع (ص: ۳۳) الأوسط (۱ / ۲۶۰) و المغني (۱ / ۳۸) نیل الأوطار (۲۹)

بنیاد پر ہیں:

① بعض صحابہ رضی اللہ عنہم اور ائمہ و فقہاء کا کہنا ہے کہ پانی کم ہو یا زیادہ، اگر اس کا رنگ یا ذائقہ یا بو کچھ بھی تبدیل نہ ہوا ہو تو وہ پانی ناپاک نہ ہوگا، یعنی اس میں سے نجاست نکال کر اسے ہر قسم کے استعمال میں لایا جاسکتا ہے۔

یہ ام المؤمنین حضرت عائشہ، ام المؤمنین حضرت میمونہ، امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت حسین شہید کربلا، حضرت ابو ہریرہ، حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہم اور تابعین رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کا مسلک ہے، جیسا کہ علامہ ابن حزم نے اپنی کتاب ”المحلی“ میں ذکر کیا ہے۔^① نیز امام مالک، اوزاعی، لیث اور علمائے مجتہدین کا بھی یہی مسلک ہے، جیسا کہ علامہ ابن عبدالبر نے ”التمہید“ میں اس کی تفصیل ذکر کی ہے۔^②

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے ”إغاثة اللہفان“ (۱/ ۱۵۶) میں لکھا ہے:

اہل مدینہ، جمہور سلف، اکثر محدثین، سفیان ثوری، عبدالرحمن بن مہدی اور اہل ظاہر بھی اسی کے قائل ہیں۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کے علاوہ امام ابن قدامہ رحمہ اللہ نے ”المغنی“ میں ذکر کیا ہے کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے بھی اس کی ایک روایت ملتی ہے اور فقہائے حنابلہ کی ایک جماعت نے بھی اسی مسلک کو اختیار کیا ہے۔^③ امام شوکانی رحمہ اللہ کے بقول امام حسن بصری، سعید ابن مسیب، عکرمہ، ابن ابی لیلی، ابراہیم نخعی، امام مالک اور غزالی رحمہم اللہ کا بھی یہی مسلک ہے۔^④

محققین علما کی ایک جماعت نے بھی اسی مسلک کو صحیح قرار دیا ہے، مثلاً: علامہ ابن عبدالبر نے ”التمہید“ (۱/ ۳۲۸) میں، علامہ ابن حزم نے ”المحلی“ (۱/ ۱۳۵) میں، امام ابن تیمیہ نے ”فتاویٰ“ (۲۱/ ۴۹۸ وما بعد) میں علامہ ابن قیم نے ”إغاثة اللہفان“ (۱/ ۱۵۶) اور ”تہذیب معالم السنن“ (تہذیب علیٰ عون المعبود: ۱/ ۱۱۹) میں، امیر صنعانی نے ”سبل السلام“ (۱/ ۱۸) میں، امام شوکانی نے ”السیل الجرار“ (۷۲۲) میں، شیخ عبدالرحمن یمان نے

① المحلی (۱/ ۱۶۸)

② التمهید (۱/ ۳۲۷-۳۲۸)

③ المغنی (۱/ ۳۹)

④ نیل الأوطار (۱/ ۲۹)

”التنکیل“ (۷۵۴) میں اور شیخ ناصر الدین البانی نے ”التنکیل“ (۷۶۲) کی تحقیق میں اسی مسلک کو صحیح قرار دیا ہے۔ امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان بھی اپنی تفسیر میں اسی طرف ہے، بلکہ وہ لکھتے ہیں:

«وَهُوَ الصَّحِيحُ فِي النَّظَرِ، وَجَيِّدُ الْأَثَرِ»^①

”یہی مسلک زیادہ قرین قیاس ہے اور اسی کے دلائل بھی اچھے ہیں۔“

پھر انھوں نے آگے چل کر طوسی اکبر کے حوالے سے لکھا ہے:

اس مسئلے میں سب سے عمدہ و اچھا مسلک امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک ہے اور ان سب کا استدلال سنن ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، مسند احمد، سنن دارقطنی و بیہقی، مستدرک حاکم اور مصنف ابن ابی شیبہ میں مذکور ”بئر بضاعة“ والی معروف حدیث سے ہے، جس میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ کیا ہم ”بضاعة“ نامی کنویں سے وضو کر سکتے ہیں، جب کہ یہ ایسا کنواں ہے، جس میں حیض کے چھتھڑے، کتوں کا گوشت اور دوسری بدبودار اشیا ڈالی جاتی ہیں؟ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«الْمَاءُ طَهُورٌ، لَا يَنْجَسُهُ شَيْءٌ»^②

”پانی پاک ہے (طاہر و مطہر ہے) اسے کوئی چیز نجس اور ناپاک نہیں کر سکتی۔“

یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ ”معالم السنن“ (۱/ ۳۷) میں امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ نے وضاحت کی ہے کہ اہل مدینہ جان بوجھ کر گندی اشیا ”بئر بضاعة“ میں ہرگز نہیں ڈالا کرتے تھے، بلکہ دراصل وہ کنواں ایک نشیبی اور ڈھلوان جگہ پر تھا اور بارش وغیرہ کا پانی مذکورہ بالا گندی اشیا کو اپنے ساتھ بہا کر اس کنویں میں لے جایا کرتا تھا، نیز قرآن کریم کے ان الفاظ:

﴿وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَهُورًا﴾ [الفرقان: ۴۸]

”اور ہم نے آسمان سے پاک پانی نازل کیا۔“

کا ظاہر بھی یہی بتاتا ہے کہ جب تک پانی کے اوصاف میں سے کوئی وصف تبدیل نہ ہو تو وہ

① تفسیر القرطبی (۷/ ۱۳/ ۴۲-۴۳)

② صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۵۶) صحیح سنن ابی داؤد (۵۹) صحیح سنن النسائی، رقم

الحدیث (۳۱۵) المنتقى مع النيل (۱/ ۲۸) المجموع للنووي (۱/ ۱۲۷) التلخیص الحبیرو (۱/ ۱۳)

نجس نہیں ہوتا۔

اسی مفہوم کی کئی دیگر احادیث بھی مروی ہیں، جو متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مرفوعاً اور موقوفاً صحیح ابن خزیمہ، صحیح ابن حبان، مسند احمد، مسند ابی یعلیٰ و بزار اور معجم طبرانی اوسط میں مذکور ہیں۔^(۱)

(۲) ایسا پانی جس میں کوئی ناپاک چیز گر جائے، مگر اس سے اس کا رنگ، ذائقہ یا بوتھیل نہ ہو، اس کے بارے میں اہل علم کا دوسرا قول ہے کہ اگر وہ پانی کثیر مقدار میں ہوگا تو ناپاک نہیں ہوگا اور اگر قلیل مقدار میں ہو تو ناپاک ہو جائے گا۔ یہ حضرت ابن عمر، سعید بن جبیر، امام مجاہد، امام شافعی، امام اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ اور ایک روایت میں امام احمد اور ابو عبیدہ رحمہم اللہ کا مسلک ہے۔^(۲)

پھر اس قلیل و کثیر پانی کی کوئی حد بندی بھی نہیں کی گئی، البتہ ایک متکلم فیہ حدیث اور قیاس سے قلیل و کثیر کی حدود طے کی گئی ہیں۔ قلیل و کثیر پانی کی حد بندی میں ائمہ و فقہاء کی آرا بھی مختلف ہیں۔ چنانچہ امام شافعی رحمہ اللہ اور عام اہل حدیث علما کے نزدیک اس کی حد بندی یہ کی گئی ہے کہ اگر وہ پانی دو قلعے یعنی مکے یا اس سے زیادہ ہو تو وہ کثیر شمار ہوگا اور اگر دو قلعوں (مٹکوں) سے کم ہے تو وہ قلیل ہے۔ پہلی شکل (یعنی دو قلعے یا زیادہ ہو تو اس صورت) میں وہ پانی نجس نہیں ہوگا اور دوسری شکل میں (دو قلعوں سے کم ہو تو) وہ نجس ہو جائے گا۔

ان کی دلیل وہ حدیث ہے، جو سنن اربعہ، صحیح ابن حبان، صحیح ابن خزیمہ، متدرک حاکم، سنن دارقطنی، سنن دارمی، مسند احمد و شافعی اور طیالسی میں مروی ہے، جس کے الفاظ ہیں:

«إِذَا كَانَ الْمَاءُ قُلَّتَيْنِ لَمْ يَحْمِلِ الْخَبْثُ»^(۳)

”جب پانی دو قلعے ہو تو وہ نجاست کو نہیں اٹھاتا (یعنی نجس نہیں ہوتا)۔“

اس مفہوم کی تائید سنن ابن ماجہ اور مسند احمد کی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے، جس میں «لَمْ يَحْمِلِ الْخَبْثُ» کے بجائے «لَمْ يَنْجِسْهُ شَيْءٌ» کے الفاظ ہیں کہ ”دو قلعے یا اس سے زیادہ پانی کو کوئی چیز

(۱) نیل الأوطار (۱/ ۲۸)

(۲) المغنی (۱/ ۳۹)

(۳) الفتح الربانی (۱/ ۲۱۶-۲۱۷) صحیح سنن أبی داود، رقم الحدیث (۵۸) صحیح سنن الترمذی (۵۷) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۵۱) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۵۱۷) موارد الظمان، رقم الحدیث (۱۱۷) نیل الأوطار و المنتقى (۱/ ۳۰)

نفس نہیں کر سکتی۔“ لیکن پہلے مسلک والے ائمہ و فقہاء اور محققین علماء، نیز امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس حدیث کے متن اور سند دونوں میں اضطراب یعنی جھول پایا جاتا ہے، لہذا یہ قابل استدلال نہیں۔ امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے ”نیل الأوطار“ میں ان دونوں قسم کے جھول یا اضطراب کو بڑی حد تک زائل کر دیا ہے، نیز محدث العصر شیخ ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے اور اس اضطراب والی علت کو رد کیا ہے۔^[۱] امام طحاوی، ابن خزیمہ، ابن حبان، حاکم، ذہبی، نووی اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسے صحیح کہا ہے۔

علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے قلتین والی حدیث سے دلیل لینے پر پندرہ اشکالات وارد کیے ہیں اور ان کی تفصیل بھی ذکر کی ہے، جو ان کی کتاب ”تہذیب معالم السنن“ (۱/ ۱۰۶ تا ۱۲۵) یا ”مختصر السنن مع المعالم و التہذیب“ (۱/ ۵۹-۷۴) میں دیکھی جاسکتی ہے، جہاں انھوں نے اس حدیث کی سند و متن کے اضطراب اور قلتین یا دو منکوں کے پانی کی تحدید پر کھل کر بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ دو منکوں سے مراد کتنا پانی ہے؟ اس میں آج تک علماء کا کسی خاص مقدار پر اتفاق نہیں ہو سکا، مذکورہ مسئلے کی حدیث کے بارے میں موصوف کی یہ طویل بحث اہل علم کے لیے قابل مطالعہ ہے، جس کی تفصیلات یہاں ذکر کرنا باعث طوالت ہے۔ مذکورہ حدیث پر بہت کچھ کلام کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے:

«وَدِدْتُ أَنْ مَذْهَبَ الشَّافِعِيِّ فِي الْمِيَاهِ كَانَ كَمَذْهَبِ مَالِكٍ»^[۲]

”مجھے یہ بات پسند ہے کہ کاش امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک بھی پانی کے سلسلے میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ والا ہوتا۔“

علامہ ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

«أَمَّا مَا ذَهَبَ إِلَيْهِ الشَّافِعِيُّ مِنْ حَدِيثِ قُلْتَيْنِ، فَمَذْهَبٌ ضَعِيفٌ مِنْ جِهَةِ النَّظَرِ، غَيْرُ ثَابِتٍ فِي الْأَثَرِ»

”کہ دو منکوں والی حدیث کی بنا پر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے جو مسلک اختیار کیا ہے، وہ فکر و نظر

[۱] ویکس: النيل (۱/ ۳۰-۳۱) الإرواء (۱/ ۶۰) تمام المنة (ص: ۴۹)

[۲] بحوالہ فتاویٰ ابن تیمیہ (۲۱/ ۵۰۱)

کے اعتبار سے ضعیف و کمزور ہے اور سند و استناد کی بنا پر غیر ثابت بھی ہے۔
پھر آگے چل کر لکھتے ہیں کہ دو منکلوں میں کتنا پانی ہو سکتا ہے؟ اس کے بارے میں نہ تو کوئی حدیث صحیح و ثابت ہے اور نہ اس پر اجماع ہی ملتا ہے۔ اگر یہ لازمی حد ہوتی تو علما پر واجب تھا کہ وہ بحث و تحقیق کر کے اس حد کی واقفیت حاصل کریں، جو نبی اکرم ﷺ نے مقرر فرمائی ہو، کیوں کہ یہ بات دین کے اصل الاصول اور فرائض میں شامل ہے۔^①

امام قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ ابن المنذر نے دو منکلوں کے بارے میں جو اختلاف ذکر کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی توقیف و تحدید ثابت نہیں ہے۔^② الغرض اس مسلک کا استدلال جس حدیث سے ہے، اس پر اگرچہ کلام کیا گیا ہے، مگر اسے کثیر محدثین رحمہم اللہ نے صحیح بھی قرار دیا ہے۔

③ ایسے پانی کے بارے میں تیسرا قول یا مسلک امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب پانی میں نجاست گر جائے تو وہ نجس ہو جاتا ہے، وہ تھوڑا ہو یا زیادہ، جب اس میں نجاست کا عموم متحقق ہو جائے، ان کے نزدیک نجاست کا عموم کیسے متحقق ہوتا ہے؟ اسے اس مثال سے سمجھا جاسکتا ہے کہ ایک تالاب میں پیشاب کا ایک قطرہ یا نجاست کا کوئی ذرہ گر گیا۔ اب اگر اس تالاب کے ایک کنارے سے پانی کو حرکت دی جائے اور اس حرکت کا اثر دوسرے کنارے پر دیکھا جاسکے تو اس تالاب کا سارا پانی نجس ہو گیا، لیکن اگر ایک کنارے کی حرکت کا اثر دوسرے کنارے پر نہ دیکھا جاسکے اور اس کنارے کا پانی متحرک نہ ہو تو پھر وہ پانی نجس نہیں ہوگا۔^③ پانی کے قلیل و کثیر کا معیار (دوسرے قول میں) تو ایک حدیث سے لیا گیا تھا، مگر یہاں معاملہ یہ ہے کہ اس معیار کی بنیاد نہ کسی قرآنی آیت پر ہے نہ کسی صحیح اور نہ ضعیف حدیث ہی پر، بلکہ یہ سراسر قیاسی بنیاد پر ہے۔ اسی معیار کو دوسرے الفاظ میں یوں بھی ذکر کیا گیا ہے کہ اگر ظن غالب یہ ہو کہ نجاست کا اثر پورے پانی میں پھیل چکا ہوگا، تو وہ سارا پانی ہی ناپاک ہو جائے گا اور اگر گمان غالب

① نیل الأوطار (۳۱/۱) تفسیر القرطبی (۷/۱۳/۴۲-۴۳)

② تفسیر القرطبی (۷/۱۳/۴۳)

③ تفسیر القرطبی (۷/۱۳/۴۲)

یہ ہو کہ اس نجاست کا اثر پانی میں نہیں پھیلا ہوگا تو وہ نجس ہوگا۔^(۱) اس کی بنیاد بھی قیاس پر ہی ہے نہ کہ کسی آیت یا حدیث پر۔ یہ معیار تو امام صاحب کی طرف منسوب ہے، جبکہ ان کے دونوں شاگردان رشید امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک اگر پانی کا طول و عرض اور گہرائی دس ہاتھ ہو تو وہ نجس نہیں ہوگا اور اگر اس سے کم ہو تو نجس ہو جائے گا۔^(۲)

اس کی بنیاد بھی قرآن و سنت کی کسی نص پر نہیں، بلکہ قیاس محض پر ہے اور پھر مختلف قسم کے قیاسی معیاروں پر بھی کئی اعتراضات و اشکالات وارد ہوتے ہیں، مثلاً حرکت والے معیار میں ان کے مطابق اگر کم گہرا مگر کافی طول و عرض میں پھیلا پانی ہو اور اس کے دوسرے کنارے تک حرکت کا اثر نہ پہنچ سکے تو وہ نجس نہ ہو اور اگر اس سے بیسیوں گنا زیادہ پانی ہو، گہرائی میں زیادہ اور طول و عرض کے اعتبار سے تنگ جگہ میں ہو تو اس میں چونکہ حرکت کا اثر دوسری طرف پہنچ جائے گا، لہذا وہ نجس ٹھہرا اور یہ بہت بڑا تضاد ہے۔^(۳) الغرض ایک تو قرآن و سنت سے دلیل نہیں، دوسرے یہاں اس قسم کے تضادات بھی پائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قول اول میں مذکور اہل تحقیق علماء و فقہانے ان تینوں اقوال میں سے ”أقرب الأقوال بالنظر إلى الدليل“ یعنی از روے قوت دلیل سب سے صحیح ترین قول یا مسلک پہلے قول ہی کو قرار دیا ہے اور تیسرے قول کی کوئی نقلی دلیل ہی نہیں، محض عقلی دلیل ہے اور وہ بھی تناقض والی ہے۔

یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ قول اول کے مطابق اگرچہ مذکورہ پانی نجس نہیں، لیکن کسی کو کسی بھی پانی سے وضو یا غسل کرنے پر مجبور تو بہر حال نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا بہتر یہ ہے کہ اپنی طبیعت کے موافق پانی ہی کو استعمال میں لایا جائے اور وہ پانی جو از روے قوت دلیل نجس نہ ہو، اُسے محض طبیعت کی عدم موافقت کی بنا پر نجس بھی نہ قرار دیا جائے۔

بہتے ہوئے پانی کا حکم:

اسی تیسری قسم کے ضمن میں وہ پانی بھی آجاتا ہے جو کھڑا نہیں، بلکہ بہ رہا ہو اور اس میں کوئی

(۱) المغنی (۱/ ۴۱) المتعلق الصبیح (۱/ ۲۳۱)

(۲) سبل السلام (۱/ ۱۷)

(۳) تہذیب معالم السنن (۱/ ۱۲۰)

نجس چیز گرجائے۔ ایسے پانی کے بارے میں امام ابن قدامہ اپنی فقہ مقارن کی معروف کتاب ”المغنی“ میں لکھتے ہیں کہ ایسا پانی پاک ہی رہتا ہے اور اس کے نجس ونا پاک ہونے کے بارے میں کوئی نص یا اجماع ہمارے علم میں نہیں، لہذا وہ اپنی اصل طہارت (طاہر و مطہر ہونے) پر ہی باقی ہے اور وہ (مذکورہ بالا) نبی کریم ﷺ کے ارشاد:

«الْمَاءُ طَهُورٌ لَا يَنْجَسُهُ شَيْءٌ»

”پانی پاک ہے (طاہر و مطہر ہے) اسے کوئی چیز نجس اور ناپاک نہیں کر سکتی۔“

اور دوسری روایت:

«الْمَاءُ طَهُورٌ لَا يَنْجَسُهُ شَيْءٌ إِلَّا مَا غَلَبَ عَلَيْهِ رِيحُهُ وَطَعْمُهُ وَلَوْنُهُ»

”پانی پاک ہے، اس کو کوئی چیز نجس نہیں کر سکتی، مگر جو اس کی بو، ذائقے اور رنگ پر غالب

آجائے۔“

کے تحت ہی آجاتا ہے۔ شوافع اور حنابلہ وغیرہ جو پانی کا دو منکوں یا اس سے زیادہ ہونا اس کے طاہر و مطہر رہنے کے لیے شرط قرار دیتے ہیں، ان کی طرف سے اشکال وارد کر کے اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ قلتین یا دو منکوں والی حدیث بھی ایسے پانی کے پاک ہونے ہی کی دلیل ہے، کیوں کہ بہتے ہوئے پانی کی مجموعی مقدار تو بہر حال دو منکوں سے زیادہ ہی ہو جاتی ہے اور پھر دو منکوں والی شرط کو بہتے ہوئے پانی پر نافذ کرنا، ایک قسم کا تحکم اور سینہ زوری ہے، جس کی کوئی دلیل نہیں ہے، کیوں کہ دو منکوں والی حدیث ٹھہرے ہوئے پانی کے بارے میں وارد ہوئی ہے اور چلتے پانی کو اسی پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے۔^①

یہاں بھی بہتے ہوئے پانی سے گندے نالے وغیرہ ہرگز مراد نہ لیے جائیں، جیسا کہ شہروں کے قریب والے تالاب مراد نہیں لیے تھے، کیوں کہ ان بہنے والے نالوں میں پانی ہی ایسا جمع ہوتا ہے، جو نجس ہوتا ہے۔ لہذا اس کے نجس اور ناپاک ہونے میں تو کسی کو کلام نہیں۔

گھی کا حکم:

پانی میں نجاست گرنے سے جو صورت حال بنتی ہے، تقریباً یہی معاملہ گھی کا بھی ہے، جب وہ

① المغنی، تحقیق التركي (۱/ ۴۷- ۴۸)

جامد نہیں، بلکہ سیال مانع ہو اور اس میں کوئی چوہا وغیرہ گر کر مر جائے تو اس گھی کا حکم بھی اس پانی ہی کا ہے، جس میں کوئی نجاست واقع ہو جائے۔ اس کی تفصیل فتاویٰ ابن تیمیہ (۲۱/ ۲۸۸ تا ۲۹۸) میں دیکھی جاسکتی ہے۔ لیکن اگر وہ گھی سیال نہیں بلکہ جامد ہے اور اس جے ہوئے گھی والے برتن میں چوہا گر جائے تو اس کے بارے میں تو حکم واضح تر ہے۔ خود نبی اکرم ﷺ کا فیصلہ ”صحیح البخاری، کتاب الوضوء، باب ما يقع من النجاسات في السمن و الماء“ اسی طرح ”کتاب الذبائح والصيد، باب إذا وقعت الفأرة في السمن الجامد أو الذائب“ نیز بخاری شریف کے علاوہ سنن ابی داود، ترمذی، نسائی، سنن دارمی، دارقطنی اور مسند احمد میں مذکور ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے ایسے گھی کا حکم دریافت کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«الْقُوَهَا وَمَا حَوْلَهَا فَاطْرَحُوهُ وَكُلُوا سَمْنَكُمْ»^①

”اسے نکال کر پھینک دو اور جس جگہ گر کر اس کی موت واقع ہوئی ہے، اس کے آس پاس والا گھی بھی نکال کر پھینک دو اور اپنا باقی گھی کھا لو۔“ یعنی وہ پاک ہے، ناپاک نہیں ہوا۔

امام بخاری کی تبویب سے تو بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ جے ہوئے اور سیال گھی میں کوئی فرق نہیں، کیوں کہ انھوں نے ”السمن الجامد أو الذائب“ کے تحت بھی یہی حدیث ذکر کی ہے۔^② جب کہ جامد جے ہوئے اور ذائب سیال کو کہا جاتا ہے۔ البتہ اس مسئلے میں اختلاف کے قوی ہونے کی وجہ سے انھوں نے پختہ حکم نہیں لگایا ہے۔

اب رہی وہ حدیث جس میں جے ہوئے اور سائل گھی میں فرق کیا گیا ہے، وہ سنن ابی داود اور مسند احمد میں مروی ہے، اس روایت کو امام بخاری رحمہ اللہ نے خطا قرار دیا ہے اور ابو حاتم نے اسے وہم شمار کیا ہے، جبکہ امام ترمذی نے سیال و جامد کے ذکر والی اس روایت کو غیر محفوظ اور شاذ کہا ہے۔^③ جامد اور سیال میں فرق کرنے والی روایت صرف ایک راوی معمر نے بیان کی ہے اور امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے قول معمر کو متروک قرار دیا ہے۔ البتہ بعض ائمہ وفقہا نے جامد اور سیال میں فرق بھی

① صحیح البخاری مع الفتح (۱/ ۲۴۳) صحیح سنن أبی داود، رقم الحدیث (۲۲۵۴) صحیح سنن

الترمذی، رقم الحدیث (۱۴۶۹) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۳۹۷۱) المغنی (۱/ ۵۳)

② صحیح البخاری مع الفتح (۹/ ۶۶۷)

③ فتح الباری (۱/ ۳۴۴) سنن الترمذی مع تحفة الأحوذی (۵/ ۵۱۷) طبع مدنی.

کیا ہے، جس کی تفصیل فتح الباری شرح صحیح بخاری، تحفۃ الاحوذی شرح جامع ترمذی، المغنی لابن قدامہ، فتاویٰ ابن تیمیہ اور دیگر شروح حدیث و کتب فقہ میں دیکھی جاسکتی ہے، جہاں ایسی صورت میں سیال کو نجس اور جامد کو طاہر کہا گیا ہے۔

قلتین کی مقدار:

غیر مطلق پانی کی چوتھی اور آخری قسم یعنی جھوٹے پانی کے حکم کی تفصیلات میں جانے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دو قلوں یا اس سے زیادہ میں نجاست گرنے سے اس کے نجس نہ ہونے کا مسلک رکھنے والوں کے ان دو قلوں یا مٹکوں میں سامنے والے پانی کی مقدار کی بھی وضاحت بیان کر دی جائے۔ اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ مٹکوں سے کون سے مٹکے مراد ہیں؟ اس کی تعیین ایک روایت میں بھی وارد ہوئی ہے، جسے امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ نے ”معالم السنن شرح أبي داود“ (مختصر السنن للمنذري) میں اور امام زیلعی نے ”نصب الراية في تخریج أحادیث الهدایة“ (۱/ ۱۱۵-۱۱۲) میں ذکر کیا ہے، جس میں ابن جریج سے مرسل مروی ہے:

«إِذَا كَانَ الْمَاءُ قَلَّتَيْنِ بِقَلَالٍ هَجَرَ»

”جب بہتی ہجر کے مٹکوں جتنے دو مٹکوں کی مقدار میں پانی ہو۔“

مگر یہ روایت ایک تو مرسل ہے کہ جریج تابعی ہیں نہ کہ صحابی، اور وہ کسی صحابی کا ذکر کیے بغیر یہ روایت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں۔^① پھر ”الکامل لابن عدی“ میں یہ روایت مرفوعاً مروی ہے، جس کے منفرد راوی مغیرہ بن قلاب ہیں، جو محدثین کے نزدیک منکر الحدیث تھے۔ اور نفیلی نے کہا ہے کہ وہ بیان حدیث میں امانت دار نہ تھے اور ابن عدی نے کہا ہے کہ ان کی بیان کردہ اکثر احادیث کی متابعت نہیں کی جاتی۔^②

تاہم شافعیہ نے ہجر کے مٹکوں سے مقدار کی تعیین کو اختیار کیا ہے، کیوں کہ اہل عرب اپنے اشعار میں ہجر کے مٹکوں کا بکثرت ذکر کرتے آئے ہیں، جیسا کہ ابو عبید نے ”کتاب الطہور“ میں ذکر کیا ہے اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ ہجر کے مٹکے ان کے یہاں مشہور و معروف تھے۔ یہی وجہ

① المغنی (۱/ ۳۷)

② نیل الأوطار (۱/ ۳۱)

ہے کہ واقعہ معراج کے ضمن میں نبی اکرم ﷺ نے سدرۃ المنتہی نامی پیری کے پیروں کا حجم ہجر کے منکلوں جیسا بتایا ہے اور امام خطابی رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ ہجر ہستی کے منکے مشہور صنعت اور مقدار کے لحاظ معلوم و معروف تھے۔^①

ہجر کے منکے میں کتنا پانی سماتا ہے؟ اس کی وضاحت ابن جریج ہی سے ملتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے ہجر کے منکے دیکھے ہیں، جن میں سے ایک میں دو اور دو سے کچھ زیادہ مشکیزوں کا پانی آتا ہے اور احتیاطاً ڈھائی مشکیزے کہنا چاہیے۔ جوزجانی نے یحییٰ بن عقیل کا قول نقل کیا ہے کہ میں نے ہجر کے منکے دیکھے ہیں، جو دو مشکیزوں کے برابر ہوتے ہیں۔ اثرم، اسماعیل بن سعید اور ابن منذر نے امام احمد سے نقل کیا ہے کہ ایک منکے چار مشکیزے کے برابر ہوتا ہے، ان میں سے اوسط درجے کا منکے ڈھائی مشکیزے ہے اور دو منکلوں کا پانی پانچ مشکیزے بن جائے گا۔

اب یہ باری آجاتی ہے کہ مشکیزے میں کتنا پانی ہوگا؟

اس سلسلے میں فقہانے لکھا ہے کہ ایک مشکیزے میں سو (۱۰۰) عراقی رطل پانی ہوتا ہے، تو پانچ مشکیزوں میں پانچ سو عراقی رطل پانی ہوا۔ امام ابن قدامہ رحمہ اللہ کے بقول ایک مشکیزے کے اس وزن کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور حجازی مشکیزوں کا وزن بھی عراقی مشکیزوں کے برابر ہوتا ہے، اسی طرح عراقی اور حجازی ہردو میں جو مجموعی مقدار سامنے آئی، وہ پانچ سو رطل ہے۔^②

موجودہ پیمانہ وزن پونڈ کو رطل کہا جا رہا ہے، جو آدھے کلو سے تھوڑا سا زیادہ ہوتا ہے تو گویا پانچ سو رطل تقریباً پانچ سو پونڈ کے برابر ہوتا ہے۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اس مسلک والوں کے نزدیک اگر پانچ سو پونڈ یا تقریباً و احتیاطاً پونے تین سو کلو یا پونے سات من پانی یا اس سے زیادہ ہو تو نجاست گرنے سے بھی نجس نہیں ہوتا اور اس سے کم ہو تو وہ نجس ہو جاتا ہے۔



① المنتقی (۱/ ۳۸) والنیل أيضاً.

② المغنی (۱/ ۳۶)

جھوٹا پانی

پانی کی مختلف اقسام میں سے ایک قسم جھوٹا پانی ہے، یعنی وہ پانی جو پینے کے بعد برتن میں بچ جائے۔ پانی کے کسی برتن، تالاب یا حوض سے کوئی انسان، حیوان یا درندہ پانی پی لے اور کچھ باقی بھی بچ جائے تو اس بچے ہوئے پانی کو ”جھوٹا پانی“ کہا جاتا ہے۔ جسے عربی میں ”سور“ کہا جاتا ہے، اس کی تعریف یہ ہے:

”مَا بَقِيَ فِي الْإِنَاءِ بَعْدَ الشُّرْبِ“^①

”پینے کے بعد جو برتن میں بچ جائے وہ جھوٹا ہوتا ہے۔“

جھوٹے پانی کی اقسام:

ایسا پانی، اس کے پینے والوں کے الگ الگ ہونے کی وجہ سے کئی نوعیتوں کا ہوتا ہے اور ان میں سے ہر کسی کا حکم معلوم کرنے کے لیے ہمیں ”جھوٹے“ کی الگ الگ نوعیتیں یا قسمیں بھی معلوم کرنا ہوں گی۔ مثلاً انسان کا جوٹھا، پھر ان میں سے بھی مسلمان کا جھوٹا اور کافر و مشرک کا جھوٹا، حیوان کا جھوٹا، پھر ان میں سے ایسے جانوروں کا جھوٹا جن کا گوشت کھایا جاتا ہے اور جن کا گوشت نہیں کھایا جاتا اور جو درندے ہیں اور جو محض جانور تو ہیں مگر درندے نہیں۔

① مسلمان کا جھوٹا:

مسلمان مرد ہو یا عورت، بچہ ہو یا جوان اور مرد چاہے جُنْحی ہو اور اسے غسل کی حاجت ہو یا وہ طاہر ہو، اسی طرح عورت چاہے طہارت سے ہو یا جنابت سے، یا اپنے مخصوص فطری عذر یعنی ایام حیض و نفاس میں ہو، ہر شکل میں ان کا جھوٹا پاک اور طاہر و مطہر ہے۔

اس بات کی دلیل وہ حدیث شریف ہے، جو صحیح بخاری و مسلم، سنن اربعہ اور دیگر کتب حدیث

① فقہ السنة (۲۰/۸)

میں مذکور ہے، جس میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

« إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَقِيَهُ فِي بَعْضِ طُرُقِ الْمَدِينَةِ، وَهُوَ جُنْبٌ فَاِنْخَسَ مِنْهُ فَذَهَبَ فَاغْتَسَلَ ثُمَّ جَاءَهُ فَقَالَ لَهُ: أَيْنَ كُنْتَ يَا أَبَا هُرَيْرَةَ؟ (فَقَالَ): كُنْتُ جُنْبًا فَكَرِهْتُ أَنْ أَجَالِسَكَ، وَأَنَا عَلَى غَيْرِ طَهَارَةٍ، فَقَالَ ﷺ: سُبْحَانَ اللَّهِ! إِنَّ الْمُؤْمِنَ لَا يَنْجَسُ^①»

”نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان سے مدینہ طیبہ کے ایک راستے میں ملے، جب کہ وہ (ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ) جنابت کی حالت میں تھے، لہذا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نظر بچا کر کسی طرف نکل گئے اور غسل کیا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا: اے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ! تم کہاں تھے؟ تو انھوں نے جواب دیا: میں جنابت کی حالت میں تھا اور مجھے یہ بات اچھی نہ لگی کہ میں غیر طاہر ہونے کی حالت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مجلس کروں تو نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”سبحان اللہ! مومن (کبھی) نجس اور ناپاک نہیں ہوتا۔“

بالکل اسی طرح کا دوسرا واقعہ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کو پیش آیا، جو صحیح مسلم، سنن ابو داؤد نسائی، ابن ماجہ اور دیگر کتب حدیث میں مروی ہے۔ اس واقعے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

« إِنَّ الْمُسْلِمَ لَا يَنْجَسُ^② » ”مسلمان نجس اور ناپاک نہیں ہوتا۔“

ان دونوں احادیث میں مذکور دو صحابہ رضی اللہ عنہما کے الگ الگ واقعات سے معلوم ہوا کہ مومن نجس نہیں ہوتا، چاہے وہ جنابت کی حالت ہی میں کیوں نہ ہو اور وہ مرد ہو یا عورت، اس میں بھی کوئی فرق نہیں، کیوں کہ مومن و مسلم ہونے کے اعتبار سے مرد و زن اور پیر و جوان سب برابر ہیں، ان کا جھوٹا بالاتفاق پاک

① صحیح مسلم مع شرح النووي (۶۶/۴ - ۶۷) صحیح البخاری مع فتح الباری (۴۶۶/۱) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۵۳۴) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (۲۱۲) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۱۰۵) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۲۶۰)

② النيل مع المنتقى (۲۰/۱) صحیح مسلم (۶۷/۴/۲) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۵۳۵) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (۲۱۱) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۲۵۸، ۲۵۹)

ہے اور جو ارشاد نبوی ﷺ کے مطابق خود نجس نہیں ہوتا، اس کا جھوٹا کیسے نجس ہوگا؟ یہ بڑی عام فہم سی بات ہے۔ ان واقعات سے مومن و مسلم کے جھوٹے کے ناپاک نہ ہونے کے علاوہ بندہ مومن و مسلم کے لیے عبرت و بصیرت کا سامان اور باہم بعض آداب بھی بیان ہوئے ہیں، مثلاً یہ کہ کسی عظیم الشان کام سے دوچار ہونا ہو تو اس سے پہلے طہارت و غسل کر لینا مشروع ہے۔

دوسرے یہ کہ اہل علم و فضل اور مربی و معلم کا احترام و اکرام اور عزت و توقیر کرنی چاہیے اور ان کی مجلس و صحبت میں بیٹھنے کے لیے عمدہ و اعلیٰ حالت اور کامل و مکمل طہارت سے ہوں تو یہ عین قرین ادب ہے، جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابو حذیفہ رضی اللہ عنہما کے فعل میں پائے جانے والے کمال ادب سے پتا چلتا ہے اور الحمد ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے تو ان واقعات سے یہ بھی استدلال کیا ہے کہ جب مومن و مسلم نجس نہیں ہوتا، تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اسے جھوٹے جانے سے پانی یعنی ”مستعمل پانی“ نجس ہو جائے؟^①

حیض و نفاس، جو عورت کے فطری عذر ہیں، ان کے دوران بھی اس کا جھوٹا پاک ہی ہوتا ہے، نجس و ناپاک نہیں ہوتا، اس کی دلیل صحیح مسلم، سنن ابی داؤد، نسائی، ابن ماجہ، دارمی اور مسند احمد میں مذکور وہ حدیث ہے، جس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

«كُنْتُ أَشْرَبُ وَأَنَا حَائِضٌ فَأَنَاوَلُهُ النَّبِيُّ ﷺ فَيَضَعُ فَاهُ عَلَيَّ مَوْضِعَ فَيَّ^②»

”میں ایام حیض کے دوران میں کسی برتن سے پانی پیتی، پھر میں وہی برتن نبی اکرم ﷺ کو پکڑا دیتی، تو آپ ﷺ اس برتن سے پانی پیتے ہوئے عین اسی جگہ سے منہ لگا کر پیتے جہاں منہ لگا کر میں نے پیا ہوتا۔“

جب کہ مذکورہ کتب ہی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے یہ الفاظ بھی منقول ہیں:

«كُنْتُ أَتَعَرَّقُ الْعَرَقَ، فَيَضَعُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَاهُ حَيْثُ وَضَعْتُ وَأَنَا حَائِضٌ^③»

① المنتقى للمجد ابن تیمیة مع النیل (۱/ ۲۱-۲۲)

② صحیح مسلم (۱/ ۳-۲۱۰-۲۱۱) صحیح سنن ابی داؤد، رقم الحدیث (۲۳۲) صحیح النسائی، رقم

الحدیث (۲۶۸) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۶۴۳) المغنی لابن قدامة (۱/ ۶۹) فقہ السنة (۱/ ۲۱)

③ صحیح مسلم مع شرح النووي (۱/ ۲۱۰-۲۱۱) صحیح سنن ابی داؤد، رقم الحدیث (۲۳۲) سنن النسائی

(۱/ ۱۲ و ۳۳)

”میں گوشت کی ہڈی چوستی، پھر اسے آپ ﷺ لے لیتے اور میرے منہ رکھنے والی جگہ پر منہ رکھ کر ہی اُسے چوستے تھے اور میں حیض کی حالت میں ہوتی تھی۔“

سُبْحَانَ اللَّهِ! یہ تھی مثالی معاشرت، بلکہ حسن معاشرت!!

ایک جاہلانہ عادت:

اس حدیث سے فطری عذر میں مبتلا عورت کے جھوٹے پانی کے پاک ہونے کا حکم واضح ہو گیا۔ یہیں پر ہم آپ کی توجہ ایک اور بات کی طرف مبذول کروانا چاہتے ہیں، جس سے بہت سے لوگ اور خصوصاً اُن پڑھ اور کم پڑھا لکھا طبقہ دوچار ہے اور وہ یہ کہ کچھ لوگ بیوی کے جھوٹے پانی کو پینے یا کسی جھوٹی چیز کو کھانے سے کچھ اس طرح کا پرہیز کرتے اور دُوسروں کو پرہیز کرنے کا مشورہ دیتے ہیں کہ جیسے یہ بیوی نہ ہو، کوئی نجس چیز یا ہندوانہ ذہن کے مطابق اچھوت قوم کی کوئی فرد ہو۔ یہ صرف ایام حیض کے دوران ہی میں نہیں، بلکہ عام حالات میں بھی ہوتا ہے اور اس کے دلائل مہیا کرنے کے لیے عقلی گھوڑے دوڑاتے ہیں اور کہتے ہیں:

”اس طرح آدمی زن مرید ہو جاتا ہے اور عورت کا جھوٹا میٹھا کھانے سے اس میں یہ اور وہ عیب آ جاتا ہے۔ نہ معلوم کیا سے کیا آفت ٹوٹ پڑتی ہے۔“

مذکورہ واقعہ آپ کے سامنے ہے۔ ایک زوجہ محترمہ جو حالتِ حیض میں ہیں۔ ان کا جھوٹا پانی اور گوشت ہے۔ سرورِ کونین ﷺ نہ صرف یہ کہ اسی برتن میں پیتے ہیں، بلکہ عین اس جگہ منہ رکھ کر پیتے ہیں، جہاں زوجہ محترمہ نے منہ رکھ کر پیا تھا اور گوشت کی ہڈی بھی اسی جگہ سے چوستے ہیں، جہاں سے زوجہ محترمہ نے چوسی تھی۔

یہ آپ ﷺ کا اپنی ازواجِ مطہرات سے مشفقانہ سلوک اور ان سے اظہارِ محبت و رافت تھا، جو امت کے لیے چراغِ راہ اور سنت ہے، مگر آج آپ ﷺ کا امتی ہونے کا دعوے دار اپنے بھائیوں اور دوست و احباب کو عورت کا جھوٹا میٹھا کھانے سے ”کُلّی پرہیز“ کا مشورہ دیتے ہوئے نظر آتا ہے۔ ایسے لوگوں میں دراصل عہدِ جاہلیت کی ذہنیت کا پَرْتُو اور ان کے خیالات میں وہی جاہلانہ نظریات سمائے ہوئے ہیں۔

عہدِ جاہلیت میں لوگوں کا عورت ذات اور بیویوں سے اور خاص ایامِ ماہواری اور فطری حالتِ عذر میں ان سے جو رویہ ہوا کرتا تھا اور کتبِ تاریخ کے ابواب ماقبل الاسلام میں اس کی جو ذہنی کوفت اور روحانی اذیت والی تفصیلات ملتی ہیں، ان کے احاطے کا تو یہاں موقع نہیں۔ البتہ اتنا ضرور کہیں گے کہ صاحبو! دائرہ اسلام میں ہوتے ہوئے بھی اگر اس قسم کی جاہلانہ عادات و رسوم کی پابندی نہ چھوڑی تو پھر کب چھوڑو گے؟ رسول اللہ ﷺ کے اسوہ حسنہ کو اپنانا تو درکنار، دوسروں کو اس سے روکنے کے یہ مشورے آخر چہ معنی دارد؟

عورت کے ماہانہ فطری عذر والے دنوں میں وہ صرف نماز نہیں پڑھے گی۔ روزہ قضا کرے گی، قرآنِ کریم کو ہاتھ میں نہ لے گی، طوافِ بیت اللہ نہ کرے گی اور اس کے شوہر کو جماع کی ممانعت ہے۔ اس کے علاوہ گھر داری میں وہ کسی قسم کے الگ معاملات کی متقاضی ہرگز نہیں۔ گھر کے سارے کام کاج کرے، شوہر کے ساتھ اُٹھے بیٹھے، اس کی کوئی ممانعت نہیں اور صرف جماع کو چھوڑ کر ہر طرح سے اپنے شوہر کی خدمت کرے، اس میں کوئی حرج نہیں۔

دلائلِ جواز:

کتبِ حدیث میں اس کے جواز کے متعدد دلائل موجود ہیں، مثلاً:

(1) صحیح بخاری و مسلم، سنن نسائی و دارمی اور مسند احمد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَوْمِيَّ (وَفِي رِوَايَةٍ لِلنَّسَائِيِّ: يُخْرِجُ) إِلَيَّ رَأْسَهُ، وَهُوَ مُعْتَكِفٌ وَأَنَا حَائِضٌ»⁽¹⁾

”نبی اکرم ﷺ اعتکاف کی حالت میں اپنا سر اقدس مسجد سے میری طرف (حجرے میں) بڑھا دیتے تھے، جب کہ میں حیض سے ہوتی تھی۔“

«فَأَغْسِلُهُ وَأَنَا حَائِضٌ»⁽²⁾

”میں آپ ﷺ کے سر اقدس کو دھو دیتی تھی، حالانکہ میں حیض کی حالت میں ہوتی تھی۔“

(1) صحیح البخاری مع الفتح، رقم الحدیث (۲۹۶) صحیح مسلم مع شرح النووی (۱/۳/۲۰۹) صحیح

سنن النسائی، رقم الحدیث (۲۶۵، ۲۶۶)

(2) حوالہ جات سابقہ.

(2) اسی طرح صحیح مسلم، سنن ابی داود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، دارمی اور مسند احمد میں حضرت

عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ہی مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے مجھے حکم فرمایا:

« نَأْوِلِيْنِي الْخُمْرَةَ مِنَ الْمَسْجِدِ، قُلْتُ: إِنِّي حَائِضٌ... قَالَ: لَيْسَتْ حَيْضَتُكَ فِي يَدِكَ »⁽¹⁾

”مجھے مسجد سے جانماز پکڑاؤ، انہوں نے عرض کی کہ میں حیض سے ہوں تو نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تمہارا حیض تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے۔“

یہاں یہ بات ذہن میں رکھیں کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا حجرہ مسجد سے ملا ہوا تھا اور مسجد کی طرف کھلنے والے دروازے یا کھڑکی سے ہاتھ بڑھا کر یہ جانماز پکڑنا تھا نہ کہ مسجد کے اندر جا کر، جیسا کہ آپ ﷺ کا سر اقدس دھونے والی حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے۔

(3) ایسے ہی سنن نسائی اور دیگر کتب حدیث میں ام المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

« كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَضَعُ رَأْسَهُ فِي حِجْرٍ إِحْدَانَا فَيَتْلُو الْقُرْآنَ وَهِيَ حَائِضٌ »

”نبی اکرم ﷺ ہم (ازواج مطہرات) میں سے کسی کی گود میں سر اقدس رکھ کر قرآن کی تلاوت کیا کرتے تھے، جبکہ وہ زوجہ محترمہ حیض کی حالت میں ہوتی تھیں۔“

اسی حدیث میں آگے یہ بھی مذکور ہے:

« وَتَقُومُ إِحْدَانَا بِالْخُمْرَةِ إِلَى الْمَسْجِدِ فَتَبْسُطُهَا وَهِيَ حَائِضٌ »⁽²⁾

”ہم میں سے کوئی عورت جانماز پکڑ کر مسجد میں بچھا دیتی، حالانکہ وہ حیض سے ہوتی۔“

ظاہر ہے کہ یہ جانماز بچھانا بھی مسجد سے باہر کھڑے ہو کر ہی ہوگا۔

(4) سنن نسائی اور دیگر کتب حدیث ہی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ بھی مروی ہے:

« كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فِي حِجْرٍ إِحْدَانَا وَهِيَ حَائِضٌ وَهُوَ يَتْلُو الْقُرْآنَ »⁽³⁾

(1) صحیح مسلم (۱/۳/۲۰۹) صحیح سنن النسائي، رقم الحديث (۲۶۲) صحیح سنن ابی داود، رقم

الحديث (۲۳۴) صحیح سنن الترمذی، رقم الحديث (۱۱۵) سنن ابن ماجہ، رقم الحديث (۶۳۲)

(2) سنن النسائي مع التعليقات السلفية از مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی (۱/۳۳-۳۴)

(3) حوالہ جات سابقہ و صحیح سنن النسائي، رقم الحديث (۲۶۴)

”نبی اکرم ﷺ ہم میں سے کسی کے حالتِ حیض میں ہونے کے باوجود اس کی گود میں سر اقدس رکھ کر تلاوتِ قرآن فرمایا کرتے تھے۔“

(5) صحیح بخاری اور سنن نسائی سمیت دیگر کتبِ حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ہے:

«كُنْتُ أَرَجِلُ رَأْسَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَأَنَا حَائِضٌ»⁽¹⁾

”میں حالتِ حیض میں نبی اکرم ﷺ کے گیسوے مبارک کنگھے سے سنوار دیا کرتی تھی۔“

(6) اس سے بڑھ کر ایک صحیح حدیث میں تو یہاں تک مذکور ہے کہ شوہر اپنی حائضہ بیوی کے ساتھ لیٹ لپٹ سکتا ہے، جیسا کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

«بَيْنَمَا أَنَا مُضْطَجِعَةٌ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فِي الْخَمِيْلَةِ إِذْ حِضْتُ، فَانْسَلَلْتُ، فَأَخَذْتُ ثِيَابَ حَيْضَتِي، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: أَنْفَسْتِ؟ قُلْتُ: نَعَمْ، فَدَعَانِي فَاضْطَجَعْتُ مَعَهُ فِي الْخَمِيْلَةِ»⁽²⁾

”میں نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ایک چادر میں لیٹی تھی کہ مجھے حیض شروع ہو گیا، میں چپکے سے کھسک گئی اور حیض والے کپڑے پہن لیے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: کیا تم حائضہ ہو گئی ہو؟ میں نے عرض کی: ہاں، (اس کے باوجود بھی) نبی کریم ﷺ نے مجھے اپنے پاس بلایا اور میں آپ ﷺ کے ساتھ اسی چادر میں لیٹ گئی۔“

(7) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

«كُنْتُ أَنَا وَرَسُولُ اللَّهِ ﷺ نَبِيْتُ فِي الشَّعَارِ الْوَاحِدِ وَأَنَا طَامِثٌ أَوْ حَائِضٌ... إلخ»⁽³⁾

”میں اور نبی اکرم ﷺ ایک ہی چادر میں رات گزارتے، جبکہ میں حیض کی حالت میں ہوتی تھی۔“

(8) صحیح بخاری و مسلم کی ایک حدیث میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

(1) حوالہ سابقہ و التجريد الصريح يعني مختصر صحيح البخاري از علامہ زبیدی (۳۴/۱)

(2) مختصر صحيح البخاري للألباني، رقم الحديث (۱۶۹)

(3) سنن أبي داود، سنن النسائي، سنن الدارمي، مسند أحمد بحواله معجم الحديث (۲۶/۴)

«كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَأْمُرُ إِحْدَانَا إِذَا كَانَتْ حَائِضًا أَنْ تَشُدَّ إِزَارَهَا، ثُمَّ يَبَاشِرُهَا»⁽¹⁾

”ہم میں سے جب کوئی حیض کی حالت میں ہوتی تو نبی ﷺ اسے چادر باندھنے کا حکم فرماتے اور پھر مباشرت (جسم کے ساتھ ملانا) کرتے۔“

(9) ایک حدیث میں ام المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا (جو عم رسول حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی سالی اور

ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی خالہ بھی ہیں) بیان فرماتی ہیں:

«كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَبَاشِرُ الْمَرْأَةَ مِنْ نِسَائِهِ وَهِيَ حَائِضٌ، إِذَا كَانَ عَلَيْهَا إِزَارٌ يَبْلُغُ أَنْصَافَ الْفَخِذَيْنِ وَالرُّكْبَتَيْنِ (وَفِي حَدِيثِ اللَّيْثِ): مُحْتَجِزَةً بِهِ»⁽²⁾

”نبی ﷺ اپنی بیویوں میں سے کسی کے حائضہ ہونے کی حالت میں بھی مباشرت (جسم کے ساتھ جسم ملانا) فرمالتے تھے، بشرطیکہ اس نے نصف رانوں یا گھٹنوں تک چادر باندھی ہوئی ہوتی۔“

ان سب احادیث کا مجموعی مفاد اور خلاصہ وہی ہے، جو ہم نے پہلے صرف ایک ہی جملے میں ذکر کر دیا ہے، البتہ اس حالت (حیض) میں جماع کرنا منع اور حرام ہے، جیسا کہ قرآن کریم، سورۃ البقرہ (آیت: ۲۲۲) کی تفسیر اور نسائی میں مذکور ہے:

”یہودیوں میں یہ عادت تھی کہ جب بیوی فطری عذر کے ایام میں ہوتی تو وہ اس کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے نہ پیتے، حتیٰ کہ اسے اپنے گھر کے بیڈروم میں بھی نہ رہنے دیتے تھے۔ (گویا ان ایام میں وہ بیوی سے ٹوٹل بائیکاٹ کر لیتے تھے) اس سلسلے میں نبی اکرم ﷺ سے سوال کیا گیا، تو اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرہ کی آیت (۲۲۲) ﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ﴾ نازل فرمادی اور نبی اکرم ﷺ نے حکم فرمادیا کہ ان ایام میں اپنی بیویوں کے ساتھ مل کر کھاؤ پیو اور گھروں میں اکٹھے مل کر رہو۔

«... وَأَنْ يَصْنَعُوا بِهِنَّ كُلَّ شَيْءٍ مَا خَلَا الْجَمَاعَ»⁽³⁾

(1) بحوالہ سابقہ (۱۳) نسائی مع تعليقات السلفية ۱/۳۳-۳۴۔

(2) نسائی مع تعليقات السلفية ۱/۳۳-۳۴۔

(3) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (۲۷۷)۔

”ایک جماع کو چھوڑ کر باقی سب کچھ بیویوں کے ساتھ کر سکتے ہیں۔“

اس فرمان رسالت مآب ﷺ پر یہودیوں نے (بھڑک کر) کہا کہ یہ نبی (ﷺ) کوئی معاملہ بھی ایسا نہ چھوڑیں گے، جس میں ہماری مخالفت نہ کریں، تو حضرت اسید بن حمیر اور عباد بن بشر رضی اللہ عنہما نے اس قول کی خبر نبی اکرم ﷺ کو پہنچائی اور ساتھ ہی کہنے لگے: کیا ہم ان ایام میں جماع بھی کر لیں؟ تو یہ سن کر نبی اکرم ﷺ کا چہرہ اقدس (غصے سے) متغیر ہو گیا۔ راوی حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم سمجھے کہ آپ ﷺ ان پر سخت ناراض ہوں گے۔ اتنے میں وہ دونوں اٹھ کر چلے گئے۔ عین اسی وقت کوئی شخص دودھ کا ہدیہ خدمت اقدس میں لایا۔ آپ ﷺ نے کسی شخص کو بھیج کر ان دونوں کو واپس بلوایا اور انھیں دودھ پلایا، جس سے ان کا یہ خدشہ جاتا رہا اور انھیں معلوم ہو گیا کہ آپ ﷺ ان پر ناراض نہیں ہیں۔^(۱)

صحاح و سنن کی مذکورہ احادیث اور مسلم و نسائی کی تفسیری حدیث سے ان مخصوص ایام میں عورت کے دائرہ کار اور شوہر کے تعلقات کی حدود واضح ہو کر سامنے آ گئی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ مسلمان مرد وزن، وہ چاہے کسی بھی حالت میں ہوں، اُن کے جھوٹے کھانے اور پانی کے پاک ہونے کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ صرف ایک امام نخی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ وہ حائضہ عورت کے جھوٹے کونا پاک تو نہیں، البتہ مکروہ سمجھتے تھے۔^(۲) مگر ان کی یہ رائے جمہور اہل علم اور احادیث و آثار کے خلاف ہونے کی وجہ سے لائق اعتنا نہیں ہے اور یہی حال جابر بن زید کے قول کا ہے۔ جس میں وہ ایسے پانی سے وضو نہ کرنے کی رائے دیتے ہیں۔ امام ابن قدامہ نے ان کی تردید کی ہے۔^(۳)

② غیر مسلم کا جھوٹا:

غیر مسلم مرد وزن کے جھوٹے کھانے اور پانی کے حکم کے بارے میں تین آراء ہیں:

① امام ابن قدامہ رحمہ اللہ کے بقول اکثر ائمہ و فقہاء اور عام اہل علم کے نزدیک انسان کا جھوٹا پاک ہے۔ وہ مسلم ہو یا کافر، کیوں کہ کافر بہ حیثیت انسان اور بنی آدم کے مسلمان جیسا ہی ہے۔^(۴)

(۱) تفسیر ابن کثیر (۱/۳۰۹) بروایت مسلم، سنن النسائي (۱/۳۴)

(۲) المغني (۱/۶۹)

(۳) حوالہ سابقہ.

(۴) المغني (۱/۶۳-۶۹)

❖ بعض اہل علم غیر مسلم کی ذات کو نجس عین اور اس کے جھوٹے کو بھی نجس ہی قرار دیتے ہیں، جیسا کہ فتح الباری میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اور نیل الاوطار میں امام شوکانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے۔^(۱)

❖ امام قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر ”الجامع الأحكام القرآن“ میں ذکر کیا ہے: ”ہمارے بعض علما کا کہنا ہے کہ عیسائی اور تمام کفار و مشرکین، دائمی شرابی اور مُردار خور لوگوں کا جھوٹا مکروہ ہے، لیکن اگر کوئی اُن کے جھوٹے سے وضو کر لے تو اس پر کوئی مواخذہ بھی نہیں، جب تک کہ اُسے (کسی طرح سے) اس جھوٹے پانی کے نجس ہونے کا یقین نہ ہو جائے۔“^(۲)

غیر مسلم کے جھوٹے کے بارے میں یہ تین آرا ملتی ہیں، جنہیں ہم نے سرِ دست اختصار کے ساتھ ذکر کر دیا ہے۔

مخلوط معاشرے:

یہ بات تو آپ کے علم میں ہے کہ ہمیں عرب اور خلیجی ممالک میں ایسا معاشرہ میسر ہے جس کے افراد میں مسلم و غیر مسلم ہر قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ غیر مسلم افراد میں کچھ وہ لوگ ہیں، جنہیں اہل کتاب ہونے کا دعویٰ ہے اور وہ اپنے دعوے میں کہاں تک حق بہ جانب ہیں؟ یہ ایک الگ موضوع ہے۔ اہل کتاب یا یہود و نصاریٰ یعنی عیسائیوں کے علاوہ بھی مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں۔ مثلاً ہندو، سکھ، مرزائی یا قادیانی اور بڈھسٹ یا بدھ مت وغیرہ ہیں اور دین سے تعلق نہ رکھنے والے چاہے کسی بھی نظریے کی طرف منسوب ہوں۔ خالق کائنات اور مالک ارض و سما کے منکر و ملحد کمیونسٹ ہوں یا اللہ تعالیٰ کی ذات کے تو معترف ہوں، مگر اس کی عبادت کے ساتھ ساتھ غیر اللہ کی پرستش کرنے والے مُشرک ہوں۔ ان سبھی انواع و اقسام کے لوگ جس طرح یہاں مخلوط طور پر موجود ہیں ایسے ہی دیگر ممالک میں بھی پائے جاتے ہیں۔

مثلاً: پاکستان ایک اسلامی مملکت ہے، مگر وہاں غیر مسلم بھی موجود ہیں۔ انڈیا ایک غیر مسلم ملک اور سیکولر حکومت ہے، لیکن وہاں کروڑوں مسلمان بھی بستے ہیں۔ بنگلہ دیش، نیپال، برما اور ایران میں

(۱) فتح الباری (۱/۳۹۰) نیل الاوطار (۱/۲۰)

(۲) تفسیر القرطبی (۷/۴۴) طبع مصر.

بھی مخلوط معاشرہ ہے۔ خلیجی و مشرقی ممالک کی طرح مغربی و یورپی ممالک اور امریکہ و کینیڈا میں رہنے والے لوگوں کو بھی اسی صورتِ حال کا سامنا ہے، کیوں کہ ان علاقوں میں بھی تارکینِ وطن بکثرت موجود ہیں اور ان کی اکثریت بھی مسلمانوں ہی پر مشتمل ہے، کہیں مسلمان غیر مسلم حکومتوں کے زیرِ تسلط رہ رہے ہیں تو کہیں غیر مسلم اسلامی حکومتوں کے زیرِ سایہ ہیں۔ لہذا غیر مسلم لوگوں کے جھوٹے کھانے اور پانی یا دیگر مشروبات کا مسئلہ بھی نہایت اہم اور عالمگیر قسم کا ہے، اس لیے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع کو بھی قدرے تفصیل کے ساتھ آپ کے سامنے رکھ دیا جائے۔ تاکہ صحیح صورتِ حال واضح ہو جائے اور بلا وجہ کسی بھی تشدد کا مظاہرہ نہ ہونے پائے۔

اسلامی احکام کی وسعت:

بلا وجہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ تنگی کا رویہ اور تشدد کے رجحانات کی اسلام میں مذمت کی

گئی ہے، جیسا کہ صحیح مسلم، سنن ابی داؤد (واللفظ لہ) اور مسند احمد میں مروی ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«أَلَا هَلْكَ الْمُتَنَطِعُونَ، أَلَا هَلْكَ الْمُتَنَطِعُونَ، أَلَا هَلْكَ الْمُتَنَطِعُونَ»^①

”خبردار! (دین میں) تشدد برپا کرنے والے ہلاک ہو گئے۔ خبردار! تشدد برپا کرنے

والے ہلاک ہو گئے۔ خبردار! تشدد برپا کرنے والے ہلاک ہو گئے۔“

اس کا مفہوم یہ ہوا کہ دینِ اسلام بڑا فراخ اور کشادہ دین ہے۔ اس کی تعلیمات میں فطرت

کی رعایت رکھی گئی ہے اور تشدد سے اس کے احکام خالی ہیں۔ اس مفہوم کی تائید ایک ضعیف روایت

سے بھی ہوتی ہے، جو طبقات ابن سعد اور تاریخ بغداد میں مروی ہے:

«بُعِثْتُ بِالْحَنِيفِيَّةِ السَّمْحَةِ»^②

”میں وہ دین دے کر مبعوث کیا گیا ہوں، جو یکسوئی (توحید) اور فراخی والا ہے۔“

یہاں بھی دینِ اسلام کو حنیف اور فراخ ہی قرار دیا گیا ہے، مگر یہ روایت ضعیف ہے۔ البتہ اس

سے قدرے اچھی سند والی وہ روایت ہے، جس میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ

① صحیح الجامع الصغیر للالبانی (۳ / ۶ / ۸۹) غایۃ المرام فی تخریج کتاب الحلال والحرام

للقرضاوی علامہ البانی (ص: ۲۰)

② ضعیف الجامع الصغیر (۲ / ۳ / ۱۰)

سے پوچھا گیا:

«أَيُّ الْأَدْيَانِ أَحَبُّ إِلَيَّ اللَّهُ؟» «اللَّهُ تَعَالَى كُوسَبِّ سَبِّ سَادِينَ لِيَسْتَدِينُ؟»

تو آپ ﷺ نے جواباً فرمایا:

«الْحَنِيفِيَّةُ السَّمْحَةُ» «وَهُ دِينُ جَوْحَنِيَّةٍ وَيَكْسُوئِي أَوْ فِرَانِي وَسَعْتٌ وَاللَّهِ»

اس سے آپ ﷺ کا اشارہ دینِ اسلام اور اس کی وسعت والی تعلیمات کی طرف ہی تھا۔

یہ روایت بخاری شریف میں تعلیقاً، الادب المفرد اور مسند احمد (والزهد لأحمد، ص:

۲۸۹-۲۹۰ مرسلاً بسند صحیح) میں موصولاً مروی ہے۔ فتح الباری میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ

نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے، مگر اس کی سند میں ایک راوی محمد بن اسحاق بھی ہیں، جو محدثین کے

نزدیک مدلس معروف ہیں اور اگر وہ کسی حدیث کو صیغہ تحدیث سے بیان کریں، تو وہ صحیح اور قابل قبول

ہوتی ہے۔ اگر وہ محض عنعنہ سے بیان کریں تو وہ روایت قابل استدلال و حجت نہیں ہوتی اور یہ روایت

انہوں نے عن ہی سے بیان کی ہے۔ لہذا اسے حسن کہنے سے بھی بعض محدثین نے تامل کیا ہے۔^①

الغرض یہ روایات نہ بھی ہوں، تب بھی صحیح مسلم اور دیگر کتب والی پہلی حدیث ہی سے معلوم

ہو رہا ہے کہ ہمارے دینِ اسلام میں تشدد برتنے کو اچھا نہیں سمجھا گیا، بلکہ وسعت اور فراخی کی تعلیم

دی گئی ہے۔

نیج صحیح بخاری، سنن ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور دیگر کتب حدیث میں ارشاد نبوی ﷺ ہے:

«إِنَّمَا بُعِثْتُ مَيْسِرِينَ، وَلَمْ تَبْعَثُوا مُعَسِّرِينَ»^②

”تم آسانی پیدا کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو، شدت اور تنگی پیدا کرنے والے نہیں۔“

آپ ﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ جسے بھی کسی مہم پر روانہ فرماتے تو اُسے «يَسِّرُوا وَلَا

تُعَسِّرُوا» ”آسانی پیدا کرو، تنگی میں مبتلا نہ کرو۔“ کی نصیحت کر کے بھیجتے تھے۔

① غاية المرام (للألبانی) فی تخریج احادیث الحلال والحرام للقرضاوی (ص: ۲۲۰-۲۲۱) و تمام المنة

(للألبانی) فی التعلیق علی فقہ السنة لسید سابق (ص: ۴۴-۴۵)

② صحیح البخاری، رقم الحدیث (۲۲۰) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (۳۶۶) صحیح سنن

الترمذی، رقم الحدیث (۱۲۶) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۵۵) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث

(۵۲۸) المنتقى مع النیل (۱/۴۱) صحیح الجامع، رقم الحدیث (۲۳۵۰)

۳) غیر مسلم اہل کتاب کا جھوٹا:

گذشتہ صفحات میں کفار و مشرکین کے جھوٹے پانی یا کھانے کے بارے میں اہل علم کے تین اقوال ذکر کیے جا چکے ہیں، اب آئیے ان تینوں اقوال کے دلائل کا بھی جائزہ لیں۔

پہلا قول:

اس سلسلے میں پہلا قول اکثر ائمہ و فقہاء، عام اہل علم اور جمہور علما کا ہے کہ کافر کا جھوٹا پاک ہے اور پھر کافروں میں بھی دو طرح لوگ آتے ہیں۔ ایک وہ غیر مسلم جو اہل کتاب ہیں، جن میں یہودیوں اور عیسائیوں کا شمار ہوتا ہے اور دوسرے وہ (کافر) غیر مسلم جو اہل کتاب نہیں ہیں، مثلاً: ہندو، سکھ اور بدھ مت وغیرہ۔ ان میں سے اہل کتاب کے جھوٹے کا پاک ہونا تو قرآن و حدیث دونوں سے ثابت ہے، جبکہ غیر اہل کتاب کفار و مشرکین کے جھوٹے کا پاک ہونا، قول و فعل رسول ﷺ اور آثار صحابہ رضی اللہ عنہم سے ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم سورۃ المائدہ (آیت: ۵) میں ارشاد الہی ہے:

﴿الْيَوْمَ أُحِلَّ لَكُمْ الطَّيِّبَاتُ وَ طَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَكُمْ وَ طَعَامُكُمْ حِلٌّ لَهُمْ وَ الْمُحْصَنَاتُ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ وَ الْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسْفِحِينَ وَ لَا مُتَّخِذِي أَخْدَانٍ وَ مَنْ يَكْفُرْ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهُ وَ هُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَسِرِينَ﴾

”آج کے دن تمہارے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کی گئی ہیں اور اہل کتاب کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے اور مسلمان عورتوں میں سے پاک دامن عورتیں تمہارے لیے حلال ہیں، جبکہ تم ان کو ان کا حق مہر دے دو۔ بشرطیکہ تم (انہیں نکاح میں لا کر ان کے) محافظ بنو نہ کہ آزاد شہوت رانی کرنے لگو اور نہ چوری چھپے آشنائیاں کرنے لگو اور جس کسی نے ایمان کی روش پر چلنے سے انکار کیا، اس کے تمام اعمال ضائع ہو گئے اور وہ آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا۔“

اس آیت سے اہل کتاب کے جھوٹے کے پاک ہونے پر دو طرح سے استدلال کیا گیا ہے۔ لہذا

آئیے اس کی تفسیر و ترجمے پر مختصری نظر ڈالتے چلیں، جس میں دونوں طرح کے استدلال آجائیں گے۔
اہل کتاب کا کھانا:

۱ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کا کھانا ہمارے لیے اور ہمارا ان کے لیے حلال قرار دیا ہے، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ہمارے اور ان کے درمیان کھانے پینے میں کوئی جھوٹ جھاٹ اور چھوٹ جھات نہیں۔ ہم ان کے ساتھ کھا سکتے ہیں اور وہ ہمارے ساتھ کھا پی سکتے ہیں۔ اکثر علمائے تفسیر کے نزدیک یہاں کھانے سے مراد ان کے ذبح کردہ جانور کا گوشت ہے۔ معلوم ہوا کہ یہودی اور عیسائی کا ذبیحہ مسلمان کے لیے بھی کھانا جائز و حلال ہے اور اللہ تعالیٰ کو ان کا طریقہ ذبح تو معلوم ہی ہے، لہذا بعض اہل علم کے نزدیک تو ان کا ذبیحہ مطلقاً حلال ہے۔ البتہ حضرت علی، ام المومنین حضرت عائشہ، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور امام طاووس و حسن بصری رضی اللہ عنہما کے نزدیک اگر انھوں نے ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام لیا ہو تو اس کا کھانا جائز نہیں، انھوں نے اس بات پر سورت انعام کی آیت (۱۲۱) سے استدلال کیا ہے، جس میں ارشاد الہی ہے:

﴿وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ﴾

”اور (بہ وقت ذبح) جس ذبیحے پر اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا گیا ہو، اُسے نہ کھاؤ، کیوں کہ ایسا کرنا فسق ہے۔“

امام مالک رضی اللہ عنہ کے نزدیک ایسا ذبیحہ حرام تو نہیں، البتہ مکروہ ہے، جبکہ دوسرے اکثر علما ان کے ذبیحے کو مطلقاً حلال مانتے ہیں، کیوں کہ امام عطاء اللہ کے بقول اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ وہ کس طرح ذبح کرتے اور بہ وقت ذبح کیا کہتے اور کس کا نام لیتے ہیں۔ ذبیحے کے علاوہ ان کے دوسرے کھانے مثلاً پھل اور گندم وغیرہ کا کھانا بالاتفاق حلال و جائز ہے، کیوں کہ ان کے تو کسی مسلم یا غیر مسلم کی ملکیت میں ہونے سے کوئی فرق ہی نہیں پڑتا۔ ان کے تیار کردہ کھانوں کو بھی جائز قرار دیا گیا ہے، کیوں کہ جب ذبیحہ حلال ہے، جس کا عقیدہ و دین سے تعلق ہے تو پھر ان کا تیار کردہ کھانا کیسے حلال نہیں ہو سکتا کہ جس کا عقیدہ و دین اور بسم اللہ پڑھنے یا تکبیر پڑھنے سے کوئی تعلق ہی نہیں، جب کہ مجوسی یا آتش پرست چونکہ ایک شاذ قول سے قطع نظر تمام علما کے مشہور قول کے مطابق اہل کتاب

نہیں ہیں، لہذا نہ ان کا ذبیحہ حلال ہے اور نہ ان کی عورتوں سے نکاح جائز ہے۔^①

اہل کتاب کے ذبیحے اور دیگر کھانوں کے جائز ہونے اور انہیں کھانے کی عام اجازت دینے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ﴿الْيَوْمَ أَحْلَلْ لَكُمْ الطَّيِّبَاتِ﴾ کا اعادہ فرمایا ہے کہ ”آج تمہارے لیے تمام پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئی ہیں۔“

اس سے پتا چلتا ہے کہ اہل کتاب اگر طہارت اور پاکیزگی کے ان قوانین کی پابندی نہ کریں، جو شریعت کے نقطہ نظر سے ضروری ہیں یا پھر ان کے کھانے میں حرام چیزیں شامل ہوں، تو پھر ان کا کھانا ہرگز جائز نہ ہوگا۔ مثلاً: اہل کتاب میں سے کسی کے دسترخوان پر کسی حرام جانور کا گوشت ہو، شراب وغیرہ مشروب ہو تو وہ ہرگز حلال نہیں ہوگا۔^②

اہل کتاب عورتوں سے نکاح:

۲] اسی آیت کے دوسرے حصے ”ان (اہل کتاب) کی عورتیں بھی تمہارے لیے حلال ہیں۔“ اس سے بھی ان کے جھوٹے کے پاک ہونے پر استدلال کیا گیا ہے کہ جب ان کی عورتوں سے نکاح جائز ہے تو ان کا جھوٹا کیسے ناپاک ہو سکتا ہے؟

پھر عام علمائے دین کے نزدیک کسی کے جھوٹے، اس کے پسینے اور اس کے لعاب دہن کا حکم ایک ہی ہے اور کسی بھی شوہر کا اپنی بیوی کے پسینے سے پوری طرح بچے رہنا غیر معقول بلکہ ایک محال امر ہے۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اور اہل علم میں سے کسی نے اہل کتاب بیوی کے پسینے کے لگ جانے سے غسل واجب قرار نہیں دیا، بلکہ صرف اسی شکل میں غسل واجب ہے، جس میں مسلمان بیوی سے واجب ہوتا ہے۔ اس طرح بھی اہل کتاب غیر مسلم کے جھوٹے کو پاک قرار دیا گیا ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہیں ہم ایک اہم بات کی طرف بھی اشارہ کر دیں کہ اللہ تعالیٰ نے غیر مسلم اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح صرف حلال و جائز قرار دیا ہے، مگر یہ مستحسن و پسندیدہ فعل نہیں ہے، لہذا اگر کسی کو کسی وجہ سے اہل کتاب عورت سے نکاح کرنا ہی پڑ جائے تو اسے اپنے مذہب و عقیدہ اور خاص طور پر اپنی اولاد کے مذہب و عقیدے کی بھی فکر کر لینی چاہیے کہ کہیں جذبات کے بہاؤ میں

① مختصراً از تفسیر القرطبی.

② اس تفصیل سے غیر مسلم اہل کتاب کے ذبیحے، کھانے اور جھوٹے کے پاک ہونے کا طریقہ استدلال واضح ہو گیا۔

خود بھی بیوی کے عقیدے میں نہ بہہ جائے اور کہیں بچوں کو ایسی غیر اہل کتاب بیوی کی تربیت کی وجہ سے اپنے ہاتھوں سے نہ کھودے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت کے آخر میں یہ تشبیہ بھی فرمادی ہے:

﴿وَمَنْ يَكْفُرْ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخُسِرِينَ﴾

[المائدہ: ۵]

”جس کسی نے ایمان کی روش پر چلنے سے انکار کر دیا تو اس کے تمام اعمال ضائع ہو گئے اور وہ آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا۔“

ان کلمات سے یہ سمجھانا مقصود ہے کہ کہیں یہودی یا عیسائی ”میم“ کی شادی کی خاطر دولتِ ایمان نہ کھو بیٹھنا اور معروف مترجم قرآن حضرت محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے بقول اہل کتاب کو دوسرے کفار سے ان دو حکموں (کھانے اور نکاح) میں مخصوص کیا ہے، جو صرف دنیا کی حد تک ہے۔ آخرت میں دولتِ ایمان و اسلام سے تہی دامن ہر کافر کا انجام بربادی ہے۔

یہیں یہ بات بھی ذہن نشین کر لیں کہ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب عورتوں سے نکاح کی جو اجازت بخشی ہے اس کے ساتھ ہی چند شرائط بھی لگا دی ہیں کہ وہ محصنات یا محفوظ و پاک دامن ہوں، آوارہ نہ ہوں، ان سے حق مہر ادا کر کے نکاح کرنے میں ان کا محافظ بننا اصل غرض ہو، نہ کہ آزاد شہوت رانی کا ارادہ اور نہ چوری چھپے آشنائیاں کرنے کا قصد ہو۔

ان شرائط کو پورا کرنے والا ان سے نکاح کر سکتا ہے۔ یہ نہیں کہ پہلے آشنائیاں ہوں، خلوتِ محرّمہ ہو، حتیٰ کہ جب پانی سر سے گزر جائے اور لڑکی کسی نئی رُوح کی آمد کی خبر دے کر نکاح کرنے کا مطالبہ کرے تو پھر اس آیت کا سہارا لے کر نکاح کا سوانگ رچایا جائے۔ اس آوارہ اور فحش انداز سے مذکورہ شرائط کہاں پوری ہو سکتی ہیں اور وہ نکاح بھی کیا ہوگا؟ أَعَادَنَا اللَّهُ مِئْتَهُ۔

سورۃ المائدہ کے بارے میں ابو میسرہ کا قول ہے:

”یہ نزول کے اعتبار سے سب سے آخری سورت ہے اور اس میں مذکورہ احکام میں سے کوئی حکم منسوخ نہیں ہوا۔“

البتہ امام شعمی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک صرف ﴿وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ﴾ اور بعض کے

زردیک ﴿أَوْ آخَرَانِ مِنْ غَيْرِكُمْ﴾ منسوخ ہیں اور باقی تمام احکام محکم ہیں۔^(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ اہل کتاب کے کھانے کا جواز برقرار ہے، منسوخ نہیں ہوا۔ متعدد احادیث اور آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی اہل کتاب کے جھوٹے پانی اور کھانے کو پاک ثابت کیا گیا ہے اور ان کے ہاتھوں کے تیار کردہ کھانے کو بھی جائز و پاک اور حلال قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ صحیح بخاری اور دیگر کتب حدیث و سیرت میں واقعہ مشہور ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے خیبر کی ایک یہودیہ عورت کی طرف سے ہدیہ دی گئی زہریلی بکری کا گوشت کھایا تھا۔^(۲)

سنن ابو داؤد اور مسند احمد میں ہے کہ آپ ﷺ نے عیسائی ممالک سے لایا گیا پنیر کھایا۔^(۳) مسند احمد میں ایک یہ واقعہ بھی مذکور ہے:

”حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک یہودی نے جو کی روٹی اور بدلی ہوئی والا رغنی سالن تیار کر کے نبی اکرم ﷺ کی دعوت کی تو آپ ﷺ نے اس کی دعوت قبول فرمائی۔“^(۴)

سنن دارقطنی میں امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بارے میں مذکور ہے کہ انہوں نے ایک عیسائی گھر کے برتن سے وضو کیا، چنانچہ حضرت زید بن اسلم اپنے والد کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ جب ہم شام میں تھے تو میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے لیے پانی لایا، جس سے انہوں نے وضو کیا۔ وضو کر چکے تو پوچھا: یہ پانی کہاں سے لائے ہو؟ میں نے اس سے اچھا اور عمدہ پانی کہیں نہیں دیکھا۔ کہتے ہیں کہ میں نے بتایا کہ میں ایک بوڑھی عیسائی عورت کے گھر سے یہ پانی لایا ہوں، چنانچہ جب وہ وضو سے فارغ ہوئے تو اس بوڑھی عورت کے پاس تشریف لائے اور ان سے مخاطب ہو کر گویا ہوئے:

«أَيُّهَا الْعَجُوزُ اسْلِمِي تَسْلِمِي، بَعَثَ اللَّهُ مُحَمَّدًا ﷺ بِالْحَقِّ»

”اے بوڑھی عورت! اسلام لے آؤ، سلامتی پاؤ گی، اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے۔“

اس عورت نے اپنا سر کھولا، جو بڑھاپے سے پوری طرح سفید ہو چکا تھا اور کہنے لگی: میں بہت بوڑھی عمر والی ہوں، اب تو میں مرنے جا رہی ہوں۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

(۱) تفسیر القرطبی (۳/۶/۳۰-۳۱)

(۲) صحیح البخاری کتاب الہبۃ باب قبول الہدیۃ من المشرکین.

(۳) نیل الأوطار (۱/۲۱)

(۴) نیل الأوطار (۱/۲۱)

﴿اللَّهُمَّ اشْهَدْ﴾^(۱) ”اے اللہ گواہ رہنا“

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک عیسائی عورت کے برتن سے لائے گئے پانی کے ساتھ وضو کا ذکر امام الحدیث حضرت امام بخاری رضی اللہ عنہ نے بھی کیا ہے۔^(۲)

غیر اہل کتاب کفار و مشرکین کا جھوٹا:

جہاں تک غیر اہل کتاب کفار و مشرکین کے جھوٹے کا تعلق ہے تو اسے بھی جائز قرار دیا گیا ہے، کیوں کہ صحیح بخاری و مسلم سمیت دیگر کتب حدیث میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایک مشرک عورت کے مشکیزے سے وضو فرمایا تھا۔^(۳)

امام قرطبی رضی اللہ عنہ لکھتے ہیں کہ کفار و مشرکین جو اہل کتاب نہیں، ان کا پکایا ہوا کھانا کھانے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں، بشرطیکہ وہ کھانا گوشت نہ ہو، جسے انھوں نے خود ذبح کیا ہو، کیوں کہ غیر اہل کتاب کا ذبیحہ حلال نہیں ہے۔^(۴)

دوسرے عام کھانے کے پاک اور حلال ہونے پر اکثر علما کا اتفاق ہے، بشرطیکہ وہ کسی حرام چیز پر مشتمل نہ ہو اور جس برتن میں اسے پکایا اور رکھا گیا ہو، وہ بھی ظاہری نجاست سے پاک ہو۔

فقہ حنفی کی معتبر کتب میں بھی کفار کے جھوٹے کو پاک قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ فتاویٰ عالمگیری جس کا عربی نام ”الفتاویٰ الہندیۃ“ ہے اور مصر سے شائع ہوا ہے، اس کی جلد اول (ص: ۲۲) میں مذکور ہے:

﴿سُوْرُ الْاَدَمِيِّ طَاهِرٌ، وَيَدْخُلُ فِيْهِ الْجَنْبُ وَالْحَائِضُ وَالنَّفْسَاءُ وَالْكَافِرُ﴾

”آدمی کا جھوٹا پاک ہے اور اس حکم میں جنبی مرد و زن، حیض و نفاس والی عورتیں اور کافر سب شامل ہیں۔“

نیز دُرِّ مختار میں ہے:

﴿فَسُوْرُ الْاَدَمِيِّ مُطْلَقًا، وَلَوْ جُنْبًا أَوْ كَافِرًا، طَاهِرٌ﴾^(۵)

”آدمی کا جھوٹا مطلقاً پاک ہے، چاہے وہ جنبی ہو یا کافر۔“

(۱) بحوالہ تفسیر القرطبی (۷/۱۳/۴۴)

(۲) صحیح البخاری مع الفتح (۱/۲۹۸ تعلقاً)

(۳) بلوغ المرام ابن حجر مع السبل (۱/۷۱) نیل الأوطار (۱/۲۱) التجرید الصریح (۱/۳۷)

(۴) تفسیر القرطبی (۳/۶/۷۷-۷۸)

(۵) دُرِّ مختار علیٰ هامش رد المحتار (۱/۱۴۸)

اہل کتاب اور غیر اہل کتاب کفار و مشرکین کے برتنوں کا حکم

1 پہلا قول اور اس کے دلائل:

اہل کتاب اور غیر اہل کتاب کفار و مشرکین کے برتنوں میں کھانا کھالینے کی بھی شرعاً کوئی ممانعت نہیں۔ کتاب اللہ اور کسی صحیح و صریح حدیث رسول ﷺ سے اس کی حرمت ثابت نہیں ہے، بلکہ صحیح بخاری (کتاب الہبۃ، باب قبول الہدیۃ من المشرکین) میں چار احادیث ہیں، جن میں سے ایک میں وہ واقعہ بھی مذکور ہے، جو ہم نے سابقہ سطور میں ذکر کیا ہے کہ آپ ﷺ نے ایک یہودیہ عورت کی پیش کردہ زہر آلود بکری قبول کی اور اسے تناول فرمایا، نیز صحیح بخاری و مسلم میں مذکور ہے کہ نبی ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ایک مشرکہ عورت کے مشکیزے سے وضو کیا۔

(1) سنن ابو داؤد اور مسند احمد اور اسی معنی میں مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

«كُنَّا نَعْرُزُ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَنُصِيبُ مِنْ آيَةِ الْمُشْرِكِينَ وَأَسْقِيَتِهِمْ فَسْتَمْتَعُ بِهَا، فَلَا يَعْيبُ ذَلِكَ عَلَيْهِمْ»⁽¹⁾

”ہم نبی ﷺ کی معیت میں غزوات پر نکلا کرتے تھے اور اس دوران میں مشرکین کے کھانے اور پینے کے برتن ہمارے ہاتھ لگتے۔ ہم ان برتنوں کو استعمال میں لاتے اور نبی ﷺ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر کوئی عیب نہیں لگاتے تھے۔“

مسند بزار میں مروی ہے:

«فَنَغْسِلُهَا وَنَأْكُلُ فِيهَا»⁽²⁾ ”ہم انھیں دھوتے اور ان میں کھانا کھاتے۔“

(1) صحیح سنن أبي داود، رقم الحديث (۳۲۵۱) نیل الأوطار (۱/۲۱)

(2) فتح الباري (۹/۶۲۳)

ہاں اگر یہ معلوم ہو جائے کہ کوئی کافر و مشرک اپنے ہاں خنزیر پکاتا اور شراب پیتا ہے تو ایسے برتنوں کو دھولینا چاہیے، تب وہ بھی قابل استعمال ہو جاتے ہیں۔
 ﴿2﴾ جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابو ثعلبہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کی:

«إِنَّا بِأَرْضِ قَوْمِ أَهْلِ الْكِتَابِ، أَفَنَأْكُلُ فِيهِمْ؟»

”ہم اہل کتاب لوگوں کے ملک (یا علاقے) میں رہتے ہیں، کیا ہم ان کے برتنوں میں کھا سکتے ہیں؟“

اس پر نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«إِنْ وَجَدْتُمْ غَيْرَهَا فَلَا تَأْكُلُوا فِيهَا، وَإِنْ لَمْ تَجِدُوا فَاعْسِلُوهَا وَكُلُوا فِيهَا»^①

”اگر تمہیں دوسرے برتن ملیں تو پھر ان کے برتنوں میں نہ کھاؤ اور اگر دوسرے نہ ملیں تو انہیں دھولو اور ان ہی میں کھا لو۔“

سنن ابی داؤد اور مسند احمد میں ہے:

«إِنَّ أَرْضَنَا أَرْضَ أَهْلِ الْكِتَابِ وَإِنَّهُمْ يَأْكُلُونَ لَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَيَشْرَبُونَ الْخَمْرَ فَكَيْفَ نَصْنَعُ بِأَنْبِيَتِهِمْ وَقُدُورِهِمْ؟»

”ہمارا علاقہ اہل کتاب کا علاقہ ہے اور وہ خنزیر کھاتے اور شراب پیتے ہیں۔ ہم ان کے برتنوں اور ہنڈیوں کا کیا کریں؟“

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«فَإِنْ لَمْ تَجِدُوا غَيْرَهَا فَارْحُضُوا بِالْمَاءِ، وَاطْبَخُوا فِيهَا وَأَشْرَبُوا»^②

”اگر تمہیں کوئی دوسرے برتن نہ ملیں تو انہیں پانی سے دھولو اور ان کی ہنڈیوں میں سالن پکاؤ اور برتنوں میں پانی پیو۔“

سنن ترمذی میں ہے:

① التجريد الصريح (۱۳۹/۲/۱)

② صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (۳۳۵۲) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (۱۴۶۸)

«سُئِلَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنْ قُدُورِ الْمَجُوسِ»

”نبی اکرم ﷺ سے آتش پرست مجوسیوں کی ہنڈیوں کے بارے میں پوچھا گیا۔“

تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَنْقَوْهَا غَسَّلاً وَاطْبَخُوا فِيهَا»^①

”انھیں دھو کر صاف کر لو اور ان میں اپنا کھانا پکاؤ۔“

⑤ مسند احمد کا واقعہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ کفار کے برتن میں کھانا کھایا جاسکتا ہے۔ کیونکہ خود

نبی کریم ﷺ نے ایک یہودی کی دعوت قبول کی، جس میں اس نے جو کی روٹی اور بدلی ہوئی ہوا والا روغنی سالن تیار کیا تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ والا واقعہ بھی اس کی دلیل ہے کہ انھوں نے ایک عیسائی عورت کے برتن سے

وضو کیا تھا۔

ان تمام واقعات سے غیر مسلموں کے برتنوں کے استعمال کا جواز نکلتا ہے۔ البتہ بعض اہل علم نے غیر اہل کتاب اور وہ اہل کتاب جو خنزیر کھاتے ہیں، ان کے برتنوں کو تو دھوئے بغیر استعمال کرنے سے مطلقاً منع کیا ہے اور جو اہل کتاب ایسا نہ کرتے ہوں، ان کے برتنوں کو دھوئے بغیر بھی استعمال کرنے کی اجازت دی ہے، تاکہ دونوں طرح کی احادیث میں مطابقت پیدا ہو جائے۔ بعض علما کے نزدیک مستحب یہ ہے کہ غیر مسلم چاہے کوئی ہو، ان کے برتنوں کو دھو لیا جائے۔ کیونکہ سنن ترمذی، نسائی، مسند احمد، مستدرک حاکم اور صحیح ابن حبان میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی اکرم ﷺ سے یہ ارشاد حفظ کیا ہے:

«دَعْ مَا يَرِيْبُكَ إِلَىٰ مَا لَا يَرِيْبُكَ»^②

”مشکوک چیز کو چھوڑ کر غیر مشکوک کو اختیار کر لو۔“

فتاویٰ عالمگیری میں ہے کہ مشرکین کے برتنوں میں انھیں دھوئے بغیر کھانا پینا مکروہ ہے، لیکن

① صحیح البخاری مع فتح الباری (۹/۲۲۲-۲۲۳) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۱۴۶۷) نیل الأوطار (۲۱/۱)

② صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۲۰۴۵) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۵۲۶۹) نیل الأوطار (۲۲/۱) صحیح الجامع، رقم الحدیث (۳۳۷۷)

اگر کوئی کھاپی لیتا ہے تو یہ حرام بھی نہیں ہے اور یہ تب ہے جب برتنوں کی نجاستِ ظاہری کا علم نہ ہو، اگر ان میں نجاست لگی معلوم ہو جائے تو پھر انہیں دھوئے بغیر ان میں کھانا جائز نہیں۔^①

② دوسرا قول اور اس کے دلائل:

غیر مسلم کے جھوٹے کے بارے میں دوسرا قول بعض اہلِ ظاہر کا ہے کہ غیر مسلموں کا جھوٹا ناپاک اور نجس ہے، حتیٰ کہ وہ خود بھی ناپاک اور نجس ہوتے ہیں۔ اُن کا استدلال ایک قرآنی آیت اور بعض احادیثِ نبویہ ﷺ سے ہے:

① ان کی پہلی دلیل سورۃ التوبہ کی (آیت: ۲۸) ہے، جس میں ارشادِ الہی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ
بَعْدَ عَامِهِمْ هَذَا﴾

”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، بلاشبہ مشرک ناپاک ہیں۔ پس اس سال کے بعد وہ مسجد حرام کے قریب نہ پھٹکیں۔“

اس آیت کے ظاہری الفاظ سے مشرکین کے نجس و ناپاک ہونے اور ان کے جھوٹے کے بھی ناپاک ہونے کی دلیل لی گئی ہے۔

② اس قول والوں کی دوسری دلیل صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں مذکور ایک ارشادِ نبوی ﷺ کا منطوق نہیں، بلکہ مفہوم ہے، جس میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

﴿إِنَّ الْمُؤْمِنَ لَا يَنْجَسُ﴾^② ”مومن نجس و ناپاک نہیں ہوتا۔“

دوسری روایت میں ہے:

﴿إِنَّ الْمُسْلِمَ لَا يَنْجَسُ﴾^③ ”مسلمان ناپاک اور نجس نہیں ہوتا۔“

کفار و مشرکین کے جھوٹے کو ناپاک کہنے والوں نے اس سے یوں دلیل لی ہے کہ نبی ﷺ نے مومن و مسلم کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ کبھی ناپاک و نجس نہیں ہوتا، تو اس کا مفہوم مخالف یہ ہوا

① الفتاویٰ الہندیۃ المعروف فتاویٰ عالمگیری (۵/ ۳۴۷) طبع مصر.

② صحیح البخاری مع فتح الباری (۱/ ۴۶۶) صحیح مسلم مع شرح النووی (۲/ ۴/ ۶۵)

③ صحیح مسلم مع شرح النووی (۲/ ۴/ ۶۵)

کہ مومن و مسلم کو چھوڑ کر تمام غیر مسلم اہل کتاب اور دیگر کفار و مشرکین نجس و ناپاک ہیں اور ان کا جھوٹا بھی نجس و ناپاک ہے۔

③ تیسری دلیل وہ حدیث ہے جو صحیح بخاری و مسلم، سنن ابی داؤد و ترمذی اور مسند احمد میں مروی ہے، جس میں حضرت ابو ثعلبہ رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ سے استفہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم اہل کتاب کے علاقے میں رہتے ہیں۔ کیا ہم ان کے برتنوں میں کھالیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”اگر تمہیں دوسرے برتن ملیں تو ان برتنوں میں نہ کھاؤ اور اگر دوسرے نہ ملیں، تو پھر انہیں دھولو اور انہیں میں کھا لو۔“ سنن ابوداؤد اور مسند احمد کے الفاظ میں یہ بھی مذکور ہے کہ ”وہ خنزیر کھاتے اور شراب پیتے ہیں۔“

اس حدیث سے یوں استدلال کیا جاتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے انہیں نجس اور ناپاک سمجھا، اس لیے ان کے برتن دھو کر استعمال کرنے کا حکم فرمایا، لہذا عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ اور حسن بصری رضی اللہ عنہ انہیں نجس عین قرار دیتے تھے۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ تو ان کے معاملے میں یہاں تک کہا کرتے تھے:

”مَنْ صَافَحَهُمْ فَلَيْتَوَضَّأُ“^① ”جو شخص ان سے مصافحہ کرے تو وہ بعد میں وضو کرے۔“

④ ان کی چوتھی دلیل وہ واقعہ ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ نے بنو ثقیف کے وفد کو مسجد میں بٹھایا تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا تھا:

”قَوْمٌ أَنْجَاسٌ“^② ”یہ تو نجس لوگ ہیں۔“

تو نبی کریم ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے اس قول کی تردید نہیں کی تھی، جو ان کے واقعی نجس ہونے کی دلیل ہے۔

دور حاضر کے معروف عالم اور انجمن خدام القرآن لاہور پاکستان کے مؤسس و امیر جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے دورہ سعودی عرب کے دوران میں ”الخبر“ پاکستانی سکول میں قومی و ملی مسائل پر گفتگو کی رپورٹ ۱۹ نومبر ۱۹۸۵ء کے نوائے وقت کراچی میں نشر ہوئی اور وہی رپورٹ نوائے وقت کے حوالے سے موصوف نے اپنے پرچہ ماہنامہ ”بیثاق“ لاہور کے شمارہ ماہ فروری ۱۹۸۶ء میں

① تفسیر ابن کثیر (۲/۳۴۶) زاد المسیر (۳/۴۱۷) تفسیر القرطبی (۴/۸/۱۰۳)

② نیل الأوطار (۱/۲۰)

شائع کی، جس میں غیر مسلموں کے جھوٹے کے سلسلے میں اسی ظاہری نقطہ نظر (کہ غیر مسلموں کا جھوٹا ناپاک اور نجس ہے، اس لیے کہ وہ خود بھی ناپاک و نجس ہوتے ہیں) کو ہی اختیار کیا گیا تھا، جس پر ہمارے ایک فاضل دوست جناب غازی عزیز (مقیم الجبیل، حال جدہ، سعودی عرب) نے تعاقب کیا تو ڈاکٹر صاحب نے اس تنقیدی مضمون کو ”میشاق“ ماہ ستمبر ۱۹۸۶ء کے شمارے میں شائع کر دیا، جو ان کی وسعتِ ظرفی اور جذبہ قبولِ حق کی دلیل ہے اور موصوف کا اپنی سابقہ رائے سے رجوع کا ثبوت بھی۔

جَزَاهُمَا اللَّهُ خَيْرًا وَالْحَقُّ أَحَقُّ أَنْ يُتَّبَعَ.

ان دلائل کا جائزہ

1 پہلی دلیل:

اب آئیے ان چاروں دلائل کا جائزہ لیں، جو بعض اہل ظاہر کے ہیں۔ ان کی پہلی دلیل وہ ہے، جو سورۃ التوبہ (آیت: ۲۸) سے لی گئی ہے کہ مشرکین نجس ہیں۔

جائزہ:

اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ یہ بات متفق علیہ نہیں کہ وہ ذات اور جسم و بدن کے لحاظ سے ناپاک اور نجس عین ہیں، بلکہ اس آیت میں ان کے عقیدے کی نجاست مراد لی گئی ہے، جسے اعتقادی و معنوی نجاست کہا جائے گا، ظاہری وحسی نہیں، جیسا کہ تفسیر ابن کثیر میں ہے:

”أَمَّا نَجَاسَةُ بَدَنِهِ فَالْجَمُّهُورُ عَلَى أَنَّهُ لَيْسَ بِنَجَسِ الْبَدَنِ وَالذَّاتِ، لِأَنَّ اللَّهَ تَعَالَى أَحَلَّ طَعَامَ أَهْلِ الْكِتَابِ“^①

”مشرک کے بدن کی نجاست کے بارے میں جمہور اہل علم کا قول یہ ہے کہ ان کا بدن اور ذات نجس نہیں، کیوں کہ خود اللہ تعالیٰ نے ان کے کھانے کو حلال قرار دیا ہے۔“

علامہ ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ نے ”زاد المسیر فی علم التفسیر“ میں اس سلسلے میں تین اقوال نقل کیے ہیں اور ظاہریہ کے ساتھ ساتھ عمر بن عبدالعزیز اور حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو چھوڑ کر

① تفسیر ابن کثیر (۲/۲۴۶)

دوسرے دونوں اقوال میں انھیں نجس عین قرار نہیں دیا گیا۔^①

”تفسیر جلالین (علیٰ ہامش المصحف، آية التوبة، آیت: ۲۴)“ میں بھی یہی مذکور ہے کہ مشرکین اپنی باطنی خباثت کے باعث نجس ہیں (ظاہری طور پر نہیں)۔
مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت (۲۸) کا ترجمہ یوں فرمایا ہے:
”مشرک لوگ (بوجہ عقائدِ خبیثہ) نرے ناپاک ہیں۔“
گویا ان کے نزدیک بھی مشرکین کی نجاست اعتقادی ہے، ظاہری نہیں۔
تفہیم القرآن میں لکھا ہے:

”مشرکین کے (ناپاک ہونے سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ خود ناپاک ہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے اعتقادات، ان کے اخلاق، ان کے اعمال اور ان کے جاہلانہ طریق زندگی ناپاک ہیں۔“^②

ان تفسیری حوالوں کے علاوہ کتبِ فقہ اور شروح حدیث کا مطالعہ کریں تو بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نجاست سے اعتقادی نجاست ہی مراد ہے، چنانچہ فتح الباری شرح صحیح بخاری میں لکھا ہے:
”جمہور علما کے نزدیک اس آیت سے مراد یہ ہے کہ مشرکین اپنے عقائد میں نجس ہیں۔
جمہور کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کو مباح قرار دیا ہے اور ایسا مسلمان مرد اپنی کتابیہ بیوی کے پسینے سے نہیں بچ سکتا، مگر کتابیہ کا پسینہ لگنے سے کسی پر غسل واجب نہیں ہوتا، جو ان کے نجس عین نہ ہونے کی دلیل ہے۔“^③

”نیل الأوطار شرح منتقى الأخبار“ میں امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے، ”عون المعبود شرح أبي داود“ میں علامہ شمس الحق عظیم آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے اور ”تحفة الأحوذی شرح سنن الترمذی“ میں علامہ عبدالرحمن مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے مشرک سے مصافحہ کے بعد وضو کرنے کی رائے کو مشرکین سے ان کے بعد و احتراز میں ایک مبالغہ آمیز فعل قرار دیا ہے۔^④

① زاد المسیر امام ابن الجوزی (۳/ ۴۱۷) طبع بیروت.

② تفہیم القرآن مولانا مودودی (۲/ ۱۸۷) طبع ادارہ ترجمان لاہور و ترجمہ قرآن مولانا تھانوی، آیت مذکورہ.

③ مختصراً از فتح الباری (۱/ ۳۹۰)

④ عون المعبود شرح سنن أبي داود للعلامة شمس الحق عظیم آبادی (۱/ ۹۲ و ۱/ ۲۸) طبع قدیم دہلی و ملتان،

تحفة الأحوذی شرح سنن الترمذی للعلامة عبدالرحمن مبارک پوری طبع قدیم (۱/ ۱۱۶) نیل الأوطار (۱/ ۲۰)

”الفقه على المذاهب الأربعة“ میں علامہ جزیری رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اس ارشادِ الہی: ﴿أَمَّا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ﴾ سے مراد ان کی معنوی نجاست ہے، جس کا حکم شارح نے بیان فرما دیا ہے۔ اس سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ ان کی ذات و بدن (خزیر کی طرح) نجس عین ہیں۔^(۱) اسی طرح ”المنار“ میں علامہ مقبلی نے مذکورہ آیت سے کافر کی نجاست پر استدلال کرنے کو وہم قرار دیا ہے۔^(۲)

اہل علم کی ان تصریحات سے یہ بات واضح ہوگی کہ ظاہر یہ کی پہلی دلیل ہی کمزور ہے اور سورۃ التوبہ کی آیت (۲۴) میں مشرکین کی جو نجاست بیان ہوئی ہے، وہ اعتقادی و حکمی نجاست ہے، ظاہری و حسی یا جسمانی و بدنی نہیں۔

2 دوسری دلیل:

ان کی دوسری دلیل صحاح و سنن میں مذکور اس ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مفہوم مخالف سے ہے، جس میں مذکور ہے:

«إِنَّ الْمُؤْمِنَ لَا يَنْجُسُ»^(۳) ”یقیناً مومن نجس نہیں ہوتا۔“

ایک روایت میں ہے:

«إِنَّ الْمُسْلِمَ لَا يَنْجُسُ»^(۴) ”یقیناً مسلمان نجس نہیں ہوتا۔“

ان کے نزدیک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ مومن نجس نہیں ہوتا، اس بات کا متقاضی ہے کہ غیر مومن اور غیر مسلم نجس ہوتا ہے۔

(۱) الفقه على المذاهب الأربعة للجزيري (۶/۱) طبع بيروت.

(۲) نیل الأوطار (۲۱/۱) طبع بيروت

(۳) صحیح سنن أبي داود، رقم الحديث (۲۱۱ - ۲۱۲) صحیح سنن الترمذی، رقم الحديث (۱۰۵) صحیح سنن النسائي، رقم الحديث (۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۵۳۴، ۵۳۵) مسند أحمد (۳۸۴، ۲۳۵/۱)

(۴) صحیح سنن أبي داود، رقم الحديث (۲۱۱ - ۲۱۲) صحیح سنن الترمذی، رقم الحديث (۱۰۵) صحیح سنن النسائي، رقم الحديث (۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۵۳۴، ۵۳۵) مسند أحمد (۳۸۴، ۲۳۵/۱)

جائزہ:

اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ اکثر علمائے اصول کے نزدیک مفہوم مخالف شرعی حجت و دلیل نہیں بن سکتا اور شروح حدیث میں اس کا جواب جمہور اہل علم کی طرف سے یہ دیا گیا ہے کہ اس حدیث شریف سے مراد یہ ہے کہ مومن و مسلم نجاست سے احتراز و اجتناب کا عادی ہونے کی وجہ سے طاہر الاعضاء ہوتا ہے، مگر اس کے برعکس مشرک نجاستوں سے اتنا پرہیز نہیں کرتے، جتنا کہ مومن و مسلمان کی شان ہے، لہذا وہ اس عدم تحفظ کے اعتبار سے ان معنوں میں نجس ہیں اور درحقیقت وہ معنوی و اعتقادی طور پر ہی نجس ہیں، حسی و جسمانی طور پر نہیں۔ آگے اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کے جواز کو اپنے اس جواب کی تقویت کے لیے پیش کیا گیا ہے۔

دلیل اول و دوم یعنی مذکورہ آیت اور مفہوم حدیث کا جمہور نے یہ جواب بھی دیا ہے کہ یہاں کفار و مشرکین کے عقائد و اعمال کی وجہ سے ان سے نفرت دلائی گئی ہے اور مجازی طور پر انہیں نجس کہا گیا ہے، اس کے مجاز ہونے کا قرینہ یہ ہے کہ صحیحین میں نبی اکرم ﷺ کا مشرک عورت کے مشکیزے سے وضو کرنا، یمامہ کے مشرک سردار ثمامہ بن اثال کو مسجد نبوی ﷺ کے ستون سے باندھنا اور خیبر کی یہودیہ عورت کی زہر آلود بکری کا گوشت کھانا ثابت ہے۔

سنن ابی داؤد اور مسند احمد میں بلادِ نصاریٰ سے لائے گئے پنیر کا کھانا، ایک یہودی کی دعوت پر جو کی روٹی اور بدلی ہوئی ہوا والا سالن کھانا بھی ثابت ہے اور مسلمان کے لیے کتابیہ سے نکاح مباح ہے، جو ان کے نجس عین نہ ہونے، بلکہ انہیں مجازی طور پر نجس کہے جانے کا قرینہ ہیں۔^①

3 تیسری دلیل:

ان کی تیسری دلیل صحیح بخاری و مسلم، سنن ابی داؤد و ترمذی اور مسند احمد میں مذکور وہ حدیث ہے، جس میں حضرت ابو ثعلبہ حششی رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے استفسار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم اہل کتاب کے علاقے میں رہتے ہیں، کیا ہم ان کے برتنوں میں کھاپی لیں؟ تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا تھا کہ اگر تمہیں دوسرے برتن مل جائیں، تو ان میں نہ کھاؤ پیو اور اگر دوسرے برتن نہ ملیں تو کھاپی لو، مگر انہیں پہلے دھولو۔

① نیل الأوطار (۲۱/۱)

اس حدیث سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے ان کے برتنوں میں دھوئے بغیر کھانے سے منع فرمایا تھا، جو ان کے نجس اور ناپاک ہونے کی دلیل ہے۔
جائزہ:

اس کا جواب جمہور نے یہ دیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے انھیں ان کے برتن دھونے کا حکم اس لیے نہیں دیا تھا کہ یہ اُن کے جھوٹے ہیں اور وہ نجس ہیں، لہذا یہ برتن بھی نجس ہیں، بلکہ آپ ﷺ نے انھیں برتنوں کو دھونے کا حکم اس لیے دیا تھا کہ وہ اپنے برتنوں میں خنزیر کا گوشت کھاتے اور شراب پیتے تھے اور یہ دونوں چیزیں چونکہ حرام ہیں، اس لیے نبی مکرم ﷺ نے ان کے برتنوں کو دھونے کا حکم فرمایا تھا، جس کا ثبوت صحیح بخاری، سنن ابی داؤد و ترمذی اور مسند احمد میں حضرت ثعلبہ رضی اللہ عنہ کے اپنے بیان میں موجود ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

«إِنَّ أَرْضَنَا أَرْضَ أَهْلِ الْكِتَابِ وَإِنَّهُمْ يَأْكُلُونَ لَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَيَشْرَبُونَ الْخَمْرَ فَكَيْفَ نَصْنَعُ بِأَنْبِيَتِهِمْ وَقُدُورِهِمْ؟»^(۱)

”ہم اہل کتاب کے علاقے میں رہتے ہیں اور وہ خنزیر کا گوشت کھاتے اور شراب پیتے ہیں، ہم ان کے برتنوں اور ہنڈیوں کا کیا کریں؟“

تو نبی اکرم ﷺ نے انھیں دھو کر استعمال کرنے کا حکم فرمایا۔ اس طرح بات بالکل واضح ہوگئی کہ یہ دھونے کا حکم ان نجاستوں کی وجہ سے تھا نہ کہ اہل کتاب کے جھوٹے اور ان کے نجس ہونے کی وجہ سے، لہذا اس حدیث سے ان کا استدلال درست نہیں۔

اس دلیل کا دوسرا جواب یہ بھی ہے کہ اگر برتنوں کو دھونے کا حکم کفار اہل کتاب کے نجس عین ہونے کی وجہ سے ہوتا تو پھر نبی اکرم ﷺ اسے دوسرے برتنوں کی عدم موجودگی کے ساتھ مشروط ہی نہ کرتے، کیوں کہ جو برتن نجس ہو، اس کی نجاست کا ازالہ کر دینے کے بعد اس میں اور دوسرے غیر نجس برتن میں تو کوئی فرق ہی نہیں رہتا، لہذا معلوم ہوا کہ یہ حکم محض صفائی کے لیے تھا نہ کہ اُن کے نجس ہونے کی وجہ سے۔^(۲)

(۱) التجريد الصريح (۱/ ۲ / ۱۳۹) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (۳۲۵۲) صحيح سنن الترمذي

(۱۴۶۸) نيل الأوطار (۱/ ۲۱)

(۲) نيل الأوطار (۱/ ۲۱)

4 چوتھی دلیل:

نجس عین قرار دینے والوں کی چوتھی دلیل وہ واقعہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے جب بنو ثقیف کا وفد مسجد میں بٹھایا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی کہ یہ تو نجس لوگ ہیں۔ اس پر نبی اکرم ﷺ نے ان کے اس قول کو برقرار رکھا، ان کی تردید نہیں کی تھی۔

جائزہ:

اس سلسلے میں عرض ہے کہ اگر اس واقعے اور اس موقع پر نبی مکرم ﷺ کے ارشاد فرمائے ہوئے الفاظ پر غور کیا جائے تو نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ وہ واقعہ نجس کہنے والوں کی دلیل بنا تو گجا، وہ تو ان کے خلاف دلیل بنتا ہے اور وہ یوں کہ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا:

«قَوْمٌ أَنْجَسُوا» ”یہ نجس قوم کے لوگ ہیں۔“

تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«لَيْسَ عَلَى الْأَرْضِ مِنْ أَنْجَاسِ الْقَوْمِ شَيْءٌ، إِنَّمَا أَنْجَاسُ الْقَوْمِ عَلَى أَنْفُسِهِمْ»

”قوم کی نجاست میں سے زمین پر کوئی چیز واقع نہیں ہو رہی، بلکہ ان کی نجاست ان کے اپنے آپ پر ہی واقع ہو رہی ہے۔“

ان الفاظ پر غور کریں تو واضح ہو جاتا ہے کہ آپ ﷺ نے ان کی نجاست کو ظاہری وحسی قرار نہیں دیا کہ جو زمین کو متاثر کرے اور صحن مسجد کو نجس کرنے کا باعث ہو، بلکہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان کی نجاست ان کے نفسوں ہی پر ہے، یعنی نجاست ان کے عقائد و اعمال کی نجاست ہے، جسے معنوی و اعتقادی نجاست کہا جاسکتا ہے، ظاہری وحسی نہیں۔

3 تیسرا قول:

کفار و مشرکین کے جھوٹے کے سلسلے میں تیسرا قول یہ ہے کہ وہ مکروہ ہے اور بظاہر اس کے مکروہ ہونے کی رائے محض اس لیے ہے کہ ان کے جھوٹے کے پاک اور ناپاک ہونے میں دلائل متعارض ہیں اور اس تعارضِ ادلہ کے پیش نظر بعض اہل علم نے اسے حرام کہا نہ حلال بلکہ پاک اور ناپاک کے درمیانی درجے کو اختیار کرتے ہوئے مکروہ قرار دے دیا ہے۔

نتیجہ:

اس طرح اب تک تینوں اقوال اور ان کے دلائل آپ کے سامنے آگئے ہیں اور دلائل کی رو سے تو جمہور کا قول اول ہی اولیٰ ہے۔ البتہ یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ کسی چیز کو حلال اور پاک قرار دینے کا یہ معنی بھی نہیں ہوتا کہ کسی کو اس کے کھانے پر مجبور کیا جائے، بلکہ کئی چیزیں ایسی ہیں کہ بالاتفاق پاکیزہ اور حلال ہیں، مگر جب کسی کی طبیعت اسے کھانے پر تیار نہ ہو تو وہ اسے کھانے پر مجبور نہیں ہے اور نہ اسے کھانے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔

گوہ کا گوشت:

اس بات کو اس مثال سے بخوبی سمجھا جاسکتا ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے صب یا گوہ کو حرام قرار نہیں دیا، مگر اسے کھایا بھی نہیں اور صاف فرما دیا کہ اسے کھانے پر میری طبیعت تیار نہیں ہوتی، چنانچہ صحیح بخاری و مسلم، سنن اور دیگر کتب حدیث میں اس بات کی تفصیل موجود ہے، مثلاً صحیح بخاری شریف میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے گوہ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَا أَكَلُهُ وَلَا أَحْرَمُهُ»^(۱) ”میں اسے نہیں کھاتا اور نہ ہی میں اسے حرام قرار دیتا ہوں۔“

ایسے ہی صحیح بخاری و مسلم میں مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت خالد بن ولید سیف اللہ رضی اللہ عنہ، ام المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر گئے جو ان کی خالہ تھیں، نبی مکرم ﷺ (اور ان دونوں) کے سامنے گوہ کا بھونا ہوا گوشت رکھا گیا اور آپ ﷺ کی کسی زوجہ محترمہ نے بتایا کہ یہ گوہ کا گوشت ہے تو آپ ﷺ نے اپنا دست مبارک کھینچ لیا، جو کھانے کے لیے آگے بڑھایا تھا۔ آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ ”اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا یہ حرام ہے؟“ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَا، وَلَكِنْ لَمْ يَكُنْ بِأَرْضِ قَوْمِي فَأَجِدُنِي أُعَافُهُ»^(۲)

”نہیں (حرام تو نہیں) لیکن یہ میری قوم کے علاقے (کے) میں نہیں پائی جاتی، لہذا

(۱) صحیح البخاری مترجم اردو (۳/ ۲۵۹) صحیح مسلم (۱۳/ ۹۷) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث

(۱۴۶۲) صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (۴۰۲۴)

(۲) صحیح البخاری مترجم اردو (۳/ ۲۵۹) صحیح مسلم مع شرح النووي (۱۳/ ۹۹-۱۰۰) صحیح سنن

أبي داود، رقم الحدیث (۳۲۲۲) صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (۲۶۴۰) سنن ابن ماجہ (۳۲۴۱)

میری طبیعت اسے کھانے پر تیار نہیں ہوتی۔“

حضرت خالد بن ولیدؓ فرماتے ہیں:

”میں کھانے لگا اور نبی اکرم ﷺ (مجھے کھاتے) دیکھ رہے تھے۔“

یزید بن اصرم کی روایت صحیح مسلم میں ہے، جس میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«كُلُوا وَأَطْعَمُوا فَإِنَّهُ حَلَالٌ. أَوْ قَالَ: لَا بَأْسَ بِهِ، وَلَكِنَّهُ لَيْسَ طَعَامِي»^(۱)

”کھاؤ اور کھلاؤ، یہ حلال ہے یا پھر فرمایا کہ (اس کے کھانے میں) کوئی حرج نہیں، لیکن یہ میرا کھانا نہیں ہے۔“

بعض روایات کی بنا پر احناف کے نزدیک یہ مکروہ ہے، جب کہ معروف حنفی محدث امام طحاوی رحمہ اللہ نے صحاح و سنن کی مذکورہ عدم کراہت بلکہ صریح جواز کے مفہوم والی احادیث و آثار نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

«فَثَبَّتْ بِهَذِهِ الْأَثَارِ أَنَّهٗ لَا بَأْسَ بِأَكْلِ الضَّبِّ، وَبِهٖ أَقُولُ»^(۲)

”ان احادیث سے ثابت ہوا کہ گوہ کا گوشت کھانے میں کوئی حرج نہیں اور میں اسے ہی اختیار کرتا (اور فتویٰ دیتا) ہوں۔“

بہر حال یہ ایک ضمنی بات تھی، غرض صرف یہ ہے کہ کفار کا جھوٹا کھانے یا پینے کو جی نہ چاہے تو مجبوری بھی نہیں، مگر دلائل کی رو سے وہ ممنوع و مکروہ اور حرام بھی ثابت نہیں ہوتا۔

موجودہ حالات میں زیادہ سے زیادہ مکروہ تنزیہی کہا جاسکتا ہے کہ اس سے بچا جاسکے تو بہتر ہے، کیونکہ وہ ظاہری وحشی نہ سہی، اعتقادی و معنوی طور پر توجس ہوتے ہی ہیں اور ان میں سے کتنے ہی لوگ خنزیر بھی کھاتے اور اکثر شراب پیتے ہیں تو ان لوگوں کے جھوٹے سے پرہیز ہی اولیٰ ہے۔^(۳)

(۱) صحیح مسلم مع شرح النووي (۹۸/۱۳)

(۲) فتح الباری (۶۶۶/۹) للتفصیل صحیح البخاری و فتح الباری (۶۶۲/۹ - ۶۶۷)

(۳) دیکھیں: جدید فقہی مسائل از مولانا خالد سیف اللہ (ص: ۳۶-۳۷) طبع حیدرآباد۔ انڈیا۔ اس بارے میں مولانا عبدالسلام کیلانی کا مضمون اور مولانا غازی عزیز کا تعاقب بھی بہت مفید ہے۔ جسے ماہنامہ محدث لاہور میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

کفار و مسلمین کے باہمی تعلقات کی نوعیتیں:

ہمیں سعودی عرب اور دیگر ممالک میں ایسا معاشرہ میسر ہے جس کے افراد میں مسلم و غیر مسلم ہر قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں اور غیر مسلم افراد میں سے اہل کتاب یا یہود و نصاریٰ کے علاوہ بھی مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں۔ مثلاً ہندو، سکھ، مرزائی یا قادیانی، بڈھٹ یا بڈھ مت اور خالق ارض و سما کے منکر و ملحد اور اس کی عبادت کے ساتھ ساتھ انبیا و صالحین یا اپنے بزرگوں کی پرستش کرنے والے مشرک۔ ان تمام انواع و اقسام کے لوگوں کے ساتھ مسلمانوں کو کس قسم کے تعلقات رکھنے چاہئیں؟ ان تعلقات کی کیا کیا نوعیتیں ہیں اور ان میں سے کون کون سی نوعیت کن حدود و قیود کے ساتھ جائز ہے اور کون سی ناجائز؟ جو جائز ہے، وہ کیوں اور جو ناجائز ہے، وہ کس لیے؟ یہ ایک نہایت اہم موضوع ہے جو ہر مسلمان کا مسئلہ ہے اور جس طرح یہاں ہمیں درپیش ہے، ایسے ہی دیگر ممالک حتیٰ کہ ہمارے اپنے ملکوں میں بھی موجود ہے، مثلاً پاکستان ایک اسلامی مملکت ہے، مگر وہاں غیر مسلم بھی موجود ہیں۔ انڈیا ایک غیر مسلم حکومت ہے، لیکن وہاں کروڑوں کی تعداد میں مسلمان بھی بستے ہیں۔ بنگلہ دیش، نیپال اور برما میں بھی مخلوط معاشرہ ہے۔

ہمارے ان عرب مشرقی ممالک کے افراد معاشرہ کی طرح ہی یہ مسئلہ یورپی ممالک اور امریکہ و کینیڈا میں رہنے والے لوگوں کو بھی درپیش ہے، کیوں کہ ان علاقوں میں بھی تارکین وطن بکثرت موجود ہیں اور ان کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ یہاں اور وہاں کے معاشرے میں صرف اتنا فرق ہے کہ یہاں غیر مسلم لوگ اسلامی حکومت کے زیر سایہ ہیں اور وہاں کے مسلمان غیر مسلم حکومتوں کے زیر تسلط رہتے ہیں، الغرض یہ ایک عالمگیر مسئلہ ہے۔

قرآن کریم کی نظر میں:

آئیے سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن کریم کا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس سلسلے میں ہماری کیا راہنمائی فرمائی ہے؟

① سورت آل عمران (آیت: ۲۸) میں ارشاد الہی ہے:

﴿لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكُفْرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ وَمَنْ يَفْعَلْ

ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِىْ شَيْءٍ اِلَّا اَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقًا وَيَحَذِّرْكُمْ اللّٰهُ نَفْسَهُ
وَ اِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۱﴾

”مومن لوگ اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں (یا غیر مسلم افراد) کو اپنا رفیق اور یار و مددگار ہرگز نہ بنائیں اور جو ایسا کرے گا (یعنی مسلمانوں کو چھوڑ کر کفار سے دلی محبت رکھے گا) اس کا اللہ تعالیٰ سے کوئی تعلق نہیں۔ ہاں! یہ معاف ہے کہ ان کے ظلم سے بچنے کے لیے بظاہر ایسا طرز عمل اختیار کر جاؤ، مگر اللہ تمہیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے اور تمہیں اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔“

امام ابن الجوزی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اس آیت کے شان نزول کے بارے میں چار اقوال نقل کیے ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ یہ آیت حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ وغیرہ کے بارے میں نازل ہوئی، جو کفار مکہ کے ساتھ اپنی محبت ظاہر کرتے تھے اور اہل مکہ کے نام ان کا ایک خط بھی پکڑا گیا تھا۔^(۱) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دونوں قسم کے معاشرے میں مسلم و غیر مسلم کے تعلقات کی وضاحت کر دی ہے کہ اگر مسلم معاشرہ ہو اور کفار بھی ساتھ رہتے ہوں اور مسلم حکومت کے تابع ہوں تو اس شکل میں مسلمانوں کو کفار کے ساتھ موالات اور دوستی و محبت نہیں رکھنی چاہیے، اگر معاملہ اس کے برعکس ہو کہ حکومت غیر اسلامی ہو اور اسی کے زیر تسلط مسلمان بھی رہتے ہوں اور مسلمانوں کو کفار کے ظلم و ستم کا اندیشہ ہو تو انھیں دلی موالات و محبت تو نہیں، البتہ ظاہری دوستانہ رسم و راہ رکھنے کی اجازت ہے، مگر اسلام کے مشن، مسلمانوں کے مفادات اور جان و مال کو کسی قسم کا نقصان پہنچانے کی نوبت نہ آئے اور کفار و کفر کی کوئی ایسی خدمت بھی نہ کی جائے، جس سے اسلام کے مقابلے میں کفر کو فروغ حاصل ہونے اور مسلمانوں پر کفار کے غالب آجانے کا امکان ہو۔^(۲)

یہ بھی یاد رہے کہ اہل علم نے کفار و مشرکین، یہود و نصاریٰ اور ملحدین سے دوستی گانٹھنے اور انبیا و صالحین کی پرستش جیسے ”شُرک“ کا ارتکاب کرنے والے کی ہم نوائی کرنے کو ”کبیرہ گناہ“ شمار کیا ہے۔^(۳)

(۱) زاد المسیر (۱/۳۷۱) تفہیم القرآن (۵/۴۲۲)

(۲) ترجمہ وحاشیہ مولانا مؤدودی، آیت مذکورہ۔

(۳) تطہیر المجتمعات علامہ أحمد بن حجر آف قطر (مترجم اردو)، (ص: ۵۵) ملاحظہ فرمائیں۔

غیر مسلم افراد سے ترک موالات کا حکم الہی:

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن کریم میں بعض دیگر مقامات پر بھی اسی مضمون کو مختلف عنوانات

کے تحت بیان فرمایا ہے:

﴿۲﴾ چنانچہ سورۃ النساء (آیت: ۱۳۴) میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کے ذکر کے دوران میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿يَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِينَ اَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ
اَتُرِيدُونَ اَنْ تَجْعَلُوا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِينًا﴾

”اے ایمان والو! مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق نہ بناؤ۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ

کو اپنے اوپر صریح حجت دے دو؟“

تفسیر ابن کثیر میں ابن ابی حاتم کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے

فرمایا: ”قرآن کریم میں جہاں کہیں ایسی عبارتوں میں ”سلطان“ کا لفظ آیا ہے، وہاں اس سے مراد

حجت ہے۔“ یعنی تم نے اگر مومنوں کو چھوڑ کر کفار سے ولی دوستی کے تعلقات پیدا کیے تو تمہارا یہ فعل

اس امر کا کافی ثبوت اور پوری دلیل ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں سزا دے۔^①

﴿۳﴾ سورۃ المائدہ (آیت: ۵۱) میں کفار میں سے یہود و نصاریٰ کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿يَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَ النَّصْرٰى اَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ
بَعْضٍ وَ مَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَاِنَّهُ مِنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِينَ﴾

”اے ایمان والو! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا ولی رفیق نہ بناؤ، یہ تو آپس ہی میں ایک

دوسرے کے رفیق ہیں اور اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا رفیق بناتا ہے تو خود اس کا شمار بھی

پھر انہی میں سے ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ظالموں کو راہِ راست نہیں دکھاتا۔“^②

﴿۳﴾ آگے اسی سورۃ المائدہ (آیت: ۵۷-۵۸) میں فرمایا ہے:

﴿يَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَ لَعِبًا مِّنَ
الَّذِينَ اُوتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ الْكٰفَرِ اَوْلِيَاءَ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ

① تفسیر ابن کثیر اردو (۷۰۰/۸)

② اس سے اگلی دو آیتوں ۵۲ اور ۵۳ کا ترجمہ بھی ساتھ پڑھ لیں تو مزید فائدہ ہوگا۔

مُؤْمِنِينَ ﴿۱﴾ وَإِذَا نَادَيْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ اتَّخَذُوهَا هُزُوًا وَلَعِبًا ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْقِلُونَ ﴿۲﴾

”اے ایمان والو! تمہارے پیش رو اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے تمہارے دین کو مذاق اور تفریح کا سامان بنا لیا ہے، انہیں اور دوسرے کافروں کو اپنا دوست و رفیق نہ بناؤ، اگر تم سچے مومن ہو تو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور جب تم نماز کے لیے منادی کرتے ہو، تو وہ اس کا مذاق اڑاتے اور اسے ہنسی کھیل ٹھہرا لیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عقل نہیں رکھتے۔“
یعنی اذان کی آواز سن کر اس کی نقلیں اتارتے اور اس پر آوازے گستے ہیں، جو محض ان کی بے عقلی کا نتیجہ ہے۔ ورنہ مذہبی اختلافات کے باوجود آخر کون معقول آدمی یہ پسند کر سکتا ہے کہ جب کوئی گروہ اللہ کی عبادت کے لیے منادی کرے تو ایسی خفیف حرکات سے اس کا مذاق اڑایا جائے؟^(۱)
کفار کا اذان کی آواز پر نقلیں اتارنا، آوازے گسنا اور تمسخر کے لیے کچھ نہ کچھ کہنا محض خیال آرائی نہیں، بلکہ عین حقیقت ہے، جیسا کہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اور دوسرے مفسرین نے اپنی تفسیر میں ایک نصرانی اور آگے چل کر ابوسفیان بن حرب، عتاب بن اسید اور حارث بن ہشام کے واقعات نقل کیے ہیں۔^(۲)
امام شوکانی رحمہ اللہ نے تو اپنی تفسیر ”فتح القدیر“ میں لکھا ہے:

”اس آیت کی رو سے اُن اہل بدعت سے دوستی رکھنا بھی حرام ہے، جنہوں نے دین کو ہنسی کھیل بنا رکھا ہے، کیوں کہ ان میں بھی وہی وصف پایا جاتا ہے تو لازماً ان کا حکم بھی وہی ہونا چاہیے جو اہل کتاب کا ہے۔“^(۳)

﴿۵﴾ سورة التوبة (آیت: ۲۳) میں تو اللہ تعالیٰ نے یہاں تک فرمایا ہے کہ اگر کسی کے ماں باپ اور بھائی بہن بھی کفر پر مہر ہوں تو ان کے ساتھ بھی دلی محبت کا تعلق نہیں رہنا چاہیے۔ ارشاد الہی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا آبَاءَكُمْ وَ إِخْوَانَكُمْ أَوْلِيَاءَ إِنِ اسْتَحَبُّوا
الْكُفْرَ عَلَى الْإِيمَانِ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾

(۱) تفہیم القرآن بتصرف (۱/۴۸۳)

(۲) ویکس: تفسیر ابن کثیر اردو (۱/۸۱۶) زاد المسیر (۲/۳۸۵-۳۸۶) تفسیر القرطبی (۳/۶/۲۲۴)

(۳) فوائد سلفیة المسمی بہ أشرف الحواشی مولانا محمد عبدة الفلاح (ص: ۱۴۲)

”اے ایمان والو! اگر تمہارے باپ اور بھائی بھی ایمان پر کفر کو ترجیح دیں تو انہیں بھی دلی دوست یا رفیق نہ بناؤ اور تم میں سے جو ان کو رفیق بنائیں گے وہی ظالم ہوں گے۔“
حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ﴿وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فَاُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ کی تفسیر یوں بیان فرمائی ہے:

”هُوَ مُشْرِكٌ مِثْلَهُمْ، لِأَنَّ مَنْ رَضِيَ بِالشِّرْكِ فَهُوَ مُشْرِكٌ“
”وہ (جو اپنے کافر اقربا کو اپنا دلی دوست بنائے) ان کی طرح ہی مشرک ہے، کیوں کہ جو شخص شرک کو پسند کرے تو وہ مشرک ہے۔“

غیر مسلم قرابت داروں سے ترکِ محبت:

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے غیر مسلم کفار سے ترکِ محبت اور ترکِ موالات کا حکم فرمایا ہے۔ یہ حکم نہ صرف یہ کہ اجنبی کفار کے ساتھ خاص ہے، بلکہ اگر کسی کے ماں باپ، اولاد، بہن بھائی اور اہل خاندان بھی کفر پر مُصرّ ہوں تو ان کے لیے بھی ترکِ موالات ہی کا حکم ہے۔

6] جیسا کہ سورۃ المجادلہ (آیت: ۲۲) میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ﴾

”تم کبھی یہ نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہوں، جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی مخالفت کی ہے۔
خواہ وہ ان کے باپ ہوں یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی یا ان کے اہل خاندان۔“

7] اس کے بعد اسی آیت میں کفار سے ترکِ محبت کو اللہ کی جماعت کے لوگوں اور مضبوط ایمان والوں کا وصف قرار دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿أُولَئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنْهُ وَيُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ أُولَئِكَ حِزْبُ اللَّهِ أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾

”یہی وہ لوگ ہیں، جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے ایمان کو ثبت کر دیا ہے اور اپنی طرف

سے ایک رُوح عطا کر کے ان کو قوت بخشی ہے۔ وہ ان کو ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہو اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ یہ اللہ کی جماعت کے لوگ ہیں۔ خبردار! آگاہ رہو کہ بے شک اللہ کی جماعت والے ہی نجات و فلاح پانے والے ہیں۔“

چند مثالیں:

کفر پر مُصِرّ والدین، بہن بھائیوں، اولاد اور اہلِ خاندان سے ترکِ محبت اور ترکِ موالات کوئی انہونی بات بھی نہیں، بلکہ ہمارے اسلاف اور صحابہ رسول ﷺ نے اس بات کی روشن مثالیں قائم فرمائی ہیں کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرنے اور اسلام قبول نہ کرنے والے قرابت داروں کو تہمتِ تنبیغ کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ کفر و اسلام کے مابین رونما ہونے والے پہلے معرکہ حق و باطل، غزوہ بدر میں نبی اکرم ﷺ کی طرف سے ”أَمِينِ هَذِهِ الْأُمَّةِ“ کا لقب پانے والے جلیل القدر صحابی حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ مسلمانوں کی طرف سے شریکِ لشکر تھے، جبکہ ان کے باپ نے لشکرِ کفر کی طرف سے شرکت کی، آمنا سامنا ہوا تو بیٹے نے باپ کا سر قلم کرنے میں ذرا تامل نہیں کیا۔

حضرت سعید بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے بقول سورۃ المجادلہ کی سابقہ آیت حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کی شان ہی میں نازل ہوئی اور امام قرطبی رضی اللہ عنہ نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی، جب انہوں نے غزوہ بدر اور بہ قول بعض غزوہ احد میں اپنے باپ کو قتل کیا، جو مشرکین کی طرف سے شریک ہوا تھا۔^①

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے عبدالرحمن کے قتل کا ارادہ کیا تھا اور حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے اپنے بھائی عبید کو قتل کیا تھا۔ حضرت عمر، حضرت حمزہ، حضرت علی اور حضرت عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہم نے اپنے اپنے قریبی رشتے داروں عتبہ، شیبہ اور ولید بن عتبہ کے سرتن سے جدا کیے تھے۔^②

تبھی تو وہ اس آیت میں مذکورہ بلند درجات پر فائز ہوئے تھے۔

یہ شہادت گہیہ اُلفت میں قدم رکھنا ہے

لوگ آساں سمجھتے ہیں مسلمان ہونا

① تفسیر القرطبی (۳۰۷/۱۷/۹)

② زاد المسیر (۱۹۹/۸/۱۹۸) تفسیر ابن کثیر (۳۵۹/۵) تفسیر القرطبی (۳۰۷/۱۷/۹) تا ۳۰۹

8 اٹھائیسویں پارے کی سورۃ الممتحنہ کی پہلی ہی آیت میں اسی موضوع کے بارے میں ارشادِ الہی ہے:

﴿يَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِمْ بِالْمُودَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُمْ مِنَ الْحَقِّ﴾ [الممتحنہ: ۱]

”اے ایمان والو! میرے دشمن اور اپنے دشمن (کفار) کو دوست مت بناؤ، تم ان سے دوستانہ میل جول رکھتے ہو، حالانکہ وہ تمہارے پاس آنے والے سچے دین (سچے کلام قرآن کریم) کو مانتے ہی نہیں ہیں۔“

اس آیت کے پس منظر میں بدری صحابی حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے، جو کتب تفسیر و حدیث میں مذکور ہے۔ صحیحین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے زیر اور مقدم رضی اللہ عنہما کو یہ فرماتے ہوئے بھیجا کہ (مکہ مدینے کے مابین) روضہ خان تک جاؤ۔ وہاں ایک عورت تمہیں ملے گی، جس کے پاس ایک خط ہے، وہ لے آؤ۔ ہم اس مقام پر پہنچے اور اس عورت سے مطالبہ کیا تو اس نے پس و پیش کیا، مگر بالآخر اس نے خط دے دیا۔ خط نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا، جو مشرکین مکہ کو نبی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے پروگرام سے باخبر کرنے کے لیے لکھا گیا تھا۔ حضرت حاطب رضی اللہ عنہ نے جواب طلبی پر بتایا کہ اپنے اہل و عیال (جو مکہ میں تھے) کی خاطر مشرکین کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے میں نے یہ کام کیا تھا۔ ورنہ میں اسلام سے پھرا ہوں نہ ان کفار کو دوست سمجھتا ہوں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بے شک تو نے سچ کہا ہے۔“

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اُن کی گردن اڑا دینے کی اجازت مانگی، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”نہیں، یہ بدری ہے اور بدری صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تم جو چاہو کرو، تمہیں اللہ تعالیٰ نے معافی دی۔“

اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تھی۔ یہ واقعہ صحیحین، سنن اربعہ (سوائے ابن ماجہ) اور صحیح ابن حبان وغیرہ سب میں موجود ہے۔¹



[1] صحیح البخاری (۷/ ۴۰۰) صحیح مسلم (۴/ ۱۹۴۲) مختصر ابن کثیر للرفاعي (۴/ ۲۱۷-۲۱۸) تفسیر القرطبي (۹/ ۱۸-۵۰-۵۱-۵۲) زاد المسیر (۸/ ۳۳۰-۳۳۱-۳۳۲) الدر المنثور للسيوطي (۶/ ۲۰۲)

شبیہ و تعارض کا ازالہ اور موالات و مواسات کا فرق

اللہ تعالیٰ نے کفار و مشرکین اور تمام غیر مسلم افراد کے ساتھ موالات یا دلی موڈت و محبت رکھنے سے مسلمانوں کو سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے۔ یہ مضمون قرآن کریم کی متعدد آیات میں مجمل اور مفصل بیان ہوا ہے۔

ان تصریحات کو پڑھنے یا سننے کے بعد حقیقتِ حال سے ناواقف غیر مسلم لوگوں کو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کے مذہبِ اسلام میں غیر مسلم افراد کے ساتھ کسی قسم کی رواداری اور تعلق بلکہ حسنِ اخلاق کی بھی کوئی گنجائش نہیں اور دوسری طرف ان آیات کو سامنے رکھتے ہوئے، جب کوئی مسلمان رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ طیبہ، آپ ﷺ کے اخلاقِ عالیہ اور غیر مسلموں کے ساتھ احسان و سلوک اور ہمدردی و غم خواری، ایسے ہی صحابہ و خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اور سلفِ اُمت کی غیر مسلموں سے ہمدردی و رواداری اور حسنِ سلوک کے واقعات پڑھے، جن کی مثالیں اقوامِ عالم میں ملنا مشکل ہیں، تو غیر مسلم بلکہ ایک سطحی نظر رکھنے والے مسلمان کو بھی قرآن و سنت کے احکام میں باہم تعارض و تضاد یا اختلاف محسوس ہونے لگتا ہے، حالانکہ حقیقت میں ایسا ہرگز نہیں ہے، بلکہ یہ دونوں خیال ہی غلط اور قرآن و سنت کی حقیقی تعلیمات سے ناواقفیت یا ناقص تحقیق کا نتیجہ ہیں۔

اس نقطے کو سمجھنے اور قرآن و سنت کی حقیقی تعلیمات معلوم کرنے کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ دو شخصوں یا جماعتوں کے تعلقات اور ان کے مختلف درجات کو مد نظر رکھا جائے، موالات اور احسان و سلوک یا ہمدردی و رواداری کا فرق اور ہر ایک کی حقیقت کو سمجھا جائے اور پھر قرآن و سنت کی روشنی میں دیکھا جائے کہ ان میں سے کون سا درجہ جائز اور کون سا ناجائز ہے؟ جو

ناجائز ہے، اس کی کیا وجوہ بیان کی گئی ہیں؟ اگر اسی نہج پر سوچا جائے تو غیر مسلموں کے لیے کوئی وجہ شکایت باقی نہیں رہتی اور نہ آیات و روایات ہی میں کسی قسم کا اختلاف رہ جاتا ہے۔ چنانچہ تفسیر معارف القرآن جلد دوم میں سورت آل عمران (آیت: ۲۸) کی تفسیر کے ضمن میں لکھا ہے:

”بات دراصل یہ ہے کہ دو جماعتوں یا دو شخصوں کے مابین باہمی تعلقات کے چار مختلف درجے ہوتے ہیں۔ پہلا موالات۔ دوسرا مواسات۔ تیسرا مدارات اور چوتھا درجہ ہے معاملات۔“^[۱]

1 موالات:

ان درجات میں سے جو پہلا درجہ موالات ہے، اس کا معنی ہے:

”کسی کے ساتھ دل کی گہرائی سے محبت و موڈت رکھنا۔“

یہ صرف مومنوں، مسلمانوں کے ساتھ ہی خاص ہے، کسی غیر مومن اور غیر مسلم کے ساتھ مسلمانوں کا یہ دلی تعلق کسی حال میں قطعاً جائز نہیں۔ قرآن کریم کی جتنی آیات ہم پیش کر چکے ہیں، ان سے مراد اسی تعلق خاطر کی ممانعت ہے۔

2 مواسات:

باہمی تعلقات کی مختلف نوعیتوں میں سے دوسرا درجہ مواسات کا ہے، جس کا معنی ہے:

”ہمدردی و خیر خواہی اور نفع رسانی کا رویہ اپنانا اور سلوک کرنا۔“

اہل حرب یا مسلمانوں کے ساتھ برسرِ جنگ کفار و مشرکین کو چھوڑ کر باقی تمام غیر مسلموں کے ساتھ یہ تعلق رکھنا جائز ہے، کیوں کہ اٹھائیسویں پارے کی سورۃ الممتحنہ جس کی پہلی ہی آیت میں اللہ تعالیٰ نے غیر مسلموں کے ساتھ موالات یا دلی تعلقات استوار کرنے سے روکا ہے اور مومنوں سے مخاطب ہو کر فرمایا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُمْ مِنَ الْحَقِّ﴾ [الممتحنہ: ۱]

[۱] معارف القرآن مفتی محمد شفیع (۵۰/۲)

”اے ایمان والو! میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو دلی دوست مت بناؤ کہ تم ان کو دوستی کے پیغام بھیجو، حالانکہ تمہارے پاس جو دین آچکا ہے، وہ اس کے منکر ہیں۔“^①

آپ ذرا اس ارشادِ الہی پر غور کریں، آپ کا ذہن تسلیم کرے گا اور خود ہی کہہ اُٹھے گا کہ واقعی کوئی بھی معقول شخص کسی ایسے انسان کو دلی دوست نہیں بنا سکتا اور نہ اس کے ساتھ محبت کی پیٹنگیں بڑھا سکتا ہے، جو اس کے اپنے دینِ حق کا منکر ہو، مگر اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ایسے منکرینِ دینِ حق کے ساتھ بھی کئی طور پر ترکِ تعلقات کا حکم نہیں دیا، بلکہ اسی سورۃ الممتحنہ (آیت: ۸) میں اس کے ساتھ احسان و انصاف اور ہمدردی و رواداری کے سلوک کا حکم فرمایا، بشرطیکہ وہ حربی غیر مسلم نہ ہو، چنانچہ ارشادِ الہی ہے:

﴿لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الذّٰلِمِيْنَ لَمَّا يٰقَاتِلُوْكُمْ فِى الدّٰيْنِ وَاَنْتُمْ اَبْرَارٌ ۗ وَمَا يٰخُرْجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبْرُوْهُمْ وَتُقْسَطُوْا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يٰحِبُّ الْمُقْسَطِيْنَ﴾
 ”اللہ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو، جنہوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کی اور تمہیں گھروں سے نہیں نکالا۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔“

اس سے اگلی آیت (۹) میں اہلِ حرب کفار سے موالات کے ساتھ ساتھ مواسات (احسان و ہمدردی کے سلوک) سے بھی منع کرتے ہوئے فرمایا:

﴿۱﴾ یہاں ترکِ موالات کی وجہ دینِ حق کا انکار بتایا ہے اور ساتھ ہی ان کے حربی ہونے کا بھی ذکر فرما دیا ہے، جیسا کہ اس آیت کے بقیہ کلمات سے معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشادِ الہی ہے:

﴿يٰخُرْجُوْنَ الرّٰسُوْلَ وَاَيّٰكُمْ اَنْ تُوْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ حَرَجْتُمْ جِهَادًا فِى سَبِيْلِىْ وَاَبْتِغَاءَ مَرْضَاتِىْ تُسْرُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمُوَدَّةِ وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَا اَخْفَيْتُمْ وَاَمَّا اَعْلَنْتُمْ وَمَنْ يَفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سُوْءَ السَّبِيْلِ﴾ [الممتحنہ: ۱]

(وہ تو ایسے ظالم ہیں کہ) رسول کو اور تمہیں صرف اتنی سی بات پر کہ تم اپنے مالک اللہ پر ایمان لائے ہو، مکہ سے نکال باہر کرتے ہیں، اگر تم میری راہ میں جہاد کرنے کے لیے نکلے ہو اور میری خوشی و رضا چاہتے ہو (تو ان سے ہرگز دوستی نہ رکھو) تم چپکے چپکے ان سے دوستی رکھتے ہو (اور یہ نہیں جانتے کہ) میں تمہاری پوشیدہ اور کھلی باتوں سے خوب آگاہ ہوں اور تم سے جو کوئی ایسا کرے گا (کافروں سے دلی دوستی رکھے گا) وہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا۔“

﴿إِنَّمَا يَنْهَكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ قَتَلُواكُمْ فِي الدِّينِ وَأَخْرَجُواكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ

وظَهَرُوا عَلَيَّ إِخْرَاجِكُمْ أَنْ تَوَلَّوْهُمْ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾

”اللہ تو تم کو ان لوگوں کی دوستی کرنے سے منع کرتا ہے، جو دین کے بارے میں تم سے

لڑے (مذہبی جنگ کی) اور انھوں نے تمہیں گھروں سے باہر نکال دیا اور تمہارے نکالنے

پر تمہارے دشمنوں کی مدد کی اور جو لوگ ایسے لوگوں سے دوستی رکھیں، وہ گناہ گار ہیں۔“

اول الذکر تعلق (موالات) تو صرف اہل ایمان مسلمانوں کے ساتھ خاص ہے، جب کہ یہ

ثانی الذکر تعلق (مواسات) صرف اہل حرب کفار کو چھوڑ کر باقی تمام غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے۔

3 مدارات:

تعلقات کی ان چار قسموں میں سے تیسرا درجہ مدارات کا ہے، جس کا معنی ہے: ”باہمی خوش

اخلاقی اور دوستانہ راہ و رسم۔“

یہ بھی تمام غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے، جب کہ اس کا بنیادی مقصد ان کو دینی اعتبار سے

نفع پہنچانا اور اپنے قریب لانا ہو، تاکہ خوش گوار ماحول میں ان تک اسلام کا پیام امن پہنچایا جاسکے اور

انھیں دین حق کی تبلیغ کی جاسکے یا پھر ان میں سے کوئی شخص مہمان بن کر آجائے تو اس کے ساتھ خندہ

روئی اور حسن اخلاق سے پیش آنا بھی اسلام کی ہمہ گیر تعلیمات کے منافی نہیں۔

ایسے ہی جہاں وہ غالب اکثریت والے ہوں اور ان کے شر یا ضرر رسانی کا خدشہ ہو تو وہاں

بھی اپنے آپ کو اس خدشے سے محفوظ رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ محدود پیمانے پر

خاطر و مدارات رکھنے کو جائز قرار دیا ہے۔ سورت آل عمران (آیت: ۲۸) میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو

چھوڑ کر کافروں سے دلی محبت کی پیکیں بڑھانے والوں کو سختی سے منع کیا ہے، جس سے عدم موالات

مُراد ہے۔ ساتھ ہی ارشاد فرمایا:

﴿إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً﴾

”سوائے اس کے کہ تم ان کے شر سے اور ضرر سے بچاؤ کے لیے ان کے ساتھ کچھ

تعلقات بحال رکھو۔“

یہاں جن تعلقات کو جائز قرار دیا گیا ہے، ان سے یہی مدارات کا درجہ ہی مراد ہے، چونکہ اس درجہ مدارات میں بھی دلی موالات ہی کی ایک شکل پائی جاتی ہے، لہذا اللہ تعالیٰ کے مومن بندوں کے دلوں میں اس مشابہت کی وجہ سے خلش پیدا ہو سکتی تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسی خلش کے سدباب کے لیے اس کو موالات سے مستثنیٰ کر کے جائز قرار دیا ہے۔ تمام ادیان عالم میں سے صرف دین اسلام ہی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ اپنے ماننے والوں کو کسی بھی حالت میں کسی حرج میں مبتلا ہونے نہیں دیتا اور نہ اپنے پیروکاروں کو کسی کے ساتھ بد اخلاقی و بد خوئی سے پیش آنے کی تعلیم دیتا ہے، بلکہ پیغمبر اسلام ﷺ نے جو جنگی ضابطے مقرر کیے ہیں، انھیں پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے تو عین میدان کارزار میں بھی کسی ایسے کام کی اجازت نہیں بخشی، جو اخلاق و مردانگی کے خلاف ہو۔

کفار کے مقتولین کا مثلہ نہ کرنا یا شکلیں بگاڑنے کے لیے ان کے ناک، کان کاٹنے کی ممانعت، فصلیں برباد نہ کرنا اور باغات نہ جلانا اور نہ اُجاڑنا۔ ایسے ہی عورتوں اور بچوں کو قتل نہ کرنے کے ضابطے نبی اسلام ﷺ اور اہل اسلام کے کریمانہ اخلاق کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

4 معاملات:

تعلقات کے مختلف چار درجوں میں سے چوتھا درجہ معاملات کا ہے، جس کا معنی ہے: ”باہمی تجارتی لین دین، اجرت و ملازمت اور صنعت و حرفت کے معاملات۔“

یہ بھی تمام غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہیں، مگر ایک شرط کو پیش نظر رکھنا ضروری ہوگا کہ ان معاملات سے مسلمانوں کے مفاد عامہ کو نقصان نہ پہنچتا ہو۔ رسول کریم ﷺ، خلفائے راشدین اور عام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تعامل اس بات پر شاہد ہے۔ تمام فقہائے اسلام نے اسی بنا پر اہل حرب کفار کے ہاتھوں اسلحہ یا جنگی سامان فروخت کرنے کو ممنوع قرار دیا ہے اور باقی تجارت وغیرہ کی اجازت دی ہے۔ انھیں اپنے اداروں یا کارخانوں میں ملازم رکھنا یا خود ان کے یہاں ملازمت کرنا جائز ہے، بشرطیکہ ان امور سے عام مسلمانوں کو نقصان نہ پہنچتا ہو۔^①

ان تفصیلات کو اگر سامنے رکھا جائے تو نہ غیر مسلموں کے لیے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف

① معارف القرآن (۲/۵۰-۵۱) بتصرف.

تنگ نظری یا عدم رواداری کی کوئی وجہ شکایت باقی رہتی ہے اور نہ آیات و روایات میں کوئی تعارض یا اختلاف باقی رہتا ہے۔

اب رہی بات غیر مردوں کو گھریلو امور کے لیے ڈرائیور رکھنے، کسی غیر مسلم مرد یا عورت کو باورچی رکھنے یا کسی غیر مسلم کو بچوں کی پرورش و تربیت کے لیے گورنس یا دایہ رکھنے کی؟ تو ان امور میں مرد و زن کے اختلاط کا تو کوئی جواز ہی نہیں، جو حرام و ناجائز ہے اور اگر اس کے دیگر نتائج و عواقب پر غور کیا جائے تو ان افعال کے ناجائز ہونے میں کسی شبہ کی بھی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔



قرونِ اولیٰ میں مسلم اور غیر مسلم خوش گوار تعلقات کی چند مثالیں

غیر مسلموں کے لیے ہمارے دینِ اسلام میں کتنی رواداری اور حسنِ سلوک کی تعلیم ہے، اس بات کا اندازہ کرنا ہو تو ہمارے رسولِ رحمت ﷺ کی سیرتِ طیبہ پر ایک نظر ڈال لیں، اس سے ساری شکایتیں دُور ہو جائیں گی۔ آپ ﷺ نے غیر مسلموں کے ساتھ جو احسان و ہمدردی اور خوش اخلاقی کے معاملات کیے، ان کی دُنیا جہان میں نظیر ماننا مشکل ہے۔

❶ مکہ مکرمہ میں قحط پڑا تو جن دشمنوں نے آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے جانثاروں کو آبائی وطن چھوڑنے اور ملک بدر ہونے پر مجبور کیا تھا، ان کی خود امداد فرمائی۔

❷ پھر فتح مکہ کے روز جب تمام دشمن آپ ﷺ کا اشارہ اُبرو ملنے پر گاجر مولیٰ کی طرح کاٹے جاسکتے تھے، اس موقع پر بھی آپ ﷺ نے اپنی رحمتِ للعالمین کا ثبوت دیتے ہوئے فرمایا:

«لَا تَنْزِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ»^❶

”آج (تمہیں) صرف معافی ہی نہیں دی جاتی بلکہ تمہارے پچھلے ظلم و ستم اور تکالیف و ایذا رسانی پر) ہم تمہیں کوئی ملامت بھی نہیں کرتے۔“

❸ غیر مسلم جنگی قیدی ہاتھ آئے تو ان کے ساتھ وہ سلوک کیا کہ ہر شخص اپنی اولاد کے ساتھ بھی نہیں کر سکتا۔

❹ کفار و مشرکین اور منافقین نے آپ ﷺ کو طرح طرح کی ذہنی و جسمانی تکلیفیں پہنچائیں، مگر کبھی آپ ﷺ کا دستِ مبارک انتقام کے لیے نہ اُٹھا۔

❺ بنو نقیف جو ابھی مسلمان بھی نہیں ہوئے تھے، ان کا وفد آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو

❶ زاد المعاد (۲/۱۶۲، طبع قدیم) و طبری کما فی رحمة للعالمین للمنصور پوری (۱۲۰/۱)

انہیں مسجد نبوی ﷺ میں ٹھہرایا گیا، جو مسلمانوں کے لیے انتہائی عزت کا مقام تھا۔ غیر مسلموں کے لیے صرف نبی اسلام ﷺ ہی نے رواداری اور حسن سلوک کی یہ تابناک مثالیں قائم نہیں کیں، بلکہ اسلام اور نبی اسلام ﷺ کے پیروکاروں نے بھی اس سلسلے میں بے نظیر عملی نمونے پیش کیے ہیں، جن کی ضیاءباریوں اور ضوافتشانیوں میں عقائد و اعمال کی ظلمتوں کا راہی آج بھی جاہِ حق کو تلاش کر سکتا ہے۔

خلفائے راشدین کی تاریخ اٹھائیے۔ ان کے عہدِ زریں کا مطالعہ کیجیے۔ سیرتِ فاروق رضی اللہ عنہما پر اچھٹی ہوئی طائرانہ نظر ہی ڈال کر دیکھیں، آپ کو قدم قدم پر انسانی ہمدردی کی مثالیں ملیں گی اور آپ کو یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگے گی کہ آج یو۔ این۔ او یا اقوام متحدہ، جس انسانی منشور پر بڑی نازاں ہے، یہ ہمارے اسلاف کے حسین نامہ اعمال کا عشرِ عشر بھی نہیں۔

﴿6﴾ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ضعیف و معذور مسلمانوں کو بیت المال سے وظیفے دیے تو اپنی مملکت میں رہنے والے غیر مسلم معذور و محتاج ذمیوں کے لیے بھی مسلمانوں کی طرح ہی بیت المال سے باقاعدہ وظیفے مقرر کیے۔

﴿7﴾ خلفائے راشدین، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اسلاف امت کی تاریخِ مواسات و مدارات اور حسن معاملات سے بھری پڑی ہے، البتہ ترکِ موالات کے قرآنی ضابطے کو کسی حالت میں بھی انہوں نے فراموش نہیں کیا۔^①

تخلیقِ انسانی کا بنیادی مقصد اور عدم موالات میں شدت کی وجہ:

مسلم اور غیر مسلم افراد کے باہمی تعلقات کی کل چار ہی نوعیتیں ہیں جن میں سے تین قسم کے تعلقات تو بعض حالات میں بعض شرائط کے ساتھ جائز ہیں۔ صرف ایک ہی درجہ ایسا ہے جو کسی حالت اور کسی شکل میں بھی جائز نہیں اور وہ موالات یا دلی محبت کا درجہ ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ آخر قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے کفار کی موالات اور قلبی دوستی و محبت سے اتنی شدت کے ساتھ کیوں روکا ہے اور اس میں آخر کیا حکمت ہے؟

اس کا جواب پانے کے لیے سب سے پہلے ہمیں تخلیقِ انسانیت کے بنیادی مقصد کی تعیین کرنا ہوگی۔

① معارف القرآن (۲/۵۱-۵۲) بتصرف.

بات دراصل یہ ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے اس دُنیا میں انسان کا وجود عام جانوروں اور جنگل کے شجر و حجر یا گھاس پھوس کی طرح نہیں کہ پیدا ہوئے، پھلے پھولے اور پھر ہمیشہ کے لیے نیست و نابود اور ختم ہو گئے، بلکہ انسان کی زندگی اس جہاں میں ایک با مقصد زندگی ہے اور حیاتِ انسانی کے تمام ادوار، کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا، حتیٰ کہ جینا اور مرنا سب ایک مقصد کے گرد گھومتے ہیں۔ جب تک وہ مقصد کے مطابق ہیں تو یہ سارے کام ہی درست و صحیح ہیں اور اگر یہ امور اس مقصد کے مخالف ہیں تو یہ سب غلط ہیں۔ وہ مقصد کیا ہے؟

قرآن کریم کی سُوْرۃ الذاریات (آیت: ۵۶) میں اللہ تعالیٰ نے تخلیقِ انسانی کے اُس مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾

”میں نے جنوں اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا کہ وہ میری بندگی کریں۔“

ساتھ ہی مزید وضاحت فرمادی:

﴿مَا أُرِيدُ مِنْهُمْ مِنْ رِزْقٍ وَمَا أُرِيدُ أَنْ يُطْعَمُونَ ﴿۵۷﴾ إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ﴾ [الذاریات: ۵۷-۵۸]

”میں ان سے کوئی رزق نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں (اور فرمایا) اللہ ہی تو ہے جو رزاق، بڑی قوت والا اور زبردست ہے۔“

انسانی زندگی کے اسی مقصدِ تخلیق کے بارے میں دانائے رُوم نے اپنی مثنوی میں کیا خوب کہا ہے: ے

زندگی از بہرِ ذکر و بندگی ست

بے عبادت زندگی شرمندگی ست

جو انسان اپنے اس بنیادی مقصدِ حیات کو پورا نہ کر رہا ہو تو اسے انسان کہلوانے کا کیا حق ہے؟

بقول مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ وہ انسان نہیں، بس انسان کا روپ دھارے ہوئے ہے اور انسانیت کے خلاف

میں پایا جاتا ہے۔ ے

آنچه می بینی خلافِ آدم اند

نیستند آدم در غلافِ آدم اند

قرآن کریم سورة الانعام (آیت: ۱۶۲ اور ۱۶۳) میں اللہ تعالیٰ نے اسی مقصدِ تخلیق کا اقرار

انسان سے ان الفاظ میں لیا ہے:

﴿قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۶﴾ لَا شَرِيكَ لَهُ وَبِذَلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ﴾

”آپ کہہ دیجیے کہ میری نماز و قربانی اور میری موت و حیات سب اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔ اللہ کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سراطعت خم کرنے والا میں ہوں۔“

جب انسان کی زندگی کا مقصدِ وحید اللہ رب العالمین کی اطاعت و عبادت ہے تو دنیا کے تمام کاروبارِ ریاست و سیاست اور عائلی و منزلی تعلقات بھی سب اُسی کے تابع ٹھہرے اور جو انسان اس بنیادی مقصد کے مخالف ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے سرتسلیم خم کرنے والے انسانوں کے سب سے زیادہ دشمن ہیں اور شیطان لعین چونکہ اس مقصد کی مخالفت میں سب سے آگے ہے، لہذا قرآن کریم کی سورة الفاطر (آیت: ۶) میں اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوهُ عَدُوًّا﴾ [الفاطر: ۶]

”درحقیقت شیطان تمہارا دشمن ہے، اس لیے تم بھی اسے اپنا دشمن ہی سمجھو۔“^①

اسی طرح جو لوگ شیطانی وساوس کے پیرو اور انبیاء ﷺ کے ذریعے سے آئے ہوئے احکامِ الہی کے مخالف ہیں، ان کے ساتھ دلی ہمدردی اور قلبی دوستی اس شخص کی ہو ہی نہیں سکتی، جس کی زندگی ایک بامقصد زندگی ہے اور جس کی دوستی اور موافقت و مخالفت سب اس مقصد کے تابع ہیں۔^②

① اور اسی موضوع کو اللہ تعالیٰ نے سورة الاعراف (آیت: ۲۲) سورة یوسف (آیت: ۵۳) سورة بنی اسرائیل

(آیت: ۵۳) اور سورة الفرقان (آیت: ۲۹) میں بھی بیان فرمایا ہے۔

② اس موضوع کے صرف مرکزی نقطہ و مفہوم کے لیے ہمارا ماخذ ہے: معارف القرآن (۲/۵۲-۵۳)

عدم موالات کے حکم میں شدت کا سبب:

جس انسان کو اپنی زندگی کے مقصد کا ادراک ہو جائے اور اسے پتا چل جائے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے اطاعت و عبادت کا مطالبہ کیا ہے تو پھر اس کی تمام حرکات و سکنات، اس کے تمام افعال و اعمال اور اس کے تمام تعلقات حکم الہی کے تابع ہو جاتے ہیں، جن سے وہ سر مو انحراف کرنا بھی گناہ سمجھتا ہے۔

اللہ کے ایسے بندوں کی دوسرے لوگوں سے دوستی و محبت یا بغض و عداوت بھی خالص منشاے الہی کے تابع ہوتی ہے۔ وہ نہ اپنی ذات کے نفع و نقصان کی خاطر کسی سے پیار کرتا ہے اور نہ ذاتی انتقام کے جذبے سے مغلوب ہو کر کسی سے دشمنی یا نفرت رکھتا ہے۔ اس کی نفرت و محبت کا پیمانہ صرف رضائے الہی ہوتا ہے اور جس شخص میں یہ وصف پیدا ہو جائے، رسول کریم ﷺ کی نگاہ حق شناس میں وہی کامل الایمان شخص ہوتا ہے، جیسا کہ ابو داؤد شریف میں آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

«مَنْ أَحَبَّ لِلَّهِ وَأَبْغَضَ لِلَّهِ فَقَدْ اسْتَكْمَلَ إِيمَانَهُ»

”جس شخص نے اپنی دوستی و دشمنی کو صرف اللہ تعالیٰ کی منشا کے تابع کر دیا، اُس نے اپنا ایمان مکمل کر لیا۔“

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایمان کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے، جب انسان اپنی محبت و دوستی اور نفرت و دشمنی کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے تابع کر دے۔ اس لیے مومن کی موالات اور دلی محبت صرف اسی شخص کے لیے ہو سکتی ہے، جو اس مقصد کا ساتھی اور اللہ کا تابع فرمان ہو اور جو شخص اس مقصد کا متلاشی نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر مہر ہو تو پھر اُس سے وہی شخص دوستی کر سکتا ہے، جو اُسی جیسا ہوگا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے کفار کے ساتھ موالات کا تعلق رکھنے والوں کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ﴾ [المائدة: ۵۱]

”تم میں سے جس نے اُن (اللہ کے نافرمان یہود و نصاریٰ) کے ساتھ دلی تعلق رکھا تو

صحیح سنن أبي داود، رقم الحديث (۳۹۵۱) صحيح الجامع، رقم الحديث (۵۹۶۵) اور اس میں «مَنْ أُعْطِيَ لِلَّهِ وَمَنْعَ لِلَّهِ» کے الفاظ بھی ہیں کہ جس نے اللہ کے لیے دیا اور اُسی کی خاطر روکا۔ السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (۳۸۰)

خود اس کا اپنا شمار بھی انہی میں سے ہوگا۔“

اس بات کی مزید وضاحت نبی اکرم ﷺ کی ایک دوسری حدیث شریف سے ہو جاتی ہے۔ سنن ابوداؤد میں حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ جَامَعَ الْمُشْرِكَ وَسَكَنَ مَعَهُ فَإِنَّهُ مِثْلُهُ»^(۱)

”جو کوئی (کفار و) مشرکین کے ساتھ اختلاط یا میل جول رکھے، وہ خود بھی انہی جیسا ہوگا۔“

اس سے معلوم ہوا کہ ان کے ساتھ رہن سہن رکھنے والا بھی انہی کے حکم اور وعید میں آجاتا ہے۔ یہاں ہم اس بات کی طرف توجہ مبذول کروانا چاہتے ہیں کہ ہمارے وہ احباب جو نہ اللہ کی خاطر محبت رکھتے ہیں، نہ اس کی خاطر نفرت کرتے ہیں، بلکہ محض چند دنیوی مفادات کے پیش نظر اپنی بود و باش، میل جول، کھانا پینا اور رہن سہن غیر مسلموں کے ساتھ رکھتے ہیں، وہ اس حدیث رسول ﷺ کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ لیں اور اپنے کردار کے اس کمزور پہلو کی اصلاح کر لیں، تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن جب بنی آدم کو حساب کتاب کے لیے اٹھایا جائے تو ان کا حشر بھی انہیں کے ساتھ ہو۔ اَعَاذَنَا اللَّهُ مِنْهُ.

یہ امر واقع ہے کہ ہمارے بعض مسلمان محض معمولی دنیوی اغراض اور گھٹیا قسم کے مقاصد کی خاطر بعض غیر مسلم قوموں سے دوستانہ راہ و رسم رکھتے ہیں۔ مثلاً: بعض لوگ انگریزوں سے سلام دعا رکھتے ہیں اور بعض سکھوں کے ساتھ میل جول اور مراسم پیدا کر لیتے ہیں اور اغراض و مقاصد کی فہرست انتہائی مختصر بلکہ صرف دو حرفی ”مفت شراب“ ہوتی ہے۔ ایک چیز جو پہلے ہی قرآن و سنت کی رو سے حرام ہے، اس کے حصول کے لیے دوسرے حرام کام کا بھی ارتکاب ہوتا ہے اور پھر یہ سلسلہ حرام در حرام چل نکلتا ہے۔

ایسے ہی بعض لوگ غیر مسلموں کے ساتھ رہن سہن کے علاوہ مل کر کھانا پینا بھی کرتے ہیں، ایک ہنڈیا اور مشترکہ برتن اور ایک ہی دسترخوان، جو وسعت ظرفی نہیں، بلکہ ناشائستگی و بدتہذیبی اور ارشاد نبوی ﷺ کی نافرمانی ہے اور بُرا ہو، ملکی و لسانی اور وطنی و نسلی تعصب کا جو یہ کام کرواتا ہے کہ اپنے ملک و قوم کے کافر کو تو اپنے ساتھ رکھنا منظور ہے، دوسری قوم و ملک کے مسلمان کو بھی روم میٹ

(۱) سنن أبي داود، رقم الحديث (۲۷۸۷) السلسلة الصحيحة (۲۳۳۰) صحيح الجامع (۶۱۸۶)

بنانا گوارہ نہیں کیا جاتا، جو انتہائی پست ذہنیت کی علامت ہے۔

سورۃ البقرہ (آیت: ۲۸) میں کفار سے عدم موالات کی تاکید کرنے کے بعد فرمایا کہ ”اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی ذاتِ عظیم سے ڈراتا ہے۔“ ایسا نہ ہو کہ چند روزہ اغراض و مقاصد کی خاطر موالاتِ کفار میں مبتلا ہو کر اللہ کو ناراض کر بیٹھو اور چونکہ موالات کا تعلق دل سے ہے اور دل کا حال اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اس لیے ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص حقیقت اور واقع میں تو کفار کی محبت میں مبتلا ہو، مگر زبانی انکار کرے۔ لہذا آل عمران (آیت: ۲۹) میں فرمایا:

﴿قُلْ إِنْ تَخَفُوا مَا فِي صُدُورِكُمْ أَوْ تُبْدُوهُ يُعَلِّمَهُ اللَّهُ وَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَ مَا فِي الْأَرْضِ وَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾
 ”کہہ دیجیے (اے میرے پیغمبر ﷺ!) تم اپنے دل کی بات چھپاؤ یا ظاہر کرو، اللہ تعالیٰ تو اُسے بہر حال جانتا ہی ہے اور جو کچھ ارض و سما میں ہے، اسے سب معلوم ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

1 کفار و مشرکین کی تقلید اور پیروی:

احکامِ الہی کی بنیاد پر یہ مسئلہ طے ہو جانے کے بعد کہ کفار و مشرکین کے ساتھ موالات منع ہے، اس بات کا فیصلہ کرنا بہت آسان ہو جاتا ہے کہ ان (کفار و مشرکین) کی عادات و اطوار، گفتار و کردار، خوراک و پوشاک اور خور و نوش کے انداز کی پیروی کرنا کیوں کر جائز ہو سکتا ہے؟ یہ سب امور بھی یقینی طور پر ناجائز اور قطعی منع ہیں۔ اہل علم نے قرآن و سنت کے دلائل کی بنا پر کفار کی تقلید اور پیروی کو گناہِ کبیرہ شمار کیا ہے۔^(۱) کیوں کہ قرآن کریم کی سورۃ الجاثیہ (آیت: ۱۸) میں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب پیغمبر ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ﴾

”(اے میرے نبی ﷺ!) ہم نے آپ (ﷺ) کو دین کے معاملے میں ایک شریعت پر

(۱) تطہیر المجتمعات (ص: ۲۹۵-۲۹۹)

قائم کیا ہے، لہذا آپ اسی پر چلیں اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کریں جو علم نہیں رکھتے۔“

اس آیت میں ﴿الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ﴾ سے مراد مشرکین لیے ہیں اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہود بنی قریظہ و بنی نضیر بھی منقول ہیں۔^①

علامہ ابن الجوزی رحمہ اللہ نے اس آیت کے شان نزول میں لکھا ہے:

”جب کفار قریش نے نبی ﷺ کو آبائی دین کی طرف لوٹ آنے کی دعوت دی تو یہ آیت نازل ہوئی۔“ پھر انہوں نے ﴿الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ﴾ کی تفسیر کفار و مشرکین کی ہے۔

علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے ”روح المعانی“ میں مذکورہ بالا تفسیر کے ساتھ ہی اس سے مراد جاہل اور گمراہ لوگ بیان کیے ہیں۔ امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے بھی ان سے حق و باطل کو نہ جاننے والے جاہل لوگ مراد لیے ہیں۔^②

اللہ تعالیٰ نے تو ہمیں ان لوگوں کی عادات و اطوار اور ان کے طریقے پر نہ چلنے کی دُعائیں مانگنے کا حکم فرمایا ہے۔ ہم ہر رکعت میں قبلہ رو ہو کر سورۃ الفاتحہ (آیت: ۵، ۶، ۷) میں دُعا کرتے ہیں:

﴿إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۝ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ﴾

”اے اللہ! ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔ اُن لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا، جو معتبوب نہیں ہوئے اور جو بھٹکے ہوئے نہیں ہیں۔“

مفسرین کرام نے ان آخری الفاظ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ معتبوب و مغضوب سے مراد قوم یہود اور ضالین سے مراد نصاریٰ (عیسائی) ہیں۔^③

مستدرک حاکم میں ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا:

«هَدَيْنَا مَخَالَفَ لِهَدْيِهِمْ»

① تفسیر القرطبي (۱۶۴/۱۶/۸)

② زاد المسير (۳۶۰/۷) حاشیہ زاد المسير (۳۶۰/۷)

③ تفسیر ابن کثیر اردو (۱/۴۵-۴۶)

”ہمارا طور طریقہ ان (یہود و نصاریٰ) کے طور طریقے کے مخالف ہے۔“
 غیر مسلموں کے طور طریقے اپنانے والوں کو اس فعل کا انجام بتاتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ غیروں کی مشابہت اختیار کرنے کا طریقہ یہ ہوگا کہ تمہارا شمار بھی انہی میں سے ہو جائے گا، جیسا کہ سنن ابی داؤد اور صحیح ابن حبان میں ارشاد نبوی ﷺ ہے:
 «مَنْ تَشَبَهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ»^(۱)
 ”جس نے کسی قوم کی مشابہت کی تو وہ انہی میں سے ہے۔“^(۲)

غیروں کی تقلید سے منع کرنے کی حکمت:

غیروں کی تقلید اور مشابہت سے منع کرنے کی حکمت یہ ہے کہ عادات و اطوار اور خوراک و پوشاک کے ظاہری امور میں مشابہت اختیار کرنے سے باطنی امور پر بھی اثر پڑتا ہے اور ان میں بھی یکسانیت آجانا شروع ہو جاتی ہے۔ یہ عمل غیر ارادی طور پر از خود انجام پا جاتا ہے اور جس طرح احساس و تجربے کی رو سے یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ باطنی محبت سے ظاہری مشابہت آ ہی جاتی ہے، ایسے ہی اس کے برعکس ظاہری مشابہت کا رنگ باطنی محبت کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ اسی عظیم حکمت کے پیش نظر رسول رحمت ﷺ نے غیر مسلم اقوام کی مشابہت سے منع فرمایا ہے، تاکہ ان کا رنگ غالب نہ آجائے۔

مگر برا ہو اس اندھا دُھند تقلیدِ مغرب کا کہ قرآن و سنت کی ان واضح تصریحات کے باوجود بھی وہ پھیل رہی ہے۔ یہود و نصاریٰ اور مجوس و مشرکین کی تمام عادات ایک ایک کر کے مُسلم معاشرے میں سرایت کر رہی ہیں اور اس سارے عمل کے پیچھے یہودی لابی اور کرپشن مشنری کا باقاعدہ ہاتھ ہے، جو خفیہ اور غیر محسوس انداز میں سرگرم عمل ہیں۔

{1} علامہ احمد حسن دہلوی نے لکھا ہے کہ اس حدیث میں ضعف پایا جاتا ہے، مگر اس کے شواہد موجود ہیں۔ مثلاً مسند ابی یعلیٰ میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: «مَنْ رَضِيَ عَمَلَ قَوْمٍ كَانَ مِنْهُمْ» ”جو کسی قوم کے کسی کام سے راضی ہوا، وہ انہی میں سے ہے۔“ حاشیہ الدہلوی علی بلوغ المرام (۱/۲) (۳۷۸) طبع المکتب الإسلامي
 {2} اس حدیث کو البانی نے صحیح کہا ہے۔ صحیح سنن ابی داؤد، رقم الحدیث (۳۴۰۱) صحیح الجامع، رقم الحدیث (۶۱۴۹) إرواء الغلیل (۱۲۶۹) اس کی مزید تشریح کے لیے فتاویٰ اہل حدیث ملاحظہ فرمائیں۔

حد تو یہ ہے کہ آج ان فتنہ انگیز عادات و اطوار اور فیشنوں کا پرچار کرنے والے صرف کفار ہی نہیں، بلکہ ایسے مسلم نوجوان بھی ہیں جو علم و فن کے حصول کے لیے مغربی ممالک کا سفر کرتے ہیں اور آتے ہوئے جہاں ہاتھوں میں علمی ڈگریاں لاتے ہیں، وہیں اپنے ذہنوں میں تقلیدِ مغرب کا میٹھا زہر بھی لیے چلے آتے ہیں۔ سامراجی طاقتوں اور ہمارے ان اپنوں کی مہربانیوں ہی کا نتیجہ ہے کہ آج کہیں کہیں مشرق کی فضاؤں پر بھی مغرب کا دھوکا ہوتا ہے اور مسلم و کافر کا فرق ناپید ہوتا جا رہا ہے۔

چند مثالیں:

بنی اسرائیل (یہود و نصاریٰ) کی بد اعمالیوں کی وجہ سے قرآن کریم کے بے شمار مقامات پر ان کی مذمت کی گئی ہے، تاکہ اہل اسلام اس سے عبرت حاصل کریں اور ان کی عادات کو اختیار نہ کریں، لیکن قرآن کریم کی مخاطب امتِ اسلامیہ کے افراد نے یہود و نصاریٰ کی مذمت سے عبرت پکڑنے کے بجائے انہی کے اطوار و افعال کو اختیار کر لیا ہے اور ان کی اندھی تقلید کیے چلے جا رہے ہیں، حتیٰ کہ دینی، اخلاقی، معاشی اور معاشرتی کوئی شعبہ حیات ایسا نہیں، جس میں ان کفار کی پیروی نہ کی جا رہی ہو۔

2) شرک اور بت پرستی:

کچھلی قوموں میں شرک اور بت پرستی پائی جاتی تھی، آج مسلمانوں میں بھی عبادتِ الہی کے ساتھ ساتھ مختلف قسم کی کئی اور ”پرستیوں“ نے قدم جما لیے ہیں۔ ان میں بت پرستی تھی تو ہمارے یہاں قبر پرستی ہے۔ وہ اپنے احبار و رہبان کی عبادت یا پیشوا پرستی میں مبتلا تھے تو ہمارے یہاں اسی کا متبادل پیر پرستی کی شکل میں موجود ہے۔ ہمارے احباب نے اپنے پیروں اور ولیوں کو ”خدائی“ اختیارات سونپ رکھے ہیں اور ان کی قبروں کی پرستش کی جاتی ہے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی قوم کی اس پتلی حالت کے پیش نظر اللہ کے حضور دست بہ دعا ہو کر کہا تھا: —

عطا کر دے انھیں یا رب بصارت بھی بصیرت بھی

مسلمان جا کے لیتے ہیں سوادِ خانقاہی میں

حقیقت یہی ہے کہ کم از کم عقیدہ توحید تو ہم خانقاہوں ہی پر جا کے لٹا رہے ہیں۔ نذریں ان

کے لیے مانی جاتی ہیں، جبکہ غیر اللہ کے نام کی نذر ماننا شرک ہے۔ قبروں کا طواف کیا جاتا ہے، مزاروں پر جانور ذبح کیے جاتے ہیں، قسمیں انہی کی کھائی جاتی ہیں اور مشکل کے وقت فریاد انہی سے کی جاتی ہے، جبکہ یہ تمام شرکیہ امور ہیں^①۔

جہاں شرک آ گیا، وہاں سے توحید کی دولت اٹھ گئی اور جو گوہر توحید سے تہی دست ہو گیا، وہ سمجھ لے کہ اس کا سبھی کچھ لٹ گیا۔

③ بے پردگی اور مردوزن میں اختلاط:

اس خالص دینی پہلو کی مختصر روئیداد کے بعد اب دیگر شعبوں پر بھی سرسری نظر ڈال لیں۔ کفار نے اپنے تعلیمی، تجارتی اور حکومتی اداروں میں مردوزن کے بے حجاب اختلاط اور میل جول کو رواج دیا، جو اب ہمارے یہاں بھی ہے۔ انھوں نے کواہجیکیشن یا مخلوط تعلیم شروع کی، ہم نے بھی کر دی، ان کی عورتوں سے بے پردگی مسلمان عورتوں میں بھی آچکی ہے۔ بیہودی اور دیگر غیر مسلم عورتیں پتلونیں اور شرٹیں پہن کر بے پردہ بازار میں نکلتی ہیں۔ یہ عادت جو ان کی مسلمان بیٹی میں بھی آگئی ہے۔ وہ منی سکرٹ پہنتی ہیں تو یہ اب یہاں بھی مقبول ہو رہی ہے۔

ہندو مرد اپنے انداز کا تہد باندھتے آ رہے ہیں، جس کا نچلا درمیانی حصہ پکڑ کر وہ لوگ اسے ازار بند کی جگہ سے باندھ دیتے ہیں۔ اب اسی سے ملتی جلتی شلوار قمیص (دھوتی گرتی) مسلم عورتوں میں بھی رواج پا رہی ہے۔ الغرض فیشن یا نقالی کی بھی کوئی حد ہے کہ اب اگر آپ کسی کو ذاتی طور پر جانتے نہیں ہیں تو مسلم و غیر مسلم کا فرق نہیں کر سکیں گے۔

④ کھانا کھانے کا حیوانی انداز:

مغرب کے بیہود و نصاریٰ نے ٹیبلوں کے گرد گھومتے پھرتے اور کھڑے کھڑے کھانا کھانے کا حیوانی انداز اپنایا، جسے بے سسٹم کہا جاتا ہے، حالانکہ اسے بفیلو سسٹم کہا جانا چاہیے تھا۔ مغرب کے ذہنی غلاموں نے اپنے یورپی آقاؤں کے اس ”دین“ کو بھی بہ صد احسان قبول کیا ہوا ہے!!

① ان امور کی تفصیلات بادلائل ہم اپنی کتاب ”قبولیت عمل کی شرائط“ کے ضمن میں ذکر کر چکے ہیں۔ اور یہ کتاب پاکستان اور اب ہندوستان میں بھی بچھ چکی ہے۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ عَلٰی ذٰلِكَ.

5 بائیں ہاتھ سے کھانا کھانا:

یہودی نے دیکھا کہ مسلمانوں کا نبی (ﷺ) دائیں ہاتھ سے کھانے اور پینے کی تعلیم دیتا ہے اور بائیں ہاتھ سے خور و نوش کو شیطان کی صفت قرار دیتا ہے، جیسا کہ صحیح مسلم، سنن ابی داؤد اور ترمذی میں ارشاد رسالت مآب ﷺ ہے:

« إِذَا أَكَلَ أَحَدُكُمْ فَلْيَأْكُلْ بِيَمِينِهِ، وَإِذَا شَرِبَ فَلْيَشْرَبْ بِيَمِينِهِ، فَإِنَّ الشَّيْطَانَ يَأْكُلُ بِشِمَالِهِ وَيَشْرَبُ بِشِمَالِهِ »⁽¹⁾

”تم میں سے جب کوئی کھائے تو دائیں ہاتھ سے کھائے اور جب پیے تو دائیں ہاتھ سے پیے، کیوں کہ شیطان بائیں ہاتھ سے کھاتا اور بائیں ہی سے پیتا ہے۔“

جب یہودی نے دیکھا کہ مسلمانوں کے رسول (ﷺ) نے بائیں ہاتھ سے کھانے اور پینے کو شیطانی فعل قرار دیا ہے تو اس نے ایسی ایسی چالیں چلیں کہ مسلمان شیطانی فعل کا ارتکاب بھی کرے اور اسے محسوس بھی نہ ہو۔

آپ ذرا پھری کانٹے سے کھانا کھانے والوں کو دیکھ لیں، ایک چیز کو دائیں ہاتھ سے کاٹیں گے تو بائیں ہاتھ سے کھالیں گے۔ ایک چیز دائیں سے پکڑ کر منہ تک پہنچائیں گے تو دوسری کو بائیں کے ذریعے سے نوالہ بنالیں گے۔ بائیں ہاتھ میں گلاس لے کر پانی پینا عام مشاہدے میں آتا رہتا ہے۔⁽²⁾

بعض چائے پینے والوں کو بھی دیکھ لیں جو لوگ کپ اور پرچ استعمال کرتے ہیں، ان کے دائیں ہاتھ میں کپ ہوتا ہے، جس سے چائے انڈیلنے ہیں اور بائیں ہاتھ میں پرچ ہوتی ہے، جس سے پیتے ہیں۔ اَلَا مَا شَاءَ اللّٰهُ.

(1) صحیح مسلم مع شرح النووي (۱۹۱/۱۳) صحیح سنن ابی داؤد، رقم الحدیث (۳۲۰۹) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۱۴۷۰) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۳۲۶۶) کذا فی بلوغ المرام و حاشیہ الدہلوی علیہ (۲/۳۶۶ و ۳۶۷) صحیح الجامع (۳۸۴) السلسلۃ الصحیحۃ (۱۲۳۶) الموطأ مع شرحہ المسوی (۱۵۴۵) طبع دار الکتب العلمیۃ.

(2) بائیں ہاتھ پر گھڑی باندھنا بھی یہودی چال ہی معلوم ہوتی ہے۔ واللہ اعلم ورنہ چاہیے تو یہ تھا کہ گھڑی دائیں ہاتھ کی کلائی پر باندھی جاتی اور انگوٹھی بھی دائیں ہاتھ کی انگلی میں ہی پہنی جاتی اور معروف سنت رسول ﷺ کا تقاضا بھی یہی ہے۔ (ارشاد الحق)

6 کتے پالنے کا رواج:

کفار نے چھوٹی نسل کے گتے پالنے کو رواج دیا، انھیں اپنے ساتھ کھلایا پلایا، چوما چاٹا، گدوں پر سلایا اور ان کا شادی بیاہ بھی کیا۔^(۱) مسلمانوں نے بھی آج ثابت کر دیا ہے کہ ہم بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔ حالاں کہ صحیح بخاری و مسلم میں مذکور ارشاد رسالت مآب ﷺ کی رو سے جس گھر میں گتتا اور کسی بھی جاندار کی تصویر لگی ہو، وہاں فرشتہ رحمت داخل نہیں ہوتا۔ چنانچہ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

«لَا تَدْخُلُ الْمَلَائِكَةُ بَيْتًا فِيهِ كَلْبٌ وَلَا صُورَةٌ»^(۲)

”فرشتے کسی ایسے گھر میں داخل نہیں ہوتے، جس میں کتا یا تصویر ہو۔“

(۱) لاہور سے شائع ہونے والے سات مارچ ۱۹۸۹ء کے روزنامہ جنگ میں یہ خبر شائع ہوئی کہ ”ترقی یافتہ یورپی معاشرہ“ ۲۱ سالہ نوجوان نے اپنی کتیا سے شادی رچالی۔ جس کا متن من و عن نقل کیا:

”لاہور (نیوز ڈیسک) یورپ کے ترقی یافتہ معاشرے میں ایک ۲۱ سالہ نوجوان نے اپنی کتیا سے شادی رچالی، دولہا کا نام ”مارک شیڈ“ اور دلہن جو اعلیٰ نسل کی کتیا ہے کا نام ”میکسی“ ہے۔ شادی کے دن مارک سیاہ رنگ کے سوٹ میں ملبوس اونچا ہیٹ پہنے ہوئے تھا، جب کہ اس نے اپنی بیوی (کتیا) کے گلے میں سفید رنگ کی پٹی ڈال رکھی تھی۔ شادی کی تقریب میں ۶۰ مہمانوں نے شرکت کی۔

مارک نے شادی کے بعد کتیا سے کہا کہ بے شک تم کتیا ہو، لیکن میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ مارک جو آرٹس اور ڈیزائن کا طالب علم ہے، اس نے کہا کہ میں اپنی بیوی کی اتنی خدمت کروں گا، جتنی ایک خاوند اپنی اپنی بیوی کی کرتا ہے۔

ایک انگریزی جریدہ کے مطابق شادی کی دوسری تقریب مارک کے گھر کے واقع آکسفورڈ اپکس میں ہوئی، جس میں مارک کی والدہ دو بہنوں اور ایک بھائی نے مہمانوں کو خوش آمدید کہا۔ جب کتیا سے پوچھا گیا کہ کیا وہ مارک کو بحیثیت خاوند قبول کرتی ہے تو ”میکسی“ نے جواباً اپنا سر زمین پر جھکا لیا۔ جس پر تمام مہمانوں نے خوشی سے ناچنا اور گانا شروع کر دیا۔ ادھر مارک کے کالج کے پرنسپل نے اپنے ہونہار شاگرد کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا کہ یہ دونوں کے درمیان بہترین رابطہ ہے۔ بتایا گیا ہے کہ مارک اپنی دلہن کے ساتھ ہنسی مون منانے کے لیے ایک جزیرے پر چلا گیا ہے، یہ خبر کسی تبصرے یا تجزیے کی محتاج نہیں۔ بس مغرب کی اندھی تقلید کرنے والوں کو غور و فکر سے کام لینا چاہیے۔ (ارشاد)

(۲) مختصر صحیح البخاری للالبانی، رقم الحدیث (۱۳۹۰) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (۴۱۹۹) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۲۲۴۸-۲۲۴۹) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۴۹۴۰) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۳۶۴۹) دیکھیں: تطہیر المجتمعات (ص: ۲۳۴-۲۳۵)

سنن ابی داؤد کی روایت میں «وَلَا جُنُبٌ»^(۱) کے الفاظ بھی موجود ہیں کہ ”جس گھر میں جنبی رہتا ہو اُس میں بھی فرشتے داخل نہیں ہوتے۔“

امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کرتے ہوئے علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

”فرشتوں سے برکت و رحمت کے فرشتے مُراد ہیں، محافظ نہیں، کیوں کہ وہ تو ہر حال میں بندوں کے ساتھ ہی رہتے ہیں، وہ جنبی ہو یا غیر جنبی۔“^(۲)

ہمارا حال آج یہ ہے کہ ہمارے یہاں کمروں کی دیواروں پر تصویریں آویزاں ہیں اور بیگم یا صاحب کی گود میں سُنا بھی کھیل رہا ہوتا ہے۔ شاید دولت زیادہ ہو جانے کی وجہ سے وہ فرشتہ رحمت کی آمد ضروری نہیں سمجھتے!!

7 بیہود و نصاریٰ کی پیروی:

اس بارے میں ہم بس چند ارشادات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم پر ہی اکتفا کریں گے۔ چنانچہ صحیح بخاری کی حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ ہی فرمایا ہے کہ اس وقت تک قیامت نہیں آئے گی، جب تک میری امت گذشتہ قوموں کی ہو بیہود پیروی نہ کرے گی۔

بخاری شریف کی اس حدیث کے مکمل الفاظ یہ ہیں:

«لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى تَأْخُذَ أُمَّتِي بِأَخْذِ الْقُرُونِ قَبْلَهَا شِبْرًا بِشِبْرٍ وَذِرَاعًا بِذِرَاعٍ، فَقِيلَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ (ﷺ) كَفَّارِسٍ وَرُومٍ؟ فَقَالَ: وَمَنْ النَّاسُ إِلَّا أَوْلِيَاكَ»^(۳)

”اس وقت تک قیامت نہیں آئے گی، جب تک میری امت گذشتہ قوموں کی ایک ایک بالشت اور ایک ایک ہاتھ، یعنی ہو بیہود پیروی نہ کرے گی۔ عرض کی گئی: اے اللہ

(۱) سنن ابی داؤد، رقم الحدیث (۴۱۵۲)

(۲) جنبی سے مراد وہ شخص ہے، جو حالت جنابت میں غسل نہ کرے یا عادتاً اسے طویل مدت تک لیٹ کر دے۔ رہا، وہ جنبی جو نماز کا وقت ہونے تک غسل میں تاخیر کرتا ہے۔ تو وہ یہاں مُراد نہیں ہے، کیونکہ نماز تک تاخیر کرنا تو خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ (الکبائر للذہبی ص ۱۹۸) اور یہی بات علامہ بیہقی نے بھی کہی ہے۔ دیکھیں:

الزواج (۲/ ۳۳-۳۴) صحیح الجامع، رقم الحدیث (۷۲۶۲)

(۳) التجرید الصریح (۲/ ۱۷۳) صحیح الجامع الصغیر، رقم الحدیث (۷۴۰۸)

کے رسول! (ﷺ) کیا ایران و روم کی طرح؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہ نہیں تو اور کون لوگ ہیں؟“

❑ 2 ایسے ہی ارشاد نبوی ﷺ ہے:

«لَتَتَّبِعَنَّ سَنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ شَبْرًا بِشَبْرٍ، وَذِرَاعًا بِذِرَاعٍ حَتَّىٰ لَوْ دَخَلُوا فِي جُحْرٍ ضَبَّ لَا تَبَعْتُمُوهُمْ. قُلْنَا يَا رَسُولَ اللَّهِ! الْيَهُودُ وَالنَّصَارَىٰ؟ قَالَ فَمَنْ؟»^①

”تم اپنے سے پہلے گزری ہوئی قوموں کی ایک ایک بالشت اور ایک ایک ہاتھ یعنی ہو پیروی کرو گے۔ یہاں تک کہ اگر وہ کسی گاوہ کے سوراخ (بیل) میں گھسے ہوں گے تو تم بھی ان کے پیچھے ہی چل پڑو گے۔ ہم (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) نے عرض کی: اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا آپ ﷺ کی مراد یہود و نصاریٰ ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اور کون؟“

❑ 3 ایک اور حدیث میں ہے:

«لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّىٰ تَعْبُدَ قِبَائِلُ مِنْ أُمَّتِي الْأَوْثَانِ»^②

”اس وقت تک قیامت قائم نہیں ہوگی، جب تک کہ میری امت کے لوگ گروہ درگروہ جٹوں کی پرستش نہ کرنے لگیں گے۔“

❑ 4 ترمذی شریف اور مستدرک حاکم میں ارشاد رسالت مآب ﷺ ہے:

«لَتَأْتِيَنَّ عَلَىٰ أُمَّتِي مَا أَتَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ حَتَّىٰ إِنْ كَانَ مِنْهُمْ مَنْ أَتَىٰ أُمَّةً عَلَانِيَةً لَكَانَ فِي أُمَّتِي مَنْ يَصْنَعُ ذَلِكَ»^③

”میری امت پر بھی ہو ہو وہ وقت آئے گا، جیسا کہ بنی اسرائیل پر آیا تھا۔ یہاں تک کہ ان میں سے اگر کسی نے اپنی ماں کے ساتھ کھلے عام بدکاری کی تو میری امت میں سے بھی بعض ایسا ہی کریں گے۔“

① مختصر صحیح مسلم للمنزري، رقم الحديث (٢٠٠٢) صحیح الجامع الصغیر، رقم الحديث (٥٠٦٣)

② صحیح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٧٧)

③ سنن الترمذی، رقم الحديث (٢٦٤١) المستدرک للحاکم (١/ ١٢٩)

ان ارشاداتِ نبویہ ﷺ کو پڑھیں اور پھر ہم اپنا جائزہ لیں کہ ہم کدھر اور کہاں جا رہے ہیں؟
 ہمارا حال تو یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کی پیروی میں کیے گئے ان افعال کو (جو پیچھے ذکر کیے گئے ہیں)
 کسی نہ کسی طرح جائز قرار دینے کے لیے سوائی سیدھی دلیلیں تراشی جاتی ہیں۔ بہ قول اقبال: س
 آہ! محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق
 خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں



حیوانات اور پرندوں کا جھوٹا

بنی آدم میں سے مسلم و غیر مسلم اور غیر مسلموں میں اہل کتاب یہود و نصاریٰ اور غیر اہل کتاب کفار و مشرکین کے جھوٹے کے بارے میں تین اقوال، ان کے دلائل اور جائزہ، پھر کفار و مسلمین کے باہمی تعلقات کے اس موضوع کے آخر میں اب آئیے دیکھیں کہ حیوانوں اور پرندوں کے جھوٹے کا کیا حکم ہے؟

اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ حیوانات اور پرندے دو قسموں کے ہوتے ہیں:

- ا۔ ایک وہ جو ماکول اللحم ہیں کہ جن کا گوشت حلال اور کھایا جاتا ہے۔ مثلاً بھیڑ، بکری، گائے، بھینس اور اونٹ وغیرہ اور پرندوں میں سے چڑیا، کبوتر اور مرغی وغیرہ۔
- ب۔ دوسرے وہ جن کا گوشت نہیں کھایا جاتا، جیسے گدھا، خچر اور چیل وغیرہ۔

1 حلال جانوروں کا جھوٹا:

ان میں سے پہلی قسم کے جو جانور اور پرندے ہیں، ان کا جھوٹا تو تمام ائمہ و فقہاء کے نزدیک بالاتفاق پاک و طہر اور مطہر ہے اور ان کے جھوٹے سے غسل و وضو کیا جاسکتا ہے۔

چنانچہ امام ابن المنذر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”أَجْمَعَ أَهْلُ الْعِلْمِ عَلَى أَنَّ سُورَ مَا يُؤْكَلُ لِحِمِّهِ يَجُوزُ شُرْبُهُ وَالْوُضُوءُ بِهِ“^①

”اہل علم کا اس پر اجماع ہے کہ جن (جانوروں اور پرندوں) کا گوشت کھایا جاتا ہے، ان کا جھوٹا پاک ہے، جسے پیا جاسکتا ہے اور اُس سے وضو بھی کیا جاسکتا ہے۔“

امام ابن حزم رحمہ اللہ ”المحلی“ میں لکھتے ہیں:

”كُلُّ مَا يُؤْكَلُ لِحِمِّهِ فَلَا خِلَافَ فِي أَنَّهُ طَاهِرٌ“

① بحوالہ المغنی لابن قدامة (۷۰/۸)

”ہر وہ جانور جس کا گوشت کھایا جاتا ہے، اس کے طاہر ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔“

سورة الاعراف (آیت: ۱۵۷) میں نبی کریم ﷺ کے بارے میں ارشادِ الہی ہے:

﴿وَيُحَلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتُ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثُ﴾

”اور آپ (ﷺ) ان کے لیے تمام پاکیزہ چیزیں حلال کرتے ہیں اور خبیث و ناپاک

چیزیں ان پر حرام کرتے ہیں۔“

تھوڑا آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

”فَكُلُّ حَلَالٍ هُوَ طَيِّبٌ، وَالطَّيِّبُ لَا يَكُونُ نَجِسًا بَلْ هُوَ طَاهِرٌ“^①

”ہر حلال چیز پاکیزہ ہے اور پاکیزہ نجس نہیں ہوتی، بلکہ طاہر ہوتی ہے۔“

یہ تو متفق علیہ اور اجماعی مسئلہ ہے۔^②

2 دیگر جانوروں کا جھوٹا:

دوسری قسم کے جانور اور پرندے وہ ہیں، جن کا گوشت نہیں کھایا جاتا، ان کے بارے میں

اہل علم کے دو قول ہیں:

پہلا قول:

پہلا قول یہ ہے کہ (خنزیر اور گتے کے جھوٹے کو چھوڑ کر) خچر، گدھے، جنگلی جانوروں یا

درندوں اور شکاری پرندوں کا جھوٹا بھی پاک ہوتا ہے اور وہ طاہر ہی نہیں بلکہ مطہر بھی ہے۔

① اس کی پہلی دلیل مسند امام شافعی، سنن دارقطنی اور معرفۃ السنن والآثار بیہقی کی وہ حدیث ہے،

جس میں مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے پوچھا گیا:

«أَنْتَوَضَأُ بِمَا أَفْضَلَتِ الْحُمْرُ؟»

① المحلی لابن حزم (۱/۱۲۹)

② لیکن جلالہ کے بارے میں اختلاف ہے اور جلالہ اس حلال جانور (مرغی۔ بھیڑ وغیرہ) کو کہا جاتا ہے، جس کی

غالب غذا نجاست ہو، اسے بعض نے نجس اور بعض نے طاہر قرار دیا ہے۔ (المغنی: ۱/۷۰) اور صحیح یہی ہے کہ یہ

طاہر ہے۔ البتہ اسے ذبح کرنے سے چند دن پہلے باندھ کر رکھا جائے اور پاکیزہ چارہ، دانا دیا جائے اور یہ بھی

تب ہے، جبکہ نجاست خوری سے اس کے گوشت کے بدبودار ہو چکنے کا خدشہ ہو اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر اسے بغیر

باندھے رکھ کر ذبح کیا جاسکتا ہے۔

”کیا ہم گدھوں کے بچے ہوئے (جھوٹے) پانی سے وضو کر لیا کریں؟“

(قَالَ: نَعَمْ، وَبِمَا أَفْضَلَتِ السَّبَاعُ كُلُّهَا^[۱])

”فرمایا: ہاں اور دوسرے تمام جنگلی جانوروں کے جھوٹے سے بھی۔“

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی اسناد اتنی ہیں کہ اگر ان کو ملایا جائے تو وہ کافی

توث اختیار کر جاتی ہیں۔

② دوسری دلیل سنن دارقطنی کی وہ حدیث ہے، جس میں مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر میں

تھے کہ راستے میں ایک آدمی کو ایک بڑے حوض پر بیٹھے پایا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس شخص

سے پوچھا:

(أَوَلَعَتِ السَّبَاعُ عَلَيْكَ اللَّيْلَةَ فِي مَقْرَاتِكَ؟)

”کیا رات کے وقت جنگلی جانوروں نے تیرے حوض میں منہ ڈالا ہے؟“

تو حوض والے شخص سے فرمایا:

(يَا صَاحِبَ الْمِقْرَاةِ! لَا تُخْبِرُهُ، هَذَا مُتَكَلِّفٌ، لَهَا مَا حَمَلَتْ فِي بُطُونِهَا،
وَلَنَا مَا بَقِيَ شَرَابٌ وَطَهُورٌ^[۲])

”اے حوض والے! اس کو کچھ مت بتاؤ، یہ تکلف سے کام لے رہا ہے۔ جنگلی جانور اپنے

پیٹوں میں جو پانی لے گئے، وہ ان کا ہو گیا اور جو بیچ گیا، وہ ہمارے لیے پینے کا پانی ہے

اور پاک کرنے والا (وضو کرنے کے لائق) ہے۔“

③ ان کی تیسری دلیل وہ اثر فاروقی رضی اللہ عنہ ہے جو موطا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ میں مروی ہے، جس میں مذکور

ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ایک قافلے کے ساتھ نکلے، جس میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما بھی

تھے۔ ایک حوض پر پہنچے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حوض والے سے پوچھا:

”هَلْ تَرَدُّ حَوْضُكَ السَّبَاعُ؟“

[۱] نیل الأوطار (۳۶/۱) فقہ السنۃ (۲۱/۱) امام نووی اور شیخ البانی نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ (تمام المنۃ، ص ۴۷)

[۲] اس حدیث کو حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ”التلخیص“ میں، امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے ”السبیل الجرار“ میں، اور علامہ

البانی نے بھی ضعیف قرار دیا ہے۔ (تمام المنۃ، ص: ۴۸)

”کیا تمہارے اس حوض سے جنگلی درندے پانی پیتے ہیں؟“

تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

”لَا تُخْبِرُنَا! فَإِنَّا نَرِدُّ عَلَى السَّبَاعِ وَتَرِدُّ عَلَيْنَا“^(۱)

”ہمیں کچھ مت بتاؤ، کیوں کہ ہم ان کے بعد پیتے ہیں اور وہ ہمارے بعد“^(۲)

حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد یقیناً نبی ﷺ سے جنگلی جانوروں کے جھوٹے کے بارے میں پاک ہونے کا ذکر سن چکنے کی بنیاد پر ہوگا، کیونکہ سنن دارقطنی والی حدیث میں دوران سفر وہ بھی ساتھ تھے، بلکہ انھیں ہی ”تکلف سے کام لینے والا“ فرماتے ہوئے آپ ﷺ نے حوض والے کو جنگلی جانوروں کی آمد و رفت کے بارے میں کچھ بتانے سے منع فرما دیا تھا اور ایسے حوض کے پانی کو پاک قرار دیا تھا۔ سنن دارقطنی کی حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے حوض والے کو کچھ بتانے سے اس لیے منع فرما دیا تھا کہ اس کا فائدہ بھی کچھ نہیں، کیوں کہ جانور آئے ہوں یا نہ آئے ہوں، وہ پانی پاک ہے۔^(۳) چوتھی دلیل جو نچر اور گدھے کے بارے میں خاص ذکر کی گئی ہے کہ نبی ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان کی سواری کیا کرتے تھے۔ اگر وہ نجس ہوتے اور ان کا پسینا و لعاب نجس ہوتے تو آپ ﷺ نے بیان فرمایا ہوتا، مگر ایسا نہیں ہے۔

یہ امام مالک اور امام شافعی رضی اللہ عنہما کا مسلک ہے۔ حضرت عمر اور جابر رضی اللہ عنہما سے اسی کی روایت ملتی ہے۔ تابعین رضی اللہ عنہم میں سے امام حسن بصری، عطاء زہری اور امام ابن المنذر رضی اللہ عنہم نے بھی ان کے جھوٹے کو استعمال میں لانے اور اس سے وضو کرنے کی اجازت دی ہے۔^(۳)

دوسرا قول:

ان کے بارے میں دوسرا قول یہ ہے کہ ان کا جھوٹا ناپاک ہے۔ ایک روایت کے مطابق اگر صرف ان جانوروں کا جھوٹا پانی ہی موجود ہو اور اس سے وضو کرے تو ساتھ ہی تیمم بھی کر لے۔ یہ ایک روایت میں امام ابوحنیفہ، ایک روایت میں امام احمد سے اور سفیان ثوری رضی اللہ عنہم سے منقول ہے۔

(۱) یہ اثر فاروقی رضی اللہ عنہ بھی ضعیف ہے۔ تمام المنة (ص: ۲۹)

(۲) موطأ الإمام مالك مع شرحه المسوی (۱/ ۹۳-۹۴)

(۳) المغني (۱/ ۶۶-۶۷)

امام ابنِ قدامہ ان ائمہ کا یہ مسلک اور امام احمد کی دوسری روایت، اسی طرح امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے دوسری روایت ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

”اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان جانوروں کا جھوٹا ان حضرات کے نزدیک بھی نجس اور ناپاک نہیں بلکہ پاک ہی تھا، ورنہ اس سے وضو کرنے کی اجازت ہی نہ ہوتی، صرف تیمم ہی کا کہتے۔“

بہر حال ان کا استدلال سننِ اربعہ، مسند احمد، مسند شافعی، صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ، مستدرک حاکم، سنن دارقطنی اور بیہقی کی اس حدیث سے ہے، جس میں مروی ہے:

«إِذَا كَانَ الْمَاءُ قُلَّتَيْنِ لَمْ يَحْمِلِ الْخَبَثَ»^(۱)

”اگر پانی دو مٹکے ہو جائے تو وہ پلیدی نہیں اٹھاتا (نجس نہیں ہوتا)۔“

اس سے وہ یوں استدلال کرتے ہیں کہ اگر ان کا جھوٹا ناپاک ہوتا تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم دو مٹکوں کی تحدید نہ فرماتے۔ قولِ اوّل کے دلائل کے طور پر ذکر کی گئی احادیث کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حوضوں کے پانی کو اس لیے پاک قرار دیا ہے کہ وہ زیادہ مقدار میں تھا۔ ان دونوں اقوال اور خصوصاً قولِ اوّل کے دلائل آپ کے سامنے ہیں، جب کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور امام حسن بصری، ابن سیرین، شععی، اوزاعی، حماد اور اسحاق بن راہویہ رحمۃ اللہ علیہم گدھے کے جھوٹے کونا پاک نہیں سمجھتے تھے، البتہ اسے مکروہ قرار دیتے تھے۔^(۲)

امام ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ معروف حنبلی ہیں، مگر ان کے اجتہاد اور اتباعِ سنت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے ”المغنی“ میں اپنے امام کی دو روایتیں نقل کرنے کے باوجود لکھا ہے:

«وَالصَّحِيحُ عِنْدِي: طَهَارَةُ الْبُعْلِ وَالْحِمَارِ، لِأَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَرْكَبُهُمَا، وَتُرْكَبُ فِي زَمَانِهِ، وَفِي عَصْرِ الصَّحَابَةِ فَلَوْ كَانَ نَجِسًا لَبَيَّنَ النَّبِيُّ ﷺ

(۱) الفتح الرباني (۱/ ۲۱۶) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (۵۸) صحيح سنن الترمذي، رقم

الحديث (۵۷) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (۵) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۵۱۷) الموارد،

رقم الحديث (۱۱۷) المنتقى مع النيل (۱/ ۲۰)

(۲) تفصيل کے لیے ملاحظہ فرمائیے: المغني (۱/ ۶۶ / ۶۹)

ذَلِكَ لِأَنَّهُمَا مِمَّا لَا يُمَكِّنُ التَّحَرُّزُ مِنْهُمَا لِمُقْتَنِيهِمَا فَأَشْبَهَ السِّنُّورُ^①
 ”میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ خچر اور گدھے کا جھوٹا پانی پاک ہے، اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ
 نے ان پر سواری فرمائی ہے، نیز آپ ﷺ کے زمانے اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم
 کے دور میں ان پر سواری کی جاتی تھی۔ اگر وہ نجس ہوتے تو نبی کریم ﷺ یہ ضرور بتا
 دیتے، کیوں کہ ان دونوں (کے پسینے) سے بچنا ممکن ہی نہیں ہے۔ پس یہ بلی کے
 ”مشابہ ہیں۔“

3 بلی کا جھوٹا:

بلی جو نہ تو مائل اللحم ہے اور نہ جنگلی ہی، بلکہ گھر میں عام پایا جانے والا جانور ہے، اس کے
 گھروں میں بکثرت پائے جانے کی وجہ سے نبی اکرم ﷺ نے اسے گھر میں کام کاج کرنے والے
 خادموں سے تشبیہ دی ہے اور اس کا جھوٹا پاک قرار دیا ہے۔

چنانچہ ایک حدیث سنن ابی داود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، مسند احمد اور مسند شافعی، موطا امام
 مالک اور سنن بیہقی میں مروی ہے، جسے امام بخاری، عقیلی، ابن خزیمہ، ابن حبان، حاکم اور دارقطنی رحمہم
 نے صحیح قرار دیا ہے کہ حضرت ابوقنادہ رضی اللہ عنہ کی بہو کبشہ بنت کعب بن مالک بیان کرتی ہیں کہ (ان کے
 سسر) حضرت ابوقنادہ رضی اللہ عنہ ان کے یہاں تشریف لائے تو انھوں نے ان کے لیے وضو کا پانی ڈالا۔
 اتنے میں ایک بلی آئی اور اس پانی سے پینے لگی۔ حضرت ابوقنادہ رضی اللہ عنہ نے برتن اس بلی کی طرف ٹیڑھا
 کر دیا، یہاں تک کہ اس نے پانی پی لیا۔ کبشہ کہتی ہیں کہ جب انھوں نے مجھے تعجب سے دیکھتے
 ہوئے پایا تو کہنے لگے: ”اے میری بھتیجی! کیا تمہیں اس چیز پر تعجب ہو رہا ہے؟“ میں نے کہا: ہاں! تو
 انھوں نے کہا کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِنَّهَا لَيْسَتْ بِنَجَسٍ، إِنَّهَا مِنَ الطَّوَّافِينَ عَلَيْكُمْ وَالطَّوَّافَاتِ»^②

① المغنی لابن قدامة (۱/ ۶۸)

② صحیح سنن ابی داود، رقم الحدیث (۶۸) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۸۰) صحیح سنن
 النسائی، رقم الحدیث (۶۶ و ۳۲۹) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۳۶۷) المنتقی مع النیل (۱/ ۳۵)
 صحیح الجامع، رقم الحدیث (۲۴۳۷)

”یہ بلی نجس نہیں ہے، کیوں کہ یہ تو ان (خادم مردوں اور عورتوں) میں سے ہے، جو ہر وقت تمہارے پاس آتے جاتے رہتے ہیں۔“

سنن ابی داؤد و دارقطنی میں اس بات کی تائید دیگر روایات سے بھی ہوتی ہے، مگر وہ متکلم فیہ ہیں اور ان سے قطع نظر بھی کر لی جائے تو اس مذکورہ صحیح حدیث ہی سے پتا چل جاتا ہے کہ بلی نجس نہیں اور اس کا جھوٹا بھی ناپاک نہیں، بلکہ طاہر و مطہر ہے، جس سے غسل اور وضو کرنا جائز ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بلی کے جھوٹے کو ناپاک تو قرار نہیں دیا، البتہ مکروہ کہا ہے، ان کا استدلال مسند احمد اور دارقطنی، مستدرک حاکم اور سنن بیہقی کی ایک روایت سے ہے، جس میں بلی کو درندہ «السنور سبع» کہا گیا ہے کہ ”بلی ایک درندہ ہے۔“ ان کے نزدیک درندے کا جھوٹا ناپاک ہوتا ہے، مگر بلی کے معاملے میں انہوں نے مزید تخفیف کی ہے اور اسے نجس تو نہیں، محض مکروہ کہا ہے، حالاں کہ کسی جانور کا محض درندہ ہونا اس کے جھوٹے کے ناپاک یا مکروہ ہونے کو مستلزم نہیں ہوتا، کیوں کہ جو متکلم فیہ احادیث گزری ہیں، ان سے واضح ہوتا ہے کہ درندے کے جھوٹے کو پاک قرار دیا گیا ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ محدثین کرام رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک بلی کو درندہ قرار دینے والی روایت متکلم فیہ اور ضعیف ہونے کی وجہ سے ناقابل استدلال ہے، حتیٰ کہ خود معروف حنفی محدث امام زیلعی رحمۃ اللہ علیہ نے ”نصب الرایۃ فی تخریج احادیث الہدایۃ“ میں اس حدیث کے طرق ذکر کیے ہیں اور جس راوی عیسیٰ بن مسیب پر تمام روایات کا انحصار ہے، اس پر کلام کیا ہے اور دیگر محدثین نے بھی اسے ضعیف قرار دیا ہے۔^(۱) اگر بالفرض اسے صحیح اور قابل استدلال بھی مان لیا جائے، تب بھی کبشہ والی مذکورہ حدیث میں بلی کی تخصیص کر دی گئی ہے کہ اس کا جھوٹا پاک ہے۔^(۲)

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ والی حدیث کو ”حسن صحیح“ کہا اور لکھا ہے کہ اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین، اکثر ائمہ، امام شافعی، احمد اور اسحاق بن راہویہ رحمۃ اللہ علیہم کا قول یہی ہے کہ بلی کے جھوٹے میں کوئی حرج نہیں، اس موضوع کے بارے میں صحیح ترین حدیث یہی

(۱) بحوالہ تحفة الأحوذی (۱/ ۳۱۰) المنتقى مع النیل (۱/ ۳۵) صحیح الجامع، رقم الحدیث (۲۴۳۷)

(۲) نیل الأوطار (۱/ ۳۶)

حدیثِ ابی قتادہ رضی اللہ عنہ ہے۔ امام مالک نے بھی اس حدیث کو جید کہا اور اسے دیگر تمام محدثین سے کامل تر نص سے ذکر کیا ہے۔^(۱)

امام مالک رضی اللہ عنہ اور دیگر اہل مدینہ، لیث اور دیگر اہل مصر، اوزاعی اور دیگر اہل شام، ثوری اور دیگر اہل عراق: ابو یوسف، محمد، ابو ثور، ابو عبید، علقمہ، ابراہیم نخعی اور عطا اور حسن بصری رضی اللہ عنہم بھی یلی کے جھوٹے کو پاک کہتے ہیں۔^(۲)

حافظ ابو عمر ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ تنازع فیہ اور اختلافی مسائل میں حجت صرف سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہو سکتی ہے اور بلی کے جھوٹے کے پاک ہونے کے بارے میں صحیح حدیث و سنت ثابت ہو چکی ہے۔ امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے سوا تمام فقہائے امصار کا اسی حدیث پر اعتماد ہے۔ امام صاحب موصوف کو غالباً یہ حدیث نہیں پہنچی ہوگی اور کتے کے جھوٹے والی حدیث پہنچ گئی ہوگی تو انھوں نے اُسے بھی اُسی پر قیاس کیا ہوگا، جب کہ حدیث و سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں کتے اور بلی کا فرق واضح ہو چکا ہے۔^(۳)

امام قرطبی رضی اللہ عنہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فقہائے امصار رضی اللہ عنہم اور حجاز و عراق میں رہنے والے تمام تابعین کا یہی مسلک ہے کہ بلی کا جھوٹا پاک ہے اور اس سے وضو کر لینے میں کوئی حرج نہیں، جیسا کہ موطا امام مالک اور دیگر کتب حدیث میں حدیثِ ابی قتادہ رضی اللہ عنہ سے پتا چلتا ہے۔^(۴)

ایک روایت میں یہ الفاظ بھی مروی ہیں: ”جب کتا کسی برتن میں منہ ڈال جائے تو اسے سات مرتبہ دھولو اور اگر بلی منہ ڈال جائے، تو اسے ایک مرتبہ دھولو۔“

اس روایت میں جو بلی کے منہ ڈالنے سے ایک مرتبہ دھونے کا ذکر آیا ہے، وہ الفاظ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں، بلکہ یہ الفاظ مدرج ہیں۔ مدرج اُن الفاظ کو کہا جاتا ہے، جو کسی راوی کی طرف سے روایت میں درج ہو جائیں۔ ممتاز حنفی عالم حضرت ملا علی قاری رضی اللہ عنہ نے ”مرقاۃ شرح مشکاۃ“

(۱) سنن الترمذی مع التحفة (۱/۳۱۰-۳۲۱)

(۲) بحوالہ تحفة الأحوذی (۱/۳۱۰)

(۳) تفسیر القرطبی (۷/۱۳-۴۷-۴۸)

(۴) تفسیر القرطبی (۷/۱۳-۴۷)

میں لکھا ہے کہ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ بلی کے منہ ڈالنے سے اس برتن کو ایک مرتبہ دھونے کے الفاظ مُدرج ہیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نہیں، بلکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے ہیں، مگر یہ بات امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ سے مخفی رہ گئی، لہذا انہوں نے بلی کے جھوٹے کو مکروہ تحریمی قرار دے دیا۔ آگے علامہ قاری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

”یہ جو لوگوں میں مشہور ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کپڑے کا وہ حصہ کاٹ ہی دیا تھا، جس پر بلی سو گئی تھی۔ اس بات کی کوئی اصل نہیں (یعنی یہ بے اصل اور من گھڑت قصہ ہے) اور رہا معاملہ بلی کے درندہ ہونے کا تو یہ کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں، اس سلسلے میں جو روایت ہے، وہ ضعیف ہے اور بلی کے نجس نہ ہونے کی صراحت کرنے والی احادیث کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔“^①

علامہ علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ بلی کے بارے میں ایک اور حدیث بھی مشہور ہے، جس میں مروی ہے کہ ”بلی سے محبت رکھنا ایمان کا حصہ ہے۔“

اس روایت کو بھی صنعانی اور دیگر جماعتِ محدثین نے موضوع اور من گھڑت قرار دیا ہے۔^②

یہ دونوں روایتیں بظاہر انتہا پسندوں کی گھڑی ہوئی ہیں۔ ایک نے بلی سے نفرت میں تشدد کا رویہ اپنایا اور کپڑا کاٹنے والی حدیث گھڑ ماری اور دوسرے نے بلی سے محبت میں غلو کا رویہ اختیار کیا، تو اس کی محبت کو جزو ایمان بنانے والی حدیث تراش دی، جب کہ نہ یہ صحیح ہے نہ وہ درست ہے۔ ہاں اتنا ہے کہ اہل علم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بلی کو پانی پلانے، صحابی رضی اللہ عنہ کے پانی پلانے اور اس کے جھوٹے سے وضو کرنے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بلی کو دن رات گھروں میں آنے جانے والے خادموں جیسا قرار دینے والی احادیث و آثار سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ بلی رکھنا، اسے پالنا اور اس کی تربیت کرنا جائز بلکہ مستحب ہے۔^③

① بحوالہ تحفة الأحوذی (۱/ ۳۱۱)

② تحفة الأحوذی (۱/ ۳۱۲)

③ حوالہ سابقہ.

4 خنزیر کا جھوٹا، نجس اور ناپاک ہے:

خنزیر کے سلسلے میں تو کسی کا کوئی اختلاف نہیں کہ وہ نجس عین ہے اور اس کا جھوٹا بھی نجس اور ناپاک ہے۔^(۱) لہذا اس کی تفصیل میں جانے کی تو کوئی ضرورت ہی نہیں۔

ایک غلط افواہ:

البتہ یہاں ایک مشہور و معروف افواہ کی طرف اشارہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عموماً لوگ کہتے ہیں کہ خنزیر کا نام زبان پر نہیں لانا چاہیے، کیونکہ وہ نجس عین ہے اور اس کا نام زبان پر لانے سے اس شخص کی زبان چوبیس یا کتنے گھنٹے تک ناپاک رہتی ہے۔ یہ محض ایک گپ، پیدل خبر، بے اصل اور من گھڑت بات ہے۔ قرآن و سنت سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ ویسے بھی مؤمن و مسلمان مرد و زن جب جنابت اور حیض و نفاس کے اوقات و ایام میں بھی ناپاک نہیں ہوتے، جیسا کہ شروع کتاب میں مذکور صحاح و سنن کی احادیث سے ثابت ہے، تو پھر ایک نجس جانور کا نام لینے سے زبان کیسے ناپاک ہو جائے گی؟ مزید برآں قرآن کریم میں لفظ خنزیر چار مقامات پر آیا ہے:

سورة البقرہ (آیت ۱۷۳) سورة المائدہ (آیت: ۳) سورة الانعام (آیت: ۱۴۵) سورة النحل (آیت: ۱۱۵) اور پانچویں مقام سورة المائدہ (آیت: ۶۰) میں اسی لفظ خنزیر کی جمع کا صیغہ خنازیر آیا ہے۔^(۲)

اگر خنزیر کہنے سے زبان ناپاک ہوتی ہو تو پھر قرآن کریم کی تلاوت کرنے والے کا کیا بنے گا؟ اسی طرح کتب احادیث میں سے صرف صحیح بخاری، سنن ابی داؤد، ترمذی، نسائی کی کتاب البیوع اور ابن ماجہ کی کتاب التجارات، سنن دارمی کی کتاب الاثریہ، پھر صحیح بخاری شریف کی کتاب الانبیاء اور کتاب المظالم، صحیح مسلم کی کتاب المساقاۃ، کتاب الایمان، کتاب الشعر، کتاب القدر اور کتاب الزکاح میں، سنن ترمذی کی کتاب اللباس اور کتاب الفتن میں، سنن ابی داؤد کی کتاب الصلاة، کتاب الادب، کتاب الاطعمۃ، کتاب الملاحم، کتاب الجہاد اور کتاب اللباس میں، سنن ابن ماجہ کی کتاب الادب، کتاب الفتن اور المقدمہ میں، موطا امام مالک کی کتاب الکلام، سنن دارمی کے مقدمہ اور

(۱) بداية المجتهد للعلامة ابن رشد (۱/ ۱۰۹)

(۲) المعجم المفہرس لألفاظ القرآن الکریم (ص: ۲۴۶)

کتاب الاثر بہ میں اور مسند احمد کے چونتیس مقامات پر متعدد احادیث آئی ہیں، جن میں لفظ خنزیر یا خنازیر موجود ہے۔^①

اندازہ فرمائیے! اگر مذکورہ بے سرو پا مسئلے کو مان لیا جائے تو معاملہ کہاں سے کہاں تک پہنچ جائے گا؟ مختصر یہ کہ خنزیر نجس عین ہے اور اس کا جھوٹا تو ناپاک ہے، مگر اس کا نام لینے سے زبان ہرگز ناپاک نہیں ہوتی۔
5 گتے کا جھوٹا:

گتے کے بارے میں صحاح و سنن میں جتنی احادیث مروی ہیں، ان سب سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بھی نجس ہے اور اس کا جھوٹا بھی ناپاک ہے، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم، سنن ابوداؤد و نسائی و ترمذی اور موطا امام مالک میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِذَا شَرِبَ الْكَلْبُ فِي إِنَاءٍ أَحَدِكُمْ فَلْيَغْسِلْهُ سَبْعَ مَرَّاتٍ»^②

”جب تم میں سے کسی کے برتن سے کتا پانی پی جائے تو اسے چاہیے کہ اس برتن کو سات مرتبہ دھوئے۔“

صحیح مسلم اور سنن نسائی میں مروی ہے:

«إِذَا وَلَغَ الْكَلْبُ فِي إِنَاءٍ أَحَدِكُمْ فَلْيُرْفُهُ ثُمَّ لْيَغْسِلْهُ سَبْعَ مَرَّاتٍ»^③

”اگر تم میں سے کسی کے برتن میں کتا منہ ڈال دے، تو اسے چاہیے کہ برتن والی چیز کو بہا (پھینک) دے اور پھر اس برتن کو سات مرتبہ دھوئے۔“

ایک روایت میں ہے:

«أَوْ لَاهُنَّ بِالتُّرَابِ»^④

① بحوالہ المعجم المفہرس لألفاظ الحديث (۸۶/۲)

② التجريد الصريح ۲۶/۱، مسلم مع شرح النووي (۱۸۲/۳) صحیح سنن أبي داود، رقم الحديث (۶۴)۔

③ صحیح سنن الترمذی، رقم الحديث (۷۹) صحیح سنن النسائی، رقم الحديث (۶۲-۶۳) سنن ابن ماجہ، رقم الحديث (۳۶۴) صحیح الجامع، رقم الحديث (۶۲۷)

④ صحیح مسلم مع شرح النووي (۱۸۳/۳) صحیح سنن النسائی، رقم الحديث (۶۳) صحیح الجامع، رقم الحديث (۸۴۱) إرواء الغلیل (۲۴)

⑤ صحیح مسلم مع شرح النووي (۱۸۳/۳) صحیح سنن أبي داود، رقم الحديث (۶۴) إرواء الغلیل، رقم الحديث (۱۶۷) صحیح الجامع، رقم الحديث (۸۴۳)

”ان (سات مرتبہ میں) سے پہلی مرتبہ مٹی کے ساتھ (اس برتن کو مانجھے اور خوب صاف کرے)“

سنن ترمذی میں ہے:

«أَوْ لَاهُنَّ أَوْ أُخْرَاهُنَّ بِالتُّرَابِ»^①

”پہلی مرتبہ یا آخری مرتبہ مٹی سے صاف کرے۔“

جب کہ صحیح مسلم، سنن ابی داؤد و نسائی، مسند احمد اور سنن داری میں یہ بھی مذکور ہے:

«وَعَفَّرُوهُ الثَّامِنَةَ فِي التُّرَابِ»^②

”آٹھویں مرتبہ اسے مٹی سے مل کر دھولو۔“^③

پہلی مرتبہ یا آخری مرتبہ یا ایک مرتبہ یا آٹھویں مرتبہ مٹی کے ساتھ دھونے والی احادیث میں حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے یوں مطابقت پیدا کی ہے کہ کسی ایک مرتبہ دھونا تو مبہم ہے، جب کہ پہلی یا ساتویں مرتبہ معین ہے، لہذا ان میں سے کسی ایک کو اختیار کیا جاسکتا ہے اور ان میں سے بھی پہلی مرتبہ دھونے والی روایت اکثریت و احتفظیت اور معنوی حیثیت سے راجح تر ہے۔^④ لہذا ایسے برتن کو پہلے مٹی مار کر دھولینا چاہیے اور احادیث میں تو مٹی کے ساتھ دھونے ہی کا ذکر ہے۔

متحدہ عرب امارات کے سرکاری روزنامہ ”الاتحاد“ ۱۹۸۷ء میں ایک مضمون میں یہ انکشاف کیا گیا تھا کہ کتے کے بیماریوں والے جراثیم مٹی کے علاوہ کسی دوسری چیز سے باسانی مرتے ہی نہیں ہیں۔^⑤

سُبْحَانَ اللَّهِ! طبِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو طبِ جدید بھی صحیح ثابت کر رہی ہے۔ ابو بکر خلال کے حوالے سے امام ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اگر مٹی کے بجائے اشنان، صابن یا چھلکا استعمال کر لیا جائے

① صحیح سنن أبی داؤد، رقم الحدیث (۶۵) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۷۹) صحیح الجامع، رقم الحدیث (۸۱۱۶)

② مختصر صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۱۹) صحیح سنن أبی داؤد، رقم الحدیث (۶۷) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۶۵) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۳۶۵) صحیح الجامع، رقم الحدیث (۸۴۰)

③ سنن الترمذی مع التحفة (۱/۳۰۰) جامع الأصول (۸/۳۶-۳۷)

④ فتح الباری (۱/۲۷۶) ارواء الغلیل (۱/۶۲)

⑤ روزنامہ الاتحاد، أبو ظہبی.

تو بھی درست ہے۔^(۱) آج کل اس غرض کے لیے لیکوڈ وغیرہ استعمال کیے جاسکتے ہیں، کیوں کہ یہ اشیا بھی جراثیم کا ازالہ کرنے والی اور مفید مطلب ہیں۔

گُتے کے جھوٹے برتن کو سات مرتبہ دھونے کا حکم نجاست کی وجہ سے ہے اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے بقول اس میں طبعی مصلحت بھی شامل ہے، کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زہریلے جانوروں کے زہر سے محفوظ رہنے کے لیے ہر صبح عجوہ کھجوروں کے کھانے میں بھی سات دانوں کے عدد کو ملحوظ رکھا ہے اور شدتِ مرض میں اپنے اوپر سات گھڑوں کا پانی ڈالنے کا فرمایا تھا، جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ طبعی طور پر بھی مفید ہے۔^(۲) گُتے کے جھوٹے برتن کو سات مرتبہ دھونے کا سختی سے حکم اس لیے فرمایا گیا کہ بقول علامہ احمد شاہ: ”طب جدید نے بھی یہ ثابت کر دیا ہے کہ کتا اپنے لعاب میں بہت سی مہلک بیماریاں اٹھائے پھرتا ہے، جن سے بچنا ضروری ہے۔“^(۳)

وزارتِ اوقاف و امورِ اسلامیہ ابو ظہبی سے جو ماہنامہ مجلہ ”منار الاسلام“ شائع ہوتا ہے، اس (شمارہ ۷ بابت ماہ رجب ۱۴۰۶ھ) میں ایک ڈاکٹر کا تحقیقی مضمون شائع ہوا تھا، جس میں گُتے کے لعاب سے پھیلنے والے امراض پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر موصوف نے لکھا تھا:

”اس مرض کے نتیجے میں انڈیا میں پندرہ ہزار سے زائد آدمی، سری لنکا میں ہر دس لاکھ میں سے تیس آدمی اور فلپائن میں ہر دس لاکھ میں سے بارہ آدمی سالانہ محض گُتے کے لعاب سے پھیلنے والے امراض کی وجہ سے لقمہ اجل بن رہے ہیں۔“^(۴)

مذکورہ احادیث کے پیش نظر جمہور اہل علم کا مسلک تو یہ ہے کہ کتا نجس اور اس کا جھوٹا ناپاک ہے، مگر حضرت عکرمہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہما ایک روایت میں اسے طاہر قرار دیتے ہیں، جو شکاری اور غیر شکاری کتے کے فرق کی بنا پر ہے، مگر بظاہر احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان کے اس نظریے کے خلاف ہیں۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی تبویب سے پتا چلتا ہے کہ ان کا رجحان بھی گُتے کے جھوٹے کے پاک

(۱) المغنی (۱/۷۴)

(۲) فتح الباری (۱/۲۷۶)

(۳) تحقیق المحلی لابن حزم (۱/۱۰۹-۱۱۰)

(۴) ماہنامہ ”منار الإسلام أبي ظہبی“ (شمارہ: ۷، بابت: ۵، رجب ۱۴۰۶ھ)

ہونے کی طرف ہی ہے۔ جبکہ زیادہ صحیح وہی ہے جو جمہور کا مسلک ہے کہ کتے کا جھوٹا ناپاک ہے، جو سات مرتبہ دھونے کے حکم ہی سے معلوم ہو رہا ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک کتے کے جھوٹے کو سات مرتبہ دھونا ضروری نہیں، بلکہ صرف تین مرتبہ دھو لینا ہی کافی ہے۔ مگر یہ تین مرتبہ والا قول حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا ہے اور قول رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں کسی دوسرے کا قول معتبر نہیں ہوتا۔^① لہذا امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی یہ بات بھی حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالف ہونے کی وجہ سے ناقابل عمل ہے۔



① تفصیل کے لیے محلی ابن حزم، فتح الباری، نیل الأوطار، المغنی اور تحفة الأحمدي کا مطالعہ فرمائیں اور قول حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ”نصب الرایة“ میں ملاحظہ فرمائیں۔

کپڑے، بدن یا جگہ کو پیشاب سے پاک کرنے کا طریقہ

مسائل طہارت سے قبل عموماً تطہیر نجاست کا موضوع کتب حدیث و فقہ میں ملتا ہے، جس میں نجس اشیا کو پاک کرنے کا طریقہ ذکر کیا گیا ہوتا ہے، مگر ہم طوالت سے بچنے کے لیے اس کی تفصیلات سے قطع نظر کر رہے ہیں۔ البتہ روزمرہ کے ضروری امور کی طرف اشارہ کیے بغیر گزر جانا بھی مناسب نہیں۔ لہذا اس سلسلے میں اختصار کے ساتھ عرض ہے کہ بنی آدم کا پیشاب و پاخانہ نجس ہیں اور ان کے ناپاک ہونے پر اہل علم کا اجماع ہے، جیسا کہ علامہ ابن رشد نے ”بداية المجتهد“ (۱/ ۱۰۹) میں ذکر کیا ہے۔

انسان مرد و زن، پیر و جوان اور بچوں سب کا حکم ایک ہی ہے۔ البتہ صرف شیر خوار لڑکے کے پیشاب کے بارے میں شریعت اسلامیہ میں کچھ تخفیف کی گئی ہے، جس کا اندازہ آئندہ تفصیل سے ہو جائے گا۔ کسی باشعور شخص سے تو یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ گھر کے کسی کمرے میں پیشاب کر دے، البتہ چھوٹی عمر کے بچوں سے اس بات کا امکان رہتا ہے، لہذا پیشاب کی نجاست دور کرنے کا طریقہ ذہن نشین کر لیں کہ کپڑے، بدن یا جس جگہ کوئی بچہ پیشاب کر دے تو اس جگہ پر پانی بہا دینے سے وہ پاک ہو جائے گی اور اس کے خشک ہو جانے پر اس جگہ پر نماز پڑھی جاسکتی ہے، چنانچہ صحیح بخاری، سنن اربعہ اور مسند احمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک اعرابی (دیہاتی) آیا اور مسجد نبوی کے صحن میں بیٹھ کر پیشاب کرنے لگا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اسے پکڑنے اور روکنے کے لیے لپکے، مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں روکتے ہوئے فرمایا:

«دَعُوهُ وَأَرِيْقُوا عَلَى بَوْلِهِ سَجَلًا مِّنْ مَّاءٍ أَوْ ذُنُوبًا مِّنْ مَّاءٍ، فَإِنَّمَا بُعِثْتُمْ مِّسْرِينَ وَلَمْ تَبْعَثُوا مُعَسِّرِينَ»^①

① صحیح البخاری مترجم (۱/ ۱۹۱) صحیح البخاری مع الفتح، رقم الحدیث (۲۲۰) صحیح مسلم مع ←

”اسے چھوڑ دو (اب پیشاب کرنے دو) اور اس کے پیشاب پر پانی کا ڈول بہا دو، تم

آسانی کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو، سختی کرنے والے نہیں۔“

سنن ابی داؤد، دارقطنی، دارمی اور سنن سعید بن منصور کی بعض روایتوں میں اس جگہ کو کھودنے

کا بھی ذکر ملتا ہے، مگر وہ روایت متکلم فیہ، ضعیف اور ناقابل استدلال ہیں۔

مصنف ابن ابی شیبہ میں ایک روایت کے الفاظ ہیں: «زَكَاةُ الْأَرْضِ يُبْسَهَا»

نیز مصنف عبدالرزاق میں ہے: «جَفَافُ الْأَرْضِ طُهُورُهَا»^(۱)

”زمین کا خشک ہو جانا ہی اس کا پاک ہو جانا ہے۔“

لیکن یہ الفاظ نبی اکرم ﷺ سے ثابت نہیں، لہذا مرفوع ہونے کے لحاظ سے یہ بے اصل ہیں

اور سند کے اعتبار سے ضعیف اور ناقابل حجت، لہذا ایسی جگہ یا زمین کو پاک کرنے کا طریقہ یہی ہے

کہ اس پر پانی بہا دیا جائے، جیسا کہ مذکورہ حدیث سے پتا چلتا ہے۔ یہ واقعہ مذکورہ کتب کے علاوہ صحیح

مسلم شریف میں بھی مذکور ہے، جس کے راوی حضرت انس رضی اللہ عنہ ہیں، اس مسلم والی حدیث میں یہ بھی

مذکور ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے بعد میں اس دیہاتی کو بلایا اور شفقت بھرے انداز سے اسے بتایا کہ

مسجدیں اللہ کا ذکر کرنے، نمازیں پڑھنے اور تلاوت کرنے کے لیے ہوتی ہیں۔ ان میں پیشاب یا

پاخانہ کرنا اچھا نہیں ہے۔^(۲)

شیر خوار بچے کے پیشاب کا حکم:

یہ تو ہوا بڑے انسان کی نسبت شریعت کا حکم، لیکن اگر کوئی بچہ شیر خوار ہو اور ماں کے دودھ کے

سوا دوسری کوئی غذا نہ کھانے لگا ہو تو اس کے پیشاب کو دھونے کی بھی ضرورت نہیں، اس پر صرف

چھینٹا مار دینا ہی کافی ہے، البتہ اس عمر کی لڑکی کے پیشاب کو دھونا ضروری ہے، جیسا کہ صحیحین اور

◀ شرح النووي (۱۹۰ / ۳) عن أنس، صحيح سنن أبي داود (۳۶۶) صحيح سنن الترمذي، رقم

الحديث (۱۲۶) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (۵۵) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۵۲۸) عن

أنس و موطأ الإمام مالك (۹۰) المنتقى مع النيل (۴۱/۱) مشكاة المصابيح (۴۹۱)

{۱} نيل الأوطار (۴۲/۱)

{۲} صحيح مسلم مع شرح النووي (۱۹۱ / ۳) سنن ابن ماجه (۵۲۹) مشكاة المصابيح، رقم الحديث (۴۹۲)

سنن اربعہ میں حضرت اُم قیس رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ وہ اپنا لڑکا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے کر آئیں، جو ابھی غذا نہیں کھانے لگا تھا۔ اس بچے نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں (کپڑے پر) پیشاب کر دیا۔

﴿فَدَعَا بِمَاءٍ فَنَضَحَهُ وَكَمْ يَغْسِلُهُ﴾^①

”آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی منگوا لیا اور اپنے کپڑے پر چھینٹے مارے اور اسے دھویا نہیں۔“

صحیح بخاری، سنن ابن ماجہ اور مسند احمد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک بچہ گھٹی دینے کے لیے لایا گیا تو اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر پیشاب کر دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر پانی مار دیا۔ سنن ابن ماجہ اور مسند احمد میں ہے:

﴿وَكَمْ يَغْسِلُهُ﴾ ”اور اسے دھویا نہیں۔“

صحیح مسلم شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ہے کہ (نومولود) بچے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے جاتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لیے دعاے برکت فرماتے اور انھیں گھٹی دیتے۔ ایک بچہ لایا گیا تو اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر پیشاب کر دیا:

﴿فَدَعَا بِمَاءٍ فَاتَّبَعَهُ بَوْلُهُ وَكَمْ يَغْسِلُهُ﴾^②

”آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی منگوا لیا اور پیشاب پر چھینٹا مارا اور اسے دھویا نہیں۔“

سنن ابی داؤد، ترمذی اور مسند احمد میں حضرت علی بن طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿بَوْلُ الْغُلَامِ الرَّضِيعِ يُنْضَحُ وَبَوْلُ الْجَارِيَةِ يُغْسَلُ﴾^③

”دودھ پیتے لڑکے کے پیشاب پر چھینٹے مارے جائیں اور دودھ پیتی لڑکی کے پیشاب کو دھویا جائے گا۔“

① صحیح البخاری مترجم (۱/۱۹۲) رقم الحدیث (۲۲۳) صحیح مسلم (۳/۱۹۴) صحیح سنن ابی داؤد، رقم الحدیث (۳۵۲) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۲۹۱) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۶۱) موطأ الإمام مالك مع المسوی، رقم الحدیث (۹۲) مشکاة المصابیح، رقم الحدیث (۴۹۷)

② صحیح البخاری، رقم الحدیث (۲۲۲) صحیح مسلم (۳/۱۹۳) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۵۲۳)

③ صحیح سنن ابی داؤد، رقم الحدیث (۲۶۳) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۶۱) صحیح الجامع، رقم الحدیث (۲۸۴۲) عن أم كرز، إرواء الغلیل، رقم الحدیث (۱۶۰)

سنن ابی داؤد و نسائی و ابن ماجہ، صحیح ابن خزیمہ اور مسند بزار میں خادم رسول ﷺ ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«يُغَسَّلُ مِنْ بَوْلِ الْجَارِيَةِ وَيُرَشُّ مِنْ بَوْلِ الْغُلَامِ»^[1]

”لڑکی کا پیشاب دھویا جائے گا اور لڑکے کے پیشاب پر چھینٹا مارا جائے گا۔“

جبکہ سنن ابی داؤد و ابن ماجہ، صحیح ابن خزیمہ و ابن حبان، مستدرک حاکم اور طبرانی میں ام مغفل، حضرت لبانہ بنت حارثؓ بیان کرتی ہیں کہ حضرت حسین بن علیؓ نے نبی کریم ﷺ کی گود میں پیشاب کر دیا، تو میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول ﷺ!

«أَعْطِنِي ثَوْبَكَ وَالْبَسْ ثَوْبًا غَيْرَهُ حَتَّى أَعْسِلَهُ»

”اپنا یہ کپڑا مجھے دے دیجیے اور دوسرا کوئی کپڑا پہن لیجیے، تاکہ میں یہ دھو دوں۔“

تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّمَا يَنْضَحُ مِنْ بَوْلِ الذَّكَرِ وَيُغَسَّلُ مِنْ بَوْلِ الْأُنْثَى»^[2]

”شیر خوار لڑکے کے پیشاب پر چھینٹا دیا جاتا ہے اور لڑکی کا پیشاب دھویا جاتا ہے۔“

اسی طرح قبیلہ بنی خزاعہ کی ایک صحابیہ حضرت ام کرزہؓ کا بیان بھی دو الگ الگ روایتوں کی

شکل میں سنن ابن ماجہ اور مسند احمد میں مذکور ہے، مگر اس کی سند میں انقطاع ہے۔^[3]

صحاح و سنن کی احادیث سے معلوم ہوا کہ لڑکے کے پیشاب پر چھینٹا مار دینا بھی کافی ہے اور لڑکی کے پیشاب کو دھو لینا ضروری ہے، جبکہ لڑکی اور لڑکے کے پیشاب کے سلسلے میں فرق کی کئی وجوہات بیان کی گئی ہیں، جن کی تفصیل میں جانا باعث طوالت ہے۔

حلال جانوروں کے پیشاب اور پاخانے کا حکم:

انسان کے پیشاب کا حکم اور اس کی طہارت کا طریقہ بیان ہو چکا ہے، جبکہ وہ جانور جن کا

[1] سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۵۲۶) صحیح سنن أبی داؤد، رقم الحدیث (۳۶۲) حسنه البخاري كما في النيل و صحیح الجامع، رقم الحدیث (۸۱۱۷)

[2] صحیح سنن أبی داؤد، رقم الحدیث (۳۶۱) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۵۲۲) الموارد الظمان، رقم الحدیث (۲۴۷) مشکاة المصابیح (۵۰۱) صحیح الجامع، رقم الحدیث (۲۳۸۳)

[3] نیل الأوطار (۱/۴۶)

گوشت حرام ہے، ان کا پیشاب اور پاخانہ بھی ناپاک ہوتا ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری، سنن ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور صحیح ابن خزیمہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رفع حاجت کے لیے نکلے اور مجھے حکم فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تین پتھر ڈھونڈ کر لاؤں۔ مجھے دو پتھر مل گئے اور تیسرا پتھر نہ ملا، میں لید اٹھا کر لے گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں پتھر لے لیے اور لید کو پھینک دیا اور فرمایا:

«إِنَّهَا رِجْسٌ»^(۱) ”یہ ناپاک ہے۔“

صحیح ابن خزیمہ کی ایک روایت میں ہے:

«إِنَّهَا رِجْسٌ إِنَّهَا رَوْثَةٌ» ”یہ پلید ہے، یہ گدھے کی لید ہے۔“

گدھے کے بارے میں تو یہ نص ہے، جب کہ دوسرے غیر ماکول اللحم جانوروں کو اس پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔ یہ تو ان جانوروں کی بابت حکم ہے، جن کا گوشت حرام ہے اور وہ جانور جن کا گوشت کھایا جاتا ہے، ان کے پیشاب و پاخانے میں بہت تخفیف کی گئی ہے۔ امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک ایسے جانوروں اور چھوٹے پرندوں کا پیشاب اور پاخانہ نجاستِ خفیفہ ہے، جبکہ امام مالک، امام احمد، اوزعی، زہری، ابراہیم نخعی، امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہم کے شاگردان رشید امام محمد و امام زفر رضی اللہ عنہما، شافعیہ میں سے امام ابن المنذر، ابن خزیمہ، ابن حبان اور علمائے حدیث رضی اللہ عنہم کا مسلک یہ ہے کہ ماکول اللحم جانوروں کا پیشاب و پاخانہ ناپاک نہیں ہوتا۔^(۲)

ان سب کا استدلال صحیح بخاری و مسلم، مسند احمد اور دیگر کتب حدیث میں مذکور اس حدیث سے ہے، جس میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ عُکل اور عُرینہ کے کچھ لوگ مدینہ منورہ آئے اور وہاں کی آب و ہوا ان کو اس نہ آئی، چنانچہ وہ بیمار ہو گئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم فرمایا کہ باہر جنگل میں ہمارے صدقے کے اونٹ ہیں، وہاں جائیں:

«وَأَنْ يَشْرَبُوا مِنْ أَبْوَالِهَا وَالْبَانِهَا»^(۳) ”اور یہ کہ اونٹوں کا دودھ اور پیشاب پیو۔“

(۱) صحیح البخاری (۱/ ۱۷۰) میں ہے: ”قال: هذا رِجْسٌ“ تقریباً معنی وہی ہے کہ یہ پلید ہے۔ صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۱۶) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (۳۰) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۴۱) و سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۳۱۴) ابن ماجہ میں ”رِجْسٌ“ کے الفاظ ہیں۔

(۲) نیل الأوطار (۱/ ۴۹)

(۳) صحیح البخاری مترجم (۱/ ۱۹۴) مع الفتح (۲۳۳) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (۳۶۸) ←

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اونٹوں کا پیشاب ناپاک نہیں ہوتا۔ باقی حلال گوشت والے جانور بھی اسی پر قیاس کیے جائیں گے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک حلال جانوروں کا پیشاب و پاخانہ بھی ناپاک ہے اور پیشاب پینے کا حکم دینے والے مذکورہ واقعے کو وہ انھیں کے ساتھ خاص قرار دیتے ہیں، جب کہ شافعیہ میں سے ایک معتبر عالم ابن منذر کا کہنا ہے:

”مَنْ زَعَمَ أَنَّ هَذَا خَاصٌّ بِأَوْلِيَّتِكَ الْقَوْمِ لَمْ يُصِبْ ، إِذِ الْخَصَائِصُ لَا تَثْبُتُ إِلَّا بِدَلِيلٍ“^①

”جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ واقعہ ان لوگوں کے ساتھ ہی خاص ہے، اس کا یہ قول صحیح نہیں، کیوں کہ خصائص دلیل کے بغیر ثابت نہیں ہوتے۔“
امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”ہر وہ جانور جس کا گوشت کھایا جاتا ہے، اس کا بول و براز پاک ہے اور اسے نجس کہنے والوں کے پاس اس بات کی کوئی دلیل نہیں، جبکہ اشیا میں اصل براءت و طہارت ہی ہوتی ہے، جب تک کہ کوئی نص (نجاست) ثابت نہ کر دے اور ایسی کوئی نص نہیں ہے۔“^②
شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

”صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی صحابی کا ایسا کوئی قول نہیں، جس میں حلال جانوروں کے بول و براز کو نجس کہا گیا ہو، اسے نجس قرار دینے والا قول سلف صالحین، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بہت بعد والے لوگوں کا ہے۔“^③

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹنی پر سوار ہو کر بیت اللہ کا طواف کیا تھا، جو اس بات کی دلیل ہے کہ

◀ صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۱۵۰۵) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۳۵۰۳) صحیح سنن

النسائی، رقم الحدیث (۳۷۵۷) المنتقی (۴۸)

① نیل الأوطار (۱/ ۴۹)

② نیل الأوطار (۱/ ۵۰)

③ بحوالہ فقہ السنۃ (۱/ ۲۸)

حلال جانوروں کا پیشاب و پاخانہ پاک ہے، اس لیے کہ عموم بلوئی سے محفوظ نہیں رہا جاسکتا۔ ان تفصیلات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جو لوگ گایوں، بھینسوں، بھیڑوں، بکریوں اور اونٹوں کو چراتے ہیں اور ان کا دودھ دوھتے ہیں، اس دوران میں اگر ان کے کپڑوں یا بدن پر پیشاب کے چھینٹے پڑ جائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں، وہ ان کپڑوں میں اطمینان کے ساتھ نماز ادا کر سکتے ہیں۔ ہاں اگر گوبر وغیرہ زیادہ لگ جائے تو اسے دھولینا ہی بہتر اور افضل ہے، کیوں کہ کلی طہارت کی اپنی ایک اہمیت ہے۔



طہارت کی اہمیت اسلام کی نظر میں

نماز کی صحت و قبولیت کے لیے دیگر شرائط کے علاوہ طہارت بھی ایک اہم شرط ہے، کیوں کہ

صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتب حدیث میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«لَا تُقْبَلُ صَلَاةٌ مِنْ أَحَدٍ حَتَّىٰ يَتَوَضَّأَ»^①

”جب تک کوئی وضو نہ کر لے، اس کی نماز قبول نہیں ہوتی۔“

صحیح مسلم شریف کے الفاظ ہیں:

«لَا تُقْبَلُ صَلَاةٌ بِغَيْرِ طُهُورٍ»^② ”طہارت کے بغیر کوئی نماز قبول نہیں ہوتی۔“

یاد رہے کہ اسلام میں طہارت اور پاکیزگی کی حیثیت صرف یہی نہیں کہ یہ نماز یا دیگر عبادات

کے لیے ہی لازمی شرط ہے، بلکہ طہارت تو بجائے خود بھی دین کا ایک شعبہ اور بہ ذاتِ خود مطلوب

ہے۔ ہر وقت طہارت اور پاکیزگی کا خیال رکھنے والے لوگوں کو سورۃ البقرہ (آیت: ۲۲۲) میں اللہ تعالیٰ

نے اپنے محبوب بندے قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشادِ الہی ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ﴾

”اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والوں اور پاک صاف رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔“

سورۃ التوبہ (آیت: ۱۰۸) میں مدینہ طیبہ کی قریبی بستی اور مسجد قبا والے لوگوں کی تعریف بیان

① صحیح بخاری شریف مترجم اردو (۱/ ۱۶۳) صحیح مسلم (۳/ ۱۰۴) صحیح سنن أبي داود، رقم

الحدیث (۵۴) مشکاة المصابیح (۱/ ۱۰۰)

② صحیح مسلم مع شرح النووي (۳/ ۱۰۲) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (۵۳) صحیح سنن

الترمذی، رقم الحدیث (۱) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۱۳۵) لیکن اس میں «لَا يَقْبَلُ اللَّهُ

صَلَاةً» کے الفاظ ہیں۔ سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۲۷۱) صحیح الجامع، رقم الحدیث (۷۳۸۴)

کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿فِيهِ رَجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَهَّرِينَ﴾

”اُس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ پاک رہنے والوں ہی کو پسند کرتا ہے۔“

صرف ان دو آیتوں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام میں طہارت اور پاکیزگی کی بجائے

خودکتنی اہمیت ہے۔ صحیح مسلم اور دیگر کتب حدیث میں تو ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«الطُّهُورُ شَطْرُ الْإِيمَانِ»^① ”طہارت و پاکیزگی ایمان کا حصہ ہے۔“

سنن ترمذی شریف کی ایک متکلم فیہ روایت میں مروی ہے:

«الطُّهُورُ نِصْفُ الْإِيمَانِ»^② ”طہارت نصف ایمان ہے۔“

معلوم ہوا کہ طہارت و پاکیزگی ایمان کا ایک جزو اور اہم شعبہ ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی بے نظیر کتاب ”حجۃ اللہ البالغۃ“ میں لکھا ہے:

شریعت کے اگرچہ بہت سے ابواب ہیں اور ہر باب کے تحت سیکڑوں ہزاروں احکام ہیں،

لیکن اپنی بے پناہ کثرت کے باوجود سب ان چار عناوین کے تحت آجاتے ہیں:

① طہارت۔ ② اِخْبَات۔ ③ سَمَاحَت۔ ④ عَدَالَت۔

گویا ان کے نزدیک شریعت کو کل چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، جن میں سے پہلا ایک

چوتھائی حصہ صرف طہارت کو حاصل ہے، پھر انھوں نے ان چار اقسام کی الگ الگ حقیقت کئی صفحات

میں بالتفصیل بیان کی ہے، جو قابلِ مطالعہ ہے اور آگے چل کر احکام و اسرارِ طہارت کے بیان میں

فرماتے ہیں کہ طہارت کی تین قسمیں ہیں:

ایک حدث سے طہارت یعنی جن حالتوں میں غسل یا وضو واجب ہے، ان حالتوں میں غسل یا

وضو کر کے شرعی طہارت و پاکیزگی حاصل کرنا۔

① مختصر صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۲۰) سنن الترمذی، رقم الحدیث (۳۵۱۷) لیکن اس میں «الْوُضُوءُ

شَطْرُ الْإِيمَانِ» کے الفاظ ہیں۔ مشکاة المصابیح (۱/ ۵۳) صحیح الجامع، رقم الحدیث (۲۹۵۷)

② حسنه الترمذی، سنن الترمذی (۱۵۱۹) وقد تکلم علی سنده الألبانی، مشکاة المصابیح (۱/ ۹۷)

دوسری قسم ہے، ظاہری نجاست اور پلیدی سے جسم، لباس اور جگہ کو پاک کرنا۔
 تیسری قسم ہے، جسم کے مختلف حصوں میں جو گندگیاں اور میل پیدا ہوتا رہتا ہے، اس کی صفائی
 کرنا، جیسے ناک، دانتوں، ناخنوں اور زائد بالوں کی صفائی ہے۔^①
 قرآن و سنت کی تصریحات اور حضرت محدث دہلوی کی نفیس تحقیقات سے یہ بات روزِ روشن
 کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اسلام میں صفائی و ستھرائی اور طہارت و پاکیزگی کو بڑا مقام حاصل ہے
 اور اس کا اپنے پیروکاروں سے طہارت و پاکیزگی رکھنے کا بڑا پُر زور مطالبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں
 عقائد و اعمال کی اور ظاہری و باطنی ہر قسم کی نجاستوں سے طہارت و پاکیزگی اختیار کرنے کی توفیق
 سے نوازے۔ آمین ثم آمین۔



① حجة الله البالغة مترجم اردو از مولانا عبد الحق حقانی (ص: ۲۷۴) طبع کراچی۔

اقسامِ حدث اور اسبابِ غسل

صحیح بخاری و مسلم کی ایک حدیث ذکر ہو چکی ہے، جس میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«لَا تُقْبَلُ صَلَاةٌ مَنْ أَحْدَثَ حَتَّىٰ يَتَوَضَّأَ»^(۱)

”جو آدمی ”حدث“ ہو جائے، اس کی اس وقت تک نماز قبول نہیں ہوتی، جب تک وہ وضو نہ کر لے۔“

اس حدیث شریف میں «مَنْ أَحْدَثَ» کے الفاظ میں ”حدث“ سے مراد سلیم الفطرت انسان کی وہ کیفیت ہے، جس میں وہ پیشاب، پاخانہ یا جماع وغیرہ سے فراغت کے بعد اپنے نفس میں ایک خاص قسم کا انقباض و تکدر اور گرانی و بے لطفی محسوس کرتا ہے اور جب وہی انسان استنجا و طہارت یا غسل کر لیتا ہے اور صاف ستھرے کپڑے پہن کر خوشبو لگا لیتا ہے تو اس کی طبیعت کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے اور ایک انشراح و انبساط اور سرور و فرحت کی کیفیت محسوس کرتا ہے۔ اسی دوسری حالت کا نام طہارت اور پاکیزگی ہے۔ قول شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ: جن کی فطرت سلیم اور جن کا وجدان صحیح ہے، وہ ان دونوں حالتوں اور کیفیتوں کے فرق کو واضح طور پر محسوس کر سکتے ہیں اور اپنی طبیعت و فطرت کے تقاضے سے حدث کی حالت کو ناپسند اور طہارت کی حالت کو پسند کرتے ہیں۔^(۲)

حدث اصغر:

وہ حدث جو روحانی کدورت و آلودگی کا باعث ہوتا ہے، جسے آپ ناپاکی بھی کہہ سکتے ہیں، اس کی فقہی کتب میں دو قسمیں یا دو درجے بیان کیے گئے ہیں۔

ایک ”حدث اصغر“ جس کے ازالے کے لیے صرف وضو کر لینا ہی کافی ہو جاتا ہے۔ پیشاب، پاخانہ، خروج ہوا اور خروج مذی یا ودی حدث اصغر کے موجب ہوتے ہیں۔

(۱) صحیح بخاری شریف مترجم اردو (۱/ ۱۶۳) صحیح مسلم مع النووی (۳/ ۱۰۴) صحیح سنن أبی

داود، رقم الحدیث (۵۴) مشکاة المصابیح (۱/ ۱۰۰)

(۲) حجة الله البالغة اردو (ص: ۲۷۴)

حدیث اکبر:

حدیث کی دوسری قسم یا درجہ ”حدیث اکبر“ ہے، یعنی جس کے اثرات زیادہ گہرے اور وسیع ہوتے ہیں اور ان کا ازالہ پورے جسم کے غسل ہی سے ہو سکتا ہے۔ جماع و احتلام اور حیض و نفاس اس دوسرے قسم کے حدیث یا ناپاکی سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہذا استنجا و طہارت اور وضو کے مسائل جاننے سے پہلے ضروری ہے کہ ہمیں اس غسلِ جنابت کا مسنون طریقہ معلوم ہو۔ یہ فطرتِ سلیمہ کا تقاضا بھی ہے اور شریعتِ اسلامیہ میں واجب بھی۔ جیسا کہ سورۃ المائدہ (آیت: ۶) میں ارشادِ الہی ہے:

﴿وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَأَطَهِّرُوا﴾

”اور اگر نہانے کی حاجت ہو تو (نہا کر) پاک ہو جایا کرو۔“

اس آیت میں غسلِ جنابت یعنی جماع اور احتلام یا بدخوابی کے نتیجے میں حاصل ہونے والی کیفیت سے غسل کر کے پاک ہونا مراد ہے، جبکہ حیض یا ماہواری کے بعد غسل کی فرضیت کی دلیل سورۃ البقرہ (آیت: ۲۲۲) میں مذکور ہے، جہاں ارشادِ الہی ہے:

﴿وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ قُلْ هُوَ أَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّىٰ يَطْهُرْنَ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ﴾

”اور تم سے حیض کے بارے میں دریافت کرتے ہیں، کہہ دو کہ وہ تو نجاست ہے، سو ایامِ حیض میں عورتوں سے کنارہ کش رہو اور جب تک پاک نہ ہو جائیں اُن سے مقاربت نہ کرو۔ ہاں جب پاک ہو جائیں تو جس طریق سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں ارشاد فرمایا ہے، اُن کے پاس جاؤ، کچھ شک نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والوں اور پاک صاف رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔“

اسی طرح صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں نبی کریم ﷺ کے ارشادات بھی مذکور ہیں، جن سے خونِ حیض کے انقطاع کے بعد غسل کی فرضیت کا پتا چلتا ہے، نیز تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس بات پر اجماع ہے کہ نفاس یعنی بچے کی ولادت کے بعد زچہ کو جاری ہو جانے والے خون کے

انقطاع پر بھی اسی طرح غسل کرنا واجب ہے، جس طرح حیض کے بعد ضروری ہے۔
 جماع و احتلام اور حیض و نفاس کے بعد کیے جانے والے غسل کی یہ چاروں قسمیں ”غسل فرض“
 ہیں، جب کہ مسنون و مستحب غسل کی بھی بعض اقسام ہم ذکر کرنے والے ہیں، لیکن پہلے یہاں ایک
 بات یہ بھی ذہن نشین کر لیں کہ اگر کوئی شخص خواب میں دیکھے کہ اسے احتلام ہو گیا ہے، مگر سو کر اٹھنے پر
 اس کی کوئی علامت نظر نہ آئے، تو اس پر غسل واجب نہیں ہوگا، لیکن اگر احتلام ہونا تو یاد نہیں، مگر اٹھنے پر
 منی کی تری پائے تو اس پر غسل واجب ہوگا، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے، صحیح
 مسلم میں حضرت انس و حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما سے، مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے، سنن نسائی،
 ابن ماجہ، مسند احمد اور مصنف ابن ابی شیبہ کی روایات میں حضرت خولہ بنت حکیم رضی اللہ عنہا سے اور سنن ابی داؤد،
 ترمذی، ابن ماجہ اور مسند احمد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ارشادات نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پتا چلتا ہے۔^①
 یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ صحیحین، سنن اربعہ، سنن کبریٰ بیہقی اور مسند احمد و شافعی میں
 نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی متعدد روایات ملتی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مردوں کی طرح ہی
 عورتوں کو بھی بدخوابی ہو جاتی ہے، لہذا تری پانے کی صورت میں ان پر بھی غسل واجب ہو جاتا ہے اور
 محض بدخوابی ہونے اور اس کی علامت نہ پانے کی شکل میں ان پر غسل واجب نہیں ہوگا۔^②
 صحیح بخاری و مسلم شریف میں مذکور ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں حضرت
 ام سلیم رضی اللہ عنہا کے جواب میں بدخوابی پر غسل واجب ہونے اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے جواب میں
 عورتوں میں بھی بدخوابی کے واقع ہونے کی عقلی دلیل کے طور پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:
 «فِيمَا يُشَبِّهُهَا وَلَدَهَا»^③

”تو پھر بچے کی شہت کبھی اس پر اور کبھی اس پر کیسے چلی جاتی ہے؟“

- ① دیکھیں: المنتقی مع النیل (۱/ ۲۵۸-۲۶۲-۳۶۳ طبع مصر) الفتح الرباني (۱۱۶/۲)
 ② اگر مرد وزن دونوں اکٹھے سوئے ہوئے ہوں اور بستر پر تری پائیں اور معلوم نہ ہو کہ کس کو بدخوابی ہوئی ہے تو
 تری کو دیکھا جائے گا، اگر رنگ سفید ہو تو مرد غسل کرے گا اور اگر رنگ پیلا یا زرد ہو تو عورت پر غسل واجب
 ہوگا، لیکن اگر پانی یا تری میں فرق نہ ہو سکے تو پھر احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ دونوں ہی غسل کر لیں۔
 ③ صحیح البخاری مع الفتح (۱/ ۲۷۶) صحیح مسلم مع شرح النووي (۳/ ۲۲۳، ۲۲۴) صحیح سنن أبی
 داؤد، رقم الحدیث (۲۱۷) المنتقی (۱/ ۲۵۸) الفتح الرباني (۱۱۶/۲ تا ۱۲۰)

صحیح مسلم شریف اور بعض دیگر کتب حدیث میں مروی ہے:
 ”مرد کا مادہ منویہ گاڑھا اور سفید ہوتا ہے، جبکہ عورت کا پتلا اور پیلا ہوتا ہے اور دونوں
 میں سے جس کا مادہ غالب آجائے، بچہ اسی کے مشابہ ہوتا ہے۔“^①



① صحیح مسلم مع شرح النووي (۳/۲۲۲-۲۲۳) صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (۱۹۴) سنن ابن
 ماجہ، رقم الحدیث (۶۰۱) الفتح الرباني (۲/۱۱۶ تا ۱۲۰)

حیض و نفاس اور استحاضہ کے بعض احکام

احکام و مسائل حیض کے سلسلے میں یہ باتیں بھی پیش نظر رہنی چاہئیں:

حیض آنے کی عمر:

حیض آنے کی کم از کم اور زیادہ سے زیادہ عمر کتنی ہے؟

اس سلسلے میں احادیث و آثار ساکت ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ائمہ کرام کے مابین اس کے بارے میں اختلاف ہے، لیکن کم از کم عمر کے بارے میں تو تقریباً سب کا اتفاق ہے کہ وہ ۹ سال ہے۔ البتہ زیادہ سے زیادہ احناف کے نزدیک ۵۵ سال اور مالکیہ و حنابلہ کے نزدیک ۵۰ سال ہے، جب کہ شافعیہ کے نزدیک زیادہ سے زیادہ عمر کی کوئی تعیین نہیں^①۔

حیض کی مدت:

ہر ماہ کے ایام حیض کی گنتی مختلف طبائع کے لحاظ سے مختلف ہو سکتی ہے۔ نبی کریم ﷺ سے اس سلسلے میں جو بعض روایات ملتی ہیں، وہ سب متکلم فیہ ہیں اور کوئی صحیح حدیث ثابت نہ ہونے کی بنا پر ائمہ کرام کے مابین بھی اختلاف ہے۔

امام شافعی اور امام احمد رحمہما کے نزدیک حیض کی کم از کم مدت ایک دن اور ایک رات اور زیادہ سے زیادہ مدت ایک روایت میں پندرہ روز اور دوسری روایت میں ۱۷ روز ہے۔ اس کی ایک روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ملتی ہے، بلکہ طبرانی اور سنن دارقطنی میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی ایک مرفوع حدیث میں بھی یہی مذکور ہے، مگر وہ سخت کمزور ہے۔^②

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک حیض کی کم از کم مدت تین دن اور زیادہ سے زیادہ دس دن ہے۔ اس کی ایک روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی ملتی ہے، جس سے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے استدلال کیا ہے، لیکن اس

① الفقه علی المذاهب الأربعة (۱/ ۱۲۴ تا ۱۲۷)

② تحفة الأحمدي (۱/ ۴۰۲-۴۰۴) الفقه علی المذاهب الأربعة (۱/ ۱۲۸) و المغني (۱/ ۲۷۷)

کی سند ضعیف ہے۔ کم از کم تین دن اور زیادہ سے زیادہ دس دن مدت حیض پر دلالت کرنے والی ایک مرفوع حدیث بھی حضرت وائلہ بنت اسقع رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، مگر وہ ضعیف اور ناقابل استدلال ہے۔^(۱)

سنن ابی داؤد، ترمذی، ابن ماجہ، دارقطنی، بیہقی، مستدرک حاکم، مسند احمد اور معانی الآثار طحاوی میں حمہ بنت جحش رضی اللہ عنہا کی حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حیض کی مدت چھ یا سات دن مقرر فرمائی ہے۔^(۲)

حقیقت تو یہ ہے کہ امام ابن قدامہ رحمہ اللہ کے بقول حیض کا ذکر مطلق وارد ہوا ہے۔ شریعت اور لغت میں اس کے قلیل و کثیر کی کوئی تحدید نہیں آئی، لہذا اس معاملے میں عادت اور عرف عام کی طرف رجوع کرنا ہی واجب ہے اور ایسی عورتیں بھی پائی گئی ہیں، جو صرف ایک ہی دن کے لیے حائضہ ہوتی ہیں، بعض مسلسل پندرہ دن اور کوئی دو دن، حتیٰ کہ امام ابن المنذر نے نقل کیا ہے کہ امام اوزاعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”ہمارے یہاں ایک ایسی عورت بھی ہے، جسے صبح حیض آتا ہے اور شام کو وہ پاک ہو جاتی ہے۔“^(۳)

اس سے معلوم ہوا کہ عرف ہی کا اعتبار ہوگا، کسی حد بندی کی پابندی واجب نہیں، کیوں کہ شریعت حد بندی سے خاموش ہے، لہذا علاقے و قبیلے کا عرف ہی معتبر ہے۔^(۴)

نفاس:

بچے کے پیدا یا ساقط ہونے کے بعد آنے والے خون کی کم از کم مدت کوئی نہیں، بلکہ جب بھی خون بند ہو جائے، نفاس کی مدت ختم ہو جاتی ہے اور میاں بیوی کے ازدواجی تعلقات کی ممانعت ختم ہو جاتی ہے۔ البتہ مستحب یہ ہے کہ چالیس دن تک ازدواجی تعلقات سے پرہیز کیا جائے۔^(۵) لیکن اس استحباب کی کوئی صریح دلیل نہیں ہے۔^(۶)

(۱) البدایۃ لابن رشد (۷۲/۱ - ۷۳) المغنی (۲۷۶/۱ - ۲۷۷) الفقه علی المذہب الأربعة (۱/۱۲۸)

(۲) إرواء الغلیل (۲۰۲/۱) حسنه الترمذی مع التحفة (۱/۳۹۶ - ۳۹۷)

(۳) المغنی لابن قدامة (۱/۲۲۵)

(۴) الروضة الندیة مع شرحه الدرر البهیة (۱/۶۲) دار المعرفة بیروت.

(۵) المغنی (۱/۳۰۹)

(۶) اگر بچہ خشک پیدا ہو جائے اور خون بالکل ہی نہ آئے تو عورت غسل کے بعد نماز شروع کر دے گی۔ دیکھیں: بدایۃ المجتہد.

نفاس کی مدت:

نفاس کی زیادہ سے زیادہ مدت چالیس دن ہے۔ احناف اور حنابلہ کا یہی مسلک ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ نے بھی غالب احوال میں یہی حد مقرر کی ہے۔^(۱) ان کا استدلال، سنن ابی داود، مستدرک حاکم اور سنن بیہقی میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے ہے، جس میں وہ فرماتی ہیں:

«كَانَتِ الْمَرْأَةُ مِنْ نِسَاءِ النَّبِيِّ ﷺ تَتَعَدُّ فِي النَّفَاسِ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً»^(۲)

”نبی اکرم ﷺ کی ازواج مطہرات میں سے کوئی عورت نفاس کی صورت میں (زیادہ سے زیادہ) چالیس دن تک بیٹھتی (یعنی نماز روزہ ترک کرتی) تھی۔“

جبکہ سنن ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، دارمی، دارقطنی، بیہقی، مسند احمد اور مستدرک حاکم میں اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

«كَانَتِ النَّفْسَاءُ تَجْلِسُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ أَرْبَعِينَ يَوْمًا»^(۳)

”نبی ﷺ کے عہد مبارک میں نفاس والی عورتیں چالیس روز تک بیٹھتی (یعنی نماز روزہ ترک کرتی) تھیں۔“

امام ترمذی رحمہ اللہ اپنی سنن میں فرماتے ہیں:

صحابہ اور تابعین میں تمام اہل علم میں اس بات پر اتفاق ہے کہ عورت چالیس دن تک نفاس میں نماز چھوڑے گی، سوائے اس کے کہ وہ اس سے پہلے ہی پاک ہو جائے۔ اس صورت میں خون بند ہونے پر وہ غسل کر کے نماز شروع کر دے گی اور اگر چالیس دن کے بعد بھی خون آتا رہے تو اکثر اہل علم کے نزدیک وہ نماز نہیں چھوڑے گی۔^(۴)

بعض حالات میں شافیہ نفاس کی زیادہ سے زیادہ مدت ساٹھ دن کہتے ہیں۔^(۵) ساٹھ کی ہی ایک

(۱) المغنی لابن قدامة (۳۰۸)

(۲) إرواء الغلیل (۱/۲۲۲) وحسنه، و صحیح سنن أبی داود، رقم الحدیث (۳۰۴)

(۳) سنن الترمذی مع التحفة (۱/۴۲۸) صحیح أبی داود، رقم الحدیث (۳۰۴) صحیح سنن الترمذی، رقم

الحدیث (۱۲۰) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۶۴۸) المغنی (۱/۳۰۸)

(۴) سنن الترمذی مع التحفة (۱/۴۲۹-۴۳۰) صحیح سنن الترمذی (۱/۴۶)

(۵) الفقہ علی المذاهب الأربعة (۱/۱۳۲)

روایت امام احمد رضی اللہ عنہ سے بھی ملتی ہے، کیوں کہ امام اوزاعی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا:

”ہمارے یہاں ایک عورت ہے، جو دو ماہ تک خونِ نفاس سے رہتی ہے۔“

امام عطاء رضی اللہ عنہ سے بھی ایک ایسا ہی واقعہ مروی ہے کہ انھوں نے بھی ایک ایسی ہی عورت دیکھی ہے اور اس مسلک کی دلیل و جود میں آنے والے یہی واقعات ہیں۔^(۱) جبکہ چالیس دن والے مسلک کی دلیل حدیث شریف ہے۔ تحفۃ الاحوذی (۱/ ۲۳۱) میں علامہ عبدالرحمن مبارک پوری رضی اللہ عنہ نے چالیس دن والے مسلک ہی کو ترجیح دی ہے اور امام شوکانی رضی اللہ عنہ کی بھی یہی رائے ہے۔^(۲)

گویا چالیس دن تک نفاس اور بعد میں آنے والے خون کا حکم استحاضہ کا ہے، جس میں نماز روزہ وغیرہ سب ضروری ہیں اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ نفاس کا حکم حیض والا ہی ہے۔^(۳)

حیض و نفاس کی حالت میں نماز اور روزے کا حکم:

حائضہ عورت کے گھر داری اور شوہر کی خدمت سے تعلق رکھنے والے بعض احکام تو پہلے ذکر کیے جا چکے ہیں، جبکہ اس کی نمازوں اور روزوں کے سلسلے میں شرعی حکم یہ ہے کہ ان ایام میں وہ نمازیں ادا کرے گی نہ روزے ہی رکھے گی۔ نمازیں تو کئی طور پر اسے معاف ہیں، مگر روزے بعد میں قضا کرنا ضروری ہیں۔ چنانچہ صحاح و سنن میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«كَانَ يُصِيبُنَا ذَلِكَ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَنُومِرُ بِقِضَاءِ الصَّوْمِ وَلَا نُؤْمِرُ بِقِضَاءِ الصَّلَاةِ»^(۴)

”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مسعود میں ہمیں حیض آتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہمیں روزے قضا کرنے کا حکم تو ملتا، مگر نمازوں کی قضا کا حکم نہیں ملتا تھا۔“

نفاس والی عورتیں بھی روزے تو قضا کریں گی، مگر نمازیں نہیں، کیونکہ سنن ابی داؤد، مستدرک حاکم

اور سنن بیہقی میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

(۱) المغنی (۱/ ۳۰۸)

(۲) تحفۃ الأحوذی (۱/ ۴۳۱)

(۳) الروضة الندية مع الدرر البهية (۱/ ۶۵-۶۶)

(۴) صحیح البخاری، رقم الحدیث (۳۲۱) صحیح سنن ابی داؤد، رقم الحدیث (۲۳۶) صحیح سنن

الترمذی، رقم الحدیث (۱۱۲) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۶۳۱)

«كَانَتِ الْمَرْأَةُ مِنْ نِسَاءِ النَّبِيِّ ﷺ تَقْعُدُ فِي النَّفَاسِ أَرْبَعِينَ يَوْمًا لَا يَأْمُرُهَا النَّبِيُّ ﷺ بِقَضَاءِ صَلَاةِ النَّفَاسِ»^①

”نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن میں سے عورت نفاس کے چالیس دن بیٹھا کرتی تھی اور نبی ﷺ اسے نمازیں قضا کرنے کا حکم نہیں فرماتے تھے۔“

جب کہ سنن ترمذی اور المغنی لابن قدامہ میں ہے کہ اگر چالیس دن سے پہلے خون نفاس بند ہو جائے تو وہ غسل کرے اور نمازیں روزے وغیرہ شروع کر دے۔^② اگر کسی کو چالیس دن سے بھی زیادہ خون جاری رہے اور اتفاق سے وہ ایام حیض ہوں تو انھیں حیض شمار کرے اور اگر وہ ایام معتاد نہیں تو پھر وہ استحاضہ ہوگا، جو ایک بیماری ہے، جس میں عورت کو خون جاری رہتا ہے۔ اس شکل میں وہ غسل کرے، نمازیں وغیرہ شروع کر دے اور ہر نماز کے لیے نیا وضو کرے، ایک وضو سے کئی نمازیں نہیں پڑھ سکتی، جیسا کہ بخاری شریف میں مروی ہے کہ فاطمہ بنت ابی جحش رضی اللہ عنہا کو نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا:

«تَوَضَّئِي لِكُلِّ صَلَاةٍ»^③ ”ہر نماز کے لیے وضو کرو۔“

یہی جمہور کا مسلک ہے، ان کے نزدیک ایک ہی غسل کافی ہے۔ بعض روایات میں ظہر و عصر کے لیے ایک غسل، مغرب و عشاء کے لیے دوسرے اور فجر کے لیے تیسرے غسل کا ذکر ہے۔ مگر امام بیہقی نے اسے ضعیف اور بعض نے منسوخ قرار دیا ہے۔^④

استحاضے کی حالت میں عورت اپنے خاوند کے لیے بھی حلال ہوتی ہے، مگر حیض و نفاس میں نہیں، لیکن اگر کوئی شخص حیض کی حالت میں اپنی بیوی سے جماع کر بیٹھے تو اس گناہ کا کفارہ ادا کرے۔ سنن ابی داؤد، نسائی اور ابن ماجہ میں (مرفوعاً لیکن صحیح موقوفاً ہے) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایسے شخص کے بارے میں مروی ہے:

«يَتَصَدَّقُ بِدَيْنَارٍ أَوْ بِنِصْفِ دَيْنَارٍ»^⑤ ”وہ ایک دینار یا نصف دینار صدقہ کرے۔“

① حسنه الألباني في الإرواء (۲۲۲/۱) و صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (۳۰۵)

② سنن الترمذی مع التحفة (۱/۴۲۸-۴۳۰) و المغنی (۱/۳۰۸) طبع مصر.

③ صحيح البخاري مع الفتح (۲۲۸) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (۲۸۷-۲۸۹) سبل السلام (۱/۱۰۳)

④ سبل السلام (۱/۱۰۰-۱۰۳) و نيل الأوطار (۱/۴۲۱-۴۲۲، ۲۶۸ تا ۲۷۶)

⑤ صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (۱۹۰۰) و رقم الحديث (۲۳۰۰) و صحيح سنن الترمذی، رقم ←

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی سے اس کی تفسیر سنن ابی داؤد میں یوں مروی ہے:

”إِذَا أَصَابَهَا فِي أَوَّلِ الدَّمِ فَدَيْنَارٌ، وَإِذَا أَصَابَهَا فِي انْقِطَاعِ الدَّمِ فَنِصْفُ دَيْنَارٍ“^①

”اگر حیض کی ابتدا میں جماع کر بیٹھے تو ایک دینار صدقہ کرے اور اگر آخری ایام میں ہو تو نصف دینار۔“

بعض ضعیف روایات سے پتا چلتا کہ اگر طاقت ہو تو ایک دینار صدقہ کرے اور اگر اس کی استطاعت نہیں تو نصف دینار صدقہ کرے۔^② یہ سب روایات ضعیف ہیں، اس لیے بعض کے نزدیک صرف استغفار ہی کافی ہے۔



← الحدیث (۱۱۷) و صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (۲۷۸) صححه غیر واحد ووافقهم الألباني في الإرواء (۱/ ۲۱۷- ۲۱۸) طبع جامعه الإمام.

① صحیح سنن أبی داؤد، رقم الحدیث (۲۳۸- ۱۹۰) الإرواء (۱/ ۲۱۸) یہ روایت مرفوعاً بھی مروی ہے، لیکن صحیح اس کا موقوف ہونا ہے۔

② إرواء الغلیل (۱/ ۲۱۸)

غسل کا حکم اور اس کا طریقہ

غسل کب واجب ہوتا ہے؟

جنابت اور خصوصاً جماع کی شکل میں غسل کب واجب ہوتا ہے؟

۱ صحیح مسلم میں مروی ہے:

«إِذَا قَعَدَ بَيْنَ شُعْبَيْهَا الْأَرْبَعِ ثُمَّ أَلْزَقَ الْخِتَانَ بِالْخِتَانِ فَقَدْ وَجِبَ الْغُسْلُ»^①
 ”جب مرد اپنی بیوی کے چاروں ارکان (ہاتھ پاؤں) کے درمیان بیٹھ جائے اور اپنی
 جائے ختنہ عورت کی جائے ختنہ سے ملا دے تو غسل واجب ہو گیا۔“

۲ سنن ابن ماجہ اور مصنف ابن ابی شیبہ میں مروی ہے:

«إِذَا التَّقَى الْخِتَانُ بِالْخِتَانِ وَتَوَارَتِ الْحَشْفَةُ فَقَدْ وَجِبَ الْغُسْلُ»^②
 ”جب دونوں کی جائے ختنہ باہم مل جائیں اور مرد کا حشفہ (عضو تناسل کا اگلا حصہ)
 عورت کی شرم گاہ میں داخل ہو جائے تو غسل واجب ہو گیا۔“

۳ جب کہ صحیح بخاری و مسلم اور بعض دوسری کتب حدیث میں مروی ہے:

«إِذَا جَلَسَ بَيْنَ شُعْبَيْهَا الْأَرْبَعِ وَأَجْهَدَ نَفْسَهُ (وَفِي رِوَايَةٍ: ثُمَّ جَهَدَ) فَقَدْ
 وَجِبَ الْغُسْلُ، أَنْزَلَ أَوْ لَمْ يُنْزَلِ»^③

”جب مرد عورت کے ہاتھوں اور پاؤں میں بیٹھ گیا اور اس نے جماع کیا تو غسل واجب
 ہے، انزال ہو یا نہ ہو۔“

① صحیح مسلم (۴/۴۱-۴۲) صحیح الجامع (۷۳۶) الفاظ تھوڑے سے مختلف ہیں لیکن معانی ایک ہی ہیں۔

② سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۶۱۱) صحیح الجامع، رقم الحدیث (۳۸۶)

③ صحیح البخاری، رقم الحدیث (۲۹۱) صحیح مسلم مع شرح النووی (۴/۳۹-۴۰) الفتح الربانی (۲/

مسنون اور مستحب غسل:

غسل واجب کی مذکورہ چار اقسام (جنابت، حیض، نفاس اور جماع سے غسل) کے علاوہ بعض اقسام غسل مسنون اور مستحب ہیں، مثلاً جمعہ کے دن ہر عاقل و بالغ مسلمان کے لیے غسل کی نبی کریم ﷺ نے بڑی تاکید فرمائی ہے۔ بعض احادیث میں اسے ضروری اور بعض میں اسے اچھا فعل قرار دیا گیا ہے۔

امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے ”نبیل الأوطار، شرح منتقى الأخبار“ میں ہر قسم کی احادیث نقل کرنے کے بعد غسل جمعہ کے مستحب ہونے کا حکم اخذ کیا ہے اور بعض احادیث کی رو سے عیدین کے غسل کے بھی مستحب ہونے کا پتا چلتا ہے۔ اسی طرح میت کو غسل دینے کے بعد، مشرک کو دفن کرنے کے بعد، غشی یا بے ہوشی کے بعد، احرام باندھتے وقت، دخول مکہ سے قبل اور وقوف عرفہ سے پہلے غسل کرنا بھی احادیث سے ثابت ہے، مگر یہ سب اقسام فرض یا واجب نہیں، بلکہ مسنون، مستحب اور کارِ ثواب ہونے کا درجہ رکھتی ہیں۔^①

البتہ ان تمام اقسام فرض و واجب اور مستحب و مسنون کے لیے غسل کا طریقہ تقریباً ایک جیسا ہی ہے، صرف اتنا فرق ہے کہ غسل جنابت کے لیے عورت کا اپنے سر کی چٹیا کھولنا ضروری نہیں، جبکہ حیض و نفاس کے لیے غسل کرتے وقت بالوں کا کھولنا اور خوب مل کر دھونا ضروری ہے۔

غسل کا مسنون طریقہ:

اب رہا غسل کا مسنون طریقہ تو اس کی عموماً دو شکلیں پائی جاتی ہیں۔ ایک غسل عادت اور دوسرا غسل عبادت ہے۔

غسل عادت تو یہ ہے کہ کوئی شخص محض اپنے جسم کا میل کچیل اور پسینا زائل کرنے، صفائی ستھرائی کی خاطر یا گرمی کی شدت کم کرنے اور حصول برودت کی غرض سے نہائے اور غسل کے مسنون طریقہ سے قطع نظر اپنی ہی مرضی سے بدن پر پانی بہائے اور صابن، شیمپو سے غسل کر لے۔ اسے آپ ”غسل عادت“ کہہ سکتے ہیں، کیوں کہ اس سے صفائی ستھرائی اور ٹھنڈک تو حاصل ہو جائے گی، مگر وہ

① الفتح الرباني (۲/ ۱۴۴ تا ۱۴۷) المنتقى مع النبیل (۱/ ۲۳۱) تمام المنة (ص: ۱۲۲-۱۲۳)

اجر و ثواب اور فضیلت حاصل نہیں ہوگی، جو مسنون طریقے سے غسل کرنے پر حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے اس مسنون طریقے کو ”غسل عبادت“ بھی کہا جاسکتا ہے۔ ان دونوں میں باہم کوئی فرق بھی نہیں، کیوں کہ پہلے سے بھی صفائی ستھرائی اور ٹھنڈک حاصل ہوتی ہے اور دوسرے سے بھی، پہلے میں بھی سرد یا گرم پانی اور صابن و شیمپو استعمال ہوتا ہے اور دوسرے میں بھی، مگر پہلا عادت اور دوسرا عبادت، پہلا محض دنیا اور دوسرا دین ہے، مگر پہلا خرما ہے تو دوسرا ہم خرما و ہم ثواب ہے۔ اس فرق کی وجہ صرف اتنی سی ہے کہ جب بھی کوئی شخص غسل کرنے لگے تو اسے (وہ غسل فرض و واجب یا مسنون و مستحب) ہر شکل میں مسنون طریقے کو اختیار کرنا چاہیے اور اس تصور کے آجانے سے جہاں آپ طہی و دنیاوی فوائد سے بہرہ ور ہوں گے، وہیں اس کے دینی و روحانی ثمرات بھی سمیٹیں گے اور اتباع سنت کا اجر و ثواب بھی پائیں گے۔ لہذا آئیے دیکھیں کہ نبی کریم ﷺ کا مسنون طریقہ غسل کیا تھا؟

صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتب حدیث میں ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

«كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا اغْتَسَلَ مِنَ الْجَنَابَةِ ، يَبْدَأُ فَيَغْسِلُ يَدَيْهِ ثُمَّ يُمْرُغُ بِيَمِينِهِ عَلَى شِمَالِهِ فَيَغْسِلُ فَرْجَهُ ، ثُمَّ يَتَوَضَّأُ وَضُوءَهُ لِّلصَّلَاةِ ثُمَّ يَأْخُذُ الْمَاءَ فَيَدْخُلُ أَصَابِعَهُ فِي أُصُولِ الشَّعْرِ حَتَّى إِذَا رَأَى أَنْ قَدْ اسْتَبْرَأَ حَفَنَ عَلَى رَأْسِهِ ثَلَاثَ حَفَنَاتٍ ، ثُمَّ أَفَاضَ عَلَى سَائِرِ جَسَدِهِ ، ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَيْهِ»^(۱)

”نبی اکرم ﷺ جب غسل جنابت فرماتے تو پہلے اپنے دونوں ہاتھوں کو دھو لیتے۔ پھر دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ پر پانی ڈال کر مقام استنجا کو دھوتے۔ پھر اسی طرح وضو فرماتے، جس طرح نماز کے لیے وضو کیا جاتا ہے۔ پھر پانی لیتے اور بالوں کی جڑوں میں انگلیاں ڈال کر وہاں پانی پہنچاتے۔ جب آپ ﷺ محسوس فرما لیتے کہ پانی بالوں کی جڑوں تک پہنچ گیا ہے تو پھر پانی کے تین چلو بھر کر اپنے سر پر ڈالتے۔ اس کے بعد باقی سارے جسم پر پانی بہاتے تھے اور اس کے بعد اپنے دونوں پاؤں دھوتے تھے۔“

(۱) صحیح البخاری، رقم الحدیث (۲۴۸) صحیح مسلم مع شرح النووی (۲/ ۳ / ۲۲۸) دار الفکر بیروت
صحیح سنن أبي داود (۲۲۲) صحیح سنن النسائي (۲۴۱) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۹۱)

صحاح و سنن ہی میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میری خالہ ام المومنین حضرت

میمونہ رضی اللہ عنہا نے مجھے (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا) طریقہ غسل بتاتے ہوئے فرمایا:

«أَدْنَيْتُ لِرَسُولِ اللَّهِ ﷺ غُسْلَهُ مِنَ الْجَنَابَةِ فَعَسَلَ كَفِّهِ مَرَّتَيْنِ أَوْ ثَلَاثًا، ثُمَّ أَذْخَلَ يَدَهُ فِي الْإِنَاءِ ثُمَّ أَفْرَغَ بِهِ عَلَى فَرْجِهِ وَغَسَلَهُ بِشِمَالِهِ، ثُمَّ ضَرَبَ بِشِمَالِهِ الْأَرْضَ فَدَلَّكَهَا دَلْكَاً شَدِيداً ثُمَّ تَوَضَّأَ وَضُوءَهُ لِلصَّلَاةِ ثُمَّ أَفْرَغَ عَلَى رَأْسِهِ ثَلَاثَ حَفَنَاتٍ مِلاً كَفِّهِ، ثُمَّ غَسَلَ سَائِرَ جَسَدِهِ، ثُمَّ تَنَحَّى عَنْ مَقَامِهِ ذَلِكَ فَغَسَلَ رِجْلَيْهِ»^(۱)

”میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل جنابت کے لیے پانی بھر کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رکھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے دو یا تین مرتبہ اپنے ہاتھوں کو دھویا۔ پھر اپنا دھلا ہوا ہاتھ پانی کے اس برتن میں ڈالا اور دائیں ہاتھ سے پانی لے کر اپنے مقام استنجا پر ڈالا اور اپنے بائیں ہاتھ سے اسے دھویا۔ پھر اپنا بائیں ہاتھ زمین پر مارا اور اسے مٹی کے ساتھ خوب رگڑ رگڑ کر ملا۔ پھر نماز کے لیے وضو کرنے جیسا وضو کیا۔ پھر تین دفعہ چلو بھر کر سر پر پانی ڈالا۔ پھر اپنے سارے جسم کو دھویا۔ پھر اس جگہ سے ہٹ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دونوں پاؤں دھوئے۔“

اس حدیث میں آگے یہ الفاظ بھی مذکور ہیں:

”پھر میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تولیہ دیا، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے واپس کر دیا۔“

نیز صحیح بخاری و مسلم ہی کی ایک حدیث میں ہے:

”آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی (اپنے دونوں ہاتھوں سے) جھاڑا۔“

ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب پانی کا جھاڑنا ثابت ہے تو پھر تولیے سے بدن کو صاف کر لینا بھی جائز ہے۔^(۲) یہ جو کہا جاتا ہے کہ وضو یا غسل کا پانی پونچھنا نہیں چاہیے، یہ بات شرعاً بے بنیاد ہے، اس سلسلے میں مسند الفردوس دیلمی کی وہ روایت جسے امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ”الجامع الصغیر“

(۱) صحیح البخاری مع الفتح، رقم الحدیث (۲۴۹) صحیح مسلم مع شرح النووی (۲/۳/۲۳۱) صحیح

سنن أبی داود، رقم الحدیث (۲۲۴) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۹۰) سنن ابن ماجہ (۵۷۳)

(۲) تولیے کے استعمال کے بارے میں ”سبل السلام“ کا مراجعہ کریں۔

میں نقل کیا ہے، محدثین کرام نے اس روایت کو ناقابلِ حجت قرار دیا ہے۔^①

مذکورہ بالا دو احادیث (جو حضرت عائشہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہیں) کے مجموعی مفاد سے غسلِ نبوی ﷺ کا جو مسنون طریقہ سامنے آتا ہے، ظاہر ہے کہ غسل کا سب سے پاکیزہ طریقہ اور باسلیقہ انداز یہی ہو سکتا ہے۔ غسل کی جگہ سے ہٹ کر آخر میں پاؤں دھونے کی وجہ یہ ہوگی کہ غسل کی وہ جگہ پختہ نہ ہوگی اور وہاں پانی رکتا اور جمع ہوتا ہوگا۔ اس طرح کیے گئے غسل کے بعد دوبارہ وضو کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں رہتی، بلکہ اسی غسل والے وضو سے نماز وغیرہ پڑھی جاسکتی ہے، بشرطیکہ دورانِ غسل وضو ٹوٹنے کی کوئی ضرورت پیش نہ آئے۔ کیوں کہ سنن اربعہ اور مستدرک حاکم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا يَتَوَضَّأُ بَعْدَ الْغُسْلِ»^②

”نبی کریم ﷺ غسل کے بعد وضو نہیں کیا کرتے تھے۔“

غسلِ حیض و نفاس کے لیے پانی میں بیری کے پتے ڈالنا بھی بخاری و مسلم اور مسند احمد میں

ثابت ہے۔^③

عورتوں کا غسلِ حیض کے لیے چوٹیاں کھولنا:

جیسا کہ پہلے بھی ہم مختصراً اشارہ کر چکے ہیں کہ عورت کے لیے غسلِ جنابت کے وقت سر کے بالوں کو کھولنا ضروری نہیں، البتہ حیض و نفاس کے غسل کے لیے اپنی چوٹی کو کھولنا ضروری ہے، جیسا کہ صحیح مسلم، سنن اربعہ اور مسند احمد میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے اس بات کا پتا چلتا ہے۔^④

① صحیح مسلم مع شرح النووی (۲/۳/۲۳۱-۲۳۲) نیل الأوطار (۱/۱۷۵-۱۷۶) تحفة الأحوذی (۱/۱۷۴-۱۷۵) الفتح الربانی (۲/۱۳۷-۱۳۸) السلسلة الضعیفة للألبانی (۲/۳۳) تحقیق مشکاة المصابیح للألبانی (۱/۱۳۶)

② صحیح سنن أبي داود، رقم الحديث (۲۲۵) صحیح سنن الترمذی، رقم الحديث (۹۳) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۵۷۹) صحیح سنن النسائی، رقم الحديث (۲۴۶) صححه الترمذی و الحاکم و الذہبی و الألبانی فی مشکاة المصابیح (۱/۱۳۹) حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ غسل کے بعد پاؤں دھویا کرتے تھے۔ یعنی پاؤں کے دھونے کو موخر کرنا، یہ صرف حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے۔

③ الفتح الربانی (۲/۱۶۷)

④ حوالہ سابقہ (۳/۱۳۵)

عورت کے لیے جنابت کے غسل کے وقت چوٹی نہ کھولنے اور حیض و نفاس کے لیے چوٹی کھولنے کے الگ الگ حکم کی فقہانے یہ توجیہ کی ہے کہ حالتِ جنابت چونکہ بکثرت ہوتی ہے، لہذا اس کے لیے ہر مرتبہ چوٹی کھول کر سر دھونا باعثِ مشقتِ فعل ہے، جبکہ حیض تو ایک ماہ میں صرف ایک ہی بار اور نفاس سالوں میں کبھی کبھار ہوتا ہے، لہذا ان میں چوٹی کھولنا باعثِ مشقت نہیں رہتا۔^(۱)

آدابِ غسل ہی میں سے یہ بھی ہے کہ پردے میں غسل کریں، کیوں کہ سنن ابی داؤد و نسائی اور مسند احمد میں ارشادِ نبوی ﷺ مروی ہے:

«إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى حَيٌّ سِتِيرٌ، يُحِبُّ الْحَيَاءَ وَالتَّسْتُرَ، فَإِذَا اغْتَسَلَ أَحَدُكُمْ فَلْيَسْتِرْ»^(۲)

”اللہ تعالیٰ بہت حیا اور پردے والا ہے اور حیا اور پردے کو پسند کرتا ہے، پس تم میں سے جب کوئی شخص غسل کرے تو اسے چاہیے کہ پردے میں غسل کرے۔“



(۱) المغنی (۱/۲۲۶) إرواء الغلیل (۱/۱۶۷)

(۲) صحیح سنن أبی داؤد، رقم الحدیث (۳۳۸۷) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۳۹۳) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۳۳۶) و صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۱۹) مشکاة المصابیح (۱/۱۳۹) صحیح الجامع (۱۷۵۶)

قضاے حاجت کے آداب

حدیثِ اصغر، جو پیشاب، پاخانہ، خروج ہوا اور خروج مذی و ودی کی شکل میں رونما ہوتا ہے، اس کا ازالہ صرف طہارت و وضو ہی سے ہو جاتا ہے، اس کے لیے غسل کرنا ضروری نہیں ہوتا۔ اس حدیثِ اصغر کے موجبات میں سے ایک قضاے حاجت بھی ہے۔ لہذا آئیے پہلے ارشاداتِ رسول ﷺ کی روشنی میں قضاے حاجت کے آداب کا مطالعہ کریں۔

اول:

اس سلسلے میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ قضاے حاجت کے وقت پردے کی خاص کوشش کی جائے۔ لیٹرین یا بیت الخلاء تو عموماً باپردہ ہی ہوتے ہیں، لیکن اگر کبھی کھلے میدان میں اس کا موقع آجائے تو لوگوں کی نظروں سے دور نکل جانا چاہیے، کیوں کہ سننِ اربعہ اور مسندِ احمد میں مختلف الفاظ، مگر ایک ہی مفہوم کی یہ حدیث مروی ہے:

«كَانَ إِذَا أَرَادَ الْحَاجَّةَ أَبْعَدَ»^①

”نبی کریم ﷺ جب قضاے حاجت کا ارادہ فرماتے تو دور نکل جاتے تھے۔“

سنن ابی داؤد میں یہ الفاظ بھی مذکور ہیں:

«حَتَّى لَا يَرَاهُ أَحَدٌ»^② ”یہاں تک کہ کوئی شخص آپ ﷺ کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔“

سنن ابن ماجہ میں مروی ہے:

«فَلَا يُرَى»^③ ”آپ ﷺ نظر نہیں آتے تھے۔“

① دیکھیں: الفتح الرباني (۱/ ۲۶۱) منتقى الأخبار (۱/ ۷۵)

② سنن أبي داود، رقم الحديث (۲)

③ سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۳۳۵)

دوم:

دوسری بات یہ کہ اس وقت اپنے پاس کوئی ایسی چیز نہیں رکھنی چاہے، جس پر اللہ کا کوئی نام لکھا ہوا ہو، کیوں کہ یہ باعثِ توہین ہے۔ سنن اربعہ اور مسند احمد میں مروی ہے:

«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا دَخَلَ الْخَلَاءَ نَزَعَ خَاتَمَهُ»^①

”نبی ﷺ جب بیت الخلاء میں داخل ہوتے تو اپنی انگوٹھی اتار کر جاتے۔“

اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ ﷺ کی انگوٹھی میں «مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ» کے کلمات نقش تھے، آپ ﷺ اس سے مہر لگانے کا کام لیا کرتے تھے۔ انگوٹھی اتار کر بیت الخلاء میں جانے والی اس روایت کو بعض محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے اور بعض نے اسے صحیح کہا ہے۔^②

سند کے اعتبار سے اس کی حیثیت چاہے کیسی بھی ہے، مفہوم کے اعتبار سے یہی درست اور قرین احتیاط ہے، تاکہ اسمِ جلالت کی توہین کا کوئی پہلو نہ نکلے اور اسی سے ایسے لاکٹ کا حکم بھی واضح ہو جاتا ہے، جس میں لفظ ”اللہ“ نقش ہوتا ہے۔ اول تو ایسا لاکٹ عورت یا بچی کے لیے خریدنا ہی نہیں چاہیے، کیوں کہ اس کے احترام کو کما حقہ ادا کرنے میں مشکل ہو جاتی ہے اور اگر بس وہی لینا ہے تو پھر اس کے احترام و مقام کا پورا پورا خیال رکھنا ہوگا اور حیض و نفاس کے ایام، اوقاتِ جماع اور بیت الخلاء میں داخل ہونے سے قبل اسے اتارنا ہوگا۔

سوم:

قضاے حاجت کے آداب میں سے تیسری بات یہ ہے کہ بیت الخلاء میں داخل ہونے سے قبل وہ دعا مانگی جائے، جس کی نبی کریم ﷺ نے تعلیم فرمائی ہے۔ چنانچہ صحاح و سنن اور معاجم و مسانید میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ بیت الخلاء میں داخل ہونے سے قبل یہ دعا مانگا کرتے تھے:

① سنن أبي داود، رقم الحديث (١٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٧٤٦) سنن النسائي، باب نزاع الخاتم عند دخول الخلاء، سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٠٣) المنتقى مع النيل (٧٣ / ١) ضعيف الجامع (٤٣٩٥)

② تفصيل کے لیے دیکھیں: نيل الأوطار (٧٣ / ١ - ٧٤) تحقيق المشكاة للألباني (١ / ١١١)

﴿اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ﴾^①

”اے اللہ! میں زومادہ تمام ناپاک روحوں (جنوں اور شیطانوں) سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔“

بیت الخلاء سے نکلنے وقت سنن ابی داود، ترمذی، ابن ماجہ اور مسند احمد میں مذکور وہ دعا کرنا بھی

سنت ہے، جس کا صرف ایک ہی لفظ ہے:

﴿غُفْرَانَكَ﴾^② ”اے اللہ! میں تیری بخشش چاہتا ہوں۔“

سنن ابن ماجہ میں ایک دعا اور بھی مذکور ہے:

﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنِّي الْأَذَى وَ عَافَانِي﴾^③

”تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں، جس نے میرے جسم سے اذیت کو دور فرمایا اور مجھے

عافیت سے نوازا۔“

مگر اس کی سند ضعیف ہے۔

چہارم:

اسی سلسلے میں چوتھی بات یہ ہے کہ قضاے حاجت کے دوران میں آدمی چونکہ عریاں بیٹھا ہوتا ہے، لہذا ایسے میں کسی قسم کی کوئی بات کرنا جائز نہیں، حتیٰ کہ کسی کے سلام کا جواب بھی نہیں دینا چاہیے، کیوں کہ صحیح مسلم اور سنن اربعہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایسی حالت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے ایک شخص گزرا اور اس نے سلام کہا، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا جواب نہیں دیا۔ جبکہ سنن ابوداؤد، ابن ماجہ اور مسند احمد میں ہے:

﴿فَإِنَّ اللَّهَ يَمُقُّتُ عَلَيَّ ذَلِكَ﴾^④

① صحیح البخاری، رقم الحدیث (۱۴۲) مختصر صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۰۸) صحیح سنن ابی داؤد، رقم الحدیث (۴) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۱۹) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۵) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۲۹۶) مسند أحمد (۳/ ۹۹- ۱۰۱) المنتقى مع النيل (۱/ ۷۳) صحیح الجامع، رقم الحدیث (۴۷۱۲)

② صحیح سنن ابی داؤد، رقم الحدیث (۲۳) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۷) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۳۰۰) صحیح الجامع، رقم الحدیث (۱۴۷۰۷) الإرواء، رقم الحدیث (۹۲)

③ سنن ابن ماجہ (۳۰۱) المنتقى مع النيل (۱/ ۷۳) تحقیق المشكاة (۱/ ۱۲۰)

④ یہ حدیث ضعیف ہے۔ تمام المنة (۵۸- ۵۹) سنن ابن ماجہ (۳۴۲) سنن ابی داؤد، رقم الحدیث (۱۵)

”اس حالت میں باتیں کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ سخت ناراض ہوتا ہے۔“
یہ ناراضی ننگے ہونے کی حالت میں باتیں کرنے پر ہے، تو حمام میں باتیں کرنے اور گنگنانے والے بھی اسی کے تحت آجاتے ہیں۔ وہ بھی اپنی اداؤں پہ ذرا غور کریں۔

پنجم:

قضاے حاجت کے آداب ہی میں سے پانچویں بات یہ ہے کہ کہیں کھلی فضا میں رفع حاجت کی نوبت آجائے تو قبلہ شریف کی طرف منہ کرنا اور ادھر پیٹھ کر کے بیٹھنا دونوں ہی ممنوع ہیں، کیوں کہ صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتب حدیث میں ارشاد نبوی ﷺ ہے:

«إِذَا أَتَيْتُمُ الْغَائِطَ، فَلَا تَسْتَقْبِلُوا الْقِبْلَةَ وَلَا تَسْتَدْبِرُوهَا»^①

”جب تم رفع حاجت کے لیے بیٹھو تو نہ قبلہ شریف کی طرف رخ کرو اور نہ پیٹھ کرو۔“
یہ ممانعت کھلی فضا میں رفع حاجت کے لیے ہے، البتہ اگر گھروں میں یا کہیں بھی جو حمام یا لیٹرین بنی ہوئی ہوتی ہیں، ان کی چار دیواری کے اندر قضاے حاجت اس ممانعت سے مستثنیٰ ہے، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم، سنن اربعہ اور صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور سنن ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ، مسند احمد، صحیح ابن خزیمہ و ابن حبان، مسند بزار، سنن دارقطنی اور مستدرک حاکم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایات اور سنن ابی داؤد میں مروان الاصغر کے طریق سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے فعل سے ثابت ہے۔^② البتہ امام شوکانی اور شیخ البانی کا رجحان مطلق تحریم کی طرف ہے، صحرا میں ہوں یا چار دیواری میں۔^③

ششم:

قضاے حاجت کے آداب میں سے چھٹا ادب یہ ہے کہ کسی ایسی جگہ اور ایسے انداز سے پیشاب نہیں کرنا، جہاں سے پیشاب کے چھینٹے پڑنے کا خدشہ ہو، کیوں کہ پیشاب کے چھینٹوں

① صحیح البخاری، رقم الحدیث (۱۴۴) صحیح مسلم مع شرح النووی (۱۵۲/۳-۱۵۳) صحیح سنن أبی

داؤد، رقم الحدیث (۷) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۸) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث

(۲) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۳۶۸) المنتقی (۸۰/۱) و المشکاة، رقم الحدیث (۳۳۴)

② تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: المنتقی مع النیل (۸۰/۱-۸۳)

③ نیل الأوطار (۸۰/۱) تمام المنة (ص: ۶۰)

سے پرہیز نہ کرنا گناہ کبیرہ اور عذاب الہی کو دعوت دینے والی بات ہے، کیوں کہ صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتب حدیث میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ نبی کریم ﷺ کا گزر دو قبروں کے پاس سے ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّهُمَا لَيُعَذَّبَانِ وَمَا يُعَذَّبَانِ فِي كَبِيرٍ وَلَكِنَّهُ كَبِيرٌ»

”ان دونوں قبروں والوں کو عذاب دیا جا رہا ہے اور یہ عذاب بھی انھیں بظاہر کسی بڑے گناہ پر نہیں ہو رہا، لیکن وہ کبیرہ ہی ہے۔“

آگے ان دونوں کے عذاب کے اسباب و موجبات بتاتے ہوئے فرمایا:

«أَمَّا أَحَدُهُمَا فَكَانَ لَا يَسْتَتِرُ مِنَ الْبَوْلِ (وَفِي رَوَايَةٍ لِّمُسْلِمٍ: لَا يَسْتَتِرُهُ مِنَ الْبَوْلِ) وَأَمَّا الْآخَرُ فَكَانَ يَمْشِي بِالنَّمِيمَةِ^(۱)»

”ان میں سے ایک کا گناہ تو یہ ہے کہ وہ پیشاب کے چھینٹوں سے پرہیز نہیں کیا کرتا تھا اور دوسرا چغل خوری کی عادت میں مبتلا تھا۔“

لہذا اگر لیٹرین میں پیشاب کیا جائے تو چھینٹوں سے بچنے کی پوری کوشش کی جائے اور اگر کہیں باہر اس کی نوبت آجائے تو نرم و پست جگہ تلاش کرنی چاہیے، تاکہ چھینٹوں سے بچا جاسکے اور کھڑے ہو کر پیشاب کرنے میں بھی چھینٹوں کا خدشہ ہوتا ہے، لہذا اس سے بھی پرہیز کیا جائے۔

ہفتم:

قضاے حاجت کے آداب میں سے ساتویں بات یہ ہے کہ کسی ایسی جگہ بیٹھنا موجب لعنت ہے، جو لوگوں کی گزرگاہ، عام راستہ یا بیٹھنے کی جگہ ہو، کیوں کہ صحیح مسلم اور سنن ابی داؤد میں ارشاد نبوی ﷺ ہے:

«اتَّقُوا اللَّاعِنِينَ» ”دو موجب لعنت کاموں سے بچو۔“

پوچھا گیا کہ وہ کون کون سے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«الَّذِي يَتَخَلَّى فِي طَرِيقِ النَّاسِ أَوْ ظَلَمَهُمْ»^(۲)

(۱) صحیح البخاری، رقم الحدیث (۲۱۶) صحیح مسلم مع شرح النووی (۳/۲۰۱-۲۰۰) صحیح سنن ابی داؤد، رقم الحدیث (۱۵) صحیح سنن الترمذی (۶۰) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۱۹۵۶) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۳۴۷) مشکاة المصابیح (۱/۱۱۰)

(۲) صحیح مسلم مع شرح النووی (۳/۱۶۱) صحیح سنن ابی داؤد، رقم الحدیث (۲۰)

”لوگوں کی گزرگاہ یا راستے اور اس جگہ قضاے حاجت کے لیے بیٹھنا، جہاں وہ سائے کے لیے بیٹھتے ہوں۔“

ہشتم:

آٹھویں بات یہ کہ کہیں ٹھہرے ہوئے پانی میں ہرگز پیشاب نہ کیا جائے، کیوں کہ نبی اکرم ﷺ نے اس سے منع کیا ہے۔ چنانچہ صحیح سنن نسائی، سنن ابن ماجہ اور مسند احمد میں مروی ہے:

«أَنَّهُ نَهَى أَنْ يُبَالَ فِي الْمَاءِ الرَّائِدِ»^①

”نبی کریم ﷺ نے ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنے سے منع فرمایا ہے۔“

صحیح مسلم اور سنن ابی داؤد کے الفاظ ہیں:

«لَا يَبُولَنَّ أَحَدُكُمْ فِي الْمَاءِ الدَّائِمِ»^②

”تم میں سے کوئی شخص ٹھہرے ہوئے پانی میں ہرگز پیشاب نہ کرے۔“

نہم:

بیت الخلاء میں قضاے حاجت کی شکل تو ظاہر ہے کہ پانی ساتھ موجود ہوگا، لیکن اگر کبھی کھلی جگہ پر رفع حاجت کی نوبت آجائے تو کم از کم تین ڈھیلے استعمال میں لائے جائیں، کیوں کہ صحیح مسلم اور دیگر کتب حدیث میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« نَهَانَا [يَعْنِي الرَّسُولَ ﷺ] أَنْ نَسْتَنْجِيَ بِأَقْلٍ مِنْ ثَلَاثَةِ أَحْجَارٍ »

”نبی اکرم ﷺ ہمیں تین ڈھیلوں (پتھروں) سے کم کے ساتھ طہارت کرنے سے منع فرمایا ہے۔“

آگے ڈھیلوں کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

«أَوْ أَنْ نَسْتَنْجِيَ بِرَجِيعٍ أَوْ بِعَظْمٍ»^③

① صحیح سنن النسائي، رقم الحديث (٣٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٤٣)

② صحیح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١٨٧) صحیح سنن ابی داؤد، رقم الحديث (٦٢ - ٦٣)

③ صحیح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١٥٢) و صحیح سنن الترمذی، رقم الحديث (١٥) و سنن ابن

ماجه، رقم الحديث (٣١٦) مشکاة المصابيح (١/ ١٠٩ - ١١٠)

”اور اس سے بھی منع فرمایا کہ ہم کسی جانور کے فضلے (گوبر یا لید وغیرہ) سے یا ہڈی سے استنجا کریں۔“

سنن ابی داؤد، نسائی، ابن ماجہ، دارمی اور صحیح ابی عوانہ میں بھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں تین ڈھیلے استعمال کرنے کا حکم اور گوبر و ہڈی سے استنجا کرنے سے منع فرمایا گیا ہے۔ اسی معنی کی ایک حدیث سنن ترمذی و نسائی میں بھی مروی ہے۔^(۱)

سنن ترمذی شریف میں ان کے ساتھ استنجانہ کرنے کی وجہ بھی بیان کی گئی ہے:

«فَإِنَّهُ زَادَ إِخْوَانَكُمْ مِنَ الْجِنَّ»^(۲)

”یہ چیزیں تمہارے جن بھائیوں کی خوراک ہیں۔“

سنن ابو داؤد و نسائی میں ایک ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں تو بڑی سرزنش فرمائی ہے:

«مَنْ عَقَدَ لِحَيْتِهِ أَوْ تَقَلَّدَ وَتَرًّا أَوْ اسْتَنْجَى بِرَجِيعٍ دَابَّةٍ أَوْ عَظْمٍ فَإِنَّ مُحَمَّدًا بَرِيٌّ مِنْهُ»^(۳)

”جس نے اپنی ڈاڑھی کو گرہ لگائی یا تنہی کو لٹکایا یا کسی جانور کے فضلے یا ہڈی سے استنجا کیا تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس شخص سے بری ہیں۔“

وہم:

اس سلسلے میں دسویں ہدایت یہ ہے کہ استنجا کے لیے دائیں ہاتھ کو ہرگز استعمال نہ کیا جائے بلکہ بائیں ہاتھ سے کیا جائے۔ کیوں کہ صحیح مسلم اور دیگر کتب حدیث میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا:

«أَنْ نَسْتَنْجَى بِالْيَمِينِ»^(۴)

”ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کہ ہم دائیں ہاتھ سے استنجا کریں۔“

(۱) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۱۵) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۳۸-۳۹)

(۲) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۱۷) مشکاة المصابیح (۱/۱۱۳)

(۳) صحیح سنن أبی داؤد، رقم الحدیث (۲۷) مشکاة المصابیح (۱/۱۱۳-۱۱۴)

(۴) صحیح مسلم مع شرح النووی (۳/۱۵۲) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۴۸) سنن ابن ماجہ،

رقم الحدیث (۳۱۶) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۱۵) مشکاة المصابیح (۱/۱۰۹)

صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِذَا شَرِبَ أَحَدُكُمْ الْمَاءَ فَلَا يَتَنَفَّسُ فِي الْإِنَاءِ، وَإِذَا أَتَى الْخَلَاءَ فَلَا يَمْسُ ذَكَرَهُ بِيَمِينِهِ، وَلَا يَتَمَسَّحُ بِيَمِينِهِ»^①

”جب تم میں سے کسی نے کچھ پینا ہو تو برتن میں سانس نہ لے اور جب بیت الخلاء میں داخل ہو تو اپنے دائیں ہاتھ سے شرم گاہ کو چھوئے نہ اس سے اسے پونچھے۔“

سنن ابی داؤد، نسائی، ابن ماجہ، دارمی اور صحیح ابن عوانہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث کے آخری الفاظ ہیں:

«وَنَهَى أَنْ يَسْتَطِيبَ الرَّجُلُ بِيَمِينِهِ»^②

”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دائیں ہاتھ سے طہارت کرنے سے منع فرمایا ہے۔“

یا زدہم:

قضاے حاجت اور استنجا کے آداب میں سے گیارہویں بات یہ ہے کہ استنجا کرنے کے بعد اپنے بائیں ہاتھ کو زمین پر رگڑ کر دھوئیں، کیوں کہ سنن ابی داؤد و دارمی اور انہی سے ملتی جلتی حدیث سنن نسائی میں مروی ہے، جس میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے استنجا کیا:

«ثُمَّ مَسَحَ يَدَهُ عَلَى الْأَرْضِ»^③ ”پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ زمین پر ملا۔“

آج کل ہاتھ روم اور بیت الخلاء جس انداز کے بنے ہوتے ہیں، ان میں اگر کھردری جگہ ہو تو وہاں ہاتھ مل لیا جائے، بہ صورت دیگر صابن سے ہاتھ دھولیا جائے تو بھی ان شاء اللہ مقصود حاصل ہو جاتا ہے، اگرچہ زمین پر ہاتھ رگڑنے کی اپنی ہی ایک حیثیت ہے۔

① صحیح البخاری مع الفتح (۱۵۳) صحیح مسلم مع شرح النووي (۱۵۹ / ۳ - ۱۶۰) صحیح سنن النسائي، رقم الحديث (۴۶) صحیح سنن ابی داؤد، رقم الحديث (۳۴) سنن ابن ماجہ، رقم الحديث (۳۱۰) مشكاة المصابيح (۱/ ۱۱۱)

② صحیح ابی داؤد، رقم الحديث (۶) صحیح سنن النسائي، رقم الحديث (۳۹) سنن ابن ماجہ، رقم الحديث (۳۱۲) مشكاة المصابيح (۱/ ۱۱۲)

③ صحیح سنن ابی داؤد، رقم الحديث (۳۵) صحیح سنن النسائي، رقم الحديث (۴۹) سنن ابن ماجہ، رقم الحديث (۳۵۸) مشكاة المصابيح (۱/ ۱۱۶)

دوازدهم:

اسی سلسلے کی بارہویں ہدایت یہ ہے کہ جب قضاے حاجت کے بعد وضو کیا جائے تو وضو سے فارغ ہونے کے بعد شرم گاہ پر پانی کا چھینٹا مار دیا جائے، کیوں کہ سنن ابی داؤد و نسائی میں مروی ہے:

«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا بَالَ تَوَضَّأَ، وَنَضَحَ فَرْجَهُ»^(۱)

”نبی اکرم ﷺ نے جب بھی پیشاب کیا اور وضو کیا تو اپنی شرم گاہ پر چھینٹا مارا۔“

ایسے ہی مسند احمد، سنن دارقطنی اور ابن ماجہ میں حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے اس چھینٹا مارنے کی تائید ہوتی ہے، جس میں مذکور ہے:

”جب پہلی مرتبہ حضرت جبرائیل علیہ السلام وحی لے کر وضو اور نماز سکھلانے آئے اور وضو سے فارغ ہوئے تو انھوں نے پانی کا چلو لیا اور شرم گاہ پر چھینٹا مارا۔“^(۲)

چھینٹا مارنے کا بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جنھیں پیشاب کے بعد قطرہ آنے کی شکایت ہو، وہ دور ہو جاتی ہے، ذہن سے شک دور ہو جاتا ہے اور آدمی پورے اطمینان سے نماز ادا کر سکتا ہے۔

سیزدہم:

قضاے حاجت کے آداب میں سے تیرھواں اور آخری ادب یہ ہے کہ رفع حاجت کے لیے بیٹھنے کا انداز یہ ہونا چاہیے کہ دایاں پاؤں کھڑا ہو اور بائیں حسب عادت رکھا ہو اور اس پر ٹیک لگائی ہو۔ اس سلسلے میں مجسم طبرانی کبیر، مستدرک حاکم اور سنن بیہقی میں سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت بھی مروی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

«أَمَرَنَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنْ نَتَوَكَّأَ عَلَى الْيُسْرَى وَ أَنْ نُنْصِبَ الْيُمْنَى»^(۳)

”ہمیں نبی کریم ﷺ نے حکم فرمایا کہ (رفع حاجت کے وقت) ہم اپنا دایاں پاؤں کھڑا رکھیں اور بائیں پر ٹیک لگائیں۔“

(۱) صحیح سنن ابی داؤد، رقم الحدیث (۱۵۲) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۳۰) سنن ابن ماجہ،

رقم الحدیث (۴۶۱) مشکاة المصابیح و صححہ الألبانی (۱/۱۱۶ لشواہدہ)

(۲) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۴۶۲) السلسلۃ الضعیفۃ للألبانی، رقم الحدیث (۳۱۲) مشکاة

المصابیح (۱/۱۱۷-۱۱۸)

(۳) المعجم الکبیر (۷/۱۶۰-۱۶۱) و الأوسط (۱/۳۳۹)

اس روایت کی سند میں تو تابعی اور ان سے روایت کرنے والے دو راوی مجہول ہیں، لہذا اس کی سند تو ضعیف ٹھہری، البتہ یہ انداز طبعی طور پر مفید ہے، کیوں کہ امام ابن قدامہ لکھتے ہیں:

”اس طرح قضاے حاجت میں آسانی رہتی ہے اور زیادہ دیر تک بیٹھے رہنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ (زیادہ دیر بیٹھنا) بواسیر کا سبب بنتا ہے اور اس میں بعض دیگر طبعی نقصانات بھی پائے جاتے ہیں، لہذا مذکورہ انداز ہی مفید مطلب ہے۔ یہی انداز امام ابن المنذر نے ”الأوسط“ میں بھی ذکر کیا ہے۔“^①



① المغني لابن قدامة (١/ ١٥٩)

بعض وضاحتیں

پچھلے اوراق میں ہم نے معلم انسانیت نبی آخر الزمان حضرت محمد ﷺ کے ارشادات کی روشنی میں قضاے حاجت اور طہارت و استنجا کے آداب ذکر کیے ہیں، اسی سلسلے میں دو ایک وضاحتیں بھی ہیں۔
پہلی وضاحت:

ان میں سے پہلی وضاحت یہ ہے کہ صحرا یا کھلی فضا میں رفع حاجت کی شکل میں صرف ڈھیلوں سے استنجا کرنے پر اکتفا بھی جائز ہے اور ٹائلٹ میں صرف پانی سے طہارت کر لینا بھی صحیح بلکہ پہلی صورت سے بہتر ہے۔ پانی نہ ہونے کے وقت ڈھیلے استعمال کیے جائیں، پھر پانی ملنے پر اس سے بھی طہارت کر لی جائے اور دونوں طریقے جمع کر لیے جائیں تو یہ جائز و درست ہی نہیں، بلکہ زیادہ افضل اور بہتر ہے، بہر حال یہ تینوں شکلیں جائز اور ثابت ہیں۔

صرف ڈھیلے اور صرف پانی سے طہارت کی دونوں شکلوں کے دلائل تو آپ کے سامنے آچکے ہیں، جبکہ پہلے ڈھیلے اور پھر پانی سے جواز و فضیلت کا پتا سنن ابی داؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور مسند بزار میں مختصر و مفصل حدیث سے لگتا ہے، جس میں مروی ہے کہ اہل قبا کی تعریف میں سورۃ التوبہ کی آیت (۱۰۸) نازل ہوئی، جس میں ارشادِ الہی ہے:

﴿فِيهِ رَجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَهَّرِينَ﴾

”اس میں ایسے لوگ رہتے ہیں جو بڑے طہارت پسند ہیں اور اللہ خوب طہارت و پاکیزگی رکھنے والوں کو پسند کرتا اور محبوب رکھتا ہے۔“

اس آیت کے نزول کے بعد نبی اکرم ﷺ نے اہل قبا سے مخاطب ہو کر فرمایا:

”اے انصار کے لوگو! اللہ تعالیٰ نے طہارت کے بارے میں تمہاری تعریف فرمائی ہے۔
 بھلا بتاؤ تو تمہاری طہارت کیا ہے؟“

تو انھوں نے جواباً عرض کی کہ ہم نماز کے لیے وضو کرتے ہیں، جنابت سے غسل کرتے ہیں اور (ڈھیلوں کے استعمال کے باوجود) پانی سے استنجا کرتے ہیں۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

« فَهَوَ ذَاكَ، فَعَلَيْكُمْ كُؤُهُ »^① ”تو پھر یہی وجہ تعریف ہے، لہذا تم اس طریقے پر کار بند رہو۔“

یہ روایت سنن ابی داؤد و ترمذی میں قدرے مختصر مروی ہے۔^② ڈھیلوں کے استعمال کے باوجود بعد میں پانی سے استنجا کرنے کے الفاظ مسند بزار میں مروی ہیں۔ سنن ابن ماجہ والی روایت کی سند تو ضعیف ہے، مگر اس کے کئی شواہد موجود ہیں، جن سے اس ضعف کا کسی حد تک ازالہ ہو جاتا ہے۔^③

دوسری وضاحت:

اس سلسلے میں دوسری وضاحت یہ ہے کہ ڈھیلوں اور پانی دونوں سے طہارت کی فضیلت حاصل کرنے یا کسی عادت کے ہاتھوں مجبور ہو کر بعض لوگ طہارت خانوں میں پانی ہونے کے باوجود ڈھیلے بھی ساتھ لے جاتے ہیں، جس سے طہارت خانوں میں غلاظت و گندگی پیدا ہوتی ہے اور بعض اوقات پانی کی نکاسی میں رکاوٹ کا باعث بن کر بدبو پھیلانے کا سبب بھی بنتے ہیں۔ یہ طرز عمل بہر حال ٹھیک نہیں، جہاں پانی میسر ہو، وہاں صرف پانی ہی پر اکتفا کرنا سنت ہے اور اسی میں کفایت ہے، تکلفات مطلوب نہیں ہیں، خصوصاً جبکہ وہ دوسروں کے لیے تکلیف کا باعث بھی بنتے ہوں۔

تیسری اہم وضاحت:

اب یہاں ذرا معلم انسانیت ﷺ کے سکھائے ہوئے ان تمام آداب کو دوبارہ ذہن میں لائیں تو بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ حیاتِ انسانی کا کوئی بھی شعبہ ایسا نہیں ہو سکتا، جس کے بارے میں نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات موجود نہ ہوں۔ یہ اسلامی تعلیمات کی ہمہ گیری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ صحیح مسلم اور مسند احمد (واللفظ لہ) میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے ارشاد سے پتا چلتا ہے کہ انھیں کسی مشرک نے ازراہ مذاق کہا تھا:

① سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۳۵۵)

② صحیح سنن أبی داؤد، رقم الحدیث (۳۴)

③ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: تحقیق مشکاة المصابیح للألبانی (۱/ ۱۸۸) المنتقى مع النیل (۱/ ۱۰۰-۱۰۱)

﴿إِنِّي لَأَرَىٰ صَاحِبِكُمْ يُعَلِّمُكُمْ حَتَّىٰ الْخِرَاءَةِ﴾^①

”میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارا ساتھی (نبی ﷺ) تمہیں قضاے حاجت تک کے آداب بھی سکھلاتا ہے۔“

اس پر انہوں نے جواب دیا: ہاں! پھر ساتھ ہی اسے وہ آداب بھی بتا دیے۔ اس مشرک نے اگرچہ یہ مذاقاً کہا تھا، مگر یہ بات عقل و فکر اور فہم و دانش کے لیے عبرت کا سامان لیے ہوئے ہے کہ جس دین کی تعلیمات میں اس حد تک ہمہ گیری ہے، اس میں کسی بڑے شعبہ حیات کو نظر انداز کیسے کیا گیا ہوگا؟ ہاں، اگر کوئی اسلامی تعلیمات کو حاصل کرنے کی توفیق نہ رکھتا ہو اور اپنی اس بے توفیقی پر یہ بھی کہہ دے کہ یہ دین موجودہ دور کی ضروریات کے حل پیش نہیں کرتا تو پھر یہ اس دین کا قصور نہیں، بلکہ اس کی اپنی عقل کا فتور ہے۔ اَلُو یا چمگا ڈر اگر دن دھاڑے آنکھ نہ کھول سکیں تو اس میں سورج کی ضیا باریوں پر کیسے شک کیا جاسکتا ہے؟ فاعتبروا یا اولیٰ الأبصار۔



① صحیح مسلم مع شرح النووي (۱۵۲/۳) مشکاة المصابیح (۱/۱۱۹)

اسباب وموجبات یا نواقض وضو

اور

وضو سے قبل چند امور

حدث اصغر جس کے اسباب وموجبات بول و براز، نیند، خروج ہوا، خروج مذی، خروج ودی اور خون استحاضہ وغیرہ ہیں۔ اس حدث کا ازالہ صرف استنجا اور وضو کر لینے ہی سے ہو جاتا ہے۔ جبکہ نیند اور خروج ہوا کے بعد استنجا کی بھی ضرورت نہیں ہوتی، محض وضو کر لینا ہی کافی ہو جاتا ہے۔ وضو کا نبی کریم ﷺ سے ثابت شدہ صحیح احادیث میں جو مسنون طریقہ بتایا گیا ہے، اس کی تفصیل میں جانے سے پہلے چند امور کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

1 ہاتھ دھونا:

پہلا یہ کہ اگر کوئی شخص سو کر نہیں اٹھا، بلکہ حالتِ بیداری ہی میں ہے تو وہ پانی کے برتن سے بلا توقف جب چاہے یا جب ضرورت ہو وضو کر لے، لیکن اگر کوئی شخص سو کر اٹھا ہو اور کسی ٹب یا برتن سے وضو کرنا ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس برتن میں اس وقت تک ہاتھ نہ ڈالے، جب تک پہلے کسی چیز سے پانی نکال کر اپنے ہاتھوں کو نہ دھولے، کیوں کہ صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتب حدیث میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

« إِذَا اسْتَيْقَظَ أَحَدُكُمْ مِنْ نَوْمِهِ فَلَا يَغْمَسُ يَدَهُ فِي الْإِنَاءِ حَتَّىٰ يَغْسِلَهَا فَإِنَّهُ لَا يَدْرِي أَيَّنَ بَاتَتْ يَدُهُ »^①

① صحیح البخاری مع الفتح، رقم الحدیث (۱۶۲) صحیح مسلم مع شرح النووي (۳/ ۱۷۸ - ۱۷۹) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (۹۶) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۲۳) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۳۹۳) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۱) مشکاة المصابیح (۱/ ۱۲۵)

”جب تم میں سے کوئی شخص نیند سے بیدار ہو تو وہ اپنا ہاتھ پانی کے برتن میں نہ ڈالے، یہاں تک کہ پہلے اسے دھو نہ لے، کیوں کہ کیا معلوم کہ نیند کے عالم میں اس کے ہاتھ نے رات کہاں گزاری ہے؟“

یعنی ہو سکتا ہے کہ سوتے میں ہاتھ بدن کے پوشیدہ اعضا کو لگ کر ناپاک ہو گیا ہو۔ اگر اسی حالت میں پانی کے برتن میں ہاتھ ڈال دیا تو وہ پانی بھی متاثر ہوگا۔ اندازہ فرمائیں کہ طہارت اور پاکیزگی کی کتنی عمدہ تعلیم دی جا رہی ہے؟

2 ناک جھاڑنا:

اسی طرح نیند سے بیدار ہونے والے شخص کے لیے صحیح بخاری و مسلم اور سنن میں ایک دوسری ہدایت بھی مذکور ہے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

«إِذَا اسْتَيْقَظَ أَحَدُكُمْ مِنْ مَنَامِهِ فَلْيَسْتَنْثِرْ ثَلَاثًا، فَإِنَّ الشَّيْطَانَ يَبِيْتُ عَلَى خَيْشُومِهِ»^①

”جب تم میں سے کوئی شخص نیند سے بیدار ہو تو اسے چاہیے کہ اپنی ناک کو تین مرتبہ اچھی طرح جھاڑ لے، کیوں کہ شیطان اس کی ناک کے بانسے پر رات گزارتا ہے۔“

سونے والے کی ناک کے بانسے پر شیطان کے رات گزارنے کی کیا کیفیت ہو سکتی ہے؟ اس کی اصل حقیقت تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ ہمارا کام اصرار و رموز کو جاننا، نہیں بلکہ صادق و مصدوق نبی ﷺ کے ارشادات پر ایمان لانا ہے۔ البتہ یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ سونے کے دوران میں فضلات و نجاسات اور غبار و رینڈ وغیرہ دماغ کے قریب جمع ہو جاتے ہیں، جن سے حواس میں تکدر آجاتا ہے اور عبادت میں کاہلی و سستی پیدا ہو جاتی ہے، جس سے شیطان خوش ہوتا ہے اور وہ رات بھر وہیں رہتا ہے۔ لہذا نیند سے بیدار ہو کر طبِ نبوی ﷺ کا یہ نسخہ استعمال کریں۔ اس طرح واقعی شیطان کا عمل دخل ختم ہو جاتا ہے اور ایسا کر لینے کے بعد انسان میں مستعدی و چستی آجاتی ہے۔ اس طرح نبی کریم ﷺ کے مذکورہ ارشاد گرامی کو سمجھنے میں بھی کوئی دقت نہیں رہتی۔

① صحیح البخاری مع الفتح، رقم الحدیث (۳۲۹۵) صحیح مسلم مع شرح النووی (۳/ ۱۲۷) و صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (۹۴) و صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (۸۸)

3 مسواک کرنا:

تیسرا امر یہ ہے کہ نیند سے بیدار ہونے کے بعد وضو کرنے سے پہلے یہ بھی سنت ہے کہ مسواک کی جائے۔ چنانچہ صحیح بخاری و مسلم، سنن نسائی و ابن ماجہ، مسند احمد، سنن دارمی اور بیہقی میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا قَامَ لِلتَّهَجُّدِ مِنَ اللَّيْلِ يَشُوصُ فَاهُ بِالسَّوَاكِ^①»

”نبی کریم ﷺ رات جب نماز تہجد کے لیے بیدار ہوتے تو خوب رگڑ کر مسواک فرماتے تھے۔“

جبکہ سنن ابی داؤد اور مسند احمد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ لَا يَرُقُدُ مِنْ لَيْلٍ وَلَا نَهَارٍ فَيَسْتَيْقِظُ إِلَّا يَتَسَوَّكُ قَبْلَ أَنْ يَتَوَضَّأَ^②»

”نبی کریم ﷺ رات یا دن کو جب بھی سو کر بیدار ہوتے تو وضو کرنے سے قبل مسواک

فرمایا کرتے تھے۔“

البتہ بعض محدثین کرام نے اس حدیث میں «وَلَا نَهَارٍ» کے الفاظ کو ضعیف قرار دیا ہے اور ان کے بغیر اس حدیث کی سند کو حسن کہا ہے۔^③

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دن کو سو کر اٹھنے پر ہو نہ ہو، رات کے سونے کے بعد جب وضو کریں تو پہلے مسواک ضرور کر لیں اور مجموعی طور پر ہر نماز سے قبل وضو کے ساتھ مسواک کرنے کی نبی اکرم ﷺ نے سخت تاکید فرمائی ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم، سنن ابی داؤد، ترمذی و نسائی، مسند احمد، سنن بیہقی اور دارمی میں ارشاد نبوی ﷺ ہے:

«لَوْلَا أَنْ شَقَّ عَلَيَّ أُمَّتِي لَأَمَرْتُهُمْ بِتَأْخِيرِ الْعِشَاءِ وَبِالسَّوَاكِ عِنْدَ كُلِّ صَلَاةٍ^④»

① صحیح البخاری، رقم الحدیث (۲۴۵) صحیح مسلم مع شرح النووی (۱۴۴ / ۳) صحیح سنن ابی داؤد، رقم الحدیث (۴۹) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۲) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۲۸۶) مشکاة المصابیح (۱/۱۲۱)

② صحیح سنن ابی داؤد، رقم الحدیث (۵۱) مسند أحمد (۱۶۰ / ۶) مشکاة تحقیق الألبانی (۱/۱۲۲)

③ مشکاة المصابیح أيضاً، و صحیح سنن ابی داؤد، رقم الحدیث (۵۱)

④ صحیح البخاری، رقم الحدیث (۸۸۷) صحیح مسلم مع شرح النووی (۱۴۳ / ۳) صحیح سنن ابی داؤد، رقم الحدیث (۳۶) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۷) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۲۱) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۲۸۷) مشکاة المصابیح (۱/۱۲۱)

”اگر میں اپنی امت کے لیے باعثِ مشقت نہ سمجھتا تو حکم دے دیتا کہ نمازِ عشا تاخیر سے ادا کریں اور ہر نماز سے قبل مسواک کیا کریں۔“

مسواک کے طبی اور روحانی فوائد:

مسواک کو امورِ فطرت میں شمار کیا گیا ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری و مسلم شریف کی ایک متفق علیہ اور سنن کی حدیث میں پانچ امورِ فطرت شمار کرتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

«الْفِطْرَةُ خَمْسٌ: الْخِتَانُ وَالِاسْتِحْدَادُ وَقَصُّ الشَّوَارِبِ، وَتَقْلِيمُ الْأَظْفَارِ وَتَنْفُ الْإِبِطِ»^(۱)

”امورِ فطرت پانچ ہیں: (۱) ختنہ کرنا۔ (۲) زیرِ ناف بالوں کو صاف کرنا۔ (۳) مونچھوں کو کاٹنا۔ (۴) ناخن تراشنا۔ (۵) بغلوں کے بال اکھاڑنا۔“

جب کہ صحیح مسلم شریف اور سنن میں مزید تفصیل بھی مذکور ہے اور ایک ارشادِ نبوی ﷺ میں دس امورِ فطرت قرار دیا گیا ہے۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«عَشْرٌ مِنَ الْفِطْرَةِ: قَصُّ الشَّوَارِبِ وَإِعْفَاءُ اللَّحْيَةِ، وَالسَّوَاكُ، وَاسْتِنْشَاقُ الْمَاءِ، وَقَصُّ الْأَظْفَارِ، وَغَسْلُ الْبَرَاجِمِ، وَتَنْفُ الْإِبِطِ، وَحَلْقُ الْعَانَةِ، وَانْتِقَاصُ الْمَاءِ، قَالَ الرَّائِي: وَنَسِيتُ الْعَاشِرَةَ إِلَّا أَنْ تَكُونَ الْمَضْمَضَةُ»^(۲)

”دس امورِ فطرت میں سے ہیں: (۱) مونچھوں کو کاٹنا۔ (۲) ڈاڑھی بڑھانا۔ (۳) مسواک کرنا۔ (۴) ناک میں پانی چڑھانا۔ (۵) ناخن تراشنا۔ (۶) انگلیوں کے بنیادی جوڑوں (یعنی ہاتھوں) کو دھونا۔ (۷) بغلوں کے بالوں کو اکھاڑنا۔ (۸) زیرِ ناف بالوں کو اکھاڑنا۔ (۹) استنجا کرنا (پانی سے)۔ راوی حدیث فرماتے ہیں کہ دسویں چیز میں بھول گیا ہوں، غالباً وہ کلی کرنا تھی۔“

(۱) صحیح مسلم مع شرح النووي (۱۴۶ / ۳) صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (۹) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۲۲۱۳) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (۲۹۲) إرواء الغلیل (۱۱۲ / ۱)

(۲) صحیح مسلم مع شرح النووي (۱۴۷ / ۳) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (۴۳) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۲۲۱۴) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (۲۹۳) إرواء الغلیل (۱۲۱ / ۱)

یہیں یہ ضروری وضاحت بھی سن لیں کہ سنن ابی داود میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«وَقَتَّ لَنَا حَلَقَ الْعَانَةِ وَتَقَلَّمَ الْأَظْفَارَ وَقَصَّ الشَّارِبَ وَنَتَفَ الْإِبِطَ أَرْبَعِينَ يَوْمًا مَرَّةً»^(۱)

”ہمارے لیے وقت مقرر کیا گیا ہے کہ ہم (زیادہ سے زیادہ) ہر چالیس دن میں ایک مرتبہ ضرور زیر ناف بالوں کو صاف کریں، ناخن تراشیں، موچھیں کاٹیں اور بغلوں کے بال اکھاڑیں۔“

مسواک کی اہمیت یہی نہیں کہ وہ امورِ فطرت میں سے ہے، بلکہ صحیح بخاری میں تعلیقاً اور سنن نسائی، صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ، سنن دارمی، مسند احمد، مسند شافعی اور سنن کبریٰ بیہقی میں موصولاً مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«السُّوْكَ مَطَهْرَةٌ لِلْفَمِ، مَرَضَةٌ لِلرَّبِّ»^(۲)

”مسواک منہ کے لیے طہارت کا باعث اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا سبب ہے۔“

معجم طبرانی الاوسط کی ایک ضعیف روایت میں یہ الفاظ بھی مروی ہیں:

«مَجْلَاةٌ لِلْبَصَرِ»^(۳) ”نظر کو تیز کرتی ہے۔“

معلوم ہوا کہ صرف سوکر اٹھنے کے بعد ہی نہیں، بلکہ ہر وضو سے پہلے مسواک کر لینا باعثِ اجر و ثواب اور ذریعہ فضیلت ہے، حتیٰ کہ اگر روزہ ہو تو جمہور اہل علم کے نزدیک روزے کی حالت میں بھی ہر وقت مسواک کی جاسکتی ہے، اس سے روزے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔^(۴)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو لکڑی کی اور وہ بھی پیلو کی لکڑی کی مسواک کیا کرتے تھے، جیسا کہ صحیح ابن حبان، مسند احمد، ابو یعلیٰ، بزار، طیالسی، حلیۃ الاولیاء ابو نعیم اور طبرانی میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

(۱) سنن ابی داود (۲/۴/۸۴) طبع مکتبۃ الریاض الحدیثۃ) صحیح سنن ابی داود، رقم الحدیث (۳۵۳۸)

صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۱۴) صحیح سنن الترمذی (۲۲۱۵-۲۲۱۶) سنن ابن ماجہ (۲۹۲)

(۲) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۵) صحیح البخاری تعلیقاً مع الفتح (۴/۸۷) مشکاة المصابیح (۱/۱۲۲)

(۳) إرواء الغلیل (۱/۱۰۵) مگر اس روایت کی سند ضعیف ہے۔

(۴) نیل الأوطار (۱/۱۰۷-۱۰۸)

﴿كُنْتُ أَجْتَنِي لِرَسُولِ اللَّهِ ﷺ سِوَاكَ مِنَ الْأَرَاكِ﴾^①

”میں نبی کریم ﷺ کے لیے اراک (پیلو) کی مسواک کاٹ کر لایا کرتا تھا۔“

اراک یا پیلو کے علاوہ کیکر، شیشم، نیم اور پیپل کی مسواک بھی دانتوں کے لیے طبی طور پر مفید

قرار دی گئی ہے۔



① إرواء الغلیل (۱/ ۱۰۴)

وضو کا مسنون طریقہ

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ احکام و مسائل نماز اور اس کو ادا کرنے کے مسنون طریقے کو مکمل تحقیقات کے ساتھ قدرے مفصل انداز سے ذکر کیا جائے اور نماز کے لیے وضو چونکہ بنیادی حیثیت رکھنے والا عمل بلکہ نماز کی چابی ہے، لہذا وضو کے طریقے سے بات شروع کرتے ہیں۔

فرضیت وضو:

نماز کے لیے وضو فرض ہے، اس کی فرضیت قرآن و سنت اور اجماع امت تینوں مصادر سے ثابت ہے۔ قرآن کریم میں فرضیت وضو کا ذکر سورۃ المائدہ (آیت: ۶) میں مذکور ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ﴾
 ”مومنو! جب تم نماز پڑھنے کا قصد کیا کرو تو منہ اور کہنیوں تک ہاتھ دھولیا کرو اور سر کا مسح کر لیا کرو اور ٹخنوں تک پاؤں (دھولیا کرو)۔“

آیت کے اس حصے میں وضو کے وجوب و فرضیت کے علاوہ طریقہ وضو کے اصول بھی ذکر کر دیے گئے ہیں، جس کی تفصیل نبی اکرم ﷺ کے ارشادات اور عمل میں موجود ہے، جو آگے چل کر ذکر کی جائے گی۔ قرآن کی طرح ہی سنت رسول ﷺ کی رو سے بھی وضو کی فرضیت ثابت ہے اور اس کے بارے میں کئی ایک احادیث مروی ہیں، جن میں سے ایک صحیح بخاری و مسلم، سنن ابی داؤد اور ترمذی شریف میں ہے، جس میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«لَا تَقْبَلُ صَلَاةٌ مِنْ أَحَدٍ حَتَّىٰ يَتَوَضَّأَ»^(۱)

[۱] صحیح البخاری مع الفتح (۱۳۵) صحیح مسلم مع شرح النووی (۱۰۴/۳) صحیح سنن ابی داؤد، رقم الحدیث (۵۴) مشکاة المصابیح بتحقیق الألبانی (۱۰۰/۱) المشکاة مع المرعاة (۳۸۳/۱) طبع سانگلہ.

”جس شخص کا وضو ٹوٹ جائے (یا سرے سے وضو ہی نہ ہو) اللہ تعالیٰ اس کی نماز قبول نہیں کرتا، تا وقتیکہ وہ وضو نہ کر لے۔“

ایسے ہی صحیح مسلم، سنن ترمذی و ابن ماجہ اور مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا تُقْبَلُ صَلَاةٌ بِغَيْرِ طُهُورٍ»^(۱)

”طہارت اور وضو کے بغیر کوئی نماز قبول نہیں کی جاتی۔“

یہی حدیث سنن ابی داؤد، نسائی اور ابن ماجہ میں ابو یلیح کے والد سے اور سنن ابن ماجہ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ اور ابو بکرہ رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔^(۲)

فضیلتِ وضو:

وضو کی فضیلت کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے متعدد ارشادات ثابت ہیں، جن میں سے ایک صحیح مسلم اور مسند احمد میں حضرت ابو امامہ باہلی، حضرت عمرو بن عنبسہ رضی اللہ عنہما ”رابع أربعة في الاسلام“ سے بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا:

«أَخْبِرْنِي عَنِ الْوُضُوءِ» ”مجھے وضو کے بارے میں بتائیے!“

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ يَقْرُبُ الْوُضُوءَ ثُمَّ يَتَمَضَّمُ وَيَسْتَنْشِقُ وَيَسْتَنْشِرُ إِلَّا خَرَجَتْ خَطَايَاهُ مِنْ فَمِهِ وَخِيَا شِيمِهِ مَعَ الْمَاءِ حِينَ يَسْتَنْشِرُ، ثُمَّ يَغْسِلُ وَجْهَهُ كَمَا أَمَرَهُ اللَّهُ تَعَالَى إِلَّا خَرَجَتْ خَطَايَا وَجْهِهِ مِنْ أَطْرَافِ لِحْيَتِهِ مَعَ الْمَاءِ، ثُمَّ يَغْسِلُ يَدَيْهِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ إِلَّا خَرَجَتْ خَطَايَا يَدَيْهِ مِنْ أَطْرَافِ أُنَامِلِهِ، ثُمَّ يَمْسَحُ رَأْسَهُ إِلَّا خَرَجَتْ خَطَايَا رَأْسِهِ مِنْ أَطْرَافِ شَعْرِهِ مَعَ الْمَاءِ، ثُمَّ يَغْسِلُ قَدَمَيْهِ إِلَى الْكَعْبَيْنِ كَمَا أَمَرَهُ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ إِلَّا

(۱) صحیح مسلم مع شرح النووی (۳/ ۱۰۲) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۱) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۲۷۲) حوالہ جات سابقہ ایضاً۔

(۲) صحیح سنن أبی داؤد، رقم الحدیث (۵۳) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۱۳۵) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۲۷۳-۲۷۴-۲۷۱) المرعاة (۱/ ۳۸۴)

خَرَجَتْ خَطَايَا قَدَمَيْهِ مِنْ أَطْرَافِ أَصَابِعِهِ مَعَ الْمَاءِ»

”تم میں سے کوئی شخص جب وضو کرنے لگتا ہے اور پھر کلی کرتا ہے، ناک میں پانی چڑھاتا ہے اور ناک جھاڑ کر صاف کرتا ہے تو اس کے منہ اور ناک کے تمام گناہ اس پانی کے ساتھ ہی بہہ جاتے ہیں، جس کے ساتھ منہ اور ناک کو صاف کیا ہوتا ہے۔ پھر جب وہ اپنا منہ دھوتا ہے، جیسا کہ اللہ کا حکم ہے تو اس کی ڈاڑھی کے اطراف سے اس کے چہرے کی تمام خطائیں بھی پانی سے دھل جاتی ہیں۔ پھر جب وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو کہنیوں تک دھوتا ہے، تو ان دونوں ہاتھوں کے گناہ اس کی انگلیوں کے پوروں کے راستے نکل جاتے ہیں، پھر جب وہ اپنے سر کا مسح کرتا ہے تو اس کے سر کی تمام خطائیں اس کے بالوں کے راستے پانی کے ساتھ ہی مٹ جاتی ہیں، پھر جب وہ حکم الہی کے مطابق دونوں پاؤں کو ٹخنوں تک دھوتا ہے تو اس کے پاؤں کی تمام خطائیں پاؤں کی انگلیوں کے راستے پانی کے ساتھ ہی بہہ جاتی ہیں۔“

اسی حدیث میں آگے یہ بھی مذکور ہے کہ جب کوئی شخص مسنون طریقے سے وضو کر کے اللہ کے حضور کھڑے ہو کر دو رکعت نماز ”تحیۃ الوضوء“ ادا کرتا ہے تو اس کی یہ حالت ہوتی ہے:

«خَرَجَ مِنْ ذَنْبِهِ كَهَيئَتِهِ يَوْمَ وُلِدَتْهُ أُمُّهُ»^(۱)

”وہ گناہوں سے اس طرح پاک ہو جاتا ہے، گویا آج ہی اس کی ماں نے اسے جنم دیا ہو۔“

جب کہ صحیح مسلم اور دیگر کتب حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں اس بات کی وضاحت بھی موجود ہے کہ یہ صغیرہ گناہوں سے پاک ہونا ہے، کیوں کہ اس حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے «إِذَا اجْتَنَبْتَ الْكَبَائِرَ» کی شرط بھی عائد فرمائی ہے کہ ”اگر وہ کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرنے والا ہو۔“ تو صغیرہ گناہوں کا یوں کفارہ ہو جائے گا اور بقول قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ تمام اہل سنت کا مذہب یہی ہے کہ کبیرہ گناہ توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتے اور مذکورہ بخشش سے صغیرہ گناہوں کی بخشش مراد ہے۔^(۲)

(۱) الفتح الربانی (۱/ ۲۹۹-۲۰۰) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۱۴۳)

(۲) فتح الباری (۱/ ۲۶۰-۲۶۱) الفتح الربانی ترتیب مسند أحمد (۱/ ۲۰۰)

صحیح مسلم میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے مروی ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«مَا مِنْ أَمْرٍ مُسْلِمٍ تَحْضُرُهُ صَلَاةٌ مَكْتُوبَةٌ فَيُحْسِنُ وُضُوءَهَا وَخَشَوْعَهَا وَرُكُوعَهَا إِلَّا كَانَتْ كَفَّارَةً لِمَا قَبْلَهَا مِنَ الذُّنُوبِ مَا لَمْ يَأْتِ كَبِيرَةً، وَذَلِكَ الدَّهْرُ كُلُّهُ»^①

”جب کسی مسلمان پر کسی فرض نماز کا وقت آ پہنچے تو وہ اس کا وضو، خشوع و خضوع اور رکوع بڑی عمدگی سے پورا کرے تو یہ اس کے پہلے تمام گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا۔ اگر وہ کبیرہ گناہوں کا ارتکاب نہ کیے ہوئے ہو اور یہ کفارہ ذنوب ہر وقت و زمانے کے لیے عام ہے۔ (کسی عہد کے ساتھ خاص نہیں)۔“

صحیح مسلم، سنن نسائی و ابن ماجہ اور مسند احمد میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی اس حدیث کے

الفاظ یوں ہیں:

«مَنْ تَوَضَّأَ فَأَحْسَنَ الْوُضُوءَ خَرَجَتْ خَطَايَاهُ مِنْ جَسَدِهِ حَتَّى تَخْرُجَ مِنْ تَحْتِ أَظْفَارِهِ»^②

”جو شخص مسنون طریقے کے ساتھ اچھی طرح وضو کرے، اس کے جسم کی تمام خطائیں معاف ہو جاتی ہیں، یہاں تک کہ اس کے ناخنوں کے نیچے سے بھی گناہ نکل جاتے ہیں۔“

اس حدیث کو صاحب مشکات شریف نے متفق علیہ لکھ کر صحیح بخاری و مسلم کی طرف منسوب کیا

ہے، مگر یہ حدیث بخاری شریف میں نہیں، بلکہ یہ افراد مسلم میں سے ہے، جیسا کہ ”منہاج المشكاة“

میں شیخ عبدالعزیز ابہری نے، ”هدایة الرواة بتخریج المصابیح و المشكاة“ میں حافظ

ابن حجر عسقلانی رضی اللہ عنہ نے، ”الترغیب و الترہیب“ میں امام منذری نے اور علامہ ابن حجر مکی نے،

ایسے ہی علامہ عبید اللہ رحمانی مبارک پوری نے تحقیق کی ہے۔^③

① صحیح مسلم مع شرح النووي (۱۱۲/۳) مشکاة المصابیح مع المرعاة (۱/۳۶۹-۳۷۰)

② صحیح مسلم مع شرح النووي (۱۳۳/۳) الفتح الربانی (۱/۳۰۴) صحیح الترغیب، رقم الحدیث

(۱۷۷) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۱۴۲-۱۴۳) و سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۲۸۳، ۲۸۵)

میں یہ حدیث عمرو بن عنینہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ المرعاة (۱/۳۶۸)

③ مرعاة المصابیح (۱/۳۶۸)

صحیح مسلم، سنن ترمذی اور موطا امام مالک میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

”جب کوئی مومن مسلمان وضو کرتا ہے اور اپنا چہرہ دھوتا ہے تو اس کے چہرے کی تمام خطائیں مٹ جاتی ہیں، جو وہ شخص اپنی آنکھوں سے کرتا ہے۔ پھر جب وہ ہاتھ دھوتا ہے تو اس کے تمام وہ گناہ بخش دیے جاتے ہیں، جو اُس نے ہاتھوں کے ساتھ کیے ہوتے ہیں، پھر جب وہ پاؤں دھوتا ہے تو وہ تمام گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں، جن کی طرف ان پاؤں سے چل کر گیا تھا۔“

«حَتَّىٰ يَخْرُجَ نَقِيًّا عَنِ الذُّنُوبِ»^①

”یہاں تک کہ وہ شخص (وضو کے ساتھ) تمام گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے۔“

صحیح مسلم، سنن ابی داؤد اور نسائی میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَتَوَضَّأُ فَيُحْسِنُ وُضُوءَهُ ثُمَّ يَقُومُ فَيُصَلِّي رَكَعَتَيْنِ، مُقْبِلًا عَلَيْهِمَا بِقَلْبِهِ وَوَجْهِهِ إِلَّا وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ»^②

”جو مسلمان اچھی طرح وضو کر کے دو رکعت نماز ادا کرتا ہے، جس کے دوران میں توجہ الی اللہ اور قلبی یک سوئی اختیار کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ ایسے شخص کے لیے جنت واجب کر دیتا ہے۔“

ایسے ہی بعض دیگر احادیث میں ایک ایک اعضاء وضو کے پانی کے ساتھ پاک ہونے کا ذکر پایا جاتا ہے، جس سے وضو کی فضیلت و برکت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ یاد رہے کہ یہ تمام فضائل و برکات صرف اُسی وقت حاصل ہوں گی، جب وضو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے مسنون طریقے سے کیا جائے اور اس میں اپنی طرف سے کوئی کمی بیشی نہ کی جائے۔

وضو کا مسنون طریقہ:

وضو کا مسنون طریقہ کیا ہے؟ اس سلسلے میں صحیح بخاری و مسلم، سنن ابی داؤد اور سنن نسائی میں

① صحیح مسلم مع شرح النووی (۳/۱۲۲-۱۳۳) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۲) الموطأ مع المسوی

(۱/۶۹) طبع دار الکتب العلمیة (الفتح الربانی (۱/۲۰۵-۲۰۶) مشکاة المصابیح مع المرعاة (۱/۳۶۹)

② صحیح مسلم مع شرح النووی (۳/۱۸-۱۱۹) صحیح سنن ابی داؤد، رقم الحدیث (۸۰۱) و صحیح

سنن النسائی، رقم الحدیث (۱۴۷) مشکاة المصابیح (۱/۳۷۲)

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«إِنَّهُ تَوَضَّأَ فَأَفْرَغَ عَلَى يَدَيْهِ ثَلَاثًا، ثُمَّ تَمَضَّمَصَّ وَاسْتَنْشَرَ ثَلَاثًا، ثُمَّ غَسَلَ وَجْهَهُ ثَلَاثًا، ثُمَّ غَسَلَ يَدَهُ الْيُمْنَى إِلَى الْمِرْفَقِ ثَلَاثًا، ثُمَّ غَسَلَ يَدَهُ الْيُسْرَى إِلَى الْمِرْفَقِ ثَلَاثًا، ثُمَّ مَسَحَ بِرَأْسِهِ»^①

”انہوں نے وضو کرتے وقت پہلے اپنے دونوں ہاتھوں پر تین مرتبہ پانی بہایا (یعنی اپنے دونوں ہاتھوں کو تین مرتبہ دھویا) پھر انہوں نے تین مرتبہ کلی کی اور تین مرتبہ ہی ناک کو جھاڑا۔ پھر تین مرتبہ اپنا منہ دھویا۔ پھر تین مرتبہ کہنی تک اپنا دایاں ہاتھ دھویا۔ پھر تین مرتبہ ہی کہنی تک اپنا بائیں ہاتھ۔ پھر اپنے سر کا مسح کیا۔“

تمام اعضاے وضو کے دھونے کے ذکر کے ساتھ ساتھ ہی تین تین بار کے الفاظ بھی وارد ہیں، مگر سر کے مسح کے ساتھ تین بار کا ذکر نہیں، بلکہ صحیحین میں اس حدیث کے جتنے بھی طرق ہیں، ان میں سے کسی میں بھی مسح کی تعداد مذکور نہیں ہے۔ لہذا سر کا مسح صرف ایک مرتبہ ہی کر لینا کافی ہے اور یہی جمہور علمائے امت کا مسلک ہے۔^② اس بات کی تائید بخاری شریف کی ایک دوسری حدیث سے بھی ہوتی ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:

«فَمَسَحَ رَأْسَهُ فَأَقْبَلَ بِهِمَا وَأَذْبَرَ مَرَّةً وَاحِدَةً»^③

”انہوں نے اپنے سر کا مسح کیا اور اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے سر کے اگلے حصے سے پھیرتے ہوئے پچھلے حصے تک لے گئے اور پیچھے سے آگے کو لائے اور یہ (مسح) ایک ہی بار کیا۔“

نیز اس بات کا ثبوت سنن اربعہ،^④ مسند احمد، طبرانی اوسط اور سنن بیہقی کی متعدد احادیث میں

① صحیح البخاری مع الفتح، رقم الحدیث (۱۵۹) صحیح مسلم مع شرح النووي (۱/ ۳ / ۱۰۵ - ۱۱۰)

صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (۹۷) صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (۸۲ - ۸۳)

② المرعاة (۱/ ۲۷۱)

③ صحیح البخاری مع الفتح، رقم الحدیث (۱۸۶) مشکاة المصابیح مع المرعاة (۱/ ۴۵۷)

④ صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (۱۰۲) صحیح الترمذی، رقم الحدیث (۳۱ - ۴۴) صحیح سنن

النسائي، رقم الحدیث (۹۰) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (۴۳۵ - ۴۳۶ - ۴۳۷)

بھی مذکور ہے۔ بعض روایات میں تین مرتبہ سر کا مسح کرنے کا ذکر آیا ہے اور بعض میں دو مرتبہ مسح کا ذکر، وہ احادیث ضعیف ہیں۔^①

مسحِ راس کے بعد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے وضو کو بیان کرنے والے راوی فرماتے ہیں:

«ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَهُ الْيُمْنَى ثَلَاثًا، ثُمَّ الْيُسْرَى ثَلَاثًا، (وَقَالَ): رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ تَوَضَّأَ نَحْوَ وَضُوءِي هَذَا (فَقَالَ): مَنْ تَوَضَّأَ نَحْوَ وَضُوءِي هَذَا، ثُمَّ يُصَلِّي رُكْعَتَيْنِ، لَا يُحَدِّثُ نَفْسَهُ فِيهَا بِشَيْءٍ، غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ»^②

”پھر انھوں نے تین مرتبہ اپنا دایاں پاؤں دھویا۔ پھر تین مرتبہ ہی بائیں دھویا۔ پھر فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے کہ آپ ﷺ نے میرے اس وضو کی طرح وضو کیا اور فرمایا: جو شخص میرے اس وضو کی طرح وضو کرے، پھر دو رکعتیں ایسے خشوع و خضوع سے پڑھے، جن کے دوران میں وہ اپنے آپ سے باتیں نہ کرے (یعنی آر پار کی سوچوں میں نہ کھوجائے) تو اس کے پہلے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔“

صحیح بخاری و مسلم میں مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن زید بن عاصم رضی اللہ عنہ سے کہا گیا: ہمارے سامنے نبی مکرم ﷺ کے وضو کی کیفیت عملی طور پر بیان کریں تو انھوں نے پانی کا برتن منگوایا، اس سے اپنے ہاتھوں پر پانی انڈیل کر انھیں تین مرتبہ دھویا۔ پھر اپنا (دایاں) ہاتھ پانی کے برتن میں ڈال کر اس سے پانی نکالا اور ایک ہی چلو سے کلی کی اور ناک میں پانی چڑھایا۔ یہ فعل تین مرتبہ دہرایا۔ پھر ہاتھ ڈال کر پانی نکالا اور تین مرتبہ منہ دھویا۔ پھر ہاتھ ڈال کر پانی نکالا اور کہنیوں سمیت اپنے دونوں ہاتھوں کو دو مرتبہ دھویا۔ پھر ہاتھ ڈال کر پانی نکالا اور اپنے سر کا مسح کیا (اور وہ یوں کہ) اپنے دونوں ہاتھوں کو سر کے اگلے حصے سے پچھلے حصے تک (بالوں پر پھیرتے ہوئے) لے گئے۔ پھر اپنے دونوں پاؤں کو ٹخنوں تک دھویا اور فرمایا:

① فتح الباری (۱/۲۶۰) نیل الأوطار (۱/۱۸۶-۱۸۸) عون المعبود، تہذیب السنن لابن القیم۔

② صحیح البخاری مع الفتح (۱۵۹) صحیح مسلم مع شرح النووی (۳/۱۰۷-۱۰۸) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (۹۷) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۸۳) منتقى الأخبار مع نیل الأوطار (۱/۱۳۹/۲) مشکاة المصابیح مع المرعاة (۱/۳۷۰-۳۷۱)

«هَكَذَا كَانَ وُضُوءَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ»^① ”رسول اللہ ﷺ کا وضو اسی طرح تھا۔“

اس حدیث میں کلی کرنے اور ناک میں پانی چڑھانے کا ذکر موجود ہے، مگر ناک جھاڑنے کا ذکر نہیں، جبکہ اس سے پہلی حدیث میں جھاڑنے کا ذکر تھا، ناک میں پانی چڑھانے کا لفظ نہیں تھا۔ البتہ صحیح بخاری و مسلم ہی کی ایک دوسری حدیث میں ہے:

«فَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ وَاسْتَنْشَرَ ثَلَاثًا بِثَلَاثِ غُرْفَاتٍ مِنْ مَاءٍ»^②

”انہوں نے تین مرتبہ کلی کی، ناک میں پانی چڑھایا اور ناک کو جھاڑ کر صاف کیا، پانی کے صرف تین چلوؤں سے۔“

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایک ہی چلو سے کلی بھی کی اور اسی سے ناک میں پانی چڑھا کر اسے صاف بھی کیا۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ پانی کا چلو لے کر اس کے آدھے حصے کو کلی کے لیے منہ میں ڈال لیا جائے اور بقیہ آدھے کو ناک میں چڑھایا جائے اور اسے جھاڑ کر صاف کیا جائے۔ یہ عمل تین مرتبہ دہرایا جائے۔

اعضائے وضو کو دھونے کی تعداد:

اعضائے وضو کو کتنی مرتبہ دھویا جائے؟ اس سلسلے میں نبی اکرم ﷺ سے تین قسم کی احادیث صحیح بخاری و مسلم میں مروی ہیں۔ تین تین بار دھونے کی، دو دو بار دھونے کی اور ایک ایک ہی بار دھونے کی بھی احادیث موجود ہیں۔ مثلاً صحیح مسلم اور مسند احمد میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے مدینہ منورہ کے قریب ایک مقام ”مقاعد“ پر وضو کرتے ہوئے فرمایا:

«أَلَا أُرِيكُمْ وُضُوءَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ ثُمَّ تَوَضَّأَ ثَلَاثًا»^③

”کیا میں تمہیں نبی اکرم ﷺ کی طرح وضو کر کے نہ دکھاؤں؟ پھر انہوں نے تمام اعضا کو تین تین بار دھویا۔“

① صحیح البخاری مع الفتح (۹۱) صحیح مسلم مع شرح النووي (۱۲۳/۳) مشکاة المصابیح بتحقیق الألبانی (۱/۱۲۵-۱۲۶)

② صحیح البخاری مع الفتح، رقم الحدیث (۱۹۲) صحیح مسلم مع شرح النووي (۱۲۳/۳-۱۲۴) مشکاة المصابیح أيضاً.

③ صحیح مسلم مع شرح النووي (۱۱۴/۳/۲)

اس موضوع کی دیگر احادیث بھی متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں، جنہیں علامہ عینی نے ”عمدة القاري“ میں جمع کر دیا ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ تَوَضَّأَ مَرَّتَيْنِ مَرَّتَيْنِ»^①

”نبی اکرم ﷺ نے وضو فرمایا اور تمام اعضا کو دو مرتبہ دھویا۔“

یہی حدیث مسند احمد میں بھی مروی ہے اور سنن ابی داؤد و ترمذی اور صحیح ابن حبان میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی اسی سیاق و مفہوم کی ایک حدیث مروی ہے۔^②

صحیح بخاری (باب غسل الوجه باليدين من غرفة واحدة) میں، اسی طرح سنن ابی داؤد میں مختصراً و مطولاً اور سنن ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور مسند احمد میں مختصراً حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں:

«تَوَضَّأَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ مَرَّةً مَرَّةً [وَلَمْ يَزِدْ عَلَى هَذَا]»^③

”نبی اکرم ﷺ نے وضو فرمایا اور تمام اعضاے وضو کو ایک ایک مرتبہ دھویا [اور اس پر زیادہ نہیں کیا]۔“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے یہ الفاظ «وَلَمْ يَزِدْ عَلَى هَذَا» کہ ”آپ ﷺ نے ایک ایک مرتبہ سے زیادہ نہیں کیا۔“ اس بات کی دلیل ہیں کہ وہ یا تو اسی وضو کے بارے میں ہیں، جو انھوں نے ایک موقع پر دیکھا، یا پھر یہ بات ان کی معلومات کی حد تک عام ہے۔ ورنہ صحیح احادیث میں ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے تمام اعضاے وضو کو دو بار اور تین تین بار بھی دھویا ہے، بلکہ ایک حدیث میں تو یہ بھی مذکور ہے کہ آپ ﷺ نے بعض اعضا کو تین تین بار اور اسی وضو کے دوران میں بعض اعضا کو دو بار دھویا تھا۔ بہر حال تمام اعضاے وضو کو صرف ایک ایک بار دھولینا۔ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما

① صحیح البخاری مع الفتح (۱۵۸) مشکاة المصابیح (۱/۱۲۶)

② فتح الباری (۱/۲۵۹) المرعاة (۱/۴۵۸)

③ صحیح البخاری، رقم الحدیث (۱۵۷) صحیح سنن ابی داؤد، رقم الحدیث (۱۲۶) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۳۹) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۷۸) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۴۱۱) مشکاة المصابیح مع المرعاة (۱/۴۵۸) سوائے مشکات کے دوسری کتابوں کی مذکورہ احادیث میں ”ولم یزد علیٰ هذا“ کے الفاظ نہیں ہیں۔

کے علاوہ متعدد دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی احادیث سے بھی ثابت ہے۔ ان احادیث کو امام شوکانی رضی اللہ عنہ نے ”نبیل الأوطار“ میں جمع کر دیا ہے اور ان کی اسانید پر کلام بھی کیا ہے۔^①

ایک ایک مرتبہ اعضا کو دھونے والی احادیث ذکر کرنے کے بعد امام شوکانی رضی اللہ عنہ لکھتے ہیں کہ یہ اس بات کی دلیل ہیں کہ وضو کے لیے صرف ایک ایک مرتبہ ہی اعضاے وضو کو دھونا واجب ہے۔ اسی لیے آپ ﷺ نے اس پر اکتفا کیا ہے۔ اگر دو دو مرتبہ یا تین تین مرتبہ دھونا واجب ہوتا تو پھر آپ ﷺ ایک ایک مرتبہ دھونے پر ہرگز اکتفا نہ کرتے۔ امام نووی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس بات پر مسلمانوں کا اجماع ہے کہ تمام اعضاے وضو کو ایک ایک مرتبہ دھونا تو واجب ہے اور تین مرتبہ دھونا سنت ہے۔^②

گویا یہ تینوں طریقے ثابت اور جائز ہیں۔ البتہ نبی اکرم ﷺ کا اکثر معمول تین تین بار دھونا تھا اور بیان جواز کے لیے آپ ﷺ نے دو دو مرتبہ اور ایک ایک بار بھی دھویا اور تین تین بار دھونا اکمل ہے۔^③

تین بار سے زیادہ دھونے کی ممانعت:

تین مرتبہ سے زیادہ دھونا وسواسی قسم کے لوگوں کا کام ہے۔ انھیں یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اعضاے وضو سے اگر کوئی چیز تین مرتبہ دھونے سے بھی زائل نہیں ہوتی تو وہ پچاس مرتبہ دھونے سے بھی زائل نہیں ہوگی۔ مسلسل کتنی کتنی دیر تک پانی بہانے بلکہ ضائع کرتے رہنے سے کیا حاصل؟ پھر نبی اکرم ﷺ نے اس فعل سے منع کیا ہے۔

محدثین کرام رضی اللہ عنہم نے تین مرتبہ سے زیادہ اعضاے وضو کو دھونے کے مکروہ ہونے کے باقاعدہ باب قائم کیے ہیں اور ان کی دلیل وہ حدیث ہے، جسے امام ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ، ابن خزیمہ اور احمد نے روایت کیا ہے۔ حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ اور دادا کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ ایک اعرابی نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے آپ ﷺ سے وضو کا طریقہ پوچھا۔ آپ ﷺ نے اسے تین تین مرتبہ اعضاے وضو کو دھونے کی تعلیم فرمائی اور آخر میں فرمایا:

① نبیل الأوطار (۱/۱) ۲۰۲-۲۰۳

② نبیل الأوطار (۱/۱) ۲۰۳

③ مرعاة المفاتیح (۱/۸) ۴۵۸

«هَذَا الْوُضُوءُ، فَمَنْ زَادَ عَلَيَّ هَذَا فَقَدْ أَسَاءَ وَتَعَدَّى وَظَلَمَ»^①

”یہ وضو ہے اور جو اس سے زیادہ مرتبہ دھوئے، اس نے برا کیا، زیادتی کی اور ظلم کیا۔“
اس برائی، زیادتی اور ظلم کی اہل علم نے متعدد توجیہات بیان کی ہیں، جن میں حد سے تجاوز، ترکِ اولیٰ اور ترکِ سنت کی وجوہات ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ نے ”التلخیص الحبیر فی تخریج أحادیث الرافعی الكبير“ میں اور امام شوکانیؒ نے ”نیل الأوطار“ میں وہ توجیہات ذکر کی ہیں۔
امام ابن مبارکؒ ایسے شخص کے بارے میں فرماتے ہیں:
”جو شخص دورانِ وضو تین سے زیادہ مرتبہ اعضاے وضو دھوئے، مجھے خدشہ ہے کہ وہ گناہ گار ہوگا۔“

امام احمد اور امام اسحاق ابن راہویہؒ سے منقول ہے:

«لَا يَزِيدُ عَلَيَّ ثَلَاثٍ إِلَّا رَجُلٌ مُّبْتَلَى»^②

”تین مرتبہ سے زیادہ اعضاے وضو کو دھونے والا شخص بتلائے وہم اور مریضِ وسواس ہے۔“
ہاں! یہاں یہ بات بھی واضح کر دیں کہ تین سے زیادہ مرتبہ اعضاے وضو کو دھونے والے شخص کو نبی کریم ﷺ نے جس حدیث میں برائی، زیادتی اور ظلم کرنے والا کہا ہے، اس کے طُرُق کو حافظ ابن حجرؒ نے صحیح قرار دیا ہے اور فتح الباری میں اس حدیث کے بارے میں امام ابن خزیمہؒ اور دیگر محدثین کی تصحیح نقل کی ہے۔ دورِ حاضر کے معروف محدث علامہ ناصر الدین البانیؒ نے بھی اسے حسن قرار دیا ہے۔ البتہ سنن ابو داؤد کی روایت میں «فَمَنْ زَادَ عَلَيَّ هَذَا» کے بعد والے الفاظ «أَوْ نَقَصَ» کو منکر یا شاذ قرار دیا ہے۔^③ اس سلسلہ میں امام ترمذیؒ فرماتے ہیں:
«الْعَمَلُ عَلَيَّ هَذَا عِنْدَ عَامَّةِ أَهْلِ الْعِلْمِ أَنَّ الْوُضُوءَ يُجْزَى مَرَّةً، وَمَرَّتَيْنِ أَفْضَلُ، وَأَفْضَلُهُ ثَلَاثًا، وَلَيْسَ بَعْدَهُ شَيْءٌ»^④

① صحیح سنن أبي داود، رقم الحديث (۱۲۳) صحیح سنن النسائي، رقم الحديث (۱۳۶) سنن ابن

ماجه، رقم الحديث (۴۲۳) المنتقى مع النيل (۱/۱/۲۰۳)

② نيل الأوطار (۱/۱/۲۰۴)

③ صحیح سنن أبي داود، رقم الحديث (۲۸/۱) نيل الأوطار (۱/۱/۲۰۳) و تحقيق المشكاة (۱/۱۳۱)

④ سنن الترمذي مع التحفة (۱/۱۰۹)

”عام اہل علم کے نزدیک اسی بات پر عمل ہے کہ ایک ایک مرتبہ اعضاے وضو کو دھونا کافی ہے اور دو مرتبہ افضل اور تین تین مرتبہ دھونا افضل ترین ہے اور اس کے بعد کچھ (جائز) نہیں ہے۔“

سنن ابی داؤد و ابن ماجہ اور مسند احمد میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے نے دعا کرتے ہوئے کہا: اے اللہ! میں تجھ سے جنت کے دائیں گوشے میں سفید محل کا سوال کرتا ہوں تو حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اے بیٹے! اللہ سے جنت کا سوال اور جہنم سے پناہ کی دعا کرو، کیوں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

«إِنَّهُ سَيَكُونُ فِي هَذِهِ الْأُمَّةِ قَوْمٌ يَعْتَدُونَ فِي الطُّهُورِ وَالِدُّعَاءِ»^①

”بے شک اس امت میں ایک ایسی قوم ہوگی، جو دعا اور طہارت میں حدود سے تجاوز کریں گے۔“ وضو میں وسواس کا شکار ہو کر بکثرت پانی بہانا بھی حد سے تجاوز اور ممنوع ہے، بلکہ ایک روایت میں تو وضو کے دوران میں وسوسے میں مبتلا کرنے والے شیطان کا نام ”ولہان“ بھی ملتا ہے، مگر وہ روایت سخت ضعیف ہے۔^②

ویسے بھی صحیح بخاری اور سنن ترمذی میں ایک حدیث ہے:

«كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَتَوَضَّأُ بِالْمَدِّ، وَيَغْتَسِلُ بِالصَّاعِ»^③

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مد پانی سے وضو کرتے اور ایک صاع پانی سے غسل فرماتے تھے۔“ اگر پانی اس مسنون مقدار میں استعمال کرنا مشکل ہو تو کم از کم اتنا بھی تو نہ بہا یا جائے جو فضول اور اسراف میں داخل ہو۔ اس مفہوم کی ایک حدیث بھی مروی ہے، مگر وہ ضعیف ہے۔^④



① صحیح سنن أبی داؤد، رقم الحدیث (۸۷) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۳۸۶۴) لیکن سنن ابن ماجہ کی حدیث میں «يعتدون في الطهور» کے الفاظ نہیں ہیں۔ مشکاة المصابیح (۱/۱۳۱) و صححہ الألبانی.

② تحقیق مشکاة المصابیح (۱/۱۳۱)

③ صحیح البخاری مع الفتح (۲۰۱) سنن الترمذی مع تحفة الأحوذی (۱/۱۸۳-۱۸۸)

④ مشکاة المصابیح بتحقیق الألبانی (۱/۱۳۳) و تحقیق زاد المعاد (۱/۱۹۱)

وضو کے ارکان و فرائض اور سنن و مستحبات

وضو کے ارکان و فرائض:

یہاں تک تو نبی اکرم ﷺ کے وضو کا مسنون طریقہ ہے، جس میں وضو کے وہ چاروں ارکان یا فرائض آگئے ہیں، جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۃ المائدہ (آیت: ۶) میں فرمایا ہے۔ وہ چاروں ارکان یا فرائض وضو یہ ہیں:

- ① چہرہ دھونا۔
- ② دونوں ہاتھوں کو کہنیوں تک دھونا۔
- ③ سر کا مسح کرنا۔
- ④ دونوں پاؤں کو ٹخنوں تک دھونا۔

وضو کے سنن و مستحبات:

مذکورہ بالا چاروں امور کے علاوہ نبی اکرم ﷺ جن امور کا اہتمام فرماتے اور اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو جن کا حکم دیتے یا ترغیب دلاتے تھے، وہ وضو کے آداب و سنن اور مستحبات کہلاتے ہیں۔ ان سے وضو کی تکمیل ہوتی ہے، لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مسائل و احکام وضو کی تمام ضروری تفصیلات آپ کے سامنے ترتیب کے ساتھ رکھ دی جائیں، تاکہ نبی کریم ﷺ کے بتائے ہوئے مسنون وضو کے بارے میں کوئی اشکال اور تشکیک باقی نہ رہے، کیوں کہ نماز جیسے اہم رکن دین کی اساس و بنیاد تو یہ وضو ہی ہے، بلکہ سنن ترمذی اور مسند احمد میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ایک ضعیف السند حدیث میں مذکور ہے:

«مِفْتَاحُ الْجَنَّةِ الصَّلَاةُ، وَمِفْتَاحُ الصَّلَاةِ الطَّهْوَرُ»^①

”جنت کی چابی نماز ہے اور نماز کی چابی وضو۔“

① سنن الترمذی، رقم الحدیث (۴) مشکاة المصابیح (۱/۹۷) ضعیف الجامع، رقم الحدیث (۵۲۷۰)

اس حدیث کی سند کو ضعیف قرار دیا گیا ہے۔ البتہ اس کے جزو ثانی یعنی نماز کی چابی وضو ہے، اس کی شاہد ایک حدیث حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔^(۱) لہذا ان الفاظ کی تائید اس شاہد سے بھی ہوگئی۔ اسی لیے ہم نے اس حدیث کے الفاظ ذکر کر دیے ہیں، ورنہ اگر سنن ترمذی اور مسند احمد والی صرف مذکورہ حدیث جابر رضی اللہ عنہ ہی ہوتی تو وہ قابلِ حجت نہیں تھی۔

1 نیت:

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ دیگر عبادات کی طرح وضو کے لیے بھی نیت شرط ہے، کیوں کہ صحیح بخاری و مسلم، سنن اربعہ اور اکثر کتب حدیث میں خلیفہ ثانی امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ارشاد نبوی ﷺ ہے:

«إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ»^(۲) ”تمام اعمال کا دارو مدار نیتوں پر ہے۔“

اس حدیث کی عظمت و رفعت:

یہ صحیح بخاری کی سب سے پہلی حدیث ہے اور اس کے علاوہ بھی چھ دوسرے مقامات پر امام بخاری رضی اللہ عنہ نے اپنی صحیح میں اسے وارد کیا ہے۔ ائمہ کرام سے تو اتر کے ساتھ اس حدیث کی عظمت و اہمیت منقول ہے، حتیٰ کہ امام بخاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کی احادیث میں جامع و مانع اور کثیر الفائدہ ہونے کے اعتبار سے اس حدیث کا مقابلہ دوسری کوئی حدیث نہیں کر سکتی۔ امام شافعی، عبد الرحمن بن مہدی، احمد بن حنبل، علی بن مدینی استاذ امام بخاری، ابو داؤد، ترمذی، دارقطنی اور حمزہ الکنانی رضی اللہ عنہم نے بالاتفاق اس حدیث کو اسلام کا ایک تہائی حصہ قرار دیا ہے۔ بعض علما نے کل احکام اسلام کا ایک چوتھائی اس حدیث کو کہا ہے۔

امام ابن مہدی کہتے ہیں کہ یہ حدیث علم کے تیس ابواب پر مشتمل ہے۔ امام شافعی رضی اللہ عنہ نے اسے علم دین کے ستر ابواب پر مشتمل قرار دیا ہے اور امام بیہقی رضی اللہ عنہ نے اسے احکام اسلام کا ایک تہائی

(۱) صحیح سنن أبي داود، رقم الحديث (۵۵) صحیح سنن الترمذی، رقم الحديث (۳) سنن ابن ماجہ، رقم الحديث (۲۷۵) تحقیق مشکاة المصابیح (۹۷/۱)

(۲) صحیح البخاری مع الفتح (۹/۱) صحیح سنن أبي داود، رقم الحديث (۱۹۲۷) صحیح سنن النسائی، رقم الحديث (۷۳، ۳۲۱۵، ۳۵۵۲) صحیح سنن الترمذی، رقم الحديث (۱۳۴۴) المنتقی مع النیل (۱۵۶/۱/۱)

حصہ ثابت کرنے کے لیے لکھا ہے کہ انسان کا کسب و عمل تین ہی اشیا سے وقوع پذیر ہوتا ہے، جن میں پہلی چیز دل، دوسری زبان اور تیسری اعضاے جسمانی ہیں اور نیت ان تین میں سے ایک بلکہ راجح ہے، لہذا یہ حدیث ”ثالث العلم“ ہوئی۔

امام احمد رضی اللہ عنہ نے اس کے ثالث العلم ہونے کی ایک دوسری توجیہ بیان کی ہے کہ اسلام کے احکام جن تین قواعد کے گرد گھومتے ہیں، ان میں سے ایک قاعدہ اس حدیث میں مذکور ہے، لہذا یہ ثالث العلم ہے۔ ایسی ہی احادیث میں سے دوسری حدیث صحیح بخاری و مسلم میں مذکور ہے:

«الْحَلَالُ بَيْنَ وَالْحَرَامِ بَيْنٌ وَبَيْنَهُمَا أُمُورٌ مُّشْتَبِهَاتٌ»^①

” (اسلام میں) حلال و حرام واضح ہیں اور ان دونوں (حرام و حلال) کے درمیان مشتبہ امور ہیں۔“

اس سلسلے کی تیسری حدیث وہ ہے، جس میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«مَنْ حَسُنَ إِسْلَامَ الْمَرْءِ تَرَكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ»^②

”کسی کے حسن اسلام کی علامت یہ ہے کہ وہ لایعنی امور کو ترک کر دے۔“

بعض علما نے اس حدیث کو احکام و علم دین کا ایک چوتھائی حصہ قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک

چوتھی حدیث وہ ہے، جس میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ يُحِبَّ لِأَخِيهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ»^③

”اس وقت تک کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا، جب تک وہ اپنے دوسرے مسلمان بھائی کے

لیے وہی چیز پسند نہ کرے، جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔“

بعض اہل علم نے اس کے بجائے چوتھی حدیث اسے قرار دیا، جس میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

① صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۹۶۳) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۳۹۸۴) صحیح الجامع،

رقم الحدیث (۳۱۹۳)

② صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۱۸۸۶-۱۸۸۷) سنن ابن ماجہ (۳۹۷۶) صحیح الجامع (۵۹۱۱)

③ صحیح البخاری مع الفتح (۱۳) صحیح مسلم مع شرح النووي (۱۷/۲-۱۶) صحیح سنن الترمذی،

رقم الحدیث (۲۰۴۲) صحیح سنن النسائی (۳۶۴۳) صحیح الجامع، رقم الحدیث (۸۳-۷۵)

«إِزْهَدُ فِي الدُّنْيَا يُحِبُّكَ اللَّهُ، وَازْهَدْ فِيمَا أَيْدِي النَّاسِ يُحِبُّكَ النَّاسُ»^①

”مال و متاع دنیا کی محبت چھوڑ دو، اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا اور جو کچھ لوگوں کے پاس ہے، اسے لپٹائی ہوئی نظروں سے دیکھنا چھوڑ دو تو لوگ بھی تم سے محبت کرنے لگیں گے۔“

نیت کے مسئلے سے تعلق رکھنے والی اس حدیث کے مقام و مرتبے کی عظمت و رفعت کے پیش نظر یہ تھوڑی سی تفصیل بھی آگئی ہے۔ بہر حال امام ابن قدامہ رحمہ اللہ ”المغنی“ میں لکھتے ہیں:

”وضو بھی ایک عبادت ہے اور کوئی عبادت نیت کے بغیر نہیں ہوتی، کیوں کہ اس سے مقصود اللہ تعالیٰ کا تقرب، اس کی اطاعت اور اس کے فرمان کی بجا آوری ہوتا ہے اور یہ بغیر نیت حاصل نہیں ہو سکتا۔“^②

امام ابو البرکات الحداد نے ”المنتقى“ میں اسی حدیث «إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ» پر جو عنوان ذکر کیا ہے، وہ یہ ہے: ”باب الدليل على وجوب النية له“، یعنی ”وضو کے لیے نیت کے واجب ہونے کی دلیل کا بیان۔“ اس حدیث کی شرح بیان کرنے کے بعد امام شوکانی رحمہ اللہ ”نیل الأوطار شرح منتقى الأخبار“ میں لکھتے ہیں:

”یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ نیک اعمال میں نیت شرط ہے۔“^③

نیت کے الفاظ کی شرعی حیثیت:

یہاں یہ بات ذہن میں رکھیں کہ وضو کی نیت تو واجب یا شرط ہے، مگر اس کے لیے یہ درست نہیں کہ کوئی شخص اس نیت کے الفاظ بھی ادا کرے اور اس پر بیٹانی میں مبتلا ہو جائے کہ نیت کے الفاظ کیا ہیں؟ زبانی یاد کرنے پڑیں گے، یاد بھی ہوں گے یا نہیں؟ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی سے بھی نیت کے کوئی بھی الفاظ ثابت نہیں ہیں۔ شارح صحیح مسلم امام نووی رحمہ اللہ اور دیگر علما کا کہنا ہے کہ نیت دل کا فعل ہے نہ کہ زبان کا، یعنی صرف دل کے

① صحیح البخاری مع فتح الباری (۱۱/۱) صحیح مسلم مع شرح للنووي (۶/۱۱/۲۹) تحقیق و تعلق صحیح مسلم از محمد فواد عبدالباقي (۳/۱۲۹-۱۲۲) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (۴۱۰۲) السلسلة الصحيحة، رقم الحدیث (۹۴۴) صحیح الجامع، رقم الحدیث (۹۲۲)

② المغنی (۱/۱۱۳-۱۱۴)

③ نیل الأوطار (۱/۱۳۳)

ارادے سے ہی نیت ہو جاتی ہے، زبان سے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے ”زاد المعاد فی ہدی خیر العباد“ میں بالتحقیق ذکر کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وضو کے شروع میں ”نَوَيْتُ رَفَعَ الْحَدِيثِ“ جیسے الفاظ ہرگز ذکر نہیں فرمایا کرتے تھے کہ ”میں نے رفعِ حدث یعنی وضو کرنے کی نیت کی۔“ اور نہ اس قسم کی نیت کسی صحابی سے ثابت ہے اور صرف یہی نہیں کہ یہ الفاظ کسی صحیح حدیث میں نہیں آئے، بلکہ لفظوں میں اس نیت کا ذکر تو کسی ضعیف حدیث میں بھی نہیں ملتا۔^(۱)

شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ جو معروف بزرگ گزرے ہیں، بعض لوگ انھیں گیارہویں والے پیر صاحب بھی کہتے ہیں اور چاند کی ہر گیارہویں تاریخ کو ان کے نام کی گیارہویں کی نیاز دینے کی بدعت پر بڑی پابندی کا مظاہرہ کرتے ہیں، وہ جیلانی بزرگ رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ”غنیۃ الطالبین“ کے پہلے ہی باب میں نیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

”وَمَحَلُّهَا الْقَلْبُ“، ”نیت دل سے کی جاتی ہے۔“ یعنی دلی ارادے کا نام ہی نیت ہے۔

اس سے آگے دلی ارادے کے ساتھ ساتھ موصوف نے زبان سے نیت کرنے کے استحسان کو بھی ذکر کیا ہے، مگر بے دلیل استحسان قابل قبول نہیں ہوتا اور بالآخر اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے:

”وَإِنْ افْتَصَرَ عَلَى الْإِعْتِقَادِ أَجْزَأُ“^(۲)

”اگر دلی ارادے ہی پر قناعت کی جائے تو کافی ہے۔“

بلکہ شرعی نقطہ نظر سے صرف یہی چاہیے کہ دل کے ارادے ہی پر اکتفا کیا جائے اور یہی بات علامہ عبداللہ لکھنوی حنفی رحمۃ اللہ علیہ نے ”عمدۃ الرعاۃ حاشیۃ شرح الوقایۃ“ میں بھی کہی ہے:

”مَحَلُّهَا الْقَلْبُ“، ”نیت کا مقام دل ہے (نہ کہ زبان)۔“

جب کہ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بہشتی زیور کے دوسرے حصے میں نماز کی شرطوں کے بیان میں مسئلہ نمبر (۱۱) کے تحت یوں لکھا ہے:

”زبان سے نیت کرنا ضروری نہیں، بلکہ دل میں جب اتنا سوچ لیوے کہ میں آج ظہر کی

نماز پڑھتی (یا پڑھتا) ہوں اور اگر سنت پڑھتی (یا پڑھتا) ہو تو یہ سوچ لے کہ ظہر کی سنت

(۱) زاد المعاد (۱/۱۹۶)

(۲) غنیۃ الطالبین اردو مترجم مع عربی مولانا راغب رحمانی دہلوی (ص: ۱۸-۱۹) طبع نفیس اکیڈمی، کراچی.

پڑھتی (یا پڑھتا) ہوں۔ بس اتنا خیال کر کے اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ باندھ لیوے تو نماز ہو جائے گی۔ جو لمبی چوڑی نیت لوگوں میں مشہور ہے، اس کا کہنا کچھ ضروری نہیں ہے۔“
پھر موصوف کے مشورے اور اجازت سے لکھے گئے حاشیے میں مذکور ہے:
”یعنی لوگ نماز میں بڑی لمبی چوڑی نیت کرتے ہیں، یہاں تک کہ امام قراءت پڑھنے لگتا ہے اور اس کی نیت ختم نہیں ہوتی، ایسا کرنا برا ہے۔“
پھر آگے مسئلہ نمبر ۱۲ میں تھوڑی سی ڈھیل بھی دے دی ہے، جو بلا دلیل ہے۔^①

2 بَسْمِ اللّٰہِ پڑھنا:

وضو کے سلسلے کی دوسری بات اس کے شروع میں ”بسم اللہ“ کا پڑھنا بھی ہے۔^②
امام نووی نے بھی لکھا ہے:
”اگر صرف ”بسم اللہ“ پڑھ لے تو بھی کفایت کر جاتا ہے۔“^③
کیوں کہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد سنن ابی داؤد، ابن ماجہ، دارقطنی، بیہقی، مستدرک حاکم اور مسند احمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں آپ ﷺ نے فرمایا:
«لَا صَلَاةَ لِمَنْ وَلَا وَضُوءَ لِمَنْ لَمْ يَذْكُرِ اسْمَ اللّٰهِ»^④
”اس کی کوئی نماز نہیں، جس کا وضو نہیں اور اس کا کوئی وضو نہیں، جس نے اس کے شروع میں ”بسم اللہ“ نہیں پڑھی۔“

شواہد کی بنا پر شیخ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔ امام منذری، حافظ ابن حجر،

① بہشتی زیور، مکمل و مدلل (ص: ۱۳-۱۴) تاج کینی.

② صرف ”بسم اللہ“ ہی پڑھیں، کیوں کہ اس جگہ ”الرحمن الرحیم“ کا اضافہ تو کسی ضعیف حدیث میں بھی مروی نہیں، اس لیے صرف ”بسم اللہ“ کہنا ہی سنت ہے۔ اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ ہمارے فاضل دوست حافظ عبدالرؤف (شارح، حال وارد کویت) نے اور دوسرا شیخ انصار زبیر محمدی (الجبیل، حال ممبئی) نے لکھا ہے اور یہ دونوں مطبوع ہیں۔

③ الأذکار للنووی (ص: ۲۲)

④ صحیح سنن أبی داؤد، رقم الحدیث (۹۲) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۳۹۹) إرواء الغلیل (۱/۱۲۲) والمنتقى (۱/۱۳۴) زاد المعاد تحقیق الأرنؤوط (۱/۹۵)

ابن الصلاح اور امام ابن کثیر رحمہم اللہ نے اسے قوی قرار دیا ہے اور حافظ عراقی نے حسن کہا ہے۔
دولابی نے ”الکنیٰ“ (۱/۱۲۰) میں امام بخاری رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے کہ اس موضوع کی صحیح ترین
حدیث یہی ہے۔^①

امام منذری رحمہ اللہ نے مختصر سنن ابی داؤد میں لکھا ہے کہ اس موضوع کی احادیث میں سے سب
سے اچھی سند اسی حدیث کی ہے۔^②

یہی حدیث مسند احمد، سنن ابن ماجہ، دارمی، العلیل للترمذی، مسند بزار، سنن دارقطنی،
مستدرک حاکم اور سنن بیہقی میں حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ اور سنن ترمذی و ابن ماجہ، مسند احمد و بزار، مستدرک حاکم
اور سنن دارقطنی میں حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ ”منتقى الأخبار“ میں شیخ ابوالبرکات
المجد ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے مطابق امام بخاری رحمہ اللہ نے سعید بن زید رضی اللہ عنہ والی حدیث کو اس موضوع کی
عمدہ ترین حدیث قرار دیا ہے، جب کہ اسحاق بن راہویہ نے حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ والی حدیث کو صحیح تر
کہا ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے بھی اسے ہی ”أحسن شیء فی الباب“ قرار دیا ہے۔ مذکورہ
تین صحابہ کے علاوہ امام شوکانی رحمہ اللہ کے بقول حضرت عائشہ، سہل بن سعد، ابوسبرہ، علی اور انس رضی اللہ عنہم
سے بھی یہ حدیث مروی ہے۔ مختلف طرق سے بکثرت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اس حدیث کے مروی
ہونے کی وجہ سے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”ان روایات کی مجموعی حیثیت اس بات کی دلیل ہے کہ ان کی کوئی نہ کوئی اصل ضرور ہے۔“

امام ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”ہمارے نزدیک یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔“

امام ابن سید الناس کا قول امام شوکانی رحمہ اللہ نے ان کی شرح ترمذی سے نقل کیا ہے، جس میں
وہ کہتے ہیں کہ اس موضوع کی حسن درجے والی صریح اور صحیح درجے والی غیر صریح روایات موجود ہیں۔^③
ان تمام روایات کو نقل کرنے کے بعد امام شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہ احادیث تو وضو کے

① الإرواء الغلیل (۱/۱۲۲)

② مختصر السنن مع معالم السنن للخطابی و تہذیب السنن لابن القیم (۱/۸۸) طبع دار المعرفہ.

③ التلخیص الكبير (۱/۷۲-۷۳) نیل الأوطار (۱/۱۳۴-۱۳۵)

شروع میں ”بسم اللہ“ پڑھنے کے واجب ہونے پر دلالت کرتی ہیں اور بظاہر اسحاق بن راہویہ اور ایک روایت میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اس کے واجب ہونے کے قائل ہیں۔ ظاہر یہ کے نزدیک مطلقاً واجب ہے، جب کہ دیگر کے نزدیک یاد ہونے کی شکل میں واجب ہے، ورنہ نہیں (یعنی اگر بھولے سے چھوٹ جائے تو وضو ہو جائے گا۔ جان بوجھ کر نہ چھوڑے) جب کہ حنفیہ، شافعیہ، امام مالک اور ربیعہ اور جمہور نے اسے سنت قرار دیا ہے۔^①

امام نسائی، ابن خزیمہ اور بیہقی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی اُس حدیث سے ”بسم اللہ“ کہنے کے استحباب پر استدلال کیا ہے، جس میں ایک معجزے کا بیان ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض صحابہ نے پانی تلاش کیا، مگر پانی نہ ملا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم میں سے کسی کے پاس تھوڑا سا پانی ہے؟ (اور جب کسی کے پاس تھوڑا سا پانی مل گیا تو) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک اس پانی والے برتن میں ڈال دیا اور فرمایا:

«تَوَضَّؤُوا بِسْمِ اللّٰهِ»^② ”بسم اللہ پڑھ کر وضو کرنا شروع کرو۔“

یہ حدیث اور یہ واقعہ یا معجزہ صحیح بخاری و مسلم میں بھی مذکور ہے۔^③

دوران وضو کی دوسری دعائیں:

وضو شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ تو ضرور ہی پڑھ لینی چاہیے، کیوں کہ تکمیل وضو کے ساتھ ساتھ یہ باعثِ برکت بھی ہے۔

① ”معجم طبرانی صغیر“ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں صرف بسم اللہ نہیں، بلکہ ”بسم اللہ و الحمد للہ“ ہے اور ان کلمات کی بڑی فضیلت بیان ہوئی ہے۔ ”مجمع الزوائد“ میں علامہ بیہقی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو ذکر کر کے اسے حسن قرار دیا ہے، مگر حافظ ابن طاہر اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہما اللہ نے اسے منکر قرار دیا ہے۔^④ لہذا صرف بسم اللہ کہنے پر اکتفا کرنا ہی بہتر ہے۔

① تحقیق الأذکار (ص: ۲۲) و نیل الأوطار أيضاً.

② صحیح سنن النسائي، رقم الحديث (۷۶)

③ دیکھیں: نیل الأوطار (۱/۱۳۵-۱۳۶)

④ مجمع الزوائد (۱/۲۲۵) تحقیق الفوائد المجموعه للشوکانی، رقم الحديث (۳۲)

﴿۲﴾ بسم اللہ کے بعد وضو ختم کر لینے تک جو مختلف دعائیں اور اذکار رواج پائے ہیں، مثلاً: کلی کرنے کی دعا، ناک میں پانی چڑھانے کی دعا، منہ دھونے کی دعا، دایاں ہاتھ دھونے کی دعا، بائیں ہاتھ دھونے کی دعا، سر کے مسح کی دعا، دایاں پاؤں دھونے کی دعا، بائیں پاؤں دھونے کی دعا؛ یہ سب دعائیں من گھڑت ہیں۔ جو نبی اکرم ﷺ نے خود مانگی ہیں نہ اپنی امت کے لوگوں کو مانگنے کا کہا ہے اور نہ یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی سے ثابت ہیں۔

یہ دعائیں ”کبیری شرح منیة المصلي“ میں مذکور ہیں، ایسے ہی بازار میں ملنے والی نماز کے موضوع کی چھوٹی چھوٹی کتابوں میں بھی منقول ہوتی ہیں۔ ان میں سے صرف پہلی دو دعائیں چھوڑ کر بقیہ آٹھ دعاؤں کو نقل کر کے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ان کی تردید کی ہے اور امام نووی رحمہ اللہ کی کتاب ”روضۃ الطالبین“ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ”یہ دعائیں بے اصل ہیں۔“

امام شافعی اور جمہور میں سے کسی نے بھی یہ دعائیں ذکر نہیں کی ہیں۔ پھر امام نووی کی کتاب ”المجموع شرح المہذب“ کے حوالے سے لکھا ہے کہ متقدمین علماء و فقہاء میں سے کسی نے انہیں ذکر نہیں کیا اور محدث شہیر علامہ ابن صلاح رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان دعاؤں کے بارے میں کوئی حدیث صحیح نہیں ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے ”التلخیص الحبیبر“ میں لکھا ہے:

”اس کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک روایت امالی ابن عساکر، الدعوات للمستغفری اور مسند الفردوس دیلمی میں ہے، مگر اس روایت کے جملہ طرق ضعیف ہیں۔ امام ابن حبان نے یہی روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ”الضعفاء“ میں اور مستغفری نے ”الدعوات“ میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے بیان کی ہے، مگر ان کی سندیں بھی ضعیف اور واہی قرار دی گئی ہیں۔“^①

ایسے ہی امام شوکانی رحمہ اللہ نے بھی ”نیل الأوطار“ میں ہر ہر عضو کے دھوتے وقت کی جانے والی دعاؤں کی تردید کی ہے اور متعدد کبار محدثین کرام سے تقیدی تبصرے بھی نقل کیے ہیں۔^② حافظ ابن القیم رحمہ اللہ ”زاد المعاد“ میں لکھتے ہیں:

① التلخیص الحبیبر لابن حجر (۱/۱/۱۰۰)

② نیل الأوطار (۱/۱/۲۰۵)

”بِسْمِ اللّٰهِ کے سوا نبی اکرم ﷺ سے ہر ہر عضو کو دھوتے وقت کی کوئی بھی دعا ثابت نہیں ہے، بلکہ ان دعاؤں پر مشتمل ہر روایت کذب و اختلاق پر مشتمل ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ایسی کوئی دعائیں کی ہیں اور نہ اپنی امت ہی کو سکھائی ہیں۔ پھر انھوں نے آگے وضو کے اوّل و آخر میں ثابت شدہ دعائیں ذکر کی ہیں“^①

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ”الأذکار“ (ص: ۳۰) میں ان دعاؤں کو بناوٹی اور بے اصل قرار دیا ہے۔ شارح بخاری حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے مسائل و احکام اسلام کے موضوع پر جامع و مانع کتاب ”بلوغ المرام“ مرتب کی تو مسائل وضو اور خصوصاً وضو کی دعاؤں میں صرف اس کے آغاز میں ”بِسْمِ اللّٰهِ“ اور آخر میں کلمہ شہادت اور «اللّٰهُمَّ اجْعَلْنِي مِنَ التَّوَّابِينَ وَاجْعَلْنِي مِنَ الْمُتَطَهِّرِينَ» والی دعا ذکر کرنے پر ہی اکتفا کیا اور جب علامہ صنعانی حضرت امیر ایمانی نے ”سبل السلام“ کے نام سے اس کتاب کی بہترین شرح لکھی تو مصنف کے اس طرز عمل کو سراہتے ہوئے لکھا کہ انھوں نے اعضاے وضو کو دھوتے وقت کی الگ الگ دعائیں ذکر ہی نہیں کیں، کیوں کہ وہ بالاتفاق ضعیف ہیں، پھر انھوں نے امام نووی اور حافظ ابن الصلاح رحمۃ اللہ علیہ کے اقوال بھی نقل کیے ہیں، جن میں انھوں نے ان دعاؤں کو غیر صحیح اور بے اصل قرار دیا ہے۔^②

سنن ترمذی کی شرح تحفۃ الأحوذی میں علامہ مبارک پوری نے بھی متعدد محدثین کرام کے اقوال نقل کر کے ان دعاؤں کے من گھڑت ہونے کی تائید کی ہے۔^③

جب ان دعاؤں کی اسنادی حیثیت یہ ہے تو پھر اب انھیں نقل کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے، جسے وہ دعائیں ضرور ہی دیکھنا ہو، وہ حافظ ابن حجر کی ”التلخیص الحبیر“ (۱/ ۱۰۰)، ”إحياء علوم الدين للغزالي“ (۱/ ۱۱۸- ۱۱۹) یا ”الأذکار للنووي“ (ص ۲۴) اور پاکستان کی وفاقی شرعی عدالت کے سابق مشیر مولانا ابو عبد السلام محمد صدیق صاحب سرگودھوی کی کتاب ”راہ سنت“ (ص: ۱۲۷- ۱۲۸) میں دیکھ سکتے ہیں۔

① زاد المعاد محقق (۱/ ۱۹۵- ۱۹۶)

② سبل السلام (۱/ ۵۵- ۵۶) طبع مصر.

③ تحفة الأحوذی (۱/ ۱۸۲)

❖ وضو کی دعاؤں کے ضمن میں یہ بھی ملتا ہے کہ وضو مکمل کر کے سورۃ القدر ﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ...﴾ کی تلاوت کی جائے، لیکن اس سلسلے میں عرض ہے کہ سورۃ القدر قرآن کریم کی ایک قابل قدر سورت ہے اور اس کی تلاوت کا ثواب ہے، مگر اس کی تلاوت کے لیے وضو مکمل کر لینے کے بعد کے وقت کی تعیین کہاں سے آگئی؟ یہی وجہ ہے کہ اس موقع پر اس سورت کی تلاوت کو امام سخاوی رحمہ اللہ نے اصل قرار دیا ہے اور اس موقع پر اس کی تعیین کو دوسری مسنون و ثابت شدہ دعاؤں کے فوت کرنے کا سبب شمار کیا ہے۔^①

❖ دوران وضو یا وضو کر لینے کے بعد ایک دعا ثابت ہے، جو امام نسائی اور ابن السنی کی ”عمل الیوم واللیلة للنسائی“ میں مروی ہے، اس دعا کے الفاظ یہ ہیں:

«اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي ذَنْبِي، وَوَسِّعْ لِي فِي دَارِي وَبَارِكْ لِي فِي رِزْقِي»

”اے اللہ! مجھے بخش دے، میرے گھر میں کثايش فرما اور رزق میں برکت فرما۔“

امام نسائی کی تبویب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دعا وضو مکمل کر لینے کے بعد کی ہے، جب کہ امام ابن السنی کی تبویب سے اس کا دوران وضو کی دعا ہونا معلوم ہوتا ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس دعا کے دونوں مواقع کے لیے ہونے کا امکان ہے۔ امام نووی اور علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔^②

علامہ ابن قیم نے ”زاد المعاد“ (۱/ ۲۶۲) میں اسے تشہد کی دعاؤں میں شمار کیا ہے اور دوسری جگہ (زاد المعاد: ۲/ ۳۸۹) سے وضو کی دعاؤں میں بیان کیا ہے۔ شیخ البانی نے ”تمام المنة“ (ص: ۹۴-۹۶) میں اور ”صلاة الرسول“ کی تحقیق میں حافظ عبدالرؤف رحمہ اللہ نے بعض قرائن ذکر کر کے اس کے نماز کی دعاؤں میں سے ہونے ہی کو راجح کہا ہے۔^③

اثناے وضو باتیں کرنا:

دوران وضو کی ثابت اور غیر ثابت دعاؤں کا ذکر چل رہا ہے تو آگے بڑھنے سے پہلے مناسب

① سلسلۃ الأحادیث الضعیفة و الموضوعۃ للألبانی (۱/ ۹۷)

② عمل الیوم واللیلة للنسائی (ص: ۱۷۲) تحقیق فاروق أحمد حمادہ طبع مراکش.

③ صلاة الرسول (تخریج: ۱۱۶)

معلوم ہوتا ہے کہ یہیں اس بات کی وضاحت بھی کر دی جائے کہ اثنائے وضو باتیں کرنے کی حیثیت کیا ہے؟ جائز و مباح یا ناجائز و ممنوع؟

اس سلسلے میں ہمارے پاک و ہند کی مساجد میں وضو خانوں کی دیواروں پر عموماً یہ الفاظ لکھے ہوئے دیکھے گئے ہیں کہ وضو کرتے ہوئے باتیں کرنا منع ہے۔ اگر بات اسی حد تک رہتی تو ممکن تھا کہ اسے احتیاط و اخلاق یا آداب وغیرہ کے عمومی امور سے شمار کر لیا جاتا، مگر وہاں تو ان الفاظ کے آخر میں بین القوسین (حدیث) کا لفظ بھی لکھا ہوتا ہے، جس سے شک گزرتا ہے، بلکہ عام آدمی اس بات کا یقین کر لیتا ہے کہ یہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہوگا کہ دورانِ وضو باتیں کرنا منع ہے۔ حالاں کہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے اور اثنائے وضو میں باتیں کرنے کی ممانعت کی کوئی دلیل نہیں ہے، مگر اس کا یہ مطلب بھی نہ سمجھ لیا جائے کہ اس اثنا میں آپ جو جی میں آئے کہتے جائیں، بلکہ جو جی میں آئے، اس کے کہتے جانے کی تو عام حالات میں بھی شرعاً اجازت نہیں، چہ جائے کہ یہ دورانِ وضو جائز ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں کے محاسبے کا عمل ایسا جامع اور وسیع ہے کہ اس کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ لکھا جاتا ہے۔ اگر وہ اچھا ہے تو ثواب اور اگر برا ہے تو عقاب لکھا جاتا ہے، ہاں اگر مباح ہو تو نہ ثواب نہ عقاب۔ چنانچہ اس عملِ محاسبہ کا ثبوت تو خود قرآن کریم میں موجود ہے، جیسا کہ سورت ق (آیت: ۱۸) میں ارشادِ الہی ہے:

﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾

”کوئی بات اس (انسان) کی زبان پر نہیں آتی، مگر ایک نگہبان اس کے پاس تیار رہتا ہے۔“

سورة الانفطار (آیت: ۱۰، ۱۱، ۱۲) میں ارشادِ الہی ہے:

﴿وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِينَ ۖ كِرَامًا كَاتِبِينَ ۖ يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ﴾

”حالانکہ تم پر نگہبان مقرر ہیں۔ عالی قدر (تمہاری باتوں کے) لکھنے والے۔ جو کچھ تم

کرتے ہو وہ اسے جانتے ہیں۔“

معلوم ہوا کہ کسی کا یہ سمجھ کر زندگی گزارنا کہ اس کی غلطیاں، کوتاہیاں اور گناہ اللہ تعالیٰ کے ریکارڈ میں نہیں آتے ہوں گے، یہ سوچ سراسر حماقت ہے، کیوں کہ ہر شخص کی نیکیاں اور برائیاں لکھنے والے فرشتے اس کے ساتھ ہوتے ہیں، جن کا ذکر سورة الانفطار کے علاوہ سورة الرعد (آیت: ۱۱) میں

بھی آتا ہے، بلکہ وہاں سے تو دائیں بائیں والوں کے علاوہ ایک آگے اور ایک پیچھے یعنی ہر انسان کے ساتھ چار فرشتوں کی تعیناتی کا پتا چلتا ہے۔ ایک صحیح حدیث کی رو سے ان فرشتوں کی صبح و شام تبدیلی ہوتی رہتی ہے، پہلے جاتے اور نئے آتے رہتے ہیں۔

گویا زبان سے نکلی ہوئی ہر بات کا لفظ لفظ ریکارڈ ہوتا رہتا ہے، لہذا ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے کہ منہ سے کسی بھی وقت کوئی بری بات نہ نکلے۔ قرآن کریم کے ان تینوں مقامات کے علاوہ متعدد احادیث میں بھی ناروا باتوں سے اپنی زبان کی حفاظت کا حکم وارد ہوا ہے، جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں، کیوں کہ حفاظتِ زبان اور آفاتِ زبان تو الگ ایک مستقل موضوع ہے۔

سردست غرض صرف یہ ہے کہ جب عام حالات میں ناجائز اور ناروا بات کا زبان سے نکالنا ٹھیک نہیں تو ایسی باتیں دورانِ وضو کیسے ٹھیک ہو سکتی ہیں؟ مگر بقول علامہ سید سابق باتیں کرنے کی مخالفت بھی وارد نہیں تو اس کا معنی یہ ہوا کہ دورانِ وضو اگر کوئی مباح بات ہو تو کی جاسکتی ہے۔^(۱) فتاویٰ علمائے حدیث میں بھی یہی مذکور ہے۔^(۲)

ایسی بات کا کرنا مباح ہوگا، گناہ نہیں۔ احادیث میں مذکور بعض واقعات سے پتا چلتا ہے کہ دورانِ وضو مباح بات کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری و مسلم اور سنن ابو داؤد میں موزوں اور جرابوں پر مسح کے باب میں حضرت مغیرہؓ سے حدیث مروی ہے، جس میں ان کے سامنے نبی اکرم ﷺ کے وضو کرنے کا واقعہ مذکور ہے اور اس بات کا ذکر بھی ہے کہ جب پاؤں دھونے کی باری آئی تو حضرت مغیرہؓ نے فرمایا:

نبی اکرم ﷺ کے پاؤں سے آپ ﷺ کے موزے اتارنے کے لیے جھکے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«دَعُهُمَا فَإِنِّي أَدْخَلْتُهُمَا طَاهِرَتَيْنِ فَمَسَحَ عَلَيْهِمَا»^(۳)

”انھیں رہنے دو، کیوں کہ میں نے یہ اسی وقت پہنے تھے، جب میرے دونوں پاؤں پاک تھے (یعنی میں وضو سے تھا) پھر آپ ﷺ نے ان پر مسح کیا۔“

(۱) فقہ السنة (۸/ ۶۰)

(۲) فتاویٰ علمائے حدیث (۱/ ۵۸)

(۳) صحیح البخاری مع الفتح (۱/ ۳۰۹) صحیح مسلم مع شرح النووي (۳/ ۱۰۷) صحیح سنن أبي داؤد، رقم الحديث (۱۳۷) المنتقى مع النيل (۱/ ۱۸۰)

اس واقعے سے معلوم ہوا کہ نبی اکرم ﷺ نے وضو کے دوران میں بات کی اور حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ کے موزے اتارنے سے روکتے ہوئے نہ اتارنے کا سبب بھی بتایا تھا۔

اعضائے وضو کو دھونے میں تیا من:

جسم کے جو اعضائے وضو جوڑا جوڑا ہیں، جیسے ہاتھ، پاؤں، کلائیوں، انھیں وضو کے دوران میں دھوتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ پہلے دائیں کو دھویا جائے اور پھر بائیں کو، کیوں کہ صحیح بخاری و مسلم اور سنن اربعہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يُحِبُّ التَّيْمَنَ مَا اسْتَطَاعَ فِي شَأْنِهِ كُلِّهِ، فِي وُضُوءِهِ وَتَرَجُّلِهِ وَتَعَلُّهِ»^①

”نبی ﷺ حسب استطاعت اپنے تمام امور میں دائیں پہلو کو محبوب رکھتے تھے۔ طہارت (کے دوران میں اعضائے وضو کو دھونے) میں، سر کو کنگھا کرنے میں اور جوتا پہننے میں بھی (دائیں جانب سے آغاز کرنا ہی محبوب تھا)۔“

اس عام مفہوم والی حدیث کے علاوہ خاص وضو کے بارے میں بھی سنن ابی داؤد وابن ماجہ، صحیح ابن حبان وابن خزیمہ، مسند احمد اور سنن کبریٰ بیہقی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«إِذَا لَبَسْتُمْ وَإِذَا تَوَضَّأْتُمْ فَابْدَأُوا بَأْيَا مِّنْكُمْ»^②

”جب تم کوئی لباس پہنو اور جب وضو کرو، تو دائیں اعضا سے شروع کرو۔“

مثلاً اگر قمیص پہننے لگیں تو پہلے دایاں بازو پہنیں، شلوار، پاجامہ یا پتلون پہننے لگیں تو پہلے دائیں

① صحیح البخاری مع الفتح، رقم الحدیث (۴۲۶) صحیح مسلم مع شرح النووی (۱۶۰/۳-۱۶۱) صحیح سنن أبی داؤد، رقم الحدیث (۳۴۸۷) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۴۹۸) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۴۰۸) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۴۰۱) مشکاة المصابیح مع المرعاة (۱/ ۴۶۷-۴۶۸)

② صحیح سنن أبی داؤد، رقم الحدیث (۳۴۸۸) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۴۰۲) موارد الظمان، رقم الحدیث (۱۴۷) و صحیح الجامع، رقم الحدیث (۷۸۷) مشکاة المصابیح مع مرعاة المفاتیح (۱/ ۱۶۸-۱۹۶) و صححه الألبانی فی تحقیق المشکاة (۱/ ۱۲۷)

پاؤں کو اس میں داخل کریں، جوتا پہنیں تو بھی پہلے دایاں اور پھر بائیں۔ ایسے ہی اس بات کی تائید سنن ترمذی اور نسائی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی اُس حدیث سے بھی ہوتی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ إِذَا لَسَّ قَمِيصًا بَدَأَ بِمِائِمِنِهِ»^①

”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب قمیص پہننے لگتے تو دائیں بازو سے شروع کرتے تھے۔“

اس طرح وضو کے دوران میں پہلے دایاں ہاتھ اور بازو، پھر بائیں ہاتھ اور بازو دھوئیں۔ اسی طرح پاؤں دھوتے وقت پہلے دایاں پاؤں اور پھر بائیں پاؤں دھوئیں۔ صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتب حدیث میں مذکور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں مسنون وضو کی ترتیب بھی اسی طرح وارد ہوئی ہے۔

4 کلی کرنا اور ناک صاف کرنا:

مسنون طریقہ وضو میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی چلو لیا اور اسی کے ساتھ ہی کلی بھی کی اور ناک بھی صاف کیا۔ یہ عمل آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ دہرایا، گویا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک چلو سے پانی لیتے اور اس کا نصف حصہ کلی کرنے کے لیے منہ میں ڈال لیتے اور دوسرا نصف حصہ ناک میں چڑھاتے اور اسے جھاڑ کر صاف کرتے تھے۔ جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم اور سنن ترمذی کے الفاظ «فَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ مِنْ كَفَّةٍ وَاحِدَةٍ»^② سے ظاہر ہو رہا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ کلی اور ناک کے لیے ایک ہی چلو پانی کو آدھا آدھا کر کے استعمال کرنا چاہیے، بلکہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں صحیح و مختار مذہب کی دلیل موجود ہے کہ سنت یہی ہے کہ ایک چلو سے منہ میں پانی ڈال کر کلی کی جائے اور اسی کے آدھے حصہ سے ناک میں پانی چڑھایا جائے۔ صحیح بخاری کی شرح فتح الباری میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

① المشكاة مع المراجعة (۱/ ۴۶۹)

② صحیح البخاری مع الفتح، رقم الحدیث (۱۹۱) صحیح مسلم مع شرح النووي (۳/ ۱۲۲) صحیح سنن

الترمذی، رقم الحدیث (۲۶)

”ایک ہی چلو سے کلی کرنے اور ناک میں پانی چڑھانے کی یہ صریح دلیل ہے“^(۱)
اسی موضوع پر دیگر احادیث بھی مروی ہیں، مثلاً صحیح ابن حبان، سنن دارمی اور مستدرک حاکم
میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ تَوَضَّأَ مَرَّةً، وَجَمَعَ بَيْنَ الْمَضْمَضَةِ وَالِاسْتِنْشَاقِ»^(۲)
”نبی اکرم ﷺ نے تمام اعضا کو ایک مرتبہ دھو کر وضو کیا اور کلی و ناک میں ایک ہی چلو
سے پانی چڑھایا۔“

ایسے ہی سنن نسائی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:
«تَوَضَّأَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَغَرَفَ غَرْفَةً، فَمَضَمَضَ وَاسْتَنْشَقَ، ثُمَّ غَرَفَ
غَرْفَةً فَغَسَلَ وَجْهَهُ»^(۳)

”نبی اکرم ﷺ نے وضو کیا تو آپ ﷺ نے ایک چلو پانی لیا، اس سے کلی کی اور ناک
میں بھی چڑھایا۔ پھر آپ ﷺ نے ایک چلو پانی اور لیا اور اس سے منہ دھویا۔“
صحیح بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انھوں نے نبی اکرم ﷺ کے وضو کی
مسنون کیفیت بیان کرنے کے لیے جب وضو کیا:

«أَخَذَ غَرْفَةً مِنْ مَاءٍ فَمَضَمَضَ بِهَا وَاسْتَنْشَقَ»^(۴)
”انھوں نے ایک چلو پانی لیا، جس سے کلی بھی کی اور ناک میں بھی چڑھایا۔“
نیز سنن ابی داؤد و نسائی اور مسند احمد و طیالسی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی تین روایات ہیں،
ان تینوں میں بھی ایک چلو پانی ہی سے کلی کرنے اور ناک میں چڑھانے کا ذکر ہے۔^(۵)

یہ طریقہ جو عام طور پر مروج ہے کہ پہلے تین مرتبہ تین چلوؤں سے کلی کی جاتی ہے اور پھر تین
مرتبہ ناک میں پانی چڑھا کر اسے صاف کیا جاتا ہے، یہ طریقہ صحیح احادیث سے ثابت نہیں۔ ہاں سنن

(۱) فتح الباری (۱/۲۹۱)

(۲) تحفة الأحوذی و حسنه (۱/۱۲۳)

(۳) صحیح سنن النسائي، رقم الحديث (۹۹) و تحفة الأحوذی و حسنه (۱/۱۲۳)

(۴) صحیح البخاری مع الفتح (۱/۲۴۰)

(۵) التلخیص الحبیر (۱/۷۹-۸۱) و تحفة الأحوذی (۱/۱۲۴)

ابی داؤد میں ایک روایت ہے، جسے طلحہ بن مصرف اپنے باپ اور دادا کے واسطے سے بیان کرتے ہیں کہ ان کے دادا نے کہا:

«رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَفْصِلُ بَيْنَ الْمُمْضَمَّةِ وَالْإِسْتِنْشَاقِ»^①

”میں نے نبی اکرم ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ وضو کے دوران میں کلی اور ناک میں پانی

چڑھانے میں فصل کیا کرتے تھے (یعنی دونوں کے لیے الگ الگ چلو پانی لیتے تھے)۔“

مگر اس حدیث کو علامہ ابن قیم اور دیگر محدثین کرام رحمہم نے ضعیف قرار دیا ہے، کیوں کہ طلحہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو کلی اور ناک کے لیے الگ الگ پانی لیتے دیکھا، حالانکہ طلحہ کے دادا کا صحابی ہونا ہی ثابت نہیں اور جو شخص صحابی نہ ہو اور یہ کہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ کرتے دیکھا ہے تو اس کی بات معتبر نہ ہوئی، نیز طلحہ کے والد بھی غیر معروف اور مجہول ہیں۔ اس کے علاوہ طلحہ والی اس روایت میں ایک راوی ”لیث بن ابی سلیم“ بھی ہے، جسے محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ ان تینوں وجوہات کی بنا پر اس حدیث کو ضعیف اور ناقابل حجت قرار دیا گیا ہے۔^②

ایسے ہی صحت و ضعف کے اعتبار سے بعض غیر واضح، غیر صریح بلکہ محتمل روایات سے کلی اور ناک میں پانی چڑھانے کو الگ الگ کرنے پر استدلال کیا گیا ہے۔ اگر بالفرض انہیں بھی قابل حجت سمجھ لیا جائے تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ کلی اور ناک میں پانی چڑھانے میں وصل اور فصل دونوں ہی جائز ہیں، لیکن (مذکورہ تفصیل کے پیش نظر) صحیح تو یہی ہے کہ وصل کیا جائے، کیوں کہ فصل کا جو انداز عموماً مروج ہے، وہ ضعیف، غیر واضح اور غیر صریح روایات پر مبنی ہے، جب کہ وصل کا ثبوت صحیح بخاری و مسلم جیسی کتب میں مذکور ہے۔ لہذا وصل ہی افضل ہے اور فصل محض ”گزارہ“ ہے۔ یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ فصل اور وصل کے جواز میں تو کوئی اختلاف نہیں، بلکہ دونوں جائز ہیں، یہ اختلاف رائے صرف افضلیت میں ہے۔

محدث برصغیر علامہ عبدالرحمن مبارکپوری رحمہ اللہ نے ”تحفة الأحوذی“ میں اس موضوع پر

① سنن أبی داؤد، رقم الحدیث (۱۳۹) زاد المعاد (۱/۱۹۲-۱۹۳)

② تحفة الأحوذی (۱/۱۲۶)

بڑی نفیس بحث کی ہے اور علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ذکر کیا ہے، جس میں وہ کہتے ہیں کہ بہتر یہ ہے کہ دونوں صورتوں ہی کو جواز پر محمول کیا جائے، پھر انھوں نے امیر صنعانی کی کتاب ”سبل السلام شرح بلوغ المرام“ سے ان کا قول نقل کیا ہے، جس میں وہ کہتے ہیں:

”فصل اور وصل کے دونوں طریقے ہی روایات میں وارد ہیں۔ لہذا اقرب بات اختیار ہی ہے اور اگرچہ دونوں طریقے ہی سنت ہیں، لیکن وصل کی روایت اکثر اور صحیح تر ہے۔ امام ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ نے ”عارضۃ الأحوذی شرح جامع الترمذی“ میں وصل والے انداز ہی کو ”أقویٰ فی النظر، و علیہ يدل الظاهر من الأثر“ قرار دیا ہے۔^①

احادیث میں اس بات کا ثبوت بھی موجود ہے کہ ناک میں پانی چڑھانے میں مبالغے سے کام لیا جائے، سوائے اس کے کہ کوئی شخص روزہ سے ہو، کیوں کہ روزے دار کو دوران وضو ناک میں پانی چڑھاتے وقت احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ مبادا پانی حلق سے نیچے اتر جائے، کیوں کہ سنن ابی داؤد و ترمذی، نسائی و ابن ماجہ، مسند احمد و شافعی، صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ، مستدرک حاکم اور سنن کبریٰ بیہقی میں حضرت لقیط بن صبرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«وَبَالِغٍ فِي الْيَسْتِنْشَاقِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ صَائِمًا»^②

”ناک میں پانی چڑھانے میں مبالغہ کرو، سوائے اس کے کہ تم روزے سے ہو۔“

یاد رہے کہ ناک میں پانی تو دائیں ہاتھ ہی سے چڑھایا جائے گا، لیکن اس کو جھاڑنے اور صاف کرنے کے لیے بائیں ہاتھ سے کام لینا ضروری ہے، جیسا کہ استنجہ اور ناک صاف کرنے کے آداب میں سے یہ بات معروف ہے۔ سنن نسائی اور مسند احمد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے:

«وَنَثَرَ بِيَدِهِ الْيُسْرَى، فَفَعَلَ هَذَا ثَلَاثًا، ثُمَّ قَالَ: هَذَا طُهُورٌ نَبِيِّ اللَّهِ ﷺ»^③

”انھوں نے بائیں ہاتھ سے ناک کو جھاڑا اور تین مرتبہ ایسا کیا اور پھر فرمایا: اللہ کے

① تحفة الأحوذی (۱/۱۲۱-۱۲۶) سبل السلام (۱/۵۴)

② صحیح سنن ابی داؤد، رقم الحدیث (۱۲۹) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۶۳۱) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۸۵) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۴۰۷) و موارد الظمان، رقم الحدیث (۱۵۹) مسند أحمد (۴/۳۳) المشكاة مع المرعاة (۱/۴۷۱-۴۷۲) علامہ مہارکپوری رحمۃ اللہ علیہ نے محدثین کی ایک جماعت سے اس حدیث کی تصحیح نقل کی ہے۔ اسی طرح علامہ البانی نے بھی اسے صحیح کہا ہے۔ تحقیق المشكاة (۱/۱۲۸)

③ صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۸۹) المنتقى مع النيل (۱/۱۴۳)

نبی ﷺ کا وضو اس طرح تھا۔“

سنن نسائی، مسند احمد اور سنن دارمی میں عبدخیر بیان کرتے ہیں کہ نماز فجر کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک جگہ بیٹھ کر کسی غلام کے ہاتھوں پانی منگوایا اور وضو کرنے لگے، جبکہ ہم سب انہیں دیکھ رہے تھے۔ اس حدیث میں ہے:

«وَنَشَرَ بِيَدِهِ الْيُسْرَى، فَعَلَّ هَذَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ»

”انہوں نے اپنے بائیں ہاتھ سے ناک کو جھاڑا اور ایسا تین مرتبہ کیا۔“

آخر میں فرمایا:

«مَنْ سَرَّهُ أَنْ يَنْظُرَ إِلَى طُهُورِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَهَذَا طُهُورُهُ»^①

”جسے یہ بات خوش گوار معلوم ہو کہ وہ نبی ﷺ کا وضو دیکھے تو (وہ جان لے کہ) یہ

نبی ﷺ کا وضو ہے۔“

5 منہ دھونا:

ہاتھ دھونے، کلی کرنے اور ناک میں پانی چڑھانے اور جھاڑنے کے بعد تین تین مرتبہ منہ دھویا جاتا ہے، مگر کتنے ہی لوگ ایسے بھی ہیں، جو منہ دھونے میں اتنی جلد بازی اور بے پروائی کرتے ہیں کہ ان کی ٹھوڑی نیچے سے خشک رہ جاتی ہے، جب کہ اس طرح وضو مکمل نہیں ہوتا، کیوں کہ اس طرح چہرہ پورا نہیں دھلتا۔

چہرے کی حدود:

فقہانے منہ یا چہرے کی جو حدود بیان کی ہیں، وہ امام ابن قدامہ، علامہ ابو القاسم خرقی اور شیخ سید سابق وغیرہ کے بقول اس طرح ہیں کہ ماتھے کا وہ مقام جہاں سے سر کے بال شروع ہوتے ہیں، وہاں سے لے کر جڑوں تک اور ٹھوڑی کے نچلے حصے تک اور دائیں کان سے لے کر بائیں کان تک کے مابین والے حصے کو منہ یا چہرہ شمار کیا جاتا ہے۔^② لہذا منہ دھوتے وقت ٹھوڑی اور دونوں جڑوں کے نچلے حصے کو دھونا بھی ضروری ہے۔

① صحیح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٠٢) صحیح سنن النسائي، رقم الحديث (٩١) المشكاة مع

المرعاة (١/٤٧٥-٤٧٦) وصححه الألباني في تحقيق المشكاة (١/١٢٩)

② المغني (١/١١٤) وفقه السنة (١/٤٣)

ڈاڑھی کا خلال:

جو لوگ سنت رسول بلکہ سنت انبیا ﷺ سے عداوت نہیں رکھتے، بلکہ ڈاڑھی رکھے ہوئے ہوں، ان کے لیے منہ دھوتے وقت ڈاڑھی کا خلال بھی مستحب ہے، کیوں کہ سنن ترمذی وابن ماجہ، صحیح ابن خزیمہ وابن حبان، مستدرک حاکم اور سنن دارقطنی میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يُخَلِّلُ لِحْيَتَهُ»^①

”نبی اکرم ﷺ اپنی ڈاڑھی کا خلال کیا کرتے تھے۔“

ڈاڑھی کے خلال کا طریقہ سنن ابوداؤد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یوں مروی ہے:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا تَوَضَّأَ أَخَذَ كَفًّا مِنْ مَاءٍ فَأَدْخَلَهُ تَحْتَ حَكَنِهِ فَخَلَّلَ بِهِ لِحْيَتَهُ وَقَالَ: هَكَذَا أَمَرَنِي رَبِّي عَزَّ وَجَلَّ»^②

”نبی اکرم ﷺ جب وضو کرتے تو پانی کا ایک چلو لے کر اسے اپنی ٹھوڑی کے نیچے داخل

کرتے اور اس سے ڈاڑھی کا خلال کرتے اور فرمایا: مجھے میرے پروردگار نے اسی طرح

حکم دیا ہے۔“

اس موضوع کی اور بھی کئی احادیث متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں، مگر وہ تقریباً سب کی سب

متکلم فیہ ہیں۔^③

یہ احادیث بکثرت ہیں، یہی وجہ ہے کہ علامہ مبارک پوری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ان کی یہ کثرت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ خلال کی اصل ضرور ہے اور کیسے نہ ہو، جب کہ امام ترمذی رضی اللہ عنہ نے حدیث عثمان رضی اللہ عنہ کو صحیح کہا ہے۔ امام بخاری نے اسے حسن کہا ہے اور حافظ ابن حجر رضی اللہ عنہ نے خلال کے بارے میں حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا کو حسن قرار دیا ہے۔ یہ احادیث مجموعی طور پر خلال کے استحباب پر دلالت کرتی ہیں اور میرے نزدیک یہی حق ہے۔

① صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۲۸) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۴۳۰) موارد الظمان، رقم

الحدیث (۱۵۴) المنتقى مع النيل (۱/۱/۱۴۸-۱۴۹)

② صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (۱۳۲) و الحاکم فی المستدرک (۱/۱۴۹) صححه الألبانی فی

تحقیق المشكاة (۱/۱۲۹) و إرواء الغلیل (۱/۱۳۰)

③ تفصیل کے لیے دیکھیں: نیل الأوطار (۱/۱/۱۴۹)

خلال کے طریقے پر مشتمل دوسری حدیث انس رضی اللہ عنہ کو بھی شیخ البانی رحمہ اللہ نے ”إرواء الغلیل“ اور ”تحقیق المشکاة“ (۱/ ۱۳۰) میں صحیح قرار دیا ہے۔ لہذا ڈاڑھی کے خلال کی مشروعیت بلاشبہ ثابت ہوگئی۔

6 گہنیوں سمیت دونوں ہاتھ دھونا:

پہلے دائیں ہاتھ کو کہنی سمیت دھوئیں اور پھر بائیں ہاتھ کو بھی کہنی سمیت دھوئیں۔ ہاتھوں کو گہنیوں سمیت اور پاؤں کو ٹخنوں سمیت دھونا تو نص قرآنی کی رو سے بھی فرض ہے، جیسا کہ آیت اور اس کا ترجمہ ذکر کیا جا چکا ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص گہنیوں سے بھی آگے تک بازو اور ٹخنوں سے بھی آگے تک پنڈلیاں دھونا چاہے تو یہ مستحب ہے، کیوں کہ صحیح بخاری و مسلم شریف، مسند احمد اور سنن بیہقی میں مروی ہے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ وضو کرنے لگے تو جب انھوں نے اپنا منہ اچھی طرح دھولیا اور دایاں ہاتھ دھویا تو کہنی سے بھی اوپر تک بازو کو دھونے لگے، پھر جب بائیں ہاتھ دھویا تو کہنی سے بھی اوپر تک بازو کو دھونے لگے اور سر کا مسح کیا اور دایاں پاؤں دھویا، تو ٹخنے سے اوپر پنڈلی تک دھونے لگے اور پھر جب بائیں پاؤں دھویا تو اس کے ٹخنے سے بھی اوپر تک پنڈلی دھوئی اور پھر کہا:

«هَكَذَا رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَتَوَضَّأُ»

”میں نے نبی اکرم ﷺ کو اسی طرح وضو کرتے دیکھا ہے۔“

اس طرح وضو کر کے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«أَنْتُمْ الْعُرُّ الْمُحَجَّلُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ إِسْبَاغِ الْوُضُوءِ»^①

”قیامت کے دن تم لوگ پوری طرح وضو کرنے کی بدولت چمکتے ہوئے ہاتھوں اور پیروں والے اور روشن چہروں والے ہو گے۔“

مدرج جملہ:

اس حدیث میں آگے یہ الفاظ بھی ہیں جو کہ مدرج ہیں:

① صحیح البخاری مع الفتح، رقم الحدیث (۱۳۶) صحیح مسلم مع شرح النووي (۳/ ۱۳۴-۱۳۵)

«فَمَنْ اسْتَطَاعَ مِنْكُمْ فَلْيُطِلْ غُرَّتَهُ وَتَحْجِئْهُ»^①

”تم میں سے جو شخص استطاعت رکھے، وہ اپنے اعضاء وضو کی چمک بڑھالے۔“

یہ آخری الفاظ بظاہر تو نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہی معلوم ہوتے ہیں، مگر بعض کبار محدثین نے تحقیق و تدقیق کے بعد ثابت کیا ہے کہ «فَمَنْ اسْتَطَاعَ مِنْكُمْ فَلْيُطِلْ غُرَّتَهُ وَتَحْجِئْهُ» کے الفاظ مدرج ہیں، یعنی نبی کریم ﷺ کے نہیں، بلکہ کسی راوی کے تفسیری و تشریحی الفاظ ہیں، مگر کسی وجہ سے واضح طور پر فرق نہیں کیا گیا ہے۔ چنانچہ امام منذری رحمۃ اللہ علیہ نے ”الترغیب و الترهیب“ میں اس بات کی وضاحت کی ہے۔^②

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے مسند (۲/ ۳۳۴ - ۵۲۳) میں بھی اس آخری جملے کو مدرج قرار دیتے ہوئے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے بعد والے راوی نعیم کا قول ذکر کیا ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں کہ مجھے معلوم نہیں کہ یہ آخری جملہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا ہے یا نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے۔^③

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے بخاری شریف کی شرح فتح الباری میں کہا ہے:

”اس روایت کو دس صحابہ رضی اللہ عنہم نے روایت کیا ہے۔ ان میں سے کسی کی روایت میں یہ آخری جملہ ہے نہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بیان کرنے والوں کی روایت میں ہے، سوائے نعیم کی اس روایت کے۔“^④

”أعلام الموقعین“ میں علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے استاذ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ وہ کہا کرتے تھے:

«هَذِهِ اللَّفْظَةُ لَا يُمَكِّنُ أَنْ تَكُونَ مِنْ كَلَامِهِ ﷺ»

”یہ جملہ ممکن ہی نہیں کہ نبی کریم ﷺ کا کلام مبارک ہو۔“

آگے وہ اس کی دلیل کے طور پر فرماتے ہیں:

”چمک (غره) ہاتھ میں نہیں ہوگی، بلکہ چہرے کے سوا کہیں بھی نہیں ہو سکتی اور اس کو طویل

① صحیح مسلم (۳۴/ ۲۴۶، ۳۵) ریاض الصالحین (۱۰۳۱) المنتقى مع النيل (۱/ ۱۵۲) إرواء الغلیل (۱/ ۱۳۲)

② الترغیب و الترهیب (۱/ ۱۲۴)

③ إرواء الغلیل (۱/ ۱۳۲)

④ فتح الباری (۱/ ۱۳۶) التلخیص (۱/ ۵۸)

کرنا ناممکن ہے، کیوں کہ یہ تو سر میں بھی داخل ہے، جب کہ اسے غرہ کہا ہی نہیں جاتا،^①
حفاظِ حدیث کی ان تصریحات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ آخری جملہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد
نہیں، بلکہ کسی راوی کی طرف سے ادرج ہے۔ البتہ حافظ ابن حجر کے بقول ایک جماعتِ سلف اور
اکثر شافعیہ و حنفیہ نے اطالتِ غرہ کو مستحب قرار دیا ہے اور شیخ ابن باز نے بھی الاطتِ تجلیل کو مشروع
قرار دیا ہے۔^②

7 انگلیوں کا خلال:

ہاتھوں کو دھونے کے دوران میں انگلیوں کا خلال کرنا اور ایسے ہی پاؤں کو دھونے کے دوران
میں پاؤں کی انگلیوں کا خلال کرنا بھی سنت ہے اور قاضی عیاض کے بقول یہ واجب ہے۔^③
یہ خلال کئی احادیث سے ثابت ہے، جیسا کہ سنن ترمذی وابن ماجہ، مسند احمد اور مستدرک حاکم
میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:
«إِذَا تَوَضَّأْتَ فَخَلِّلْ بَيْنَ أَصَابِعِ يَدَيْكَ وَرِجْلَيْكَ»^④
”جب تم وضو کرو، تو ہاتھوں اور پیروں کی انگلیوں میں خلال بھی کرو۔“
ہاتھوں کی انگلیوں کا خلال تو انھیں ایک دوسرے میں داخل کرنے سے بہ آسانی ہو جاتا ہے،
جبکہ پاؤں کی انگلیوں کے خلال کا طریقہ بھی ایک حدیث میں موجود ہے۔ چنانچہ سنن ابی داؤد، ترمذی،

① أعلام الموقعين (٦/٣٦٦) بحوالہ تمام المنة (ص: ٩٢) إرواء الغلیل (١/١٣٢-١٣٣)

② فتح الباری بتعلیق ابن باز (١/٢٣٦-٢٣٧)

③ نیل الأوطار (١/١٥٤)

④ المنتقى مع النيل (١/١٥٣-١٥٤) اس حدیث کی سند میں ایک راوی صالح ہے جو حافظے میں اختلاط ہو جانے
کی وجہ سے ضعیف ہے۔ مگر امام بخاری رضی اللہ عنہ نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے، کیوں کہ یہ موسیٰ بن عقبہ کی صالح
سے روایت ہے اور اس کا سماع اختلاط سے پہلے کا ہے۔ (نیل الأوطار ١/١٥٤) اور تحقیق المشكاة (١/١٢٨)
میں شیخ البانی نے بھی اسے حسن کہا ہے اور امام ترمذی کی تحسین نقل کی ہے۔ ایسے ہی سنن اربعہ، صحیح ابن
خزیمہ وابن حبان، مسند احمد، مستدرک حاکم، سنن بیہقی، شافعی اور دارمی میں حضرت لقیط بن صبرہ رضی اللہ عنہ سے مروی
ہے کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کی: مجھے وضو کے بارے میں بتائیے تو آپ ﷺ نے فرمایا:
«أَسْبِغِ الوُضُوءَ وَخَلِّلْ بَيْنَ الأصَابِعِ» ”وضو اچھی طرح کرو اور انگلیوں کا خلال بھی کرو۔“
المشكاة مع المرعاة (١/٤٧١-٤٧٢) وقد صححه جمع كبير كما في المرعاة و تحقیق الألبانی (١/١٣٨)

ابن ماجہ، مسند احمد اور بیہقی میں حضرت مسنورد بن شداد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ إِذَا تَوَضَّأَ يَذُلُّكَ أَصَابِعَ رَجُلِيهِ بِخَنْصَرِهِ»^①

”میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم وضو کر رہے تھے تو پاؤں کی انگلیوں کو اپنے ہاتھ کی چھگی (سب سے چھوٹی انگلی) سے مل رہے تھے۔“

ایسے ہی سنن دارقطنی میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے، طبرانی اوسط میں حضرت ربیع بنت معوذ رضی اللہ عنہا سے، طبرانی کبیر میں حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے، سنن دارقطنی ہی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے، مسند احمد میں حضرت عبد اللہ بن زائد بن عاصم رضی اللہ عنہ سے اور ایسے ہی مصنف عبدالرزاق اور مصنف ابن ابی شیبہ میں بھی خلال کے بارے میں احادیث موجود ہیں، لیکن ان میں سے تو ہر روایت ہی متکلم فیہ ہے، مگر وہ تین احادیث جو ہم نے ذکر کی ہیں، صحیح و حسن درجے کی ہیں۔ ان کے ساتھ یہ متکلم فیہ احادیث بھی تقویت حاصل کرتی ہیں اور ان سب کا مجموعی مفاد خلال کی مشروعیت کے لیے ایک مضبوط دلیل بن جاتا ہے۔^②

امام ابن قدامہ نے اپنی کتاب ”المغنی“ میں لکھا ہے کہ خلال کرتے وقت دائیں پاؤں کی چھگی سے شروع کریں اور انگوٹھے تک پہنچیں اور بائیں پاؤں کے انگوٹھے سے شروع کریں اور چھگی تک جائیں، اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام امور میں دایاں پہلو محبوب تھا، جیسا کہ صحاح و سنن کے حوالے سے حدیث بھی گزری ہے، لہذا اس طرح خلال کرنے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا محبوب انداز آجائے گا۔^③

دوسری بات یہ کہ پاؤں کی انگلیوں کا خلال کرنے کے لیے جو بھی ہاتھ استعمال کریں، جائز ہے۔ ویسے چونکہ پاؤں دھوئے بھی بائیں ہاتھ سے جاتے ہیں تو ان کی انگلیوں کا خلال بھی بائیں ہاتھ ہی سے بہتر ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی بائیں ہاتھ ہی کا ذکر کیا ہے اور یہ بات کسی نص سے تو

① صحیح سنن أبي داود، رقم الحديث (۱۳۴) صحیح سنن الترمذی، رقم الحديث (۳۷) سنن ابن ماجہ، رقم الحديث (۴۴۶) مسند أحمد (۲۲۹ / ۴) المشكاة مع المرعاة (۴۷۳ / ۱) علامہ مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ نے بعض محدثین سے اس حدیث کی تصحیح نقل کی ہے۔ و صححه الألباني في تحقيق المشكاة (۱ / ۱۲۸)

② نیل الأوطار (۱ / ۱) (۱۵۴)

③ المغنی لابن قدامة (۱ / ۱۰۸)

ثابت نہیں، لیکن امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے پاؤں کی انگلیوں کے خلال کو استنجا پر قیاس کیا ہے اور بائیں ہاتھ کی تجویز پیش کی ہے۔^①

انگوٹھی اور چوڑیوں کا ہلانا:

وضو کے لیے جب ہاتھ دھونے لگیں تو ایک چیز یہ بھی پیش نظر رکھیں کہ اگر کسی ہاتھ میں انگوٹھی ہو یا کسی عورت نے ننگن یا چوڑیاں پہن رکھی ہوں تو انھیں ہلا دینا چاہیے، تاکہ کہیں ان کے تنگ ہونے کی وجہ سے نیچے کی جگہ خشک نہ رہ جائے۔ اس سلسلے میں ایک ضعیف روایت بھی مروی ہے، جو ابن ماجہ اور دارقطنی میں حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے:

«كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا تَوَضَّأَ وَضُوءَ الصَّلَاةِ حَرَكَ خَاتَمَهُ فِي إِصْبَعِهِ»^②

”نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز کا وضو کرنے لگتے تو اپنی انگلی میں انگوٹھی کو ہلاتے تھے۔“

مگر یہ روایت معمر بن عبداللہ کی وجہ سے ضعیف ہے۔ محدثین نے اسے منکر الحدیث کہا ہے۔ وہ اپنے باپ محمد بن عبید اللہ سے بیان کرتے ہیں، جبکہ وہ بھی سخت منکر الحدیث اور ذاہب و متروک ہیں، لہذا یہ سند ضعیف ہوئی۔ زاد المعاد میں علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔^④

البتہ صحیح بخاری شریف میں تعلقاً اور تاریخ امام بخاری اور مصنف ابن شیبہ میں موصولاً امام ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ سے صحیح سند کے ساتھ یہی مروی ہے، چنانچہ بخاری شریف ”باب غسل الأعتاب“ کے ترجمے میں مذکور ہے:

”وَكَانَ ابْنُ سَيْرِينَ يَغْسِلُ مَوْضِعَ الْخَاتَمِ إِذَا تَوَضَّأَ“^⑤

① سبل السلام (۱/ ۴۸) إحياء علوم الدين للغزالي (۱/ ۱۱۹) طبع عالم الكتب دمشق.

② سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۴۴۹) مشكاة المصابيح بتحقيق الألباني (۱/ ۱۳۳-۱۳۴) ضعيف الجامع الصغير، رقم الحديث (۴۳۶۶)

③ المرعاة شرح المشكاة علامه عبید اللہ رحمانی مبارکپوری (۱/ ۴۸۹) تحقیق المشكاة للألباني (۱/ ۱۳۴)

④ زاد المعاد (۱/ ۱۹۸)

⑤ صحیح البخاری مع فتح الباری (۱/ ۲۶۷) یہ صحیح اثر امام ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں تاریخ امام بخاری میں موصولاً مہدی بن میمون کے حوالے سے اور مصنف ابن ابی شیبہ میں بھی موصولاً ہی مروی ہے، لیکن خالد کے حوالے سے مروی ہے۔ فتح الباری شرح صحیح البخاری (۱/ ۲۶۷)

”امام ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ وضو کرتے وقت اپنی انگوٹھی کی جگہ کو دھویا کرتے تھے۔“
تاریخ امام بخاری میں یہی اثر موصولاً بھی مروی ہے اور مصنف ابن ابی شیبہ میں موصولاً یوں
مروی ہے:

«إِنَّهُ كَانَ إِذَا تَوَضَّأَ حَرَّكَ خَاتَمَهُ»^①

”حضرت ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ جب وضو کرتے تو اپنی انگوٹھی کو حرکت دیتے (ہلاتے) تھے۔“
تاریخ امام بخاری اور مصنف ابن ابی شیبہ والی دونوں سندوں کو حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح
قرار دیا ہے۔^②

مرفوع مگر ضعیف حدیث سے قطع نظر اس اثر ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وضو کرتے وقت
انگوٹھی، کنگن، یا چوڑیوں کو پھیر کر ان کے نیچے کی جگہ کو اچھی طرح تر کر لینا چاہیے، تاکہ کہیں ایسا نہ ہو
کہ ان کے نیچے کی جگہ خشک رہ جائے اور اگر کوئی ناخن برابر جگہ بھی اعضاے وضو سے خشک رہ جائے
تو وضو نہیں ہوتا اور اگر وضو ہی نہ ہوا تو نماز کیا ہوگی؟ یہی وجہ ہے کہ احتیاطاً مذکورہ چیزوں کو
دورانِ وضو ضرور ہلا لینا چاہیے۔

کچھ یہی صورت ناک کی تیلی یا کو کے یا نتھ کی بھی ہے کہ ان کو بھی حرکت دے کر ان کے
نیچے تک پانی پہنچانا ضروری ہوگا، لیکن اگر معمولی حرکت دینے سے پانی کے ان کے نیچے تک پہنچ جانے
کی غالب توقع ہو تو پھر انھیں نکالنے کی ضرورت ہے نہ اس سوراخ میں تینکے سے پانی داخل کرنے کی
ضرورت ہے۔ فتاویٰ عالمگیری کی جلد اول کے ابتدائی صفحات (۷) ہی میں یہ بات مذکور ہے، جو
”البحر الرائق“ سے منقول ہے۔ البتہ وہاں انگوٹھی کے ساتھ کان کی بالی کو حرکت دینے کا ذکر ہے۔
ناک میں ڈالی جانے والی نتھ یا تیلی وغیرہ کا نہیں، حالانکہ یہ چاہیے تھا، کیوں کہ ناک دھونے کی جگہ
ہے نہ کہ کان۔ کان پر تو صرف مسح ہی کافی ہے۔^③

① فتح الباری (۱/۲۶۷)

② حوالہ سابقہ

③ (فتاویٰ عالمگیری: ۱/۷۱) فرائض وضو بحوالہ جدید فقہی مسائل، ص: ۲۰/۲۱ از مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، طبع حیدر
آباد۔ انڈیا)

ناخن پالش کا حکم:

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ناخن پالش کا حکم بھی ذکر کر دیا جائے، کیوں کہ عورتیں عموماً نیل پالش استعمال کرتی ہیں، جو ان کے لیے جائز بھی ہے کہ وہ استعمال کر سکتی ہیں، مگر اس کے لیے صرف اتنی احتیاط ضروری ہے کہ اگر اس کے لگائے ہوئے ہی کسی نماز کا وقت ہو جائے تو ریو ورسے اسے اتار کر وضو کریں اور نماز ادا کریں، اسی طرح غسل حیض و نفاس یا غسل جنابت واجب ہو تو بھی پہلے اسے اتار لیں اور پھر غسل کریں۔ وضو اور غسل واجب کے وقت یہ احتیاط کیوں ضروری ہے اور اسے اتارنا کیوں لازمی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ناخن جسم کے ان حصوں میں سے ہے، جسے غسل واجب یا وضو کرتے وقت دھونا ضروری ہے اور پھر اعضاے وضو پر کسی حقیقی ضرورت اور مجبوری کے بغیر کوئی ایسی چیز لگا لینا، جو پانی کو جسم تک پہنچنے سے روکے رکھے، ایسی چیز کی موجودگی میں وضو درست نہیں ہوگا، بلکہ وضو صرف اسی وقت ہو سکے گا، جب اس چیز کو کھرچ دیا جائے۔ نیل پالش یا کوئی بھی ایسا پینٹ جو خواتین لگایا کرتی ہیں، یہ حقیقی ضرورت کے حکم میں نہیں آتے، بلکہ محض زینت شمار ہوتے ہیں۔ اس لیے وضو کرتے وقت ضروری ہوگا کہ ان کو کھرچ دیا جائے، تاکہ ناخنوں کی تہ تک پانی پہنچ سکے۔ اس سلسلے میں فتاویٰ عالمگیری کے یہ الفاظ قابل غور ہیں:

”أَوْ لِزْقٍ بِأَصْلِ ظَفْرِهِ طِينٍ يَابِسٍ أَوْ رَطْبٍ لَمْ يَجْزِ“^①

”اگر اصل ناخن سے خشک یا گیلی مٹی چمٹی ہوئی ہو اور اس کے اوپر سے پانی گزار دیا جائے تو یہ کافی ہوگا نہ وضو صحیح ہوگا۔“

برصغیر کے اہل حدیث علمائے کرام میں سے ایک معروف عالم حافظ عبداللہ محدث روپڑی رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا گیا کہ کیا عورت ناخن پر ناخن پالش لگا کر وضو کر کے نماز پڑھ سکتی ہے؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ناخن پالش لگا کر وضو کرے تو وضو نہیں ہوتا؟ اس سوال کا جواب موصوف نے اپنے ہفت روزہ اخبار ”تنظیم اہل حدیث“ (جلد: ۷ شماره: ۳۳) میں شائع کیا، جو لفظ بہ لفظ یہ ہے:

”ناخن پالش منہدی کی قسم سے ہے۔ منہدی کا رنگ بھی دو تین دفعہ لگانے سے گاڑھا

① بحوالہ جدید فقہی مسائل (ص: ۱۹)

اور موٹا ہو جاتا ہے، جو بالاتفاق جائز ہے۔ ایسا ہی ناخن پالش کو سمجھ لیا جائے۔^(۱)
 مولانا علی محمد سعیدی رحمۃ اللہ علیہ نے اس جواب کو فتاویٰ علمائے حدیث میں نقل کیا تو اپنی طرف سے
 اس پر کوئی توضیحی نوٹ نہیں لکھا، جیسا کہ متعدد مقامات پر انھوں نے کیا ہے، جس سے اندازہ کیا جاسکتا
 ہے کہ موصوف بھی اس جواب پر متفق ہیں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں اس جواب سے اتفاق نہیں،^(۲)
 کیوں کہ موصوف کو علمی مقام و مرتبے کے باوجود معصوم عن الخطا تو نہیں کہا جاسکتا۔
 نہ ان کا اپنا دعوایے عصمت تھا۔ اس لیے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا وہ قول انتہائی اہم ہے، جو وہ
 مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں درس کے دوران میں کہا کرتے تھے:

”كُلُّ يُوْخِذُ وَيُرَدُّ عَلَيْهِ إِلَّا صَاحِبُ هَذَا الْقَبْرِ“^(۳)

”ہر کسی کی کوئی بات مانی اور کوئی رد کی جاسکتی ہے، سوائے اس قبر والے کی بات کے۔“

یہ کہتے ہوئے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر اقدس کی طرف اشارہ کیا کرتے تھے۔ غرض نیل پالش کو
 منہدی پر قیاس کرنے والی رائے مستقیم نہیں اور اس کی کئی وجوہات ہیں۔ مثلاً یہ کہ منہدی کو چاہے کتنی
 دفعہ استعمال کریں، اس کا رنگ تو گاڑھا ہوتا جائے گا، جسے موٹا بھی کہا جاسکتا ہے، مگر اس کی کوئی
 جسامت نہیں ہوگی۔ یعنی ہتھیلی یا ناخن پر اس کی تہہ نہیں جھے گی اور ریہوور سے اسے زائل کرنا ممکن نہیں
 ہوگا، جب کہ نیل پالش کی باقاعدہ تہہ جم جاتی ہے، جسے ریہوور کے ساتھ آسانی سے یا کسی بھی دوسری
 چیز کے ساتھ کھرچ کر زائل کیا جاسکتا ہے۔ منہدی اور پالش کے اس واضح فرق کی بنا پر کہا جاسکتا ہے
 کہ پالش پانی کے ناخن تک پہنچنے میں حائل ہو جاتی ہے، مگر منہدی حائل نہیں ہوتی۔
 لہذا پالش کو منہدی پر قیاس کرنا درست نہ ہو اور پالش اتارے بغیر وضو درست نہ ہو، یہی وجہ ہے
 کہ عورتوں کے لیے نیل پالش کے استعمال کے جواز کے باوجود یہ احتیاط ضروری ہے کہ اسے بہ وقت وضو
 زائل کر لیا جائے، ورنہ وضو صحیح نہیں ہوگا۔

(۱) فتاویٰ علمائے حدیث مولانا علی محمد سعیدی، خانیوال (۱/۶۹)

(۲) ممکن ہے کہ اس وقت نیل پالش اتنی گاڑھی نہ ہوتی ہو، جس کی تہہ جم جاتی ہو، جیسا کہ آج کل ہوتا ہے۔ بلکہ
 پانی کی طرح پتلی ہوتی ہو، جس کی بنا پر حافظ محدث روپڑی رحمۃ اللہ علیہ نے جواز کا فتویٰ دیا ہو۔ مجھے یقین ہے کہ اگر
 آج حافظ صاحب زندہ ہوتے تو اس کے عدم جواز ہی کا فتویٰ دیتے۔

(۳) الاعتصام للشاطبي و صفة الصلاة للألباني (ص: ۴۹) طبع مكتبة المعارف، الرياض.

عمامہ یا پگڑی پر مسح کرنا:

سر کے مسح کے مسائل میں سے یہ امر قابل توجہ ہے کہ اگر کسی نے سر پر پگڑی یا عمامہ باندھ رکھا ہو، تو اس وقت مسح کی کیفیت کیا ہوگی؟ اس سلسلے میں صحیح مسلم میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

”إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ تَوَضَّأَ فَمَسَحَ بِنَاصِيَتِهِ وَعَلَى الْعِمَامَةِ وَالْخُفَيْنِ“^①

”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا تو آپ نے اپنی پیشانی اور دستار مبارک اور موزوں پر مسح کیا۔“

امام شافعی نے امام عطا سے ایک مرسل روایت بیان کی ہے، جس میں امام عطا فرماتے ہیں:

”أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ تَوَضَّأَ فَحَسَرَ الْعِمَامَةَ عَنْ رَأْسِهِ، وَمَسَحَ مُقَدِّمَ رَأْسِهِ“^②

”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو فرمایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمامے کو سر اقدس سے اتارا اور اپنے سر کے اگلے حصے پر مسح کیا۔“

اس کی تائید سنن ابی داؤد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے موصولاً مروی حدیث سے بھی ہوتی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں:

”رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَتَوَضَّأُ، وَعَلَيْهِ عِمَامَةٌ قَطْرِيَّةٌ، فَأَدْخَلَ يَدَيْهِ تَحْتَ الْعِمَامَةَ فَمَسَحَ مُقَدِّمَ رَأْسِهِ وَلَمْ يَنْقُضِ الْعِمَامَةَ“^③

”میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قطری عمامہ باندھے ہوئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک عمامہ کے نیچے داخل کیے اور سر کے اگلے حصے کا مسح کیا اور پورا عمامہ نہیں اتارا۔“

اگرچہ اس کی سند میں ایک راوی ابو معقل غیر معروف ہے، لیکن حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کے قول کے مطابق مرسل و موصول ان دونوں احادیث کا مجموعی مفاد ایک دوسرے سے مل کر قوت اختیار کر جاتا ہے، جبکہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے کہ انھوں نے سر کے

① صحیح مسلم مع شرح النووی (۳/۱۷۳، ۱۷۴) بلوغ المرام مع السبل (۱/۱/۵۱)، طبع بیروت

② فتح الباری (۱/۲۹۳) طبع دار الإفتاء. الرياض

③ سنن أبی داؤد، رقم الحدیث (۱۴۷) المنتقى مع النيل (۱/۱/۱۵۷) طبع بیروت

کچھ حصے کا مسح کیا، جیسا کہ امام ابن المنذر رحمہ اللہ نے کہا ہے اور علامہ ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے بھی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے اس فعل سے اختلاف نہیں کیا۔ یہ سب امور بھی سابق الذکر مرسل روایت کو تقویت دیتے ہیں۔^(۱)

اس طرح معلوم ہوا کہ سر پر پگڑی ہو تو اسے پورا اُتارنے کی ضرورت نہیں، بلکہ اسے تھوڑا سا اٹھا کر اس طرح مسح کر لیں کہ پیشانی اور سر کے کچھ حصے پر مسح ہو جائے اور پھر پگڑی کے اوپر سے گدی تک سر کے مسح کو مکمل کر لیں۔

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ ”زاد المعاد“ میں فرماتے ہیں:

”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سر کے مسح کی تین صورتیں تھیں۔ کبھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پورے سر کا مسح فرماتے تھے۔ کبھی دستار مبارک کے اوپر سے مسح کر لیتے تھے اور کبھی پیشانی کے بالوں اور دستار دونوں پر مسح کیا کرتے تھے۔“

علامہ موصوف کی تحقیق یہ ہے کہ کسی صحیح حدیث سے یہ ہرگز ثابت نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سر کے صرف کچھ حصے پر مسح کیا ہو، بلکہ اگر سر کے کچھ حصے پر مسح کرتے تو بقیہ عمامے پر پورا کر لیتے تھے، جیسا کہ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث مسلم میں ہے اور امام دارقطنی فرماتے ہیں کہ انھوں نے یہ حدیث ساٹھ (۶۰) رواۃ سے بیان کی ہے۔ امیر صنعانی رحمہ اللہ کے بقول سر کے کچھ حصے کو شامل کیے بغیر صرف پگڑی کے اوپر کفایت کرنے کو جمہور اہل علم درست قرار نہیں دیتے۔^(۲)

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کی تحقیق اپنی جگہ، لیکن صحیح بخاری، سنن ابن ماجہ اور مسند احمد میں حضرت عمرو بن اُمیہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

”رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَمْسَحُ عَلَى عِمَامَتِهِ وَخُفَّيْهِ“^(۳)

”میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عمامے (دستار مبارک) اور موزوں پر مسح کرتے تھے۔“

(۱) فتح الباری (۱/ ۲۹۳) نیز دیکھیں: نیل الأوطار إمام شوکانی (۱/ ۱۵۷-۱۵۸) سبل السلام علامہ صنعانی (۱/ ۵۱) طبع بیروت.

(۲) زاد المعاد و تحقیقہ (۱/ ۱۹۴) طبع قطر) سبل السلام (۱/ ۵۱-۵۲)

(۳) صحیح البخاری مع الفتح (۱/ ۳۰۸-۳۰۹) سنن ابن ماجہ (۵۶۲) فقہ السنۃ سید سابق (۱/ ۴۳)

ایسے ہی صحیح بخاری و مسلم اور بعض دیگر کتب میں بھی بعض احادیث موجود ہیں۔ اکثر اہل علم کا عمل بھی یہی رہا ہے اور وہ صرف پگڑی پر مسح کر لینے پر ہی اکتفا کیا کرتے تھے۔^(۱)

اس سے تو بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ صرف سر کے مسح پر کفایت کرنا بھی جائز ہے۔ امام اوزاعی، ایک روایت میں ثوری، احمد، ابو ثور، طبری، ابن خزیمہ اور ابن المنذر کا یہی مسلک ہے۔ امام ابن المنذر کا کہنا ہے کہ حضرت ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما سے بھی یہ ثابت ہے اور صحیح حدیث میں یہ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«إِنْ يُطْعِ النَّاسُ أَبَا بَكْرٍ وَعُمَرَ يَرْشُدُوا»^(۲)

”اگر لوگ ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کی اطاعت کریں گے تو رشد و ہدایت پا جائیں گے۔“

صحیح بخاری کی مذکورہ حدیث میں عمامہ کے لفظ کو شاذ قرار دینے اور کئی دیگر تعلیلیں ذکر کرنے کے بعد حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں لایعنی قرار دیا ہے اور لفظِ عمامہ کو ثقہ راوی کا اضافہ اور قابل قبول کہا ہے، پھر صرف عمامہ پر مسح پر اکتفا کرنے کو جائز کہنے کی رائے کی طرف اپنا میلان ظاہر کیا ہے۔ البتہ اس میں شرط یہ ہے کہ عمامہ اتارنے میں مشقت ہو تو اس پر کفایت کی جاسکتی ہے۔^(۳)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق ایک مسلک کی تائید ہے اور جمہور کا مسلک بھی وہی ہے، البتہ حافظ عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ اور کثیر علما نے صرف عمامہ پر اکتفا کو بھی جائز قرار دیا ہے اور مذکورہ بالا حدیث بخاری ان کی موید ہے۔

ٹوپی کا حکم:

یہ حکم تو عمامہ اور پگڑی کے بارے میں ہے، جس کا دورانِ وضو مکمل طور پر اتارنا حرج کا باعث ہو سکتا ہے۔ اب رہا معاملہ ٹوپی کا، جیسے قراقلی اور رام پوری ٹوپیاں یا جناح کیپ وغیرہ ہیں، ظاہر ہے کہ انہیں اتارنا مشکل نہیں ہوتا، لہذا انہیں اتار کر پورے سر ہی کا مسح کرنا چاہیے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ٹوپی پر مسح جائز ہی نہیں ہے۔ امام ابن المنذر کا کہنا ہے کہ ٹوپی پر مسح کرنے کا کوئی قول نہیں سوائے اس کے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ٹوپی پر مسح کیا۔

(۱) فقہ السنة (۱/ ۴۳ طبع بیروت)

(۲) فتح الباری (۱/ ۳۰۹)

(۳) فتح الباری (۱/ ۳۰۸-۳۰۹)

سنن ائرم کے حوالے سے امام ابن قدامہ نے ”المغنی“ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ اگر کوئی چاہے تو سرنگا کر کے مسح کر لے اور اگر چاہے تو پگڑی یا ٹوپی پر مسح کر لے۔^(۱)

غرض کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تو ٹوپی پر مسح کے بارے میں کوئی قولی یا عملی حدیث ثابت نہیں، البتہ مطلقاً ٹوپی کا استعمال ثابت ہے، جیسے سترے کے باب میں مذکور ایک متکلم فیہ حدیث کے الفاظ «رَبِّمَا نَزَعَ قَلْنَسُوْتَهُ» سے پتا چلتا ہے۔ حضرت انس اور عمر رضی اللہ عنہما کے قول و عمل سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص پگڑی کی طرح ہی ٹوپی کو بھی اٹھا کر سر کے کچھ حصے پر مسح کر کے بقیہ ٹوپی پر کر لے تو مسح ہو جائے گا۔ علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی مسلک اختیار کیا ہے۔^(۲)

عورتوں کے دوپٹے کا حکم:

خواتین کی چادر ہو یا دوپٹا، وہ انھوں نے سر پر باندھا ہوا تو ہوتا نہیں، لہذا اس کا اتارنا آسان ہوتا ہے، انھیں اسے اُتار کر سر ہی پر مسح کرنا چاہیے۔ البتہ بعض خواتین کا جو یہ خیال ہے کہ وضو کرتے وقت سر کے بال ننگے نہیں ہونے چاہئیں، ان کا یہ خیال درست نہیں، کیوں کہ سر کے بالوں کے ننگے ہوتے ہوئے وضو کرنا تو کجا غسل سے قبل سارے جسم کے ننگے ہوتے ہوئے کیا ہوا وضو بھی صحیح ہوتا ہے اور دورانِ غسل اگر کوئی دوسرا ناقض وضو فعل سرزد نہ ہو تو اسی وضو سے نماز ادا کی جاسکتی ہے۔ از سر نو وضو کرنا ضروری نہیں ہوتا، جیسا کہ سنن اربعہ اور مستدرک حاکم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ارشاد فرماتی ہیں:

«كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا يَتَوَضَّأُ بَعْدَ الْغُسْلِ»^(۳)

”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غسل کے بعد وضو نہیں کیا کرتے تھے۔“

گھر کے اندر یا صرف عورتوں کی موجودگی میں بالوں کا ننگا کر لینا جائز ہے اور غیر محرم مردوں کی موجودگی میں سرنگا کر لینا منع ہے، تو ان کی موجودگی میں ظاہر ہے کہ وضو کا انداز بھی پردے کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہی اختیار کرنا ہوگا، لہذا دونوں صورتوں کا فرق واضح ہے۔

(۱) المغنی (۱/۳۰۴-۳۰۵)

(۲) المحلی لابن حزم (۱/۵۸/۲) المغنی (۱/۳۰۴-۳۰۵)

(۳) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۲۴۶) صحیح سنن أبي داد، رقم الحدیث (۲۲۵) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۹۳) سنن ابن ماجه (۵۷۹) المستدرک (۱/۱۵۳) صحیح الترمذی و الحاکم و الذہبی والألبانی کما فی تحقیق المشکاة (۱/۱۳۹) و صحیح الجامع، رقم الحدیث (۴۸۴۳)

کانوں کا مسح کرنے کے لیے نیا پانی لینا

اب رہا معاملہ کانوں کے مسح کے لیے پانی کا تو اس سلسلے میں سنن ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور مسند احمد میں ایک حدیث مروی ہے، جس کے موقوف یا مرفوع ہونے میں قدرے اختلاف ہے۔ البتہ اکثر اہل علم کا قول یہ ہے کہ یہ مرفوعاً نبی اکرم ﷺ سے مروی ہے، جس میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

«الْأَذُنَانِ مِنَ الرَّأْسِ»^(۱) ”کان سر ہی کا حصہ ہیں۔“

یعنی ان کا بھی سر کی طرح ہی مسح کیا جائے گا نہ کہ انھیں منہ کی طرح دھویا جائے گا۔ کانوں کے سر کا حصہ ہونے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سر کے مسح والے بچے ہوئے پانی سے کانوں کا مسح بھی کیا جاسکتا ہے۔ نیا پانی لینے کی ضرورت نہیں، جب کہ سنن بیہقی اور مستدرک حاکم کی ایک روایت حضرت عبداللہ بن زائد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں:

«إِنَّهُ رَأَى النَّبِيَّ ﷺ يَأْخُذُ لِأَذُنَيْهِ مَاءً غَيْرَ الَّذِي أَخَذَهُ لِرَأْسِهِ»^(۲)

”انھوں نے دیکھا کہ نبی اکرم ﷺ کانوں کے مسح کے لیے سر کے مسح والے پانی کے علاوہ نیا پانی لیتے تھے۔“

امام مالک، احمد، شافعی اور ابو ثور رحمہم اللہ کے نزدیک اس حدیث کی بنا پر کانوں کے مسح کے لیے نیا پانی لینا چاہیے۔ یہ حدیث اس بات کی واضح دلیل ہے۔^(۳) تو گو یا ان دونوں طریقوں کے دلائل ہی موجود ہیں۔ سر کے مسح سے بچی ہوئی تری سے مسح کرنے اور نیا پانی لینے پر دلالت کرنے والی مستدرک حاکم کی روایت کو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بظاہر صحیح کہا ہے اور بیہقی والی روایت کو امام بیہقی نے صحیح قرار دیا ہے۔^(۴)

(۱) صحیح سنن أبي داود، رقم الحديث (۱۲۲) المشكاة مع المراجعة (۱/ ۴۷۹- ۴۸۰)

(۲) بلوغ المرام مع سبل السلام (۱/ ۴۹) و نیل الأوطار (۱/ ۱۶۱)

(۳) حوالہ جات سابقہ.

(۴) نیل الأوطار (۱/ ۱۶۱)

لہذا جائز تو دونوں صورتیں ہی ہوں۔ اب بات رہ جاتی ہے صرف ترجیح کی کہ ان دونوں صورتوں میں سے راجح صورت کون سی ہے؟ اس سلسلے میں مولانا ابوسعید شرف الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے کانوں کے لیے نیا پانی لینے کے راجح ہونے کا میلان ظاہر کیا ہے۔^①

موطا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ میں حضرت نافع رحمۃ اللہ علیہ، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں بیان فرماتے ہیں:

”إِنَّهُ كَانَ إِذَا تَوَضَّأَ يَأْخُذُ الْمَاءَ بِإِصْبَعَيْهِ لِأَذْنَيْهِ“^②

”جب وہ وضو فرماتے تو کانوں کا مسح کرنے کے لیے اپنی (شہادت کی) دونوں انگلیوں

کے ساتھ پانی لیتے تھے۔“

علامہ ابن قیم کی تحقیق کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کانوں کے لیے نیا پانی لینا تو ثابت نہیں، البتہ یہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ثابت ہے۔^③

گردن کا مسح:

مسائل وضو کے ضمن میں سر اور کانوں کے مسح کا ذکر ہو چکا ہے۔ بعض لوگ ان کے ساتھ ہی اپنے اٹے ہاتھوں سے گردن کا مسح بھی کرتے ہیں، مگر یہ فعل کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے۔ اسے جائز ثابت کرنے کے لیے بعض روایتوں کا سہارا لیا جاتا ہے، جب کہ وہ ضعیف ہونے کی وجہ سے قابل استدلال نہیں۔ ان میں سے ایک مسند احمد میں مروی ہے، جسے طلحہ بن مصرف اپنے باپ اور دادا کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

”إِنَّهُ رَأَى رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَمْسَحُ رَأْسَهُ حَتَّىٰ بَلَغَ الْقَذَالَ، وَمَا يَلِيهِ مِنْ مُقَدِّمِ الْعُنُقِ“^④

”انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سر کا مسح کرتے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گدی اور گردن کے

① فتاویٰ علمائے حدیث (۱۰۳/۱)

② الموطأ مع تنویر الحوالک للسیوطی (۵۶/۱/۱) طبع بیروت.

③ نیل الأوطار (۱۶۲/۱/۱) زاد المعاد (۱۹۴/۱-۱۹۵)

④ المنتقی مع النیل (۱۶۳/۱/۱)

پہلے حصے کا بھی مسح کیا۔“

امام مجتہد قاضی شوکانی رحمۃ اللہ علیہ اس روایت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس کی سند میں ایک راوی لیث ابن ابی سلیم ہے، جو ضعیف ہے، پھر انھوں نے کبار محدثین مثلاً: امام ابن حبان، یحییٰ بن قطان، ابن مہدی، ابن معین اور احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم کے اس راوی کے بارے میں اقوال جرح نقل کیے ہیں اور تہذیب الاسماء نووی کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ اس راوی کے ضعیف ہونے پر تمام علما کا اتفاق ہے، نیز اس روایت میں جو طلحہ کے دادا ہیں، ان کا صحابی ہونا ہی مختلف فیہ ہے، بلکہ ان کے اہل خاندان ان کے صحابی نہ ہونے کے قائل ہیں اور طلحہ کے والد بھی غیر معروف ہیں۔ غرض کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔^(۱)

اگر اس روایت کو صحیح بھی مان لیا جائے، تب بھی گردن کے مسح کا ثبوت اس روایت سے نہیں ملتا، بلکہ زیادہ سے زیادہ صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب سر کا مسح کرتے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو اتنا پیچھے لے جاتے کہ گدی اور گردن تک ہاتھ پہنچ جاتے۔ اس روایت میں الٹے ہاتھوں اور نئے سرے سے مسح کرنے کا تو ذکر ہی نہیں۔ اس سلسلے میں ایک دوسری حدیث بھی مروی ہے، جس سے گردن کے مسح کی دلیل لی جاسکتی ہے۔ وہ روایت سنن ابوداؤد میں اسی سند سے مذکور ہے، جس کا

ابھی ہم نے ذکر کیا ہے۔ اس حدیث میں ہے:

«وَمَسَحَ رَأْسَهُ مِنْ مُقَدِّمِهِ إِلَى مُؤَخَّرِهِ حَتَّى أَخْرَجَ يَدَيْهِ مِنْ تَحْتِ أُذُنَيْهِ»^(۲)

”آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سر کا مسح کیا، اس کے شروع سے لے کر اس کے آخری حصے تک، حتیٰ کہ

اپنے ہاتھوں کو کانوں کے نیچے سے نکالا۔“

اس کی سند پر بھی وہی جرح ہے، جو پہلی روایت پر گزری ہے۔ لہذا اس میں بھی جب تین وجوہات یعنی ① لیث ابن ابی سلیم کا ضعف۔ ② ابوطلحہ کے والد مصرف کی جہالت۔ ③ مصرف کے والد کی صحابیت میں اختلاف یکجا ہیں، تو اس روایت کے امام نووی، ابن تیمیہ اور حافظ ابن حجر کے بقول ضعیف اور ناقابل استدلال ہونے میں بھی کوئی شک نہ رہا۔^(۳)

(۱) نیل الأوطار (۱/۱/۱۶۳)

(۲) سنن أبي داود، رقم الحديث (۱۳۲) الضعيفة للألباني (۱/ ۹۹)

(۳) نیل الأوطار (۱/۱/۱۶۳) و السلسلة الضعيفة (۱/ ۹۹)

اسی موضوع کی ایک تیسری حدیث بھی ہے، جس میں مروی ہے:

«مَسْحُ الرَّقَبَةِ أَمَانٌ مِنَ الْعُلِّ»^(۱)

”گردن کا مسح کرنا قیامت کے دن گلے میں طوق پہنائے جانے سے امان کا سبب ہے۔“

اس روایت کے بارے میں ”المجموع شرح المہذب“ میں امام نووی رحمہ اللہ فرماتے

ہیں ”کہ یہ حدیث من گھڑت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام نہیں ہے۔“

امام سیوطی نے من گھڑت حدیثوں کا جو مجموعہ تیار کیا ہے، اس کے ذیل میں یہ حدیث اور امام

نووی رحمہ اللہ کا من گھڑت کہنا نقل کیا ہے اور اسے برقرار رکھا ہے۔ ”تخریج أحادیث إحياء

علوم الدین“ (۱/ ۱۱۹) میں علامہ عراقی نے بھی اسے ضعیف کہا ہے۔ ”تلخیص الحبیر“ میں

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے امام الحرمین ابو محمد جوینی کے حوالے سے لکھا ہے کہ ائمہ حدیث اس روایت کی

سند کو پسند نہیں کرتے اور علامہ ابن صلاح نے کہا ہے:

”یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام نہیں، بلکہ سلف میں سے کسی شخص کا کلام ہے۔“^(۲)

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ گردن کا مسح کرنا سنت نہیں، بلکہ بدعت ہے۔^(۳)

اسی موضوع کی ایک اور روایت حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ”تلخیص الحبیر“ میں تاریخ اصفہان

ابونعیم کے حوالے سے ذکر کی ہے، جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ مرفوعاً بیان کرتے ہیں:

«مَنْ تَوَضَّأَ وَمَسَحَ عُنُقَهُ، لَمْ يُغَلَّ بِالْأَعْلَالِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ»^(۴)

”جس شخص نے وضو کیا اور اپنی گردن کا مسح بھی کیا، اسے قیامت کے دن طوق نہیں پہنایا

جائے گا۔“

”البحر للرومانی“ کے حوالے سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت بیان کی گئی ہے،

جس میں مروی ہے:

{1} السلسلة الضعيفة (۱/ ۹۷)

{2} مصدر سابق.

{3} نیل الأوطار (۱/ ۱۶۳)

{4} سلسلة الأحاديث الضعيفة للألباني (۱/ ۹۸)

«مَنْ تَوَضَّأَ وَمَسَحَ بِيَدَيْهِ عُنُقَهُ، وَقَى الْغُلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ»^①

”جس شخص نے وضو کیا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی گردن کا مسح کیا تو وہ قیامت کے دن طوق سے بچ جائے گا۔“

ابن عمر رضی اللہ عنہما والی اس روایت کو ملا علی قاری نے موضوعات میں مسند الفردوس دیلمی کی طرف منسوب کرتے ہوئے ضعیف قرار دیا ہے۔^② غرض کہ اس موضوع کی یہ پانچ روایتیں ہیں اور پانچوں ہی من گھڑت یا ضعیف ہیں۔ چنانچہ علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے ”زاد المعاد“ میں سچ ہی کہا ہے:

”وَلَمْ يَصِحَّ عَنْهُ (رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ) فِي مَسْحِ الْعُنُقِ حَدِيثُ الْبَتَّةِ“^③

”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے گردن کے مسح کے بارے میں کوئی بھی صحیح حدیث نہیں ملتی۔“

علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کے استاد اور معروف مجدد و مصلح شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ سے گردن کے مسح کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے جو فتویٰ دیا، وہ ان کے مجموع الفتاویٰ (۲۱/ ۱۲۷-۱۲۸) میں مذکور ہے، جس میں موصوف فرماتے ہیں:

”نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی صحیح حدیث نہیں ملتی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوران وضو گردن کا مسح کیا ہو اور نہ کسی صحیح حدیث (روایت) میں یہ بات مذکور ہے، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مسنون وضو کا طریقہ بتانے والی صحیح حدیث سے تو پتا چلتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گردن کا مسح نہیں کیا کرتے تھے۔ لہذا جمہور علماء و ائمہ جیسے امام مالک، شافعی اور احمد رحمۃ اللہ علیہم اسے مستحب قرار نہیں دیتے اور جو کوئی گردن کے مسح کو مستحب قرار دیتا ہے، اس کا اعتماد اسی اثر یا روایت پر ہے، جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، یا اس ضعیف روایت پر ہے، جس میں مذکور ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سر کا مسح کیا، یہاں تک کہ ہاتھ گدی تک پہنچ گئے۔ ایسی ضعیف روایات قابل استدلال و حجت نہیں ہوتیں اور نہ ایسی روایات صحیح احادیث کے مدلول کی معارض و مخالف ہو سکتی ہیں۔ لہذا جو شخص گردن کا مسح نہ کرے، اس کا وضو علماء کے اتفاق کے ساتھ صحیح ہے۔“

① سلسلۃ الأحادیث الضعیفۃ للألبانی (۱/ ۹۸)

② حوالہ جات سابقہ.

③ زاد المعاد (۱/ ۹۵) نیز ”فتح القدیر لابن ہمام“ اور ”عون المعبود“ کا مراجعہ فرمائیں۔

امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے مذکورہ روایات کے علاوہ بھی بعض روایات نقل کی ہیں اور بعض اہل علم کا گردن کے مسح کو مستحب کہنے کا قول نقل کیا ہے۔^① جب کہ وہ قول جمہور ائمہ کے خلاف ہے۔ ان تمام تصریحات سے معلوم ہوا کہ گردن کے مروجہ مسح کی بات بلا دلیل و بلا ثبوت ہے اور جس قدر مسح کا پتا چلتا ہے، وہ سر کے مسح میں داخل اور اسی کا تتمہ ہے۔ اگلے ہاتھوں سے گردن کا مسح صحیح تو کیا کسی ضعیف حدیث میں بھی مذکور نہیں ہے، لہذا سے ترک کرنا ہی اولیٰ ہے۔

⑩ ٹخنوں سمیت پاؤں دھونا:

سر اور کانوں کے مسح کے بعد پہلے دایاں اور پھر بائیں پاؤں ٹخنوں تک دھویا جاتا ہے، جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کا مسنون طریقہ بتانے والی صحیح احادیث گزری ہیں، نیز ہاتھوں کی انگلیوں کے خلال کے ساتھ ہی یہ بھی ذکر ہوا تھا کہ پاؤں کی انگلیوں کا خلال کرنا بھی مستحب ہے اور اس سلسلے کی تین احادیث حضرت ابن صبرہ، ابن عباس اور مستور بن شداد رضی اللہ عنہم سے ذکر کی گئی تھیں، لہذا اب انھیں دہرانے کی ضرورت نہیں۔

ایڑیاں دھونے پر توجہ دینا:

یہاں ایک اور بات بھی بطور خاص ذہن نشین کر لیں کہ بعض لوگ پاؤں کو دھوتے وقت جلد بازی اور بے پروائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس طرح اٹھ جاتے ہیں کہ ان کے پاؤں کی ایڑیوں کے سوکھے رہ جانے کا امکان ہوتا ہے۔ پوری ایڑیاں نہیں تو کہیں کہیں کوئی جگہ خشک رہ جائے، چاہے وہ ناخن برابر ہی کیوں نہ ہو تو اس طرح وضو نہیں ہوتا، بلکہ ایسے لوگوں کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت وعید سنائی ہے، جو متعدد صحیح احادیث میں مذکور ہے۔ مثلاً صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ (مکہ سے مدینہ تک) ایک سفر میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے پیچھے رہ گئے اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں آلیا، جب کہ عصر کا وقت نکل رہا تھا۔ لہذا ہم نے وضو کرنا اور پاؤں پر مسح کرنا شروع کیا تو یہ دیکھ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بلند آواز سے پکار کر دو تین مرتبہ فرمایا:

«وَيْلٌ لِّلْأَعْقَابِ مِنَ النَّارِ»^②

① نیل الأوطار (۱/۱/۱۶۴)

② صحیح البخاری مع الفتح، رقم الحدیث (۶۰) صحیح مسلم مع شرح النووي (۳/۱۲۸) صحیح ←

”خٹک رہ جانے والی ایڑیوں کے لیے جہنم کی آگ کا عذاب ہے۔“

صحیح بخاری و مسلم اور سنن ابن ماجہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث تو اور بھی واضح تر ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ رَأَى رَجُلًا لَمْ يَغْسِلْ عَقِبَهُ، فَقَالَ: وَيْلٌ لِلْأَعْقَابِ مِنَ النَّارِ»^①

”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو دیکھا، جس نے اپنی ایڑی نہیں دھوئی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت فرمایا: ایسی ایڑیوں کے لیے آگ کا عذاب ہے۔“

ایک تیسری حدیث سنن ابن ماجہ اور مسند احمد میں حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

«رَأَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ قَوْمًا تَوَضَّؤُوا، وَلَمْ يَمَسَّ أَعْقَابَهُمُ الْمَاءُ فَقَالَ: وَيْلٌ لِلْأَعْقَابِ مِنَ النَّارِ»^②

”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض لوگوں کو دیکھا کہ ان کی ایڑیوں کو پانی نہیں پہنچا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایسی ایڑیوں کے لیے نار جہنم کا عذاب ہے۔“

اس موضوع کی کئی اور احادیث بھی ہیں، مگر ان سے قطع نظر صرف ان مذکورہ تین احادیث ہی کو سامنے رکھا جائے، جن میں صحیح بخاری و مسلم کی احادیث بھی ہیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایڑیوں سمیت دونوں پاؤں کو دھونا ہی فرض ہے نہ کہ ان پر مسح کرنا۔ اس طرح سورۃ المائدہ (آیت: ۶) میں جہاں وضو کا ذکر ہے اور اس آیت: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ﴾ کے بعد ہے: ﴿وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ﴾ جس کا معنی ﴿أَرْجُلَكُمْ﴾ کی لام پر زبر ہونے کی شکل میں یہ بنتا ہے کہ ”اپنے پیروں کو ٹخنوں تک دھوؤ۔“

جمہور علمائے تفسیر کے نزدیک قراءت یہی ہے، جب کہ بعض نے منہ اور ہاتھوں پر پاؤں کا

← سنن أبي داود، رقم الحديث (۸۸) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (۱۰۷) المنتقى مع النيل (۱/۱/۱۶۷)
 ① صحيح البخاري (۱۷۳/۱) مترجم اردو، صحيح مسلم مع شرح النووي (۱۳۱/۳) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۴۵۳) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (۱۰۷) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۸)
 ② سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۴۵۴) و المنتقى مع النيل (۱/۱/۱۶۹)

عطف ماننے کے بجائے پاؤں کا عطف سروں پر مانا ہے اور ”أَرْجُلِكُمْ“ یعنی لام کی زیر سے پڑھا ہے۔ اس طرح معنی یہ بنتا ہے: ”سروں اور ٹخنوں تک پیروں کا مسح کرو۔“ جب کہ احادیثِ رسول ﷺ اور آپ ﷺ کا عمر بھر کا اسوۂ حسنہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تعامل شاہد ہیں کہ پاؤں کا مسح نہیں، بلکہ پاؤں کو دھویا ہی جاتا ہے۔ لہذا مذکورہ آیت میں ”أَرْجُلِكُمْ“ والی قراءت کے بجائے صحیح تر قراءت ”أَرْجُلِكُمْ“ ہی ہے اور پاؤں کا دھونا ہی فرض و واجب ہے۔ اب اگر یہاں مفسرین کرام کی تصریحات کا ذکر شروع کر دیا جائے تو بات لمبی ہو جائے گی۔ لہذا ہم صرف ایک مفسر زنجیزی رضی اللہ عنہ کی ”تفسیر الکشاف“ (۱/ ۵۹۷ طبع دار المعرفة بیروت) سے صرف ایک نکتہ ذکر کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ چنانچہ موصوف لکھتے ہیں:

”علما (تفسیر ونحو اور اہل لغت) کی ایک جماعت نے لام کی زبر کے ساتھ ”أَرْجُلِكُمْ“ ہی پڑھا ہے کہ پاؤں دھوئے جانے والے اعضا ہیں۔ اگر تم کہو کہ اس کی زیر والی قراءت اور مسح کے حکم میں دخول کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ تو میرا جواب یہ ہے کہ پاؤں اُن اعضا میں سے ہیں، جو دھوئے جاتے ہیں اور انھیں اوپر سے پانی بہا کر دھویا جاتا ہے۔ ان کے دھونے میں پانی میں غیر ضروری اور ممنوع و مذموم فضول خرچی کا امکان تھا، لہذا ان کا عطف دھوئے جانے والے اعضا کے بجائے عضوِ مسح (سر) پر کر دیا ہے۔ یہ اس لیے نہیں کہ اس کا بھی مسح ہی کیا جائے، بلکہ اس لیے کہ انھیں دھوتے وقت پانی میں میاں روی کے وجوب پر تنبیہ کی جاسکے، پھر ساتھ ہی ﴿إِلَى الْكَعْبَيْنِ﴾ بھی ذکر کر دیا کہ یہ دھونا ٹخنوں تک ہوگا اور یہ غایت مسح کا ظن دور کرنے کے لیے لائی گئی ہے، کیوں کہ مسح کی شریعت میں کوئی غایت و انتہا نہیں آئی اور جہاں اس غایت کا ذکر ہے، وہاں متعلقہ عضو کو دھونے کا ذکر ہے۔“^(۱)

اس نکتے کے بعد علامہ زنجیزی نے پاؤں کو دھونے کے بجائے ان کے مسح پر مصر حضرات کے امام اول حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ بھی نقل کیا ہے کہ انھوں نے بعض قریشی نوجوانوں کو وضو میں

(۱) شرح العقيدة الطحاوية. صحیح بات یہ ہے کہ دونوں قراءت ہی صحیح ہیں اور متواتر ہیں۔

(۲) الکشاف (۱/ ۵۹۷) المحلی لابن حزم (۱/ ۵۸ / ۲)

جلدی کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا:

«وَيْلٌ لِّلْأَعْقَابِ مِنَ النَّارِ»

”ان ایڑیوں کے لیے نارِ جہنم کا عذاب ہے (جو خشک رہ جائیں)۔“

جب ان نوجوان نے حضرت علیؓ کی زبان سے یہ الفاظ سنے تو انھوں نے پاؤں کو اچھی طرح مل مل کر دھونا شروع کر دیا۔^①

معروف تابعی اور محدث امام عطاء اللہؒ فرماتے ہیں:

«وَاللَّهِ مَا عَلِمْتُ أَنَّ أَحَدًا مِّنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ مَسَحَ عَلَى الْقَدَمَيْنِ»^②

”اللہ کی قسم! نبی اکرم ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کوئی ایک بھی ایسا صحابی میرے علم میں

نہیں، جو پاؤں (کو دھونے کے بجائے ان) پر مسح کرتا ہو۔“

سنن ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ اور صحیح ابن خزمیہ میں مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے وضو کیا،

جس میں اپنے پاؤں مبارک دھوئے اور آخر میں فرمایا:

«فَمَنْ زَادَ عَلَى هَذَا أَوْ نَقَصَ فَقَدْ سَاءَ وَظَلَمَ»^③

”جس نے اس سے زیادہ یا کم کیا، اس نے برا کیا اور ظلم کیا۔“

اس حدیث کے پیش نظر پاؤں پر مسح کرنا، بلاشبہ دھونے کی نسبت نقص اور کمی کرنا ہے، جسے

آپ ﷺ نے برائی اور ظلم قرار دیا ہے۔ ان احادیث اور اجماع صحابہ کے پیش نظر اس آیت کی قراءت

زبر ہی سے صحیح تر ہے اور پیروں کا دھونا ہی فرض ہے نہ کہ مسح کرنا۔

جب آپ وضو مکمل کر لیں تو اب یہاں تین مسئلے پیش آتے ہیں:

❶ ان میں سے ایک تو وضو کے سابقہ تمام مسائل کی طرح مرد و زن سب کے لیے یکساں ہے اور

وہ ہے: وضو سے فارغ ہونے کے بعد کھڑے ہو کر ایک آدھ گھونٹ پانی پینا۔

① تفسیر الکشاف (۱/۵۹۷-۵۹۸)

② مصدر سابق (ص: ۵۵۸)

③ صحیح سنن ابی داؤد، رقم الحدیث (۱۲۳) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۱۳۶) نیل الأوطار

(۱/۱۶۸) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۴۲۲) لیکن اس میں ”أَوْ نَقَصَ“ کے الفاظ نہیں ہیں۔ ”أَوْ نَقَصَ“

کے الفاظ شاذ ہیں۔ فتح الباری ملاحظہ فرمائیں۔

۲ دوسرا مسند بعض وجوہات کی بنا پر مردوں کے ساتھ خاص ہے اور وہ ہے: وضو سے فارغ ہو کر شرم گاہ پر پانی کا چھینٹا مارنا۔

۳ تیسرا بھی سب کے لیے برابر ہے اور وہ ہے: وضو مکمل کرنے کی دعا کرنا۔

ان تینوں امور کی تفصیل و وجوہات اور دلائل کو سر دست ہم موخر کر رہے ہیں، تاکہ وضو ہی سے تعلق رکھنے والے بعض دیگر امور کا تذکرہ پہلے کر لیں، جو عام حالات سے تو تعلق نہیں رکھتے، البتہ بعض حالات میں ان کی ضرورت پیش آ جاتی ہے، مثلاً:

۱ کسی کے دانت مصنوعی ہوں، تو ان کے بارے میں کیا حکم ہے؟

۲ کسی کے بعض دیگر اعضا میں سے کوئی عضو مصنوعی ہو تو اس وقت اس کے وضو کی کیا صورت ہوگی؟

۳ ہاتھ پاؤں وغیرہ پر بوجہ مجبوری پلاسٹر لگایا گیا ہو تو وضو کیسے ہوگا؟

۴ اعضاے وضو میں سے کسی پر ”ڈامر“ لگا ہو تو وضو کی کیفیت کیا ہوگی؟

۵ اگر کسی مرد یا عورت نے وگ لگا رکھی ہو تو سر کے مسح کا طریقہ کیا ہوگا؟

۶ موسم سرما میں سردی سے بچنے کے لیے یا ویسے ہی کسی نے چمڑے کے موزے ایسے ہی اون،

فوم، کاٹن یا نائیلون کی جرابیں پہن رکھی ہوں، تو وہ کیسی ہونی چاہئیں اور ان کی موجودگی میں

مسح کے احکام و مسائل کیا ہیں؟ ان پیچھے مسائل کے بعد ہم مذکورہ تین امور ذکر کریں گے اور

پھر ان کے ساتھ ہی مسائل وضو مکمل ہو جائیں گے۔ (ان شاء اللہ)



مصنوعی اعضا کی صورت میں غُسل اور وضو کے احکام

مصنوعی دانتوں کا حکم:

آئیے پہلے دیکھیں کہ اگر کسی کے اصلی دانت کسی بیماری کی وجہ سے یا اپنی طبعی مدت کو پہنچنے کی وجہ سے نہ رہے ہوں اور اس نے مصنوعی دانت لگوا رکھے ہوں تو اس صورت میں غُسل اور وضو کے کیا احکام و مسائل ہیں؟

اس سلسلے میں بنیادی بات یہ ہے کہ مصنوعی دانت دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو مستقل طور پر لگا دیے جاتے ہیں اور انھیں آسانی سے نکالا نہیں جاسکتا۔ دوسرے وہ جو بنائے ہی اس طرح جاتے ہیں کہ حسبِ ضرورت ان کا استعمال کیا جاتا ہے اور جب چاہیں انھیں نکال کر رکھ لیا جاتا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں سے پہلی صورت میں تو یہ مصنوعی دانت بھی اصل کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کا حکم بھی اصلی دانتوں ہی کا ہوگا۔ وضو میں ان دانتوں تک پانی پہنچانا مسنون اور ضروری غُسل میں فرض ہوگا۔ ایسے دانتوں کو نکال کر ان کی نچلی جگہ تک پانی پہنچانے کی ضرورت نہیں ہے، جس کا واضح قرینہ یہ ہے کہ فقہانے اس طرح کے دانت لگانے یا دانتوں کو سونے یا چاندی کی تاروں کے ساتھ مضبوط کرنے کی اجازت دی ہے، جیسا کہ فقہ حنفی کی کتاب در مختار کے حاشیہ و شرح ”رد المحتار“ (۵/۳۱۸) میں بھی یہ بات مذکور ہے۔

اب ظاہر ہے کہ مصنوعی دانتوں کو سونے یا چاندی کے تاروں سے مضبوط کرنے کی اجازت کا مطلب یہی ہوگا کہ ان کے اندرونی حصوں میں پانی پہنچانا ضروری نہیں ہے۔ ورنہ یہ اجازت بڑی پریشان کن بھی ہوگی اور لا یعنی بھی۔ یہ حکم تو ان مصنوعی دانتوں کے بارے میں ہے، جو تاروں کے ﴿۱﴾ ”مصنوعی اعضاء اور خارجی اشیاء (زیورات وغیرہ) کی صورت میں احکام غُسل و وضو“ کے نام سے ہماری ایک کتاب الگ سے بھی شائع ہو چکی ہے۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَمِنْهُ الْقَبُولُ

ساتھ مضبوط کیے ہوئے ہوں یا پوری بتیسی ہو اور اسے اتارنا نہ جاتا ہو، سوائے کبھی کبھار کے، جبکہ دوسری صورت ان دانتوں کی ہے، جو حسب ضرورت لگائے اور اتارے جاتے ہیں اور انھیں اتارنا اور لگانا آسان بھی ہوتا ہے، بلکہ بعض لوگ اپنی زبان کے دباؤ سے انھیں ہلاتے بھی رہتے ہیں۔ ایسے دانتوں کی حیثیت ایک زائد چیز کی ہوگی، یعنی ایسے مصنوعی دانت کی شکل میں غسل اسی وقت درست ہوگا، جب اس کے نیچے کی جگہ تک پانی پہنچ جائے۔ یہ کوئی مشکل بھی نہیں ہوتا کہ زبان کے معمولی دباؤ سے انھیں ڈھیلا کر لینے سے اصل جسم تک پانی پہنچ جائے گا اور ایسا ہی وضو کرتے وقت بھی کر لیں۔^①

مصنوعی اعضا کے وضو کا حکم:

چھ مسائل میں سے دوسرا مسئلہ یہ ذکر کیا گیا تھا کہ اگر کسی کے دیگر اعضا میں سے کوئی عضو مصنوعی ہو تو اس سلسلے میں بھی احکام وضو اور طریقہ وہی ہوگا، جو مصنوعی دانتوں کے سلسلے میں ذکر ہوا ہے، یعنی اگر عضو کی بناوٹ اس نوعیت کی ہو کہ جراحی یا آپریشن کے بغیر اسے الگ کرنا ممکن نہ ہو تو اس کی حیثیت اصل عضو ہی کی ہوگی۔ اگر وہ عضو اعضاے وضو میں سے ہو تو اُسے دھونا واجب ہوگا اور غسل میں بھی اس پر پانی پہنچانا واجب ہوگا، لیکن اگر اس کی بناوٹ اور نوعیت ایسی ہو کہ وہ آسانی سے علاحدہ کیا جاسکتا ہو تو غسل کے وقت، اسی طرح اگر وہ اعضاے وضو میں سے ہو تو وضو کرتے وقت، اس عضو کو الگ کر کے یا ڈھیلا کر کے جسم کے اصل حصے پر پانی پہنچانا ضروری ہوگا۔ جو اعضا آسانی سے الگ ہو سکتے ہیں، انھیں تو الگ کرنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی، بلکہ خود بہ خود ان کے نیچے پانی گھس جاتا ہے، البتہ بہ وقت غسل وضو معمولی توجہ سے بطور خاص اس کے نیچے پانی پہنچالینا کافی ہوگا اور یہ کوئی دقت طلب امر بھی نہیں ہوگا، بلکہ یہی سمجھیں گے کہ جس طرح انگوٹھی، کنگن یا چوڑیوں کے ذرائع ہونے کی شکل میں ہوتا ہے، وہی معاملہ یہاں بھی ہوگا اور جیسے انھیں معمولی حرکت دے لینے سے مقصود حاصل ہو جاتا ہے، ویسے یہاں بھی ہو جائے گا۔^②

پلاسٹر پر مسح:

اگر بالفرض کسی مجبوری کی وجہ سے کسی کے ہاتھ یا پاؤں وغیرہ پر پلاسٹر لگا ہوا ہو، تو غسل یا وضو

① جدید فقہی مسائل (ص: ۱۹، ۲۰)

② جدید فقہی مسائل (ص: ۲۰)

کے لیے اس صورت میں کیا طریقہ اختیار کیا جائے گا؟ اس سلسلے میں بھی شریعتِ اسلامیہ کے مصادر میں ہدایات موجود ہیں کہ اس پلاسٹر پر صرف مسح کر لیا جائے، یعنی اس کے اوپر صرف گیلہا ہاتھ پھیر دیا جائے، اُسے دھونے کی بھی ضرورت نہیں ہے اور اس کی حیثیت جبیرہ یعنی پٹی پر مسح کی ہوگی، جو فقہ اسلامی کا معروف مسئلہ ہے۔ جبیرہ یا جبارۃ کی تعریف میں امام ابنِ قدامہ ”المغنی“ (۱/ ۲۷۷) میں اور صاحب ”مغنی المحتاج“ (۱/ ۹۴) لکھتے ہیں:

”کسی لکڑی وغیرہ کی وہ پٹی جو برابر تراش کر کسی جوڑ کے اتر جانے پر یا کسی ہڈی کے ٹوٹ جانے پر اُسے صحیح اور سیدھا رکھنے کے لیے اس جوڑ یا ہڈی پر باندھ دی جاتی ہے۔“
ڈاکٹر وہبہ زحیلی نے ”الفقہ الإسلامي وأدلته“ میں لکھا ہے:

”کسی ہڈی کے ٹوٹ جانے پر اُسے جوڑ کر جو چپس لگا دی جاتی ہے (جسے پلاسٹر کہا جاتا ہے) وہ بھی جبیرہ کے معنوں میں داخل ہے۔ اگر سر پر چوٹ آ کر زخم ہو جائے یا کسی جگہ فصد لگوائی ہو یا کوئی پھنسی پھوڑا یا کسی آپریشن کے بعد پٹی باندھی گئی ہو تو یہ ساری پٹیاں بھی جبیرہ کے حکم میں داخل ہیں۔“^①

”المسح علی الجبیرة“ (پٹی پر مسح) کو عقلاً اور شرعاً ہر دو اعتبار سے مشروع کہا گیا ہے۔ عقلاً اس طرح کہ ضرورت اس مسح کی متقاضی ہے اور پلاسٹر یا پٹی کو اتارنا حرج و ضرر کا باعث ہے، بلکہ فقہ حنفی کی کتاب ہدایہ کے مولف علامہ مرغینانی کے بقول موزے اتارنے سے پٹی اتارنے کا حرج کئی گنا زیادہ ہے۔ لہذا جب موزوں پر مسح جائز ہے تو پلاسٹر یا پٹی پر بالاولیٰ جائز ہوگا۔^②

شرعاً بھی اس مسح کے جواز پر متعدد احادیث سے استدلال کیا گیا ہے، لیکن ان احادیث میں سے کوئی ایک بھی مرفوع حدیث صحیح نہیں، بلکہ سب ضعیف اور متکلم فیہ ہیں۔ ان کے ضعف اور کمزوری کو واضح کرنے کے لیے محدثین کرام کی تصریحات کو اگر بانفصیل ذکر کیا جائے تو بات طویل ہو جاتی ہے، لہذا ہم ان کا خلاصہ ذکر کر دیتے ہیں:

(۱) جن احادیث سے ”المسح علی الجبیرہ“ کی مشروعیت پر استدلال کیا جاتا ہے، ان میں سے پہلی

① الفقه الإسلامي (۱/ ۳۴۶)

② ہدایة مع فتح القدیر (۱/ ۱۰۹)

حدیث سنن ابن ماجہ، دارقطنی اور بیہقی میں حضرت علیؑ سے مروی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

«انكسرت إحدی زندي فسألت النبي ﷺ»

”میرا ایک ہاتھ ٹوٹ گیا تو میں نے نبی اکرم ﷺ سے استفسار کیا (کہ میں کیا کروں)؟“

اس روایت میں وہ فرماتے ہیں:

«فأمرني أن أمسح على الجبائر^①»

”مجھے نبی اکرم ﷺ نے حکم فرمایا کہ میں ٹیپوں پر مسح کر لیا کروں۔“

اس روایت کے بارے میں حافظ ابن حجر عسقلانیؒ ”بلوغ المرام“ میں فرماتے ہیں کہ

اسے ابن ماجہ نے سخت ناکارہ سی سند سے روایت کیا ہے، جب کہ ”سبل السلام“ میں امیر صنعانیؒ فرماتے ہیں:

”امام احمد اور یحییٰ بن معین نے اس حدیث کا انکار کیا ہے (یعنی اسے صحیح نہیں مانا) اس

حدیث کو دارقطنی اور بیہقی نے بھی روایت کیا ہے اور ان کی سند ابن ماجہ والی سند سے بھی

زیادہ ناکارہ ہے۔“

امام نوویؒ فرماتے ہیں:

”حفاظ حدیث اس روایت کے ضعف پر متفق ہے۔ ”نصب الرایة“ میں علامہ زیلیعیؒ

نے بھی اس حدیث کے ضعف کو نقل کیا ہے اور ابن ابی حاتم نے تو ”العلل“ میں اپنے

والد سے نقل کیا ہے کہ یہ حدیث باطل ہے، اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔“^②

① دوسری حدیث سنن ابوداؤد، ابن ماجہ اور دارقطنی میں مروی ہے، جس میں حضرت جابرؓ بیان

فرماتے ہیں:

”ہم ایک سفر پر روانہ ہوئے۔ ہم میں سے ایک شخص کے سر میں پتھر لگا اور اس کا سر

پھٹ گیا۔ وہ پھر بدخوابی (احتمام) کا شکار ہوا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا تو

انہوں نے اسے غسل کرنے کا مشورہ دیا، اس نے غسل کیا (مگر سر کے زخم میں پانی پڑنے

① سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۶۵۷)

② صحیح سنن أبی داؤد، رقم الحدیث (۳۲۵) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۵۷۲) بلوغ المرام و سبل السلام

(۹۹/۱/۱) الفقه الإسلامي للذهبي (۱/۳۴۶) تمام المنة للألباني (ص: ۱۳۴) تلخیص الحبیر (۱/۱/۱۴۶)

کے نتیجے میں) اس کی موت واقع ہوگئی۔ جب اس واقعہ کی خبر نبی کریم ﷺ کو پہنچی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«قَتَلُوهُ قَتَلَهُمُ اللَّهُ»^① «اللہ انھیں غارت کرے، انھوں نے اسے قتل کر دیا۔»

جب انھیں اصلی حکم معلوم نہیں تھا تو انھوں نے پوچھ کیوں نہ لیا؟ کیوں کہ ایسے بیمار کی شفا پوچھ لینا ہے، اُسے یہی کافی تھا کہ وہ تیمم کر لیتا اور زخم پر پٹی وغیرہ باندھ کر اس پر مسح کر لیتا اور باقی سارے جسم کا غسل کر لیتا۔»

اسے ”بلوغ المرام“ میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ”ضعیف السند“ کہا ہے اور ”سبل السلام“ میں امیر صنعانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

”یہ حدیث اور حضرت علی رضی اللہ عنہ والی حدیث دونوں مل کر ”المسح علی الجبيرة“ کے وجوب کا پتہ دیتی ہیں، لیکن وجوب میں علما کا اختلاف ہے۔“^②

بعض کہتے ہیں کہ ان دونوں حدیثوں کی بنا پر مسح کرے اور ان میں اگرچہ ضعف ہے، لیکن باہم مل کر کچھ قوت اختیار کر جاتی ہیں۔ اس لیے بھی کہ اب اس عضو کو دھونا ناممکن ہو گیا ہے تو سر کے بالوں پر مسح کی طرح ہی پٹی پر مسح ہوگا اور موزوں پر مسح کرنے پر بھی قیاس کیا گیا ہے۔ امیر صنعانی رحمہ اللہ نے اس قیاس کو قوی قرار دیا ہے۔

امام بیہقی نے بھی اس دوسری حدیث جابر کو ضعیف کہا ہے، لیکن صحیح ابن خزیمہ و ابن حبان اور مستدرک حاکم میں اس حدیث کی شاہد ایک دوسری حسن درجے کی اور بعض کے نزدیک صحیح حدیث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اس کے ساتھ مل کر یہ حدیث جابر حسن درجے کی ہو جاتی ہے، مگر صرف تیمم کے ذکر تک، کیوں کہ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما میں آگے پٹی باندھنے، اس پر مسح کرنے اور باقی سارے جسم کا غسل کرنے کے الفاظ نہیں ہیں۔ لہذا بعض کبار محدثین رحمہم اللہ نے کہا ہے:

”یہ آخری حصہ ضعیف و منکر ہے، کیونکہ یہ الفاظ صرف ضعیف سند سے وارد ہیں۔“^③

① صحیح سنن أبي داود، رقم الحديث (۳۲۵) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۵۷۲)

② بلوغ المرام و سبل السلام (۹۹ / ۱ / ۱)

③ تلخیص الحبير (۱ / ۱ / ۱۴۷ - ۱۴۸) و تمام المنة (ص: ۱۳۱) مشکاة المصابيح (۱ / ۱۶۶)

(3) تیسری حدیث معجم طبرانی کبیر میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس میں وہ بیان کرتے ہیں:
 «أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَمَّا رَمَاهُ ابْنُ قُمَيْتَةَ يَوْمَ أُحُدٍ، رَأَيْتُهُ إِذَا تَوَضَّأَ حَلَّ إِصَابَتَهُ
 وَمَسَحَ عَلَيْهَا بِالْوُضُوءِ»⁽¹⁾

”غزوہٴ اُحد کے دن ابن قمیئہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تیر مارا تو میں نے دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لگائے ہوئے زخم کی پٹی پر وضو کے وقت مسح کرتے تھے۔“

حافظ ابن حجر رضی اللہ عنہ نے ”التلخیص الحبیر“ میں اس کی سند کو ضعیف کہا ہے اور اہم بات یہ ہے کہ ان کے بقول حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ غزوہٴ اُحد میں شامل ہی نہیں تھے۔ اس روایت کو امام زیلعی نے ”نصب الرایۃ“ میں بھی نقل کیا ہے۔⁽²⁾

(4) اس موضوع کی چوتھی روایت سنن دارقطنی میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں:

«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَمْسَحُ عَلَى الْجَبَائِرِ»

”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پیوں پر مسح کیا کرتے تھے۔“

اس روایت کو بیان کر کے خود امام دارقطنی ہی نے لکھا ہے:

”یہ مرفوعاً صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس کا ایک راوی ابوعمارہ سخت ضعیف ہے۔“⁽³⁾

عام فقہاء و محدثین کا مسلک:

سابقہ سطور میں ہم پلاسٹر وغیرہ پر مسح کے مشروعیت کے دلائل پر مشتمل احادیث ذکر کر رہے تھے اور کبار محدثین کرام کے اقوال کا خلاصہ بھی نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ احادیث ضعیف ہیں اور ایسی احادیث جن میں سے ہر حدیث کی سند ضعیف ہو اور اس کا کوئی شاہد بھی نہ ہو ایسی روایات تو چاہے کتنی ہوں، ان کا مجموعہ قوی نہیں ہو پاتا۔ یہی وجہ ہے کہ امام بیہقی نے اپنی سنن کبریٰ میں ان میں سے بعض روایات کو نقل کرنے کے باوجود لکھا ہے:

(1) نصب الرایۃ (۱/۱۸۶)

(2) کذا فی تمام المنۃ (ص: ۱۳۴) نیز دیکھیں: تلخیص الحبیر (۱/۱۴۶-۱۴۷)

(3) تمام المنۃ (ص: ۱۳۴) التلخیص الحبیر (۱/۱۴۶) نصب الرایۃ للزیلعی (۱/۱۸۶)

”وَلَا يَنْبُتُ فِيْ هَذَا شَيْءٍ“، ”اس موضوع کی کوئی مرفوع حدیث صحیح نہیں ہے۔“

ان روایات میں سے سب سے صحیح تر وہ روایت ہے، جو حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، مگر وہ بھی قوی نہیں۔ اس موضوع میں صرف فقہائے تابعین اور ان کے بعد والے ائمہ و فقہاء کے اقوال ہی ہیں یا پھر ایک روایت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے موقوفاً صحیح سند سے مروی ہے کہ انھوں نے پٹی پر مسح کیا ہے۔^(۱)

گویا امام بیہقی جیسے محدث کبیر کے نزدیک اس موضوع کی مرفوع حدیث تو کوئی بھی صحیح نہیں، جس سے ثابت ہوتا ہو کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا یا ایسا کرنے کا حکم فرمایا۔ البتہ آثار صحابہ و تابعین اور خصوصاً اثر ابن عمر رضی اللہ عنہما پر ہی اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ امیر صنعانی رضی اللہ عنہ نے بھی ”سبل السلام“ میں ”المسح علی الجبیرہ“ کی مشروعیت کو قبول کیا ہے۔^(۲) اسی بنا پر شافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ و جوب مسح کے قائل ہیں۔^(۳)

امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کے طرق باہم مل جانے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ والی حدیث کی وجہ سے ان کے مجموعے کو قابل استدلال قرار دیا ہے اور سید سابق بھی مشروعیت و وجوب ہی کے قائل ہیں۔^(۴)

”نبیل الأوطار“ میں لکھا ہے:

”امام ابو حنیفہ، شافعی، فقہائے سبعمہ اور بعد والے کثیر فقہاء رضی اللہ عنہم مسح کے وجوب کے قائل ہیں، لیکن امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ شرط رکھی ہے کہ وہ پٹی طہارت کی حالت میں لگائی گئی ہو اور اس کے نیچے جسم صحیح سالم نہ ہو، سوائے اس کے جس کے بغیر کوئی چارہ کار ہی نہ ہو۔“

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ کسی ایسے عضو پر، جس پر پلاسٹر لگا ہو، اس پر نہ تو مسح کیا جائے گا اور نہ اسے کھولا ہی جائے گا، بلکہ اسے ویسے ہی چھوڑ دیا جائے گا، کیونکہ یہ جبیرہ یا پلاسٹر ایک الگ عضو کی شکل میں ہے اور آیت وضو میں اس کے دھونے یا مسح کرنے کا

(۱) تمام المنة (ص: ۱۳۴-۱۳۵)

(۲) سبل السلام (۱/۱) ۹۹

(۳) الفقه الإسلامي للزحيلي (۱/۳۴۷)

(۴) فقه السنة (۱/۸۱)

ذکر نہیں، اس معاملے میں حضرت جابر اور علی رضی اللہ عنہما سے مروی احادیث ضعیف ہونے کی وجہ سے ناقابل استدلال ہیں۔^①

امام ابوحنیفہ اور علامہ ابن حزم رحمہما کا مسلک:

فقہ حنفی کی معتبر اور معروف کتاب ”بدائع الصنائع“ (۱/ ۱۳) میں امام صاحب رحمہ اللہ کا مسلک یہ مذکور ہے کہ جبیرہ پر مسح صرف مستحب ہے واجب نہیں، جبکہ صاحبین یعنی امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما کے نزدیک واجب ہے اور امام صاحب سے ”البدائع“ میں منقول ہے:

”فرضیت کسی قطعی دلیل کے بغیر ثابت نہیں ہو سکتی، جب کہ مسح کے بارے میں جو حدیث علی ہے، وہ (اخبار آحاد میں سے ہے اور) ضعیف ہے، لہذا اس سے فرضیت ثابت نہیں ہو سکتی۔“^②

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی یہ رائے اگرچہ کتب فقہ حنفیہ کی رو سے مفتی بہ نہیں، بلکہ فتویٰ ان کے دوسرے قول اور صاحبین کے قول کے مطابق و جواب ہی کا ہے، لیکن موصوف کی رائے سے علامہ ابن حزم رحمہ اللہ کا اتفاق ہے، بلکہ انھوں نے تو ”المحلی“ میں دو ٹوک فیصلہ دیا ہے کہ جبیرہ پر مسح کرنا مشروع نہیں ہے، ان کے نزدیک اس کی دلیل ایک تو سورۃ البقرہ کی آخری آیت (۲۸۶) میں مذکور یہ ارشاد الہی ہے:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾

”اللہ تعالیٰ کسی نفس کو اس کی وسعت و طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔“

دوسری دلیل صحیح بخاری و مسلم، سنن نسائی و ابن ماجہ اور مسند احمد میں مروی یہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

﴿إِذْ أَمَرْتُكُمْ بِأَمْرِ فَأَتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾^③

”جب میں تمہیں کسی کام کا حکم دوں تو حسب استطاعت اس کی تعمیل کرو۔“

لہذا قرآن و سنت دونوں کی رو سے ہر وہ عمل ساقط ہو گیا، جو کسی کی طاقت سے باہر ہو، اس کا

① نیل الأوطار (۱/۱) ۲۵۷-۲۵۸

② ویکھیں: الفقہ الإسلامي للزحيلي (۱/ ۳۴۷)

③ صحیح البخاری، رقم الحدیث (۷۲۸۹) صحیح مسلم مع شرح النووي (۹/ ۱۰۱) صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (۲۴۵۶) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۲) کذا فی إرواء الغلیل (۱/ ۱۸۳)

عوض مقرر کرنا شریعت کا کام ہے اور شریعت قرآن و سنت کے سوا کسی طرح سے لازم نہیں ہوتی، جبکہ قرآن و سنت کسی میں بھی جبیرے یا پلاسٹر پر اس عضو کو دھونے کے عوض میں مسح کرنے کا حکم نہیں آیا، لہذا اس مسح کی مشروعیت ساقط ہوگئی۔ آگے انھوں نے امام شیعہ، امام داؤد اور ان کے اصحاب سے بھی ایسے ہی اقوال نقل کیے ہیں، جن سے ان کے قول یعنی مسح کی عدم مشروعیت کی تائید ہوتی ہے۔ انھوں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی موقوف اثر کہ انھوں نے پٹی پر مسح کیا، کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے:

”وہ ان کا اپنا عمل تھا اور وہ بھی پٹی پر مسح کو واجب قرار دینے کے لیے نہیں تھا، جب کہ

ان سے تو صحیح سند کے ساتھ یہ بھی ثابت ہے کہ وہ غسل و وضو کے دوران میں اپنی آنکھوں

کے اندر پانی داخل کیا کرتے تھے، حالانکہ فرض ہونا تو کجا یہ مشروع تک بھی نہیں ہے۔“^①

یعنی جب انہی کا ایک فعل مشروع تک بھی نہیں تو انہی کے ایک دوسرے فعل کو وجوب کا درجہ

کیسے دیا جاسکتا ہے؟

اس ساری تفصیل سے معلوم ہوا کہ پلاسٹر یا پٹی پر مسح کے بارے میں جمہور فقہاء کا مسلک تو

مشروعیت اور وجوب کا ہے، جب کہ امام شیعہ، امام داؤد اور ان کے اصحاب علامہ ابن حزم اور ایک

قول میں امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ اس مسح کی مشروعیت کے بھی قائل نہیں، چہ جائیکہ وجوب کو تسلیم کریں۔

دور حاضر کے بعض کبار محدثین (مثل العلامة الألبانی فی تمام المنّة) نے اسی رائے کو حق

قرار دیا ہے، کیوں کہ قرآن و سنت انہی کے حلیف ہیں اور جمہور کا مسلک ضعیف روایات پر مبنی ہے۔

ایک تیسری رائے بھی ہے جو امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کی طرف ہی منسوب ہے کہ جبیرہ پر مسح واجب تو نہیں،

البتہ مستحب ہے کہ کر لیا جائے تو اچھا ہے اور نہ کریں تو کوئی حرج نہیں۔

موصوف کی یہ رائے اگرچہ مفتی بہ نہیں، لیکن ساری تفصیل کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے

کہ یہی اقرب الی الصواب ہے۔ امام صاحب رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی کسی معمولی کتاب یا رسالے میں

نہیں، بلکہ فقہ حنفی کی ایک معتبر اور معروف کتاب ”بدائع الصنائع“ میں علامہ کاسانی رضی اللہ عنہ نے نقل

کیا ہے۔^②

① المحلی لابن حزم (۱/۲/۷۴-۷۷) تمام المنّة (ص: ۱۳۵)

② المغنی لابن قدامة (۱/۳۵۵) وما بعد الشرح للصغیر (۱/۲۰۲) وما بعد طبع علی نفقة الشیخ الزائد

حاکم الإمارات.

پلاسٹریا پٹی پر مسح کرنے کی شرائط:

جسیرہ یا پلاسٹر وغیرہ پر مسح کرنے کی بعض شرطیں بھی فقہائے کرام نے ذکر کی ہیں:

① پہلی شرط:

ان میں سے پہلی شرط یہ ہے کہ اس پلاسٹریا پٹی کا کھولنا ممکن ہی نہ ہو یا اسے کھول کر دھونے سے اس مرض کے بڑھ جانے یا کسی دوسرے مرض کے پیدا ہو جانے یا شفا یابی کے موخر ہو جانے کا خدشہ ہو۔ مالکیہ کا کہنا ہے کہ ہلاکت کا خوف، مرض کے شدت اختیار کر جانے یا افاقے کے موخر و معطل ہونے کا خدشہ ہو تو مسح واجب ہے۔

② دوسری شرط:

دوسری شرط یہ ہے کہ پلاسٹریا پٹی سخت ضرورت کی جگہ پر ہو، صحیح و سالم جگہ پر نہ ہو اور ایسی جگہ بھی اس کے نیچے موجود ہو تو اسے ننگا کر کے دھویا جائے۔

③ تیسری شرط:

تیسری شرط یہ ہے کہ وہ پلاسٹریا پٹی طہارت یعنی غسل یا وضو کر کے لگائی گئی ہو۔ یہ شرط صرف شافیہ اور حنابلہ ہی نے عائد کی ہے۔ بظاہر یہ شرط پلاسٹریا پٹی کی ضرورت و مجبوری سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی، بلکہ ایک لایعنی شرط ہے، کیوں کہ ایک شخص کا وضو نہیں تھا، اچانک کسی وجہ سے اسے کوئی حادثہ پیش آ گیا، جس سے مثلاً اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا یا کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ڈاکٹر نے فوری طور پر دوا وغیرہ لگائی اور حسب ضرورت پلاسٹر چڑھا دیا یا پٹی لگا دی اور تھوڑی ہی دیر کے بعد نماز کا وقت ہو گیا۔ اس شرط کی رو سے تو اب اس مریض کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس پلاسٹر کو کٹوا دیں یا پٹی اترا کر وضو کرے، پھر وضو کی حالت ہی میں پلاسٹریا پٹی لگوائے، تاکہ وہ مسح کی رخصت پر عمل کر سکے۔ یہ عام فہم سی بات ہے کہ یہ شرط درست نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حنفیہ اور مالکیہ کے یہاں یہ شرط سرے سے ہے ہی نہیں، بلکہ ان کے نزدیک پٹی پر مسح جائز ہے، خواہ وہ طہارت کی حالت میں لگائی ہو یا بلا طہارت کی حالت میں اور یہی معقول بات ہے، کیوں کہ اعضا کی ٹوٹ پھوٹ جس ہنگامی شکل میں واقع ہوتی ہے، اس کے پیش نظر طہارت و عدم طہارت کا لحاظ رکھنا ایک مشکل اور باعث حرج و مشقت چیز ہے

اور اسلام وہ دین ہے جو آسان احکام پر مشتمل ہے اور کسی معاملے میں حرج کی بھی کوئی صورت نہیں رکھی گئی، جیسا کہ سورۃ الحج (آیت: ۷۸) میں ارشادِ الہی ہے:

﴿وَمَا جَعَلْ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ﴾

”اللہ تعالیٰ نے دین کے احکام میں تم پر کوئی حرج نہیں رکھا۔“

یہی بات اللہ تعالیٰ نے سورۃ المائدہ (آیت: ۶) میں یوں بیان فرمائی ہے:

﴿مَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ حَرَجٍ﴾

”اللہ تمہیں کسی حرج و مشقت میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا۔“

نیز حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«إِنَّ الدِّينَ يُسْرٌ»^(۱) ”دین تو آسان ہے۔“

سنن نسائی اور صحیح ابن حبان میں اس ارشادِ نبوی کے الفاظ یوں ہیں:

«إِنَّ هَذَا الدِّينَ يُسْرٌ»^(۲) ”یہ دین اسلام آسان احکام والا دین ہے۔“

یہ شافعیہ و حنابلہ والی شرط آسان ہے نہ حرج ہی سے خالی ہے، لہذا یہ غیر معقول ہے۔

③ چوتھی شرط:

”المسح علی الجبیرہ“ کی چوتھی شرط یہ ہے کہ پلاسٹر یا پٹی کسی ایسی چیز سے نہ ہو، جو غصب کی گئی ہو، یعنی چوری یا ظلماً چھینی ہوئی نہ ہو اور پٹی کا کپڑا ریشم کا بھی نہ ہو، جو مردوں پر حرام ہے۔ ایسے ہی پلاسٹر یا پٹی کسی نجس چیز پر مشتمل نہ ہو، ورنہ مسح باطل ہوگا اور نماز بھی نہیں ہوگی۔ یہ شرط فقہائے حنابلہ نے عائد کی ہے اور معقول بھی ہے۔ ایسے ہی بعض دیگر شرائط بھی ذکر کر گئی ہیں، لیکن وہ کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں۔^(۳)

پلاسٹر یا پٹی پر مسح کے نواقض:

یہ بات پیش نظر رہے کہ فقہائے مذاہبِ اربعہ نے نواقض ”المسح علی الجبیرہ“ کہ پٹی

(۱) صحیح البخاری مع الفتح (۱/ ۹۳-۹۴) صحیح سنن النسائي، رقم الحديث (۴۶۶۱) تمام المنة (ص: ۴۳)

(۲) صحیح البخاری مع الفتح (۲۹) صحیح الجامع، رقم الحديث (۱۶۱۱)

(۳) تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: الفقہ الإسلامي وأدلة (۱/ ۳۴۸-۳۵۰)

یا پلاسٹر پر کیے ہوئے مسح کی مدت کب ختم ہوگی؟ اس سلسلے میں دو حالتیں ذکر کی ہیں:

1 ناقضِ اوّل:

مسح کے بعد جب تک وضو ٹوٹنے کے اسباب میں سے کسی کا وقوع نہ ہو، اس وقت تک مسح کی مدت بحال رہے گی اور جو نہی وضو ٹوٹ گیا، مسح کی مدت بھی ختم ہوگئی۔ نئے وضو کے ساتھ از سر نو مسح کرنا ضروری ہوگا۔ اس پر تمام مذاہب کا اتفاق ہے۔

2 ناقضِ ثانی:

یہ متفق علیہ نہیں، بلکہ مختلف مذاہب کے فقہانے اس کی تفصیلات میں مختلف آرا کا اظہار کیا ہے، لیکن جو چیز ان سب کے یہاں مشترک ہے، وہ یہ ہے کہ مسح کرنے سے لے کر جب تک پلاسٹر کو اتار نہ لیا جائے یا وہ خود بہ خود نہ گر جائے (اور نہ وضو ٹوٹے) تو وہ مسح بحال رہے گا، جب کہ پلاسٹر، پٹی یا جیرہ کو جو نہی کھولا گیا، اس مسح کی مدت ختم ہو جائے گی اور وضو ٹوٹ جائے گا۔ چاہے وضو ٹوٹنے کا دوسرا کوئی بھی سبب نہ بنا ہو۔^①

کتبِ فقہ میں عموماً جیرہ، پلاسٹر یا پٹی کو اتارنے کے ساتھ ہی اس کے خود بہ خود گرنے کا ذکر بھی ہوتا ہے۔ جب کہ یہ پڑانے زمانے کی باتیں ہیں۔ موجودہ دور میں لگایا گیا پلاسٹر تو جب تک ڈاکٹر سے نہ کٹوایا جائے کٹنا ہی نہیں اور تقریباً یہی معاملہ پٹی کا ہے، مگر کبھی ایسا ہو جائے کہ خود بہ خود گرجائے تو اس کا حکم بھی موجود ہے۔

موزوں پر مسح اور پلاسٹر پر مسح میں فرق:

جیرہ، پلاسٹر یا پٹی پر مسح بظاہر تو موزوں پر مسح ہی کی طرح ہے، لیکن ان دونوں پر مسح کے مابین کچھ فرق ہے، جس کی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً:

① پلاسٹر یا پٹی پر مسح کی توقیت دنوں کے ساتھ نہیں ہوتی، بلکہ شفا پر منحصر ہوتی ہے، جب کہ موزوں پر مسح کی توقیت دنوں کے ساتھ ہے کہ مسافر تین دنوں اور تین راتوں تک موزوں پر مسح کر سکتا

① بدائع الصنائع (۱/ ۱۴) فتح القدیر شرح ہدایۃ (۱/ ۱۱۰) اللباب شرح قدوری (۱/ ۴۱) طبع المکتب العربی (الفقہ الاسلامی (۱/ ۳۵۴-۳۵۵-۳۵۶))

ہے اور مقیم صرف ایک دن اور ایک رات تک۔ اس مدت کے بعد اُسے موزے اتار کر پاؤں کو لازماً دھونا ہوگا، لیکن پلاسٹر یا پٹی میں ایسا نہیں، جب تک زخم مندمل نہ ہو جائے اور ہڈی جڑ کر ٹھیک نہ ہو جائے، اُسے اتارنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

② ان دونوں چیزوں میں دوسرا فرق یہ ہے کہ موزوں پر مسح کے جواز میں یہ شرط ہے کہ طہارت و وضو کی حالت میں پہنے گئے ہوں۔ پلاسٹر یا پٹی میں یہ کوئی شرط نہیں اور حنابلہ اور شافعیہ نے جو یہ شرط عائد کی ہے تو اہل علم نے اُسے غیر معقول و ناحق قرار دیا ہے۔^①

③ ان میں تیسرا فرق یہ ہے کہ پلاسٹر یا پٹی حصول شفا سے پہلے ہی کسی وجہ سے گر جائے تو بھی مسح کی مدت ختم نہیں ہوگی، بلکہ دوبارہ پٹی کر لینے کے بعد پھر اس پر مسح جائز ہے، لیکن موزہ اگر پاؤں سے اتار لیا جائے یا دونوں اتار دیے جائیں اور وضو بھی نہ ہو تو اب ان پر مسح کی مدت ختم ہوگئی۔ لہذا ضروری ہے کہ وضو کر کے انھیں پہنیں، ورنہ ان پر مسح جائز نہیں ہوگا۔

④ ان دونوں کے مابین چوتھا فرق یہ ہے کہ پٹی پر مسح تو اس وقت جائز ہے کہ جب زخم پر مسح کرنا اور اُسے دھونا نقصان دہ ہو، جبکہ موزوں کا معاملہ اس کے برعکس ہے کہ اگرچہ کوئی پاؤں دھونے سے عاجز نہ بھی ہو، تب بھی مسح جائز ہے اور موسم سرما کی سردی سے بچاؤ تو کوئی بہت بڑا عذر نہیں، اس کے باوجود شریعت نے اجازت دے رکھی ہے۔

⑤ پانچواں فرق یہ ہے کہ موزوں پر مسح تو صرف پاؤں کے ساتھ خاص ہے، جسم کے دوسرے حصے پر موزہ نما چیز چڑھائی جائے یا دستانے پہن لیے جائیں، تب بھی ان پر مسح جائز نہیں، جب کہ پلاسٹر یا پٹی سر سے پاؤں تک جسم کے کسی بھی حصے پر ہو، اس پر مسح کرنا جائز ہے۔^②

ڈامر لگانے کی صورت میں وضو کا حکم:

اگر اعضاء وضو میں سے کسی پر ڈامر لگا ہو تو وضو کی کیفیت کیا ہوگی؟ اس سلسلے میں بنیادی بات یہ ہے کہ ڈامر ان چیزوں میں سے ہے، جو پانی کو جسم تک نہیں پہنچنے دیتیں۔ لہذا ڈامر یا کولتار کا حکم بھی تقریباً نیل پالش جیسا ہی ہے کہ وضو کرتے وقت جس طرح اسے ریہوور سے صاف کرنا

① الفقه الإسلامي وأدلة (۱/ ۳۴۹، ۳۵۳)

② بدائع الصنائع (۱۴/ ۱) المغنی لابن قدامة (۱/ ۳۵۶) الفقه الإسلامي (۱/ ۳۵۶-۳۵۷) جدید فقہی مسائل (ص: ۶۱)

ضروری ہے، ایسے ہی ڈامر کو بھی اتارنا ضروری ہے اور اس کے بعد وضو کرنا ہوگا، ورنہ اس کی موجودگی میں اتنی جگہ کے اصل جسم تک پانی نہیں پہنچے گا اور وضو نہیں ہوگا۔ ہاں نیل پالش اور ڈامر میں اتنا فرق ہے کہ نیل پالش کی ضرورت ہرگز نہیں ہوتی، وہ تو صرف ایک زینت ہوتی ہے، البتہ ایک ضرورت ہونے کی شکل میں اس سے مختلف ہے، لہذا اگر کسی عذر و ضرورت کی بنا پر ڈامر لگانا ناگزیر ہو جائے اور اُسے اتارنا یا چھڑانا نقصان دہ ہو تو پھر وہ بھی جبیرہ، پلاسٹر اور زخم کی پٹی کے حکم میں آئے گا اور اُسے اتارے بغیر وضو ہو جائے گا اور نماز ادا کی جاسکے گی۔^①

غسل و وضو میں مصنوعی بالوں کے جوڑوں یا وگوں کا حکم:

اب باری ہے اس جدید فقہی مسئلے کی کہ اگر کسی مرد یا عورت نے مصنوعی بالوں کا بنا ہوا جوڑا یا وگ لگا رکھی ہو تو غسل و وضو کا طریقہ کیا ہوگا اور سر کے مسح کے لیے کیا صورت اختیار کرنا پڑے گی؟ اس سوال کے جواب سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیکھ لیا جائے کہ مصنوعی بال لگانے یا ان سے بنا ہوا جوڑا یا وگ استعمال کرنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ زیب و زینت اور بناؤ سنگار کرنا عورت کا ایک فطری جذبہ اور شوق ہے، جس کی رعایت رکھتے ہوئے اسلام نے ان کے لیے ریشمی لباس، زیورات، کاسمیٹک اور میک اپ کے سامان کا استعمال جائز قرار دیا ہے، بشرطیکہ یہ سب چیزیں چار دیواری کے اندر اندر اور خاص کر شوہر کے لیے ہوں۔ بے حجاب ہو کر سیر و سیاحت کے دوران اور مرد و زن کی مخلوط پارٹیوں میں شرکت کر کے غیر مردوں کو دکھانے کے لیے نہ ہوں۔ ایسے ہی اسلام نے جہاں عورتوں کو حدود کے اندر رہتے ہوئے بناؤ سنگار اور زیب و زینت کی اجازت بخشی ہے، وہیں یہ پابندی بھی عائد کی ہے کہ اس میں غلو نہ کیا جائے اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ بناؤ و شناخت میں کوئی تغیر و تبدل نہ کیا جائے، کیوں کہ یہ ایک شیطانی فعل ہے، چنانچہ سورۃ النساء (آیت: ۱۱۸) میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے شیطان پر لعنت کی تھی تو اس نے کہا تھا:

﴿لَا تَخَذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا﴾

”میں تیرے بندوں میں سے ایک مقرر حصہ لے کر رہوں گا۔“

یعنی ان کے اوقات میں، ان کی محنتوں میں، ان کی قوتوں و قابلیتوں میں، ان کے مال اور

① جدید فقہی مسائل (ص: ۲۱-۲۲) بتصرّف.

ان کی اولاد میں اپنا حصہ نکالوں گا اور ان کو فریب دے کر ایسا پرچاؤں گا کہ وہ ان ساری چیزوں کا ایک معتد بہ حصہ میری راہ میں صرف کریں گے۔ مزید شیطان نے جو اس وقت کہا تھا، اُسے اللہ تعالیٰ نے اگلی آیت میں یوں بیان فرمایا ہے:

﴿وَلَا ضَلَّٰلَةً لَهُمْ وَلَا مَنِيَّةً لَهُمْ وَلَا مَرْتَبَةً فَلَيْبَتِكُنَّ اِذَا نَالِ الْاِنْعَامِ وَلَا مَرْتَبَةً

فَلْيَغْيِرَنَّ خَلْقَ اللّٰهِ﴾ [النساء: ۱۱۹]

”میں انھیں بہکاووں گا۔ میں انھیں آرزوؤں میں الجھاؤں گا، میں انھیں حکم دوں گا اور وہ میرے حکم سے جانوروں کے کان پھاڑیں گے اور میں انھیں ضرور حکم دوں گا اور وہ میرے حکم سے اللہ کی بخشی ہوئی ساخت و بناوٹ میں رد و بدل کریں گے۔“

آیت کے اس حصے میں جو شیطان کی ڈھینگیس نقل کی گئی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ جانوروں کے کان پھاڑیں گے۔ یہاں اہل عرب کے توہمات میں سے ایک توہم کی طرف اشارہ ہے۔ ان کے ہاں قانون تھا کہ اونٹنی پانچ بچے یا دس بچے جن لیتی تو اس کے کان پھاڑ کر اُسے اپنے دیوتا کے نام پر چھوڑ دیتے اور اس سے کوئی کام لینا حرام سمجھتے تھے۔ اسی طرح جس اونٹ کے نطفے سے دس بچے ہو جاتے، اُسے بھی کسی دیوتا کے نام پر کان چیر کر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ یہ کان چیرنا اس بات کی علامت تھی کہ یہ کسی دیوتا کے نام پر چھوڑا ہوا جانور ہے، جس کا پھر دوسرے لوگ بھی احترام کیا کرتے تھے۔ یہ دراصل شیطان کی سکھائی ہوئی چال تھی۔ دور جاہلیت کی یہ مشرکانہ رسم تھوڑی سی شکل بدل کر آج بھی برصغیر میں موجود ہے (البتہ علاقے اور ماحول کی مناسبت سے دیوی اور دیوتاؤں کی جگہ مزاروں نے اور اونٹوں، اونٹنیوں کی جگہ بیلوں اور گائیوں نے لے رکھی ہے)۔

یہاں جو دوسری بات کہی گئی ہے کہ اللہ کی بخشی ہوئی ساخت و بناوٹ میں رد و بدل کریں گے، اس کے مفاہم و مطالب میں سے ایک یہ بھی ہے کہ لوگ کسی نہ کسی طرح اللہ کی بخشی ہوئی ساخت و بناوٹ میں تبدیلی کریں گے۔ ہمارا محلِ استشہاد یہی الفاظ ہیں کہ عورتوں کا مصنوعی بالوں کے جوڑے اور مردوزن سب کا طرح طرح کی وگوں کا استعمال کرنا بھی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ساخت میں تغیر و تبدل ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے شیطانی فعل قرار دیا ہے اور شیطانی فعل کو اپنانے والے کے بارے میں اسی آیت (۱۱۹) میں اللہ تعالیٰ نے وعید سناتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿وَمَنْ يَتَّخِذِ الشَّيْطَانَ وَلِيًّا مِّنْ دُونِ اللَّهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرًا مُّبِينًا﴾

”اور جس نے اللہ کے بجائے اس شیطان کو اپنا ولی و سرپرست بنا لیا ہے، وہ صریح

نقصان میں پڑ گیا۔“

قرآن کریم کے اس مقام پر اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی ساخت کو تبدیل کرنے کے شیطانی فعل قرار دیے جانے کے پیش نظر اسلام نے مرد و زن ہر دو کے لیے زینت کی خاطر اپنے اصل بالوں کے ساتھ کسی دوسرے کے اصلی یا مصنوعی طریقے سے بنائے گئے بالوں کو جوڑنا حرام قرار دیا ہے۔ موجودہ دور میں جو مصنوعی بالوں کے رنگا رنگ جوڑوں کا استعمال عورتوں اور طرح طرح کی وگوں کا استعمال مردوں اور عورتوں سب میں عام ہو چکا ہے، یہ مطلقاً ناجائز و حرام ہے، بلکہ اہل علم نے اسے کبیرہ گناہوں میں شمار کیا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن حجر ہیتمی رحمۃ اللہ علیہ نے کبیرہ گناہوں کے موضوع پر ایک کتاب: ”الزواج عن اقتراء الكبائر“ لکھی ہے، اس میں انھوں نے چار سو اڑسٹھ (۳۶۸) گناہوں کو کبیرہ گناہ شمار کیا ہے۔ جن میں باطنی اعمال سے تعلق رکھنے والے کبائر بھی ہیں۔ جیسے شرک، ریا، نفاق وغیرہ اور ظاہری اعمال سے تعلق رکھنے والے بھی جیسے زنا کاری، شراب نوشی اور رشوت خوری وغیرہ ہیں۔ موصوف نے اس کتاب کی جلد اول میں کبیرہ گناہ (نمبر ۸۰) اسی مصنوعی جوڑے یا وگ کے استعمال کرنے کو شمار کیا ہے۔^①

کبائر کے موضوع پر شیخ احمد بن حجر آل بوطامی آف قطر نے حال ہی میں ایک کتاب ”تطهير المجتمعات من أرجاس الموبقات“ کے نام سے لکھی ہے، جس کا اردو ترجمہ بھی بمبئی کے ایک اشاعتی ادارے الدار السلفية نے ”معاشرے کی مہلک بیماریاں اور ان کا علاج“ کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ اس میں اسی (۸۰) کبیرہ گناہوں کو منتخب کر کے قرآن و سنت کی رو سے ان کی قباحت و ممانعت بیان کی گئی ہے، اس میں کبیرہ نمبر (۷۰) ”وصل الشعر“ یعنی بال جوڑنا یا وگ کا استعمال کرنا ہی ہے۔^②

دنیا کی معروف اور قدیم یونیورسٹی ”جامعہ ازہر قاہرہ“ نے آج سے مدّتوں پہلے جب

① الزواج (۱۴/۸) دار المعرفة بیروت.

② تطهير المجتمعات عربی (ص: ۳۱۲) معاشرے کی مہلک بیماریاں (ص: ۶۷۸) ترجمہ مولانا نصیر احمد ملی.

امریکہ و یورپی ممالک میں مقیم مسلمانوں کی راہنمائی اور وہاں کے غیر مسلم لوگوں کو اسلامی تعلیمات سے متعارف کروانے کے لیے ایک پروگرام بنایا اور مختلف علما کو مختلف موضوعات پر کتابیں لکھنے پر متعین کیا، جنہیں انگلش ترجمہ کر کے ان ممالک میں پہنچایا جانا طے پایا تو قطر میں مقیم عرب ممالک کے معروف اسکالر ڈاکٹر یوسف قرضاوی کے ذمے یہ لگایا گیا کہ وہ ”اسلام میں حلال و حرام“ کے موضوع پر کتاب لکھیں گے۔ چنانچہ ۱۳۸۰ھ = ۱۹۶۰ء میں ”الحلال و الحرام فی الإسلام“ کے نام سے ان کی کتاب شائع ہوئی، جس کے اب تک بیسیوں اڈیشن چھپ چکے ہیں اور دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے، حتیٰ کہ الدار السلفیہ بمبئی نے اسے اردو میں بھی شائع کر دیا ہے۔ اس میں موصوف نے بھی مصنوعی بالوں کے جوڑوں یا وگوں کو ممنوع اشیا میں شمار کیا ہے۔^①

اس فعل کی حرمت و ممانعت پر یوں تو صرف قرآن کریم میں سورۃ النساء (آیت: ۱۱۹) کے الفاظ کی دلالت بھی کافی ہے، جب کہ اس پر مستزاد نبی اکرم ﷺ کی متعدد احادیث بھی ہیں، جن میں اس فعل کو ناجائز و ممنوع قرار دیا گیا ہے اور اس کا ارتکاب کرنے والوں پر لعنت کی گئی ہے، بلکہ بعض احادیث میں تو یہاں تک مذکور ہے کہ اس فعل کا ارتکاب کرنے والوں پر اللہ نے لعنت فرمائی۔ یہ فعل چونکہ عموماً زیادہ تر عورتوں میں پایا جاتا ہے، اس لیے احادیث میں جو صیغے آئے ہیں، وہ مونث ہی کے ہیں، مگر اس فعل کا ارتکاب اگر کوئی مرد کرے تو وہ بھی ان احادیث کا مصداق ہو کر ملعون ہوتا ہے، کیوں کہ مونث کے صیغے محض تغلیباً ہیں، ورنہ حکم سب کے لیے برابر ہے، بلکہ ڈاکٹر یوسف قرضاوی کے بقول: ”مرد کا اس تحریم میں دخول تو بہ درجہ اولیٰ ہے۔“^②

وہ چاہے خود وگ استعمال کرے یا کسی دوسرے مرد وزن کے لیے وگ تیار کرے اور اس کی کنگھی پٹی کرے۔ اس موضوع کی متعدد احادیث کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں۔

صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

① دیکھیں: ”الحلال و الحرام فی الإسلام“ ڈاکٹر یوسف القرضاوی (ص: ۸۸-۹۰) طبع المکتب الإسلامی و مترجم اردو از مولانا شمس پیر زادہ (ص: ۱۲۱-۱۲۳) طبع الدار السلفیہ بمبئی.

② الحلال و الحرام (ص: ۸۹)

”نبی ﷺ نے بال جوڑنے اور جڑوانے والی پر لعنت فرمائی ہے۔“^(۱)

﴿2﴾ سنن نسائی اور مسند احمد میں صحیح سند سے حضرت مسروق رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس ایک عورت آئی اور کہنے لگی:

”مجھے اطلاع ملی ہے کہ آپ بال جوڑنے سے منع کرتے ہیں؟“ انھوں نے کہا: ہاں، تو اس عورت نے کہا: ”کیا اس کے بارے میں قرآن کریم سے کوئی دلیل پاتے ہو یا تم نے نبی اکرم ﷺ سے کچھ سنا ہوا ہے؟“

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا:

”میں اس کی ممانعت کی دلیل کتاب اللہ میں بھی پاتا ہوں اور رسول اللہ ﷺ سے بھی اس کی ممانعت کے بارے میں سُن چکا ہوں۔“

اُس عورت نے کہا:

”اللہ کی قسم! میں نے قرآن کریم کی اول تا آخر ورق گردانی کی ہے، مجھے تو وہ کچھ نہیں ملا جو تم کہتے ہو۔“

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا تمہیں قرآن کریم میں سورۃ الحشر کی آیت (۷) میں یہ الفاظ نہیں ملے ہیں:

﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾

”رسول اللہ تمہیں جس کا حکم دیں اُسے اختیار کر لو اور آپ جس سے منع کر دیں اس سے رک جاؤ۔“

اس عورت نے کہا ہاں تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

”میں نے نبی کریم ﷺ کو بال جوڑنے سے منع فرماتے ہوئے سنا ہے۔“

(۱) صحیح البخاری مع فتح الباری (۱۰/ ۳۷۸) صحیح مسلم مترجم اردو (۵/ ۳۳۳) ترجمہ علامہ وحید الزمان) صحیح سنن النسائي للألباني، رقم الحديث (۴۷۱۶) صحیح سنن أبي داود، للألباني، رقم الحديث (۳۵۱۳) صحیح سنن الترمذي للألباني، رقم الحديث (۱۴۴۱ و ۲۲۳۴) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۱۹۸۷) غاية المرام في تخريج أحاديث الحلال و الحرام للألباني (ص: ۷۴- ۷۵ المكتب الإسلامي)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس طرح قرآن و سنت دونوں کی رو سے اس فعل کو ممنوع ثابت کر دیا، تو اس عورت نے کہا: ”ممکن ہے کہ آپ کے گھر کی عورتوں میں سے کوئی ایسا کرتی ہو۔“ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اندر جا کر دیکھ لو، وہ عورت ان کے گھر میں داخل ہوئی اور جب دیکھ بھال کر باہر آئی تو کہنے لگی: ”مجھے ایسی کوئی (قابل اعتراض) چیز نظر نہیں آئی۔“

تب حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: (اگر میرے گھر میں ایسی کوئی چیز پائی جاتی) تو پھر میں نے ایک بندہ صالح کی وصیت کو کیا اپنایا ہوتا، جنھوں نے فرمایا تھا: ”میں نہیں چاہتا کہ جس چیز سے میں تمھیں منع کروں، خود اسی میں تمھاری خلاف ورزی کروں۔“^①

ایک عورت اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مابین رونما ہونے والے مکالمے کی شکل کے اس واقعے میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بال جوڑنے یا وگ لگانے کو پہلے قرآن کریم، پھر حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ممنوع ثابت کیا اور پھر اس کے ممنوع ہونے کا اپنے گھر کی عورتوں سے عملی ثبوت بھی مہیا فرمایا۔ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ وَ عَنِ أَهْلِ بَيْتِهِ وَأَرْضَاهُمْ.

③ اس موضوع کی تیسری حدیث صحیح بخاری اور مسند احمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں مذکور ہے:

”اللہ بال جوڑنے اور جڑوانے والی عورت پر لعنت کرے۔“

③ چوتھی حدیث صحیح بخاری و مسلم، سنن نسائی اور مسند احمد میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انصار کی ایک لڑکی کی شادی ہوئی، جبکہ کسی بیماری کی وجہ سے اس کے سر کے بال گر چکے تھے، اس کے گھر والوں نے چاہا کہ (دلہن بناتے وقت) اس کے سر پر کوئی دوسرے بال جوڑ دیے جائیں۔ (لیکن یہ کام کرنے سے پہلے) انھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سلسلے میں استفسار کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”اللہ تعالیٰ نے بال جوڑے اور جڑوانے والی عورت پر لعنت کی ہے۔“

① صحیح سنن النسائي، رقم الحديث (٤٧١٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٩٨٩) ولكن عن علقمة عن عبدالله، صحیح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥١٣)

اس واقعے سے معلوم ہوا کہ آئے دن وگس بدلنے والے مرد وزن تو گجا، نبی اکرم ﷺ نے تو کسی ایسی عورت کو بھی دوسرے بال لگوانے یا بالفاظ دیگر وگ لگانے کی اجازت نہیں دی، جس کے بال کسی بیماری کی وجہ سے گر چکے ہیں اور خواہ وہ پہلی شب کی دلہن ہی کیوں نہ ہو۔

5 صحیح بخاری و مسلم اور مسند احمد میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بہن حضرت اسماء رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ کسی عورت نے نبی اکرم ﷺ سے پوچھا: اے اللہ کے رسول! میری بیٹی کو خسرے کی بیماری لگنے سے اس کے بال گر گئے ہیں۔ میں نے اس کی شادی کر دی ہے تو کیا میں اس کے بالوں کے ساتھ دوسرے بال جوڑ دوں؟“ تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے بال جوڑنے اور جڑوانے والی عورت پر لعنت کی ہے۔“¹

6 صحیح بخاری و مسلم، سنن نسائی اور مسند احمد میں مروی ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ جب آخری مرتبہ مدینہ طیبہ آئے تو خطبے کے دوران میں انھوں نے بالوں کا ایک گچھا نکالا اور فرمایا: ”میں نے یہودیوں کے علاوہ کسی کو اس فعل (بال جوڑنے) کا ارتکاب کرتے نہیں دیکھا اور نبی اکرم ﷺ نے بالوں کے جوڑنے کے اس فعل کو سراسر جھوٹ (دھوکا) قرار دیا ہے۔“²

7 حضرت امیر معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے برسر منبر اپنے ایک خادم کے ہاتھ سے بالوں کا گچھا لے کر لہرایا اور فرمایا:

”تمہارے علما کہاں گئے ہیں (جو تمہیں اس کے بارے میں شرعی حکم بتائیں؟)۔ میں نے نبی اکرم ﷺ کو اس سے منع کرتے اور یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ”بنی اسرائیل کی عورتوں نے جب ان (مصنوعی جوڑوں اور وگوں) کا استعمال اپنایا تو وہ لوگ ہلاک ہو گئے۔“³

1 صحیح البخاری (۱۰/۳۷۸) صحیح مسلم مترجم اردو (۵/۳۳۲) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۱۹۸۸) غایۃ المرام (ص: ۷۹)

2 صحیح البخاری مع الفتح (۱۰/۳۷۴) صحیح مسلم مترجم (۵/۳۳۴، ۳۳۵) و صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۴۷۱۴) غایۃ المرام (ص: ۷۹-۸۰)

3 صحیح البخاری مع الفتح (۵۹۳۲) مختصر صحیح مسلم للمندری بتحقیق الألبانی، رقم الحدیث (۱۳۸۵) بحوالہ صحیح الجامع، رقم الحدیث (۲۳۷۵) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (۳۵۱۱)

فتح الباری میں اس حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہ حدیث جمہور کی دلیل ہے، جو کہتے ہیں کہ بالوں کے ساتھ دوسرے بال یا کوئی اور چیز جوڑنا منع ہے، چاہے کوئی بھی کیوں نہ ہو اور اس کی تائید صحیح مسلم اور مسند احمد میں مذکور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں:

”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کو ڈانٹا، جس نے بالوں کے ساتھ کسی بھی دوسری چیز کو جوڑا۔“^①

آگے چل کر انھوں نے امام لیث رحمہ اللہ اور دیگر فقہاء سے نقل کیا ہے کہ وہ صرف بالوں کی ممانعت کے قائل ہیں۔ دوسری چیز کی ممانعت کے نہیں، جیسے دھاگا وغیرہ ہے، آگے سنن ابی داؤد کے حوالے سے حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

”اونی یاریشی دھاگے جوڑنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔“

امام احمد رحمہ اللہ کا بھی یہی مسلک بتایا ہے اور حضرت سعید رضی اللہ عنہ کے اس قول کی سند کو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے صحیح قرار دیا ہے۔^② جب کہ بعض دیگر محدثین کے نزدیک یہ سند ضعیف ہے۔^③ لہذا قابل حجت نہیں، ویسے بھی یہ ایک تابعی کا قول ہے، جبکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ والی مرفوع حدیث اس کے مخالف ہے، نیز یہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ والی صحیحین کی حدیث کے مفہوم اور صحیح مسلم و مسند احمد میں حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کی ”الزُّور“ کی تشریح کے بھی مخالف ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں کہ ”الزُّور“ سے مراد وہ اشیاء ہیں، جن سے عورتیں اپنے بالوں کو بڑھاتی ہیں۔^④

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ بالوں کو زیادہ ثابت کرنے کے لیے دوسرے بال جوڑے جائیں یا کبھی کوئی دھاگا وغیرہ، یہ سب ممنوع ہے۔ بعض اہل علم نے کہا ہے کہ اگر کوئی بالوں کے ساتھ دوسری کوئی چیز اس طرح جوڑے، جس سے یہ دھوکا ہو کہ سب اصلی بال ہی ہیں تو یہ ممنوع ہے اور اگر اصلی بال اور یہ ساتھ جوڑی جانے والی چیز دونوں الگ نظر آتی ہوں تو پھر یہ جائز ہے۔^⑤

① صحیح مسلم مترجم اردو (۳۳۴/۵)

② فتح الباری (۳۷۵/۱۰)

③ غایۃ المرام (ص: ۸۱)

④ فتح الباری (۳۷۵/۱۰) غایۃ المرام (ص: ۷۸)

⑤ فتح الباری (۳۷۵/۱۰)

خود حافظ ابن حجر نے اس بات کو قوی قرار دیا ہے، لیکن یہ بھی ان کا اور بعض دیگر علما کا محض خیال ہے۔ ورنہ احادیث کے الفاظ میں ایسی کوئی صراحت نہیں ملتی، حتیٰ کہ بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اگر کوئی عورت اپنے شوہر کی اجازت اور اس کے حکم سے دوسرے بال یا کوئی بھی چیز لگالے تو جائز ہے، مگر حافظ عسقلانی کے بقول ”باب وصل الشعر“ میں مذکور احادیث ان کے خلاف ہیں۔^① جب کہ صحیح بخاری کی ایک حدیث میں جو حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ سے مروی ہے، اس بات کی واضح طور پر تردید موجود ہے، کیوں کہ اس حدیث میں یہ الفاظ بھی موجود ہیں:

”میری بیٹی کا شوہر مجھے اس بات پر برا بھونکتا کرتا تھا (کہ میں کچھ جوڑوں) کیا میں کوئی چیز جوڑوں؟ تو نبی اکرم ﷺ نے بال جوڑنے اور جڑوانے والی عورت کو برا کہا۔“^②

وگ لگانے کی ممانعت:

وگ کے استعمال کو کبار معاصرین اہل علم نے بھی اپنے فتاویٰ میں ناجائز قرار دیا ہے۔ مثلاً فتویٰ صادر کرنے والے متعدد مفتیان کرام پر مشتمل دائمی کمیٹی نے بھی اس کے عدم جواز کا فتویٰ دیا ہے اور یاد رہے کہ اس کمیٹی میں شیخ ابن بازؒ اور انہی جیسے دیگر بلند پایہ علما شامل ہیں۔ خاص کر شیخ ابن بازؒ اور دوسرے معروف سعودی عالم شیخ محمد بن صالح العثیمین نیز بعض دیگر اہل علم نے بھی ایسا ہی فتویٰ دیا ہے۔^③

عورتوں کو بال کٹوانے کی ممانعت:

یہاں یہ بات بھی ذہن نشین کر لیں کہ جس طرح عورتوں کا اپنے اصل بالوں کے ساتھ کوئی دوسرے بال جوڑنا حرام ہے، اُسی طرح عورتوں کا بال منڈوانا بھی حرام ہے، سوائے کسی عذر و مجبوری کے، کیوں کہ طبرانی میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے:

«نَهَى النَّبِيُّ ﷺ أَنْ تَحْلِقَ الْمَرْأَةُ رَأْسَهَا»

”نبی اکرم ﷺ نے عورت کو اپنا سر موٹڈ کرنے سے منع فرمایا ہے۔“

① فتح الباری (۱۰/۳۷۵)

② صحیح البخاری مع الفتح (۱۰/۳۷۴)

③ فتاویٰ اسلامیہ (۳/۱۷۹-۱۸۱-۲۰۲-۵۰۲) طبع دار القلم۔ بیروت.

جب کہ سنن ابی داؤد میں مسائل حج میں ایک روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے،

اس حدیث کے الفاظ ہیں:

«لَيْسَ عَلَى النِّسَاءِ حَلْقٌ، وَإِنَّمَا عَلَى النِّسَاءِ التَّقْصِيرُ»^①

”عورتوں پر سر موٹنا نہیں ہے۔ ان پر (حج و عمرے کے موقع پر) صرف (تھوڑے

سے) بالوں کا کاٹنا ہے۔“

ان دونوں حدیثوں سے عورتوں کا اپنے بالوں کو موٹنا تو بالصراحت ناجائز ثابت ہوا، جب کہ ان کا بالوں کو کاٹنا اور تراش خراش سے مختلف ڈیزائنوں میں بدلنا بھی منع ہے، کیوں کہ عورتوں کا بالوں کی ایسی تراش خراش کرنا مردوں سے مشابہت پیدا کرنے کے مترادف ہے اور ایسی عورتوں پر جو کسی بھی طرح مردوں سے مشابہت پیدا کریں، نبی اکرم ﷺ نے لعنت فرمائی ہے اور جو مرد اپنے کسی فعل سے عورتوں سے مشابہت پیدا کریں، ان پر بھی لعنت کی گئی ہے، چنانچہ صحیح بخاری، سنن ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، دارمی، مسند طیالسی اور مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

«لَعَنَ النَّبِيُّ ﷺ ... الْمُتَرَجَّلَاتِ مِنَ النِّسَاءِ»^②

”نبی کریم ﷺ نے مردوں سے مشابہت کرنے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے۔“

جبکہ صحیح بخاری میں یہ الفاظ بھی ہیں:

«لَعَنَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الْمُتَشَبِّهِينَ مِنَ الرِّجَالِ بِالنِّسَاءِ وَالْمُتَشَبِّهَاتِ مِنَ النِّسَاءِ بِالرِّجَالِ»^③

”نبی کریم ﷺ نے عورتوں سے مشابہت پیدا کرنے والے مردوں پر اور مردوں سے

مشابہت پیدا کرنے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے۔“

سنن ابی داؤد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ارشاد نبوی ہے:

① سنن ابی داؤد، رقم الحدیث (۱۹۸۴ و ۱۹۸۵) سلسلۃ الأحادیث الصحیحۃ للآلبانی (۶۰۵ طبع بیروت).

② صحیح البخاری مع الفتح (۱۰/۳۳۳) بحوالہ حجاب المرأة المسلمة للآلبانی (ص: ۶۷، طبع

المکتب الإسلامی - بیروت) صحیح سنن ابی داؤد، رقم الحدیث (۴۱۳۱) صحیح سنن الترمذی، رقم

الحدیث (۲۲۳۶) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۱۹۰۴)

③ صحیح البخاری مع الفتح (۱۰/۳۳۲) و حجاب المرأة المسلمة أيضاً.

«لَعَنَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الرَّجُلَةَ مِنَ النِّسَاءِ»^(۱)

”نبی اکرم ﷺ نے مردوں سے مشابہت پیدا کرنے والی عورت پر لعنت فرمائی ہے۔“
اس موضوع کی اور بھی کئی احادیث ہیں۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک غلط فہمی کی طرف بھی اشارہ کر دیا جائے کہ صحیح مسلم میں حضرت ابوسلمہ بن عبدالرحمن بیان کرتے ہیں:
”كَانَ أَزْوَاجُ النَّبِيِّ ﷺ يَأْخُذْنَ مِنْ رُؤُوسِهِنَّ حَتَّى تَكُونَ كَالْوَفْرَةِ“^(۲)
”نبی اکرم ﷺ کی ازواجِ مطہرات اپنے سروں کے بال لمبائی سے لے لیتی تھیں، یہاں تک کہ وہ وفرہ کی مانند ہو جاتے۔“

”وفرہ“ ایسے بالوں کو کہا جاتا ہے جو کانوں تک ہوں۔ بال اس سے زیادہ لمبے اور کندھوں تک پہنچتے ہوں تو انھیں ”لرہ“ اور اس سے بھی لمبے ہوں تو انھیں ”بُتْمَہ“ کہا جاتا ہے۔ بعض علما کے نزدیک اس کے برعکس ”وفرہ“ وہ بال ہیں، جو سب سے زیادہ لمبے ہوں اور پھر اس کے بعد ”لرہ“ اور پھر بُتْمَہ جو سب سے چھوٹے ہوں۔

حافظ صلاح الدین یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے ہفت روزہ ”الاعتصام“ لاہور (جلد ۴۱ شمارہ ۳۶ بابت ۶ صفر ۱۴۱۰ھ بہ مطابق ستمبر ۱۹۸۹ء) میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھا تھا:

”ازواجِ مطہرات کے اس فعل کے بارے میں شارحین حدیث نے یہ صراحت کی ہے کہ ان کا یہ فعل نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد کا ہے اور اس سے ان کا مقصود ترکِ تزینت تھا، کیونکہ لمبے بالِ حُسن و زینت میں شمار ہوتے ہیں، جس سے وہ بچنا چاہتی تھیں۔“
آگے چل کر موصوف لکھتے ہیں:

”تاہم اس کے ساتھ ساتھ شارحین حدیث نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ عورتیں اپنے بال ہلکے کر سکتی یعنی کاٹ سکتی ہیں۔ ”فِيهِ دَلِيلٌ عَلَى جَوَازِ تَخْفِيفِ الشُّعُورِ لِلنِّسَاءِ“^(۳)

(۱) صحیح سنن أبي داود، رقم الحديث (۳۴۵۵) حجاب المرأة المسلمة (ص: ۶۸)

(۲) صحیح مسلم شرح النووي (۴/۴)

(۳) شرح النووي علی صحیح مسلم (۱/۱۴۸) فتح الملہم (۱/۴۷۲) مختصر صحیح مسلم للمنذری بتحقیق علامہ البانی (ص: ۵۰) السراج الوہاج (۱/۱۲۶) إكمال المعلم المعروف شرح الأبي (۱/۹۶)

آگے حافظ صاحب موصوف نے لکھا ہے:

”ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے اس طرز عمل سے اس امر کا جواز تو یقیناً معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں ایسے بال رکھ سکتی ہیں، جنہیں ہمارے ہاں عام طور پر پٹے کہا جاتا ہے۔ تاہم اس سے نوجوان عورتوں کے بالوں کے فیشن کا جواز ہرگز نہیں نکلتا، جو ایک تو وفرہ (پٹے) کی تعریف میں نہیں آتے۔ دوسرے اس کی بنیاد تبرج (اظہار زیب و زینت) اور بے پردگی پر ہے۔ تیسرے اس سے مقصود مغربی عورتوں کی نقالی ہے۔ جو «مَنْ تَشَبَهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ» کی رو سے ناجائز ہے۔ چوتھے اس میں بالعموم غیر محرم مردوں سے بال کٹوانے پڑتے ہیں، جو سراسر بے غیرتی کا مظاہرہ ہے۔

”ان وجوہ اربعہ کے پیش نظر عورتوں کے بال کٹوانے کی موجودہ روش سراسر غیر اسلامی اور ناجائز ہے۔ اسی طرح بیوٹی پارلوں کا موجودہ کاروبار جو عورتوں میں بالوں کے مغربی فیشن اور بے پردگی کو عام کرنے کا باعث ہے، غلط اور ناجائز ہے۔ تاہم اگر کوئی عورت مذکورہ تمام قباحتوں سے بچتے ہوئے لمبے بال رکھنے کے بجائے پٹے بال رکھنا پسند کرے تو اس کا جواز موجود ہے۔“^①

دیگر محققین کی رائے:

موصوف کے اس جواب میں موجودہ فیشن کی تردید تو بہر حال موجود ہے اور بالوں کی تراش و خراش سے مراد صرف فیشن کی پیروی ہی ہوتی ہے نہ کہ دوسری غرض شریف۔ جہاں تک وجوہ اربعہ اور دیگر قباحتوں سے بچتے ہوئے پٹے بال کٹوانے کے جواز کا کہا گیا ہے اور امام نووی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر شارحین حدیث (جن کی غالب اکثریت نے امام نووی رحمۃ اللہ علیہ ہی کا قول نقل کر کے اسے برقرار رکھا ہے) کے اس جواز کو تسلیم کرنے کا ذکر کیا ہے، اسے بعض دیگر محقق علمائے کرام درست تسلیم نہیں کرتے۔ چنانچہ الاعتصام (شمارہ ۴۵ جلد ۴۱ بابت ۱۰ ربیع الثانی ۱۴۱۰ھ بہ مطابق ۱۰ نومبر ۱۹۸۹ء) ہی میں استاذی شیخ الحدیث مولانا ثناء اللہ خاں مدنی (لاہور) نے ایک تفصیلی مضمون لکھا اور ثابت کیا کہ حافظ صلاح الدین یوسف صاحب اور دیگر شارحین کی رائے درست نہیں ہے۔ اسی طرح ایک فاضل

① ہفت روزہ ”الاعتصام“ (جلد: ۴۱، شمارہ: ۴۶) لاہور۔

محقق مولانا ابوالشبال صغیر احمد شاغف بہاری (مکہ مکرمہ) کا مکتوب بھی اسی شمارے میں شائع ہوا۔ مولانا موصوف نے اپنے مکتوب میں لکھا ہے:

”حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا میں جو علت موجود ہے، یعنی بعد وفاتِ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم انہوں نے ایسا کیا تو اسی حدیث سے استنباط بدون علت از روئے فقہ جائز نہیں۔ البتہ اس حدیث سے ان بیوہ عورتوں کے لیے جواز کی دلیل ہے، جو شادی کرنے کی بہ وجہ مجبوری خواہش مند نہ ہوں۔ بہ صورتِ دیگر اس سے جوازِ عام کی صورت میں محض مقلد انہ اندھا پن ہے کہ جو اگلوں نے لکھ دیا، اگرچہ ان سے اس نص کے سمجھنے میں سہو ہوا ہو، ان کے بعد آنے والے آنکھ بند کر کے اسی پر فتویٰ صادر کرتے چلے گئے۔ پھر اس حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا پر خیر القرون کی عورتوں یعنی اہمات المؤمنین کے علاوہ دیگر صحابیات اور تابعیات اور اس کے بعد میں اس پر عمل ہوا یا نہیں؟ کم از کم میری نظر سے تو اس پر عمل کرنے کا ثبوت نہیں گزرا، لہذا میری نظر میں یہ فتویٰ قابلِ گرفت و تصحیح ہے، یعنی جواز کی صورت صحیح نہیں۔ رہی یہ بات کہ عدمِ جواز کی بھی کوئی روایت ثابت ہے یا نہیں؟ تو اس سلسلے میں یہ عملی تواتر از عہدِ صحابیات تا ایں دم کافی ہے۔“

حافظ ثناء اللہ صاحب مدنی نے اپنے مفصل مضمون میں جس کا عنوان ”عورت معقول عذر کے بغیر سر کے بال نہیں کٹوا سکتی“ طویل بالوں سے متعلقہ ابتدائیہ کے بعد لکھا:

”اسلام میں جہاں تک مرد کے بالوں کا تعلق ہے، اگرچہ بعض احادیث سے منڈوانے کا جواز ملتا ہے، لیکن افضل و اولیٰ امر یہ ہے کہ بال رکھے جائیں اور صاف کرانے سے احتراز کیا جائے۔ بخاری و مسلم کی متفق علیہ حدیث سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بالوں کا اسوۂ حسنہ بیان کیا ہے کہ وہ نصف کانوں تک اور ایک روایت کی رو سے کانوں اور کندھوں کے درمیان تھے۔ ”مجمع البحار“ سے اس اختلاف کی وجہ جمع یہ نقل کی ہے کہ ان دونوں روایتوں میں مذکور لمبائی کو مختلف اوقات پر محمول کیا جائے گا کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم بال کاٹنے میں تساہل برتتے تو کندھوں تک پہنچ جاتے اور جب کاٹتے تو کان تک ہوتے۔“

آگے حافظ صاحب لکھتے ہیں:

”اس سے معلوم ہوا کہ مردوں کے لیے بال رکھنے کا اندازہ اس حد بندی میں محدود ہے، جب کہ عورتوں کو یہ ہیئت اختیار کرنی ممنوع ہے، جس طرح کہ عورتوں کو مردوں سے تشبہ اختیار کرنا ناجائز ہے۔“

آگے تشبہ اختیار کرنے والی عورتوں پر لعنت کے ورود سے متعلقہ احادیث (جن میں سے بعض گزر چکی ہیں) نقل کرنے کے بعد صحیح مسلم والی موضوع بحث سے متعلق حدیث کے لفظ ”يَأْخُذْنَ“ کے بارے میں لکھا ہے:

”اس کا ترجمہ ضروری نہیں کہ کاٹنا ہی ہو (جیسا کہ حافظ صلاح الدین صاحب یوسف نے کہا ہے) احتمال ہے کہ اس کا معنی یہ ہو کہ وہ اپنے بالوں کا خاص انداز میں جوڑا بنا لیتی تھیں، جو وفرہ کی شکل میں نظر آتے۔ مسائل طہارت سے اس معنی کی مناسبت بھی ہے، کیوں کہ عورتیں عموماً غسل کے موقع پر ایسا فعل کرتی ہیں۔“

”پھر مصنف رحمۃ اللہ علیہ (امام مسلم) کا اسے اس کے مناسب محل و مقام پر ذکر نہ کرنا بھی ہمارے مدعا کا موید ہے، جب کہ صحیح مسلم اپنے حسن ترتیب اور سہل الماخذ ہونے میں معروف ہے۔ دوسری بات یہ کہ شرع میں وفرہ، لثمہ، بجمہ، بالوں کے اوصاف صرف مردوں کے لیے بیان ہوئے ہیں، عورتوں کے لیے نہیں۔ یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بال حقیقتاً وفرہ نہ تھے۔ صرف دیکھنے میں وفرہ معلوم ہوتے تھے۔ اس لیے یہاں کاف تشبیہ سے تعبیر کی گئی ہے۔ ”كَالْوَفْرَةِ“ یعنی وفرہ جیسے تھے۔

”اگر یہ بات تسلیم بھی کر لی جائے کہ ”يَأْخُذْنَ“ کا معنی کاٹنا ہے تو یہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کا خاصا ہوگا، کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ان کی حیثیت معتدات (عدت گزارنے والیاں) جیسی تھی۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَمَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا رَسُولَ اللَّهِ وَلَا أَنْ تُنكِحُوا أَزْوَاجَهُ مِنْ بَعْدِهِ أَبَدًا إِنَّ ذَلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللَّهِ عَظِيمًا﴾ [الأحزاب: ۵۳]

”تمہارے لیے یہ ہرگز جائز نہیں کہ اللہ کے رسول کو تکلیف دو، اور نہ یہ جائز ہے کہ ان کے بعد ان کی بیویوں (ازواج مطہرات) سے نکاح کرو۔ یہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا

گناہ ہے۔ تم خواہ کوئی بات ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ کو ہر بات کا علم ہے۔“
 ”قاضی عیاض رحمہ اللہ شارح صحیح مسلم نے اس بات کا اشارہ دیا ہے کہ ازواج النبی صلی اللہ علیہم وسلم کا یہ فعل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد تھا اور صاحب تفسیر ”أضواء البیان“ نے امام نووی رحمہ اللہ کی پیروی میں بایں الفاظ کہا ہے:

”وَهُوَ مُتَعَيِّنٌ وَلَا يُظَنُّ بِهِنَّ فِعْلُهُ فِي حَيَاتِهِ ﷺ“^①

”اس حکم کے پیش نظر ازواج النبی صلی اللہ علیہم وسلم نے سادگی اور ترک زینت کو ضروری سمجھ کر فعل ہذا کا ارتکاب کیا، تاکہ کئی طور پر نکاح کے دواعی سے قطع و یاس ہو سکے۔ ہر دو صورت میں امام نووی رحمہ اللہ کے قول: ”وَفِيهِ دَلِيلٌ عَلَى جَوَازِ تَخْفِيفِ الشُّعُورِ لِلنِّسَاءِ“
 ”اس میں عورتوں کے بال ہلکے کرنے کی دلیل ہے۔“ کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے کہ ان کا استدلال درست نہیں۔ بالخصوص جب انہوں نے خود بھی قاضی عیاض رحمہ اللہ کے موقف کو درست قرار دیا ہے۔ نیز اس میں تغیر لخلق اللہ اور مثلہ کا شائبہ بھی موجود ہے، جو اس فعل سے مانع ہے۔ واللہ اعلم۔“

آگے حافظ ثناء اللہ صاحب مدنی لکھتے ہیں:

”عام حالات میں اگر عورت کو بال کاٹنے کی اجازت ہوتی تو میرے خیال میں کم از کم حج کے موقع پر اس کو موٹڈ نے کا حکم ضرور ہونا چاہیے تھا، تاکہ «اللَّهُمَّ ارْحَمِ الْمُحَلَّقِينَ» کی سعادت سے محروم نہ رہتی۔ اس کے برعکس معاملہ یہاں تک محدود ہے کہ ماسوائے چند بالوں کے سر کی تقصیر کی بھی اجازت نہیں تو عام حالات میں بلا وجہ بال کاٹنے کیسے جائز ہوں گے؟ ہرگز نہیں۔ البتہ کسی معقول علت و عذر کی بنا پر یہ فعل جائز ہے، جیسے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے بیماری کی وجہ سے اپنا سر منڈوایا تھا۔“

﴿وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرُّتُمْ إِلَيْهِ﴾ [الأَنْعَامُ: ۱۰۶]

تفصیلی قصہ صحیح ابن جان میں گیارہویں نوع اور پانچویں قسم میں بھی موجود ہے۔ علامہ البانی

کتاب ”حِجَابُ الْمَرْأَةِ الْمُسْلِمَةِ“ میں فرماتے ہیں:

① أضواء البیان علامہ شنقيطي (۵/ ۵۹۸)

”بال کٹانے سے اگر غیر مسلموں کی مشابہت مقصود ہو تو حدیث «مَنْ تَشَبَهَ بِقَوْمٍ» کی بنا پر ناجائز ہے، ورنہ جائز ہے۔“

”میرے خیال میں یہ بات بھی درست نہیں۔ وہ اس کی کوئی نئی دلیل بیان نہیں کر سکے، بلکہ بنیاد ازواجِ مطہرات کے فعل پر ہے، جس کی معقول توجیہات پہلے بیان ہو چکی ہیں۔ نیز حدیث «مَنْ تَشَبَهَ بِقَوْمٍ» کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ اس کی جھلک فتاویٰ اہل حدیث میں موجود ہے:

”در اصل ہمارے ماحول اور معاشرے میں آج کل جو کچھ نظر آ رہا ہے، اسلامی تہذیب و تمدن کا قطعاً اس سے کوئی تعلق اور واسطہ نہیں۔ یہ خالصتاً مغربی اور استعماری تہذیب و تقلید کا نتیجہ ہے، جس کی یلغار میں بڑے بڑے بُرج بھی منہدم اور بہتے نظر آ رہے ہیں (نَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ هَذِهِ الْفِتَنِ)“^①

پھر عورتوں کا مردوں سے مشابہت پیدا کرنا، بالوں کی تراش و خراش کے علاوہ بھی کئی طرح سے ممکن ہے، جس کی تفصیل کا یہاں اب موقع نہیں کہ یہ خارج از موضوع بات ہو جائے گی۔

مصنوعی بالوں کے جوڑوں اور وگوں کی ممانعت کا تذکرہ ہو رہا ہے، جس کے آخر میں عورتوں کے بال منڈوانے اور کٹوانے کی ممانعت کا تذکرہ بھی آ گیا ہے۔ صحیح بخاری شریف میں ”باب وصل الشعر“ کے تحت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے پانچ صحابہ و صحابیات رضی اللہ عنہم سے جو احادیث سات طرق سے بیان کی ہیں، ان کی شرح کے آخر میں بطور نتیجہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

”ان احادیث میں بالوں کو جوڑنے اور جڑوانے کو حرام قرار دینے کی رائے رکھنے والوں کے لیے دلیل ہے۔ بعض لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ اس ممانعت کو نہی تنزیہی پر محمول کیا جائے، یہ ان کا واضح رد ہے، کیوں کہ کسی کام پر لعنت بھیجا جانا، اس کے حرام ہونے کے قوی دلائل میں سے ہے، بلکہ بعض لوگوں کے نزدیک لعنت بھیجا جانا تو اس فعل کے کبیرہ گناہ ہونے کی علامت ہے۔“

(جیسا کہ علامہ بیہقی اور شیخ احمد آل بو طامی کی کبیرہ گناہوں پر مشتمل کتب کا تذکرہ ہم بھی

① ہفت روزہ ”الاعتصام“ (جلد: ۴۱، شمارہ: ۳۶) لاہور۔

کر چکے ہیں) آگے موصوف لکھتے ہیں:

”حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے طبرانی میں جو روایت نقل کی گئی ہے، جو ان کی طرف سے بالوں کو جوڑنے کی رخصت پر دلالت کرتی ہے، وہ باطل ہے، کیوں کہ یہاں بخاری شریف میں لہن کو بھی بال جوڑنے کی اجازت نہ دینے والی حدیث شائد ہے کہ وہ رخصت و اجازت کی قائل نہیں تھیں۔“^①

حرمت و لعنت کا سبب:

وگ کے استعمال کی حرمت یا مصنوعی جوڑوں پر لعنت فرمائے جانے کی وجہ دراصل دجل و فریب، دھوکا دہی اور تغیر خلق اللہ ہے، خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فیشن یا فعل کو ”زور“ یعنی جھوٹ اور فریب سے تعبیر فرمایا ہے، جیسا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں گزرا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر قسم کی جعل سازی اور فریب کاری سے بھی سختی سے منع فرمایا ہے، جیسا کہ صحیح مسلم، سنن ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ، مستدرک حاکم، سنن بیہقی، مسند احمد اور بعض دیگر کتب حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک واقعہ مذکور ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر غلے کے ایک ڈھیر کے قریب سے ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک اس ڈھیر کے اندر گھسا دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں کو نمی سی لگی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غلے والے سے پوچھا کہ معاملہ کیا ہے تو اس نے بتایا کہ اسے آسمان سے یہ نمی (بارش یا شبنم کی وجہ سے) پہنچی ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَفَلَا جَعَلْتَهُ فَوْقَ الطَّعَامِ كَمَا يَرَاهُ النَّاسُ؟»

”تم نے یہ گیلا غلہ اوپر کیوں نہ ڈال دیا، تاکہ لوگ اسے دیکھ لیتے؟“

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ مشہور و معروف الفاظ ارشاد فرمائے، جو زبان زد خاص و عام ہیں اور صحیح مسلم، مسند ابی عوانہ اور سنن ابی داؤد میں مروی ہیں:

«مَنْ عَشَّ فَلَيْسَ مِنَّا» ”جس نے دھوکا دیا، وہ مجھ سے نہیں۔“

صحیح مسلم کی ایک دوسری روایت اور سنن ابن ماجہ میں یہ الفاظ منقول ہیں:

«مَنْ عَشَّ فَلَيْسَ مِنِّي» ”جس نے دھوکا دہی کی، وہ ہم سے نہیں۔“

① فتح الباری (۱۰/۳۷۷)

صحیح مسلم کی تیسری روایت اور سنن ترمذی میں یہ الفاظ منقول ہیں:

«لَيْسَ مِنَّا مَنْ غَشَّ» «جس نے دھوکا دہی کی، وہ ہم سے نہیں۔»

صحیح مسلم کی چوتھی روایت اور مستدرک حاکم میں یہ الفاظ منقول ہیں:

«لَيْسَ مِنَّا مَنْ غَشَّنَا» «جس نے ہم سے دھوکا دہی کی، وہ ہم سے نہیں۔»

صحیح مسلم کی ایک پانچویں روایت، جو مسند احمد اور سنن بیہقی میں بھی مروی ہے، اس میں

ارشاد نبوی ﷺ کے الفاظ یہ ہیں:

«أَلَا مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا»^①

”خبردار! جس نے ہم سے دھوکا دہی کی تو وہ ہم سے نہیں۔“

اس حدیث کی یہ پانچ روایتیں ہیں، جن کے الفاظ ملتے جلتے ہیں، اور ان میں معمولی فرق

ہے، لیکن معنی سب کا ایک ہی ہے، ان میں سے جو الفاظ زبان زدِ خاص و عام ہیں، وہ «مَنْ غَشَّ

فَلَيْسَ مِنَّا» ہیں۔ ان الفاظ میں «فَلَيْسَ مِنِّي» وہ مجھ سے نہیں۔ یا «فَلَيْسَ مِنَّا» وہ ہم سے نہیں،

سے مراد یہ ہے کہ وہ میری امت سے نہیں یا بالفاظ دیگر وہ امتِ اسلامیہ کا فرد نہیں۔ اندازہ فرمائیں

کہ کتنی سخت وعید ہے؟

صحیح ابن حبان، طبرانی صغیر، طبرانی کبیر، حلیۃ الاولیاء ابو نعیم اور مسند الشہاب للقتضاعی میں

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے:

«مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا، وَالْمَكْرُ وَالْخَدِيعَةُ فِي النَّارِ»^②

”جس نے ہم سے دھوکا کیا، وہ ہم سے نہیں اور مکر و فریب کا انجام جہنم ہے۔“

مجمع الزوائد میں امام بیہقی رضی اللہ عنہ نے اس کی سند کے ایک راوی عاصم کو سولے حفظ والا قرار دیا

ہے، جب کہ شیخ محمد ناصر الدین البانی رضی اللہ عنہ نے ”إرواء الغلیل فی تخریج أحادیث منار السبیل“

میں لکھا ہے:

① یہ حدیث ابو ہریرہ مختصر صحیح مسلم للمنزہی، رقم الحدیث (۱۲۳۵) صحیح سنن أبی داود، رقم

الحدیث (۲۹۴۶) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۱۰۶۰) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۲۲۲۴)

إرواء الغلیل (۱۶۱/۵) میں ملاحظہ فرمائیں۔

② إرواء الغلیل (۱۶۴/۵) موارد الظمان لزوائد ابن حبان للہیثمی (۱۱۰۷) و السلسلة الصحیحة (۱۰۵۸)

”ماہرین علم حدیث کے نزدیک یہ بات طے شدہ ہے کہ یہ راوی حسن الحدیث ہیں اور ان سے حجت و دلیل لی جائے گی، خصوصاً جب کہ وہ دوسرے ثقہ راویوں کے موافق کوئی بات نقل کریں۔“

یہی وجہ ہے کہ امام منذری رحمہ اللہ نے ترغیب و ترہیب میں جب یہ حدیث نقل کی تو کہا کہ اس کی سند جید ہے۔ امام ابو داؤد نے اپنی کتاب ”المراسیل“ میں حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے مرسلہ اور قدرے اختصار سے یہ حدیث یوں بیان کی ہے:

«الْمَكْرُ وَالْخَدِيْعَةُ وَالْخِيَانَةُ فِي النَّارِ»^①

”مکر و فریب اور خیانت کرنے والوں کا ٹھکانا جہنم ہے۔“

امام خطابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”مصنوعی جوڑوں اور وگوں (نیز نقش کروانے اور بھنوں کے بال کاٹ یا چن کر انھیں باریک کرنے) وغیرہ کے بارے میں سخت وعید اس لیے وارد ہوئی ہے کہ ان میں کھوٹ اور فریب ہے۔ اگر ان کی رخصت دے دی جاتی تو پھر یہ کھوٹ اور فریب کی دوسری صورتوں کو بھی جائز کر لینے کا وسیلہ و ذریعہ بن جاتیں، اس سخت وعید کی دوسری وجہ قدرتی ساخت میں رڈ و بدل کا پہلو بھی ہے۔“

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کے الفاظ: «الْمُغَيَّرَاتِ خَلَقَ اللّٰهُ» سے

بھی اس کا اشارہ ملتا ہے۔^②

ان الفاظ والی جس حدیث کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہ صحیح بخاری و مسلم میں ہے، جس میں

کئی طرح کی عورتوں پر لعنت کی گئی ہے، جن میں سے ایک یہ بھی ہے:

«لَعْنَةُ اللّٰهِ... الْمُغَيَّرَاتِ خَلَقَ اللّٰهُ، مَا لِيْ لَا أَلْعَنُ مَنْ لَعَنَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ»

وَهُوَ مَلْعُوْنٌ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ»^③

① مراسیل سنن أبي داود (ص: ۸۱ طبع معهد الشريعة كوت ادو، تحقيق مولانا محمد عبده) و الإرواء (۱۶۴/۵)

② فتح الباري (۲۸۰/۱۰)

③ صحيح البخاري مع الفتح (۳۷۸/۱۰) صحيح مسلم مترجم اردو (۳۳۳/۵) آداب الزفاف للالباني (ص: ۱۳۳)

”قدرتی ساخت میں رد و بدل کرنے والیوں پر اللہ کی لعنت ہو، مجھے کیا ہے کہ میں اس پر لعنت نہ کروں، جس پر نبی اکرم ﷺ نے لعنت کی ہے اور جو کتاب اللہ کی رو سے بھی ملعون ہے۔“

کتاب اللہ میں لعنت سے مراد سورۃ النساء (آیت: ۱۱۷) میں مذکور لعنت ہے۔ وگوں کے استعمال میں چونکہ فریب کاری اور دھوکا دہی ہے، لہذا مذکورہ حدیث کی رو سے یہ ممنوع و حرام اور کبیرہ گناہ ہے۔ اس کے علاوہ صحیح بخاری و مسلم، سنن نسائی اور مسند احمد میں حضرت سعید بن مسیب سے مروی حدیث میں ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«مَا كُنْتُ أَرَى أَحَدًا يَفْعَلُ هَذَا غَيْرَ الْيَهُودِ»^①

”میں نے یہودیوں کے سوا کسی کو اس فعل کا ارتکاب کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔“

حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے بیٹے حضرت حمید سے مروی حدیث میں ہے کہ خود

نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«إِنَّمَا هَلَكَتْ بَنُو إِسْرَائِيلَ حِينَ اتَّخَذَ هَذِهِ نِسَاؤُهُمْ»^②

”بنی اسرائیل کی عورتوں نے جب اس فعل کا ارتکاب شروع کیا تو وہ ہلاک ہو گئے۔“

معلوم ہوا کہ مصنوعی جوڑے اور وگیں لگانا یہودیوں کا فعل ہے، جو ان کی ہلاکت کے اسباب میں سے بھی ہے، لہذا جب بنی اسرائیل کی ہلاکت کے اسباب میں سے ایک یہ بھی ہے تو یہ مسلمانوں کے لیے روا کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کے علاوہ جب یہ فعل یہود ہے تو اس کا ارتکاب کرنے والا یہودیوں کی مشابہت کرتا ہے، جو خود ممنوع ہے، کیوں کہ صحیح ابن حبان، سنن ابی داؤد اور متدرک حاکم میں مذکور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی مشہور حدیث ہے:

«مَنْ تَشَبَهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ»^③

”جس نے کسی قوم کی مشابہت کی تو وہ انھیں میں سے ہے۔“

① صحیح البخاری مع الفتح (۶۶۷/۹)

② صحیح البخاری مع الفتح، رقم الحدیث (۹۵۳۲) صحیح مسلم مترجم اُردو (۳۳۴/۵)

③ بحوالہ حجاب المرأة المسلمة (ص: ۱۰۴) صحیح سنن ابی داؤد، رقم الحدیث (۳۴۰۱) صحیح

الجامع، رقم الحدیث (۶۱۴۹) و الإرواء (۱۲۶۹)

وگ پر مسح کا حکم:

قرآن و سنت پر مبنی دلائل کی رو سے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ مصنوعی جوڑے یا وگیں ناجائز و حرام ہیں اور ان کا ارتکاب کبیرہ گناہ ہے۔ یہ تو تھی ان کی شرعی حیثیت۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر عورت ایسا جوڑا لگا ہی لے یا کوئی مرد وزن ایسی وگ لگا لے تو غسل اور وضو میں ان کا کیا حکم ہے؟ تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ چونکہ ایسے جوڑوں اور وگوں کے بال جسم کا حصہ ہوتے ہیں نہ یہ کسی جائز صورت و مجبوری کی بنا پر لگائے جاتے ہیں اور نہ ان کا اتارنا چنداں دشوار ہوتا ہے، اس لیے ان کی حیثیت ایک خارجی چیز کی ہوگی، لہذا اگر کوئی عورت یا مرد وگ لگائے ہوئے ہو اور وضو کرتے ہوئے سر کا مسح اس طرح کرے کہ ان مصنوعی بالوں کے اوپر ہی مسح کر لے اور اصلی بالوں پر مسح نہ ہو پائے تو وہ کافی نہ ہوگا اور چونکہ سر کا مسح وضو کے فرائض و واجبات میں سے ہے، لہذا اس کا وضو صحیح نہیں ہوگا۔ اُسے مصنوعی جوڑا یا وگ اتار کر اپنے اصلی بالوں پر مسح کرنا ہوگا۔^①

وگ کے ساتھ غسل کی صورت:

غسل کے سلسلے میں مردوں کے لیے تو ضروری ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے بالوں والا ہو یا زلفوں والا، چاہے اس نے مینڈھیاں رکھی ہوئی ہوں، بہر حال بالوں کو کھول کر پورے بالوں کو بھی دھوئے گا اور سر کو بھی۔ لہذا مردوں کو تو بہر صورت وگ اتار کر ہی غسل کرنا ہوگا، تاکہ سر کے اصل بال اور سر کی کوئی جگہ خشک نہ رہ جائے۔

عورتوں کا معاملہ اس سے کچھ مختلف ہے، کیوں کہ انھیں غسل کی بعض صورتوں میں کچھ رعایت دی گئی ہے۔ ہدایہ، بدائع الصنائع اور قدوری وغیرہ میں اس کی رعایت کو مطلق ہی قرار دے دیا گیا ہے کہ غسل چاہے کوئی بھی ہو، عورت کو اپنے سر کی چوٹی یا مینڈھیاں کھولنے کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ صاحب ہدایہ و قدوری لکھتے ہیں:

”وَلَيْسَ عَلَى الْمَرْأَةِ أَنْ تَنْقُصَ ضَفَائِرَهَا فِي الْغُسْلِ إِذَا بَلَغَ الْمَاءُ أُصُولَ الشَّعْرِ“^②

”غسل کے دوران میں اگر پانی بالوں کی جڑوں تک پہنچ جائے تو عورت کے لیے بالوں

① جدید فقہی مسائل (ص: ۲۹)

② ہدایہ، و البدائع بحوالہ شرح قدوری: اللباب فی شرح الكتاب (۱/ ۱۶)

کی مینڈھیاں کھولنا ضروری نہیں ہے۔“

لیکن حقیقت یہ ہے کہ کتب فقہ میں مذکورہ اس اطلاق و توسع کو احادیث رسول اکرم ﷺ غسل جنابت کے ساتھ مقید کر دیتی ہیں، کیوں کہ غسل حیض کے دوران میں بالوں کو کھولنے کا حکم ثابت ہے اور غسل نفاس کا حکم بھی غسل حیض والا ہی ہے۔ چنانچہ سنن ابن ماجہ اور مصنف ابن ابی شیبہ میں ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ وہ حیض سے تھیں اور جب غسل کا وقت آیا تو انھیں نبی اکرم ﷺ نے حکم فرمایا:

«انْقِضِي شَعْرَكَ وَاعْتَسِلِي»^①

”اپنے سر کے بالوں (مینڈھیوں وغیرہ) کو کھول دو اور غسل کرو۔“

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی اس حدیث کو علامہ ابن حزم رضی اللہ عنہ نے ”المحلی“ (۳۸ / ۲ / ۸) میں بھی روایت کیا ہے اور اسے اپنانے کو واجب قرار دیا ہے اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی وہ حدیث جس میں عورت کو غسل حیض و جنابت ہر دو میں بال نہ کھولنے کا حکم ہے، اُسے ساقط الاعتبار قرار دیا ہے اور ساقط ہونے کی وجوہات بھی ذکر کی ہیں۔

علامہ سندھی کے حاشیہ ابن ماجہ سے نقل کرتے ہوئے شیخ محمد فواد عبدالباقی نے لکھا ہے:

”حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا والی وہ حدیث جس میں نبی اکرم ﷺ نے غسل حیض کے لیے سر کے بالوں کو کھولنے کا حکم فرمایا۔ اس کی اصل صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتب حدیث میں موجود ہے۔“^②

چنانچہ صحیح بخاری میں امام صاحب موصوف نے ”کتاب الحيض“ میں جہاں اصل واقعہ ذکر کیا ہے، وہاں ”بَابُ نَقْضِ الْمَرْأَةِ شَعْرَهَا عِنْدَ غُسْلِ الْمَحِيضِ“ کے تحت روایت کیا ہے کہ غسل حیض کے لیے عورت کا بالوں کے کھولنے کا حکم کیا ہے؟ حافظ ابن حجر رضی اللہ عنہ نے اس کی شرح میں لکھا ہے:

”اس حدیث کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ حائضہ پر اپنے بالوں کو کھول کر غسل کرنا واجب

① سنن ابن ماجہ بتحقیق محمد فواد عبدالباقی (۲۱۰ / ۸) مصنف ابن ابی شیبہ (۷۹ / ۱) طبع الدار السلفية بمبئی.

② تحقیق سنن ابن ماجہ (۲۱۰ / ۸)

ہے۔ حضرت حسن بصری، امام طاؤس اور امام احمد رضی اللہ عنہم کا یہی مسلک ہے اور علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صحیح کہا ہے۔ البتہ امام احمد کے اصحاب میں سے ایک جماعت نے بالوں کو کھولنا مستحب قرار دیا ہے، واجب نہیں کہا اور جمہور کا مسلک بھی عدمِ وجوب کا ہے^①۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ والی مذکورہ حدیث کتاب الحج میں روایت کی ہے، جس پر امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے ”بیان حج الحائض“ کے الفاظ سے تبویب کی ہے^②۔

اس سے معلوم ہوا کہ حیض و نفاس کی صورت میں اصل بالوں کی چوٹیوں کو بھی کھولنے ہی کا حکم ہے تو مصنوعی جوڑے یا وگ کو بھی اتارے بغیر غسل صحیح نہیں ہوگا اور غسل کے وقت تو شاید اسے رکھتا بھی کوئی نہیں، بلکہ اتار ہی لیا جاتا ہے، کیوں کہ اس کا اتارنا کوئی مشکل تو ہوتا نہیں۔ اصل مسئلہ وضو کا تھا تو وہ الحمد للہ ذکر ہو گیا کہ وگ وغیرہ کو اتارے بغیر وضو صحیح نہیں ہوتا۔ غسل جنابت میں عورتوں کو رخصت دی گئی ہے کہ وہ بے شک بالوں کی چوٹیاں نہ کھولیں۔ چنانچہ صحیح مسلم، سنن اربعہ اور مسند احمد میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میں اپنے بالوں کو خوب مضبوطی سے گوندتی یا مینڈھیاں بناتی ہوں۔ کیا غسل جنابت کے لیے میں انھیں کھولا کروں تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا، إِنَّمَا يَكْفِيكَ أَنْ تَحْتِي عَلَى رَأْسِكَ ثَلَاثَ حَثِيَّاتٍ ثُمَّ تَفِيضِينَ
عَلَيْكَ الْمَاءَ فَتَطْهَرِينَ»^③

”نہیں تمھارے لیے بس اتنا کافی ہے کہ تین چلو پانی اپنے سر پر ڈال لو اور پھر سارے بدن پر پانی بہا لو۔ تم پاک ہو جاؤ گی۔“

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا ہی سے ایک روایت میں جنابت کے ساتھ حیض کا لفظ بھی مروی ہے، جسے امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے ”لیس بشيء“ کہا ہے۔ اس موضوع کی بعض دیگر تفصیلات ”المنهاج

① فتح الباری (۱/ ۴۸) معالم السنن للخطابی (۱/ ۱۶۶ دار المعرفة)

② ویکھیں: صحیح مسلم مع شرح النووی (۴/ ۸ / ۱۳۸ - ۱۳۹)

③ صحیح مسلم مع شرح النووی (۲/ ۴ / ۱۱) الفتح الربانی (۳/ ۱۳۵) مختصر سنن أبي داود للمنذري (۱/

۱۶۶) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۹۲) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۲۳۵) سنن ابن ماجہ،

رقم الحدیث (۶۰۳)

شرح صحیح مسلم بن الحجاج للنووي، (۲/ ۴ / ۱۱ - ۱۲) ”المحلی لابن حزم“
 (۱/ ۲ - ۳۸ - ۳۹) اور ”تہذیب السنن القيم“ (۱/ ۱۶۵ تا ۱۶۸) میں دیکھی جاسکتی ہیں۔
 الغرض غسل جنابت کی صورت میں وگ نہ اتارنے کی تو گنجائش ہے، بشرطیکہ پانی اصل بالوں
 کی جڑوں تک پہنچ سکتا ہو اور سر خشک رہ جانے کا خدشہ نہ ہو۔ ویسے ایسی اشیا کو اتارا ہی جاتا ہے کہ
 خراب نہ ہو جائیں، مگر مسئلہ اپنی جگہ موجود ہے۔

غسل حیض و جنابت میں فرق کی توجیہ:

غسل حیض و جنابت میں جو یہ فرق کیا گیا ہے، اہل علم نے اس کی یہ توجیہ کی ہے کہ حالت جنابت
 تو چونکہ بکثرت ہوتی ہے، لہذا اس کے لیے ہر مرتبہ سر کو کھولنا باعث مشقت ہے، جب کہ حیض تو ایک
 ماہ میں ایک ہی بار اور نفاس سالوں میں کبھی کبھار ہوتا ہے، لہذا ان میں چوٹی اور مینڈھیاں کھولنا تو
 کوئی باعث مشقت نہیں رہتا۔^①

موزوں پر مسح:

موسم سرما میں سردی سے بچنے کے لیے یا کسی بھی دوسری غرض سے، جس شخص نے چڑے
 کے موزے پہن رکھے ہوں اور پہنے بھی وضو و طہارت کی حالت میں ہوں، تو اسے اجازت ہے کہ
 انھیں اتار کر پاؤں دھونے کے بجائے ان موزوں کے اوپر ہی گیلا ہاتھ پھیر کر مسح کر لے، کیوں کہ یہ
 مسح نبی اکرم ﷺ سے صحیح احادیث میں ثابت ہے، چنانچہ صحیح بخاری و مسلم، سنن اربعہ اور مسند احمد میں
 ایک واقعہ مذکور ہے کہ حضرت جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے وضو کیا اور پاؤں کے موزوں پر مسح کیا۔ اُن
 سے پوچھا گیا کہ آپ ایسا کرتے ہیں؟ تو انھوں نے فرمایا:

«نَعَمْ، رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ بَالَ، ثُمَّ تَوَضَّأَ، وَمَسَحَ عَلَيَّ خُفِّيَّ»^②

”ہاں میں نے نبی اکرم ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ نے پیشاب کرنے کے بعد وضو فرمایا
 اور اپنے موزوں پر مسح کیا۔“

① المغنی لابن قدامة (۱/ ۲۲۶) بتحقیق محمد خلیل ہراس (إرواء الغلیل (۱/ ۱۶۷)

② الفتح الربانی (۴/ ۵۷) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (۱۴۰) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث

(۸۱، ۸۲) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۱۱۴) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۵۴۳)

اس حدیث کے راوی حضرت جریر رضی اللہ عنہ چونکہ سورۃ المائدہ کی آیت وضو نازل ہونے کے بعد اسلام لائے تھے، اس لیے لوگ ان کی اس روایت کو بہت معتبر مانتے تھے، کیوں کہ اس آیت کے ذریعے سے جن صحابہ رضی اللہ عنہم کو مسح کے منسوخ ہو جانے کا گمان تھا، وہ ان کی روایت سے دور ہو گیا، کیوں کہ وہ تو مشرف بہ اسلام ہی آیت وضو کے نزول کے بعد ہوئے تھے، جب کہ آیت وضو ۵ھ یا ۶ھ میں غزوہ بنی مصطلق کے موقع پر نازل ہوئی تھی اور حضرت جریر رضی اللہ عنہ کا قبول اسلام ماہ رمضان ۶ھ میں واقع ہوا تھا۔^(۱)

ایسے ہی صحیح بخاری، موطا امام مالک اور مسند احمد میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بیان فرماتے ہیں:

«إِنَّهُ مَسَحَ عَلَيَّ الْخُفَيْنِ»^(۲) ”آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے موزوں پر مسح کیا۔“

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنے عظیم المرتبت والد امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے اس سلسلے میں پوچھا تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

”نَعَمْ، إِذَا حَدَّثَكَ شَيْئًا سَعِدٌ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَا تَسْأَلْ عَنْهُ غَيْرَهُ“^(۳)

”ہاں! جب تمہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی چیز سعد بیان کریں تو پھر اس کے بارے میں کسی دوسرے سے مت پوچھو۔“

صحیح بخاری میں حضرت عمرو بن أمیہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَمْسَحُ عَلَيَّ عَمَامَتِهِ وَخُفَيْهِ»^(۴)

”میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دستار مبارک اور موزوں پر مسح کرتے دیکھا ہے۔“
فتح الباری میں لکھا ہے:

”حَقَاطُ حَدِيثِ كِي اِيك جَمَاعَتِ نِي اِس بَاتِ كِي صِرَاحَتِ كِي هِي كِه موزوں پر مسح

(۱) الفتح الرباني و شرحه بلوغ الأمانی (۲/ ۵۷- ۵۸) نیز فتح الباری جلد سات میں بھی سیدنا جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام کا واقعہ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) صحیح البخاری مع الفتح، رقم الحدیث (۲۰۲) الموطأ مع شرحه المسوی، رقم الحدیث (۵۸)

(۳) صحیح البخاری مع الفتح (۱/ ۳۰۵) و الفتح الرباني (۲/ ۵۹)

(۴) صحیح البخاری مع الفتح (۱/ ۳۰۸)

کرنا تو اتر سے ثابت ہے۔ ان میں سے بعض محدثین کرام نے موزوں پر مسح کرنے کی مشروعیت بیان کرنے والے صحابہ رضی اللہ عنہم کو شمار کیا تو ان کی تعداد اسی (۸۰) سے بھی تجاوز کر گئی، جن میں اس دنیا میں ہوتے ہوئے ہی جنت کی خوش خبری پانے والے دس صحابہ بھی شامل ہیں۔“

مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:
 ”حَدَّثَنِي سَبْعُونَ مِنَ الصَّحَابَةِ بِالمَسْحِ عَلَى الخُفَّيْنِ“^①
 ”مجھے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ستر (۷۰) حضرات نے موزوں پر مسح کرنے والی حدیث سنائی ہے۔“

جراہوں پر مسح اور احادیث رسول ﷺ:

چمڑے کے موزوں کی طرح ہی اون، نوم، کاٹن یا نائیون کی جراہوں پر مسح کرنا بھی جائز ہے، جس کا ثبوت سنن ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ، مسند احمد، سنن بیہقی اور صحیح ابن حبان میں صحیح سند سے مروی حدیث میں موجود ہے۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ تَوَضَّأَ وَمَسَحَ عَلَى الجَوْرَيْنِ وَالنَّعْلَيْنِ»^②

”نبی اکرم ﷺ نے وضو کیا اور اپنی جراہوں اور جوتوں پر مسح کیا۔“

محدثین کرام کے معیارِ صحت پر پوری اترنے والی اس حدیث کے علاوہ بھی متعدد احادیث میں جراہوں پر مسح کی مشروعیت کا ذکر آیا ہے، اگرچہ ان میں سے بعض کی اسانید اور راویوں پر کچھ کلام بھی کیا گیا ہے، مگر ان میں سے بھی متکلم فیہ احادیث اکثر محدثین کرام کے نزدیک صحیح ہیں، ان روایات کی نصوص اور محدثین کے ان پر تبصرے ”نصب الراية تخريج أحاديث الهداية للإمام الزيلعي“ (۱/ ۱۸۴ تا ۱۸۶) ”عون المعبود شرح أبي داود للعلامة شمس الحق

① فتح الباري (۱/ ۳۰۶) الفتح الرباني (۲/ ۵۸-۵۹)

② سنن أبي داود مع العون (۱/ ۲۶۹) سنن الترمذي مع التحفة (۱/ ۳۲۷) مسند أحمد (۲/ ۷۱) و صححه الألباني في الإرواء (۱/ ۱۳۷-۱۳۸) و تحقيق المشكاة (۱/ ۱۶۲) و تمام المنة (ص: ۱۱۳) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۵۵۹) موارد الظمان، رقم الحديث (۱۷۶) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (۸۶)

العظیم آبادی، (۱/ ۲۶۹- ۲۷۵ طبع مدنی) ”معالم السنن للخطابی (۱/ ۱۲۱) ”تہذیب السنن لابن القيم“ (ص: ۲۲-۱۲۳) ”تحفة الأحوذی شرح سنن الترمذی للمبارکفوری“ (۱/ ۳۳۰- ۳۳۳ طبع مدنی) میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ علامہ ابن قیم کی کتاب ”زاد المعاد“ کے محقق نے لکھا ہے:

”علامہ جمال الدین قاسمی نے جرابوں پر مسح کے موضوع پر ایک رسالہ لکھا، جس میں کئی صحیح و ثابت احادیث جمع کیں اور پھر علامہ احمد شاہ کرنے اس رسالے کی تخریج کی تو کئی دیگر احادیث کا اس میں اضافہ بھی کیا ہے۔“^①

آثار صحابہ رضی اللہ عنہم:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ایک جماعت سے جرابوں پر مسح کرنا ثابت ہے۔ چنانچہ سنن ابی داود میں خود امام صاحب نے ان نو (۹) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تفصیل یوں ذکر کی ہے:

- ① حضرت علی بن ابی طالب۔
- ② عبد اللہ بن مسعود۔
- ③ براء بن عازب۔
- ④ انس بن مالک۔
- ⑤ ابوامامہ۔
- ⑥ سہل بن سعد۔
- ⑦ عمرو بن حریث۔
- ⑧ عمر بن خطاب۔
- ⑨ ابن عباس رضی اللہ عنہم۔^②

”تہذیب السنن“ میں علامہ ابن قیم رضی اللہ عنہ نے ابن المنذر کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ جرابوں پر مسح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نو (۹) صحابہ سے مروی ہے۔

- ① حضرت علی، ② حضرت عمار، ③ حضرت ابو مسعود انصاری، ④ حضرت انس، ⑤ حضرت عبد اللہ بن عمر، ⑥ حضرت براء، ⑦ حضرت بلال، ⑧ عبد اللہ بن ابی اوفی، ⑨ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہم۔^③

① تحقیق زاد المعاد (۱/ ۱۹۴)

② سنن أبی داود مع العون (۱/ ۲۷۴- ۲۷۵)

③ تہذیب السنن لابن القيم علی هامش العون (۱/ ۲۷۲)

ان اٹھارہ صحابہ کرام کے اسمائے گرامی میں سے حضرت علی، انس، براء اور سہل بن سعد رضی اللہ عنہم کے نام مکرر آئے ہیں تو گویا چودہ صحابہ سے جرابوں پر مسح کی روایت ملتی ہے، جب کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ، حضرت ثوبان اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہم سے ”المسح علی الجوربین“ کی مرفوع روایات آئی ہیں، لہذا ان کی تعداد سترہ ہوگئی۔^①

اختصار کے پیش نظر ہم ان آثار کی نصوص اور ان کے ترجمے سے صرف نظر کر رہے ہیں۔ البتہ ان کا خلاصہ یہی ہے کہ ان سب نے مختلف مواقع پر اپنی جرابوں پر مسح کیا، جو جرابوں پر مسح کی مشروعیت کی دلیل ہے۔

آثار تابعین اور اقوال ائمہ رضی اللہ عنہم:

جس طرح قدسی نفوس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت جرابوں پر مسح کرنے کے جواز کی قائل ہے، اُسی طرح ہی تابعین کرام رضی اللہ عنہم کی بھی ایک جماعت اس کی قائل و فاعل ہے۔^② چنانچہ مصنف ابن ابی شیبہ (۱/۱۸۹) اور علامہ ابن قیم کی ”أعلام الموقعین“ (۱/۷۵) پر جن تیرہ تابعین کے اسمائے گرامی مذکور ہیں۔ ان میں:

- | | | |
|---|-----------------|----------------|
| ① حسن بصری۔ | ② سعید بن مسیب۔ | ③ ابن جریج۔ |
| ④ عطاء۔ | ⑤ ابراہیم نخعی۔ | ⑥ فضل بن وکیع۔ |
| ⑦ اعمش۔ | ⑧ قتادہ۔ | ⑨ خلاص۔ |
| ⑩ سعید بن جبیر۔ | ⑪ نافع۔ | ⑫ سفیان ثوری۔ |
| ⑬ ابو ثور رضی اللہ عنہم جیسے اساطین علم شامل ہیں۔ | | |

ان حضرات کے اقوال و فتاویٰ بھی مذکورہ کتب میں منقول ہیں۔ جن کی نصوص و ترجمہ سے اختصار کے پیش نظر ہم صرف نظر کرتے ہیں، جب کہ جامع ترمذی میں امام صاحب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

① عون المعبود (۱/۲۷۴-۲۷۵) تحفة الأحوذی (۱/۳۲۸-۳۲۹) المحلی لابن حزم (۱/۸۱-۸۲-۱۰۳) مصنف ابن ابی شیبہ (۱/۱۸۸-۱۸۹) مصنف عبد الرزاق (۱/۱۹۰، ۷۴۵، ۷۷۳، ۷۸۱، ۷۸۲) اور ”نصب الراية للزيلعي“ میں ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے آثار بھی منقول ہیں۔

② بحوالہ ہفت روزہ ”اہل حدیث“ (جلد ۲۰ شماره ۵۲ بابت ۲۹ جمادی الاول ۱۴۱۰ھ بمطابق ۲۹ دسمبر ۱۹۸۹ء)

”جراہوں پر مسح کے جواز کا قول کئی اہل علم کا ہے اور حضرت سفیان ثوری، ابن المبارک، شافعی، احمد اور اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ کا بھی یہی مسلک ہے۔^(۱)

علامہ ابن قیم رحمہم اللہ ”تہذیب السنن“ میں فرماتے ہیں:

”جراہوں پر مسح کے جواز کا قول اکثر اہل علم کا ہے اور جن صحابہ کے نام ذکر کیے گئے ہیں، ان کے علاوہ امام احمد، اسحاق بن راہویہ، عبداللہ بن مبارک، سفیان ثوری، عطاء بن ابی رباح، حسن بصری، سعید بن مسیب اور ابو یوسف قاضی رحمہم اللہ بھی جواز کے قائل تھے اور جن صحابہ رضی اللہ عنہم کے نام ہم ذکر کر آئے ہیں، ان کا مخالف بھی دوسرا کوئی صحابی ہم نہیں جانتے۔“^(۲)

احناف کا مسلک:

معالم السنن میں امام ابوحنیفہ رحمہم اللہ کے دونوں شاگردان گرامی امام قاضی ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ

کا مسلک یوں منقول ہے:

”يُمَسَّحُ عَلَيْهِمَا إِذَا كَانَا تَخِينَيْنِ لَا يَشْفَانِ“

”جراہوں پر مسح کیا جائے گا، جب کہ وہ موٹی ہوں۔“

خاص فقہ حنفی کی کتاب قدوری میں ہے کہ امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ کہتے ہیں:

”يَجُوزُ الْمَسْحُ عَلَى الْجَوْرَيْنِ إِذَا كَانَا تَخِينَيْنِ لَا يَشْفَانِ الْمَاءُ“^(۳)

”جراہوں پر مسح جائز ہے جب کہ وہ موٹی ہوں اور پانی کو (مسح کے وقت) چوس کر پاؤں

تک نہ پہنچاتی ہوں۔“

خود امام ابوحنیفہ رحمہم اللہ شروع میں جراہوں پر مسح کے قائل نہ تھے، مگر بعد میں انہوں نے اپنے

اس قول سے رجوع کر لیا اور صاحبین والا قول ہی اختیار فرما لیا تھا۔ چنانچہ قدوری کی شرح اللباب

میں شیخ عبدالغنی غنیمی دمشقی میدانی رحمہم اللہ لکھتے ہیں۔ ہدایہ کے حوالے سے تصحیح میں ہے:

(۱) سنن الترمذی مع تحفة الأوحدي (۱/ ۳۲۹)

(۲) تہذیب السنن لابن قیم علی ہامش عون المعبود (۱/ ۲۷۳-۲۷۴)

(۳) قدوری مع شرحہ اللباب (۱/ ۴۰ دار الكتاب)

”أَنَّهُ رَجَعَ إِلَى قَوْلِهِمَا وَعَلَيْهِ الْفُتْوَى“

”امام صاحب نے بھی صاحبین کے قول کی طرف رجوع کر لیا تھا اور اسی پر فتویٰ ہے۔“
حاصل کلام کے طور پر شرح الجامع المعروف قاضی خاں سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:
”اگر جرابیں موٹی ہوں، مگر جوتے میں نہ ہوں تو امام صاحب کے نزدیک ان پر مسح جائز نہیں۔ صاحبین کے نزدیک جائز ہے اور آگے ساتھ ہی یہ وضاحت بھی کر دی گئی ہے کہ بیان کیا جاتا ہے:

”إِنَّ الْإِمَامَ رَجَعَ إِلَى قَوْلِهِمَا فِي الْمَرَضِ الَّذِي مَاتَ فِيهِ“^①

”امام صاحب نے اپنے اس مرض کے دوران میں جس سے پھر آپ جانبر نہ ہو سکے تھے، صاحبین کے قول کی طرف رجوع کر لیا تھا۔“

نیز ہدایہ میں لکھا ہے:

”وَقَالَا: يَجُوزُ الْمَسْحُ عَلَى الْجُورَبَيْنِ إِذَا كَانَا ثَخِينَيْنِ لَا يَشْفَانِ، لِمَا رُوِيَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ مَسَحَ عَلَى جُورَبَيْهِ، وَعَلَيْهِ الْفُتْوَى“^②

”صاحبین کا کہنا ہے کہ جرابیں اگر موٹی ہوں تو ان پر مسح کرنا جائز ہے، کیونکہ روایت بیان کی گئی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی دونوں جرابوں پر مسح کیا تھا اور اسی بات پر (علمائے احناف کا) فتویٰ ہے۔“

ان الفاظ سے پہلے صاحب ہدایہ نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کے نزدیک جرابوں پر مسح جائز نہیں اور پھر تین سطروں کے بعد ہی ذکر کر دیا ہے کہ امام صاحب نے اپنے اس قول سے رجوع کر لیا تھا۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا رجوع:

یہ جو ذکر ہو رہا ہے کہ صاحبین یعنی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے شاگردان رشید امام قاضی ابو یوسف و امام محمد رحمہم اللہ تو شروع ہی سے جرابوں پر مسح کے جواز کے قائل تھے اور دلیل کے طور پر وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

① اللباب (۱/۸/۴۰)

② الهدایة (۱/۴۴) طبع مجتہبائی.

کے عمل مبارک کا حوالہ دیا کرتے تھے اور بالآخر خود امام صاحب جو پہلے جواز کے قائل نہیں تھے، وہ بھی صاحبین کے قول کی طرف رجوع کر کے جواز کے قائل ہو گئے، ان کے اس رجوع کی تفصیل ہدایہ کے حاشیہ پر مولانا عبدالرحمن حنفی لکھنوی نے ذکر کی ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:

”امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی آخری بیماری میں اپنے شاگردوں کے سامنے وضو فرمایا، جب کہ آپ نے جرابیں پہنی ہوئی تھیں۔ اس وقت آپ نے وضو کر کے جرابوں پر مسح کیا اور اپنے شاگردوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ میں نے یہ عمل اس لیے کیا ہے کہ میں جرابوں پر مسح سے روکا کرتا تھا، مگر اب میری تحقیق یہ ہے کہ جرابوں پر مسح نہ صرف جائز ہے، بلکہ یہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ اس لیے میں نے یہ عمل کر کے تمہیں بتایا ہے، تاکہ تم عوام الناس اور علما کو بتاؤ کہ ابوحنیفہ نے اپنے مسلک سے رجوع کر لیا ہے۔“

صرف جرابوں پر مسح کے مسئلے پر رجوع ہی نہیں، بلکہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کثیر مسائل میں تحقیق کے بعد ان سے رجوع کیا تھا اور یہی محققین کی شان ہے اور یہی ہونا بھی چاہیے کہ جب صحیح مسئلہ سامنے آجائے تو اپنے پرانے عمل کو فوراً ترک کر دیا جائے جو بلا دلیل ہو اور از روے دلیل صحیح کو اختیار کر لیا جائے۔ ”طبقات الحنفیة“ (ص: ۹۲ تا ۱۰۰) میں شیخ عبدالقادر نے ذکر کیا ہے:

”امام صاحب نے قاضی ابو یوسف کو ایسے چوبیس (۲۴) مسئلے تحریر کرائے، جن میں انہوں نے اپنے سابقہ مسلک سے رجوع کیا تھا اور قاضی ابو یوسف کو یہ تاکید فرمائی کہ یہ مسائل اور ان میں رجوع علما کو بھی بتا دینا اور عوام تک بھی پہنچا دینا، تاکہ کہیں میری وجہ سے لوگ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ترک نہ کرتے رہیں، اس لیے کہ نعمان غلطی کر سکتا ہے، مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غلطی نہیں کر سکتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پیغمبر اور معصوم ہیں اور نعمان بن ثابت پیغمبر ہے نہ معصوم۔ یاد رکھنا کہ جب میرا کوئی قول حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف پاؤ تو میرے قول کو دیوار پر مار دو اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو سینے سے لگا لو۔“

اس طرح امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے آپ کو بری الذمہ کر لیا۔ جو ان کی تواضع کے ساتھ ساتھ رفعت اور بلند مقامی کا ثبوت ہے۔ رحمۃ اللہ رحمة واسعة^①۔

① ہفت روزہ ”اہل حدیث“ (جلد ۲۰ شماره ۵۲ بابت ماہ ۲۹ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۰ھ بہ مطابق ۲۹ دسمبر ۱۹۸۹ء)

”معالم السنن للخطابی“ (۱۲۱/۱) ”عمدة الرعاية حاشية شرح الوقاية“ (بحواله تحفة الأحوذی: ۱/ ۳۳۵) اور ”رد المحتار حاشية در مختار“ (۱/ ۲۷۸) میں بھی فقہائے احناف کا فتویٰ یہی مذکور ہے کہ جرابوں پر مسح کرنا جائز ہے۔

لفظ جراب کی لغوی تحقیق:

جراب ایک معروف چیز ہے، لیکن بعض لوگ بلاوجہ اسے ایسے معنوں میں لینے لگتے ہیں کہ جسے تشدد اور غلو کہا جاسکتا ہے، جیسے کوئی کہہ دیتا ہے کہ جراب سے چڑے کی جرابیں مراد ہیں، حالانکہ ان کے لیے تو حدیث شریف حتیٰ کہ بخاری و مسلم میں ”خُفَّيْنِ“ کا لفظ موجود ہے، لہذا جراب سے چڑے کی جرابیں مراد لینا لغت سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے، لہذا آئیے اس لفظ کی تھوڑی سی لغوی تحقیق کریں، تاکہ اصل حقیقت تک پہنچا جاسکے۔ چنانچہ عربی کی درمیانی مگر معروف و متداول ڈکشنری ”المنجد“ (ص: ۸۴) اور ”قاموس المحيط فیروز آبادی“ (۱/ ۴۷) میں لکھا ہے:

”الْجَوْرَبُ: لِفَافَةُ الرَّجُلِ“

”جراب پاؤں کا لفافہ یعنی پاؤں کو لپیٹنے کے لیے ہوتی ہے۔“

ماہر لغت علامہ احمد رضا دمشقی ”معجم متن اللغة“ نامی پانچ ضخیم جلدوں پر مشتمل ڈکشنری

(۱/ ۴۹۹، ۵۰۰) میں لکھتے ہیں:

”جو رب پاؤں پر لپیٹے جانے والے لفافے کو کہتے ہیں۔ دراصل یہ ایک فارسی لفظ

”گورپا“ سے معرب ہے، جس کا معنی ”پاؤں کی قبر“ ہے۔“

پندرہ جلدوں پر مشتمل ”لسان العرب لابن منظور“ (۱/ ۲۶۳) میں لکھا ہے:

”الْجَرَابُ وَ عَاءٌ مَعْرُوفٌ“ ”جراب ایک معروف ظرف ہے۔“

صاحب ”عون المعبود“ اور ”تحفة الأحوذی“ نے امام سیوطی رحمہ اللہ اور امام ابو بکر

ابن العربی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے:

”الْجَوْرَبُ غَشَاءٌ لِلْقَدَمِ مِنْ صُوفٍ يَتَّخَذُ لِلدَّفءِ وَهُوَ الشَّخِينُ“^①

”جراب پاؤں پر چڑھانے کا ایک پردہ ہوتا ہے، جو پاؤں کو گرم رکھنے کے لیے اُون کا

① عون المعبود (۱/ ۲۶۹) تحفة الأحوذی (۱/ ۳۳۴)

بنایا جاتا ہے اور موٹا ہوتا ہے۔“

علامہ عیسیٰ حنفی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

”جرب ملکِ شام کے سردترین علاقوں میں پاؤں میں ٹخنوں سے اُوپر تک پہنی جاتی ہے اور وہ دھاگے یا اون سے تیار شدہ ہوتی ہے۔“^①

کبار علمائے احناف میں سے علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے ”جورب“ کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے: ”جورب شامی ممالک میں سخت سردی کے وقت پہنی جاتی ہے، جو اون کی بنی ہوتی ہے اور پاؤں سمیت ٹخنوں کے اُوپر تک ہوتی ہے۔“^②

تاج العروس زبیدی میں بھی ”جورب“ کو پاؤں کا لفافہ اور اصل فارسی ”گورپا“ ہی لکھا ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے فتاویٰ میں ہے کہ ”جوربین“ اور ”نعلین“ میں فرق یہ ہے کہ جوربین اون اور نعلین چڑے سے بنی ہوئی ہوتی ہیں۔ مجدالدین فیروز آبادی کی ”القاموس المحیط“ میں ”جورب“ کی عام تعریف کی گئی ہے، جو چڑے، اون، بال اور دھاگے سے بنی ہر جراب کو شامل ہے۔^③ اس ساری لغوی تحقیق و تشریح سے معلوم ہوا کہ جورب میں ہر طرح کی جرابیں آجاتی ہیں، وہ چڑے کی ہوں، ریشم کی، اون کی، دھاگے کی، بالوں کی، یا نائیلون کی اور ہر اس جراب پر مسح جائز ہے، جو صحیح و سالم اور موٹی ہو، لیکن اگر وہ صحیح سالم تو ہو، مگر اتنی باریک ہو کہ اس سے پاؤں صاف نظر آتا ہو تو وہ مسح کے قابل نہیں ہوتی۔ ہاں اگر جراب میں کہیں معمولی سا سوراخ ہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، جیسا کہ فقہا کی کتب میں مذکور ہے۔

مسح کی شرط:

جبیرہ، پلاسٹر اور پٹی کے ضمن میں یہ تفصیل گزر چکی ہے کہ ان پر مسح اور موزوں یا جرابوں پر مسح میں کن کن پہلوؤں میں فرق ہے، لہذا یہاں اس تفصیل کو دہرانے کی ضرورت نہیں اور وہیں شرائطِ مسح بھی ذکر ہوئی تھیں۔ لیکن یہاں صرف ایک ہی شرط قابل ذکر ہے اور وہ ہے طہارت و وضو کہ موزوں یا

① بحوالہ ہفت روزہ ”اہل حدیث“ (جلد ۲۰ شماره ۵۱ بابت ۲۲ جمادی الاول ۱۴۱۰ھ بہ مطابق ۲۲ دسمبر ۱۹۸۹ء)

② عون المعبود (۱/ ۲۷۰) و تحفة الأحوذی (۱/ ۳۳۴)

③ حوالہ جات سابقہ.

جراہوں پر مسح صرف اسی صورت میں جائز ہے کہ جب انھیں با وضو ہونے کی حالت میں پہنا گیا ہو، کیوں کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک سفر کے دوران میں میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وضو فرمانے لگے تو میں برتن سے پانی ڈال رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب چہرہ اقدس اور بازوؤں کو دھویا اور سر اقدس کا مسح کر لیا تو میں جھکا کہ آپ کے موزے اتاروں، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«دَعَهُمَا فِإِنِّي أَدْخَلْتُهُمَا طَاهِرَتَيْنِ فَمَسَحَ عَلَيْهِمَا»^①

”انھیں رہنے دو، کیوں کہ میں نے یہ طہارت کی حالت میں پہنے تھے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

ان پر مسح کر لیا۔“

مقام مسح:

موزوں یا جراہوں پر مسح بظاہر تو پاؤں کی پٹلی جانب چاہیے، مگر مسنون یہ ہے کہ پاؤں کے تلوؤں کے بجائے ان کے اوپر والے حصے پر مسح کر لیا جائے، کیوں کہ سنن ابی داؤد و دارقطنی، مسند احمد، سنن بیہقی، دارمی اور محلی ابن حزم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا:

«لَوْ كَانَ الدِّينُ بِالرَّأْيِ لَكَانَ أَسْفَلَ الْخُفِّ أَوْلَىٰ بِالْمَسْحِ مِنْ أَعْلَاهُ وَقَدْ رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَمْسَحُ عَلَيَّ ظَاهِرِ خُفِّي»^②

”اگر دین کی بنیاد عقل و قیاس پر ہوتی تو موزوں کے نیچے مسح کرنا ان کے اوپر مسح کرنے سے اولیٰ تھا، لیکن میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم موزوں کے اوپر مسح کرتے تھے۔“

کیفیت مسح:

مسح کرنے کا طریقہ و کیفیت کیا ہے؟ اس سلسلے میں متعدد احادیث مروی ہیں، لیکن وہ سبھی متکلم فیہ ہیں، لیکن ان کا مجموعی مفاد یہ ہے کہ دائیں ہاتھ کی گیلی انگلیاں کھول کر دائیں پاؤں کے

① صحیح البخاری مع الفتح (۱/ ۳۰۹) صحیح مسلم مع شرح النووي (۳/ ۱۷۰) المنتقى (۱/ ۱۸۰)

صحیح سنن ابی داؤد، رقم الحدیث (۱۳۷) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۸۵)

② صحیح الحافظ فی التلخیص (۱/ ۱۶۰) و الألبانی فی الإرواء (۱/ ۱۴۰) و تحقیق المشكاة (۱/ ۶۳)

موزے یا جراب کے اوپر پاؤں کی انگلیوں والی جگہ سے لے کر ان کے پنڈلی پر چڑھنے والے حصے تک اس طرح لے جائیں، گویا خط کھینچا جا رہا ہے یا کوئی لکیریں بنا رہا ہے، اس طرح بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے بائیں پاؤں کی انگلیوں سے لے کر پنڈلیوں کے شروع والی جگہ تک مسح کریں۔^① لیکن چونکہ یہ روایات متکلم فیہ ہیں، لہذا اس کیفیت کا التزام واجب نہیں، بلکہ کسی بھی طرح مسح کر لیں، مسح ہو جائے گا، البتہ مذکورہ طریقہ اختیار کرنا اولیٰ ہے۔

ان ضعیف اور ناقابل استدلال روایات میں سے ایک سنن کبریٰ بیہقی میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ

سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں:

« إِنَّهُ ﷺ مَسَحَ عَلَيَّ خُفِّيهِ، وَوَضَعَ يَدَهُ الْيُمْنَى عَلَيَّ خُفِّيهِ الْاَيْمَنِ، وَيَدَهُ الْيُسْرَى عَلَيَّ خُفِّيهِ الْاَيْسَرِ، ثُمَّ مَسَحَ اَعْلَاهُمَا مَسْحَةً وَّاحِدَةً، كَأَنِّي اَنْظُرُ اَصَابِعَهُ عَلَيَّ الْخُفَّيْنِ »

”آپ ﷺ نے اپنے دائیں موزے پر اپنا دایاں ہاتھ اور بائیں موزے پر اپنا بائیں ہاتھ رکھا، پھر آپ ﷺ نے دونوں موزوں کے اوپر صرف ایک بار مسح کیا، گویا میں موزوں پر آپ کی انگلیاں دیکھ رہا ہوں۔“

لیکن اس روایت کو محدثین میں سے امیر صنعانی رضی اللہ عنہ نے منقطع قرار دیا ہے۔ اس موضوع کی

دوسری روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان فرماتے ہیں:

« إِنَّهُ رَأَى رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَمْسَحُ عَلَيَّ ظَهْرَ الْخُفِّ خُطُوطًا بِالْاَصَابِعِ »

”انہوں نے نبی اکرم ﷺ کو موزے کے اوپر مسح کرتے دیکھا، گویا آپ ﷺ انگلیوں سے لکیریں لگا رہے ہیں۔“

امام نووی رضی اللہ عنہ نے اس حدیث کے بارے میں کہا ہے کہ یہ ضعیف ہے۔ اسی سلسلے کی ایک

تیسری روایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان فرماتے ہیں:

« إِنَّهُ ﷺ اَرَى بَعْضَ مَنْ عَلَّمَهُ الْمَسْحَ اَنْ يَمْسَحَ بِيَدِهِ مِنْ مُقَدِّمِ الْخُفَّيْنِ اِلَى اَصْلِ السَّاقِ مَرَّةً، وَفَرَّجَ بَيْنَ اَصَابِعِهِ »

① سُبُلُ السَّلَامِ (۱/۱) ۵۹

”آپ ﷺ نے کسی شخص کو مسح کا طریقہ سکھاتے ہوئے دکھایا کہ وہ اپنے ہاتھ سے موزے کے اگلے حصے سے لے کر پنڈلی شروع ہونے کی جگہ تک ایک مرتبہ مسح کرے۔ آپ ﷺ نے یہ دکھاتے ہوئے اپنی انگلیوں کو کھول کر ایک دوسرے سے الگ رکھا۔“
لیکن اس روایت کو حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے سخت ضعیف کہا ہے۔^(۱)

یہ تینوں روایات ہم نے محض تنبیہ کے لیے ذکر کر دی ہیں، ورنہ ان میں سے کوئی ایک بھی قابل استدلال ہے نہ کیفیت و کمیت کے بارے میں دوسری کوئی روایت ہے، جس پر اعتماد کیا جاسکے، لہذا امیر یمنی کے بقول اگر کوئی شخص اپنے موزے (یا جراب) پر اس طرح ہاتھ پھیر لے، جسے لغوی اعتبار سے مسح کرنا کہا جاسکتا ہو تو وہ کفایت کر جائے گا، خواہ وہ کسی طرح بھی کر لے۔^(۲)

مسح کی مدت:

اب رہی یہ بات کہ جب وضو کر کے موزے یا جرابیں پہن لی جائیں تو کتنے عرصے کے لیے ان پر مسح کیا جاسکتا ہے؟ اس سلسلے میں دس سے زیادہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے متعدد احادیث وارد ہوئی ہیں، جن سے پتا چلتا ہے کہ مقیم کے لیے ایک دن رات یعنی چوبیس ۲۴ گھنٹے اور مسافر کے لیے تین دن اور تین راتیں یعنی بہتر (۷۲) گھنٹے تک ان موزوں یا جرابوں پر مسح کر لینے کی گنجائش ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم، سنن نسائی، ابن ماجہ، صحیح ابن حبان اور مسند احمد میں شرح بن ہانی بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوا اور موزوں پر مسح کی مدت کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے کہا کہ تم ابن ابی طالب یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس چلے جاؤ اور ان سے جا کر پوچھو، کیوں کہ وہ سفر میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہونے کی وجہ سے اس بات کو مجھ سے زیادہ جاننے والے ہیں۔ میں ان کے پاس گیا اور ان سے مسح کی مدت کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے بتایا:

«جَعَلَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ وَكَيْالِيَهُنَّ لِلْمُسَافِرِ، وَيَوْمًا وَكَيْلَةَ لِلْمَقِيمِ»^(۳)

(۱) سُبُلُ السَّلَامِ (۵۹ / ۱ / ۱) التلخیص الحبیر (۱ / ۱ / ۱۶۱ - ۱۶۰)

(۲) سُبُلُ السَّلَامِ (۱۹ / ۱) طبع مکتبہ عاطف۔ ازہر۔

(۳) صحیح مسلم مع شرح النووی (۲ / ۳ / ۱۷۶) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۱۲۴) سنن ابن

ماجہ، رقم الحدیث (۵۵۲) المشکاة مع المرعاة (۱ / ۵۷۵)

”رسول اللہ ﷺ نے (موزوں یا جرابوں پر) مسح کی مدت مسافر کے لیے تین دن اور تین راتیں اور مقیم کے لیے ایک دن اور ایک رات مقرر کی ہے۔“

اسی طرح سنن ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، صحیح ابن خزیمہ و ابن حبان، سنن دارقطنی، مسند احمد و شافعی اور سنن بیہقی میں ایک حدیث مروی ہے، جسے امام ترمذی، ابن خزیمہ اور خطابی رحمہم نے صحیح قرار دیا ہے اور امام بخاری رحمہم نے اسے اس موضوع کی صحیح ترین حدیث قرار دیا ہے، جس میں حضرت صفوان بن عسال رحمہم بیان فرماتے ہیں:

«كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَأْمُرُنَا إِذَا كُنَّا سَفَرًا أَنْ لَا نَنْزِعَ خِفَافَنَا ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ وَلَيَالِيَهُنَّ إِلَّا مِنْ جَنَابَةٍ، وَلَكِنْ مِنْ غَائِطٍ وَبَوْلٍ وَنَوْمٍ»^(۱)

”نبی اکرم ﷺ ہمیں حکم فرمایا کرتے تھے کہ جب ہم سفر میں ہوں تو بول و براز اور نیند سے وضو ٹوٹنے کی صورت میں تین دن اور تین راتوں تک اپنے موزے نہ اتاریں۔ ہاں جنابت ہو جائے تو اتارنے ضروری ہیں۔“

اس حدیث میں حکم فرمانے کے الفاظ سے محسوس ہوتا ہے کہ مسح واجب ہونا چاہیے، لیکن اجماع نے اس وجوب کو اباحت و ندب میں بدل دیا ہے۔ مسح کے واجب نہیں، بلکہ محض ایک رخصت ہونے کا پتا ایک دوسری حدیث سے بھی چلتا ہے، جو صحیح ابن خزیمہ، سنن دارقطنی، صحیح ابن حبان، مصنف ابن ابی شیبہ، مسند شافعی اور سنن بیہقی میں مروی ہے، جسے لجد ابن تیمیہ اور شوکانی رحمہم کے بقول امام خطابی، شافعی اور ابن خزیمہ رحمہم نے صحیح قرار دیا ہے، اس میں حضرت ابو بکرہ رحمہم نبی اکرم ﷺ سے بیان کرتے ہیں:

«إِنَّهُ رَخَّصَ لِلْمَسَافِرِ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ وَلَيَالِيَهُنَّ، وَلِلْمُقِيمِ يَوْمًا وَلَيْلَةً، إِذَا تَطَهَّرَ فَلَيْسَ خُفْيَهُ أَنْ يَمْسَحَ عَلَيْهِمَا»^(۲)

(۱) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۸۴) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۱۲۲) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۴۷۸) موارد الظمان، رقم الحدیث (۱۷۹) المشكاة مع المرعاة (۱/ ۱۷۹- ۱۸۰) سبل السلام (۱/ ۵۹) و المنتقى مع النيل (۱/ ۱۸۱)

(۲) موارد الظمان (۱۸۴) مشكاة المصابيح (۱/ ۵۷۸، ۵۷۹) بلوغ المرام مع السبل (۱/ ۱۶۱) المنتقى مع النيل (۱/ ۸۲) فتح الباري (۱/ ۳۱۰)

”آپ ﷺ نے مسافر کو تین دن اور تین راتیں اور مقیم کو ایک دن اور ایک رات کے لیے موزوں پر مسح کی رخصت دی، جب کہ اس نے وضو کر کے موزے پہنے ہوں۔“

مسح کی مدت کا آغاز کب ہوتا ہے؟

مسح کے متعلق ایک بات یہ بھی ہے کہ مسح کی مدت جو ایک دن مقیم کے لیے اور تین دن مسافر کے لیے ہے، اس کی ابتدا کب سے شمار کی جائے گی؟ تاکہ چوبیس (۴۲) گھنٹے یا بہتر (۷۲) گھنٹے کا شمار کیا جاسکے۔ علامہ عبید اللہ رحمانی مبارکپوری نے ”المرعاة شرح المشكاة“ میں لکھا ہے:

”کثیر علماء کا قول یہ ہے کہ موزوں پر مسح کی مدت کی ابتدا موزے پہننے کے بعد جب وضو ٹوٹے تو اس وقت سے ہوگی نہ کہ وضو کرنے یا مسح کرنے کے وقت سے اور نہ موزے پہننے کے وقت ہی سے۔ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے:

”موزے پہننے کے وقت سے ابتدا شمار ہوگی۔“^①

”المنہاج شرح صحیح مسلم بن الحجاج“ میں امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

”امام شافعی اور کثیر اہل علم کا مذہب یہ ہے کہ اس مدت کی ابتدا موزے پہننے کے بعد وضو ٹوٹنے کے وقت سے ہے، موزے پہننے سے نہیں اور نہ ان پر مسح کرنے ہی سے۔“^②

صحیح مسلم اور دیگر کتب میں مذکور حدیث علی رضی اللہ عنہ اور اسی مفہوم کی دوسری احادیث کے ظاہری معنی سے شیخ محمد ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ اخذ کیا ہے:

”ابتداء مدت کا اعتبار (پہلی مرتبہ) مسح کرنے سے ہوگا نہ کہ مسح کرنے کے بعد وضو ٹوٹنے کے وقت سے، امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ہی ترجیح دی ہے، اگرچہ ان کے مذہب کے یہ خلاف ہے۔“^③

محققین علماء کی شان ہی یہ رہی ہے کہ جس بات کو قرآن و سنت کی رو سے صحیح تر سمجھیں، وہ اسے قبول کر لیتے ہیں، اگرچہ ان کا فقہی مذہب، حتیٰ کہ امام مذہب اس کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

① المرعاة (۱/ ۵۷۵)

② شرح مسلم للنووي (۲/ ۱۷۶/ ۳)

③ تحقیق المشكاة (۱/ ۱۶۰)

امام نووی کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ چنانچہ اپنی کتاب ”شرح صحیح مسلم“ میں اختصار سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور کثیر علما کے حوالے سے بیان کر دیا کہ وضو کر کے موزے پہن لینے کے بعد جب وضو ٹوٹے تو اس وقت سے مسح کی مدت کا آغاز ہوگا۔ اس وقت سے مقیم ایک دن اور ایک رات اور مسافر تین دن اور تین رات مسح کر سکے گا۔ اسے مثال سے یوں سمجھ لیں کہ ایک نمازی نے ظہر کے وقت وضو کیا اور موزے یا جرابیں پہن لیں۔ عشا تک اس کا وضو بحال رہا اور عشا کے بعد مثلاً نوبے اس کا وضو ٹوٹ گیا۔ اب اسے اجازت ہے کہ اگلی رات کے نوبے تک وہ جتنی مرتبہ اور جس غرض کے لیے وضو کرے، اُسے پاؤں سے موزے اور جرابیں اتارنے کی ضرورت نہیں، بلکہ وہ ان پر مسح کر سکتا ہے، اگر وہ اس سے پہلے جب موزے اتار کر پورا وضو کرنا اور پاؤں دھونا چاہے تو اسے اختیار ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کے بقول یہ امام شافعی، ابوحنیفہ، ان کے اصحاب، سفیان اور جمہور اہل علم رحمۃ اللہ علیہم کا مسلک ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے صحیح تر روایت کے مطابق یہی مروی ہے اور امام داؤد رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی مذہب ہے۔ ان کا استدلال تو حضرت صفوان رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کے اضافی الفاظ «مِنَ الْحَدِيثِ إِلَى الْحَدِيثِ» سے ہے، لیکن یہ اضافہ ثابت نہیں، بلکہ خود امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے ”المجموع شرح المہذب“ میں اسے ”غریب“ قرار دیا ہے یا پھر ان کا استدلال قیاس سے ہے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے کہ مسح کی مدت کا آغاز موزے پہننے ہی سے ہو جائے گا، مثلاً ایک شخص نے دوپہر نماز ظہر کے لیے وضو کر کے موزے پہن لیے۔ موزے پہننے کے ساتھ ہی آغاز مدت شمار کیا جائے گا اور آئندہ ظہر تک مقیم کے لیے اور تیسرے دن کی ظہر تک مسافر کے لیے مسح کی گنجائش ہوگی۔ گویا مقیم روزانہ ظہر کے وقت وضو کر کے موزے پہن لیا کرے اور اگر درمیان میں اتارے نہیں تو چوبیس (۲۴) گھنٹے تک اور مسافر بہتر (۷۲) گھنٹے تک مسح کر سکتا ہے۔ مسح کی مدت کے آغاز کے سلسلے میں ایک تیسرا قول امام اوزاعی اور ابو ثور رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، ایک روایت میں امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور داؤد رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی قول ہے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے بھی یہی منقول ہے کہ مدت مسح کی ابتدا اس مسح سے ہوگی، جو موزے پہننے کے بعد وضو ٹوٹنے پر دوبارہ وضو کرتے وقت کیا جائے گا۔ مثلاً ایک شخص نے ظہر کے وقت وضو کیا اور عشا تک اسی وضو سے نمازیں ادا کرتا رہا، عشا کے بعد اس کا وضو ٹوٹ گیا۔ پھر صبح نماز فجر کے لیے وہ اٹھا اور وضو کیا اور پاؤں پر مسح کیا، اب اس مسح

کے وقت سے لے کر مقیم کے لیے چوبیس (۲۴) گھنٹے اور مسافر لیے بہتر (۷۲) گھنٹے مسح کر لینے کی رخصت ہے۔

ان حضرات کا استدلال صحیح مسلم اور دیگر کتب والی ان صحیح احادیث کے ظاہری مفہوم سے ہے، جن میں مقیم کو ایک دن اور ایک رات اور مسافر کو تین دن اور تین راتیں مسح کرنے کی گنجائش دی گئی ہے۔ اس گنجائش سے تین دن اور تین راتیں یا ایک دن اور ایک رات کا پوری طرح استفادہ صرف اسی صورت میں کیا جاسکتا ہے کہ مدت مسح کا شمار پہلے مسح سے کیا جائے۔ مثلاً ایک آدمی نے نمازِ ظہر کے لیے وضو کیا اور موزے پہن لیے، نمازِ عشا تک اس کا وضو بحال رہا اور پھر وضو ٹوٹ گیا۔ صبح فجر کے لیے اس نے وضو کیا اور مسح کیا۔ اب اگر مسح کی مدت کا آغاز وضو ٹوٹ جانے سے شمار کیا جائے تو اس طرح اُسے صرف دن دن کے وقت یا دن اور نمازِ عشا تک مسح کرنے کا اختیار دیا جاتا ہے۔ عشا کے بعد اور تہجد کے لیے اگر وہ اُٹھے تو اسے مسح کا اختیار نہیں ہوگا، کیوں کہ اس شکل میں عشا کے بعد وضو ٹوٹ جانے سے مسح کا اختیار صرف اسی وقت تک رہ گیا ہے، جب کہ صحیح احادیث اُسے پورا دن اور پوری رات مسح کا اختیار دے رہی ہیں اور یہ صرف اسی شکل میں ممکن ہے، جب مدت مسح کا آغاز پہلے مسح سے شمار کیا جائے نہ کہ موزے پہننے یا وضو ٹوٹنے سے کیا جائے۔ اس مسلک کے بارے میں امام نووی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

”وَهُوَ الْمُخْتَارُ الرَّاجِحُ دَلِيلًا، وَاخْتَارَهُ ابْنُ الْمُنْذِرِ، وَحُكِيَ نَحْوَهُ عَنْ
عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رضی اللہ عنہ“^①

”دلیل کی رو سے یہی مختار اور راجح مسلک ہے اور امام ابن المنذر نے بھی اسے ہی اختیار کیا ہے، اسی طرح حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے بھی یہی منقول ہے۔“

یہ تو ایک علمی بحث اور اس کی تفصیلات تھیں۔ ویسے اگر مطلقاً روزانہ ظہر کے وقت پورا وضو کر لیا جائے تو مقیم کو اس کی گنجائش ہے۔ باقی اوقات میں پاؤں کے موزوں یا جرابوں پر مسح کرتا رہے۔ مسافر تین راتیں اور تین دن کر لے۔ یہ موٹا سا حساب ہے اور جواز کی حدود کے اندر بھی اور اگر باریکیوں کو ہی اختیار کرنا ہو تو وہ بھی ہم نے ذکر کر دی ہیں۔ وَاللَّهُ الْمَوْفِقُ.

① المجموع شرح المہذب (۱/ ۵۲۵) طبع قاہرہ

یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ مسح کی گنجائش حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ موزوں یا جرابوں کو اتارے نہیں، بلکہ مسلسل پہنے رہے۔ یہ نہیں کہ جب چاہے پہن لے اور مسح کر لے، کیوں کہ فتح الباری میں ”فائدہ“ کے تحت حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

”اگر مسح کرنے کے بعد مسح کی مدت ختم ہونے سے پہلے ہی کسی نے اپنے موزے اتار لیے تو امام احمد و اسحاق اور دوسرے توفیق کے قائل ائمہ کے نزدیک اسے دوبارہ وضو کرنا پڑے گا، جب کہ فقہائے کوفہ امام مزنی اور ابو ثور رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک صرف دونوں پاؤں ہی دھولے۔ امام مالک و لیث کا بھی یہی قول ہے، جب کہ حضرت حسن بصری، ابن ابی لیلیٰ اور علما کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ اس کے لیے پاؤں دھونا بھی ضروری نہیں۔“^①

انہوں نے اس شخص پر قیاس کیا ہے، جس نے سر کا مسح کیا، پھر منڈوا ڈالا تو اس کے لیے دوبارہ سر کا مسح کرنا واجب نہیں، لیکن حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس قیاس کو محل نظر قرار دیا ہے۔ شیخ ابن باز کی نگرانی میں فتح الباری کی جو تحقیق و تصحیح ہوئی ہے، اس میں حافظ ابن حجر کے اس تبصرے کی تائید کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ اسے سر کے مسح پر قیاس کرنا، اس لیے محل نظر ہے کہ سر اصل ہے، جس پر مسح کیا جائے گا، بال چاہے ہوں یا نہ ہوں، جب کہ موزوں پر مسح پاؤں کو دھونے کے عوض میں ہے، لہذا یہ دونوں امور الگ الگ ہوئے۔ اسی بنا پر راجح قول یہی ہے کہ اگر کوئی شخص موزے اتار دے تو اس کا وضو باطل ہو گیا اور اب صرف پاؤں کا دھو لینا ہی کافی نہیں۔ کیوں کہ اس طرح موالات یا وہ تسلسل فوت ہو جاتا ہے، جو اعضاے وضو کو دھونے میں ضروری ہے۔^②

نواقض مسح:

یہاں یہ بھی یاد رہے کہ نواقض مسح بھی وہی ہیں، جو نواقض وضو ہیں، یعنی جب وضو ٹوٹا تو ساتھ ہی مسح بھی ٹوٹ گیا۔ جب نیا وضو کریں تو نئے سرے سے مسح بھی کریں۔

① تمام المنة (ص: ۱۱۴-۱۱۵)

② فتح الباری (۱/۳۱۰ حاشیہ)

12- موالات یا تسلسل

اب یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ موالات یا تسلسل کی کچھ وضاحت کر دی جائے۔ یہ بات تو ویسے ہی معروف و مروج ہے کہ جب کوئی مرد یا عورت وضو کرنے لگے تو ہاتھ دھونے سے لے کر پاؤں دھونے تک مسلسل ہی وضو کیا جاتا ہے اور عموماً ایسا نہیں ہوتا کہ ہاتھ منہ دھویا اور پھر کسی کام لگ گئے، پھر آکر بازو دھوئے، سر کا مسح کیا اور قدم دھولے، عموماً ایسا نہیں ہوتا، لیکن اگر کسی وجہ سے ہو ہی جائے، مثلاً ایک آدمی وضو کر رہا تھا اور صرف پاؤں دھونے باقی تھے کہ کسی نے آواز دے کر متوجہ کر لیا اور اس کی باتیں یا گفتگو ایسی تھی کہ اسے وضو کا سلسلہ ترک کر کے ہمہ تن گوش ہو کر اسے سننا پڑا اور جب تک اس کی بات مکمل ہوئی، اس شخص کے وہ اعضاے وضو جو اس نے دھولے تھے، وہ سب خشک ہو چکے تھے۔ اب جب یہ دوبارہ وضو کرنے لگے تو اسے صرف پاؤں دھولینے پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے، بلکہ از سر نو وضو کرنا چاہیے، کیوں کہ اعضا کو دھونے میں جس موالات یا تسلسل کی ضرورت تھی، وہ برابر قائم نہیں رہ سکا۔

ایسے ہی گھر میں ہوتے ہوئے کسی عورت سے یہ واقعہ پیش آسکتا ہے یا اس سے ملتی جلتی کوئی دوسری صورت رونما ہو سکتی ہے۔ مثلاً وہ وضو کر رہی ہو اور صرف پاؤں دھونے باقی ہوں کہ بچے کے رونے اور گر جانے کے خدشے سے وہ فوراً بچے کے پاس آگئی اور اسے بہلانے میں اتنا وقت لگ گیا کہ اعضاے وضو سے وضو کے آثار تک ختم ہو گئے۔ اب جب وہ وضو کرنے لگے تو اسے از سر نو وضو کرنا ہوگا، کیوں کہ اس سے مطلوبہ تسلسل قائم نہیں رہ سکا۔ صحت وضو کے لیے اس موالات یا تسلسل کو شرط قرار دیا گیا ہے اور تسلسل کے شرط ہونے پر ایک حدیث سے استدلال کیا گیا ہے، جو سنن ابی داؤد، مسند احمد اور مستدرک حاکم میں خالد بن معدان سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کا بیان ہے:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ رَأَى رَجُلًا يُصَلِّي وَفِي ظَهْرِ قَدَمِهِ لَمْعَةٌ قَدَرِ الدِّرْهِمِ، لَمْ يُصِبْهَا الْمَاءُ فَأَمَرَهُ أَنْ يُعِيدَ الْوُضُوءَ»

”نبی اکرم ﷺ نے ایک آدمی کو دیکھا جو نماز ادا کر رہا تھا اور اس کے پاؤں پر ایک درہم کے برابر جگہ خشک رہ جانے کی وجہ سے چمک رہی تھی۔ نبی اکرم ﷺ نے اسے حکم فرمایا کہ وہ وضو دوبارہ کرے۔“

سنن ابو داؤد میں تو یہاں تک ہے:

«فَأَمَرَهُ أَنْ يُعِيدَ الْوُضُوءَ وَالصَّلَاةَ»^(۱)

”آپ ﷺ نے تو اسے وضو دہرانے اور نماز دوبارہ پڑھنے کا حکم فرمایا۔“^(۲)

اس حدیث کی شاہد ایک دوسری حدیث بھی ہے، جو سنن ابو داؤد و ابن ماجہ، صحیح ابن خزمیہ،

مسند ابوعوانہ، سنن دارقطنی و بیہقی اور مسند احمد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«إِنَّ رَجُلًا جَاءَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ وَقَدْ تَوَضَّأَ، وَتَرَكَ عَلَى قَدَمِهِ مِثْلَ مَوْضِعِ الظُّفْرِ، فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: إِرْجِعْ أَحْسِنُ وَوُضُوءَكَ»^(۳)

”ایک آدمی نبی اکرم ﷺ کے پاس آیا جو وضو کر چکا تھا، مگر اس کے پاؤں پر ناخن برابر جگہ خشک چھوٹ گئی تھی۔ نبی اکرم ﷺ نے اسے فرمایا: لوٹ جاؤ اور اچھی طرح وضو کر کے آؤ۔“

اس کی شاہد ہی ایک تیسری حدیث بھی ہے، جو صحیح مسلم، مسند ابی عوانہ، سنن ابن ماجہ اور مسند

احمد میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اس کا مفہوم بھی مذکورہ حدیث والا ہی ہے۔^(۴)

ان حدیث کے پیش نظر یہ تو واضح بات ہے کہ اگر اعضائے وضو میں سے کوئی خشک رہ جائے

تو دوبارہ از سر نو وضو کیا جائے اور اگر اس وضو سے نماز شروع کر دی ہو تو معلوم ہوتے ہی نماز توڑ دی

(۱) صحیح سنن أبي داود، رقم الحديث (۱۶۱)

(۲) المنتقى مع النيل (۱/۱/۳۰۵-۳۰۶) إرواء الغلیل (۱/۲۶-۱۲۷) و صححه.

(۳) صحیح سنن أبي داود، رقم الحديث (۵۸) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۶۶۵) الإرواء (۱/۲۷) و صححه، نیل الأوطار (۱/۲۰۶) و المنتقى (۱/۳۰۰)

(۴) الإرواء (۱/۱۲۷) و المنتقى مع النيل (۱/۲۰۶)

جائے اور وہ بھی وضو کر کے دوبارہ ادا کی جائے۔ انہی احادیث کی بنا پر کثیر اہل علم نے اعضاے وضو کو دھونے میں موالات یا تسلسل کو واجب قرار دیا ہے، لیکن بعض محققین اس کے وجوب کے قائل نہیں ہیں۔ وجوب کے قائلین میں سے جمہور اہل علم ہیں، جن میں امام اوزاعی، مالک، احمد بن حنبل اور ایک قول میں امام شافعی رحمہ اللہ بھی شامل ہیں، جب کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور ایک دوسرے قول کے مطابق امام شافعی رحمہ اللہ وجوب تسلسل کے قائل نہیں ہیں۔

قائلین وجوب کا استدلال اس طرح ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ایک آدمی کے پاؤں پر درہم کے برابر جگہ خشک دیکھی تو اسے وضو کرنے کا حکم دیا۔ یہ نہیں فرمایا کہ صرف اتنی جگہ کو جا کر گیلا کر کے آجاؤ۔ اس کے علاوہ بعض اور احادیث بھی ہیں، جن سے وجوب تسلسل پر استدلال کیا جاتا ہے۔ جیسے سنن ابن ماجہ، دارقطنی، بیہقی، مسند ابو یعلیٰ اور مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک حدیث مروی ہے، جس میں مذکور ہے:

«إِنَّهُ ﷺ تَوَضَّأَ عَلَى الْوَلَاءِ، وَقَالَ: هَذَا وَضُوءٌ، لَا يَقْبَلُ اللَّهُ الصَّلَاةَ إِلَّا بِهِ»^①
 ”آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا، جس کے دوران میں تسلسل قائم رکھا اور آخر میں فرمایا کہ وضو یہ ہے۔ ایسے وضو کے سوا اللہ تعالیٰ نماز قبول نہیں کرتا۔“

اگر یہ روایت صحیح ہوتی تو وجوب تسلسل کی بڑی زبردست دلیل تھی، مگر امام ابن ابی حاتم کہتے ہیں کہ میں نے ابو زرہ سے اس روایت کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے اسے بیکار، منکر اور ضعیف کہا ہے اور ایک دفعہ تو اسے بے اصل قرار دیا۔

امام دارقطنی نے اسے غرائب مالک میں بیان کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ وجوب موالات یا تسلسل اگرچہ جمہور اہل علم کا مسلک ہے، لیکن اس کے وجوب پر دلالت کرنے والی واضح اور صریح نص کوئی نہیں۔ امام ابن قدامہ کا رجحان وجوب کی طرف ہی ہے، جب کہ امام شوکانی اور امیر صنعانی رحمہما اللہ کے انداز سے عدم وجوب کا رجحان مترشح ہوتا ہے۔ بعض دیگر محققین کا میلان بھی عدم وجوب کی طرف ہی ہے۔^②

① سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۴۱۹) الإرواء (۱۲۵ / ۱) نیل الأوطار (۲۰۶ / ۱ / ۱)

② اس موضوع کی تفصیل: المغنی (۱ / ۱ / ۱۹، ۹۲) نیل الأوطار (۱ / ۱ / ۲۰۶ مصر) سبل السلام شرح بلوغ المرام (۱ / ۱ / ۵۴ مصر) اور سلسلة الأحادیث الصحیحة (۱ / ۴۶۶) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

13- ترتیب

اعضائے وضو کو دھونے میں موالات و تسلسل کی طرح ہی ترتیبِ اعضا کا مسئلہ بھی ہے۔ اہل علم میں ترتیب کے بارے میں بھی دو مسلک ہیں۔ ایک یہ کہ اعضائے وضو کو دھونے میں ترتیب واجب ہے۔ یہ مسلک امام احمد بن حنبل، امام شافعی، ابو ثور اور ابو عبید اللہؒ کا ہے۔ ان کے نزدیک آیت وضو میں ایک قرینہ موجود ہے، جو ترتیب کے وجوب پر دلالت کرتا ہے۔ ایسے ہی ان کا کہنا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے وضو کا طریقہ جس نے بھی بیان کیا ہے، ترتیب وار ہی بیان کیا ہے۔ سنن ابن ماجہ، دارقطنی، بیہقی، مسند ابویعلیٰ اور مسند احمد والی حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ولاء والی روایت سے بھی استدلال کیا جاتا ہے، مگر جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، وہ حدیث سخت ضعیف ہے۔^①

یہی وجہ ہے کہ ایک روایت میں امام احمد بن حنبل، اسی طرح امام مالک، امام سفیان ثوری اور احنافؒ کا مسلک عدم وجوب کا ہے۔ حضرت سعید بن مسیب، امام عطاء اور حسن بصریؒ بھی عدم وجوب کے قائل ہیں۔ حضرت علیؓ، کحول، زہری، نخعی اور اوزاعیؒ سے مروی ہے کہ اگر کوئی شخص سر کا مسح کرنا بھول جائے اور اس کی ڈاڑھی میں تری باقی ہو تو وہ اس تری سے سر کا مسح کر لے۔^② انھوں نے اسے دوبارہ پاؤں دھونے کا حکم نہیں دیا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ترتیب واجب نہیں۔ امام ابن المیزر کا اختیار بھی یہی ہے، جب کہ معنی ابن قدامہ میں حضرت علیؓ اور ابن مسعودؓ کے آثار نقل کیے گئے ہیں، جو ترتیب کے غیر واجب ہونے کا پتا دیتے ہیں۔^③

امام شوکانیؒ نے بھی سنن دارقطنی، بیہقی، مسند احمد اور مصنف ابن ابی شیبہ سے حضرت علیؓ

① إرواء الغلیل (۱/۱۲۵-۱۲۶) نیل الأوطار (۱/۲۰۶)

② مجمع الزوائد میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مرفوعاً ڈاڑھی کی تری والی بات طبرانی اوسط کے حوالے سے مروی ہے، مگر علامہ پیشیؒ نے لکھا ہے کہ اس کی سند میں ”نہشل بن سعید“ ہے، جو کذاب ہے۔ (مجمع

الزوائد: ۱/۱/۲۴۵ بیروت)

③ المغنی (۱/۱۸۹-۱۹۱) وبہ قال الألبانی فی الإرواء (۱/۱۲۹)

کے آثار نقل کر کے اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی عدم وجوب ہی کا فیصلہ دیا ہے۔^① البتہ امیر صنعانی کا رجحان ”سبل السلام“ (۱/۱/۵۰) میں وجوب کی طرف ہے۔ الغرض اعضاء وضو کو دھوتے وقت ترتیب کا خیال رکھنا چاہیے۔ وجوباً نہیں تو استحباً اور ندباً ہی سہی۔ وضو کی جو مسنون کیفیت بیان کی جا چکی ہے، اس کے مطابق جب پوری طرح وضو سے فارغ ہو جائیں، یعنی پاؤں دھو کر یا ان پر مسح کر کے کھڑے ہوں تو اب یہاں تین کام کرنے ثابت ہیں:

❶ ایک آدھ گھونٹ پانی پینا۔

❷ مردوں کے لیے شرم گاہ پر پانی کا چھینٹا مارنا۔

❸ تکمیل وضو کی دعا کرنا۔

بلکہ ان میں یہاں تین اور مسائل کا اضافہ بھی کر لیں۔ ایک وضو کر کے تالیے وغیرہ سے ہاتھ پونچھنا، دوسرا دو رکعتیں ”تحیۃ الوضوء“ کے طور پر پڑھنا اور تیسرا تیمم کا طریقہ و مشروعیت ہے۔ آئیے یکے بعد دیگرے ان تینوں بلکہ چھ امور کی کچھ تفصیل دیکھیں۔

ایک آدھ گھونٹ پانی پینا:

یہ تو معروف ہے کہ بیٹھ کر ہی کھانا اور پینا چاہیے۔ یہ بات کھانے پینے کے آداب میں سے شمار ہوتی ہے اور اس کی بڑی تاکید بھی آئی ہے۔

❶ مثلاً صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ زَجَرَ عَنِ الشُّرْبِ قَائِمًا»^②

”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر پینے سے ڈانٹا ہے۔“

❷ صحیح مسلم ہی میں حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى عَنِ الشُّرْبِ قَائِمًا»^③

① نیل الأوطار (۱/۱/۲۰۱، ۲۰۲) فتح الباری (۱/۲۷۰)

② صحیح مسلم مترجم اردو (۵/۲۶۲) السلسلة الصحيحة، رقم الحدیث (۱۷۷)

③ صحیح مسلم مترجم اردو (۵/۲۶۲) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۱۵۳۱) صحیح سنن أبی

داود، رقم الحدیث (۳۱۶۱) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۳۴۲۴)

”نبی کریم ﷺ نے کھڑے ہو کر پینے سے منع فرمایا۔“

③ صحیح مسلم ہی میں ایک تیسری حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں ارشادِ نبوی ہے:

«لَا يَشْرَبَنَّ أَحَدٌ مِّنْكُمْ قَائِمًا فَمَنْ نَسِيَ فَلْيَسْتَقِي»^①

”تم میں سے کھڑے ہو کر کوئی ہرگز نہ پیے اور اگر کوئی بھول کر پی بیٹھے تو اسے چاہیے کہ

تے کر دے۔“

معمولی فرق کے ساتھ یہی حدیث مسند احمد اور ابن حبان میں بھی مروی ہے۔

④ صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک اور حدیث میں ہے:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى أَنْ يَشْرَبَ الرَّجُلُ قَائِمًا»^②

”نبی اکرم ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ کوئی شخص کھڑے ہو کر کچھ پیے۔“

اسی حدیث کے آخر میں حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا

کہ کھڑے ہو کر کھانے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا:

”ذَلِكَ أَشْرٌ أَوْ أَحَبُّ“^③ ”یہ تو اور بھی بدتر یا خبیث تر ہے۔“

یہ سب احادیث تو عام آدابِ اکل و شرب کا پتا دے رہی ہیں، جب کہ بعض صورتوں میں

کھڑے ہو کر پینا بھی جائز ہے۔

⑤ مثلاً صحیح مسلم میں، جہاں مذکورہ چاروں احادیث وارد ہوئی ہیں، ان میں سے اگلے ہی باب میں

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں:

«سَقَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ مِنْ زَمْزَمَ فَشَرِبَ وَهُوَ قَائِمٌ»^④

”نبی کریم ﷺ کو میں نے آبِ زمزم پلایا تو آپ ﷺ نے کھڑے کھڑے ہی پی لیا۔“

⑥ جب کہ یہی حدیث ”صحیح البخاری، کتاب الأشرية، باب الشرب قائماً“ میں

① صحیح مسلم مترجم (۵/۲۶۳) السلسلة الصحيحة (۱/۱۲۶/۲) طبع المكتب الاسلامي.

② صحیح مسلم مترجم (۵/۲۶۲) صحیح الجامع، رقم الحدیث (۶۸۲۹)

③ صحیح مسلم تحقیق محمد فؤاد عبد الباقی (۳/۱۶۰، ۱۶۰) فتح الباری (۱۰/۸۲) و الصحیحة (۱/۱۲۸)

④ صحیح مسلم (۳/۱۶۰) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۳۴۲۲)

بھی ہے جہاں الفاظ یوں ہیں:

«شَرِبَ النَّبِيُّ ﷺ قَائِمًا مِنْ زَمَزَمَ»^①

”نبی اکرم ﷺ نے کھڑے کھڑے آبِ زمزم پیا۔“

صحیح بخاری، سنن ترمذی، نسائی، مسند احمد اور مسند ابی داؤد طیالسی میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا واقعہ مذکور ہے کہ انہوں نے ظہر کی نماز ادا کی، پھر لوگوں کی حاجتیں سننے کے لیے کوفے کی ایک کھلی جگہ پر کچھری لگائی، یہاں تک کہ نمازِ عصر کا وقت ہو گیا۔ آپ کو پانی لا کر دیا گیا۔ آپ نے اس میں سے کچھ پیا، پھر چہرہ اور ہاتھ دھوئے۔ سر (کے مسح) اور پاؤں (کے دھونے) کا بھی ذکر ہے۔ آگے راوی حدیث بیان کرتے ہیں:

«ثُمَّ قَامَ فَشَرِبَ فَضَلَّهُ وَهُوَ قَائِمٌ»

”پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہو گئے اور وضو سے بچا ہوا پانی پیا۔“

پھر اس کے بعد فرمایا:

«إِنَّ نَاسًا يَكْرَهُونَ الشُّرْبَ قَائِمًا، وَإِنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَنَعَ مِثْلَ مَا صَنَعْتُ»^②

”بعض لوگ کھڑے ہو کر پینے کو برا سمجھتے ہیں، حالانکہ نبی اکرم ﷺ نے اسی طرح کیا

جس طرح میں نے کیا ہے۔“

دوسری روایت کے الفاظ ہیں:

«وَإِنِّي رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ فَعَلَ كَمَا رَأَيْتُمُونِي فَعَلْتُ»

”میں نے نبی اکرم ﷺ کو ایسے ہی کرتے دیکھا، جس طرح کرتے آپ لوگوں نے

مجھے دیکھا ہے۔“

یہاں آبِ زمزم کے سلسلے میں تو صرف اتنی سی بات پیش نظر رکھیں کہ بعض لوگ اس حدیث کی بنا پر آبِ زمزم کو کھڑے ہو کر پینا اس کے آداب میں سے شمار کرتے ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے،

① صحیح البخاری مع الفتح (۸۱/۱۰)

② صحیح البخاری مع الفتح (۸۱/۱۰) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۴۴، ۴۵) صحیح سنن أبی

داؤد، رقم الحدیث (۳۱۶۲) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۱۲۶، ۱۳۲)

بلکہ یہ زیادہ سے زیادہ محض بیان جواز کے لیے ہے۔^①

وضو کر لینے کے بعد کھڑے ہو کر وضو سے بچے ہوئے پانی سے دو ایک گھونٹ پینا بھی ان احادیث کی رو سے جائز ہے، بلکہ ”تحفة الأحوذی شرح سنن الترمذی“ میں علامہ عبدالرحمن مبارکپوری رحمہ اللہ نے عبد الممالک کے حوالے سے لکھا ہے کہ وضو چونکہ عبادت ہے اور جس پانی سے یہ عبادت بجالاتی گئی ہے، اسی کے بچے ہوئے سے کچھ پی لینا باعث برکت ہے اور اس کا کھڑے ہو کر پینا بہتر ہے، تاکہ امت کو اس بات کی تعلیم دی جائے کہ اس موقع پر کھڑے ہو کر پینا جائز ہے۔^②

کھڑے ہو کر پانی پینے کے جواز اور ممانعت پر دلالت کرنے والی دونوں طرح کی احادیث وارد ہونے کی بنا پر اہل علم نے اس سلسلے میں متعدد آرا ظاہر کی ہیں، جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، البتہ ”فتح الباری“ (۱۰/۸۱ تا ۸۵) اور ”تحفة الأحوذی“ (۱/۱۶۳، ۱۶۵، ۱۶۶-۳) میں اس کی تفصیل دیکھی جاسکتی ہے۔ مختصراً یہ کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے سب سے احسن، سلیم تر اور اعتراض سے بعید تر مسلک امام خطابی اور ابن بطل رحمہ اللہ کی اس رائے کو قرار دیا ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ کھڑے ہو کر پانی پینے کی ممانعت والی احادیث کو نہی تنزیہی پر محمول کیا جائے اور دوسری احادیث کو بیان جواز پر، جب کہ ایک رائے میں کھڑے ہو کر پینے کو طہی طور پر نقصان دہ قرار دیا گیا ہے۔^③

شرم گاہ پر پانی کا چھینٹا مارنا:

وضو کر کے جب کھڑے ہوں تو شرم گاہ پر پانی کا چھینٹا مارنا مشروع اور مفید ہے، اگرچہ اس موضوع کی احادیث میں یہ صراحت تو نہیں کہ یہ عورتوں کے لیے نہیں، بلکہ مردوں کے لیے ہے، لیکن اس چھینٹے کی وجہ اور فائدہ اس بات کا پتا دیتا ہے کہ یہ مردوں کے ساتھ خاص ہے، جیسا کہ تفصیل میں آگے آئے گا۔ اس چھینٹے کی مشروعیت پر دلالت کرنے والی احادیث تو متعدد ہیں، لیکن ان میں سے بعض کی سند ضعیف اور بعض کی حسن اور مجموعی حیثیت سے یہ حدیث صحیح کے درجے کو پہنچ جاتی ہے، چنانچہ ”تحفة الأحوذی“ میں علامہ الرحمن مبارکپوری رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

① دیکھیں: فتح الباری (۳/۴۹۳)

② تحفة الأحوذی (۱/۱۶۴)

③ فتح الباری (۱۰/۸۴)

”وَفِي الْبَابِ أَحَادِيثٌ عَدِيدَةٌ، مَجْمُوعُهَا تَدُلُّ عَلَى أَنَّ لَهُ أَصْلًا“^①

”اس موضوع کی احادیث متعدد ہیں اور ان سب کا مجموعہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس حدیث کی کوئی اصل ضرور ہے۔“

جب کہ دورِ حاضر کے معروف محدث علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے مشکوٰۃ شریف کی تحقیق میں اس حدیث کی سند کو شدید اضطراب کی وجہ سے ضعیف قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

”لَكِنَّ الْحَدِيثَ صَحِيحٌ لَشَوَاهِدِهِ“

”لیکن یہ حدیث اپنے شواہد کی بنا پر صحیح ہے۔“

آگے لکھتے ہیں کہ ان شواہد میں سے میں نے بعض ”سنن أبي داود“ (ص: ۱۵۹) میں ذکر کیے۔ ایک شواہد تو ”مشكاة المصابيح“ ہی میں (حدیث نمبر ۳۶۶) ہے، جس کی سند کو موصوف نے حسن درجے کی قرار دیا ہے۔ اس قبی تفصیل سے معلوم ہوا کہ چھینٹا مارنے کی مشروعیت پر دلالت کرنے والی احادیث مجموعی طور پر صحیح ہیں، اگرچہ انفرادی طور پر ان کی اسانید متکلم فیہ ہیں۔

① ان میں سے پہلی حدیث سنن ابو داود، نسائی اور ابن ماجہ میں مروی ہے، جس میں حکم بن سفیان یا سفیان بن حکم ثقفی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

«كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا بَالَ يَتَوَضَّأُ وَ يَنْتَضِحُ» وَفِي رِوَايَةٍ: «ثُمَّ نَضَحَ فَرُجَهُ»^②

”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پیشاب کرنے کے بعد وضو کرتے، پھر شرم گاہ پر چھینٹا بھی مارتے۔“ ایک روایت میں ہے: ”پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرم گاہ پر چھینٹا مارا۔“

امام ترمذی، منذری اور ابن عبد البر نے کہا ہے کہ اس حدیث کی سند میں اضطراب ہے، لیکن شواہد کی بنا پر شیخ البانی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔^③

② ایک حدیث سنن ترمذی و ابن ماجہ میں مروی ہے، جس میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مرفوعاً بیان

① تحفة الأحمدي (۱/ ۱۶۹)

② صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (۱۵۲) مختصر سنن أبي داود للمنذري مع معالم السنن و التهذيب (۱/ ۱۲۵-۱۲۶) صحيح سنن النسائي (۱۳۰-۱۳۱) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۴۶۱)

③ مختصر السنن أيضاً، تحقيق المشكاة (۱/ ۱۱۶) و سنن الترمذي مع تحفة الأحمدي (۱/ ۱۶۹-۱۷۰)

فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«جَاءَ نَبِيَّ جِبْرِيلُ فَقَالَ: يَا مُحَمَّدُ إِذَا تَوَضَّأْتَ فَانْتَضِحْ»⁽¹⁾

”حضرت جبرائیل علیہ السلام میرے پاس آئے اور کہنے لگے: اے محمد ﷺ! جب آپ ﷺ وضو کریں تو چھینٹا مارا کریں۔“

اس حدیث کی سند کے ایک راوی حسن بن علی ہاشمی ہیں، جن پر امام بخاری، ترمذی، نسائی، احمد، ابوحاتم اور دارقطنی نے کلام کیا ہے۔ اسی حدیث کو ضعیف السند قرار دیتے ہوئے ”تحفة الأحوذی“ کے مولف نے لکھا ہے کہ اس موضوع کی متعدد احادیث ہیں، جن کا مجموعہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان کی کوئی اصل ہے۔⁽²⁾

۳ ایک تیسری حدیث حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے سنن ابن ماجہ، دارقطنی اور مسند احمد میں مروی ہے، جس میں وہ نبی اکرم ﷺ سے بیان کرتے ہیں:

«إِنَّ جِبْرِيلَ أَتَاهُ أَوَّلَ مَا أُوحِيَ إِلَيْهِ فَعَلَّمَهُ الْوُضُوءَ وَالصَّلَاةَ، فَلَمَّا فَرَغَ مِنَ الْوُضُوءِ أَخَذَ عَرْفَةَ مِنْ مَاءٍ فَنَضَحَ بِهَا فَرَجَهُ»⁽³⁾

”حضرت جبرائیل علیہ السلام نزول وحی کے آغاز ہی میں ایک مرتبہ آئے، تو انھوں نے آپ ﷺ کو وضو اور نماز کا طریقہ سکھلایا۔ جب وہ وضو سے فارغ ہوئے تو انھوں نے پانی کا چلولیا اور شرم گاہ پر چھینٹا مارا۔“

سنن ابن ماجہ میں یہ الفاظ ہیں:

«عَلَّمَنِي جِبْرِيلُ الْوُضُوءَ، وَأَمَرَنِي أَنْ أَنْضَحَ تَحْتَ ثَوْبِي لِمَا يَخْرُجُ مِنَ الْبَوْلِ بَعْدَ الْوُضُوءِ»⁽⁴⁾

”جبرائیل علیہ السلام نے مجھے وضو سکھایا تو اس بات کا حکم دیا کہ میں اپنے کپڑے کے نیچے چھینٹا ماروں، جو وضو کے بعد نکلنے والے پیشاب کے قطرے کا علاج ہے۔“

(1) سنن الترمذی، رقم الحدیث (۵۰) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۴۶۴) و مشکاة المصابیح (۱/ ۱۱۸)

(2) سنن الترمذی و التحفة (۱/ ۱۶۹)

(3) سنن الدار قطنی مع التعلیق المغنی (۱/ ۱۱۱) مشکاة المصابیح (۱/ ۱۱۷-۱۱۸)

(4) سنن ابن ماجہ (۱/ ۱۵۷) تحقیق محمد فؤاد.

اس حدیث کی سند میں ابن لہیعہ معروف متکلم فیہ راوی ہے، لیکن شواہد کی بنا پر اس کو حسن درجے کی حدیث قرار دیا گیا ہے۔^(۱)

❏ مسند احمد اور سنن دارقطنی میں حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں چھینٹے کی کیفیت پر مبنی الفاظ یوں ہیں:

«فَرَشَّ بِهَا نَحْوَ الْفَرْجِ»^(۲)

”پھر جب وہ وضو سے فارغ ہوئے تو انھوں نے شرم گاہ کی طرف چھینٹا مارا۔“
اس حدیث کے ایک راوی ”رشدین“ کی بعض ائمہ نے توثیق کی ہے اور بعض نے اسے ضعیف کہا ہے۔^(۳)

❏ چھینٹا مارنے کی کیفیت کے علاوہ مصنف عبدالرزاق میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت مروی ہے، جسے ”تحفة الأحوذی“ میں علامہ مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے کہ کسی شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ شکایت کی:

«إِنِّي أَكُونُ فِي الصَّلَاةِ فَيَتَخَيَّلُ لِي أَنَّ بَدَنِي بِلَلًا، قَالَ: قَاتَلَ اللَّهُ الشَّيْطَانَ! إِنَّهُ يَمَسُّ ذَكَرَ الْإِنْسَانِ لِإِيْبِهِ أَنَّهُ قَدْ أَحْدَثَ، فَإِذَا تَوَضَّأَتْ فَانْضَحْ فَرَجَكَ بِالْمَاءِ، فَإِنْ وَجَدْتِ فَقُلْ هُوَ مِنَ الْمَاءِ فَفَعَلْ ذَلِكَ فَذَهَبَ»^(۴)

”میں نماز میں ہوتا ہوں اور مجھے لگتا ہے کہ جیسے میرے آلہ تناسل پر تری لگی ہے۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ شیطان کو غارت کرے، وہ انسان کے آلہ تناسل کو چھو کر اسے اس احساس میں مبتلا کر دیتا ہے کہ اس کا وضو (قطرہ نکلنے سے) ٹوٹ گیا ہے، جب تم وضو کرو تو شرم گاہ پر چھینٹا مار لو اور پھر اگر (پیشاب کا قطرہ نکلنے کا) احساس ہو تو دل میں کہہ لو کہ تری تو اس چھینٹے کی ہے، جو خود میرا اپنا مارا ہوا ہے۔ اس آدمی نے اس ترکیب پر عمل کیا تو اس کا یہ مرض وسواس ختم ہو گیا۔“

❏ تحقیق المشكاة (۱۱۸ / ۱) و تحقیق سنن ابن ماجہ (۱۵۷ / ۱)

❏ مسند أحمد، و اللفظ له، بحوالہ تحفة الأحوذی و سنن الدارقطني مع التعليق (۱۱۱ / ۱)

❏ مجمع الزوائد (۲۴۷ / ۱ / ۱) التعليق المغني (۱۱۲ / ۱ / ۱) تحفة الأحوذی (۱۷۰ / ۱)

❏ تحفة الأحوذی (۱۶۹ / ۱)

اس موضوع کی اور احادیث بھی ہیں، مگر ہم ان پانچ روایتوں ہی پر اکتفا کرتے ہیں، کیوں کہ انہی میں چھینٹا مارنے کی مشروعیت، اس کی کیفیت، سبب اور فائدہ سبھی امور آگئے ہیں۔ پیشاب کے بعد استنجا اور وضو کر لینے کے بعد پھر پیشاب کی نالی سے قطرہ آنے کا مرض یا وہم صرف مردوں ہی کو ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان احادیث کے مجموعی مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم نے اس چھینٹا مارنے کو مردوں کے ساتھ خاص کہا ہے۔ ویسے اگر محض اس سنت پر عمل پیرا ہونے کے لیے کوئی عورت بھی گیلے ہاتھوں کا چھینٹا کپڑے پر مار لے تو نیت پر ثواب ہوگا۔ چادر کا استعمال کرنے والوں کے لیے کپڑا اٹھا کر چھینٹا مارنا آسان ہے۔ ویسے اوپر سے کپڑے ہی پر چھینٹا مار لیا جائے تو مسند احمد اور سنن دارقطنی والی حدیث اسامہ رضی اللہ عنہ کے الفاظ: «فَرَشَّ بِهَا نَحْوَ الْفَرْجِ» سے اس کیفیت کا بھی پتا چلتا ہے اور دفعِ وسواس کا مقصود بھی اس طرح حاصل ہو سکتا ہے۔

امام ابن العربی نے ”عارضۃ الأحوذی“ میں ”نضح“ کے مختلف معانی بیان کیے ہیں اور اہل علم کے اس سلسلے میں چار اقوال بالتحصیل نقل کیے ہیں۔ اسی طرح ”معالم السنن“ میں امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ”نضح“ کے مختلف معانی لکھے ہیں، جب کہ ”عارضۃ الأحوذی“ اور ”عون المعبود“ میں امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا گیا ہے کہ ان کے نزدیک جمہور اہل علم نے ان احادیث میں ”نضح“ سے مراد چھینٹا مارنا ہی لیا ہے۔

امام ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس چھینٹے کا یہ فائدہ ذکر کیا ہے کہ جس شخص کو وضو کے بعد پیشاب کا قطرہ آنے کی بیماری یا وسواس ہو، وہ اس سے ٹھیک ہو جاتا ہے۔ امام منذری رحمۃ اللہ علیہ کی ”مختصر سنن أبی داود“ کی شرح ”معالم السنن“ میں امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس سے شیطانی وسوسے کے ازالے کا تذکرہ کیا ہے۔ صحیحین، سنن اربعہ، موطا امام مالک اور سنن رزین کو یکجا کر کے امام ابن الاثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کتاب ترتیب دی ہے، جو عہدِ قدیم سے لے کر آج تک ”جامع الأصول“ کے نام سے اہل علم سے خراج تحسین وصول کرتی آرہی ہے۔ انہوں نے اس کتاب میں بعض کلمات کی تشریح بھی کی ہے اور ”نضح“ کے ضمن انہوں نے بھی لکھا کہ بعض دفعہ انسان محسوس کرتا ہے کہ اس کے آلہ تناسل سے پیشاب کا کوئی قطرہ نکلا ہے، ایسا شخص اگر وضو کے بعد پانی کا چھینٹا مار لیتا ہے تو کسی تری وغیرہ کے نکلنے کا وسوسہ ہوتے ہی معاً اس کی دلجمعی اس امر سے ہو جائے

گی کہ یہ جگہ تو میرے چھینٹا مارنے سے گیلی ہوئی ہے۔^①

سُنّت کی سُنّت، علاج کا علاج۔ اسے ہی کہتے ہیں: ”ہم خرما، ہم ثواب“

تکمیل وضو کی دعا:

جب وضو مسنون طریقے کے مطابق مکمل کر لیں تو کلمہ شہادت پڑھیں اور دربار رسالت مآب ﷺ سے جنت کی خوش خبری پائیں، کیوں کہ صحیح مسلم، سنن ابو داود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، مسند احمد اور سنن بیہقی میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

« مَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ يَتَوَضَّأُ فَيُسَبِّغُ الْوُضُوءَ، ثُمَّ يَقُولُ: أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ إِلَّا فُتِحَتْ لَهُ أَبْوَابُ الْجَنَّةِ الثَّمَانِيَةِ يَدْخُلُ مِنْ أَيِّهَا شَاءَ »^②

”تم میں سے جو شخص وضو کرے اور اچھی طرح سے وضو کر لے، پھر یہ کہے: ”میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں، وہ یکتا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔“ اس کے لیے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔ ان میں سے وہ جس سے چاہے داخل ہو جائے۔“

سنن ابی داود، سنن دارمی اور مسند احمد کی ایک روایت میں آسمان کی طرف نظریں اٹھا کر کلمہ شہادت پڑھنے کا بھی ذکر آیا ہے، مگر اس کی سند میں ایک راوی ابن عم عقیل مجہول ہے اور نظریں اٹھانے والا اضافہ منکر ہے۔^③

سنن ترمذی شریف میں اختتام وضو کی دعا میں کلمہ شہادت کے علاوہ یہ الفاظ بھی مروی ہیں:

① تفصیل کے لیے دیکھیں: معالم السنن (۱/ ۱۲۵) عون المعبود (۱/ ۲۸۵-۲۸۷) تحفة الأحوذی (۱/ ۱۶۷، ۱۷۰)

② صحیح مسلم مع شرح النووی (۳/ ۱۱۸، ۱۱۹) صحیح سنن أبی داود، رقم الحدیث (۱۵۵) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۴۸) سنن الترمذی مع التحفة (۱۰۰/ ۱۷۹، ۱۸۲) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۴۴) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۴۷۰) و صحیح الترغیب، رقم الحدیث (۲۱۹) المنتقى مع

النیل (۱/ ۱۷۳، ۱۷۴) إرواء الغلیل (۱/ ۱۳۴)

③ نیل الأوطار (۱/ ۱۷۴) إرواء الغلیل (۱/ ۱۳۵)

«اللَّهُمَّ اجْعَلْنِي مِنَ التَّوَّابِينَ، وَاجْعَلْنِي مِنَ الْمُتَطَهِّرِينَ»^(۱)

اس اضافے کے بغیر تو مذکورہ بالا حدیث صحیح مسلم اور دیگر کتب میں بھی مذکور ہے، جو ہر قسم کے اضطراب سے صحیح و سالم ہے۔ البتہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس اضافے والی روایت کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کی سند میں اضطراب ہے، جب کہ دیگر کبار محدثین نے اس اضطراب کو مرجوح قرار دیا ہے اور اس اضافے کو بزار، طبرانی نے معجم کبیر اور اوسط میں اور ابن اسنی نے ”عمل الیوم و اللیلة“ میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے اور ابن ماجہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی بیان کیا ہے۔ لہذا اس اضافے کو بھی صحیح قرار دیا گیا ہے، جس کی تفصیل ”التلخیص الحبیر“ (۱/۱ / ۱۰۱، ۱۰۲) ”نیل الأوطار“ (۱/۱ / ۱۷۴) ”تحفة الأحوذی“ (۱/۱ - ۱۸۰ - ۱۸۲) ”إرواء الغلیل“ (۱/۱۳۵) اور ”تحقیق المشکاة“ (۱/۹۵) میں دیکھی جاسکتی ہے۔ مختصر یہ کہ کلمہ شہادت کے بعد یہ دعا بھی کہہ لینی چاہیے، کیوں کہ یہ بھی صحیح اور ثابت ہے۔

تولیے وغیرہ کا استعمال:

وضو سے فارغ ہو جانے کے بعد اپنے ہاتھ منہ کو تولیے، رومال یا کسی دوسرے کپڑے سے پونچھا جاسکتا ہے، جس کا پتہ کئی احادیث سے چلتا ہے۔

① مثلاً صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«قَامَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِلَى غُسْلِهِ فَسَتَرَتْ عَلَيْهِ فَاطِمَةٌ، ثُمَّ أَخَذَ ثَوْبَهُ فَالْتَحَفَ بِهِ»^(۲)

”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غسل فرمانے لگے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی لخت جگر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے پردے کا انتظام کیا۔ پھر (غسل سے فارغ ہو کر) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا کپڑا لیا اور اسے اپنے بدن مبارک پر لپیٹا۔“

② ایسے ہی ابن ماجہ اور عمل الیوم واللیلة نسائی میں حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

① صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۴۸) صحیح الترغیب، رقم الحدیث (۲۱۹)

② صحیح البخاری مع عمدة القاری (۲/۳ / ۱۹۵) دار الفکر۔ بیروت) صحیح البخاری مع الفتح، رقم

الحدیث (۳۵۷، ۶۱۵۸) صحیح مسلم مع شرح النووی (۲/۴ / ۲۹) واللفظ له، سنن الترمذی مع تحفة

الأحوذی (۱/۷۷) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۴۶۵)

« أَتَانَا النَّبِيُّ ﷺ فَوَضَعْنَا لَهُ مَاءً فَأَغْتَسَلَ ثُمَّ أَتَيْنَاهُ بِمِلْحَفَةٍ وَرُسِيَّةٍ فَاشْتَمَلَ بِهَا فَكَانَنِي أَنْظُرُ إِلَى أَثَرِ الْوَرْسِ عَلَيْهِ»⁽¹⁾

”نبی اکرم ﷺ ہمارے یہاں تشریف لائے تو ہم نے آپ ﷺ کے لیے پانی رکھا، جس سے آپ ﷺ نے غسل فرمایا، پھر ہم نے آپ ﷺ کو ورس لگا ہوا کپڑا (تولیے) دیا، جسے آپ ﷺ نے اپنے جسم سے لپٹا لیا، میں گویا آپ ﷺ پر ورس کا نشان دیکھ رہا ہوں۔“

وضو کے بعد:

ان دونوں حدیثوں میں نبی اکرم ﷺ کا غسل کے بعد اپنے بدن کو کپڑے سے سکھانے کا ذکر ہے، وضو کے بعد کا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شارح ترمذی علامہ مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ان احادیث سے وضو کے بعد تولیے کے استعمال کے جواز پر استدلال میں انھیں تا مل ہے، جب کہ خاص وضو کے بعد نبی اکرم ﷺ کے تولیے سے اعضاے وضو کو پونچھنے کا ذکر متعدد احادیث میں آیا ہے، جن میں سے سنن ترمذی، ابن ماجہ، دارقطنی اور بیہقی میں کئی صحابہ و صحابیات کی روایات موجود ہیں۔⁽²⁾

لیکن ان احادیث میں سے محدثین کرام کے نزدیک کوئی بھی ضعف سے خالی نہیں۔ حتیٰ کہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اس موضوع کی کوئی بھی صحیح حدیث نبی اکرم ﷺ سے ثابت نہیں ہے۔ البتہ علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے ”عمدة القاری“ میں امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ”الکنی“ کے حوالے سے ایک حدیث نقل کی ہے اور اس کی سند کو بھی صحیح قرار دیا ہے، جس میں ایک صحابی رسول ﷺ کے حوالے سے ابو مریم ایاس بن جعفر بیان کرتے ہیں:

﴿1﴾ « إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ لَهُ مِنْدِيلٌ أَوْ خِرْقَةٌ، يَمْسَحُ بِهَا وَجْهَهُ إِذَا تَوَضَّأَ»⁽³⁾

”نبی اکرم ﷺ کا ایک (رومال) یا کپڑا تھا، جس سے آپ وضو کے بعد چہرہ مبارک پونچھا کرتے تھے۔“

(1) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۴۶۶) و صحیحہ ابن حزم، قاله العيني۔ ويكفي: تلخيص الحبير (۱/ ۹۹)

(2) ويكفي: سنن الترمذی مع التحفة (۱/ ۱۷۴ - ۱۷۹) سنن ابن ماجہ (۱/ ۱۵۸) سنن الدارقطني (۱/ ۱۱۰)

تلخيص الحبير (۱/ ۹۸، ۹۹)

(3) عمدة القاري (۲/ ۳/ ۱۹۵) دار الفكر۔ بيروت.

اس حدیث کو علامہ عینی نے ”عمدة القاري شرح صحيح البخاري“ میں صحیح قرار دیا ہے، جب کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ”التلخیص الحبير“ میں اسے مرسل کہا ہے۔^①

(2) سنن ترمذی و دارقطنی، مستدرک حاکم اور سنن بیہقی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«كَانَتْ لِرَسُولِ اللَّهِ ﷺ خِرْقَةٌ يَنْشِفُ بِهَا بَعْدَ الْوُضُوءِ»^②

”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک کپڑا (تولیا یا رومال) تھا، جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم وضو کے بعد اعضاء وضو کو پونچھا کرتے تھے۔“

اس حدیث کو امام ترمذی نے ”لیس بالقائم“ کہہ کر اور تلخیص میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی ضعیف قرار دیا ہے، لیکن امام حاکم رحمہ اللہ نے مستدرک میں اسے صحیح کہا ہے اور علامہ احمد شاہ رحمہ اللہ نے ترمذی کی جو تحقیق کی ہے، اس میں تفصیل کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔^③

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ وضو اور غسل کے بعد تولیے کا استعمال جائز ہے۔ امام ابن المنذر لکھتے ہیں کہ وضو کے بعد حضرت عثمان، حسن بن علی اور انس رضی اللہ عنہم نے تولیہ استعمال کیا ہے اور تابعین میں سے حضرت حسن بصری، ابن سیرین، علقمہ، اسود، مسروق اور ضحاک رحمہم اللہ نے اس کی رخصت دی ہے، جب کہ امام سفیان ثوری، احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ اور احناف تولیے وغیرہ کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔^④

امام نووی رحمہ اللہ نے وضو اور غسل کے بعد تولیے کے استعمال میں علما کے اختلاف کو پانچ صورتوں میں تقسیم کیا ہے:

- ① پہلی رائے یہ ہے کہ استعمال نہ کیا جائے، مگر اسے مکروہ بھی نہ کہا جائے۔
- ② دوسری رائے یہ ہے کہ اس کا استعمال مکروہ ہے۔
- ③ تیسری رائے یہ ہے کہ یہ مباح ہے، جس کا فعل اور ترک برابر ہے۔

① التلخیص الحبير (۱/ ۹۹)

② سنن الترمذی مع التحفة (۱/ ۱۷۴) سنن الدارقطنی (۱/ ۱۱۰) مستدرک الحاکم (۱/ ۱۵۴) مشکاة

المصایب مع الرعاة (۱/ ۴۸۳-۴۸۴) تلخیص الحبير (۱/ ۹۹)

③ ویکس: مرعاة المفاتیح (۱/ ۴۸۳، ۴۸۴)

④ ویکس: عمدة القاري (۲/ ۱۹۵)

4 چوتھی یہ کہ اس کا استعمال مستحب ہے، کیوں کہ اس میں میل کچیل سے احتراز اور نظافت کا پہلو پایا جاتا ہے۔

5 پانچویں رائے یہ ہے کہ موسم گرما میں تو تولیے کا استعمال مکروہ ہے، مگر سرما میں نہیں۔ سرما میں یہ مباح ہے۔^①

علامہ احمد عبدالرحمن البنا نے ”الفتح الرباني ترتيب و شرح مسند أحمد الشيباني“ (1/ 2 / 137) میں، علامہ عبدالرحمن مبارکپوری رحمہ اللہ نے ”تحفة الأحوذی شرح سنن الترمذی“ (1/ 78) میں اور علامہ عبید اللہ رحمانی نے ”المرعاة شرح المشكاة“ (1/ 483-484) میں تولیے کے استعمال کے جائز ہونے کو راجح قرار دیا ہے۔ علامہ عینی رحمہ اللہ کا رجحان ”عمدة القاری“ (2/ 3 / 194-195) میں اور امام شوکانی رحمہ اللہ کا میلان ”نیل الأوطار“ (1/ 1 / 208-209) میں عدم کراہت کی طرف ہی ہے اور یہی اقرب الی الصواب بات ہے، کیوں کہ کراہت کی کوئی صریح اور صحیح دلیل نہیں ہے، جو ہے وہ یا صریح نہیں یا صحیح نہیں۔

مکروہ کہنے والوں کے دلائل اور ان کا جائزہ:

تولیے کا استعمال مشروع اور جائز ہے، جب کہ بعض کے نزدیک یہ مکروہ ہے۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے دلائل بھی ذکر کیے جائیں اور ان پر اہل علم کا تبصرہ وغیرہ نقل کر کے ان کا جائزہ لیا جائے۔ چنانچہ ان کے دلائل میں سے ایک تو صحیح بخاری اور دیگر کتب حدیث میں مذکور وہ حدیث ہے، جس میں أم المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل جنابت کا واقعہ بیان فرماتی اور آخر میں بتاتی ہیں:

«ثُمَّ أَتَيْتِ بِمَنْدِيلٍ فَلَمْ يَنْفُضْ بِهَا»^②

”پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رومال یا تولیا دیا گیا، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے (اپنے بدن کو) خشک نہیں کیا۔“

صحیح ابن خزیمہ میں مذکور ہے:

① شرح صحیح مسلم للنووي (2/ 3 / 231)

② صحیح البخاری مع عمدة القاری (2/ 3 / 206) و صحیح مسلم مع شرح النووي (2/ 3 / 231)

«فَأْتِيَ بِمَنْدِيلٍ فَأَبَى أَنْ يَقْبَلَهُ»

”آپ ﷺ کو رومال دیا گیا تو آپ ﷺ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔“
سنن دارمی میں ہے:

«فَأَعْطَيْتَهُ مَلْحَفَةً فَأَبَى»^①

”میں نے آپ ﷺ کو تولیہ دیا، مگر آپ ﷺ نے انکار کر دیا۔“
صحیح مسلم اور سنن نسائی کے الفاظ ہیں:

«ثُمَّ أَتَيْتُهُ بِالْمَنْدِيلِ فَارَدَّهُ»^②

”پھر میں نے آپ ﷺ کو تولیہ دیا تو آپ ﷺ نے واپس کر دیا۔“
صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے:

«فَنَاولْتُهُ خِرْقَةً فَقَالَ بِيَدِهِ هَكَذَا وَلَمْ يَرُدَّهَا»^③

”پھر میں نے آپ ﷺ کو کپڑے کا ایک ٹکڑا دیا، مگر آپ ﷺ نے ہاتھ سے اشارہ فرمایا
کہ نہیں چاہیے۔“

صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَتَى بِمَنْدِيلٍ فَلَمْ يَمْسَهُ، وَجَعَلَ يَقُولُ بِالْمَاءِ هَكَذَا، يَعْنِي
رَدَّهُ»^④
بنفرضہ

”آپ ﷺ کو تولیا دیا گیا، مگر آپ ﷺ نے اسے نہیں چھوا اور جسم پر لگے پانی کو اپنے
ہاتھوں سے جھاڑنا شروع کر دیا۔“

حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے مروی اس حدیث کے مختلف کتب میں وارد شدہ مختلف الفاظ سے اخذ کیا

گیا ہے کہ تولیے کا استعمال مکروہ ہے، جب کہ اس سلسلے میں امام نووی رضی اللہ عنہ کے ذکر کردہ پانچ اقوال تو آپ

① دیکھیں: عمدة القاري (۲/۳/۱۹۴)

② صحیح مسلم مع شرح النووي (۲/۳/۲۳۱) صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (۲۴۷)

③ صحیح البخاري مع عمدة القاري (۲/۳/۲۱۲)

④ صحیح مسلم مع شرح النووي (۲/۳/۲۳۲)

سن چکے ہیں۔ اب اس حدیث سے استدلال کے بارے میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”اس حدیث میں بھی کراہت کی دلیل نہیں ہے، کیوں کہ یہ ایک واقعہ ہے، جس میں تو لیا رومال یا کپڑا نہ لینے کے کئی احتمال ہیں، بلکہ ہو سکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عدم جواز کے بجائے کسی اور وجہ سے وہ کپڑا نہ لیا ہو، جس کا کپڑے کے استعمال کی کراہت سے کوئی تعلق ہی نہ ہو، بلکہ اس کا تعلق اس کپڑے سے ہو یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم جلدی میں ہوں یا کوئی دوسری وجہ ہو۔ مہلب کا کہنا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی کی برکت کو باقی رکھنے کے لیے یا تواضع اور انکساری کے پیش نظر کپڑا نہ لیا ہو یا وہ کپڑا ریشمی ہو یا اس میں کوئی میل کچیل لگی ہو، جب کہ اسی حدیث کی مسند ابو عوانہ والی روایت میں اسماعیلی کے یہاں اعمش کے یہ الفاظ بھی موجود ہیں کہ میں نے یہ بات ابراہیم نخعی سے کہی، تو انھوں نے فرمایا:

”لَا بَأْسَ بِالْمِنْدِيلِ، إِنَّمَا رَدَّهُ مَخَافَةَ أَنْ يَصِيرَ عَادَةً“

”رومال کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کپڑا محض اس خدشے سے واپس کر دیا تھا کہ کہیں یہ عادت اور رواج ہی نہ بن جائے۔“

علامہ تمیمی نے اس حدیث کی شرح میں کہا ہے:

”اس حدیث میں (کراہت کے بجائے) اس بات کی دلیل ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو لیا وغیرہ استعمال فرمایا کرتے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اُم المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا تو لیا یا کپڑا ہرگز نہ لا کر دیتیں۔“

علامہ ابن دقیق العید فرماتے ہیں:

”آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے ہاتھوں سے پانی جھاڑنا، اس بات کی دلیل ہے کہ تولیے وغیرہ کے استعمال میں کوئی کراہت نہیں، کیوں کہ ہاتھوں سے جھاڑنا یا تولیے سے پونچھنا دونوں ہی پانی کے ازالے کے طریقے ہیں۔ یہی بات امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح مسلم میں بھی لکھی ہے۔“^①

① فتح الباری (۱/۳۶۳) عمدة الفاری (۲/۳/۱۹۴) شرح صحیح مسلم للنووی (۲/۳/۲۳۲) تحفة

الأحوذی (۱/۱۷۸) و الفتح الربانی (۱/۱۳۷)

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں سے پانی جھاڑنے کے الفاظ کی شرح کے دوران یہ بھی لکھا ہے کہ یہ الفاظ غسل و وضو کے بعد جسم سے پانی کو جھاڑنے میں کوئی مضائقہ نہ ہونے کی دلیل ہیں اور اس سلسلے میں ہمارے اصحاب کے تین اقوال ہیں:

❶ مستحب یہ ہے کہ اسے ترک ہی کیا جائے، لیکن اسے مکروہ نہ کہا جائے۔

❷ یہ مکروہ ہے۔

❸ یہ مباح ہے، جس کا فعل ترک دونوں یکساں ہیں۔ اس تیسرے قول کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہی ظاہر تر اور مختار قول ہے، کیوں کہ صحیح حدیث میں اس کی اباحت وارد ہوئی ہے اور اس کی ممانعت میں اصلاً کوئی دلیل ثابت نہیں ہے۔^❶

ابن مسیب، مجاہد اور ابو العالیہ نے تولیے کے استعمال کو مکروہ شمار کیا ہے۔^❷ جب کہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سنن میں ابن مسیب اور زہری سے کراہت نقل کی ہے اور مکروہ شمار کرنے والوں کی دلیل یہ ذکر کی ہے:

”إِنَّ الْوَضُوءَ يُؤَزَّنُ“^❸ ”وضو کا پانی تولا جائے گا۔“

مگر یہ بات کئی وجوہات کی بنا پر اس کی دلیل نہیں بن سکتی:

❶ زیادہ سے زیادہ یہ امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کا موقوف قول ہے، حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم یا کوئی اثر صحابی نہیں۔

❷ بظاہر اس سے مراد اس پانی کا تولا جانا ہے، جو وضو کے لیے استعمال ہوا ہو نہ کہ وہ پانی جو اعضاے وضو پر باقی ہے۔

❸ امام ابن دقیق العید اور امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پانی کو جھاڑنے سے تولیے کے استعمال کے جواز کی دلیل لی ہے، کیوں کہ دونوں ہی پانی کے ازالے کا طریقہ ہیں اور جب جھاڑنا ثابت ہے تو پھر وضو کے پانی کا تولا جانا کوئی حیثیت نہیں رکھتا، بلکہ ثابت ہی نہیں ہوتا کہ اعضاے وضو پر رکا ہوا پانی تولا جائے گا۔

❶ شرح صحیح مسلم مع للنووي (۲/۳/۲۳۲)

❷ عمدة القاري (۲/۳/۱۹۵)

❸ سنن الترمذي مع التحفة (۱/۱۷۷)

تولیے کے استعمال کو مکروہ کہنے والوں کی ایک دلیل ”الناسخ والمنسوخ لابن شاہین“ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں:

«إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ لَمْ يَكُنْ يَمْسَحُ وَجْهَهُ بِالْمِنْدِيلِ بَعْدَ الْوُضُوءِ، وَلَا أَبُو بَكْرٍ، وَلَا عُمَرُ، وَلَا ابْنُ مَسْعُودٍ»^①

”نبی اکرم ﷺ، ابوبکر، عمر اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم وضو کے بعد رومال سے چہرہ نہیں پونچھا کرتے تھے۔“

لیکن حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ”التلخیص الحبیر“ میں اس حدیث کو نقل کر کے ضعیف قرار دیا ہے۔ لہذا اس سے استدلال درست نہیں۔^②

ان کے علاوہ تولیے وغیرہ کے استعمال کی کراہت کے بعض دوسرے دلائل بھی ذکر کیے گئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ وضو کا پانی قیامت کے دن نور ہوگا، لہذا اسے پونچھنا نہیں چاہیے، حالانکہ ان کی یہ بات کراہت کی دلیل نہیں بن سکتی، کیوں کہ اول تو اس سے مراد وہ پانی ہے، جو وضو کے لیے استعمال ہوتا ہے نہ کہ صرف وہ پانی جو وضو کے بعد اعضاے وضو پر باقی رہے۔ دوسرے اس پانی کو نبی اکرم ﷺ نے اپنے ہاتھوں سے جھاڑا تھا، جیسا کہ صحیح احادیث سے ثابت ہے تو پھر اس کا کپڑے سے پونچھنا کیسے مکروہ ہو سکتا ہے؟ کیوں کہ جھاڑنا اور پونچھنا ایک ہی تو ہے۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ وضو ایک عبادت ہے اور وضو کے اعضا سے پانی کو پونچھنا آثار عبادت کو زائل کرنا ہے، لہذا مکروہ ہے تو اس سلسلے میں بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ غسل بھی عبادت ہے اور غسل کے بعد جب نبی ﷺ کا ہاتھوں سے پانی جھاڑنا صحیح احادیث سے ثابت ہے تو پونچھنے کو مکروہ کیسے کہا جاسکتا ہے، جب کہ یہ دونوں طریقے ہی آثار عبادت کو زائل کرنے والے ہیں؟

ایسے ہی یہ بھی کہا گیا ہے کہ وضو کا پانی جب تک اعضا کے اوپر رہے، وہ تسبیح بیان کرتا ہے، لہذا اس کا پونچھنا مکروہ ہے۔ اس کے جواب میں حضرت ملا علی قاری نے لکھا ہے کہ یہ بھی کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں کہ جب پانی کو پونچھ دیا جائے تو وہ تسبیح بند کر دیتا ہے۔^③

① التلخیص الحبیر (۹۸ / ۱ / ۱)

② التلخیص الحبیر (۹۸ / ۱ / ۱) تحفة الأحمدي (۱۷۸ / ۱)

③ ویکس: تحفة الأحمدي (۱۷۷ / ۱)

مختصر یہ کہ کبر اور نخوت کی علامت نہ بنایا جائے تو نظافت اور صفائی کی غرض سے تولیے کا استعمال جائز ہے، اسے مکروہ کہنے کی کوئی صحیح دلیل نہیں ہے۔

”تحیة الوضوء“ کی دو رکعتیں:

وضو سے فارغ ہو کر دو رکعت نماز ”تحیة الوضوء“ کے طور پر ادا کرنا بہت ہی کارِ ثواب ہے اور کوئی شخص جب بھی وضو کرے، اس کے لیے یہ دو رکعتیں ادا کرنا مستحب ہے۔ کتب حدیث میں ان دو رکعتوں کی بہت زیادہ فضیلت ذکر ہوئی ہے، جس کا اندازہ صرف اس ایک حدیث ہی سے لگایا جاسکتا ہے، جو صحیح بخاری و مسلم، سنن ترمذی اور مسند احمد میں مروی ہے، جس میں نماز فجر کے وقت نبی اکرم ﷺ حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں:

« حَدَّثَنِي بَارِجِي عَمَلِي عَمَلْتَهُ فِي الْإِسْلَامِ، فَإِنِّي سَمِعْتُ دُفَّ نَعْلِكَ بَيْنَ يَدَيَّ فِي الْجَنَّةِ »

”مجھے اپنا وہ عمل بتاؤ، جس کے سب سے زیادہ اجر و ثواب کی تمہیں امید ہو، کیوں کہ میں نے تمہارے جو تلوں کی چاپ جنت میں اپنے آگے سنی ہے۔“

تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

« مَا عَمَلْتُ عَمَلًا أَرْجِي عِنْدِي مِنْ أَنِّي لَمْ أَتَطَهَّرْ طَهُورًا فِي سَاعَةٍ مِّنْ لَّيْلِ أَوْ نَهَارٍ إِلَّا صَلَّيْتُ بِذَلِكَ الطُّهُورِ مَا كَتَبَ اللَّهُ أَنْ أُصَلِّيَ »^(۱)

”مجھے اپنے اعمال میں سب سے زیادہ اجر و ثواب کی امید اس سے ہے کہ میں نے رات یا دن کے کسی بھی وقت جب بھی وضو کیا ہے، اس وضو سے میں نے ضرور نماز پڑھی ہے، جتنی نماز کی مجھے اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق ملی۔“

سنن ترمذی، مسند احمد اور مستدرک حاکم میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ منقول ہیں:

(۱) صحیح البخاری مع الفتح (۳/۳۴) صحیح مسلم بتحقیق محمد فواد (۲۴۵۸) مختصر صحیح مسلم للآلبانی (ص: ۲۰۶) صحیح سنن الترمذی (۲۹۱۲) شرح السنة للبعوي (۴/۱۴۷) صحیح الترغیب، رقم الحدیث (۲۲۶) إرواء الغلیل (۲/۲۲۱) نیل الأوطار (۲/۳، ۷۰، ۷۱) ریاض الصالحین بمراجعة الأرنؤوط (ص: ۴۵۸)

« مَا أَذْنْتُ إِلَّا صَلَّيْتُ رُكْعَتَيْنِ، وَمَا أَصَابَنِي حَدَثٌ قَطُّ إِلَّا تَوَضَّأْتُ عِنْدَهَا، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: بِهَذَا⁽¹⁾ »

”میں نے جب بھی اذان دی ہے، دو رکعتیں ضرور پڑھی ہیں اور جب بھی بے وضو ہوا ہوں، اسی وقت وضو کر لیا ہے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہی وجہ ہے۔“ یعنی انہی دو رکعتوں کی وجہ سے یہ مقام ملا ہے۔“

مسند احمد کی ایک روایت میں ہے:

« مَا أَحَدْتُ إِلَّا تَوَضَّأْتُ وَصَلَّيْتُ رُكْعَتَيْنِ⁽²⁾ »

”میں جب بھی بے وضو ہوا ہوں، اسی وقت میں نے وضو کیا اور دو رکعتیں پڑھی ہیں۔“

اس حدیث سے وضو کے بعد پڑھی جانے والی دو رکعتوں کی فضیلت واضح ہوگئی۔ یہاں ایک بات اور بھی واضح کر دیں کہ عموماً معروف تو یہ ہے کہ یہ واقعہ جو جنت میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے قدموں کی چاپ نبی اکرم ﷺ نے سنی، یہ معراج کا واقعہ ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، بلکہ حافظ ابن حجر عسقلانی رضی اللہ عنہ ”فتح الباری“ میں لکھتے ہیں:

«عِنْدَ صَلَاةِ الْفَجْرِ» یعنی نماز فجر کے وقت کے الفاظ میں اس بات کی طرف اشارہ موجود

ہے کہ یہ واقعہ معراج کا نہیں، بلکہ خواب کا ہے، ورنہ نماز فجر کے وقت یہ بات پوچھنے کا کیا معنی ہوا؟ آگے لکھتے ہیں کہ صحیح مسلم کی روایت میں: «سَمِعْتُ دُفَّ نَعْلَيْكَ» کے بجائے «سَمِعْتُ اللَّيْلَةَ دُفَّ نَعْلَيْكَ» آیا ہے کہ ”آج رات میں نے تمہارے جوتوں کی چاپ سنی ہے۔“

یہاں ”آج رات“ کے الفاظ بھی اس بات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ یہ واقعہ معراج کا نہیں، بلکہ خواب کا ہے۔⁽³⁾ پھر خواب میں بھی یہ واقعہ کوئی ایک بار ہی پیش نہیں آیا، بلکہ کئی بار یہ واقعہ نبی مکرم ﷺ کو پیش آیا تھا، چنانچہ سنن ترمذی اور مسند احمد میں حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

(1) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۲۹۱۲) صحیح الترغیب، رقم الحدیث (۱۹۶) إرواء الغلیل أيضاً.

(2) إرواء الغلیل أيضاً.

(3) فتح الباری (۳/۳۴)

«أَصْبَحَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَدَعَا بِلَالًا، فَقَالَ: يَا بِلَالُ! بِمَ سَبَقْتَنِي إِلَى الْجَنَّةِ؟ مَا دَخَلْتُ الْجَنَّةَ قَطُّ إِلَّا سَمِعْتُ خَشْخَشَتَكَ أَمَامِي، إِنِّي دَخَلْتُ الْجَنَّةَ الْبَارِحَةَ فَسَمِعْتُ خَشْخَشَتَكَ أَمَامِي»

”ایک صبح نبی اکرم ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہما کو بلایا تو آپ ﷺ نے پوچھا: اے بلال! کس عمل کی وجہ سے تم جنت میں جانے میں مجھ سے آگے تھے؟ میں جب بھی جنت میں داخل ہوا تو اپنے آگے تیرے چلنے کی آواز سنی۔ رات میں جنت میں داخل ہوا تو تیری چاپ اپنے آگے سنی۔“

پھر آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے سونے کے بنے ہوئے بلند وبالاحل کو دیکھا اور پوچھا: «لِمَنْ هَذَا الْقَصْرُ؟» ”یہ محل کس کا ہے؟“ انھوں نے کہا کہ ایک عربی کا ہے۔ میں نے کہا: میں عربی ہوں۔ یہ محل کس کا ہے؟ انھوں نے کہا: امت محمدیہ میں سے ایک آدمی کا ہے۔ میں نے کہا: میں محمد ہوں، یہ محل کس کا ہے؟ تو انھوں نے بتایا کہ یہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا ہے۔ پھر حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے بتایا: اے اللہ کے رسول ﷺ! میں نے جب بھی اذان دی، دو رکعتیں ضرور ہی پڑھیں اور جب بھی بے وضو ہوا تو وضو کیا اور اپنے آپ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے دو رکعتیں ضروری سمجھیں۔ اس پر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: (تب تمہارا جنت میں جانے میں بظاہر مجھ سے سبقت لے جانا) انہی دو رکعتوں کی پابندی کی وجہ سے ہے۔^①

اس حدیث سے جہاں یہ بات واضح ہوئی کہ مذکورہ واقعہ معراج کا نہیں، بلکہ خواب کا ہے اور نبی اکرم ﷺ کو کئی بار پیش آیا ہے، وہیں یہ حدیث حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے جنتی ہونے کی بھی دلیل ہے، کیوں کہ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح غریب کہا ہے اور محدث البانی جیسے ماہرین حدیث کے نزدیک بھی یہ حدیث صحیح مسلم کی شرائط پر ہے اور صحیح ہے۔^②

صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے پورا وضو کر کے

① سنن الترمذی مع التحفة (۱۰/۱۷۴-۱۷۶) تخريج صلاة الرسول (ص: ۱۲۶) طبع اول.

② إرواء الغلیل (۲/۲۲۱)

دکھایا، جس کی تفصیل بھی اس حدیث میں مذکور ہے اور آخر میں فرمایا:

«مَنْ تَوَضَّأَ نَحْوَ وَضُوءِي هَذَا، ثُمَّ صَلَّى رَكَعَتَيْنِ لَا يُحَدِّثُ فِيهَا نَفْسَهُ، غَفَرَ اللَّهُ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ»^(۱)

”جس شخص نے میرے اس وضو کی طرح وضو کیا اور دو رکعتیں اس توجہ سے ادا کیں کہ ان کے دوران میں پریشان خیالی میں مبتلا نہیں ہوا، اللہ تعالیٰ اس کے پہلے تمام گناہ معاف کر دیتا ہے۔“

جب کہ صحیح مسلم میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَتَوَضَّأُ فَيُحْسِنُ وَضُوءَهُ ثُمَّ يَقُومُ، فَيُصَلِّي رَكَعَتَيْنِ مُقْبِلًا عَلَيْهِمَا بِقَلْبِهِ وَوَجْهِهِ إِلَّا وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ»^(۲)

”کوئی مسلمان جب اچھی طرح سے وضو کرتا ہے، پھر کھڑے ہو کر دو رکعتیں قلبی توجہ اور

یک سوئی سے ادا کرتا ہے تو اس کے لیے جنت واجب ہو جاتی ہے۔“

یہ حدیث صحیح مسلم کے علاوہ سنن ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ، صحیح ابن خزیمہ، مسند احمد، شرح السنۃ

بغوی اور مستدرک حاکم میں بھی مروی ہے۔^(۳)

ایک روایت میں مذکور ہے:

«وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ وَغُفِرَ لَهُ»^(۴)

”اس کے لیے جنت واجب ہو جاتی ہے اور اس کی بخشش ہو جاتی ہے۔“

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ وضو کے بعد کم از کم دو رکعتیں نماز ”تحیۃ الوضوء“ پڑھنے

کا کتنا ثواب ہے اور اخروی سعادت کا یہ عالم ہے کہ موزن رسول حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے انہی دو

^(۱) صحیح البخاری مع الفتح، رقم الحدیث (۱۵۹) صحیح مسلم مع شرح النووی (۳/ ۱۰۸، ۱۱۰) صحیح

سنن أبی داؤد، رقم الحدیث (۹۷) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۸۲، ۸۳) و صحیح

الترغیب، رقم الحدیث (۲۲۴) مشکاة المصابیح (۱/ ۹۵) المنتقی مع النیل (۱/ ۱۳۹)

^(۲) صحیح مسلم مع شرح النووی (۳/ ۱۱۸) مشکاة المصابیح (۱/ ۵۹)

^(۳) الفتح الربانی و شرحه (۱/ ۳۰۹-۳۱۰) شرح السنۃ (۴/ ۱۴۹)

^(۴) الفتح الربانی (۱/ ۳۱۰) و شرح السنۃ (۴/ ۱۵۰)

رکعتوں کی پابندی سے یہ رتبہ پایا۔ ہمیں بھی یہ عادت ڈالنی چاہیے کہ جب بھی وضو کریں، اس سے کم از کم دو رکعت نفلی نماز ضرور ادا کریں۔ اَللّٰهُمَّ وَفَّقْنَا جَمِيعًا. آمین.

ایک وضو سے کئی نمازیں:

اب ہم ایسی بات کا تذکرہ کرتے ہیں جو اگرچہ معروف ہے اور ممکن ہے، ہر کسی کو معلوم بھی ہو، لیکن اس بات کا بھی عین امکان ہے کہ بعض لوگوں کے لیے یہ بات نئی ہو۔ لہذا کم از کم ان کے کام آجائے گی اور جنہیں معلوم ہے، ان کے ہاتھ اس کے دلائل آجائیں گے۔ لہذا ہر کس ونا کس کے لیے استفادے کا پہلو نکل آتا ہے۔ وہ بات یہ ہے کہ ایک وضو سے متعدد نمازیں پڑھی جاسکتی ہیں۔ یہ امر جائز اور ثابت ہیں۔ چنانچہ صحیح بخاری، سنن ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ میں حضرت عمرو بن عامر الجلی بیان کرتے ہیں:

«سَأَلْتُ أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ عَنِ الْوُضُوءِ فَقَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَتَوَضَّأُ لِكُلِّ صَلَاةٍ، وَكُنَّا نَصَلِّي الصَّلَوَاتِ بِوُضُوءٍ وَاحِدٍ»⁽¹⁾

”میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے وضو کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے جواب دیا کہ نبی اکرم ﷺ تو ہر نماز کے لیے وضو فرمایا کرتے تھے اور ہم کئی کئی نمازیں ایک ہی وضو سے ادا کر لیا کرتے تھے۔“

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نبی اکرم ﷺ کا عمل مبارک تو افضل پر تھا، جب کہ آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم جواز و رخصت سے فائدہ اٹھا لیا کرتے تھے، کیوں کہ یہ جواز و رخصت بھی خود نبی اکرم ﷺ کے اپنے عمل سے ثابت ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ میں حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

(1) صحیح البخاری مع الفتح، رقم الحدیث (۲۱۴) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (۱۵۶) و اللفظ له، مختصر سنن أبي داود للمنذري (۱/ ۱۲۷) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۵۰) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۵۰۹) صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (۱۲۷) المنتقى مع النيل (۱/ ۲۱۰) و صحیح الجامع، رقم الحدیث (۴۹۰۷)

«صَلَّى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَوْمَ الْفَتْحِ خَمْسَ صَلَوَاتٍ بَوْضُوءٍ وَاحِدٍ، وَمَسَحَ عَلَى خَفِيَّهِ»

”فتح مکہ کے دن نبی اکرم ﷺ نے ایک ہی وضو سے پانچ نمازیں ادا فرمائیں اور اس وضو میں اپنے موزوں پر مسح فرمایا۔“

یہ دیکھ کر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم ﷺ سے استفسار فرمایا:

«[إِنِّي رَأَيْتُكَ] لَقَدْ صَنَعْتَ [الْيَوْمَ] شَيْئًا لَمْ تَكُنْ تَصْنَعُهُ»

”میں نے دیکھا ہے، آج آپ ﷺ نے ایک ایسا کام کیا ہے، جو پہلے آپ ﷺ نہیں کیا کرتے تھے۔“

(حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اشارہ کئی نمازیں ایک وضو سے ادا کرنے کی طرف تھا) اس پر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«عَمَدًا صَنَعْتَهُ يَا عُمَرُ»^① ”عمر! میں نے ایسا جان بوجھ کیا ہے۔“

ان دونوں حدیثوں سے معلوم ہوا کہ ایک وضو کے ساتھ کئی نمازیں پڑھی جاسکتی ہیں۔ ہر نماز کے ساتھ از سر نو وضو فرض اور واجب نہیں، البتہ یہ افضل ہے، کیوں کہ صحیح بخاری میں تعلیقاً، سنن نسائی، صحیح ابن خزیمہ اور مسند احمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے موصولاً مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«لَوْلَا أَنْ أَشَقَّ عَلَى أُمَّتِي لِأَمْرَتِهِمْ عِنْدَ كُلِّ صَلَاةٍ بَوْضُوءٍ، وَمَعَ كُلِّ وُضُوءٍ بِسَوَائِكَ»^②

”اگر میں اپنی امت کے لیے باعثِ مشقت نہ سمجھتا تو انھیں حکم دے دیتا کہ وہ ہر نماز

① مختصر صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۴۲) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (۱۵۷) مختصر السنن

للمنذري (۱۲۷ / ۱) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۵۱) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۱۲۹)

سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (۵۱۰) مشکاة المصابيح (۱۰۱ / ۱) صحیح الجامع، رقم الحدیث (۴۰۹۳)

② صحیح البخاری مع الفتح، رقم الحدیث (۸۸۷) صحیح مسلم (۱۴۲ / ۳) صحیح سنن أبي داود، رقم

الحدیث (۳۵) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۷) سنن ابن ماجه (۲۸۷) صحیح الترغیب، رقم

الحدیث (۲۰۰) صحیح الجامع، رقم الحدیث (۵۳۱۸) والإرواء، رقم الحدیث (۷۲)

کے ساتھ وضو کیا کریں اور ہر وضو کے ساتھ مسواک کیا کریں۔“
 اسی مفہوم کی ایک حدیث صحیح ابن حبان میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہے۔ امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ
 کہتے ہیں کہ یہ حدیث ہر نماز کے ساتھ تجدید وضو کے عدم وجوب پر دلالت کرتی ہے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ
 نے قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے کہا ہے کہ تمام اہل فتویٰ کا اس کے عدم وجوب پر اجماع ہے اور
 ان کے مابین اس سلسلے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔^①



① نیل الأوطار (۱/۱) ۲۰۴-۲۱۰ طبع بیروت.

تیمم

قارئین کرام! یہاں تک تو مسنون غسل و طہارت اور وضو کرنے کے ضروری احکام و مسائل کا ذکر تھا، جن کا تعلق پانی سے بلکہ پانی کی وافر مقدار موجود ہونے سے ہوتا ہے، مگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم کسی ایسے مقام پر ہوں، جہاں پانی ہی میسر نہیں، جس سے غسل یا وضو کیا جاسکے یا اتنا نہیں جو پینے جیسی اہم انسانی ضرورت سے زائد ہو کہ وضو کے کام لایا جائے اور کبھی یوں بھی ہو سکتا ہے کہ پانی تو موجود ہے، مگر کسی بیماری کی وجہ سے غسل و وضو کرنا جان لیوا یا سخت مضر ہوتا ہے۔ سفر و حضر میں کبھی ان حالات کا پیش آجانا کوئی بعید از امکان نہیں تو ایسے میں شریعت اسلامیہ کے پاس اس کا کیا حل ہے؟

اس سلسلے میں سب سے پہلی اور بنیادی بات تو یہ ہے کہ قرآن کریم اور حدیث نبوی کی تعلیمات کسی خاص ملک و قوم اور کسی محدود وقت و زمانے کے لیے نہیں کہ ان مسائل کے حل کا دائرہ محدود ہو، بلکہ دین اسلام ایک عالم گیر دین ہے۔ یہ قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کے لیے ہے اور اس کی تعلیمات میں ہر زمانے، ہر قوم اور ہر ملک کے باشندوں کو پیش آنے والے ہر قسم کے حالات کا حل اور اس کی راہنمائی کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ یہی چیز تو شریعت اسلامیہ کا سب سے بڑا اعجاز ہے، جو اسے دوسری سابقہ شرائع سے ممتاز کرتی ہے۔

اگر کبھی کوئی شخص ایسے حالات سے دوچار ہو جائے کہ اس کے پاس پانی نہ ہو یا اسے پانی کے استعمال پر قدرت نہ ہو یا پھر اس کا استعمال مضر ہو تو ایسے میں بھی نماز معاف نہیں کی گئی، کیوں کہ یہ تو دین کا ستون ہے۔ البتہ ایسے حالات میں اللہ تعالیٰ نے مٹی کو پانی کے قائم مقام قرار دے دیا ہے اور اس کا بھی ایک خاص انداز اور مسنون طریقہ ہے۔ اس انداز طہارت کو ”تیمم“ کہا جاتا ہے۔

تیمم کا اجمالی طریقہ:

تیمم کا اجمالی طریقہ یہ ہے کہ حصول طہارت کی نیت سے دونوں ہاتھوں کو زمین یا کسی چیز پر

پڑے ہوئے گرد و غبار پر ماریں، پھر دونوں ہاتھوں میں پھونک کر انھیں پہلے منہ پر اور پھر دونوں ہاتھوں کو باہم ایک دوسرے پر پھیر لیں۔ اس طرح صرف ایک ہی بار کر لینے سے تیمم ہو جاتا ہے۔ کہنیوں اور پاؤں وغیرہ پر ہاتھ پھیرنا اور سر یا کانوں کا مسح کرنا بھی ضروری نہیں، کیوں کہ یہ اندازِ طہارت ایک ”علامت“ ہے۔ اعضاء و ضو کا استیعاب اس میں مقصود ہی نہیں ہے۔

تیمم کی مشروعیت میں حکمت:

قبل اس کے کہ تیمم کی مشروعیت کے دلائل اور تیمم کے دیگر احکام و مسائل کا سلسلہ شروع کیا جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعض مخصوص حالات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر رحمت اور شفقت کرتے ہوئے غسل و وضو کا علامتی قائم مقام جس تیمم کو قرار دیا ہے، اس کی مشروعیت میں پائی جانے والی حکمتیں اختصار سے ذکر کر دی جائیں۔

اگر بلا غسل و بلا وضو اور بلا تیمم ہی نماز وغیرہ کی اجازت دے دی جاتی تو اس کا ایک نقصان تو یہ ہوتا کہ ان اتفاقات سے طبائع ترک طہارت کی عادی ہو جاتیں اور اس سے بھی بڑھ کر یہ ہوتا کہ غسل و وضو کی پابندی سے اللہ تعالیٰ کے دربار کی حاضر کا جو اہتمام محسوس ہوتا اور اس کی وجہ سے اس حاضری کی عظمت و تقدس کا جو تصور ذہن پر چھایا رہتا ہے، وہ مجروح ہوتا۔ اس لیے حکمت الہی نے مجبوری کے ایسے حالات میں تیمم کو غسل و وضو کا قائم مقام بنا دیا ہے۔ اب مجبوری کی حالت میں غسل یا وضو کے بجائے آدمی نماز وغیرہ کے لیے تیمم کا اہتمام کرے گا تو اس کی عادت و ذہن پر کوئی غلط اثر نہیں پڑے گا۔

اس کی ایک حکمت تو بعض اہل علم نے یہ بیان کی ہے کہ پوری زمین کے دو ہی حصے ہیں: خشکی اور تری۔ ان دونوں میں سے ایک بڑے حصے کی سطح پانی ہے اور دوسرے حصے کی مٹی۔ اس لیے پانی اور مٹی میں ایک مناسبت ہے۔ نیز انسان کی ابتدائی تخلیق بھی پانی اور مٹی ہی سے ہوئی ہے اور مٹی ہی ایک ایسی چیز ہے، جسے انسان سمندر کے سوا ہر جگہ پاسکتا ہے، پھر مٹی پر ہاتھ مار کر منہ پر پھیرنے میں انکساری اور خاکساری کی بھی ایک خاص شان ہے، چونکہ انسان کا آخری ٹھکانا بھی مٹی اور خاک ہی ہے، مگر اسے خاک ہی سے جا ملنا ہے، اس لیے تیمم میں موت اور قبر کی یاد بھی پائی جاتی ہے۔ تیمم کی مشروعیت میں یہ حکمتیں اور اسرار و رموز محسوس کیے جاسکتے ہیں۔^①

① معارف الحدیث مولانا نعمانی (۳/۹۵-۹۶) طبع لکھنؤ ۱۹۸۳ء

تیمم اور قرآن کریم:

یہ تیمم قرآن و سنت اور اجماع امت تینوں کی رو سے جائز اور ثابت ہے۔

① چنانچہ قرآن کریم کی سورۃ النساء (آیت: ۴۳) میں ارشادِ الہی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَرَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ وَلَا جُنُبًا إِلَّا عَابِرِي سَبِيلٍ حَتَّىٰ تَغْتَسِلُوا وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِّنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ أَوْ لَمَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُورًا﴾

”مومنو! جب تم نشے کی حالت میں ہو تو جب تک (ان الفاظ کو) جو منہ سے کہو سمجھنے (نہ) لگو، نماز کے پاس نہ جاؤ اور جنابت کی حالت میں بھی (نماز کے پاس نہ جاؤ) جب تک کہ غسل (نہ) کر لو، ہاں اگر بہ حالتِ سفر راستے پر چلے جا رہے ہو (اور پانی نہ ملنے کے سبب غسل نہ کر سکو تو تیمم کر کے نماز پڑھ لو) اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا کوئی تم میں سے بیت الخلاء سے ہو کر آیا ہو یا تم عورتوں سے ہم بستر ہوئے ہو اور تمہیں پانی نہ ملے تو پاک مٹی لو اور منہ اور ہاتھوں کا مسح (کر کے تیمم) کر لو، بے شک اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔“

اس آیت میں اجمالی طور پر اللہ تعالیٰ نے جوازِ تیمم کے اسباب و حالات اور طریقہ تیمم بیان فرمایا ہے۔ معمولی لفظی فرق کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے یہی مضمون سورۃ المائدہ (آیت: ۶) میں بھی بیان فرمایا ہے۔ اس آیت میں پہلے وضو کے اصول و احکام ہیں، پھر اسباب و طریقہ تیمم کا ذکر ہے۔

② چنانچہ ارشادِ الہی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوْهُكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَهَّرُوا وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّن

الْغَائِطِ أَوْ لَمَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا
بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُمْ مِنْهُ مَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ حَرَجٍ وَ لَكِنْ
يُرِيدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَ لِيَتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۱﴾

”مومنو! جب تم نماز پڑھنے کا قصد کیا کرو، تو منہ اور کہنیوں تک ہاتھ دھولیا کرو اور سر کا
مسح کر لیا کرو اور ٹخنوں تک پاؤں (دھولیا کرو) اور اگر نہانے کی حاجت ہو تو (نہا کر)
پاک ہو جایا کرو اور اگر بیمار ہو یا سفر میں ہو یا کوئی تم میں سے بیت الخلاء میں سے ہو کر
آیا ہو یا تم عورتوں سے ہم بستر ہوئے ہو اور تمہیں پانی نہ مل سکے تو پاک مٹی لو اور اس
سے منہ اور ہاتھوں کا مسح (تیمم) کر لو، اللہ تعالیٰ تم پر کسی طرح کی تنگی نہیں کرنا چاہتا، بلکہ
یہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کرے اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کرے، تاکہ تم شکر ادا کرو۔“
ان دونوں آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے تیمم کی مشروعیت، اسباب، طریقہ اور حکمت؛ تمام امور
بیان فرمادیے ہیں۔ آیت تیمم کے لفظ ﴿فَتَيَمَّمُوا﴾ سے تیمم میں نیت کے وجوب پر بھی استدلال کیا
گیا ہے۔ تمام فقہا کا (سوائے امام اوزاعی رحمہ اللہ کے) یہی قول ہے۔^①

تیمم اور احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم:

قرآن کریم کی طرح حدیث شریف میں بھی ان امور کا تذکرہ آیا ہے۔

﴿۱﴾ چنانچہ صحیح مسلم، مسند احمد اور سنن بیہقی میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے
فرمایا:

«فُضِّلْنَا عَلَى النَّاسِ بِثَلَاثٍ: جُعِلَتْ صُفُوفُنَا كَصُفُوفِ الْمَلَائِكَةِ، وَجُعِلَتْ
لَنَا الْأَرْضُ كُلُّهَا مَسْجِدًا، وَجُعِلَتْ تُرْبَتُهَا لَنَا طَهُورًا، إِذَا لَمْ نَجِدِ الْمَاءَ ﴿۲﴾»
”ہمیں تین اشیا کے ساتھ دوسری امتوں کے لوگوں پر فضیلت دی گئی ہے: ہماری صفوں کو
فرشتوں کی صفیں قرار دیا گیا ہے۔ ہمارے لیے تمام روے زمین مسجد بنا دی گئی ہے اور

① فتح الباری (۱/ ۴۳۴)

② صحیح مسلم مع شرح النووی (۵/ ۴) مشکاة المصابیح (۱/ ۱۶۴) المنتقی مع النیل (۱/ ۲۶۳) إرواء
الغلیل (۱/ ۳۱۶)

جب ہم پانی نہ پائیں تو اس زمین کی مٹی ہمارے لیے طہارت کا ذریعہ بنا دی گئی ہے۔“

یہ حدیث متعدد کتب حدیث میں کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔

❖ صحیح بخاری و مسلم، سنن نسائی و دارمی، صحیح ابی عوانہ اور سنن بیہقی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ارشاد نبوی ﷺ کے الفاظ ہیں:

«أُعْطِيَتْ خَمْسًا لَمْ يُعْطَهُنَّ أَحَدٌ قَبْلِي: نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيرَةَ شَهْرٍ، وَجَعَلْتُ لِي الْأَرْضُ مَسْجِدًا وَطَهُورًا، فَأَيُّمَا رَجُلٍ مِنْ أُمَّتِي أَدْرَكَتُهُ الصَّلَاةُ فَلْيُصَلِّ...»

”مجھے پانچ چیزیں ایسی دی گئی ہیں، جو پہلے [انبیاء میں سے] کسی کو نہیں دی گئیں: میری اس طرح مدد کی گئی ہے کہ میرے اور میرے دشمن کے مابین ایک ماہ کی مسافت ہوتی ہے، مگر اس پر رعب چھا جاتا ہے۔ میرے لیے یہ زمین مسجد اور طہارت بنا دی گئی ہے۔ میری امت کے کسی آدمی کو جہاں بھی نماز کا وقت ہو جائے، وہ وہیں نماز پڑھ لے۔“

یہاں یہ بات بھی پیش نظر رکھیں کہ پہلی امتوں پر ضروری تھا کہ وہ جہاں بھی ہوں، نماز کے لیے بنائی گئی عبادت گاہوں میں پہنچ کر ہی نماز ادا کریں۔ ان کے علاوہ کہیں ان کی نماز ادا نہیں ہو سکتی تھی۔ اسی حدیث میں آگے آپ ﷺ فرماتے ہیں:

«أُحِلَّتْ لِي الْغَنَائِمُ، وَكَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ إِلَى قَوْمِهِ خَاصَّةً، وَبُعِثْتُ إِلَى النَّاسِ كَافَّةً، وَأُعْطِيَتْ الشَّفَاعَةَ»^①

”میرے لیے اموال غنیمت حلال کر دیے گئے ہیں۔ مجھ سے پہلے ہر نبی خاص اپنی قوم کی طرف مبعوث کیا جاتا تھا، جب کہ میں تمام بنی نوع انسان طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں اور مجھے شفاعت کے شرف سے نوازا گیا ہے۔“

❖ صحیح مسلم، سنن ترمذی، ابن ماجہ، صحیح ابی عوانہ اور مسند احمد میں یہی حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں «فُضِّلْتُ عَلَى الْأَنْبِيَاءِ بِسِتِّ...» کے الفاظ ہیں، یعنی مجھے پہلے

① صحیح البخاری مع الفتح، رقم الحدیث (۳۳۵) صحیح مسلم مع شرح النووی (۳/۵) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۴۱۹) إرواء الغلیل (۱/۳۱۵-۳۱۶) و صحیح الجامع، رقم الحدیث (۱۰۵۶)

انبیاء ﷺ پر چھ اشیا سے فضیلت دی گئی ہے۔ جن میں سے پہلی چیز ہے: «أُعْطِيَتْ جَوَامِعَ الْكَلِمِ» «میں جوامع الکلم دیا گیا ہوں۔» دوسری: «أَحَلَّتْ لِي الْغَنَائِمُ» «میرے لیے غنیمت حلال کی گئی ہے۔» تیسری ہے: زمین کا مسجد اور طہارت ہونا۔ سنن ابن ماجہ میں صرف یہی مذکور ہے۔ چوتھی ہے: ساری مخلوقات کی طرف نبی مبعوث ہونا اور پانچویں ہے: «وَوَخَّيْتُمْ بِي النَّبِيِّونَ» «میرے ساتھ نبیوں کا سلسلہ ختم کر دیا گیا ہے۔»^①

④ سنن بیہقی اور مسند احمد میں اسی سے ملتے جلتے الفاظ کے ساتھ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں چار چیزیں: ساری زمین کا مسجد و طہارت ہونا، آپ ﷺ کا ساری مخلوقات کا نبی ہونا، رعب و دبدبہ اور حلت غنائم مذکور ہیں۔^②

⑤ اسی حدیث کی پانچویں روایت مسند احمد اور سنن داری میں مفصلاً اور سنن ابو داؤد میں مختصراً حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں پانچ اشیا کا ذکر ہے، جو سابقہ احادیث میں آگئی ہیں، البتہ انداز بیان الگ ہے۔ سنن ابو داؤد میں صرف تمام زمین کے مسجد و طہارت بنائے جانے کا ذکر کیا گیا ہے اور محدثین کرام کے نزدیک یہ پانچویں روایت بھی صحیح سند سے مروی ہے۔

⑥ چھٹی روایت مسند احمد میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے حسن درجے کی سند سے مروی ہے۔ اس میں بھی پانچ چیزوں کا ذکر ہے۔ اس روایت میں اس بات کی وضاحت بھی ہے کہ پہلی اُمتوں کے لوگ اموالِ غنیمت استعمال نہیں کر سکتے تھے، بلکہ جلا دیتے تھے، لیکن میرے لیے وہ حلال کیے گئے ہیں اور پہلی اُمتوں کے لوگ صرف اپنے معبدوں اور کنیسوں ہی میں نماز پڑھ سکتے تھے، لیکن میرے لیے ساری زمین ہی مسجد اور ذریعہ طہارت بنا دی گئی ہے۔

⑦ ساتویں روایت مسند احمد میں حسن سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، جس کا مفہوم حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ والی روایت ہی کا ہے۔

⑧ آٹھویں روایت دلائل النبوة بیہقی اور مسند احمد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں رعب و دبدبہ اور مٹی کے طہارت بنائے جانے کے علاوہ تیسری بات یہ ہے کہ مجھے زمین کی

① صحیح مسلم مع شرح النووي (۵/۵) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۱۲۵۷) الإرواء (۱/۳۱۵)

صحیح الجامع، رقم الحدیث (۴۲۲۲)

② مختصر صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۵۷) الإرواء (۱/۱۸۰-۳۱۶) صحیح الجامع، رقم الحدیث (۳۲۲۲)

چابیاں دی گئی ہیں۔ چوتھی یہ کہ میرا نام احمد رکھا گیا ہے اور پانچویں یہ کہ میری امت کو خیر الامم بنایا گیا ہے۔ اس آخری روایت کی سند میں ضعف واضطراب ہے، مگر مجموعی طور پر ان آٹھوں روایات والی حدیث صحیح بلکہ متواتر ہے۔^①

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اللہ تعالیٰ کے ان خاص عطیات کو نبی اکرم ﷺ کی زبانی ذکر کر دیا ہے، جو ان سے پہلے دوسرے کسی نبی کو نہیں دیے گئے تھے، پھر ان عطیات میں امت اسلامیہ کے شرف کا پہلو بھی ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے یہ اور دیگر متعدد روایات جمع کر کے ان عطیات الہیہ کی تعداد سترہ بیان کی ہے اور ابو سعید نیشاپوری کی آٹھ جلدوں پر مشتمل کتاب شرف المصطفیٰ ﷺ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ ان خصائص کی تعداد ساٹھ ہے۔^②

بہر حال نبی اکرم ﷺ نے خصوصی انعامات الہیہ میں سے روے زمین کی مٹی کو طہارت کا ذریعہ بنایا جانا بھی شمار فرمایا، جو تیمم کی مشروعیت کا ثبوت ہے۔

◆ سنن ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، دارقطنی، مستدرک حاکم اور مسند احمد میں حضرت ابو ذر

غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ارشاد نبوی ﷺ ہے:

«إِنَّ الصَّعِيدَ الطَّيِّبَ وَضَوْءَ الْمُسْلِمِ وَإِنْ لَمْ يَجِدِ الْمَاءَ عَشْرَ سِنِينَ»^③

”پاک مٹی مسلمان کا وضو ہے، چاہے اسے دس سال بھی پانی میسر نہ آئے۔“

سنن نسائی کے سوا دوسری کتب میں آگے یہ الفاظ بھی مذکور ہیں:

«فَإِذَا وَجَدَ الْمَاءَ فَلْيَمْسَهُ بِشَرَّتِهِ، فَإِنَّ ذَلِكَ خَيْرٌ»^④

”جب اسے پانی مل جائے، تو پھر اس سے غسل وضو کرنا چاہیے، کیوں کہ یہی بہتر ہے۔“

① إرواء الغلیل (۱/۳۱۷) و المنتقی مع النیل (۱/۲۶۲)

② فتح الباری (۱/۴۳۹) و نیل الأوطار (۱/۲۶۲)

③ صحیح سنن أبي داؤد، رقم الحدیث (۳۲۱) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۱۰۷) صحیح سنن

النسائی، رقم الحدیث (۳۱۱) مسند أحمد (۵/۱۵۵، ۱۸۰) موارد الظمان، رقم الحدیث (۱۹۶) مشکاة

المصابیح (۱/۱۶۵) المنتقی مع نیل الأوطار (۱/۲۶۶، ۲۶۷) الإرواء (۱/۱۸۱)

④ صحیح سنن أبي داؤد، رقم الحدیث (۳۲۱) سنن الترمذی مع التحفة (۱/۳۸۷) صحیح الترمذی، رقم

الحدیث (۱۰۷) و اللفظ له، و صحیح الجامع، رقم الحدیث (۱۶۶۷)

تیمم اور اجماع امت:

قرآن و سنت کی ان نصوص کی طرح تیمم کے جواز و مشروعیت پر ایک دلیل پوری امت اسلامیہ کا اجماع بھی ہے، جیسا کہ شروح حدیث اور کتب فقہ میں مذکور ہے۔ البتہ شروح میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور ابراہیم نخعی رضی اللہ عنہ کا صرف اس صورت میں اختلاف مذکور کہ جنابت والے کے لیے تیمم جائز نہیں، لیکن سنن ترمذی میں ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے قول سے رجوع کر لیا تھا اور اس بات کے قائل ہو گئے تھے کہ پانی نہ ملنے کی صورت میں جنابت والا بھی تیمم کر سکتا ہے۔^(۱) ”تحفة الأحوذی“ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے رجوع کر لینے کا بھی تذکرہ ہے۔^(۲)

اس مسئلے میں اجماع امت اور اتفاق علما کا ذکر امام ابن قدامہ نے فقہ مقارن کی بہترین کتاب ”المغنی“ (۱/ ۲۳۳) میں بھی کیا ہے۔

حیض اور جنابت میں تیمم:

یہ بات تو معروف ہے کہ نماز وغیرہ کے لیے وضو کرنا ہوگا، مگر پانی نہ ملنے یا پانی تو ہو، مگر کسی عذر کی بنا پر پانی استعمال نہ کر سکتا ہو تو وہ شخص تیمم کر کے نماز ادا کر سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی ذہن نشین کر لیں کہ اگر کسی پر جماع و احتلام یا حیض و نفاس کی وجہ سے غسل واجب ہو اور اس کے پاس پانی نہ ہو یا پانی تو ہو، مگر بیماری یا شدید سردی کی وجہ سے غسل نہ کر سکتا ہو تو ایسے شخص کے لیے بھی جائز ہے کہ وہ تیمم کر کے نماز ادا کر لے، اس کا یہ تیمم غسل اور وضو دونوں سے کفایت کر جائے گا۔ امام مالک، شافعی، احمد اور اسحاق رضی اللہ عنہم کا یہی قول ہے۔^(۳)

اس کا ثبوت کئی احادیث میں موجود ہے، چنانچہ صحیح بخاری و مسلم میں مطولاً اور نسائی شریف میں مختصراً مروی ہے، حضرت عمران رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

«كُنَّا فِي سَفَرٍ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فَصَلَّى بِالنَّاسِ، فَلَمَّا انْفَتَلَ مِنْ صَلَاتِهِ، إِذَا

(۱) سنن الترمذی مع التحفة (۱/ ۳۸۹)

(۲) تحفة الأحوذی (۱/ ۳۸۹)

(۳) سنن الترمذی مع التحفة (۱/ ۳۸۹)

هُوَ بِرَجُلٍ مُعْتَزِلٍ، لَمْ يُصَلِّ مَعَ الْقَوْمِ، قَالَ: مَا مَنَعَكَ يَا فُلَانُ أَنْ تُصَلِّيَ مَعَ الْقَوْمِ؟ قَالَ: أَصَابَتْنِي جَنَابَةٌ وَلَا مَاءَ، قَالَ: عَلَيْكَ بِالصَّعِيدِ فَإِنَّهُ يَكْفِيكَ^① ”ہم ایک سفر میں نبی اکرم ﷺ کے ہمراہ تھے تو آپ ﷺ نے لوگوں کو نماز پڑھائی۔ جب آپ ﷺ نماز پڑھا کر فارغ ہو کر پھرے تو آپ ﷺ نے ایک آدمی کو الگ تھلگ بیٹھے دیکھا، جس نے لوگوں کے ساتھ نماز نہیں پڑھی تھی۔ نبی اکرم ﷺ نے اس سے مخاطب ہو کر فرمایا: اے فلاں! تمہیں لوگوں کے ساتھ مل کر نماز ادا کرنے سے کس چیز نے روکا ہے؟ اس نے جواب دیا: میں جنابت میں مبتلا ہو گیا ہوں، لیکن (غسل کے لیے) پانی نہیں ہے۔ یہ سن کر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: تمہارے پاس مٹی ہے (اس سے تیمم کر لو) یہی تمہارے لیے کافی ہے۔“

ایسے ہی صحیح بخاری و مسلم اور سنن اربعہ میں حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس کوئی شخص آیا اور کہنے لگا:

«إِنِّي أَجْنَبْتُ فَلَمْ أَصِبِ الْمَاءَ» ”مجھے جنابت ہو گئی ہے اور پانی نہیں مل رہا۔“

تو حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے کہا:

«أَمَا تَذْكُرُ أَنَا كُنَّا فِي سَفَرٍ أَنَا وَأَنْتَ [وَفِي مُسْلِمٍ]، فَأَجْنَبْنَا فَأَمَّا أَنْتَ فَلَمْ تُصَلِّ، وَأَمَّا أَنَا فَتَمَعَّكَتُ، فَصَلَّيْتُ، فَذَكَرْتُ ذَلِكَ لِلنَّبِيِّ ﷺ... إِنَّمَا كَانَ يَكْفِيكَ هَكَذَا فَضَرَبَ النَّبِيُّ ﷺ بِكَفِّهِ الْأَرْضَ وَنَفَخَ فِيهِمَا ثُمَّ مَسَحَ بِهِمَا وَجْهَهُ وَكَفَّيَهُ»^②

”کیا آپ کو یاد نہیں کہ ایک سفر کے دوران میں ہم دونوں کو جنابت لاحق ہو گئی تھی

① صحیح البخاری مع الفتح، رقم الحدیث (۳۴۴) صحیح مسلم مع شرح النووي (۵/ ۱۸۹ تا ۱۹۲)

صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۳۱۰) المشكاة مع المرعاة (۱/ ۵۸۷) و صحیح الجامع (۴۰۴۳)

② صحیح البخاری مع الفتح (۳۳۸) صحیح مسلم مع شرح النووي (۴/ ۶۲) صحیح سنن أبي داود،

رقم الحدیث (۳۱۳) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۳۰۸) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث

(۱۲۵) مختصر سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۵۹۹) المشكاة مع المرعاة (۱/ ۱۸۷ - ۱۸۹) و صحیح

الجامع، رقم الحدیث (۲۳۶۷)

اور آپ نے تو نماز نہیں پڑھی تھی، جب کہ میں نے مٹی میں لوٹ پوٹ ہونے کے بعد نماز پڑھ لی، پھر میں نے اپنا مٹی لوٹ پوٹ ہونا نبی اکرم ﷺ کے سامنے ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: تمہارے لیے یوں کر لینا ہی کافی تھا۔ (یعنی چاہے تیمم برائے جنابت تھا، اپنا مٹی میں لوٹ پوٹ ہونے کے بجائے صرف اتنا ہی کافی تھا) پھر نبی اکرم ﷺ نے اپنی دونوں ہتھیلیوں کو زمین پر مارا اور پھر ان دونوں میں پھونک ماری، پھر دونوں ہتھیلیاں منہ پر اور پھر باہم دونوں ہاتھوں پر پھیر لیں۔“

سنن ترمذی میں مذکور ہے کہ جنابت والا اور حیض والی جب پانی نہ پائیں تو تیمم کر لیں اور نماز پڑھیں۔ تحفۃ الأحوذی میں اس پر سلف و خلف کا اجماع ذکر کیا گیا ہے۔^①

مریض اور تیمم:

اس شخص کے لیے بھی تیمم کی اجازت ہے، جو پانی تو پاتا ہے، مگر بیمار ہے اور بیماری کی وجہ سے پانی سے غسل نہیں کر سکتا یا اسے غسل کرنے میں مرض کے بڑھ جانے کا خدشہ ہو۔ چنانچہ کتب حدیث میں سے سنن ابوداؤد، ابن ماجہ، دارقطنی اور بیہقی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں، جس حدیث میں یہ واقعہ مذکور ہے، اس کی سند کے بارے میں ہم پلاسٹریا پٹی پر مسح کے ضمن میں کچھ تفصیل ذکر کر چکے ہیں کہ ان پر مسح سے متعلق الفاظ ضعیف السند ہیں۔ البتہ تیمم کے ذکر کی حد تک اس حدیث کو شواہد کی بنا پر حسن درجے کی قرار دیا گیا ہے۔^②

اُس حدیث میں وہ واقعہ بہ روایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ یوں مذکور ہے کہ ہم ایک سفر میں تھے کہ ہم میں سے ایک آدمی کے سر پر پتھر لگا، جس سے اس کا سر پھٹ گیا اور پھر اسے احتلام ہو گیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا:

«هَلْ تَجِدُونَ لِي رُخْصَةً فِي التَّيْمَمِ؟»

”کیا تم میرے لیے تیمم کر لینے کی رخصت پاتے ہو یا نہیں؟“

تو انھوں نے جواب دیا:

① سنن الترمذی مع شرحه تحفۃ الأحوذی (۱/ ۳۸۹)

② دیکھیں: التلخیص (۱/ ۱۴۷- ۱۴۸) سبیل السلام (۱/ ۱/ ۹۹) تمام المنة (ص: ۱۳۱)

«مَا نَجِدُ لَكَ رُخْصَةً، وَأَنْتَ تَقْدِرُ عَلَى الْمَاءِ»

”ہم تمہارے لیے کوئی رخصت نہیں پاتے، کیوں کہ تم پانی کے استعمال پر قادر ہو۔“

لہذا اس شخص نے غسل کیا، نتیجہ یہ کہ وہ فوت ہو گیا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب ہم نبی اکرم ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور اس واقعے کی آپ ﷺ کو خبر دی گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«قَتَلُوهُ قَتَلَهُمُ اللَّهُ! أَلَا سَأَلُوا إِذَا لَمْ يَعْلَمُوا، فَإِنَّمَا شِفَاءُ الْعِيِّ السُّؤَالُ»

”اللہ انھیں غارت کرے! انھوں نے اسے قتل کر دیا ہے۔ جب انھیں معلوم نہیں تھا تو انھوں نے پوچھ کیوں نہ لیا۔ مرضِ جہالت اور نادانی کا علاج صرف سوال ہے۔“

اور آگے فرمایا:

«إِنَّمَا كَانَ يَكْفِيهِ أَنْ يَتِيمَ»^①

”اس کے لیے یہی کافی تھا کہ وہ یتیم کر لیتا۔“

ان تین احادیث سے معلوم ہوا کہ تیمم صرف وضو کا قائم مقام ہی نہیں، بلکہ غسل کا قائم مقام بھی ہے، لہذا جنابت وغیرہ کی حالت میں پانی نہ ملے یا مرض کی حالت میں پانی کے استعمال کی قدرت نہ ہو اور ایسے وقت میں صرف تیمم کر لیا جائے تو کافی ہے۔

سخت سردی اور تیمم:

اگر مذکورہ حالات کے علاوہ کبھی کہیں سخت سردی ہے اور آدمی تندرست و توانا ہونے کے باوجود اس سردی کی وجہ سے نہانے میں جان کا خطرہ محسوس کرے تو اس صورت میں بھی تیمم جائز ہے، جیسا کہ صحیح بخاری (تعلیقاً)، سنن ابی داؤد، دارقطنی، مستدرک حاکم اور مسند احمد میں صحیح سند سے مروی ہے، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ غزوہ ذات السلاسل میں ہمیں نبی اکرم ﷺ نے بھیجا:

«إِحْتَلَمْتُ فِي لَيْلَةٍ بَارِدَةٍ شَدِيدَةٍ الْبُرْدِ فَأَشْفَقْتُ أَنْ أَعْتَسَلْتُ أَنْ أَهْلِكَ فَتَيْمَّمْتُ، ثُمَّ صَلَّيْتُ بِأَصْحَابِي صَلَاةَ الصُّبْحِ، فَلَمَّا قَدِمْنَا عَلَى رَسُولِ

① صحیح سنن ابی داؤد، رقم الحدیث (۳۲۵) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۵۷۲) المشكاة مع المرعاة

(۱/۵۹۳-۵۹۴) المنتقى مع النيل (۱/۲۵۷) التلخیص الحبیر (۱/۱۴۷) بلوغ المرام مع سبل السلام

(۱/۹۹)

اللَّهُ ﷻ ذَكَرْتُ ذَلِكَ لَهُ فَقَالَ: يَا عَمْرُؤُ! صَلَّيْتَ أَصْحَابَكَ وَأَنْتَ جُنُبٌ؟
 ”ایک سخت سردی والی رات میں مجھے بد خوابی (احتلام کی وجہ) سے غسل کی ضرورت پیش
 آئی۔ سردی کی سخت شدت سے ڈر گیا کہ میں ہلاک نہ ہو جاؤں، لہذا میں نے تیمم کیا اور
 اپنے ساتھیوں کو فجر کی نماز پڑھا دی۔ جب ہم نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر
 ہو گئے تو میں نے آپ ﷺ کو یہ واقعہ بتایا۔ واقعہ سن کر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اے
 عمرو! تو نے اپنے ساتھیوں کو جنابت کی حالت ہی میں نماز پڑھا دی؟“

حضرت عمرو بن العاص نے واقعہ ذکر کر کے بتایا کہ اس مجبوری کے وقت میں مجھے اللہ تعالیٰ کا وہ

ارشاد یاد آگیا، جس میں فرمایا ہے:

﴿وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا﴾ [النساء: ۲۹]

”اور اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو، کچھ شک نہیں کہ اللہ تم پر مہربان ہے۔“

لہذا میں نے تیمم کر کے نماز پڑھا دی:

﴿فَضَحِكَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَلَمْ يَقُلْ شَيْئًا﴾^①

”نبی اکرم ﷺ یہ سن کر ہنس دیے اور آپ ﷺ نے کچھ نہ کہا۔“

اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد المجد ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے ”منتقى الأخبار“ میں لکھا ہے کہ
 شدید سردی کے خوف سے بھی تیمم کا جواز ثابت ہے۔ دوسرے یہ بھی کہ جس نے پانی سے باقاعدہ
 وضو کیا ہو، اس کی نماز تیمم والے امام کی اقتدا میں جائز و صحیح ہے۔ امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی شرح
 ”نیل الأوطار“ میں لکھا ہے کہ ان حالات میں تیمم کے جواز کی اس حدیث میں دو دلیلیں ہیں:

① یہ واقعہ سن کر نبی اکرم ﷺ کا تبسم فرمانا اور خوش ہونا۔ آپ ﷺ کا یہ تبسم تو کسی کام کے جواز پر
 آپ ﷺ کے خاموش رہنے سے بھی زیادہ قوی دلیل ہے، جب کہ آپ ﷺ کی محض خاموشی
 بھی دلیل جواز ہے، کیوں کہ آپ ﷺ کسی ناجائز کام کو دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔

② یہ آپ ﷺ کا اس فعل پر نکیر نہ کرنا۔ اگر یہ فعل ناجائز ہوتا تو آپ ﷺ ضرور اسے ناجائز قرار

① صحیح البخاری مع الفتح (۱/ ۴۵۴) صحیح سنن أبي داود، رقم الحديث (۳۲۳) المنتقى مع النيل (۱/

۱/ ۲۵۸) الإرواء (۱/ ۱۸۱-۱۸۲) و صححه.

دیتے، کیوں کہ ناجائز اور باطل کام کو آپ ﷺ ہرگز برقرار نہیں رکھا کرتے تھے۔ اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے امام ثوری، ابو حنیفہ، مالک اور ابن المنذر رحمہم نے کہا ہے کہ جس نے شدید سردی کے خوف سے تیمم کر کے نماز ادا کی، اس پر اس نماز کا اعادہ یعنی دوبارہ پڑھنا واجب نہیں رہا، کیوں کہ مذکورہ واقعہ سن کر نبی اکرم ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نماز کے اعادے کا حکم نہیں فرمایا اور اگر یہ واجب ہوتا تو آپ ﷺ ضرور حکم فرمادیتے۔^(۱)

صحیح بخاری میں امام صاحب نے ایک باب قائم کر کے یہی حدیث تعلقاً ذکر کی ہے اور اس باب میں لکھا ہے:

”بَابُ إِذَا خَافَ الْجُنْبُ عَلَى نَفْسِهِ الْمَرَضَ أَوْ الْمَوْتَ أَوْ خَافَ الْعَطَشَ تَيْمَمًا“^(۲)

”اگر جنابت والا اپنے آپ پر مرض یا موت سے ڈرے یا (وضو و غسل میں پانی ختم ہو جانے کے نتیجے میں) پیاس کے خدشے میں ہو تو وہ تیمم کر لے۔“

اعادۂ نماز کا وجوب اور عدم وجوب:

یہاں اس بات کی تھوڑی سی وضاحت کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ نماز کے اعادے کے واجب نہ ہونے کے علاوہ بعض صورتوں میں واجب ہونے کی دلیل بھی موجود ہے۔ نماز پڑھی گئی اور اس کا وقت بھی نکل گیا، اب اسے دہرانے کی ضرورت نہیں، جیسا کہ ابھی گذشتہ حدیث میں ذکر ہوا ہے۔ یہ ایک صورت ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ نماز تیمم کر کے ادا کر لی اور ابھی اس کا وقت باقی تھا کہ پانی بھی مل گیا، اس شکل میں بھی نماز کا دہرانا واجب نہیں ہے، جیسا کہ سنن ابوداؤد، نسائی، دارمی، دارقطنی اور متدرک حاکم میں مختلف فیہ سند کے ساتھ اور صحیح ابن سکین میں موصول صحیح سند کے ساتھ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ دو آدمی سفر پر نکلے اور نماز کا وقت ہو گیا، مگر ان دونوں کے پاس (وضو کے لیے) پانی نہیں تھا۔ ان دونوں نے تیمم کر کے نماز ادا کی۔

«ثُمَّ وَجَدَا الْمَاءَ فِي الْوَقْتِ فَأَعَادَا أَحَدُهُمَا الْوُضُوءَ وَالصَّلَاةَ، وَلَمْ يُعِدِ الْآخَرُ»

(۱) نیل الأوطار (۲۵۸/۱/۱) و المنتقى (۲۵۹/۱/۱)

(۲) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: صحیح البخاری مع فتح الباری (۱/۴۵۴-۴۵۵)

”پھر نماز کا وقت ہوتے ہوئے ہی انھیں پانی مل گیا۔ ان میں سے ایک نے تو وضو کر کے نماز دہرائی، مگر دوسرے نے اعادہ نہیں کیا، یعنی نماز نہیں دہرائی۔“

جب وہ دونوں نبی اکرم ﷺ کے پاس پہنچے تو انھوں نے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ آپ ﷺ نے سارا واقعہ سننے کے بعد جس نے نماز نہیں دہرائی تھی، اس سے مخاطب ہو کر فرمایا:

«أَصَبْتَ السَّنَةَ، وَأَجْرًا تَكَّ صَلَاتِكَ»

”تم نے سنت کو پالیا اور تمھاری نماز ہو گئی۔“

پھر دوسرے شخص سے مخاطب ہو کر (جس نے نماز دہرائی تھی) فرمایا:

«لَكَ الْأَجْرَ مَرَّتَيْنِ»^① ”تمھارے لیے دوہرا اجر ہے۔“

اس حدیث کے الفاظ «أَصَبْتَ السَّنَةَ، وَأَجْرًا تَكَّ صَلَاتِكَ» اس بات کی واضح دلیل

ہیں کہ نماز پڑھ چکنے کے بعد وقت ہوتے ہوئے بھی اگر پانی مل جائے تو تیمم والے پر واجب نہیں کہ وہ وضو کرے اور نماز کو دہرائے۔ امام ابوحنیفہ، مالک، شافعی اور یحییٰ بن یوسف کا یہی مسلک ہے۔^②

ایک تیسری صورت یہ ہے کہ پانی کی عدم موجودگی کی وجہ سے تیمم کر کے نماز شروع کرنے والا تھا کہ پانی مل گیا۔ داؤد اور سلمہ بن عبد الرحمن کے سوا تمام فقہائے کرام رحمہم اللہ کے نزدیک وہ شخص اب وضو کرے اور پھر نماز پڑھے، کیوں کہ اس نے ابھی نماز شروع نہیں کی کہ پانی مل گیا ہے۔^③

اسی سلسلے کی ایک چوتھی صورت بھی ہے کہ پانی کی عدم موجودگی کی وجہ سے تیمم کیا اور نماز بھی شروع کر دی، مگر نماز مکمل کرنے سے پہلے ہی پانی حاصل ہو گیا۔ اس شکل میں امام داؤد اور مالک رحمہم اللہ کا کہنا ہے کہ وہ نماز نہ توڑے، بلکہ پڑھتا رہے اور مکمل کرے، کیوں کہ سورت محمد (آیت: ۳۳) میں ارشاد الہی ہے:

﴿وَلَا تَبْطُلُوا أَعْمَالَكُمْ﴾ [محمد: ۳۳] ”اور اپنے اعمال کو ضائع نہ ہونے دو۔“

جب کہ امام ابوحنیفہ، اوزاعی، ثوری، مزنی (صاحب شافعی) اور ابن شریح رحمہم اللہ کا کہنا ہے کہ

① صحیح سنن أبي داود، رقم الحديث (۳۲۷) صحیح سنن النسائي، رقم الحديث (۴۲۰) المتفق مع

النيل ۱/ (۲۶۵-۲۶۶) مشکاة المصابيح (۱/۱۶۶) التلخيص الحبير (۱/۱۵۶-۱۵۷)

② نيل الأوطار (۱/۱) (۲۶۶) و المرعاة (۱/۵۹۶)

③ نيل الأوطار (۱/۱) (۲۶۶) و المرعاة (۱/۵۹۶)

اس پر واجب ہے کہ وہ نماز قطع کرے، وضو کرے اور پھر سے نماز پڑھے۔ ”منتقى الأخبار“ میں ابو البركات المجد ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس مسلک کے لیے جس حدیث سے استدلال کیا ہے، وہ سنن ابو داود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، دارقطنی، مستدرک حاکم اور مسند احمد میں صحیح سند کے ساتھ حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّ الصَّعِيدَ الطَّيِّبَ وَضُوءَ الْمُسْلِمِ، وَإِنْ لَمْ يَجِدِ الْمَاءَ عَشْرَ سِنِينَ، فَإِذَا وَجَدَ الْمَاءَ فَلْيُمْسَسْ بَشْرَتَهُ فَإِنَّ ذَلِكَ خَيْرٌ»^①

”پاکیزہ مٹی مسلمان کا وضو ہے، اگر چہ اسے دس سال بھی پانی نہ ملے۔ جب اسے پانی مل

جائے تو اسے چاہیے کہ پانی ہی سے غسل و وضو کرے کہ اس کے لیے یہی بہتر ہے۔“

اس حدیث کے آخری الفاظ «فَإِذَا وَجَدَ الْمَاءَ فَلْيُمْسَسْ بَشْرَتَهُ فَإِنَّ ذَلِكَ خَيْرٌ» سے استدلال کیا گیا ہے کہ نماز مکمل ہونے سے پہلے اگر پانی مل جائے تو پھر اس نماز کو چھوڑ کر وضو کرنا اور نماز کو دہرانا واجب ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ ”نیل الأوطار“ میں لکھتے ہیں کہ یہ استدلال بالکل صحیح ہے، کیوں کہ یہ حدیث مطلق ہے، ہر اس شخص کے حق میں جس نے وقت گزرنے کے بعد پانی پایا یا جس نے دوران نماز ہی پانی پایا یا نماز پڑھ چکنے، مگر وقت نماز باقی ہونے کے عرصے میں پایا۔ جب کہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ والی حدیث اس شخص کے ساتھ خاص و مقید ہے، جسے نماز سے فارغ ہو چکنے، مگر اس کے وقت ہونے کے دوران ہی میں پانی مل گیا۔ لہذا وہ صورت حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ والی حدیث کی رو سے اعادے سے مستثنیٰ ہے، جب کہ دوسری دو صورتیں یعنی تیمم کر لینے، مگر نماز شروع کرنے سے پہلے پانی پالینے اور نماز شروع کر لینے، مگر اسے مکمل کرنے سے پہلے پانی پالینے والی صورتیں حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ والی حدیث کے تحت آجاتی ہیں۔ ان میں نماز کا دہرانا ہی ضروری ہے۔^②

آیت تیمم کا سبب نزول:

آیے اس کے بارے میں نازل ہونے والی آیت کا شان نزول اور مشروعیت تیمم کا اولین

① صحیح سنن أبي داود، رقم الحديث (۳۲۱، ۳۲۲) صحیح سنن الترمذی، رقم الحديث (۱۰۷) صحیح

سنن النسائي، رقم الحديث (۳۱۱) مشکاة المصابيح (۱/۵۳۰) صحیح الجامع، رقم الحديث (۱۶۶۷)

② نیل الأوطار (۱/۲۶۷)

محرک دیکھیں۔ چنانچہ صحیح بخاری و مسلم، سنن ابی داؤد، نسائی، ابن ماجہ اور مسند احمد میں ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم نبی اکرم ﷺ کے ساتھ سفر میں نکلے اور جب ہم مقام بیدا یا ذات الحیش پر تھے تو میرا ہارٹوٹ کر کہیں گر گیا (دوسری روایت کے مطابق انھوں نے وہ اپنی چھوٹی بہن حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے مستعار لے کر پہنا ہوا تھا)

نبی اکرم ﷺ ہار کی تلاش کے لیے رک گئے۔ دوسرے لوگ بھی رکے، جب کہ اس جگہ پانی تھا اور نہ لوگوں کے پاس ہی پانی تھا۔ لوگوں نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے جا کر شکایت کی کہ دیکھو! عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہار گم ہونے کی وجہ سے نبی اکرم ﷺ اور سارے لوگ رکے پڑے ہیں۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ گئے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو سخت سُست کہا، اسی موقع پر اللہ تعالیٰ نے تیمم کی مشروعیت والی آیت نازل فرمادی۔ لہذا لوگوں نے تیمم کیا۔ اسی واقعہ اور آیت تیمم کے نزول پر حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«مَا هِيَ بِأَوَّلِ بَرَكَتِكُمْ يَا آلَ أَبِي بَكْرٍ»

”اے خاندان ابو بکر رضی اللہ عنہ! یہ تمہاری کوئی پہلی برکت نہیں ہے (یعنی تم لوگ بڑے بابرکت ہو کہ تمہاری وجہ سے مسلمانوں کو کئی آسانیاں میسر آئیں)۔“

اسی حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جس اونٹ پر میں بیٹھی تھی، جب اسے اس کی جگہ سے اٹھایا گیا تو وہیں سے ہار مل گیا، جب کہ صحیح بخاری اور دیگر کتب میں ایک دوسری سند سے بھی یہ واقعہ مذکور ہے، جہاں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ ہار حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے مستعار لینا ذکر ہوا ہے۔ اس میں مذکور ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ہار کی تلاش میں لوگوں کو بھیجا۔ انھیں ہار تو مل گیا، مگر اسی دوران میں نماز کا وقت ہو گیا، جب کہ ان کے پاس پانی نہیں تھا، تو انھوں نے بغیر وضو ہی کے نماز پڑھ لی۔ واپس آئے تو نبی اکرم ﷺ کو ماجرا سنایا، تب اللہ تعالیٰ نے تیمم والی آیت نازل فرمادی۔ اس پر حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مخاطب ہو کر فرمایا:

«جَزَاكَ اللَّهُ خَيْرًا، فَوَ اللَّهُ مَا نَزَلَ بِكَ أَمْرٌ تَكْرَهِيَنَّهُ قَطُّ إِلَّا جَعَلَ اللَّهُ ذَلِكَ لَكَ مِنْهُ مَخْرَجًا، وَجَعَلَ لِلْمُسْلِمِينَ فِيهِ خَيْرًا [وفي رواية: بَرَكَةٌ]»^①

① مختصر صحیح البخاری للآلبانی (ص: ۹۳-۹۴) ومع فتح الباری (۱/ ۴۳۱-۴۴۰) صحیح مسلم مع

”اللہ تمہیں جزاے خیر دے۔ اللہ کی قسم! جب کبھی کوئی ایسی بات رونما ہوئی ہے، جو تمہیں پسند نہ ہو، اللہ نے تمہارے لیے اس سے صاف بچ نکلنے کا راستہ بنا دیا اور صرف اسی پر بس نہیں کہ تمہارے لیے نکلنے کا راستہ بنایا، بلکہ اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کے لیے اس میں خیر و برکت رکھ دی۔“

اس حدیث میں یہ الفاظ حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کے تھے، جس کی بطور خاص وجہ یہ ہے کہ جو لوگ ہار کی تلاش میں بھیجے گئے تھے، یہ ان کے سربراہ تھے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان اس طرف ہے کہ ہار گم ہونے کا یہ واقعہ اور ہے اور جس میں حضرت عائشہ صدیقہ، طیبہ و طاہرہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگی تھی، اس واقعہ میں بھی ہار گم ہوا تھا، لیکن وہ دوسرا الگ واقعہ ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے ”فتح الباری“ میں محمد بن حبیب کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہار غزوہ ذات الرقاع اور غزوہ بنی المصطلق میں الگ الگ دو مرتبہ گم ہوا تھا اور حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کے الفاظ اور اسی مفہوم کی بعض دیگر روایات نقل کرنے کے بعد انہوں نے لکھا ہے:

”یہ اس بات کو قوت دیتی ہیں کہ نزولِ تیمم اور ہار کے گم ہونے والا یہ واقعہ تہمت اور ہار گم ہونے والے اس واقعے کے بعد کا ہے۔“^①

بہر حال حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہار گم ہونے کی بدولت اُمتِ اسلامیہ کو تیمم کی رخصت مل گئی اور یہ برکاتِ آلِ ابی بکر رضی اللہ عنہ میں سے ایک برکت ہے۔

مقیم اور تیمم:

یہ معروف اور عام سی بات ہے کہ سفر کے دوران میں پانی نہ ہونے کی شکل میں تیمم کیا جاسکتا ہے، جب کہ حضر میں مقیم کو بھی اجازت ہے کہ اگر وہ پانی نہ پائے اور پانی پالینے تک نماز کے گزر جانے کا اندیشہ ہو تو وہ بھی تیمم کر کے نماز ادا کر سکتا ہے۔ صحیح بخاری میں امام صاحب نے ایک باب میں ان دونوں شرطوں کو ذکر کیا ہے، یعنی خروجِ وقت کا اندیشہ یا خدشہ اور پانی کا فقدان، جب کہ

① شرح النووي (۵۸ / ۴) صحیح سنن أبي داود، رقم الحديث (۳۰۹) صحیح سنن النسائي، رقم

الحديث (۲۹۹) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۵۶۸) و المنتقى مع النيل (۱ / ۲۶۷)

② فتح الباري (۱ / ۴۳۴-۴۳۵)

شارح بخاری حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

”پانی کے فقدان کے تحت ہی پانی کے استعمال کی قدرت کا فقدان بھی آجاتا ہے کہ پانی تو موجود ہے، مگر سخت سردی یا ہلاکت کے خوف سے اس کے استعمال کی قدرت نہیں تو ان صورتوں میں مقیم کے لیے حضر میں بھی تیمم جائز ہے۔“^(۱)

اس کی دلیل صحیح بخاری و مسلم، سنن نسائی اور دارقطنی کی وہ حدیث ہے، جو صحیح مسلم میں تعلقاً اور باقی کتب میں موصولاً حضرت ابو جہیم بن حارث رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

«أَقْبَلَ النَّبِيُّ ﷺ مِنْ نَحْوِ بئرِ جَمَلٍ فَلَقِيَهُ رَجُلٌ فَسَلَّمَ عَلَيْهِ فَلَمْ يَرُدَّ النَّبِيُّ ﷺ حَتَّى أَقْبَلَ عَلَى الْجِدَارِ فَمَسَحَ بِوَجْهِهِ وَيَدَيْهِ، ثُمَّ رَدَّ عَلَيْهِ السَّلَامَ»^(۲)

”نبی اکرم ﷺ (مدینے کے ایک مقام) بئر جمل کی طرف سے تشریف لائے تو آپ ﷺ کو ایک آدمی ملا اور اس نے آپ ﷺ کو سلام کیا، آپ ﷺ نے اس کے سلام کا جواب نہ دیا، حتیٰ کہ آپ ﷺ ایک دیوار کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ ﷺ نے اپنا چہرہ مبارک اور دونوں ہاتھوں کا مسح (تیمم) کیا اور پھر اس شخص کے سلام کا جواب دیا۔“

یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ جو آدمی نبی اکرم ﷺ کو ملا اور اس نے سلام کیا، وہ خود راوی حدیث حضرت ابو جہیم رضی اللہ عنہ ہی تھے، جیسا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں مذکور ہے۔ سنن دارقطنی کی روایت میں «حَتَّى أَقْبَلَ عَلَى الْجِدَارِ» کی بجائے «حَتَّى وَضَعَ يَدَهُ عَلَى الْجِدَارِ» کے الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ دیوار پر رکھے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ والی روایت میں ہے: «فَحَثَّهٖ بِعَصَا» کہ دیوار کو اپنے عصا مبارک سے کریدا اور پھر اس پر مسح کیا۔^(۳)

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے پاس اس وقت پانی نہیں تھا، اس لیے آپ ﷺ نے تیمم کیا۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ بات نقل کر کے حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ”فتح الباری“ (۱/ ۴۴۳)

(۱) صحیح البخاری مع فتح الباری (۱/ ۴۴۱)

(۲) صحیح البخاری مع الفتح (۱/ ۴۴۱) صحیح مسلم مع شرح النووی (۴/ ۶۳، ۶۴) صحیح سنن أبی داؤد، رقم الحدیث (۳۱۹) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۳۰۰) المشكاة مع المرعاة (۱/ ۵۹۷)

التلخیص الحبیر (۱/ ۱۴۹)

(۳) فتح الباری (۱/ ۴۴۲) المرعاة (۱/ ۵۹۷)

میں لکھا ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اسی لیے اس حدیث پر یہ باب قائم کیا ہے کہ اگر حضر میں بھی پانی ہو تو تیمم جائز ہے۔ البتہ اس پر اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضر میں یہ تیمم ایک سبب سے تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سلام کا جواب دینا چاہتے تھے اور سلام چونکہ اسماء الہی میں سے ایک مقدس نام ہے، لہذا ذکر الہی کے ارادے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیمم فرمایا تھا۔ اس تیمم سے نماز کا تو ارادہ نہیں تھا۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ سلام کا جواب تو بلا وضو بھی جائز ہے۔ اس کے باوجود پانی نہ ہونے کی صورت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیمم کر لیا اور نماز جو بلا طہارت جائز ہی نہیں، جب اس کا وقت نکلنے کا خدشہ ہو تو حضر میں بھی پانی نہ ہونے کی شکل میں تیمم کا جواز اولیٰ ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمۃ اللہ علیہم کے آثار:

اس موضوع کے بعض دلائل، اس مرفوع حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ آثار صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمۃ اللہ علیہم سے بھی ملتے ہیں۔ چنانچہ بخاری شریف میں تعلقاً مذکور ہے، جسے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے موصولاً بیان کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما (مدینہ طیبہ سے بالائی جانب ایک فرسخ دور مقام) جرف سے مدینہ طیبہ کی طرف آرہے تھے تو (مدینے سے صرف ایک میل پہلے والے مقام) مربد پر انھوں نے تیمم کیا اور عصر کی نماز ادا کی، پھر مدینہ شریف میں داخل ہوئے، جب کہ ابھی سورج بلند تھا، مگر انھوں نے نماز دہرائی نہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے اس اثر کے بارے میں حضرت نافع رضی اللہ عنہ کے الفاظ یہ ہیں:

«أَقْبَلَ ابْنُ عُمَرَ مِنْ أَرْضِهِ بِالْجُرْفِ حَتَّى إِذَا كَانَ بِالْمَرْبِدِ تَيْمَّمَ، فَمَسَحَ وَجْهَهُ وَيَدَيْهِ، وَصَلَّى الْعَصْرَ، ثُمَّ دَخَلَ الْمَدِينَةَ وَالشَّمْسُ مُرْتَفِعَةٌ فَلَمْ يُعِدْ»^①

یہ اثر اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما حضر میں مقیم کے لیے بھی پانی نہ ملنے پر تیمم کو جائز سمجھتے تھے، کیوں کہ ایسی مسافت کو، جس میں انھوں نے تیمم کر کے نماز ادا فرمائی، سفر نہیں کہا جاسکتا۔ معروف محدث و تابعی حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا قول بخاری شریف میں تعلقاً اور اسماعیل القاضی کی کتاب ”الأحكام“ میں موصولاً مروی ہے، جس میں مذکور ہے کہ اگر کوئی بیمار ہے اور اس کے قریب ہی پانی موجود ہے، لیکن وہاں کوئی دوسرا ایسا شخص نہیں، جو اسے وہ پانی پکڑا دے اور خود وہ

① صحیح البخاری مع فتح الباری (۱/ ۴۴۱) و التلخیص (۱/ ۱۴۵)

اٹھ کر لائیں سکتا تو وہ مریض تیمم کر لے۔^①

مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ اور امام ابن سیرین رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

«لَا يَتَيَّمُ مَا رَجَأَ أَنْ يَقْدِرَ عَلَى الْمَاءِ فِي الْوَقْتِ»^②

”جب تک کسی کو امید ہو کہ وقت نکلنے سے پہلے پہلے وہ پانی پالے گا، تب تک تیمم نہ کرے۔“

لیکن بقول حافظ ابن حجر رضی اللہ عنہ اس کا مفہوم بھی پہلی بات کے موافق ہی ہے، یعنی اگر اُسے ایسی امید نہ ہو تو پھر وہ بھی تیمم کر لے اور ان کا یہ قول بھی حضرت میں مقیم شخص ہی کے بارے میں ہے۔ صحیح بخاری کے ترجمہ الباب میں جہاں امام صاحب نے پانی نہ ملنے اور نماز کا وقت نکلنے کے خدشے سے حضرت میں تیمم کا بیان شروع کیا ہے، وہیں لکھا ہے:

”وَيَهِّئُ قَالَ عَطَاءٌ“، ”امام عطاء رضی اللہ عنہ کا قول بھی یہی ہے (کہ حضرت میں بھی اس صورت میں

تیمم جائز ہے)۔“

صحیح بخاری کے ترجمہ الباب میں تو یہ اثر تعلقاً لایا گیا ہے، جب کہ ”فتح الباری“ میں لکھا ہے کہ اسی اثر کو مصنف عبد الرزاق میں صحیح سند سے موصولاً اور ایسے ہی مصنف ابن ابی شیبہ میں بھی ایک دوسری سند سے روایت کیا گیا ہے۔ مزید یہ کہ امام عطاء سے منقول اثر میں نماز کو دہرانے کے واجب ہونے کے بارے میں بھی کوئی ذکر نہیں ہے۔^③

امام مالک رضی اللہ عنہ کا مسلک بھی ان آثار کی بنا پر یہی ہے کہ حضرت میں تیمم سے ادا کی گئی نماز کو دہرانا واجب نہیں ہے۔ البتہ امام شافعی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایسی صورت حال کبھی کبھار اور شاذ و نادر ہی رونما ہوتی ہے، لہذا نماز کو دہرالینا چاہیے۔ امام ابو یوسف اور ان کے ساتھی امام زفر رضی اللہ عنہما نے تو کہا ہے:

”ایسا شخص نماز ہی نہ پڑھے، اگرچہ وقت ہی کیوں نہ نکل جائے۔“^④

لیکن ان کا یہ قول صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رضی اللہ عنہم کے آثار ہی نہیں، بلکہ دیگر ائمہ کے اقوال کے بھی مخالف اور انتہائی منفرد و غیر مستقیم ہے، بلکہ صحیحین، سنن ترمذی اور مسند احمد کی اُس حدیث کے بھی

① صحیح البخاری مع فتح الباری (۱/ ۴۴) و التلخیص (۱/ ۱۴۵)

② فتح الباری (۱/ ۴۴)

③ فتح الباری (۱/ ۴۴)

④ فتح الباری (۱/ ۴۴۲)

خلاف ہے، جس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہار تلاش کرنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بغیر وضو ہی کے نماز ادا کر لیتے ہیں اور تیمم کا اس وقت تک ابھی حکم ہی نازل نہیں ہوا تھا۔ اس کے باوجود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں نہ تو ان کے اس فعل پر ٹوکا اور نہ نماز دہرانے کا حکم فرمایا، جیسا کہ تفصیل گزری ہے۔ اس اعتبار سے امام مالک رضی اللہ عنہ کا قول ہی اقرب الی الصواب ہے کہ ایسی حالت میں تیمم سے ادا کی گئی نماز کو دہرانا واجب نہیں ہے۔

ایک انتہائی نادر صورت:

یہیں ایک اور بات کی طرف بھی اشارہ کرتے چلے جائیں کہ کبھی کبھار ایک انتہائی نادر و ناممکن سی صورت حال بھی پیش آسکتی ہے کہ کسی کو نہ تو پانی ملے اور نہ مٹی ہی یا یہ الفاظ دیگر نہ وضو کا ذریعہ موجود ہو اور نہ تیمم ہی کا، جس کی کئی اشکال امام نووی رحمہ اللہ نے ”المجموع“ (۲/ ۳۰۵ وما بعدھا) میں بیان کی ہیں۔ اگر کبھی کسی کو ایسی صورت حال سے دوچار ہونا پڑے، تو ایسے میں کیا کیا جائے؟ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں جو تویب کی ہے، وہاں موصوف کے الفاظ ہیں:

”بَابُ إِذَا لَمْ يَجِدْ مَاءً وَلَا تَرَابًا“

”اگر کسی کو پانی ملے نہ مٹی تو اس کے لیے حکم کا بیان۔“

جیسا کہ ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ امام صاحب رحمہ اللہ نے اس کے بارے میں حکم بیان نہیں کیا، بلکہ اسے کھلا ہی چھوڑ دیا ہے۔ جہاں کہیں اس قسم کی تویب ہوتی ہے، وہ اس بات کا پتا دیتی ہے کہ اُن کے نزدیک اس کے حکم میں قوی قسم کا اختلاف ہوتا ہے اور بحث و نظر کی گنجائش بھی پاتے ہیں تو باب قائم کر دیتے ہیں، مگر باب میں حکم بتانے کے بجائے مختلف آرا کا دروازہ کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔ البتہ اپنی رائے کا اظہار اس باب کے تحت آنے والی حدیث کی شکل میں کر جاتے ہیں، چنانچہ مذکورہ صورت میں حکم یہ ہے کہ پانی اور مٹی چاہے دونوں چیزیں ہی کہیں دستیاب نہ ہوں نماز پھر بھی پڑھی جائے گی، جو اس نادر حالت میں بلا تیمم و بلا وضو ہی ہوگی اور اس کی دلیل بھی صحیحین، سنن ابی داؤد نسائی، ابن ماجہ اور مسند احمد والی وہی حدیث ہے، جس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہار تلاش کرنے کے لیے جانے والے لوگ اسی طرح نماز ادا کر لیتے ہیں، چنانچہ اس حدیث میں ہے:

﴿فَأَدْرَكْتَهُمُ الصَّلَاةَ، وَلَيْسَ مَعَهُمْ مَاءٌ فَصَلُّوا﴾ [وفي رواية: بَعِيرٌ وَضُوءٌ] ⁽¹⁾
 ”نماز کا وقت ہو گیا، جب کہ ان کے پاس پانی نہیں تھا، لیکن انھوں نے بلا وضو ہی نماز ادا کر لی۔“

تیمم کا اس وقت تک ابھی حکم ہی نہیں ہوا تھا، لہذا ابن رشید کے حوالے سے صاحب فتح الباری نے لکھا ہے کہ ان کے پاس صرف پانی کا نہ ہونا اور ہمارے پاس پانی اور مٹی دونوں کا نہ ہونا ایک ہی حکم میں ہیں، اسی بات سے اس حدیث کی اس باب سے مناسبت بھی ظاہر ہو جاتی ہے، کیوں کہ حدیث میں مٹی کے فقدان کا ذکر نہیں، صرف پانی کے فقدان کا تذکرہ ہے۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ چاہے کہیں پانی اور مٹی دونوں ہی نہ ملیں، نماز پھر بھی واجب ہے صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کے وجوب کے پیش نظر ہی نماز ادا کی تھی۔ اگر ایسے حالات میں نماز ممنوع ہوتی، تو نبی اکرم ﷺ ان صحابہ رضی اللہ عنہم کو ان کے اس فعل پر ٹوک دیتے، مگر ایسا نہیں ہوا اور ضرورت کے وقت نبی اکرم ﷺ کا کسی مسئلے میں شرعی حکم بیان کرنے میں تاخیر کرنا جائز ہے اور نہ یہ آپ ﷺ کے شایان شان ہے۔ ⁽²⁾
 امام شوکانی رحمہ اللہ کے بقول صاحب ”منتقى الأخبار“ ابو البركات المجد ابن تيميه رحمہ اللہ اور کثیر محققین کا مسلک یہی ہے کہ ان حالات میں بھی نماز کو ادا کرنا واجب ہے۔ ⁽³⁾

فتح الباری شرح صحیح بخاری میں لکھا ہے کہ امام شافعی، احمد اور امام مالک رحمہم اللہ خود تو نہیں، البتہ ان کے اکثر اصحاب اور جمہور محدثین کرام رحمہم اللہ کا مسلک یہی وجوب والا ہی ہے، لیکن نماز کو دہرانے کے واجب ہونے میں ان کا اختلاف ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور ان کے اکثر اصحاب کے نزدیک ایسی نماز کو دہرانا واجب ہے کہ جب پانی یا مٹی دستیاب ہوں تو وضو یا تیمم کر کے وہ نماز دوبارہ ادا کر لے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ عذر شاذ و نادر واقع ہونے والا ہے، لہذا یہ نماز دہرانے کو ساقط نہیں کرتا۔

ان کی یہ بات محض ایک قیاس آرائی ہے، ورنہ حدیث میں مذکور اس واقعہ میں نبی اکرم ﷺ

[1] صحیح البخاری مع الفتح (۱/ ۴۳۱- ۴۴۰) مختصر صحیح البخاری للألبانی (ص: ۹۳- ۹۴) صحیح

مسلم مع شرح النووي (۲/ ۴/ ۵۹) صحیح سنن أبي داود، رقم الحديث (۳۰۹) صحیح سنن النسائي،

رقم الحديث (۲۲۹) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۵۶۸) المنتقى مع النيل (۱/ ۱/ ۲۶۷)

[2] فتح الباری (۱/ ۴۴۰)

[3] نیل الأوطار (۱/ ۱/ ۲۶۷)

نے ان صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی کو نماز دہرانے کا حکم نہیں فرمایا۔ یہی وجہ ہے کہ امام احمد رضی اللہ عنہ کے مشہور قول کے مطابق، اسی طرح امام مزنی، سخون اور ابن منذر رضی اللہ عنہم کے نزدیک ایسی ادا کردہ نماز کو دوبارہ دہرانے کی کوئی ضرورت ہے نہ یہ واجب ہے، ان کی دلیل مذکورہ بالا حدیث ہی ہے، جب کہ امام ابو حنیفہ اور امام مالک رضی اللہ عنہما کے مشہور اقوال کے مطابق ایسی صورت حال سے دو چار شخص کو نماز ہی نہیں پڑھنی چاہیے۔ البتہ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب، اسی طرح امام ثوری اور امام اوزاعی رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ اس شخص پر نماز کی قضا واجب ہے، لیکن امام مالک رضی اللہ عنہ سے ان کے مدنی رواۃ نے جو قول نقل کیا ہے، اس کے مطابق ان کے نزدیک ایسے شخص پر اس نماز کی قضا بھی واجب نہیں۔ گویا ایسے شخص کو وہ نماز ہی معاف ہے، وہ اس وقت ادا کرے نہ بعد میں قضا کرے، لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا فعل جسے نبی اکرم ﷺ نے برقرار رکھا، وہ ان حضرات کے اقوال کے بجائے نماز کو اس کے وقت پر وجوباً ادا کرنے اور پھر اسے نہ دہرانے کے قول والوں کی تائید کر رہا ہے۔

ایسی صورت حال سے دو چار شخص کی نماز کے حکم کے بارے میں یہ چار اقوال ہو گئے ہیں۔ جب کہ ”المجموع شرح المہذب“ میں امام نووی رضی اللہ عنہ نے ایک پانچواں قول بھی ذکر کیا ہے، جس کے مطابق ایسے شخص کا وقت پر نماز ادا کر لینا مستحب اور بعد میں اس صورت حال کے زائل ہونے پر اس نماز کو دہرا لینا واجب ہے۔^①

مذکورہ بالا حدیث ان پانچوں اقوال میں سے امام احمد، مزنی، سخون اور ابن منذر رضی اللہ عنہم کے قول کی موید ہے۔ دور حاضر کے معروف عالم و مفتی شیخ ابن باز کی نگرانی میں فتح الباری کی جو تحقیق ہوئی ہے، اس میں مذکورہ مقام پر ایک تعلیق یا حاشیہ ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مفتی صاحب موصوف اور ان کی نگرانی میں کام کرنے والے کبار علمائے تحقیق کا مسلک بھی یہی ہے کہ ان حالات میں ادا کی گئی نماز کو دہرانا واجب نہیں، کیوں کہ نبی اکرم ﷺ نے اس کا حکم نہیں فرمایا۔^②

بعض مجبوری کے حالات میں ادا شدہ نماز کو وہ مجبوری زائل ہونے کے بعد دوبارہ ادا نہ کرنے یا بالفاظ دیگر اعادہ یا دہرانے کے واجب نہ ہونے کی تائید تو اس حدیث سے بھی ہوتی ہے، جو

① المجموع شرح المہذب (۲/۳۰۶) فتح الباری (۱/۴۴۰) نیل الأوطار (۱/۲۶۷-۲۶۸)

② حاشیة فتح الباری (۱/۴۴۰)

سنن ابی داؤد، نسائی، دارقطنی، دارمی اور مستدرک حاکم میں ایک مختلف فیہ سند سے، مگر صحیح ابن السکن میں صحیح اور موصول سند سے مروی ہے، جس میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ دو آدمی سفر پر نکلے۔ کہیں انھیں نماز کا وقت ہو گیا، لیکن ان کے پاس پانی نہیں تھا، لہذا ان دونوں نے تیمم کر کے نماز ادا کی۔ پھر انھیں پانی مل گیا تو ان میں سے ایک نے وضو کر کے وہ نماز دہرائی، مگر دوسرے نے نہیں دہرائی۔ جب انھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر سارا واقعہ سنایا تو نماز دہرانے والے سے مخاطب ہو کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَصَبْتَ السُّنَّةَ وَأَجْرُكَ أَتَكَ صَلَاتُكَ» ”تم نے سنت کو پالیا اور تمہاری نماز ہو گئی۔“

گویا ان الفاظ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز نہ دہرانے والے کے فعل کو سنت کے مطابق قرار دیا اور دوسرے کے اجتہاد کو غیر صحیح قرار دیا۔ تاہم اس سے مخاطب ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَكَ الْأَجْرُ مَرَّتَيْنِ»^(۱) ”تمہیں دوہرا ثواب ہوگا۔“

یعنی تیمم سے ادا کرنے کا بھی اور وضو سے ادا کرنے کا بھی۔ کیوں کہ جب وہ دونوں ہی صحیح تھیں تو دونوں ہی کا ثواب بھی ملے گا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کسی کے عمل کو ضائع نہیں کرتا اور اس سے بھی یہ معلوم ہوا کہ اجتہاد میں خطا ہو جانا اس عمل پر اجر حاصل ہونے کے منافی نہیں، بلکہ اجتہاد میں خطا پر بھی اجر ملتا ہے۔ جیسا کہ صحیحین، سنن اربعہ اور مسند احمد میں معروف حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«إِذَا حَكَمَ الْحَاكِمُ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ أَصَابَ فَلَهُ أَجْرَانِ، وَإِذَا حَكَمَ الْحَاكِمُ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ أَخْطَأَ فَلَهُ أَجْرٌ»^(۲)

”جب کوئی شخص فیصلہ کرے اور اجتہاد سے کام لے اور اپنے اجتہاد میں صحیح حکم کو پالے تو اسے دو اجر ملتے ہیں اور اگر فیصلہ کرنے والے نے اجتہاد کیا اور خطا کر گیا تو اسے (اجتہاد کا) ایک اجر ملے گا۔“

کسی فعل پر اجر کے ثابت ہونے سے اس فعل کا صحیح ہونا بھی لازم نہیں آتا، جیسا کہ اس ذکر

(۱) مشکاة المصابیح تحقیق الألبانی (۱/۱۶۶) تلخیص الحبیبر (۱/۱۵۵-۱۵۶)

(۲) صحیح البخاری مع الفتح (۱۳/۳۱۸) مختصر صحیح مسلم للمنذری (۱۰۵۶) صحیح سنن أبی داؤد، رقم الحدیث (۳۵۲) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۱۰۶۸) صحیح سنن النسائی (۳/۱۰۸۹) رقم الحدیث (۴۹۷۴) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۲۳۱۴) مسند أحمد (۴/۱۹۸)

کردہ حدیث سے معلوم ہو رہا ہے کہ آپ ﷺ نے غلطی کرنے والے کو بھی ثواب ملنا بتایا ہے۔ یہی معاملہ اس سے پہلی حدیث والے واقعہ کا بھی ہے کہ نماز کو دہرانے والے نے اجتہاد میں خطا کی، اس کے باوجود اس کا اجر ثابت ہو گیا۔ جیسا کہ «لَكَ الْأَجْرُ مَرَّتَيْنِ» کے الفاظ سے پتا چلتا ہے۔ یہ حدیث پہلے بھی ذکر کی جا چکی ہے، مگر وہاں موضوع کچھ اور تھا اور اُس میں مذکور صورتِ حال ہماری اس موجودہ زیرِ بحث صورتِ حال سے بھی قدرے مختلف ہے۔ اس لیے ہم نے اسے استدلال کی بنیاد نہیں بنایا۔ محض تائید کے لیے ذکر کیا ہے کہ اعادہ یا نماز کو دہرانے کا واجب نہ ہونا تو اس میں بھی مذکور ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان کے پاس پانی نہیں تھا تو انھوں نے تیمم کر کے نماز پڑھ لی اور یہاں پانی ہے نہ مٹی۔ لہذا کسی نے بلا وضو و بلا تیمم نماز ادا کر لی۔ نہ وہاں دہرانا واجب قرار دیا گیا ہے اور نہ یہاں ہی واجب ہے، لہذا عدم وجوب کا قول ہی راجح ہوا۔

طریقہ تیمم:

تیمم کے متعلق کئی مسائل تو ذکر ہو گئے ہیں۔ اب آئیے مسنون طریقہ تیمم کی طرف، تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ تیمم کا طریقہ بھی قرآن کریم کی مذکورہ دونوں آیتوں اور کئی احادیث میں گزرا ہے، مگر ان مواقع پر ان کے ذکر سے مراد طریقہ تیمم کا تذکرہ نہیں تھا، بلکہ دوسرے احکام و مسائل تھے۔ مثلاً ان قرآنی آیات کو وہاں ہم نے تیمم کی مشروعیت اور اس کے جواز کو ثابت کرنے کے لیے ذکر کیا تھا، پھر صحیحین اور سنن اربعہ کے حوالے سے حضرت عمار اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما والی حدیث، حیض و جنابت کی حالت میں تیمم کے جواز کی دلیل کے طور پر پیش کی تھی۔ اس کے بعد نبی اکرم ﷺ نے تیمم کر کے سلام کا جواب دینے والی صحیحین، سنن نسائی اور دارقطنی کی حدیث، مقیم کے لیے تیمم کے جواز پر استدلال کرنے کے لیے ذکر کی تھی اور بخاری تعلیقاً و شافعی موصولاً والا حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا اثر بھی اسی سلسلے ہی میں ذکر کیا گیا تھا۔ ان سب آیات و احادیث اور اثر میں تیمم کا طریقہ بھی مذکور ہے، جسے اب ہم طریقہ تیمم کے طور پر بطور خاص قدرے تفصیل سے ذکر کرنا چاہتے ہیں۔

طریقہ تیمم کے سلسلے میں قرآنی آیات اور احادیثِ رسول ﷺ میں واضح ہدایات موجود ہیں، چونکہ ہم وہ آیات و احادیث پورے حوالوں کے ساتھ ذکر کر چکے ہیں، لہذا اب ہم ان کے حوالے تو ذکر کر دیتے ہیں۔ البتہ ان کی مکمل نصوص ذکر نہیں کریں گے، بلکہ صرف طریقہ تیمم سے متعلق الفاظ

کے ذکر ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ چنانچہ سورۃ النساء (آیت: ۴۳) میں ارشادِ الہی ہے:

﴿فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا بِوُجُوْهِكُمْ وَ أَيْدِيكُمْ﴾

”اور تمہیں پانی نہ ملے تو پاک مٹی لو اور منہ اور ہاتھوں کا مسح (کر کے تیمم) کر لو۔“

جب کہ سورۃ المائدہ (آیت: ۶) میں ایک لفظ کے بڑھ جانے سے بات اور بھی قریب الفہم

ہو گئی ہے۔ ارشادِ الہی ہے:

﴿فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا بِوُجُوْهِكُمْ وَ أَيْدِيكُمْ﴾

﴿مِنْهُ﴾

”اور تمہیں پانی نہ مل سکے تو پاک مٹی لو اور اُس سے منہ اور ہاتھوں کا مسح (تیمم) کر لو۔“

اس دوسری آیت کے الفاظ میں ﴿مِنْهُ﴾ کے ایک لفظ نے بات کھول دی ہے کہ مٹی کے

ساتھ منہ اور ہاتھوں کا مسح کرنا ہے۔ قرآن کریم کے ان دونوں مقامات پر تیمم کا طریقہ تو ان الفاظ

میں پورا آ گیا ہے۔ معمولی سی دریافت طلب بات یہ رہ جاتی ہے کہ مٹی سے منہ اور ہاتھوں کا مسح کس

طرح کیا جائے؟ تو اس کا تفصیلی جواب نبی اکرم ﷺ کے ارشادات میں آ گیا ہے، چنانچہ صحیح

بخاری و مسلم اور سنن اربعہ والی حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں نبی اکرم ﷺ کے طریقہ تیمم کو

بیان کرتے ہوئے وہ بتاتے ہیں:

« فَضْرَبَ النَّبِيُّ ﷺ بِكَفِّهِ الْأَرْضَ، ثُمَّ نَفَخَ فِيهِمَا، ثُمَّ مَسَحَ بِهِمَا وَجْهَهُ
وَكَفَّيَهُ»^①

”نبی اکرم ﷺ نے اپنی دونوں ہتھیلیوں کو زمین پر مارا، پھر ان دونوں ہتھیلیوں میں

پھونک ماری، پھر ان دونوں ہتھیلیوں کو (پہلے) اپنے منہ پر اور (پھر) اپنے دونوں ہاتھوں

پر باہم پھیر لیا۔“

صحیحین اور سنن اربعہ کی اس حدیث میں تیمم کا مکمل طریقہ مذکور ہے۔ اسی طرح صحیح بخاری،

① صحیح البخاری مع الفتح (۳۳۸) صحیح مسلم مع شرح النووي (۴/ ۶۲) صحیح سنن أبي داود،

رقم الحديث (۳۱۳) صحیح سنن النسائي، رقم الحديث (۳۰۸) صحیح سنن الترمذي، رقم الحديث

(۱۲۵) مختصر سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۵۹۹) المشكاة مع المرعاة (۱/ ۱۸۷- ۱۸۹) و صحیح

الجامع، رقم الحديث (۲۳۶۷)

مسلم، سنن نسائی اور دارقطنی کی حضرت ابو جہم رضی اللہ عنہ والی حدیث ہے، جو مسلم شریف میں تعلیقاً اور دیگر کتب میں موصولاً مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بے وضو تھے اور کسی کے سلام کا جواب دینے کے لیے تیمم کیا:

«حَتَّىٰ أَقْبَلَ عَلَى الْجِدَارِ» "آپ صلی اللہ علیہ وسلم دیوار کی طرف متوجہ ہوئے۔"

سنن دارقطنی میں مروی ہے:

«حَتَّىٰ وَضَعَ يَدَهُ عَلَى الْجِدَارِ فَمَسَحَ بِوَجْهِهِ وَيَدَيْهِ»^①

"آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ دیوار پر رکھے۔ پھر ان کو چہرہ مبارک پر اور باہم دونوں ہاتھوں پر مارا۔"

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً مروی ان دو احادیث کے علاوہ ایک صحابی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا واقعہ بھی صحیح بخاری میں تعلیقاً مروی ہے، جسے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے موصولاً بیان کیا ہے:

«تَيَمَّمَ فَمَسَحَ وَجْهَهُ وَيَدَيْهِ، وَصَلَّى الْعَصْرَ»^②

"انہوں نے تیمم کیا تو اپنے منہ اور دونوں ہاتھوں کا مسح کیا اور عصر کی نماز پڑھی۔"

اس اثر اور مذکورہ احادیث میں تیمم کا طریقہ انتہائی واضح انداز سے آگیا ہے۔

پھونک مارنا:

ان دونوں حدیثوں اور اثر صحابی میں سے صرف ایک حدیث میں زمین پر ہاتھ مارنے کے بعد ان میں پھونک مارنے کا بھی ذکر ہوا ہے۔ شارحین حدیث نے لکھا ہے کہ شاید آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں کو کوئی چیز لگ گئی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدشہ محسوس ہوا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ اقدس پر نہ لگ جائے۔ لہذا پھونک مار کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس چیز کو گرا دیا، یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں کو مٹی کی مقدار کچھ زیادہ لگ گئی تھی، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں ہاتھوں کو اکٹھے کر کے ان میں ہلکی سی پھونک ماری، تاکہ مٹی کی مقدار میں تخفیف ہو جائے یا پھر یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پھونک

① صحیح البخاری مع الفتح (۱/ ۴۴۱) صحیح مسلم مع شرح النووي (۴/ ۶۳، ۶۴) صحیح سنن أبي داود، رقم الحديث (۳۱۹) صحیح سنن النسائی، رقم الحديث (۳۰۰) المشكاة مع المراجعة (۱/ ۵۹۷)

التلخيص الحبير (۱/ ۱۴۹)

② صحیح البخاری مع فتح الباری (۱/ ۴۴۱) و التلخيص (۱/ ۱۴۵)

کی مشروعیت کو بیان کرنے کے لیے ایسا کیا تھا۔^①

ویسے بھی تیمم میں مٹی کے ساتھ منہ اور ہاتھوں کو خوب خاک آلود کرنا مقصود ہے نہ تمام اعضاء وضو کا استیعاب مطلوب ہوتا ہے کہ مٹی کا یہ مسح تمام اعضاء وضو پر کیا جائے، بلکہ یہ تو ایک علامت ہے، جسے وضو کے قائم مقام مقرر کیا گیا ہے۔ شارح بخاری لکھتے ہیں کہ اس پھونک مارنے سے مٹی کی تخفیف کے استحباب پر استدلال کیا گیا ہے اور ساتھ ہی یہ اس بات کی دلیل بھی ہے کہ جب ایک مرتبہ زمین پر ہاتھ مارنے سے ان پر لگی مٹی کو بھی پھونک مار کر آپ ﷺ نے کم کر دیا تھا تو معلوم ہوا کہ تیمم کرتے وقت مختلف اعضاء کے لیے بار بار ہاتھوں کو زمین پر مارنا مستحب نہیں ہے۔^②

کیوں کہ بار بار زمین پر ہاتھ مارنا زیادہ مٹی لانے اور عدم تخفیف کو مستلزم ہے، لہذا تکرار کا استحباب ساقط ہو گیا۔

زمین پر ہاتھ مارنے میں تکرار:

صرف ایک مرتبہ زمین پر ہاتھ مارنا جمہور اہل علم کا مسلک ہے۔^③ اس مسلک والوں کے استدلال کو دوسری کئی صریح اور صحیح احادیث سے بھی تقویت ملتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے تیمم کے لیے اپنے ہاتھ کو صرف ایک ہی مرتبہ زمین پر مارا تھا، بار بار نہیں، مثلاً تیمم کے طریقے کے بارے میں جو احادیث صحیح بخاری اور دیگر کتب کے حوالے سے گزری ہیں، ان سب سے بھی بظاہر ہاتھوں کو زمین پر ایک مرتبہ مارنے ہی کا ثبوت ملتا ہے، جب کہ صحیح بخاری و مسلم، سنن نسائی، صحیح ابی عوانہ، سنن دارقطنی، بیہقی اور مسند احمد میں حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں صحیح مسلم کے سیاق کی رو سے ارشاد نبوی ﷺ کے الفاظ یوں ہیں:

«إِنَّمَا كَانَ يَكْفِيكَ أَنْ تَقُولَ بِيَدَيْكَ هَكَذَا، ثُمَّ ضَرَبَ بِيَدَيْهِ الْأَرْضَ ضَرْبَةً وَاحِدَةً»^④

① فتح الباری (۱/ ۴۴۳- ۴۴۴) المرعاة (۱/ ۵۸۸)

② فتح الباری (۱/ ۴۴۴)

③ المرعاة (۱/ ۵۸۸)

④ صحیح البخاری مع الفتح، رقم الحدیث (۳۴۷) صحیح سنن أبی داود، رقم الحدیث (۳۱۸) صحیح مسلم مع شرح النووي (۲/ ۴/ ۶۱) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۳۰۱، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۸) و الإرواء (۱/ ۱۸۴)

”تمہارے لیے اپنے دونوں ہاتھوں سے یوں کر لینا ہی کافی تھا، پھر آپ ﷺ نے صرف ایک ہی مرتبہ اپنے دونوں ہاتھوں کو زمین پر مارا۔“

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے ”المنہاج شرح صحیح مسلم بن الحجاج“ میں لکھتے ہیں کہ یہ حدیث ان لوگوں کے لیے دلیل ہے، جو تیمم میں منہ اور ہاتھوں کے لیے صرف ایک ہی مرتبہ زمین پر ہاتھ مارنے کو کافی قرار دیتے ہیں۔ آگے لکھتے ہیں:

”دوسرے اس کا یہ جواب دے سکتے ہیں کہ یہاں صرف ہاتھ مارنے کی صورت یا طریقہ سکھلانا مراد ہے، پورے تیمم کا طریقہ بیان کرنا نہیں۔“^(۱)

امام صاحب کا یہ جواب نقل کر کے حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان کے اس جواب پر تعاقب کیا گیا ہے (کہ وہ صحیح نہیں، کیوں کہ) اس سارے واقعے کا سیاق اور تفصیل اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ یہاں مراد پورے تیمم کا طریقہ سکھلانا ہی ہے (نہ کہ صرف ہاتھ مارنے کا طریقہ سکھلانا) کیوں کہ آپ ﷺ کے ارشاد: «إِنَّمَا كَانَ يَكْفِيكَ» ”تمہارے لیے یہی کافی ہے۔“ کے الفاظ سے بظاہر یہی معلوم ہو رہا ہے (کہ یہاں تیمم کا مکمل طریقہ سکھلانا ہی مراد ہے)^(۲)

اسی طرح سنن ابو داؤد، ترمذی، دارقطنی، بیہقی، مسند احمد، سنن دارقطنی اور معانی الآثار طحاوی میں صحیح سند سے مروی ایک حدیث ہے، جس میں حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«الْتَيْمُّ ضَرْبَةٌ لِلْوَجْهِ وَالْكَفَيْنِ»^(۳)

”تیمم کے لیے منہ اور ہاتھوں کے لیے صرف ایک ہی مرتبہ ہاتھوں کو زمین پر مارنا ہے۔“

اس حدیث میں بھی صرف ایک ہی مرتبہ ہاتھوں کو زمین پر مارنے کا حکم ہے۔

دو مرتبہ زمین پر ہاتھ مارنا اور اس کے دلائل کا جائزہ:

بعض روایات ایسی بھی ملتی ہیں، جن میں زمین پر دو مرتبہ ہاتھ مارنے کا ذکر ہے۔ ایک مرتبہ

(۱) شرح صحیح مسلم للنووی (۶۱/۴/۲)

(۲) فتح الباری (۱/۴۴۵-۴۴۶)

(۳) صحیح سنن أبي داؤد، رقم الحدیث (۳۱۸) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۱۲۵) إرواء الغلیل

(۱/۱۷۵) و صحیح الجامع، رقم الحدیث (۳۰۲۰)

منہ کے لیے اور دوسری مرتبہ دونوں ہاتھوں کے لیے، مگر وہ روایات متکلم فیہ اور ضعیف قرار دی گئی ہیں، مثلاً ایک روایت تو حضرت عمار رضی اللہ عنہ ہی سے سنن ابی داؤد و ابن ماجہ میں ہے، جس میں مذکور ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے نماز فجر کے لیے تیمم کیا تو انھوں نے اپنے ہاتھوں کو زمین پر مارا اور اپنے چہروں کا ایک مرتبہ مسح کیا۔ پھر دوبارہ اپنے ہاتھوں کو زمین پر مارا:

﴿فَمَسَحُوا بِأَيْدِيهِمْ كُلَّهَا إِلَى الْمَنَاكِبِ وَالْبَاطِ مِنْ بَطُونِ أَيْدِيهِمْ﴾^①

”پھر اپنے ہاتھوں کا اپنی ہتھیلیوں سے کندھوں اور بغلوں تک مسح کیا۔“

مختصر السنن میں امام منذری رضی اللہ عنہ نے لکھا ہے کہ یہ حدیث منقطع ہے، کیوں کہ اس کی سند کے ایک راوی عبد اللہ نے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا۔ البتہ سنن نسائی و ابن ماجہ میں ایک روایت انھیں عبد اللہ سے ان کے والد کے حوالے سے ہے، یعنی وہ موصول ہے اور مختصر بھی۔^②

وہ صحیح مگر مختصر اس قدر ہے کہ اس میں حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے الفاظ صرف اتنے ہیں:

﴿تَيَمَّمْنَا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ بِالْتُّرَابِ فَمَسَحْنَا بِوُجُوهِنَا وَأَيْدِينَا إِلَى الْمَنَاكِبِ﴾^③

”ہم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں مٹی سے تیمم کیا اور اپنے چہروں اور ہاتھوں کا کندھوں تک مسح کیا۔“

گویا اس حدیث میں دو مرتبہ زمین پر ہاتھ مارنے کا ذکر ہی نہیں ہے۔ البتہ شیخ البانی نے تحقیق مشکات میں ذکر کیا ہے کہ ابو داؤد نے اس روایت کو موصولاً بھی بیان کیا ہے، پھر اس کی سند کو انھوں نے صحیح کہا ہے۔^④

اس موصول روایت سے ان کی مراد غالباً وہ روایت ہے، جسے عبید اللہ نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے، مگر اس کی تفصیل میں دو مرتبہ ہاتھ زمین پر مارنے کی روایت ہے۔

① مختصر السنن للمندري (١/ ٩٩ / ٢٠٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥٧) و المشكاة مع المرعاة (١/ ٥٩٧-٥٩٨) شیخ البانی نے اس حدیث کو صحیح سنن ابی داؤد، رقم الحديث (٣١٠) میں ذکر کیا اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔

② مختصر السنن للمندري (١/ ٢٠٠) و سنن ابی داؤد مع العون (١/ ٥٠٩-١٥٠)

③ صحیح سنن ابی داؤد، رقم الحديث (٣١١) سنن النسائي مع التعليقات السلفية (١/ ٣٧) صحیح سنن

النسائي، رقم الحديث (٣٠٤) و اللفظ له، سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥٦٦)

④ تحقیق المشكاة (١/ ١٦٧)

پر مارنے کا ذکر نہیں ہے۔ امام ابو داؤد رضی اللہ عنہ نے اس روایت کے بعد اپنی سنن میں ابن شہاب کا قول بھی ذکر کیا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں:

«وَلَا يَعْتَبَرُ بِهَذَا النَّاسُ»^① ”اس روایت کو لوگ قابل اعتبار نہیں سمجھتے۔“

پھر آگے کچھ تفصیل ذکر کی ہے کہ ابن اسحاق، یونس اور معمر نے اس روایت کو بیان کیا تو دو دفعہ زمین پر ہاتھ مارنے کا تذکرہ کیا، جب کہ صالح بن کیسان، لیث بن سعد، عمرو بن دینار، مالک بن ابی زب اور دیگر روایت نے اس کو بیان کرتے وقت دو دفعہ کا ذکر نہیں کیا اور ابن ابی عیینہ سے اضطراب کے واقع ہونے کا ذکر بھی کیا ہے۔^②

علامہ ابن عبد البر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اکثر آثار یعنی احادیث میں صرف ایک ہی مرتبہ زمین پر ہاتھ مارنے کا ذکر ہے اور جو بعض روایات دو مرتبہ ہاتھ مارنے والی مروی ہیں، وہ سب مضطرب ہیں۔

دو مرتبہ زمین پر ہاتھ مارنے کا ذکر ایک دوسری روایت میں بھی ہوا ہے، جو سنن دارقطنی، بیہقی اور مستدرک حاکم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے:

«الْتَيْمُّ ضَرْبَتَانِ، ضَرْبَةٌ لِلْوَجْهِ، وَضَرْبَةٌ لِلْيَدَيْنِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ»^③

”تیمم دو ضربیں ہے۔ ایک ضرب منہ کے لیے اور دوسری کہنیوں تک دونوں ہاتھوں کے لیے ہے۔“

امام دارقطنی فرماتے ہیں کہ یحییٰ القطان اور یشتم نے اس روایت کو موقوف قرار دیا ہے، یعنی یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول و فعل نہیں ہے، بلکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما پر موقوف ہے، اگرچہ یہ روایت موقوفاً بیان نہیں کی گئی۔

ایک دوسری روایت جو امام دارقطنی نے سنن میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے موقوف بیان کی ہے، اس کی سند میں علی بن ظبیان راوی ہے، جسے قطان، ابن معین اور دیگر کثیر محدثین نے ضعیف قرار

① سنن أبي داود مع العون (٥١٢/١)

② ويكيبيديا: سنن أبي داود مع عون المعبود (٥١٢/١ - ٥١٣)

③ سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٣٠) تلخيص الحبير (١/١ / ١٥١) و ضعيف الجامع، رقم الحديث

(٢٥١٨) و السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٤٢٧)

دیا ہے۔ سنن دارقطنی ہی میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ایک روایت مرفوعاً بھی ہے، جس میں دو ضربوں کا ذکر ہے، لیکن اس میں ایک راوی سلیمان بن ارقم ہے، جسے متروک کہا گیا ہے۔ امام بیہقی کہتے ہیں کہ اسے معمر اور بعض دیگر روایات نے امام زہری سے موقوفاً بیان ہے۔ ایک حدیث سنن ابی داؤد میں بھی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، جس میں دو ضربوں کا ذکر آیا ہے، لیکن اس روایت کا دار و مدار ایک راوی محمد بن ثابت پر ہے، جسے ابن معین، ابو حاتم، احمد، بخاری اور خطابی رحمہم اللہ جیسے کبار محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ سنن دارقطنی اور مستدرک حاکم میں ایک روایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بھی مرفوعاً مروی ہے، جس میں مذکور ہے:

«الْتَيْمُّ ضَرْبَةٌ لِلْوَجْهِ، وَضَرْبَةٌ لِلدَّرَاعَيْنِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ»

”تیمم میں ایک ضرب منہ کے لیے اور ایک ضرب کہنیوں تک دونوں ہاتھوں کے لیے ہے۔“

اس روایت کو امام ابن الجوزی نے ضعیف کہا ہے، کیوں کہ اس کی سند میں ایک راوی عثمان ہے، جو متکلم فیہ ہے، لیکن ان کا یہ قول صحیح نہیں، کیوں کہ ابن دقیق العید کے بقول اس راوی پر کسی نے کلام نہیں کیا۔ البتہ صاحب ”التلخیص الحبیر“ نے نقل کیا ہے کہ ابن دقیق کے بقول یہ روایت شاذ ہے۔ سنن دارقطنی کے حاشیے میں امام دارقطنی کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ روایت موقوف ہے۔ اس حدیث جابر رضی اللہ عنہ کو امام حاکم اور ذہبی نے صحیح قرار دیا ہے، جب کہ تلخیص کے حاشیے میں علامہ بیانی نے بھی اس کی سند کے صحیح ہونے ہی کو ترجیح دی ہے۔ اس طرح یہ محدثین میں صحت و ضعف کے اعتبار سے مختلف فیہ روایت ہے۔

سنن دارقطنی اور معجم طبرانی میں ایک حدیث حضرت اسلم رضی اللہ عنہ سے بھی مرفوعاً مروی ہے، جس میں دو ضربوں کا تذکرہ ہے، لیکن اس کی سند کے ایک راوی ربیع بن بدر کو کبار محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ طبرانی میں ایک روایت حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے، جس کی سند کو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ”التلخیص الحبیر“ میں ضعیف لکھا ہے۔ ایک روایت أم المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی مسند بزار اور الکامل لابن عدی میں مرفوعاً مروی ہے، جس میں ایک راوی حریش بن خریث متفرد ہیں، امام ابو حاتم نے کہا ہے کہ یہ حدیث منکر ہے اور حریش کی بیان کردہ حدیث قابل حجت نہیں ہوتی۔ مسند بزار میں حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے ایک روایت (سابقہ

روایات کے علاوہ) بھی مروی ہے، جس میں دو ضربوں کا ثبوت ہے، اس کی سند کو غالباً حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کرتے ہوئے علامہ یمانی نے ”التلخیص الحبیر“ کے حاشیے میں حسن درجے کی قرار دیا ہے، لیکن دوسرا کلام ذکر نہیں کیا۔^(۱)

کیا یہ متعدد روایات دو مرتبہ زمین پر ہاتھ مارنے کی دلیل بن سکتی ہیں؟ جبکہ ان کی اسنادی حیثیت آپ کے سامنے ہے اور ایک مرتبہ پر دلالت کرنے والی احادیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی ہیں۔
فریقین میں محاکمہ:

ہم نے وہ احادیث ذکر کر دی ہیں، جو تیمم میں منہ اور ہاتھوں کا مسح کرنے کے لیے زمین پر ایک مرتبہ دونوں ہاتھ مارنے پر دلالت کرتی ہیں، جو صحیح بخاری و مسلم، سنن ابی داؤد، ترمذی، نسائی، دارمی، دارقطنی، بیہقی، مسند احمد اور دیگر کتب میں مروی ہیں۔ پھر ہم نے دو مرتبہ زمین پر ہاتھ مارنے والی روایات، یعنی ایک مرتبہ منہ کے لیے اور دوسری مرتبہ ہاتھوں کے لیے، ذکر کی ہیں اور ان کی اسنادی حیثیت کے بارے میں کبار محدثین کی نقد و جرح بھی ذکر کی ہے، جس سے معمولی غور و فکر کرنے والا بھی اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ ایک مرتبہ والی احادیث ہی کا پلہ بھاری ہے، وہی زیادہ صحیح ہیں اور وہی طریقہ صحیح تر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے محدثین کو اس کا اعتراف کرتے ہی بنی ہے، حتیٰ کہ امام خطابی اور امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ کو تو یہ کہنا پڑا کہ اہل علم کی ایک جماعت کا مسلک یہ ہے کہ تیمم میں صرف ایک ضرب منہ اور ہاتھوں سب کے لیے ہے۔ یہی امام عطا بن ابی رباح، مکحول، اوزاعی، احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ رحمۃ اللہ علیہ عام اہل حدیث کا مسلک ہے۔ آگے فرماتے ہیں:

”وَهَذَا الْمَذْهَبُ أَصَحُّ فِي الرَّوَايَةِ“

”یہی مذہب روایت کے اعتبار سے صحیح تر ہے۔“

پھر دو ضربوں والے مسلک کے بارے میں لکھا ہے:

”أَشْبَهُ بِالْأَصُولِ، وَأَصَحُّ فِي الْقِيَاسِ“^(۲)

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیں: سنن الدارقطنی مع التعلیق المغنی (۱/ ۱۷۹-۱۸۳) التلخیص مع الحاشیة

(۱/ ۱۵۱-۱۵۳) تحفة الأحوذی (۱/ ۴۴۲) و إرواء الغلیل (۱/ ۱۸۶)

(۲) معالم السنن للخطابی (۱/ ۳۰۲) شرح السنة للبعوی (۱/ ۱۳-۱۴-۱۵)

”اصول کے زیادہ مشابہ اور قیاس کی رو سے صحیح تر ہے۔“
لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ جب صحیحین اور دیگر کتب میں ایک حدیث صحیح ثابت ہو جائے تو پھر اس کے بعد قیاس کی بھول بھلیوں میں کھونے کی ضرورت ہی کیا ہے؟

علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے ”زاد المعاد“ میں لکھا ہے:

”وَلَمْ يَصِحَّ عَنْهُ أَنَّهُ (ﷺ) تَيَمَّمَ بِضَرْبَتَيْنِ وَلَا إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ“

”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیمم کے لیے ہاتھوں

کو دو مرتبہ زمین پر مارا ہو۔ اسی طرح یہ بھی ثابت نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیمم کے لیے

ہاتھوں کا مسح کہنیوں تک کیا ہو۔“

یہیں یہ بات بھی ذکر کر دیں کہ تلخیص کے حاشیے میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے جو لکھا ہے کہ احادیث دونوں طرف موجود ہیں، لہذا اگرچہ ایک طرف صحیحین کی احادیث ہیں اور دوسری طرف سنن کی، لیکن دوسروں والے مسلک نیز ہاتھوں کو کہنیوں تک مسح کرنے والے مسلک میں احتیاط زیادہ ہے، کیوں کہ اس میں صحیحین والا عمل آجاتا ہے کہ ایک ضرب بھی آگئی اور کہنیوں تک ہاتھ دھونے میں کلائی کے جوڑ (گٹے) تک ہاتھ دھونا بھی آجاتا ہے۔^①

تو موصوف کا یہ انداز خالص قیاسی نوعیت کا ہے۔ اس کے بجائے یوں کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے کہ احادیث تو دونوں طرف ہیں، مگر ایک طرف صحاح و سنن اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع احادیث ہیں اور دوسری طرف ضعاف اور مرفوع و موقوف ہونے میں مختلف فیہ بلکہ موقوف روایات ہیں۔ لہذا صحاح پر عمل کر لیا جائے، کیوں کہ اگر دوسری حسن درجے کی احادیث بلکہ بعض صحیح درجے والی ہوتیں، تب بھی اولیت و اصحیت اسی عمل کو دی جاتی، جو صحیحین سے ثابت ہوتا ہے، جب کہ یہاں تو معاملہ یہ ہے کہ دوسروں کی تائید جن احادیث سے ہوتی ہے، وہ سب متکلم فیہ ہیں، حتیٰ کہ مسند بزار کی ایک روایت جو حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جسے حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ”الدرایۃ“ میں سند کے اعتبار سے حسن درجے کی قرار دیا ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ اس روایت کو امام ابو داؤد نے بھی روایت کیا ہے، جس میں ہاتھوں کو کندھوں تک دھونے کا تذکرہ ہے، امام ابو داؤد نے اس کی

① تحفة الأحمدي (۱/ ۴۵۰)

علت اور اس میں پایا جانے والا اختلاف بھی ذکر کیا ہے۔ آگے حافظ عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی دو ضربوں پر دلالت کرنے والی روایت نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ اس پر کلام آگے چل کر آئے گا، پھر کہتے ہیں:

”دو ضربوں والی روایت کے مخالف وہ احادیث ہیں، جو حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے صحیحین میں ثابت ہیں۔“ پھر آگے وہ احادیث بھی نقل کی ہیں۔

علامہ عبدالرحمن مبارکپوری ”تحفة الأحوذی شرح جامع الترمذی“ میں لکھتے ہیں کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے اس کلام سے معلوم ہوا کہ مسند بزار کی حضرت عمار رضی اللہ عنہ والی روایت قابلِ حجت اور لائقِ استدلال نہیں ہے، اگرچہ اس کی سند حسن درجے کی ہے۔ جب کہ یہ طے ہے کہ کسی حدیث کی سند کا حسن یا صحیح ہونا، اس حدیث کے متن کے بھی حسن یا صحیح ہونے کو لازم نہیں ہوتا۔ آگے لکھتے ہیں کہ ”آثار السنن“ میں (مولانا شوق نیوی) نے مسند بزار والی حدیث عمار رضی اللہ عنہ سے استدلال کیا ہے اور ”الدراية“ سے حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول کہ یہ حسن سند سے مروی ہے، نقل کیا ہے، مگر انہی کا بقیہ کلام نقل نہیں کیا، جس سے اس کا ضعیف ہونا ثابت ہوتا ہے۔ ایسے ہی ”العرف الشذی“ میں (علامہ انور شاہ کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ) نے بھی کیا ہے:

”وَلَيْسَ هَذَا مِنْ شَأْنِ أَهْلِ الْعِلْمِ“^① ”جب کہ یہ اہل علم کی شان نہیں ہے۔“

یہاں ایک بات یہ بھی ذکر کر دیں کہ موطا امام مالک کی فارسی شرح ”مصنفی“ میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے اس اثر کے تحت جس میں کہنیوں تک ہاتھ دھونے اور دو مرتبہ زمین پر ہاتھ مارنے کا ذکر ہے، لکھا ہے کہ اس اثر اور صرف کلائی کے جوڑ تک ہاتھ دھونے اور صرف ایک ہی مرتبہ زمین پر ہاتھ مارنے والی حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں باہم کوئی تعارض نہیں، بلکہ فعل ابن عمر رضی اللہ عنہما میں کمال تیمم ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل میں تیمم کی کم از کم مقدار مذکور ہے، جیسا کہ لفظ ”يَكْفِيكَ“ سے معلوم ہوتا ہے، یہ بھی اسی طرح ہے، جس طرح وضو میں اصل تو تمام اعضا کو ایک ایک مرتبہ دھونا ہے اور کمال وضوتین تین مرتبہ دھونا ہے۔

صاحب ”تحفة الأحوذی“ موصوف کا یہ اقتباس نقل کر کے لکھتے ہیں:

① تحفة الأحوذی ۱/ ۴۴۳- ۴۴۴- ۴۵

”اگر دو ضربوں اور کہنیوں تک مسح کرنے والی کوئی حدیث صحیح اور مرفوع ہوتی تو حضرت شاہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی بات بھی درست ہوتی، جب کہ یہاں تو معاملہ ہی بالکل الٹ ہے کہ ایک ضرب اور صرف ہاتھوں کے مسح والی احادیث متفق علیہ ہیں اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی یہی فتویٰ دیا کرتے تھے اور راوی حدیث اس حدیث کی مراد کو سب سے بہتر جانتے ہیں، خصوصاً جب کہ وہ مجتہد بھی ہوں۔“^(۱)

لہذا مذکورہ بات کیسے صحیح ہو سکتی ہے؟ علاوہ ازیں وہ اثر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما پر موقوف ہے اور صرف ان کا فعل تو کمال تیمم کو ثابت نہیں کر سکتا۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ امام ابن المنذر رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ وہ وضو میں پاؤں کو سات سات مرتبہ دھویا کرتے تھے، جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ”فتح الباری“ میں بھی بیان کیا ہے تو کیا یہاں بھی یہ کہنا صحیح ہوگا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا پاؤں کو سات سات مرتبہ دھونا کمال وضو اور کمال غسل الرجلین ہے! نہیں اور قطعاً نہیں۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تو اپنی صحیح میں ایک باب ہی یوں قائم کیا ہے:

”بَابُ التَّيْمُمِ ضَرْبَةً“^(۲) ”تیمم ایک ہی ضرب ہے۔“

یہی اولیٰ اور افضل ہے۔

ہاتھوں کا مسح کہاں تک؟

تیمم کے احکام و مسائل میں سے اس مسئلے میں بھی اہل علم کی آرا مختلف ہیں کہ ہاتھوں کا باہم مسح کہاں تک کیا جائے؟ ہاتھ اور کلائی کے درمیان والے جوڑ (گٹے) تک یا کہنیوں تک؟ یہ اختلاف رائے بھی تقریباً مسح کے لیے ایک ضرب یا دو ضربوں والے اختلاف سے ملتا جلتا ہے اور دلائل کے ضعف و قوت کا بھی وہی معیار ہے، جیسا کہ ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں کہ تیمم محض ایک علامتی طہارت اور غسل و وضو کا قائم مقام ہے اور علامتی طہارت میں ظاہر ہے کہ تمام اعضاء غسل و وضو کا استیعاب مطلوب نہیں ہو سکتا، اگر ایسا ہوتا تو غسل کے لیے تیمم کرتے وقت پورے بدن پر مٹی ملنا پڑتی اور وضو کے لیے منہ اور ہاتھوں کے علاوہ پاؤں کا بھی مسح کرنا پڑتا، مگر ایسا نہیں ہے۔

(۱) تحفة الأحوذی (۱/ ۴۴۷- ۴۴۸)

(۲) صحیح البخاری مع الفتح (۱/ ۴۵۵)

صرف ہاتھوں تک:

صحیح تر روایات کے مطابق تیمم صرف چہرے اور ہاتھوں ہی کا ہے۔ حسبِ موقع یہی پورے غسل و وضو دونوں کا قائم مقام بھی بن جاتا ہے اور صرف وضو کا بھی، کیوں کہ حضرت ابو جہیم بن حارث انصاری رضی اللہ عنہ اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے مروی دو احادیث کے علاوہ طریقہ تیمم کے سلسلے میں کوئی حدیث صحیح سند سے ثابت نہیں ہے، ان دونوں کی مروی احادیث میں ہاتھوں کا مسح صرف کلائیوں اور ہاتھوں کے درمیان والے جوڑ تک ہی ہے، جسے عام طور پر ”ہاتھ“ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری و مسلم، سنن نسائی اور دارقطنی کی حضرت ابو جہیم رضی اللہ عنہ والی حدیث جو مسلم میں تعلقاً اور دیگر کتب میں موصولاً مروی ہے، اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تیمم کا جو طریقہ بتایا گیا ہے، اس میں دیوار پر ہاتھ مارنے کے بعد یہ مذکور ہے:

«فَمَسَحَ بِوَجْهِهِ وَيَدَيْهِ»^①

”آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چہرہ اقدس اور دونوں ہاتھوں کا مسح کیا۔“

اس حدیث میں تو مطلقاً دونوں ہاتھوں کا ذکر ہے، جب کہ صحیح بخاری و مسلم اور سنن اربعہ میں مذکور حضرت عمار رضی اللہ عنہ والی حدیث میں تو مزید واضح اور محدود کرنے والا لفظ «كَفَّيْنِ» آیا ہے۔ اس میں زمین پر ہاتھ مارنے اور ان میں پھونک مارنے کے بعد مذکور ہے:

«ثُمَّ مَسَحَ بِهِمَا وَجْهَهُ وَكَفَّيْهِ»^②

”پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (دونوں ہاتھوں کو) اپنے چہرہ اقدس پر پھیرا اور (پھر) باہم اپنے دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے پر۔“

اب یہاں یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ مطلق «يَدَيْنِ» کے لفظ میں اس تاویل کی گنجائش تھی کہ عربی میں بلکہ عرف عام میں «يَدَيْنِ» یا ہاتھوں سے مراد کہنیوں تک ہاتھ ہو سکتے ہیں، لیکن دوسری

① صحیح البخاری مع الفتح (۳۳۸) صحیح مسلم مع شرح النووي (۶۲/۴) صحیح سنن أبي داود،

رقم الحدیث (۳۱۳) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۳۰۸) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث

(۱۲۵) مختصر سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۵۹۹) المشكاة مع المرعاة (۱/۱۸۷-۱۸۹) و صحیح

الجامع، رقم الحدیث (۲۳۶۷)

② فتح الباری (۱/۴۳۴-۴۳۵)

حدیث کے لفظ «كَفَّيْنِ» نے اس تاویل کا راستہ ہی بند کر دیا اور ہاتھوں کی بھی حد بندی کر دی ہے کہ ہاتھوں سے صرف ہاتھوں اور کلائیوں کے جوڑوں تک کا حصہ مراد ہے، اس سے آگے نہیں۔ حضرت عمار رضی اللہ عنہ والی حدیث ہی کی ایک روایت میں بخاری شریف میں مذکور الفاظ کے مطابق نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«يَكْفِيكَ الْوَجْهَ وَالْكَفَّانِ»^①

”تمہیں چہرے اور دونوں ہاتھوں پر باہم ہاتھ پھیر لینا ہی کافی ہے۔“

امام احمد، اسحاق بن راہویہ، ابن جریر، ابن خزیمہ اور ابن المنذر رحمہم اللہ کا یہی مسلک ہے۔ ابن الجہم اور بعض دیگر اہل علم نے امام مالک رحمہ اللہ سے بھی یہی مسلک نقل کیا ہے اور امام خطاب رحمہ اللہ کے بقول اہل حدیث علما کا بھی یہی مسلک ہے۔^②

امام ابو داؤد اور دیگر علما نے امام شافعی رحمہ اللہ سے قدیم قول میں یہی مسلک ذکر کیا ہے اور ”الفروع شرح المہذب“ میں امام نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ (اگرچہ ہمارے مسلک میں) یہ رائے مرجوح ہے، لیکن دلیل کے اعتبار سے یہی قوی ہے۔^③

کہنیوں تک:

حضرت حسن بصری، شععی، امام ابو حنیفہ، ثوری اور ایک روایت کے مطابق امام مالک اور شافعی رحمہم اللہ کا مسلک یہ ہے کہ تیمم میں ہاتھوں کو کہنیوں تک پھیرا جائے۔^④

ان کا استدلال بعض روایات اور قیاس دونوں سے ہے۔ وہ روایات تو وہی ہیں جو دو مرتبہ زمین پر ہاتھوں کو مارنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ انہی میں سے بعض میں کہنیوں تک کے الفاظ بھی موجود ہیں، بلکہ بعض میں تو کلائیوں، کندھوں اور بغلوں کا بھی ذکر آیا ہے۔ چنانچہ سنن ابو داؤد میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی مرفوع حدیث میں مذکور ہے:

① صحیح البخاری مع الفتح (۱/ ۴۴۵)

② فتح الباری (۱/ ۴۴۵)

③ فتح الباری (۱/ ۴۴۵)

④ معالم السنن (۱/ ۲۰۰)

﴿فَمَسَحَ ذِرَاعَيْهِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ﴾^①

”آپ ﷺ نے اپنی دونوں کلائیوں پر کہنیوں تک ہاتھ پھیرا۔“

اس حدیث کو روایت کرنے کے بعد خود امام ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے سنا وہ کہہ رہے تھے کہ (اس کے ایک راوی) محمد بن ثابت نے تیمم کے بارے میں ایک منکر روایت بیان کی ہے اور ”معالم السنن“ میں امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی یہ حدیث صحیح نہیں، کیوں کہ (اس کا ایک راوی) محمد بن ثابت العبیدی رحمۃ اللہ علیہ سخت ضعیف ہے۔ اس کی بیان کردہ حدیث قابلِ حجت نہیں ہوتی۔^②

امام منذری رحمۃ اللہ علیہ نے مختصر سنن ابی داؤد میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے محمد بن ثابت کے اس حدیث کو مرفوعاً بیان کرنے پر نکیر کی ہے۔^③ اس حدیث کے راوی محمد بن ثابت کو امام ابن معین اور ابو حاتم نے بھی ضعیف کہا ہے۔^④

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ہی سے ایک دوسری حدیث سنن دارقطنی و بیہقی اور مستدرک حاکم میں مرفوعاً مروی ہے اور اس میں بھی کہنیوں تک مذکور ہے، مگر اسے یحییٰ القطان، یثیم اور دیگر محدثین نے موقوف قرار دیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہی صحیح ہے کہ وہ روایت موقوف ہے، جب کہ انہی سے مروی تیسری حدیث سنن دارقطنی میں ہے، جس کے ایک راوی سلیمان بن ارقم کے متروک ہونے کی وجہ سے وہ ضعیف ہے۔ ایسے ہی بعض دیگر احادیث میں بھی کہنیوں کا ذکر آیا ہے۔ مثلاً سنن دارقطنی اور مستدرک حاکم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ والی حدیث ہے، جسے شاذ کہا گیا ہے۔ دارقطنی اور معجم طبرانی میں حضرت اسلع رضی اللہ عنہ کی حدیث مروی ہے۔ مسند بزار اور کامل ابن عدی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مروی حدیث ہے۔ مسند بزار میں حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے، جس کے ضعیف ہونے سے متعلق محدثین کے اقوال جرح و تقفید دو مرتبہ زمین پر ہاتھ مارنے کے ضمن میں ذکر کیے جا چکے ہیں۔ لہذا ان کے اعادے کی ضرورت نہیں۔

① سنن أبي داود مع العون (۱/۵۳۲)

② معالم السنن علی مختصر السنن (۱/۳۰۴)

③ مختصر السنن (۱/۲۰۵)

④ التلخیص الحبیر (۱/۱۵۱)

بغلوں والی حدیث کے بارے میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”اگر یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے تھا تو اس موقع کے بعد جو تیمم صحیح سند سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، وہ اس کا نسخ ہوگا اور اگر وہ بغلوں والا طریقہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے بغیر (محض لوگوں کی مرضی سے) واقع ہوا تو وہ حجت نہیں، کیوں کہ حجت تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یا حدیث ہے۔“

آگے لکھتے ہیں:

”صحیحین کی احادیث میں مروی صرف ہاتھوں تک کے مسح کو اس بات سے بھی تقویت ملتی ہے کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی اسی کا فتویٰ دیا کرتے تھے اور راوی حدیث ہی مراد حدیث کو سب سے بہتر سمجھنے والا ہوتا ہے، خصوصاً جب کہ وہ صحابی مجتہد بھی ہو۔“^(۱)

قیاسی دلیل:

کہنیوں تک ہاتھ پھیرنے کی ایک دلیل عقلی اور قیاسی بھی ہے کہ جب وضو کے لیے کہنیوں کو دھونا شرط ہے تو اسی بنا پر قیاس کرتے ہوئے تیمم میں بھی کہنیوں تک ہاتھوں کو پھیرنا چاہیے، لیکن یہ ایک نص صریح و صحیح کے مقابلے میں قیاس ہے، لہذا فاسد الاعتبار ہے۔^(۲) کیوں کہ نص کے مقابلے میں قیاس جائز ہی نہیں، لہذا قیاسی دلیل قابل اعتبار ہی نہ ہوئی۔ اس کے علاوہ بعض دیگر قیاس آرائیاں اور صحیحین کی حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے مروی احادیث کی تاویلیں اور انھیں قبول کرنے میں عذر و معذرت کی چارہ سازیاں بھی کی گئی ہیں۔ جنہیں فقہ حنفیہ کی کتاب ”السعیۃ“ میں نقل کر کے خود مولف مولانا عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ ہی نے ان کا تنقیدی جائزہ لے کر انھیں رد کیا ہے، لہذا وہ تفصیل و ہیں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ اسے بلا تنقید و تبصرہ علامہ مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ نے ”تحفة الأحوذی“ (۱/ ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰) پر بھی نقل کیا ہے، جو قابل مطالعہ ہے، مگر ہم بہ خوف طوالت اسے ذکر نہیں کر رہے۔ و فیما ذکرناہ کفایۃ إن شاء اللہ.

(۱) فتح الباری (۱/ ۴۴۴-۴۴۵) عون المعبود (۱/ ۵۱۴، ۵۲۰) مختصر السنن للمنذری (۱/ ۲۰۱)

(۲) فتح الباری (۱/ ۴۴۶)

جنسِ ارض:

اب ایک تحقیق طلب بات یہ ہے کہ تیمم کے لیے کیا صرف مٹی پر ہاتھ مارنا ضروری ہے یا زمین کے دیگر اجزا مثلاً ریت، چونا اور پتھر وغیرہ پر بھی ہاتھ مار کر تیمم کیا جاسکتا ہے؟ اس سلسلے میں اہل علم کے دو قول ہیں:

پہلا قول:

تیمم صرف مٹی پر ہاتھ مارنے ہی سے ہو سکتا ہے، دوسری کسی چیز سے نہیں۔ یہ امام شافعی، امام احمد اور امام داؤد رضی اللہ عنہم کا مسلک ہے۔ ان کا استدلال آیت تیمم کے الفاظ: ﴿فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا﴾ [النساء: ۴۳] ”(کہ پانی نہ ملنے کی صورت میں) پاک مٹی سے کام لو۔“ سے ہے۔

یہاں اس مسلک والے ”صعید“ کو صرف مٹی کے معنی میں لیتے ہیں، جب کہ اسی آیت کے اگلے الفاظ ﴿فَامْسَحُوا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ مِنْهُ﴾ [المائدة: ۶] ”اس سے مسح کرو، چہرے کا اور دونوں ہاتھوں کا۔“ میں لفظ ﴿مِنْهُ﴾ کو تبعیض کے لیے قرار دیتے ہوئے بھی تیمم کے لیے مٹی کو شرط قرار دیا گیا ہے۔ حافظ ابن حجر رضی اللہ عنہ کا ”فتح الباری“ (۱/ ۴۳۸- ۴۴۷) میں، علامہ شوکانی رضی اللہ عنہ کا ”نیل الأوطار“ (۱/ ۲۶۰- ۲۶۱) میں اور علامہ بیہقی رضی اللہ عنہ کا ”سبل السلام“ (۱/ ۹۴) میں اسی طرف رجحان ہے۔ گذشتہ صفحات میں ہم ایک حدیث صحیح بخاری و مسلم اور سنن نسائی و دارقطنی کے حوالے سے ذکر کر آئے ہیں جو صرف صحیح مسلم میں تعلیقاً اور باقی میں مرفوعاً ہے۔ اس کے حوالے سے ہم بیان کر آئے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دیوار پر ہاتھ مار کر تیمم کیا۔

اس حدیث سے ابن بطلان نے تو یہ اخذ کیا ہے کہ تیمم کے لیے مٹی شرط نہیں، بلکہ پتھر وغیرہ سے بھی تیمم کیا جاسکتا ہے، کیوں کہ مدینے کے گھروں کی دیواریں عموماً پتھروں کی بنی ہوئی ہوتی تھیں اور پتھروں پر مٹی تو نہیں چمٹی ہوگی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں کو لگتی، لیکن اس بات کو ایک احتمال قرار دیا گیا ہے، یقینی امر نہیں، پھر اسی روایت میں مسند امام شافعی میں یہ الفاظ بھی مروی ہیں:

«فَحَثَّهٖ بَعْصًا» ”آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دیوار کو اپنے عصا سے کریدا۔“

اس سے معلوم ہوا کہ وہ دیوار محض پتھروں کی نہیں، بلکہ ان کے درمیان مٹی بھی تھی، جسے

[۱] عون المعبود (۱/ ۵۲۶)

آپ ﷺ نے کرید کر پھر اس پر ہاتھ مارے اور تیمم کیا، اس سے تو یہ معلوم ہوا کہ مٹی ہی سے تیمم ضروری ہے، کسی دوسری چیز سے نہیں۔^①

اسی طرح صحیح مسلم اور دیگر کتب میں حدیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی ہے:

«وَجُعِلَ لَنَا الْأَرْضُ كُلُّهَا مَسْجِدًا، وَجُعِلَتْ تُرْبَتُهَا لَنَا طَهُورًا إِذَا لَمْ نَجِدِ الْمَاءَ»^②

”ہمارے لیے ساری زمین کو مسجد بنا دیا گیا ہے اور پانی نہ ملنے کی صورت میں زمین کی مٹی ہمارے لیے ذریعہ طہارت بنا دی گئی ہے۔“

گویا مسجد تو ساری ہی زمین ہے، البتہ طہارت کا ذریعہ صرف زمین کی مٹی ہے۔ بعض اہل علم نے لفظ ”تربة“ پر اعتراض کیا ہے کہ یہ مٹی کے ساتھ خاص نہیں، جس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ صحیح ابن خزیمہ میں ”تربة“ کے بجائے ”تراب“ ہے، جو مٹی سے خاص ہے۔ مسند احمد اور سنن بیہقی میں حسن سند سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«وَجُعِلَتِ التُّرَابُ لِي طَهُورًا» ”مٹی میرے لیے طہارت بنائی گئی ہے۔“
ان سب دلائل سے تیمم کے لیے مٹی شرط معلوم ہوتی ہے۔

دوسرا قول:

اسی مسئلے کے بارے میں دوسرا قول یہ ہے کہ تیمم کے لیے صرف مٹی ہی شرط نہیں، بلکہ زمین کی جنس کے کسی بھی جزو یا حصے سے تیمم کیا جاسکتا ہے، وہ چونا ہو یا کھر و شور، پتھر ہو یا سُرْمہ اور ہڑتال ہو یا ریت یا کچھ اور، شرط صرف یہ ہے کہ وہ زمین کا حصہ ہو۔ امام ابو حنیفہ، مالک، عطاء، اوزاعی اور ثوری رضی اللہ عنہم کا یہی مسلک ہے۔^③

ان کا استدلال بھی آیت تیمم کے الفاظ ﴿فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا﴾ [النساء: ۴۳] کے لفظ ”صعيد“ سے ہے، اس مسلک والے ”صعيد“ سے زمین کے تمام اجزا مراد لیتے ہیں۔

① فتح الباری (۱/ ۴۴۳)

② صحیح مسلم مع النووی (۲/ ۴/ ۵)

③ عون المعبود (۱/ ۵۲۶)

ایسے ہی ان کا استدلال بعض احادیث سے بھی ہے، مثلاً صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتب میں مذکور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

«وَجَعَلْتُ لِي الْأَرْضَ مَسْجِدًا وَطَهُورًا، فَأَيُّمَا رَجُلٍ مِنْ أُمَّتِي أَدْرَكَتُهُ الصَّلَاةُ فَلْيُصَلِّ»^①

”اور میرے لیے زمین کو مسجد اور ذریعہ طہارت بنایا گیا ہے۔ میری امت کے کسی بھی فرد کو کہیں بھی نماز کا وقت ہو جائے تو وہ وہیں نماز پڑھ لے۔“

اس حدیث کے الفاظ سے استدلال کیا جاتا ہے کہ زمین کے تمام اجزا سے تیمم جائز ہے، کیوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین کو طہارت بنایا جانا بتایا ہے، لہذا اس کے تمام اجزا اس میں شامل ہیں، لیکن بعض دیگر احادیث میں زمین کے عام لفظ سے مٹی کو خاص کیا گیا ہے، جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں، لہذا اس عام لفظ کو اس خاص پر محمول کرنا چاہیے، اس طرح طہارت مٹی کے ساتھ خاص ہو جاتی ہے، اگر مٹی کے علاوہ دوسری اشیا سے بھی تیمم جائز ہوتا تو پھر ”تراب“ کے لفظ پر اکتفا پر نہ کیا جاتا۔^②

بہر حال اس دوسرے مسلک کی تائید ایک اور روایت سے بھی ہوتی ہے، جو سنن بیہقی اور

مسند احمد میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں مذکور ہے:

«وَجَعَلْتُ الْأَرْضَ كُلَّهَا لِي وَلِأُمَّتِي مَسْجِدًا وَطَهُورًا»^③

”میرے لیے اور میری امت کے لیے ساری زمین ہی مسجد و طہارت بنا دی گئی ہے۔“

جب کہ سنن بیہقی (۱/۶۷۸) میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ ہیں:

«فَأَيُّمَا رَجُلٍ مِنْ أُمَّتِي أَتَى الصَّلَاةَ فَلَمْ يَجِدْ مَاءً وَجَدَ الْأَرْضَ طَهُورًا وَمَسْجِدًا»^④

”میری امت کے جس شخص پر نماز کا وقت آجائے اور وہ پانی نہ پائے تو وہ زمین ہی کو

① صحیح البخاری مع الفتح، رقم الحدیث (۳۳۵) صحیح مسلم مع شرح النووی (۳/۵) صحیح سنن

النسائی، رقم الحدیث (۴۱۹) إرواء الغلیل (۱/۳۱۵-۳۱۶) و صحیح الجامع، رقم الحدیث (۱۰۵۶)

② فتح الباری (۱/۴۳۸)

③ مسند أحمد (۵/۲۴۸) بحوالہ تحقیق زاد المعاد (۱/۲۰۰) فتح الباری (۱/۴۳۸) و منتقى الأخبار (۱/۲۵۹)

④ مسند أحمد (۵/۲۴۸) بحوالہ تحقیق زاد المعاد (۱/۲۰۰) فتح الباری (۱/۴۳۸) و منتقى الأخبار (۱/۲۵۹)

طہارت و مسجد پاتا ہے۔“

مسند احمد کے الفاظ ہیں:

«فَعِنْدَهُ طَهُورُهُ وَمَسْجِدُهُ»^① ”اس کی طہارت اور مسجد اس کے پاس ہے۔“

امام بخاری نے اپنی صحیح کے ایک ترجمہ الباب میں حضرت یحییٰ بن سعید انصاری سے تعلقاً نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں:

«لَا بَأْسَ بِالصَّلَاةِ عَلَى السَّبِيحَةِ وَالتَّيْمُمِ بِهَا»^②

”کَلَرِ زَمِينٍ پَر نَمَازِ اِدَا كَرْنِ اَوْر كَلَرِ سَے تَيْمَمِ كَرْنِ مِيں كُوْنِي حَرْج نَهِيں هَے۔“

مذکورہ باب میں امام صاحب موصوف کا اس اثر کو نقل کرنا، اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ موصوف نے کَلَرِ كُو بھي مٹی كے حَكْم مِيں شَار كِيَا هَے۔ علامہ ابن تيمم جيسے بعض اهل علم نے ارض حجاز سے بھي استدلال كِيَا هَے كِه وَهَاں اَكْثَر عِلَاقُوں مِيں رِيْت هَے يَا پَهْر پَهْر لِي زَمِين هَے، لَهْذَا اِنْ هَر دُو پَر بھي تَيْمَمِ جَائِز هَے نَه كِه صَرْفِ مِٹِي پَر، جُو جَاز مِيں بَهْت كَم يَاب چيز هَے۔^③

مٹی كے علاوہ ديگر اشيَاء سے تيمم كے سلسلے مِيں مَوْلَانَا ثَنَا اللّٰهُ اَمْر تَسْرِي رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ فرماتے هِيں:

”خَا كَسَار كُو اَس مِيں شَبِه هَے۔“^④

اس اختلاف كا سبب اور لفظ ”صعيد“ كِي لغوي تشریح:

اب آيے اس بات كِي وضاحت بھي كَر دِيں كَر ائمہ و فقہا كے مابين جُو اختلاف پَا يَا جاتا هَے كِه بعض كے نزديك ”صعيد“ سے مراد صرف اور صرف مٹی هَے اور بعض ديگر كے نزديك زمين اور اس كے تمام اجزا اس مِيں شامل هِيں۔ اس اختلاف كا بنيادي سبب دراصل يه هَے كِه ائمہ لغت كے نزديك بھي اس لفظ ”صعيد“ كے لغوي معنی كے بارے مِيں دونوں طرح كے اقوال موجود هِيں، لَهْذَا اِگْر اس لفظ كِي لغوي تشریح سامنے رَهے تُو اس اختلاف كُو سمجھنا آسان هُو جاتا هَے۔ چنانچہ امام ابن منظور نے عربي كِي پندرہ ضخيم جلدوں پَر مشتمل ”لسان العرب“ (۲/۳۵۴) مِيں لفظ ”صعيد“ كِي تشریح

① ”زاد المعاد“ (۱/۲۰۰) كا حاشيه ملاحظه فرمائیں۔

② صحيح البخاري مع الفتح (۱/۴۴۶)

③ زاد المعاد (۱/۲۰۰)

④ فتاویٰ ثنائیه (۱/۳۱۰) بحوالہ فتاویٰ علمائے حدیث (۱/۱۲۵) نیز دیکھیں: المغني لابن قدامة (۱/۲۴۷)

کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

”صعید“ زمین کے بلند حصے کو کہتے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ صعید سے مراد زمین کا وہ حصہ ہے، جس میں ریت اور گلر شامل نہ ہو۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ صعید سے مراد مطلق روئے زمین ہے اور اس قول والوں کا استدلال قرآن کی سورۃ الکہف (آیت: ۴۰) کے الفاظ سے ہے، جن میں ہے: ”بعید نہیں کہ میرا رب مجھے تیرے باغ سے بہتر عطا فرما دے اور تیرے باغ پر آسمان سے کوئی آفت بھیج دے:

﴿فَتُصْبِحُ صَعِيدًا زَلَقًا﴾ [الکہف: ۴۰]

”جس سے وہ پھسلتی زمین (صاف میدان) بن کر رہ جائے۔“

(گو اس آیت میں صعید سے مراد مطلق روئے زمین ہے) کہا گیا ہے کہ صعید سے مراد زمین ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ صعید سے پاک زمین مراد ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ ہر پاک مٹی صعید ہیں، اس پر سورۃ المائدۃ کی آیت (۶) کے الفاظ ﴿فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا﴾ سے بھی استدلال کیا گیا ہے۔ فراء نے سورۃ الکہف (آیت: ۸) کے الفاظ ﴿صَعِيدًا جُرُزًا﴾ میں صعید کا ترجمہ مٹی کیا ہے اور بعض دیگر نے برابر اور چٹیل زمین کیا ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”صعید“ کا اطلاق صرف اس مٹی پر ہی ہوتا ہے جو غبار والی ہو، پتھریلی جگہ پر ”صعید“ کا لفظ صادق نہیں آتا، ان کے نزدیک چونے، سُرے اور ہڑتال نامی دھات سے تیمم نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ یہ سب پتھر کی اقسام ہیں۔

ابو اسحاق زجاج کہتے ہیں:

”صعید سے مراد روئے زمین ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ زمین پر ہاتھ مار کر تیمم کر لے اور اس بات کی پروا نہ کرے کہ اس جگہ مٹی بھی ہے یا نہیں، کیوں کہ ”صعید“ سے مراد مٹی نہیں، بلکہ روئے زمین ہے، خواہ وہاں مٹی ہو یا کچھ اور ہو۔“

وہ مزید کہتے ہیں:

”اگر ساری زمین ہی پتھریلی چٹان ہوتی اور اس پر مٹی بھی نہ ہوتی تو کوئی شخص اس پر دونوں ہاتھ مار کر اپنے منہ پر پھیر لیتا تو اس کا تیمم و طہارت ہو جاتی۔ اس ارشادِ الہی کے

الفاظ: ﴿فَتُصْبِحُ صَعِيدًا﴾ [الكهف: ٤٠] کی رو سے مطلق زمین ہی ”صعید“ ہے۔ آگے فرماتے ہیں:

”اہل لغت کا اس بارے میں کوئی اختلاف میرے علم میں نہیں ہے کہ ”صعید“ سے مراد روے زمین ہے۔“

زہری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

”زجاج کا قول میرے خیال میں امام مالک اور ان کے موافقین کا مذہب ہے، مگر یہ بات یقینی نہیں ہے۔“

لیث کا کہنا ہے:

جب کوئی باغیچہ ویران ہو جائے اور تمام پھول، پودے ختم ہو جائیں تو کہا جاتا ہے:

”فَقَدْ صَارَتْ صَعِيدًا“

”وہ صعید یعنی صاف زمین بن گیا ہے، جس میں کوئی درخت پودا نہیں ہے۔“

ابن الاعرابی کا کہنا ہے:

”الصعید: الأرض بعینہا“ ”صعید سے عین زمین مراد ہے۔“

راستے کو بھی ”صعید“ کہا جاتا ہے، کیوں کہ وہاں بھی مٹی ہوتی ہے۔ مختلف علمائے لغت کے اقوال کی روشنی میں یہ ابن منظور کی تشریح ہے، جب کہ دوسری معروف و متداول عربی ڈکشنری ”القاموس المحيط“ میں علامہ فیروز آبادی لکھتے ہیں:

”الصَّعِيدُ: التُّرَابُ أَوْ وَجْهُ الْأَرْضِ“^①

”صعید سے مراد مٹی یا روے زمین ہے۔“

علامہ جوہری نے ”الصحاح“ میں صعید کا معنی مٹی کیا ہے (اور اسے فراء کی طرف منسوب کیا ہے) جب کہ ثعلبی سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”هُوَ وَجْهُ الْأَرْضِ لِقَوْلِهِ تَعَالَى: ﴿فَتُصْبِحُ صَعِيدًا زَلَقًا﴾“^②

① القاموس المحيط (۱/۱/۳۱۸)

② بحوالہ مختار الصحاح للرازي (ص: ۳۶۳ بیروت) و عون المعبود (۱/۵۱۶)

”اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿فَتُصَبِّحُ صَعِيدًا زَلَقًا﴾ [الکہف: ۴۰] کی رو سے صعيد کا معنی روے زمین ہے۔“

ماہرین لغت کے ایک بورڈ نے ”المعجم الوسيط“ کے نام سے ایک ڈکشنری ترتیب دی ہے، اس میں بھی صعيد سے مراد روے زمین اور مٹی لکھا گیا ہے اور بطور استشہاد آیت تیمم کے الفاظ: ﴿فَتَيَمِّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا﴾ [النساء: ۴۳] بھی نقل کیے ہیں۔^①

ماہر لغت علامہ احمد رضا نے ”معجم متن اللغة“ (۳/ ۵۳)، طبع بیروت) میں لکھا ہے: ”صعيد کا معنی زمین، زمین کا بالائی حصہ یا وہ حصہ ہے، جس میں ریت یا گلر شامل نہ ہو یا روے زمین یا پاکیزہ زمین اور ہر پاک مٹی اور غبار والی مٹی اور راستے کو بھی صعيد کہتے ہیں۔“

رابع بات:

اس ساری تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ صعيد کے لغوی معنی میں نزاع کی وجہ سے اس مسئلے میں بھی نزاع ہے کہ تیمم کے لیے صرف مٹی ہی ضروری ہے یا زمین کے تمام اجزا سے تیمم جائز ہے؟ البتہ اس سلسلے میں علامہ شمس الحق عظیم آبادی جیسے کبار علما کی تحقیق یہ ہے کہ اگر کسی کو مٹی دستیاب ہو تو اس کے لیے اسی سے تیمم کرنا متعین ہے۔ اس کے لیے کسی دوسری چیز سے تیمم روا نہیں، کیوں کہ ائمہ لغت کے نزدیک صعيد سے مراد مٹی ہے اور مٹی سے تیمم بالاتفاق جائز ہے، لہذا ایک یقینی امر کو قابل احتمال امر کی بنا پر کیسے ترک کیا جاسکتا ہے؟ ہاں جسے مٹی دستیاب نہ ہو تو وہ ریت پر یا پتھر پر تیمم کر کے ہی نماز پڑھ لے، کیوں کہ بعض علمائے لغت کے نزدیک یہ بھی صعيد کے مدلول میں شامل ہے، لیکن جس شخص کو پتھر اور ریت بھی نہ ملے تو وہ کسی بھی چیز سے تیمم کر سکتا ہے، جن کا ذکر لفظ صعيد کی تشریح میں گزرا ہے۔ (مثلاً چونا، گلر، سرمہ اور ہڑتال وغیرہ) البتہ تیمم کے بغیر وہ نماز نہ پڑھے، لیکن اگر کسی کو ان میں سے کوئی ایک چیز بھی میسر نہیں تو اسے اجازت ہے کہ وہ بلا طہارت ہی نماز پڑھ لے۔ واللہ أعلم۔^②

جیسا کہ انتہائی نادر بلکہ ناممکن سی صورت کے ضمن میں ہم تفصیل ذکر کر چکے ہیں۔ امام

① المعجم الوسيط (۱/ ۵۱۴) طبع بیروت.

② عون المعبود (۱/ ۵۲۷)

ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کلّ زمین پر تیمم کے جائز ہونے پر اس حدیث سے استدلال کیا ہے، جس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ارشادِ نبوی ہے:

«أُرِيْتُ دَارَ هِجْرَتِكُمْ سَبِيحَةَ ذَاتِ نَخْلٍ»^①

”مجھے تمہارا دارِ ہجرت (مدینہ طیبہ) دکھایا گیا ہے، جو کلّ والا نخلستان ہے۔“

خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کا نام ”طیبہ“ رکھا، جو اس بات کی دلیل ہے کہ کلّ زمین بھی طیب (صَعِيداً طَيِّباً) میں داخل ہے۔

جنسِ ارض:

اب یہاں جنسِ ارض کے سلسلے میں ایک فقہی نقطہ اور موجود دور میں اس کے مجروح ہونے کا تذکرہ بھی مناسب حال ہوگا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہر اس چیز پر تیمم کیا جاسکتا ہے، جو جنسِ ارض سے ہو۔ فقہ حنفی کی معروف کتاب ”فتاویٰ عالمگیری“ کے عربی ایڈیشن ”الفتاویٰ الہندیہ“ کی جلد اول کے بالکل ابتدائی صفحات (ص: ۱۴) میں جنسِ ارض کی تعریف یہ بیان کی گئی ہے:

”جنسِ ارض سے مراد ہر وہ چیز ہے جو جلانے کی وجہ سے خاکستر (راکھ) بنے نہ پگھلے۔

اس طرح لکڑی جو خاکستر بن جاتی ہے اور سونا چاندی جو آگ کی وجہ سے پگھل جاتے

ہیں، زمین کی جنس میں شامل نہ ہوں گے اور ان سے تیمم نہیں کیا جاسکے گا۔“

یہ ”فتاویٰ عالمگیری“ کے الفاظ و مفہوم ہے، جب کہ آج یہ بات پایہ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ خود مٹی بھی ایک خاص حد تک گرم کرنے کے بعد پگھل جاتی ہے۔ اس طرح ”جنسِ ارض“ کی مذکورہ تعریف مجروح ہو جاتی ہے۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ مذکورہ تعریف میں جلانے سے مراد عام معمول کی حرارت اور آگ ہے، جس سے سونا وغیرہ تو پگھل جاتا ہے، جب کہ مٹی کو پگھلانے کے لیے مخصوص نوعیت کی غیر معمولی حرارت اور گرمی مطلوب ہوتی ہے۔^②

ٹرین وغیرہ کی دیواروں پر تیمم:

مسائلِ تیمم کے سلسلے میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ اگر کبھی ایسا ہو کہ کوئی شخص ٹرین (ریل

① دیکھیں: فتح الباری (۱/ ۴۴۷)

② دیکھیں: جدید فقہی مسائل (ص: ۲۶)

گاڑی) یا بس وغیرہ میں سوار ہو اور نماز کا وقت ہو جائے۔ اندر پانی ہونہ اسے رکوانا ممکن ہو تو ایسے میں وہ نماز کیا کرے؟ اس سلسلے میں یہ تو معروف ہے کہ ٹرین یا بس کی دیواریں عموماً لکڑی، لوہے یا پلاسٹک کی ہوتی ہیں، ان پر تیمم کرنا تو درست نہیں ہے، البتہ اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ دوران سفر عموماً گاڑیوں کی دیواروں پر گرد و غبار جم جاتا ہے اور امام ابوحنیفہ، امام محمد رحمہما اللہ اور ان کے دیگر موافقین کے نزدیک گرد و غبار پر بھی تیمم کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ ”ہدایۃ، باب التیمم“ (۱/ ۳۴) میں لکھا ہے:

”وَيَجُوزُ التَّيْمُّمُ عِنْدَ أَبِي حَنِيفَةَ وَمُحَمَّدٍ بِكُلِّ مَا كَانَ مِنْ جِنْسِ الْأَرْضِ مِنَ التُّرَابِ وَالرَّمْلِ وَالْحَجَرِ وَالْحَصِّ ... وَكَذَا يَجُوزُ بِالْغُبَارِ“^①

”امام ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک جنسِ ارض کی ہر چیز مٹی، ریت، پتھر اور چونے سے تیمم کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح گرد و غبار سے بھی تیمم جائز ہے۔“

فقہ حنفی کی اس معروف کتاب ”الہدایۃ“ کے ان الفاظ کی رو سے اگر ٹرین کی دیواروں پر گرد و غبار ہو تو تیمم کیا جاسکتا ہے، ورنہ نہیں۔

ایک تیمم سے متعدد فرضی و نفل نمازیں اور تلاوت وغیرہ:

یہ بات تو صحیح مسلم (مع شرح النووی: ۴/ ۳/ ۱۷۷) اور دیگر کتب میں مروی ایک صحیح حدیث کے حوالے سے ذکر کی جا چکی ہے کہ ایک وضو سے متعدد نمازیں ادا کی جاسکتی ہیں۔ اگرچہ ہر نماز کے لیے از سر نو وضو کرنا زیادہ بہتر ہے اور تیمم بھی چونکہ غسل و وضو اور کبھی صرف وضو کے قائم مقام ہوتا ہے، لہذا ایک مرتبہ تیمم کر لینے کے بعد جب تک اس کا کوئی ناقض رونما نہ ہو، تب تک اس سے بھی متعدد نمازیں پڑھی جاسکتی اور تلاوت کی جاسکتی ہے۔ ہر نماز کے لیے تیمم کرنا ضروری نہیں۔ نہ یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل مبارک سے ثابت ہے اور نہ کسی حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حکم فرمایا ہے، بلکہ اس کے برعکس سنن اربعہ، دارقطنی، مستدرک حاکم، صحیح ابن حبان اور مسند احمد میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ارشاد نبوی ہے:

«إِنَّ الصَّعِيدَ الطَّيِّبَ وَضُوءَ الْمُسْلِمِ وَإِنْ لَمْ يَجِدِ الْمَاءَ عَشْرَ سِنِينَ»^②

① دیکھیں: جدید فقہی مسائل (ص: ۲۶)

② صحیح سنن أبي داود، رقم الحديث (۳۲۱) صحیح سنن الترمذی، رقم الحديث (۱۰۷) صحیح سنن ←

”پاک مٹی مسلمان کا وضو ہے، چاہے وہ دس سال بھی پانی نہ پائے۔“

اس حدیث کو امام المجد ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ”منتقى الأخبار“ میں ”باب الرخصة في الجماع لعادم الماء“ کے تحت وارد کیا ہے اور ”نبیل الأوطار“ میں اس کی شرح بیان کرتے ہوئے امام شوکانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے: اسی موضوع کی ایک حدیث مسند بزار اور معجم طبرانی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے، جس کے بارے میں امام دارقطنی نے ”علل“ میں کہا ہے کہ اس کا مرسل ہونا ہی زیادہ صحیح ہے، البتہ شیخ محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔^①

امام شوکانی رحمہ اللہ مزید لکھتے ہیں:

”یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ مٹی ذریعہ طہارت ہے اور جو شخص اس سے تیمم کر لے، اس کے لیے جائز ہے کہ ہر وہ کام کرے جو پانی سے وضو کرنے والا کرتا ہے، جیسے نماز ادا کرنا، تلاوت کرنا، مسجد میں جانا اور قرآن کریم کو چھونا وغیرہ۔ تیمم کا ان امور کے لیے کافی ہونا کسی محدود وقت کے لیے نہیں، بلکہ چاہے کتنی مدت بھی پانی نہ ملے، تیمم کفایت کرتا جائے گا اور دس سال کا ذکر اس بات کی دلیل نہیں کہ اس مدت کے بعد تیمم کافی نہیں ہوگا، کیوں کہ اس مدت کا ذکر تحدید و تقید کے لیے نہیں ہوا، بلکہ مبالغے کے لیے آیا ہے۔“^②

امام ابن قدامہ رحمہ اللہ نے فقہ مقارن کی بہترین کتاب ”المغنی“ میں لکھا ہے کہ نوافل کے لیے کیے ہوئے تیمم سے فرائض بھی ادا کیے جاسکتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ اور امام احمد رحمہما اللہ کا یہی مسلک ہے۔^③

”المراقبة شرح المشكاة“ میں ملا علی قاری حدیث: «وَإِنْ لَمْ يَجِدِ الْمَاءَ عَشْرَ سِنِينَ» سے استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کسی نماز کے لیے تیمم کیا گیا اور وہ نماز بھی ادا کر لی، حتیٰ کہ اس نماز کا وقت بھی گزر گیا، اس کے باوجود اگر نوافل وضو و تیمم میں سے کوئی امر واقع نہ ہوا ہو تو وہ شخص

← النسائي، رقم الحديث (۳۱۱) مسند أحمد (۵/ ۱۵۵، ۱۸۰) موارد الظمان، رقم الحديث (۱۹۶) مشكاة المصابيح (۱/ ۱۶۵) المنتقى مع نبیل الأوطار (۱/ ۱/ ۲۵۹) الإرواء (۱/ ۱۸۱) مشكاة المصابيح (۱/ ۱۶۵) صحيح الجامع للألباني، رقم الحديث (۶۶۷)

① مشكاة المصابيح (۱/ ۱۶۵) وقواه محقق الزاد (۱/ ۲۰۱)

② نبیل الأوطار (۱/ ۲۵۹)

③ المغني لابن قدامة (۱/ ۳۲۶، ۲۵۲)

طہارت ہی سے ہوگا، کیوں کہ محض خروج وقت ناقض تیمم نہیں، بلکہ اس کا حکم بھی وضو ہی کا ہے، جیسا کہ ہمارے احناف کا مذہب ہے۔^①

وقت تیمم:

امام شافعی، احمد، مالک اور ابو داؤد رضی اللہ عنہم کے نزدیک تیمم کے لیے کسی نماز کے وقت کا ہو جانا شرط ہے اور ان کا استدلال بعض احادیث سے ہے، مثلاً مسند احمد میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

”میرے اور میری امت کے لیے ساری زمین کو مسجد اور ذریعہ طہارت بنایا گیا ہے۔ میری امت کے کسی آدمی کو جہاں بھی نماز کا وقت ہو جائے، تو اس کے پاس ہی اس کی مسجد و طہارت ہے۔“

اسی مفہوم کی کئی دوسری احادیث بھی صحیحین اور سنن میں مذکور ہیں۔^②

ان سب احادیث میں جو «أَيْنَمَا أَدْرَكْتَنِي الصَّلَاةُ... الخ» یا «أَيْنَمَا أَدْرَكْتَ رَجُلًا مِنْ أُمَّتِي الصَّلَاةُ» کے الفاظ ہیں اور صحیحین کے الفاظ ہیں: «فَأَيُّمَا رَجُلٍ مِنْ أُمَّتِي أَدْرَكْتَهُ الصَّلَاةُ فَلْيُصَلِّ...» ان سب کا مفہوم ایک ہی ہے کہ میری امت کے کسی بھی شخص کو جہاں بھی نماز کا وقت ہو جائے، وہ نماز پڑھ لے اور (پانی نہ ہونے کی شکل میں) تیمم کر لے۔

مذکورہ حضرات نے نماز کا وقت ہو جانے سے استدلال کیا ہے کہ تیمم کے لیے ضروری ہے کہ پہلے کسی نماز کا وقت ہو۔ قرآنی الفاظ: ﴿إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ﴾ سے بھی استدلال کیا گیا ہے، جب کہ امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ اور ان کے اصحاب و رفقا کے نزدیک وضو کی طرح ہی تیمم بھی قبل از وقت کیا جاسکتا ہے اور امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تائید کرتے ہوئے ”نبیل الأوطار“ میں لکھا ہے:

”وَهَذَا هُوَ الظَّاهِرُ، وَلَمْ يَرِدْ مَا يَدُلُّ عَلَى عَدَمِ الأَجْزَاءِ“

”یہی ظاہر ہے اور وقت سے پہلے کیے گئے تیمم کے صحیح نہ ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔“

آگے مزید لکھتے ہیں:

① بحوالہ تحفة الأحوذی (۱/ ۳۸۷)

② دیکھیں: المنتقى مع النيل (۱/ ۲۵۹، ۲۶۰)

”قرآن کریم (سورة المائدہ، آیت: ۶) میں جو وضو کے لیے ﴿إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ﴾ کے الفاظ ہیں، ان سے مراد نماز کے لیے کھڑے ہونا نہیں، بلکہ نماز کے لیے کھڑے ہونے کا ارادہ کرنا ہے، جو نماز کے وقت میں بھی ہو سکتا ہے اور نماز کے وقت سے قبل بھی اور وقت نماز ہونے کی شرط پر دلالت کرنے والا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔^(۱) گویا پانی نہ ہونے کی شکل میں جب چاہیں تیمم کر لیں اور تلاوت کریں یا نقلی نماز ادا کریں یا فرائض ادا کریں، وضو کی طرح اس میں بھی وسعت ہے۔

تیمم سے صرف ایک نماز اور اس کے دلائل کا جائزہ:

یہاں مناسب ہوگا کہ ان بعض اہل علم کے دلائل بھی ذکر کر دیے جائیں، جن کے نزدیک ایک مرتبہ کیے گئے تیمم سے صرف ایک ہی وقت کی نماز ادا کی جاسکتی ہے یا قضا دی جاسکتی ہے۔ ان کا استدلال ایک تو معجم طبرانی اور سنن دارقطنی و بیہقی کی اس حدیث سے ہے، جس میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے:

«مِنَ السُّنَّةِ أَنْ لَا يُصَلِّيَ الرَّجُلُ بِالتَّيْمَمِ إِلَّا صَلَاةً وَاحِدَةً ثُمَّ يَتَيَّمُ لِلصَّلَاةِ الْآخَرَى»^(۲)

”سنت یہ ہے کہ تیمم سے کوئی شخص ایک نماز سے زیادہ نہ پڑھے اور دوسری نماز کے لیے پھر تیمم کر لے۔“

یہ بات معلوم ہے کہ جب کوئی صحابی کسی معاملے کے بارے میں ”مِنَ السُّنَّةِ“ کہے تو اس کا حکم مرفوع حدیث کا ہوتا ہے، یعنی نبی اکرم ﷺ کا عمل مبارک یا آپ کا ارشاد اس کی بنیاد ہوتا ہے اور وہ حدیث حجت ہوتی ہے۔ اگر یہ مذکورہ حدیث سند کے اعتبار سے صحیح ثابت ہو جائے تو پھر یہ اس مسئلے کی بہترین دلیل بن سکتی ہے، لیکن ایسا نہیں ہے، بلکہ محدثین کرام رضی اللہ عنہم نے اس حدیث کو ضعیف اور ناقابل حجت قرار دیا ہے۔ کبار محدثین میں سے حافظ ابن حجر عسقلانی رضی اللہ عنہ نے اس حدیث کو ”التلخیص الحبیبر“ میں سنن دارقطنی و بیہقی کی طرف منسوب کیا اور لکھا ہے کہ اس کی سند کا ایک

(۱) نیل الأوطار (۲۶۱/۱/۱)

(۲) سنن الدار قطنی باب التیمم (۱/۱۸۵) رقم الحدیث (۵)

راوی حسن بن عمار سخت ضعیف ہے۔^①

”بلوغ المرام“ میں موصوف نے اسی روایت کو نقل کر کے اس کی سند کے سخت ضعیف ہونے کا بھی تذکرہ کیا ہے۔^②

”سلسلة الأحادیث الضعیفة و الموضوعة“ (۱/ ۴۲۳، ۴۲۴) میں علامہ البانی نے امام دارقطنی کے حسن بن عمارہ کو ضعیف کہنے کے الفاظ ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ صرف ضعیف ہی نہیں، بلکہ اس سے بڑھ کر ہے، حتیٰ کہ شعبہ نے اس راوی کے بارے میں کہا ہے کہ وہ جھوٹ بولتا تھا۔ امام بخاری رحمہ اللہ کے استاذ علی بن مدینی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ حدیثیں گھڑا کرتا تھا۔ امام احمد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی بیان کردہ احادیث من گھڑت ہیں۔ یہی وجہ کہ اس حدیث پر موضوع یعنی خود ساختہ اور من گھڑت ہونے کا حکم لگایا گیا ہے، لہذا اس سے استدلال جائز نہ رہا۔ سنن بیہقی میں حسن بن عمارہ والی سند سے ہی ایک اور روایت مرفوعاً مروی ہے، جسے نقل کر کے خود امام بیہقی نے لکھا ہے کہ حسن بن عمارہ قابلِ حجت نہیں، گویا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً یا موقوفاً کسی طرح بھی یہ حدیث صحیح ثابت نہیں ہے۔^③

اس مرفوع اور موقوف حدیث کے علاوہ اسی مفہوم کے بعض آثار صحابہ رضی اللہ عنہم بھی مروی ہیں، مثلاً سنن دارقطنی میں ایک اثر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، مگر اس کی سند میں حجاج بن ارطاة جیسا معروف متکلم فیہ راوی اور حارث بن اعور بھی ہے، جس کی وجہ سے وہ ضعیف ہے۔ سنن دارقطنی میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے بھی ایک اثر مروی ہے کہ وہ ہر نماز کے لیے الگ الگ تیمم کیا کرتے تھے اور امام قتادہ رحمہ اللہ اسی کا فتویٰ دیا کرتے تھے، جب کہ امام قتادہ رحمہ اللہ اور حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کے مابین ارسال ہے، یعنی اولاً یہ اثر موقوف ہے، ثانیاً مرسل بھی ہے۔

سنن بیہقی میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی ایک اثر مروی ہے، جس میں حضرت نافع

بیان کرتے ہیں:

”يَتَيَّمُ لِكُلِّ صَلَاةٍ وَإِنْ لَمْ يُحَدِّثْ“

① التلخیص الحبیر (۱/ ۱۵۵)

② بلوغ المرام مع السبل السلام (۱/ ۱۰۰)

③ سلسلة الأحادیث الضعیفة (۱/ ۴۲۳، ۴۴۴)

”حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہر نماز کے لیے الگ یا نیا تیمم کیا کرتے تھے، چاہے وہ حادث نہ بھی ہوتے۔“

یعنی اگرچہ نواقض وضو و تیمم میں سے کوئی امر واقع نہ بھی ہوتا، تب بھی وہ ہر نماز کے ساتھ نیا تیمم کیا کرتے تھے۔ اس اثر کو نقل کرنے کے بعد امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اس موضوع کی صحیح تر دلیل یہی اثر ہے اور ہمارے علم کے مطابق صحابہ کرام میں سے ان کا کوئی مخالف بھی نہیں تھا۔^(۱)

جب کہ علامہ یمانی امیر صنعانی رحمۃ اللہ علیہ ”سبل السلام“ میں حضرت علی اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے آثار کی طرف اشارہ کر کے لکھتے ہیں کہ یہ دونوں بھی سند کے اعتبار سے ضعیف ہیں اور اگرچہ کہا گیا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی اثر اس موضوع کا صحیح تر اثر ہے، مگر ہے تو وہ بھی موقوف (یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول و فعل تو نہیں ہے) لہذا مذکورہ بالا حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ان آثار سے بھی حجت قائم نہیں ہوتی ہے۔ آگے علامہ صنعانی فرماتے ہیں کہ اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مٹی کو پانی کے قائم مقام بنایا ہے اور یہ بات معلوم و معروف ہے کہ پانی سے وضو کرنا، اس وقت تک واجب نہیں ہوتا، جب تک مدت یا نواقض وضو میں سے کوئی امر واقع نہ ہو تو اس معاملے میں تیمم بھی وضو کی طرح ہی ہے۔ ائمہ حدیث و فقہاء کی ایک جماعت کا یہی مذہب اور دلیل کے اعتبار سے بھی یہی مضبوط ہے۔^(۲)

علامہ ابن حزم کی تحقیق کا نچوڑ:

یہیں یہ بات بھی واضح کر دیں کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی مرفوع و موقوف کوئی بھی روایت صحیح ثابت نہیں اور اسی پر بس نہیں، بلکہ خود انہی سے اس کے برعکس مفہوم کی روایت ملتی ہے، جیسا کہ علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے ”المحلی“ (۲/ ۱۳۳) میں ذکر کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ تیمم والا شخص اس تیمم سے جو نفل و فرض نمازیں چاہے، پڑھ سکتا ہے، جب تک پانی نہ مل جائے یا کسی حادث کے واقع ہونے سے اس کا وضو نہ ٹوٹے۔ علامہ ابن حزم کے نزدیک اس مسئلے میں یہی صحیح اور حق بات ہے۔ علامہ موصوف نے ”المحلی“ کی جلد اول جزو دوم میں متعدد صفحات پر اس موضوع کو ذکر کیا اور خوب داد تحقیق دی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ہر نماز کے لیے پانی کی تلاش کرنا

(۱) التلخیص الحبیر (۱/ ۱۵۵)

(۲) سبل السلام (۱/ ۱۰۰)

ایک لغو اور باطل بات ہے، کیوں کہ کسی جگہ سے صرف ایک مرتبہ پانی تلاش کر لینا اور اس کے عدم وجود کا یقین کر لینا کافی ہوتا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کا یہ قول کہ فرضی نماز کے بعد تو تیمم والی طہارت نفلوں کے لیے برقرار رہتی ہے، البتہ نفلوں کے بعد فرضوں کے لیے نہیں، ان کے اس قول کو فاسد قرار دیا ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کا جو قول ہے کہ ہر فرضی نماز کے ساتھ دوبارہ تیمم کرے، البتہ نوافل کے ساتھ تجدید تیمم کی ضرورت نہیں۔ ان کے اس قول کو بھی ظاہر الخطا قرار دیا ہے اور امام ابو ثور رحمہ اللہ نے جو لکھا ہے کہ تیمم کی طہارت نماز کے وقت تک رہتی ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ہی وہ طہارت ختم ہو جاتی ہے، اسے بھی انھوں نے ظاہر الخطا کہا اور لکھا ہے کہ ہمیں قرآن و سنت، کسی سے بھی نوافل طہارت میں سے ”خروج وقت“ نامی کوئی سبب معلوم نہیں ہے، پھر آگے چل کر انھوں نے وہ چاروں آثار صحابہ رضی اللہ عنہم بھی ذکر کیے ہیں، جو ہم نقل کر چکے ہیں اور انھیں غیر صحیح بلکہ ضعیف و ناقابل حجت قرار دیا ہے، پھر سورۃ المائدہ (آیت: ۶) سے جو تیمم کے لیے دخول وقت کو شرط قرار دیا ہے، اس کی بھی تردید کی ہے۔^①

علامہ نواب صدیق حسن خان والی بھوپال کی تحقیق:

امام شوکانی رحمہ اللہ نے ”الدرر البہیة“ کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس میں صحیح دلائل والے فقہی مسائل ذکر کیے ہیں اور والی ریاست بھوپال علامہ نواب صدیق حسن خان نے دو جلدوں میں اس کی ایک بے نظیر شرح قلم بند کی ہے، جس کا نام ”الروضۃ الندیة“ ہے۔ اس کی دارالمعرفۃ بیروت والی طبع (ص: ۵۹) میں علامہ موصوف نے بھی لکھا ہے کہ تیمم وضو کی طرح ہی ہے اور ایک تیمم سے متعدد فرضی و نفلی نمازیں ادا کی جاسکتی ہیں۔ ایک نماز سے فارغ ہو جانے یا اس نماز کا وقت نکل جانے سے تیمم والی طہارت ختم نہیں ہوتی اور ”حیث“ سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

”وَلَمْ أَجِدْ فِي حَدِيثٍ صَحِيحٍ تَصْرِيحًا بِأَنَّهُ يَجِبُ أَنْ يَتِيمَمَ لِكُلِّ فَرِيضَةٍ“^②

”مجھے کسی صحیح حدیث میں یہ صراحت نہیں ملی، جس کی رو سے ہر فرض نماز کے ساتھ

از سر نو تیمم کرنا واجب ہو۔“

① المحلی (۱/۲/۱۲۸-۱۳۳)

② الروضۃ الندیة (ص: ۹۵) دارالمعرفۃ، بیروت.

حضرت حسن بصری، امام بخاری، امام ابن المنذر رحمۃ اللہ علیہم:

رئیس الحدیثین امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان بھی واضح طور پر اسی طرف ہے کہ ایک تیمم سے متعدد فرضی و نفل نمازیں ادا کی جاسکتی ہیں اور جب تک کوئی ناقض واقع نہ ہو، تیمم کی طہارت موجود رہتی ہے۔

① چنانچہ صحیح بخاری کے ایک ترجمہ الباب میں موصوف نے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا وہ قول نقل کیا ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

”يُجْزِيهِ التَّيْمُمُ مَا لَمْ يُحْدِثْ“^①

”تیمم والا جب تک حادث نہ ہو جائے، وہ اسے کافی رہتا ہے۔“

② امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تو یہ اثر تعلقاً ذکر کیا ہے، جب کہ بعض دیگر کتب حدیث میں یہ موصولاً بھی مروی ہے۔ چنانچہ مصنف عبدالرزاق میں اس اثر کے الفاظ ہیں:

”يُجْزِي تَيْمُمٌ وَاحِدٌ مَا لَمْ يُحْدِثْ“

”جب تک کوئی ناقض وضو واقع نہ ہو، تیمم کفایت کرتا جاتا ہے۔“

③ مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے:

”لَا يَنْقِضُ التَّيْمُمُ إِلَّا الْحَدَثَ“

”تیمم کی طہارت کو صرف حدث ہی توڑتا ہے۔“

④ سنن سعید بن منصور میں ہے:

”التَّيْمُمُ بِمَنْزِلَةِ الْوُضُوءِ إِذَا تَيْمَّمْتَ فَأَنْتَ عَلَى وَضُوءٍ حَتَّى تُحْدِثَ“

”تیمم وضو کے قائم مقام ہے۔ جب تم تیمم کر لو تو ناقض وضو واقع ہونے تک تم وضو ہی سے ہو۔“

⑤ مصنف حماد بن سلمہ میں ہے:

”تُصَلِّي الصَّلَاةَ كُلَّهَا بِتَيْمُمٍ وَاحِدٍ مِثْلَ الْوُضُوءِ مَا لَمْ تُحْدِثْ“^②

”وضو کی طرح ہی کوئی حادث یا ناقض وضو واقع ہونے تک تیمم سے بھی تمام نمازیں پڑھی

① صحیح البخاری مع الفتح (۱/۴۴۶)

② ویکس: فتح الباری (۱/۴۴۶)

جاسکتی ہیں۔“

﴿۲﴾ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ترجمۃ الباب والے اس اثرِ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ اس باب میں وہ حدیث بھی نقل کی ہے، جس میں جماعت کے ساتھ نماز نہ پڑھنے والے آدمی سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا تھا:

«مَا مَنَعَكَ يَا فُلَانٌ أَنْ تُصَلِّيَ مَعَ الْقَوْمِ؟»

”اے فلاں! قوم کے ساتھ مل کر نماز ادا کرنے سے تجھے کس چیز نے روکا ہے؟“

تو اس نے جواب دیا:

«أَصَابَتْنِي جَنَابَةٌ وَلَا مَاءً»

”مجھے جنابت ہوگئی تھی اور پانی نہیں ملا (کہ غسل کر لیتا)۔“

تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

«عَلَيْكَ بِالصَّعِيدِ فَإِنَّهُ يَكْفِيكَ»^①

”تمھیں مٹی سے کام لینا (تیمم کر لینا) تھا اور یہ تمھارے لیے کافی ہے۔“

ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے لفظ «يَكْفِيكَ» سے امام بخاری نے یہی اخذ کیا ہے کہ ایک مرتبہ کیا ہوا

تیمم تمھارے لیے کافی ہے، یعنی جب تک تمھاری طہارت تیمم ٹوٹ نہ جائے یا پانی نہ مل جائے۔

کبار علمائے اسلام میں سے امام ابن المنذر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب ایک تیمم سے کئی نوافل جائز و صحیح ہیں، تو پھر کئی فرائض بھی صحیح ہیں، کیوں کہ جن امور کو فرائض کے لیے شرط قرار دیا گیا ہے۔ وہی نوافل کے لیے بھی شرط ہیں۔ سوائے کسی ایسی استثنائی شکل کے جو کسی دلیل سے ثابت ہو اور علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کی طرح ہی امام ابن المنذر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ ہر فرض نماز کے لیے پانی کی تلاش واجب نہیں۔^②

تیمم کرنے والے کا امامت کروانا:

مذکورہ مسئلے کی مزید وضاحت اس سے بھی ہو جاتی ہے کہ تیمم کا ہر لحاظ سے وضو کے قائم مقام

① صحیح البخاری مع الفتح (۱/ ۴۴۷)

② کذا فی فتح الباری (۱/ ۴۴۷)

ہونا اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ تیمم کرنے والا، وضو والوں کی امامت کروا سکتا ہے۔ اس طرح دو مسئلے حل ہو گئے، ایک مذکورہ زیر بحث مسئلہ اور دوسرا تیمم والے کا وضو والوں کی امامت کروانا اور اس کا جائز ہونا۔ جمہور اہل علم اور فقہائے کوفہ کا یہی مسلک ہے اور اس سلسلے میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ بھی ان کے موافق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی صحیح کے ایک ترجمہ الباب میں انھوں نے بڑے جزم و یقین کے ساتھ، مگر تعلیقاً نقل کیا ہے:

”أَمَّ ابْنُ عَبَّاسٍ، وَهُوَ مُتَيْمِمٌ“^①

”حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے امامت کروائی، جب کہ وہ تیمم کیے ہوئے تھے۔“

صحیح بخاری شریف کے ترجمہ الباب میں یہ اثر تعلیقاً بیان کیا گیا ہے، جب کہ مصنف ابن ابی شیبہ اور سنن بیہقی میں اس اثر کو موصولاً روایت کیا گیا ہے۔ محدثین کرام نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ اثر نقل کر کے اشارہ فرما دیا ہے کہ تیمم پوری طرح وضو کا قائم مقام ہوتا ہے اور اگر اس سے حاصل ہونے والی طہارت وضو والی طہارت سے کم تر ہوتی تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما تیمم کر کے ان لوگوں کی امامت نہ کرواتے، جنھوں نے وضو کیا ہوا تھا۔ تیمم والے کی امامت کے صحیح ہونے اور اس کے پیچھے متوضی نمازیوں کی نماز کے صحیح ہونے کا دوسرا ثبوت یا دلیل وہ حدیث صحیح ہے، جس میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کا واقعہ مذکورہ ہے، جسے امام بخاری نے اپنی صحیح کے ایک ترجمہ الباب میں تعلیقاً نقل کیا ہے اور صیغہ تمریض استعمال کیا ہے، جس کی توجیہ ”فتح الباری“ میں یہ بیان کی گئی ہے کہ امام صاحب نے اس واقعہ کو چونکہ مختصراً ذکر کیا ہے، لہذا اس کی تصدیق ذکر کر کے صیغہ تمریض و تضعیف سے کی ہے، ورنہ حدیث قوی سند والی ہے۔^②

اس واقعہ کو سنن ابوداؤد و دارقطنی، مستدرک حاکم، صحیح ابن حبان اور مسند احمد میں موصولاً روایت کیا گیا ہے، جس میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ہم غزوۂ ذات السلاسل میں بھیجے گئے۔ ایک رات جب کہ سخت سردی تھی، مجھے غسل کی ضرورت پیش آگئی اور مجھے اندیشہ ہوا کہ اگر میں

① صحیح البخاری مع الفتح (۱/۴۴۶)

② فتح الباری (۱/۴۵۴)

نہایا تو مرجاؤں گا۔ چنانچہ میں نے تیمم کیا اور لوگوں کو صبح کی نماز پڑھائی۔ جب ہم مدینہ واپس آئے تو لوگوں نے نبی اکرم ﷺ سے اس واقعے کا ذکر کیا، اس پر آپ ﷺ نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا: اے عمرو! «صَلَّيْتَ أَصْحَابَكَ وَأَنْتَ جُنُبٌ؟» ”تم نے جنابت کی حالت میں لوگوں کو نماز پڑھا دی؟“ میں نے عرض کی: مجھے قرآن کریم کی سورۃ النساء کی آیت (۲۹) یاد آگئی تھی، جس میں ارشادِ الہی ہے:

﴿وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا﴾

”اپنے آپ کو ہلاک مت کرو، بے شک اللہ تم پر رحم کرنے والا ہے۔“

اس لیے میں نے تیمم کر کے نماز پڑھا دی۔

بخاری شریف میں ہے:

«فَلَمْ يُغْنَفْ» ”آپ ﷺ نے انھیں کوئی ملامت نہ کی۔“

جب کہ دوسری مذکورہ کتب کے الفاظ ہیں:

«فَضَحِكَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَلَمْ يَقُلْ شَيْئًا»^(۱)

”نبی اکرم ﷺ یہ سن کر مسکرا دیے اور مزید کچھ نہ فرمایا۔“

اس حدیث سے امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ”فتح الباری“ میں، الحداد بن تیمیہ رحمہ اللہ نے ”منتقى الأخبار“ میں اور امام شوکانی رحمہ اللہ نے ”نیل الأوطار“ میں استدلال کیا ہے کہ تیمم کے پیچھے متوضیٰ کی نماز اور تیمم کی امامت صحیح ہے۔

صاحب فتح الباری نے اسی حدیث سے نبی اکرم ﷺ کے عہد مبارک میں اجتہاد کے جواز پر استدلال کیا ہے۔ مالکیہ نے تیمم کے پیچھے نماز کو جائز، مگر مکروہ کہا ہے، جیسا کہ ”الفقہ علی المذاهب الأربعة“ (۱/ ۴۳۰) سے پتا چلتا ہے۔

مالکیہ کا یہ مکروہ کہنا کیا حیثیت رکھتا ہے؟ جب کہ موطا میں خود امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

(۱) صحیح البخاری مع الفتح (۱/ ۴۵۴) صحیح سنن أبي داود، رقم الحديث (۳۲۳) موارد الظمان، رقم الحديث (۲۰۲) المنتقى مع النيل (۱/ ۲۵۸) إرواء الغلیل (۱/ ۱۸۱-۱۸۲) و صححه الألبانی.

”وَلَوْ أَنَّهُمْ هُوَ لَمْ أَرِ بِذَلِكَ بَأْسًا“

”اگر وہ ان کی امامت کرائے تو میرے نزدیک اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔“

آگے وہ فرماتے ہیں:

”وَلَيْسَ الَّذِي وَجَدَ الْمَاءَ بِأَطْهَرَ مِنْهُ وَلَا أَتَمَّ صَلَاةً“^①

”پانی سے وضو کرنے والا تیمم والے سے زیادہ طاہر نہیں اور نہ اس کی نماز اس سے زیادہ

کامل ہے۔“



① الموطأ مع تنوير الحوالك للسيوطي (٧٥ / ١) طبع بيروت.

نواقضِ تیمم اور نواقضِ وضو

نواقضِ تیمم:

تیمم کے بارے میں جس قدر ضروری مسائل تھے، وہ بتوفیقہ تعالیٰ بیان کر دیے گئے ہیں۔ اب صرف اتنی سی بات رہ گئی ہے کہ نواقضِ تیمم یعنی وہ کون کون سے امور ہیں، جن سے تیمم ختم ہو جاتا ہے؟ اس سلسلے میں مختصراً عرض ہے کہ جن کاموں سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، انہی سے تیمم بھی ختم ہو جاتا ہے، کیوں کہ وہ اسی کے قائم مقام ہوتا ہے۔ ایسے ہی جس شخص نے پہلے پانی ملنے کی وجہ سے تیمم کیا ہو، پانی مل جانے پر اس کا تیمم ختم ہو جاتا ہے۔ البتہ اگر تیمم والی نماز کے دوران ہی میں پانی مل جانے کا پتا چل جائے تو وہ نماز مکمل کر سکتا ہے، جیسا کہ تفصیل ذکر کی جا چکی ہے اور اگر کسی نے بیماری یا کسی دوسرے عذر کی بنا پر تیمم کیا ہو تو جب اس کا وہ عذر ختم ہو جائے، تیمم بھی ختم ہو جاتا ہے۔ گویا نواقضِ تیمم کو جاننے کے لیے نواقضِ وضو کا جاننا اور ان کا پیش نظر ہونا ضروری ہے۔

نواقضِ وضو:

نواقضِ وضو کا ذکر مسائلِ وضو کے ضمن میں گزر چکا ہے، مگر کسی وجہ سے وہاں ہم نے ان کی طرف اشارہ کر دینے پر ہی اکتفا کیا تھا، لیکن اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دیگر مسائلِ طہارت کی تفصیل کی طرح ان کی بھی کچھ تشریح کر دی جائے۔

2,1- پیشاب اور پاخانہ:

«مَا خَرَجَ مِنَ السَّبِيلَيْنِ» «پیشاب اور پاخانے کی جگہوں سے کچھ نکلنا»

اس کے تحت متعدد اشیا آتی ہیں، جن میں سے پہلی دو چیزیں تو پیشاب اور پاخانہ ہی ہیں، ان دونوں کے نواقضِ وضو ہونے کا ذکر خود قرآن کریم میں موجود ہے۔ چنانچہ سورۃ النساء (آیت: ۴۳) میں ارشادِ الہی ہے:

﴿أَوْجَاءَ أَحَدٍ مِّنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ﴾

”یا کوئی تم میں سے بیت الخلاء سے ہو کر آیا ہو۔“

ظاہر ہے کہ رفع حاجت پیشاب و پاخانہ ہی سے کناہیہ ہے۔ ان دونوں سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اور فراغت کے بعد نماز کے لیے استنجا اور وضو کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ ”مَا خَرَجَ مِنَ السَّبِيلَيْنِ“ میں سے ان دونوں چیزوں کے ناقض وضو ہونے کا ثبوت حدیث شریف میں بھی مذکور ہے، چنانچہ سنن ترمذی، نسائی، صحیح ابن خزیمہ اور مسند احمد میں حضرت صفوان بن عسال رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

«كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَأْمُرُنَا إِذَا كُنَّا سَفْرًا أَنْ لَا نَنْزِعَ خِفَافَنَا ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ وَلَيَالِيَهُنَّ إِلَّا مِنْ جَنَابَةٍ وَلَكِنْ مِنْ غَائِطٍ وَبَوْلٍ وَنَوْمٍ»^(۱)

”نبی اکرم ﷺ سفر کے دوران میں ہمیں یہ حکم فرمایا کرتے تھے کہ ہم اپنے موزوں کو تین دن اور تین راتیں پاخانہ، پیشاب اور نیند کی بنا پر نہ اتارا کریں، ہاں اگر جنابت ہو تو پھر اتار لیں۔“

اس حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے تین نواقض وضو شمار کیے اور بتایا ہے کہ ان سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، لیکن اگر کسی نے موزے پہنے ہوں تو وضو ٹوٹ جانے کے باوجود موزے اتار کر پاؤں دھونے کی ضرورت نہیں، بلکہ ان پر مسح کر لینا ہی کافی ہے۔ ہاں اگر جنابت ہو جائے تو پھر موزوں کا اتارنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اس حدیث کو موزوں پر مسح کرنے کے مسائل کے ضمن میں بھی ذکر کیا جا چکا ہے اور یہاں ان دونوں نواقض وضو پر استدلال کے لیے اسے دوبارہ ذکر کر دیا ہے۔

سلسلہ البول:

یہیں ایک دوسرا مسئلہ بھی حل کرتے جائیں اور وہ ہے: سلسلہ البول کا مسئلہ۔ اگر کسی کو سلسلہ البول کی بیماری ہو، یعنی پیشاب کے قطرے مسلسل گرتے رہتے ہوں تو وہ نماز کیسے ادا کرے؟ اس سلسلے میں اہل علم نے لکھا ہے کہ نماز تو معاف نہیں ہے۔ ایسے بیمار لوگ انڈرویٹ استعمال کریں، وضو

(۱) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۸۴) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۱۲۲) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۴۷۸) مسند أحمد (۴/ ۲۳۹- ۲۴۰) الفتح الربانی (۲/ ۷۳، ۷۴) و نقل تصحیح ابن خزیمہ و الترمذی و تحسین البخاری للحدیث. مشکاة المصابیح (۱/ ۱۶۱- ۱۶۲)

کر کے نماز شروع کر دیں اور ایک ہی وضو سے پوری نماز پڑھ لیں، اگر درمیان میں قطرے سے وضو ٹوٹتا ہے تو ٹوٹتا رہے، اللہ تعالیٰ معاف کرے گا۔ البتہ ایسا شخص ایک وضو سے دو نمازیں ادا نہیں کر سکتا، بلکہ ہر نماز کے لیے از سر نو وضو کرنا ضروری ہے۔^(۱)

جب وضو کر لے تو شرم گاہ پر چھینٹا مارے، پھر مطمئن ہو کر نماز پڑھے، کیوں کہ وہ ایک شرعی عذر میں مبتلا اور مجبور ہے۔ ایسے شخص کو مستحاضہ کے حکم میں شمار کیا گیا ہے۔ مستحاضہ عورت جسے مخصوص ایام کے علاوہ بھی بیماری کی وجہ سے خون آتا رہتا ہے، اسے نبی اکرم ﷺ نے ایسے ہی نمازیں ادا کرنے کا حکم فرمایا تھا۔ چنانچہ صحیح بخاری و مسلم، سنن ابی داؤد، ترمذی، نسائی، صحیح ابن حبان اور موطا امام مالک جیسی کتب حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک صحابیہ حضرت فاطمہ بنت ابی حشیش رضی اللہ عنہا کا واقعہ مذکور ہے، انھوں نے نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کی:

«إِنِّي لَا أَطْهَرُ، أَفَادُعُ الصَّلَاةِ؟»

”میں پاک نہیں رہتی تو کیا میں نماز چھوڑ دوں؟“

ان کا اشارہ مرض استحاضہ کی طرف تھا۔ اس پر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّمَا ذَلِكَ عِرْقٌ، وَلَيْسَ بِالْحَيْضَةِ فَإِذَا أَقْبَلَتِ الْحَيْضَةَ فَاتْرُكِي الصَّلَاةَ، فَإِذَا ذَهَبَ قَدْرُهَا فَاغْسِلِي الدَّمَ وَصَلِّي»^(۲)

”یہ ایک رگ ہوتی ہے، حیض نہیں۔ جب ایام حیض آئیں تو نماز چھوڑ دو اور جب ایام حیض کے برابر عرصہ گزر جائے تو خون دھو دو (غسل حیض کر لو) اور نماز پڑھو۔“

جب کہ ایک اور روایت میں ہے:

«ثُمَّ تَوَضَّعِي لِكُلِّ صَلَاةٍ»^(۳) ”پھر تم ہر نماز کے لیے وضو کرو۔“

[۱] المغنی (۳۰۳/۱) فقہ السنۃ (۶۰/۱) فتاویٰ علمائے حدیث (۷۴/۱) فتویٰ دار الإفتاء جامعہ سلفیہ بحوالہ ہفت روزہ ”اہل حدیث“ (جلد ۱۲ شمارہ ۸)

[۲] صحیح البخاری مع الفتح (۲۲۸) صحیح مسلم مع شرح النووی (۱۷/۴، ۱۶۱) صحیح سنن ابی داؤد، رقم الحدیث (۲۶۱) صحیح سنن الترمذی (۱۰۸) صحیح سنن النسائی (۲۰۶، ۳۴۷) سنن ابن ماجہ (۶۶۱) الموطأ مع المسوی (۱۰۴)

[۳] صحیح البخاری مع فتح الباری (۴۰۹/۱) صحیح سنن ابی داؤد، رقم الحدیث (۲۸۷) و الفتح الربانی (۱۷۱/۲) و جامع الأصول (۳۶۳/۷)

انڈرویئر کے استعمال کا فائدہ یہ ہوگا کہ اوپر والے کپڑے ناپاک نہیں ہوں گے، اس کے استعمال کا اشارہ ان احادیث سے ملتا ہے، جن میں استحاضہ والی بعض صحابیات اور ام المومنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے استحاضے کے باوجود اعتکاف کرنے کا ذکر آیا ہے، جن کی تفصیل ”صحیح البخاری، کتاب الحيض، باب الاعتكاف للمستحاضة“ اور اس کی شرح ”فتح الباری“ اور مسند احمد کی ترتیب و شرح ”الفتح الرباني“ (۲/ ۱۶۹ تا ۱۷۲) اور دیگر کتب حدیث اور ان کی شروح میں دیکھی جاسکتی ہے۔^①

3- خروج ریح یا ہوا کا آنا:

نواقض وضو میں سے تیسری چیز خروج ریح ہے، اس کا ثبوت صحیح بخاری و مسلم، مسند احمد اور دیگر کتب حدیث میں مذکور ہے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لَا تُقْبَلُ صَلَاةٌ مِنْ أَحَدٍ حَتَّىٰ يَتَوَضَّأَ»

”جو شخص حادث ہو جائے، اس کی اس وقت تک نماز قبول نہیں ہوتی جب تک وہ وضو نہ کر لے۔“

یہ سن کر حضرموت سے آئے ہوئے ایک شخص نے پوچھا:

«مَا الْحَدَثُ يَا أَبَا هُرَيْرَةَ؟ فَقَالَ: فُسَاءٌ أَوْ ضَرَاطٌ»^②

”اے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ! حدیث کیا ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا: بھسکی یا گوز یعنی بغیر آواز کے یا آواز کے ساتھ جاے پاخانہ سے ہوا کا خارج ہونا۔“

یہاں یہ بات پیش نظر ہے کہ اس معاملے میں خواہ مخواہ شک میں مبتلا ہو جانا بھی صحیح نہیں، کیوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے محض معمولی سا شک گزرنے پر نماز چھوڑ کر وضو کرنے کے لیے چل دینے سے منع فرمایا ہے، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داؤد اور نسائی میں حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ شکایت کی گئی کہ بعض دفعہ نمازی محسوس کرتا ہے کہ شاید دوران نماز اس کے پیٹ سے ہوا خارج ہوگئی ہے۔ (تو ایسے میں وہ کیا کرے؟) اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

① صحیح البخاری مع فتح الباری (۱/ ۴۱۱، ۴۱۲) و المغنی (۱/ ۴، ۳)

② صحیح البخاری مع الفتح (۱/ ۲۳۴) صحیح مسلم مع شرح النووی (۳/ ۱۰۴) الفتح الربانی (۲/ ۷۵)

«لَا يَنْتَبِلُ، لَا يَنْصَرِفُ حَتَّى يَسْمَعَ صَوْتًا أَوْ يَجِدَ رِيحًا»^①

”وہ اس وقت تک نماز چھوڑ کر نہ جائے، جب تک وہ آواز نہ سن لے یا بو نہ پائے۔“

ایسے ہی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے صحیح مسلم، سنن ابی داؤد اور ترمذی میں مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«إِذَا وَجَدَ أَحَدُكُمْ فِي بَطْنِهِ شَيْئًا فَأَشْكَلَ عَلَيْهِ أَخْرَجَ أَمْ لَا؟ فَلَا يَخْرُجَنَّ حَتَّى يَسْمَعَ صَوْتًا أَوْ يَجِدَ رِيحًا»^②

”جب تم میں سے کوئی شخص اپنے پیٹ میں کچھ پائے اور اس کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہو جائے کہ ہوا نکلی ہے یا نہیں؟ تو اس وقت تک (نماز سے) ہرگز نہ نکلے، جب تک آواز نہ سن لے یا بو نہ پائے۔“

ان دونوں احادیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خروج ہوا کا یقین کر لینے تک نماز نہ چھوڑنے کا حکم فرمایا ہے کہ صرف معمولی شک گزرنے سے ایسا نہ کرے۔ گویا جب تک وضو کے ٹوٹ جانے کا پختہ یقین نہ ہو جائے، اس کی نماز صحیح ہے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح صحیح مسلم میں کہا ہے کہ یہ حدیث اس مسئلے میں اصل ہے کہ اشیا اپنی اصل ہی پر رہتی ہیں، جب تک کہ اس کے خلاف (اصل سے ہٹ جانے) کا پختہ یقین نہ ہو جائے اور محض شک کا واقع ہو جانا مضر نہیں ہے۔ جمہور علما نے اسی حدیث کو اختیار کیا ہے۔^③

ان احادیث سے مرض وسواس میں مبتلا لوگوں کے لیے بھی صاف علاج اور عمدہ حل نکل آیا ہے کہ وہ محض وسواس اور شک پر بنیاد بنا کر نماز نہ چھوڑیں اور وضو کرنے نہ چل نکلیں، بلکہ یقین پر بنیاد رکھیں۔ فتح الباری میں حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے تو مذکورہ حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ بعض لوگوں

① صحیح البخاری مع الفتح (۱/۲۳۷) صحیح مسلم مع شرح النووی (۴/۵۱) صحیح سنن ابی داؤد، رقم الحدیث (۱۶۳) صحیح سنن الترمذی (۶۵) صحیح النسائی (۱۵۴) سنن ابن ماجہ (۵۱۳) صحیح ابن خزيمة (۱۰۱۸) جامع الأصول (۸/۱۰۷)

② صحیح مسلم مع شرح النووی (۴/۵۱) صحیح سنن ابی داؤد، رقم الحدیث (۶۳) صحیح سنن الترمذی (۶۵) جامع الأصول (۸/۱۰۷)

③ فتح الباری (۱/۲۳۸) و شرح صحیح مسلم للنووی (۲/۳-۴۹-۵۰)

نے اس حدیث کو مرضِ وسواس میں مبتلا لوگوں کے ساتھ خاص قرار دیا ہے، مگر انھوں نے صحیح مسلم اور سنن ابو داؤد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کے الفاظ نقل کر کے ثابت کیا ہے کہ اس حدیث کا حکم وسواس والوں کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ ہر کسی کے لیے عام ہے کہ جب تک خروج ہو یا کسی بھی دوسرے طریقے سے وضو کے ٹوٹ جانے کا یقین نہ ہو جائے، تب تک مطمئن ہو کر اسی وضو سے نماز ادا کرتے جانا چاہیے۔^①

امام خطابی رضی اللہ عنہ ”معالم السنن“ میں فرماتے ہیں کہ آواز سننے یا پانے کا معنی پختہ یقین حاصل کر لینا ہے، خاص آواز یا بو پانا مراد نہیں اور جب کوئی معنی خاص نام سے زیادہ وسعت والا ہو تو حکم اسی معنی کا ہوگا نہ کہ اس خاص معنی کا۔^②

جمہور اہل علم کا مسلک تو یہی ہے، البتہ امام مالک رضی اللہ عنہ ایک قول میں شک سے وضو کے ٹوٹ جانے کے قائل ہیں اور دوسرے قول میں ان کے نزدیک ایسے وقت میں نیا وضو کر لینا زیادہ محبوب ہے۔ ان کا یہ مسلک من حیث النظر تو قوی ہے، مگر مدلول حدیث کے مخالف ہے (لہذا جمہور کا مسلک ہی اولیٰ ہے)۔^③

امام ابن مالک رضی اللہ عنہ نے اس سلسلے میں ایک بڑی عمدہ بات کہی ہے۔ وہ فرماتے ہیں: ”اگر کسی کو حادث ہونے میں شک ہو جائے تو اس پر وضو کرنا اس وقت تک واجب نہیں جب تک اسے اس کا پختہ یقین نہ آجائے اور پختہ یقین اس حد تک کہ وہ اس پر حلف یعنی قسم کھا سکے، لیکن اگر حادث ہونے کا یقین ہو، جب کہ طہارت کے بحال ہونے کا محض شک رہ جائے تو اس پر وضو کرنا لازم ہے اور اس پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔“^④

4- سلسلہ الریح:

جس طرح بعض لوگوں کو تقطیر البول یا سلس البول یعنی پیشاب کے قطروں کے آتے رہنے کا

① فتح الباری (۱/ ۲۳۸)

② معالم السنن للخطابی (۱/ ۱۲۹)

③ فتح الباری (۱/ ۲۳۸)

④ شرح صحیح مسلم للنووی (۲/ ۳/ ۵۰) فقہ السنة (۱/ ۵۶)

مرض ہوتا ہے، ایسے ہی بعض کو سلس الریح کی بیماری ہوتی ہے کہ وہ چند منٹ کے لیے بھی ہوا کو نہیں روک سکتے، بلکہ بلا اختیار ہوا خارج ہوتی رہتی ہے۔ ایسے لوگوں کے وضو اور نماز کا حکم بھی سلس البول والوں ہی کی طرح ہے۔ علمائے اسے بھی استحاضہ کے حکم میں داخل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ وضو کر کے اطمینان سے نماز ادا کر لے۔ اس نماز کی سنتیں اور نوافل بھی پڑھ لے، حتیٰ کہ معمول کے مطابق قرآن کریم کی تلاوت، درود شریف یا دوسرا کوئی مسنون وظیفہ کرنا چاہے تو نماز کے ساتھ ہی اسی وضو سے کر لے، البتہ ایک وضو سے متعدد نمازیں ادا نہیں کر سکتا۔^①



① فتاویٰ عزیزی (ص: ۳۶۲) بحوالہ فتاویٰ علمائے حدیث (۱/ ۷۵) فقہ السنۃ (۱/ ۶۰) المغنی (۱/ ۳۰۴) دلیل الطالب (ص: ۲۳۷، ۳۴۵) بحوالہ فتاویٰ علمائے حدیث (۱/ ۸۳، ۹۱) دلائل و تفصیل سلس البول کے ضمن میں گزر چکی ہے، لہذا دہرانے کی ضرورت نہیں۔

شرم و حیا کے مسائل

بعض نواقض وضو خصوصاً ”مَا خَرَجَ مِنَ السَّبِيلَيْنِ“ سے تعلق رکھنے والے نواقض ایسے بھی ہیں، جنہیں شرم و حیا والے امور میں شمار کیا جاتا ہے اور بعض لوگوں کو ناگوار گزرتا ہے کہ ایسے مسائل بیان کیے جائیں، ان کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ ماؤں، بہنوں اور بہو بیٹیوں کی موجودگی میں ایسے مسائل کا ذکر تکلیف دہ ہوتا ہے۔ ان کے جذبات کا پاس کرتے ہوئے بہ قدر امکان مناسب الفاظ سے ان مسائل کا تذکرہ بھی از بس ضروری ہے، کیوں کہ وہ بھی دین کا ایک جزو ہیں۔ مسائل دین کے بیان کرنے میں اگر محض اسی بات کو سامنے رکھتے ہوئے تساہل برتا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دین کا ایک حصہ نظروں سے اوجھل رہ جائے گا، ویسے بھی صحیح بخاری، سنن ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، دارمی اور مسند احمد میں بھی ہے:

«إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ»^①

”یقیناً اللہ تعالیٰ حق بیان کرنے سے نہیں شرماتا۔“

نیز سورۃ الاحزاب (آیت: ۵۳) میں ارشاد الہی ہے:

﴿وَاللَّهُ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ﴾ ”لیکن اللہ سچی بات کے کہنے سے شرم نہیں کرتا۔“

خود پیکر شرم و حیا نبی اکرم ﷺ نے ایسے مسائل اپنی امت کے تمام افراد مرد و زن کے لیے بیان فرمائے اور ان مسائل کو اُمہات المؤمنین رضی اللہ عنہن نے کمال دیانت سے اُمت تک پہنچایا۔ جب عفت مآب صدیقہ کائنات رضی اللہ عنہا سے ان مسائل کی بکثرت احادیث مروی ہیں اور اُمہ المؤمنین حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں تو آج ہماری ماؤں، بہنوں اور بہو بیٹیوں کو چھیں بہ جبیں نہیں ہونا چاہیے اور نہ مردوں

① صحیح البخاری مع الفتح (۱/۳۸۸) صحیح مسلم (۱/۳/۲۲۳، ۲۲۴) صحیح سنن أبي داود، رقم الحديث (۲۳۷) صحیح سنن الترمذی، رقم الحديث (۱۰۶) صحیح سنن النسائی، رقم الحديث (۹۰) سنن ابن ماجہ، رقم الحديث (۱۹۲۴) الفتح الرباني (۲/۷۴) سنن الدارمی (۷۶۳) طبع دار الكتاب العربي.

کے لیے اس سلسلے میں ضرورت سے زیادہ شرمیلا پن مناسب ہے۔

شرم و حیا اور علم:

شرم و حیا کی حدود کو اتنا بھی تنگ نہ کر دیا جائے کہ مسائل دین ہی اوجھل رہ جائیں۔ البتہ بعض مواقع پر تو شرم و حیا قابل تعریف ہے، جیسے اکابرین اور بڑوں کے سامنے احتراماً حیا کرنا، جو ایک شرعی مسئلہ ہے۔ وہ حیا مفردات القرآن میں امام راغب اصفہانی کے بقول ”انقباض النفس عن القبیح“ ہے کہ برائی سے نفس انسانی جو انقباض سا محسوس کرتا، اسے حیا کہا جاتا ہے۔

آگے فرماتے ہیں:

”وَهُوَ مِنْ خَصَائِصِ الْإِنْسَانِ لِيَرْتَدَّ عَنْ إِرْتِكَابِ كُلِّ مَا يَشْتَهِي، فَلَا يَكُونُ كَالْبَهِيمَةِ وَهُوَ مُرَكَّبٌ مِنْ جُبْنٍ وَعِفَّةٍ فَلِذَلِكَ لَا يَكُونُ الْمُسْتَحْيُ فَاسِقًا“
 ”یہ حیا تو انسان کے خصائص میں سے ہے، تاکہ وہ ہر نفسانی خواہش کی تکمیل و ارتکاب سے رکا رہے اور کہیں حیوان نہ بن جائے۔ یہ شرعی حیا بزدلی اور پاکیزگی کا مجموعہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حیا دار شخص فاسق (کبار کا ارتکاب کرنے والا اور کھلے عام برائی کرنے والا) نہیں ہوتا۔“

امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”إِنَّ الْحَيَاءَ يَمْنَعُ صَاحِبَهُ مِنْ إِرْتِكَابِ الْمَعَاصِي كَمَا يَمْنَعُ الْإِيْمَانَ“
 ”حیا بھی انسان کو گناہوں کا ارتکاب کرنے سے اسی طرح روکتی ہے، جیسے ایمان روکتا ہے۔“
 صحیح بخاری و مسلم اور موطا امام مالک میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:
 «الْحَيَاءُ مِنَ الْإِيْمَانِ»^① ”حیا ایمان کا جزو ہے۔“

سنن ابن ماجہ میں ہے:

«الْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِنَ الْإِيْمَانِ»^② ”حیا ایمان کا ایک شعبہ ہے۔“

① صحیح البخاری مع الفتح (۷۴ / ۱) صحیح مسلم (۶ / ۲ / ۱) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث

(۲۱۰۹) الموطأ مع المسوی (۴۶۱ / ۲) باب فضل الحیاء.

② سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۵۸)

اسی طرح: «الْحَيَاءُ لَا يَأْتِي إِلَّا بِخَيْرٍ»^① ”حیا کا نتیجہ بھلائی ہی ہے۔“ سے بھی وہی حیا

مراد ہے۔

اگر کہیں ایسی صورت حال ہو کہ گناہ کا ارتکاب کرتے وقت حیا دامن گیر ہو اور وہ گناہ سے رک جائے تو یہ قابلِ تعریف حیا ہے، جو اسلام میں مطلوب ہے، لیکن اگر حیا نام کا جذبہ کسی شرعی امر کے ترک کرنے کا موجب بن رہا ہو تو وہ حیا شرعی نہیں، بلکہ حیا کے نام سے ضعف و مداہنت ہے، جو قابلِ مذمت ہے اور اس کی حدود دراصل کبر و نخوت سے جا ملتی ہیں۔ اس شرم و تکبر سے ملے جلے جذبہ مذمومہ کا نتیجہ حصولِ علم سے پہلو تہی، بلکہ محرومی تک پہنچ جاتا ہے۔ صحیح بخاری کے ایک ترجمہ الباب میں تعلیقاً اور ”حلیۃ الأولیاء لأبی نعیم“ میں صحیح سند سے موصولاً مروی حضرت امام مجاہدؒ کا ارشاد ہے:

”لَا يَتَعَلَّمُ الْعِلْمَ مُسْتَحْيٍ وَلَا مُتَكَبِّرٍ“^②

”شرم و حیا اور تکبر کرنے والا شخص علم نہیں سیکھ سکتا۔“

جن لوگوں کو علم دین کا حصول اور روز مرہ زندگی کے مسائل کی معرفت عزیز تھی، وہ مرد تو کجا عورتیں تک خود ایسے ایسے مسائل پوچھ لیا کرتی تھیں کہ آج واقعی وہ ان کی بڑی جرأت معلوم ہوتی ہے، لیکن وہ جرأت مذموم بھی نہیں تھی، بلکہ اُم المؤمنین حضرت عائشہؓ نے ان کی تعریف کی ہے، چنانچہ صحیح بخاری میں تعلیقاً اور صحیح مسلم میں موصولاً مروی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا:

”نِعْمَ النِّسَاءُ نِسَاءُ الْأَنْصَارِ، لَمْ يَمْنَعُهُنَّ الْحَيَاءُ أَنْ يَتَفَقَّهْنَ فِي الدِّينِ“^③

”بہترین عورتیں انصارِ مدینہ کی عورتیں ہیں۔ (نام نہاد) حیا نے انھیں تفقہ فی الدین

(علم دین) کے حصول سے نہیں روکا۔“ رضی اللہ عنہن و أَرْضَاهُنَّ.

امید ہے کہ بات پوری واضح ہوگئی ہوگی، تو آئیے اب آگے چلتے ہیں۔

① فتح الباری (۱/۷۴-۷۵)

② صحیح البخاری مع الفتح (۱/۲۲۸)

③ صحیح البخاری مع الفتح (۱/۲۲۸) مختصر صحیح مسلم للمنذری، رقم الحدیث (۷۱۲) صحیح

سنن أبي داود، رقم الحدیث (۳۰۸) و سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (۶۴۲)

5- خروج مذی:

نواقض وضو میں سے ”مَا خَرَجَ مِنَ السَّبِيلَيْنِ“ کے تحت ہی یہ بھی آتی ہے، لیکن یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ جماع و احتلام کی شکل میں جو مادہ منویہ (لذت، شہوت اور ٹپک کے ساتھ) نکلتا ہے، جس سے انسان کی تخلیق ہوتی ہے، اس (منی) کے خروج سے تو غسل واجب ہو جاتا ہے۔ خواہ وہ خروج مذکورہ فطری طریقوں سے ہو یا غیر فطری ذرائع سے، اس میں کوئی فرق نہیں ہے۔

نواقض وضو میں سے ”مذی“ سے مراد لیس دار مادے کا وہ قطرہ ہے، جو ملاعبت یعنی بوس و کنار کے نتیجے میں عضو تناسل سے نمودار ہوتا ہے۔ یہ نوجوان اور طاق توراخص کے ساتھ خاص ہے۔ اس کے خروج سے غسل واجب نہیں ہوتا، بلکہ اس کے بعد صرف استنجا اور وضو کر کے نماز ادا کی جاسکتی ہے، جیسا کہ بخاری شریف و مسلم میں حضرت علیؓ سے مروی ہے:

«كُنْتُ رَجُلًا مَذَّاءً فَأَمَرْتُ الْمِقْدَادَ أَنْ يَسْأَلَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ... فِيهِ الْوُضُوءُ»⁽¹⁾

”میں بکثرت مذی والا آدمی تھا تو میں نے حضرت مقدادؓ سے کہا کہ وہ نبی اکرمؐ سے اس کے بارے میں حکم پوچھیں، (تو نبی اکرمؐ نے ارشاد فرمایا:) اس میں وضو ہے۔“

بخاری شریف ہی کی ایک دوسری روایت میں ہے:

«تَوَضَّأَ وَأَغْسَلَ ذَكَرَكَ»

مسلم شریف میں تقدیم و تاخیر کے ساتھ یوں مذکور ہے:

«اغْسِلْ ذَكَرَكَ وَتَوَضَّأَ» ”قضیب کو دھولو، یعنی استنجا کر لو اور پھر وضو کر لو۔“

معنی دونوں کا ایک ہی ہے، البتہ مسلم شریف میں ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

اس حدیث میں تو صرف اتنا ہی مذکور ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت مقدادؓ کو مذکورہ

مسئلہ پوچھنے کے لیے بھیجا، جب کہ صحیح بخاری ہی میں ایک دوسری روایت میں اس کا سبب بھی مذکور ہے۔ چنانچہ حضرت علیؓ فرماتے ہیں:

«لِمَكَانِ ابْنَتِهِ»⁽²⁾ ”آپؐ کی بیٹی میری زوجیت میں ہونے کی وجہ سے۔“

(1) صحیح البخاری مع الفتح (1/230) صحیح مسلم مع شرح النووي (1/3، 121، 213) بلوغ المرام مع

السبل (1/1، 65 بیروت)

(2) صحیح البخاری مع الفتح (1/379)

ایک اور روایت میں ہے: ”لِمَكَانِ فَاطِمَةَ“ ”فاطمہ کی وجہ سے۔“

مطلب یہ کہ نبی اکرم ﷺ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں تھیں اور سسر و داماد کے باہمی حساس رشتے کی بنا پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خود مذکورہ مسئلہ پوچھنے کے بجائے اپنے ساتھی حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کو بھیجا، اس رشتے کی نزاکت کا یہی تقاضا تھا کہ وہ اس مسئلے میں حیا کے پیش نظر یہی طریقہ اپنائیں۔ ”المجموع شرح المہذب“ میں امام نووی رضی اللہ عنہ نے اور فتح الباری میں حافظ ابن حجر رضی اللہ عنہ نے لکھا ہے کہ ادب کا تقاضا یہی تھا کہ داماد اپنے سسرالی رشتے داروں سے ایسے امور کے متعلق گفتگو نہ کرے۔ یہ شک ہو سکتا تھا کہ اس مادے کا خروج شاید صرف مردوں ہی میں ہو، عورتوں میں نہ ہو، لیکن امام نووی رضی اللہ عنہ نے اس شک کو بھی رفع کر دیا ہے، چنانچہ ”المجموع“ ہی میں موصوف نے لکھا ہے کہ اس مادے کا خروج صرف مرد کے ساتھ خاص نہیں بلکہ عورت تو اس معاملے میں مرد سے بھی آگے ہے۔^(۱)

سنن ابی داؤد اور مسند احمد میں اس حدیث علی رضی اللہ عنہ کی جو روایت ہے، اس میں یہ الفاظ

بھی منقول ہیں:

«يَغْسِلُ ذَكَرَهُ وَأُنْثِيَّتَهُ وَيَتَوَضَّأُ»

موطا امام مالک اور ابو داؤد ہی کی ایک دوسری حضرت عبداللہ بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث

میں ہے:

«فَتَغْسِلُ مِنْ ذَلِكَ فَرْجَكَ وَأُنْثِيَّتِكَ وَتَوَضَّأُ وَضُوءَكَ لِلصَّلَاةِ»^(۲)

ان دونوں روایتوں کا مفہوم ایک ہی ہے: ”ایسے میں استنجا کرتے وقت (مرد) شرم گاہ

کے ساتھ اپنے ہی نصیبے بھی دھوئے اور پھر وضو کرے۔“

خروج مذی سے متعلقہ احادیث:

نواقض وضو میں سے مذی کا ذکر ہو رہا ہے اور آخر میں دو روایتیں سنن ابی داؤد وغیرہ کے

حوالے سے ذکر کی جا چکی ہیں، جن میں مذی کے خروج پر استنجا کرنے اور مردوں کے لیے نصیبے بھی

(۱) الفروع (۱۵۱/۲-۱۵۲)

(۲) مختصر السنن للمنزدي (۱/۱۴۸) جامع الأصول (۸/۱۱۲) تحقیق فتح الباری (۱/۳۸۰)

دھونے کا ذکر ہے۔ یہ مسئلہ توفی ذاتہ صحیح ہے، کیوں کہ دوسری روایت سے ثابت ہے، البتہ ان دونوں میں سے پہلی روایت مطعون ہے، کیوں کہ وہ ”عروۃ عن علی“ کے سلسلہ سند سے مروی ہے جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے عروہ کا سماع یعنی حدیث سننا ثابت نہیں، جیسا کہ امیر صنعانی نے ”سبل السلام“ میں لکھا ہے۔^(۱)

لیکن علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے ”معالم السنن“ کی تہذیب میں ذکر کیا ہے کہ خصیوں کے لفظ والی حدیث صحیح ابوعوانہ میں مروی ہے اور اس کی سند میں عروہ بھی نہیں، بلکہ وہ متصل سند ہے۔^(۲)

”التلخیص الحبیر“ میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ عبیدہ عن علی کی سند والی حدیث پر کوئی طعن نہیں ہے اور حضرت عبد اللہ بن سعد انصاری رضی اللہ عنہ والی دوسری حدیث کی سند کو بھی ضعیف کہا گیا ہے، اگرچہ امام ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے۔^(۳)

امام ترمذی رحمہ اللہ کا اسے حسن قرار دینا غالباً شواہد کی بنا پر ہوگا اور صحیح ابی عوانہ والی حدیث اس کی بہترین شاہد ہے اور بقول امیر صنعانی، جب مجموعی طور پر حدیث کی صحت ثابت ہوگئی تو پھر اسے قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہونا چاہیے۔

”فتح الباری“ میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے خصیوں کو دھونے کی حکمت یہ ذکر کی ہے کہ اس طرح پانی کی بروقت اور ٹھنڈک کے نتیجے میں مذی کا خروج رک جائے گا۔ گویا یہ ایک طبی نقطہ ہے۔^(۴) ان احادیث میں مذکور ”دھونے“ کے لفظ سے استدلال کرتے ہوئے امام ابن دقیق العید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مذی کو پیشاب پر محمول نہیں کیا جاسکتا کہ صرف ڈھیلے کے استعمال ہی پر کفایت کی جاسکے، بلکہ اس کے لیے پانی سے استنجا کرنا ہی ضروری ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے شرح صحیح مسلم میں تو اسے ہی صحیح کہا ہے، جب کہ دوسری کتب میں اسے بھی پیشاب پر محمول کرتے ہوئے ڈھیلے کے استعمال کو کافی لکھا ہے، لیکن فتح الباری کے محقق شیخ ابن باز اور دیگر علما نے سنن ابی داؤد اور مسند احمد والی حدیث کے پیش نظر مذی کو دھونے کے ساتھ خاص کرنے میں امام ابن دقیق العید رحمہ اللہ کے قول کی

(۱) سبل السلام (۱/۱) ۶۵

(۲) تہذیب السنن (۱/۱۴۸-۱۴۹)

(۳) التلخیص الحبیر (۱/۱) ۱۱۷

(۴) سبل السلام (۱/۱) ۶۵ فتح الباری (۱/۳۸۱)

تائید کی ہے۔ قضیب کو دھونے کے سلسلے میں بعض مالکیہ و حنابلہ نے دھونے کے لفظ کی حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے استیعاب کو واجب قرار دیا ہے، لیکن جمہور اہل علم نے معنی کو پیش نظر رکھتے ہوئے استیعاب کو واجب نہیں کہا، کیوں کہ اسے دھونے کا موجب ایک چیز کا خروج ہے، لہذا اس کے خروج کی جگہ سے دوسرے حصے تک تجاوز کرنا واجب نہیں ہے۔^①

اس کی تائید اسماعیلی کی روایت کے ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے:

«فَقَالَ: تَوَضَّأَ وَأَغْسَلَهُ»

”آپ ﷺ نے فرمایا: وضو کرو اور (پہلے) اس (مذی) کو دھو دو۔“

»إِغْسِلَهُ« میں ہا کی ضمیر مذی کی طرف عائد ہے اور انہی احادیث سے مذی کی نجاست پر بھی استدلال کیا گیا ہے۔

6- ودی:

وہ گاڑھا، لیس دار اور سفید مادہ جو پیشاب سے متصل پہلے یا بعد میں دو ایک قطرے کی شکل میں خارج ہوتا ہے، اسے ”ودی“ کہا جاتا ہے۔ اس کے نکلنے پر بھی غسل کرنا واجب نہیں ہوتا، بلکہ ائمہ و فقہانے اسے بھی مذی کے حکم میں شمار کیا ہے اور بالاتفاق اس پر استنجا اور وضو ہی کافی ہے۔^②

سنن کبریٰ بیہقی اور سنن ائرم میں بعض آثار صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی پتا چلتا ہے کہ ودی پر صرف استنجا اور وضو ہی کافی ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انھوں نے منی، مذی اور ودی کے بارے میں فرمایا:

«فَالْمَنِيُّ مِنْهُ الْغُسْلُ، وَمِنْ هَذَيْنِ الْوُضُوءُ، يَغْسِلُ ذَكَرَهُ وَيَتَوَضَّأُ،»

”خروج منی پر تو غسل واجب ہے اور ان دونوں یعنی مذی و ودی پر قضیب کو دھونا اور وضو کرنا ہے۔“

دوسرا اثر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

«الْوَدِيُّ الَّذِي يَكُونُ بَعْدَ الْبَوْلِ، فِيهِ الْوُضُوءُ»^③

① فتح الباری (۱/۳۸۰)

② المجموع للنووی (۱۵۲/۲) اور فتاویٰ علمائے حدیث (۱/۴۵) ملاحظہ فرمائیں۔

③ بلوغ الأمانی شرح و ترتیب مسند أحمد (۲/۷۶) سنن ائرم بحوالہ المغنی (۱/۲۳۳) بتحقیق الترمذی.

”ودی جو پیشاب کے بعد ہوتی ہے، اس پر صرف وضو ہی ہے۔“ (یعنی استنجا و وضو ہے غسل واجب نہیں ہے)۔“

جریان اور لیکوریا، یا سیلان الرحم:

یہاں یہ بھی واضح کر دیں کہ بعض مردوں کو سلس المذی کا مرض ہوتا ہے کہ انہیں مذی کے قطرات مسلسل آتے رہتے ہیں، جسے ”جریان“ کا نام دیا جاتا ہے۔ اس بیماری والے مردوں کو بھی استنجا والی عورت کے حکم میں شمار کیا گیا ہے، لہذا ان پر بھی غسل نہیں، بلکہ محض استنجا اور وضو لازم ہے۔^① جو وہ ہر نماز کے ساتھ کریں گے۔ یہ ایک وضو سے ایک سے زیادہ نمازیں ادا نہیں کر سکتے اور بالائی کپڑوں کو صاف رکھنے کے لیے انڈرویئر استعمال کریں، جیسا کہ تقطیر البول یا سلس البول کے ضمن میں ذکر گزر چکا ہے۔

مردوں کی اس بیماری کی طرح بعض عورتوں کو بھی ایسی ہی بیماری ہوتی ہے، جسے سیلان الرحم یا لیکوریا کہا جاتا ہے۔ اس مرض میں مبتلا خواتین کی شرم گاہ سے ایک سفید رطوبت سی خارج ہوتی رہتی ہے۔ اس کا حکم بھی استنجا اور جریان والا ہی ہے کہ ایسی خواتین ہر نماز کے ساتھ نیا وضو کر لیا کریں اور کپڑوں کی نظافت و طہارت کا اہتمام رکھیں۔

سلس الاحتمام:

ایک اور صورت جس کا نواقض وضو سے تو تعلق نہیں، البتہ ہمارے موضوع کے قریبی متعلقات میں سے ہے، وہ صورت یہ ہے کہ کسی کو سلس الاحتمام کا مرض ہو اور ہر رات سونے میں بد خوابی ہو جاتی ہو تو ایسا شخص اٹھ کر غسل کرے، یہ اس پر واجب ہے اور پھر نمازیں وغیرہ ادا کرتا رہے، جو عام فہم سی بات ہے اور اگر وہ حج کرنا چاہے تو بھی ممکن اور جائز ہے، اس کی صورت بھی حیض والی عورت کی طرح ہے مگر اس بیماری والا شخص روزانہ غسل کر لیا کرے اور تمام اعمال حج میں شامل رہے اور طہارت کی حالت میں طواف بھی کر لیا کرے۔^②

① فتح الباری (۱/۳۸۱)

② فتاویٰ علمائے حدیث (۱/۷۰-۷۱)

7- خون استحاضہ:

نواقض وضو کے ضمن میں ”مَا خَرَجَ مِنَ السَّبِيلَيْنِ“ سے متعلقہ نواقض کا ذکر چل رہا ہے تو انہی میں سے خون استحاضہ بھی ہے، جس کا بار بار ذکر گزرا ہے۔ خون حیض تو غسل کا موجب ہے، لیکن خون استحاضہ کے لیے صرف وضو ہی کافی ہے، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم، ابن ماجہ کے سوا سنن اربعہ، صحیح ابن حبان اور موطا امام مالک رضی اللہ عنہ کے حوالے سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حضرت فاطمہ بنت ابی حمیش کے استحاضے سے تعلق رکھنے والی حدیث گزری ہے، جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے «ثُمَّ تَوَضَّئِي لِكُلِّ صَلَاةٍ...» فرما کر ”ہر نماز کے ساتھ وضو کرنے کا حکم فرمایا تھا۔“ جیسا کہ سلسل ابول کے ضمن میں اس حدیث کی نص اور انڈرویئر کے استعمال کا پتہ دینے والی احادیث کی طرف اشارہ گزرا ہے۔ ان احادیث کی بنا پر جمہور اہل علم کے نزدیک ایام حیض کے بہ قدر وقت گزرنے کے بعد اور غسل حیض کے بعد آتا رہنے والا خون ناقض وضو ہے، موجب غسل نہیں۔ ایسی عورت کے لیے ہر نماز کے ساتھ وضو کرنا واجب ہے، ایک وضو سے وہ متعدد نمازیں نہیں پڑھ سکتی۔^①

8- شرم گاہ کو چھونا:

نواقض وضو میں سے آٹھواں ناقض ”مَا خَرَجَ مِنَ السَّبِيلَيْنِ“ سے تو نہیں، البتہ سبیلین سے تعلق رکھتا ہے اور وہ ہے شرم گاہ کو چھونا۔ اس کے ناقض یا غیر ناقض ہونے کے بارے میں اہل علم کی دو الگ الگ آرا ہیں:

پہلی رائے:

جمہور اہل علم کی رائے یہ ہے کہ شرم گاہ کو چھونا ناقض ہے اور اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ خصوصاً جب کہ درمیان میں کوئی چیز حائل نہ ہو اور یہ چھونا بھی شہوت کے باعث ہو، ان کا استدلال متعدد احادیث سے ہے۔ چنانچہ ان میں سے ایک حدیث سنن اربعہ، صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ، مسند احمد و شافعی، موطا امام مالک، مستدرک حاکم اور منشی ابن جارود میں متعدد طرق سے مروی ہے، جسے کثیر محدثین کرام نے صحیح قرار دیا ہے اور امام بخاری رضی اللہ عنہ نے اسے اس موضوع کی صحیح ترین

① بلوغ الأمانی شرح مسند أحمد (۲/۷۶)

حدیث قرار دیا ہے۔ محدثین کے اقوال کی تفصیل میں جانے کے بجائے ہم چند کتب کے حوالے دے دیتے ہیں۔ تفصیل درکار ہو تو وہ ”التلخیص الحبیر لتخریج أحادیث الرافعی الکبیر“ (۲/ ۱۲۲- ۱۲۳) ”الفتح الربانی ترتیب و شرح مسند أحمد الشیبانی“ (۲/ ۸۶- ۸۷) ”سنن الترمذی مع تحفة الأحوذی (۱/ ۲۷۰، ۲۷۳) ”نیل الأوطار“ (۱/ ۱/ ۱۹۷) ”سبل السلام“ (۱/ ۱/ ۶۷- ۶۸) ملاحظہ فرمائیں۔

یہ مذکورہ حدیث حضرت بسرہ بنت صفوان رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ مَسَّ ذَكَرَهُ فَلَا يُصَلِّي حَتَّى يَتَوَضَّأَ»^(۱)

”جو شخص اپنے قضیب کو چھوئے تو وہ اس وقت تک نماز نہ پڑھے، جب تک وضو نہ کر لے۔“

اس حدیث کی تائید میں دیگر متعدد احادیث بھی مروی ہیں، جو امیر صنعانی صاحب سبل السلام کے بقول سترہ صحابہ و صحابیات رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں، ان میں سے بعض میں اس بات کی صراحت بھی پائی جاتی ہے کہ اس معاملے میں مرد وزن اور قبل و دبر کا کوئی فرق نہیں ہے۔ مثلاً حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے سنن ابن ماجہ، بیہقی اور طحاوی میں مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ مَسَّ فَرْجَهُ فَلْيَتَوَضَّأَ»^(۲) ”جس نے شرم گاہ کو چھوا، وہ وضو کرے۔“

اس حدیث میں لفظ فرج عام ہے، جو امام مالک رضی اللہ عنہ کے نظریے کی تردید کرتی ہے، کیوں کہ انھوں نے مس فرج سے نفقہ وضو کو مردوں کے ساتھ خاص کیا ہے، نیز اس کی تردید سنن دارقطنی، بیہقی اور مسند احمد کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے، جو ”عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده“ کی سند سے مروی ہے، جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

«أَيُّمَا رَجُلٍ مَسَّ فَرْجَهُ فَلْيَتَوَضَّأَ، وَأَيُّمَا امْرَأَةٍ مَسَّتْ فَرْجَهَا فَلْيَتَوَضَّأَ»^(۳)

(۱) صحیح سنن أبی داود، رقم الحدیث (۳۷/ ۱) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۷۱، ۷۳) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۱۵۷) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۴۷۹) سنن الدارمی (۷۲۴، ۷۲۵) صحیح الجامع، رقم الحدیث (۴۵۵۴) موارد الظمان، رقم الحدیث (۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳)

(۲) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۴۸۱) المنتقی مع النیل (۱/ ۱/ ۱۹۹) و صححہ الألبانی فی الإوراء (۱/ ۱۵۰)

(۳) المنتقی مع النیل (۱/ ۱/ ۲۰۰) الفتح الربانی (۲/ ۵۸) التلخیص الحبیر (۱/ ۱/ ۱۲۴) و صحیح الجامع، رقم الحدیث (۳۷۲۵)

”جو مرد اپنی شرم گاہ کو چھوئے، وہ وضو کرے اور جو عورت اپنی شرم گاہ کو چھوئے، وہ وضو کرے۔“

ترمذی کی کتاب العلل کے حوالے سے امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے ”نیل الأوطار“ میں لکھا ہے کہ اس کے بارے میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے:

”وہذا عندی صحیح“ ”یہ حدیث میرے نزدیک صحیح ہے۔“

علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے ”المحلی“ (۱/ ۱) (۲۳۸) میں کہا ہے کہ شرم گاہ صرف قبل ہی ہے، دُبر نہیں۔ لیکن امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے ”نیل الأوطار“ میں اس نظریے کی تردید کی اور کہا ہے کہ قبل ہو یا دُبر، دونوں ہی شرم گاہ (فرج) ہیں۔

ایک حدیث سے اس بات کی وضاحت بھی ہوتی ہے کہ اگر کوئی کپڑا وغیرہ حائل نہ ہو، تب وضو ٹوٹتا ہے، ورنہ نہیں، یعنی اگر کپڑے کے اوپر سے ہاتھ لگ جائے تو یہ ناقض وضو نہیں ہے، جیسا کہ صحیح ابن حبان، مسند احمد، مستدرک حاکم، سنن بیہقی اور معجم طبرانی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ أَفْضَىٰ بِيَدِهِ إِلَىٰ ذَكَرِهِ لَيْسَ دُونَهُ سِتْرٌ فَقَدْ وَجَبَ عَلَيْهِ الْوُضُوءُ»^(۱)

”جس نے اپنا ہاتھ کسی رکاوت کے بغیر قضیب تک پہنچایا تو اس پر وضو واجب ہے۔“

”الإفضاء“ کے لفظ سے استدلال کرتے ہوئے شافعیہ نے کہا ہے کہ وضو صرف تب ٹوٹے

گا، جب شرم گاہ کو صرف ہاتھ کی اندرونی جانب ہتھیلی کی جانب سے چھوا گیا، لیکن علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ ہاتھ کی اندرونی اور بیرونی دونوں جانب کے لیے برابر ہے اور شوافع کی یہ تفریق قرآن و سنت، اجماع امت، کسی صحابی کے قول، قیاس اور صحیح رائے کسی سے بھی ثابت نہیں۔^(۲)

اسی موضوع کی دیگر احادیث کی تخریج حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ”التلخیص الحبیر“ میں،

امام ترمذی نے اپنی سنن میں اور علامہ مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ نے ”تحفة الأحوذی“ میں کر دی ہے۔ لہذا

[۱] موارد الضمان (۲۷، ۲۵) رقم الحدیث (۲۱۰) الممتقی (۱/ ۱) (۱۹۹) و الصحیحۃ (۳/ ۳) (۲۳۷) صحیح الجامع (۳۶۲)

[۲] نیل الأوطار (۱/ ۱) (۱۹۹) محلی ابن حزم (۱/ ۱) (۲۳۷-۲۳۸) التلخیص الحبیر (۱/ ۱) (۱۲۶)

انہیں وہیں اور دیگر کتب میں دیکھا جاسکتا ہے۔

ان سب احادیث کے مجموعی مفاد کا خلاصہ یہ ہے کہ شرم گاہ کو ہاتھ اندرونی جانب سے لگے یا بیرونی سے، شرم گاہ میں قبل ہو یا دبر اس معاملے میں مرد ہو یا عورت، کسی پردے یا حائل کپڑے کے بغیر ہو، وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ تین مکاتب فکر کے ائمہ امام شافعی، امام مالک اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کے علاوہ جمہور ائمہ و فقہاء کا یہی مسلک ہے۔ مالکیہ اور شافعیہ میں جو تفصیل ہے، وہ بھی ذکر کی جا چکی ہے۔ امام اوزاعی اور اسحاق بن راہویہ کا بھی یہی مسلک ہے۔ ”کتاب الاعتبار للحازمی“ (ص: ۴۰) کے حوالے سے علامہ مبارکپوری نے ”تحفة الأحوذی“ میں بارہ کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور گیارہ معروف تابعین رضی اللہ عنہم کے اسمائے گرامی نام بہ نام ذکر کیے ہیں، جو مس فرج سے وضو ٹوٹنے کے قائل ہیں۔^①

دوسری رائے:

مس فرج کے بارے میں ایک دوسرا مسلک یہ ہے کہ اس سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ یہ امام ابوحنیفہ، ابن المبارک، یحییٰ بن معین اور بعض دیگر فقہاء رضی اللہ عنہم کا مسلک ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ”کتاب الاعتبار“ (ص: ۴۰) کی رو سے حضرت علی بن ابی طالب، عمار بن یاسر، عبد اللہ بن مسعود اور ایک روایت کے مطابق سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم سے بھی اسی کی روایت ملتی ہے اور تابعین میں سے سعید بن مسیب، سعید بن جبیر، ابراہیم نخعی، ربیعہ بن عبد الرحمن اور سفیان ثوری رضی اللہ عنہم سے یہی مسلک منقول ہے۔^②

اس مسلک والوں کا استدلال سنن ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، دارقطنی اور مسند احمد میں طلق بن علی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے ہے، جس میں مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے پوچھا گیا کہ جو شخص اپنی شرم گاہ (قضیب) کو چھولے تو کیا اس پر وضو ہے؟ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

« إِنَّمَا هُوَ بُضْعَةٌ مِنْكَ » وَكَفُظُ التُّرْمِذِيِّ: « وَهَلْ هُوَ إِلَّا مُضْغَةٌ مِنْهُ أَوْ بُضْعَةٌ مِنْهُ »^③

① تحفة الأحوذی (۱/ ۲۷۳)

② نیل الأوطار (۱/ ۱۹۸) سنن الترمذی مع تحفة الأحوذی (۱/ ۲۷۵)

③ صحیح سنن أبي داود للألباني (۱/ ۳۷) سنن الترمذی مع التحفة (۱/ ۲۷۴) صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (۵۹) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۴۸۳) نیل الأوطار (۱/ ۱۹۸) تخریج المغنی (۱/ ۲۴۱)

”کیا وہ اسی کا ایک حصہ نہیں ہے۔“

گویا استفہام انکاری سے واضح کر دیا گیا ہے کہ وہ بھی تو جسم کا ایک حصہ ہی ہے، لہذا اس کو چھونے پر وضو کیوں؟

امام ابن حبان، طبرانی اور ابن حزم نے اس حدیث کو بھی صحیح قرار دیا ہے، بلکہ فلاس، علی بن مدینی اور طحاوی نے اس حدیث کو حدیثِ بسرہ سے احسن قرار دیا ہے، جب کہ امام شافعی، ابو حاتم، ابو زرعہ، دارقطنی، بیہقی اور ابن الجوزی رحمہم اللہ نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے اور امام ابن حبان، طبرانی، ابن العربی، حازمی اور دیگر ائمہ نے اس حدیث کو حدیثِ بسرہ رحمہم اللہ کی وجہ سے منسوخ قرار دیا ہے۔^(۱)

امام ترمذی رحمہم اللہ نے اسی مفہوم کی ایک اور حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے، جو حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور وہ حدیث سنن ابن ماجہ میں ہے، مگر اس کی سند میں دو راوی منکلم فیہ ہیں۔ ایک جعفر بن زبیر ہے، جس کو متروک قرار دیا گیا ہے اور دوسرا راوی قاسم ہے، جو ضعیف ہے، حتیٰ کہ خود امام طحاوی رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ امام بخاری، نسائی اور دارقطنی نے جعفر بن زبیر کو متروک قرار دیا اور قاسم ضعیف ہے۔ شیخ محمد فواد عبدالباقی اور علامہ بوصیری کے بقول اس حدیث کی سند میں جعفر بن زبیر ہے، جس کی مروی حدیث کو ترک کرنے پر محدثین کا اتفاق ہے اور ان کے نزدیک وہ مہتمم ہے۔ اسی موضوع کی ایک تیسری روایت حضرت عصمہ بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، مگر اسے بھی امام زیلعی رحمہم اللہ نے ضعیف کہا ہے۔^(۲)

تو گویا اس موضوع کی صرف ایک ہی حدیث ہے، جسے بعض محدثین نے صحیح اور بعض نے ضعیف قرار دیا ہے۔

مسئلہ اول کی ترجیح کی وجوہات:

پہلے مسلک کی تائید میں حضرت بسرہ رضی اللہ عنہ کے علاوہ بھی متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی صحیح اور صالح احادیث موجود ہیں، جن کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اگر اس اختلافِ رائے کو صرف دو حدیثیں سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو ایک طرف حدیثِ بسرہ رحمہم اللہ ہے اور دوسری طرف حدیثِ طلق رضی اللہ عنہ۔

[۱] التلخیص لابن حجر (۱/۱/۱۲۵) نیل الأوطار (۱/۱/۱۹۸) التحفة (۱/۲۸۰)

[۲] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: سنن الترمذی مع تحفة الأحوذی (۱/۲۷۵) سنن ابن ماجہ بتحقیق محمد فؤاد (۱/۱۶۳)

امام طحاوی نے فلاس اور علی بن مدینی کی طرف منسوب کرتے ہوئے کہا ہے کہ انھوں نے حدیثِ طلق رضی اللہ عنہ کو حدیثِ بسرہ رضی اللہ عنہما سے احسن واثبت قرار دیا ہے۔

(1) دیگر محدثین نے حدیثِ بسرہ رضی اللہ عنہما کو اثبت، اقویٰ اور ارجح قرار دیا ہے۔

(2) امام بیہقی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حدیثِ بسرہ رضی اللہ عنہما کے حدیثِ طلق رضی اللہ عنہ سے راجح ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ امام بخاری و مسلم نے نہ تو حدیثِ طلق رضی اللہ عنہ روایت کی ہے اور نہ اس کے راویوں میں سے کسی راوی سے احتجاج کیا ہے، جب کہ حدیثِ بسرہ کے تمام راویوں سے امام بخاری اور مسلم نے احتجاج کیا ہے، الا یہ کہ انھوں نے اس حدیث کی تخریج اپنی صحیحین میں نہیں کی اور اس کی وجہ بھی کوئی خاص نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اسماعیلی نے کہا ہے کہ اس حدیثِ بسرہ رضی اللہ عنہ کی نظیر صحیح بخاری میں موجود ہے، لہذا ان پر اس حدیث کا اپنی صحیح میں لانا لازم تھا۔⁽¹⁾

(3) حدیثِ بسرہ رضی اللہ عنہ والے مسلک کے راجح ہونے کی تیسری وجہ یہ بھی ہے کہ حضرت طلق رضی اللہ عنہ جن سے عدم نقض والی حدیث مروی ہے، خود انہی سے معجم طبرانی میں اس کے برعکس اور حدیثِ بسرہ رضی اللہ عنہ کی موید روایت بھی مروی ہے، جس میں مذکور ہے:

«مَنْ مَسَّ فَرْجَهُ فَلَيْتَوْضَأُ»⁽²⁾ ”جو اپنی شرم گاہ کو چھوئے تو وہ وضو کرے۔“

حافظ ابن حجر عسقلانی رضی اللہ عنہ اور امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے امام طبرانی سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے اس حدیثِ طلق رضی اللہ عنہ کو صحیح قرار دیا ہے۔⁽³⁾

مزید لکھا ہے: یوں لگتا ہے کہ حضرت طلق رضی اللہ عنہ نے شروع شروع میں تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے وہی حدیث سنی ہو، جس میں وضو نہ ٹوٹنے کا تذکرہ ہے اور پھر بعد میں کبھی یہ دوسری حدیث بھی سنی ہو، جو حدیثِ بسرہ رضی اللہ عنہ کے موافق ہے، جس کی رو سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ کا مذکورہ کلام نقل کرنے کے بعد امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے ”نیل الأوطار“ میں لکھا ہے:

«فَالظَّاهِرُ مَا ذَهَبَ إِلَيْهِ الْأَوْلُونَ»⁽³⁾

(1) التلخیص الحبیر (۱/۱) ۱۲۵ و تحفة الأوحذی (۱/۲۷۶) سبل السلام (۱/۱) ۶۸

(2) نیل الأوطار (۱/۱) ۱۹۸

(3) التلخیص الحبیر (۱/۱) ۱۲۴ نیل الأوطار (۱/۱) ۱۹۸

(4) نیل الأوطار (۱/۱) ۱۹۸

”جن لوگوں کا ذکر پہلے ہوا ہے، ان کا مسلک نقض ہی ظاہر ہے۔“

علامہ امیر صنعانی نے ”سبل السلام شرح بلوغ المرام“ میں لکھا ہے کہ حدیث بسرہ رضی اللہ عنہا اس کے صحیح کہنے والوں کی کثرت اور شواہد کی کثرت کی بنا پر زیادہ راجح ہے۔^(۱) اس بات کا اعتراف بقول علامہ مبارکپوری خود بعض علمائے احناف نے بھی کیا ہے (موصوف کا اشارہ علامہ عبدالحی لکھنوی کی طرف ہے) انھوں نے موطا امام محمد رضی اللہ عنہ کے حاشیہ ”التعلیق الممجد“ میں کہا ہے:

”الْبَانِصَافُ فِي هَذَا الْبَحْثِ أَنَّهُ إِنْ اخْتِيرَ طَرِيقُ التَّرْجِيحِ فَأَحَادِيثُ النَّقْضِ كَثْرَةٌ وَقَوَّةٌ“

”اس بحث میں انصاف کی بات یہ ہے کہ اگر اس میں ترجیح کا راستہ اختیار کیا جائے تو وضو کے ٹوٹ جانے کی احادیث ہی زیادہ اور قوی ہیں۔“

شرح وقایہ کے حاشیہ ”السعیة“ میں مولانا لکھنوی موصوف ہی لکھتے ہیں:

”إِنَّ أَحَادِيثَ النَّقْضِ أَكْثَرُ وَأَقْوَى مِنْ أَحَادِيثِ الرَّخْصَةِ“^(۲)

”وضو ٹوٹنے پر دلالت کرنے والی احادیث، رخصت والی احادیث سے اکثر اور اقوی ہیں۔“

(۴) انہی وجوہات ترجیح میں سے چوتھی وجہ یہ بھی ہے کہ بعض کبار محدثین کرام نے حدیث طلق رضی اللہ عنہ کو منسوخ اور حدیث بسرہ رضی اللہ عنہا کو اس کی ناسخ کہا ہے، چنانچہ امام ابن حبان نے اپنی صحیح میں لکھا ہے کہ حدیث طلق رضی اللہ عنہ نے لوگوں کی کثیر تعداد کو اس وہم میں مبتلا کر دیا ہے کہ یہ حدیث بسرہ رضی اللہ عنہا کے معارض و مخالف ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، کیوں کہ وہ تو حدیث ہی منسوخ ہے، کیوں کہ حضرت طلق بن علی رضی اللہ عنہ کی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آمد ہجرت کے پہلے سال میں تھی، جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان مسجد نبوی کی تعمیر فرما رہے تھے اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ۷ھ میں مسلمان ہوئے، گویا حضرت طلق رضی اللہ عنہ والی حدیث سے سات سال بعد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ والی حدیث صادر ہوئی۔ امام صاحب موصوف نے لکھا ہے کہ حضرت طلق رضی اللہ عنہ نے ہجرت کے پہلے سال ہی اپنے وطن واپسی اختیار کر لی تھی اور ان کا دوبارہ مدینہ طیبہ آنا بھی ثابت نہیں، جو شخص ان کی

(۱) سبل السلام (۱/۱/۶۸)

(۲) یکصین: تحفة الأحوذی (۱/۲۷۶)

دوبارہ واپسی کا دعویٰ کرے، وہ کسی صریح دلیل سے کرے، مگر یہ کیسے ثابت کیا جاسکتا ہے؟^①
 امام حازمی نے اپنی کتاب ”الاعتبار“ میں کافی تفصیل کے ساتھ پہلے حدیثِ طلق رضی اللہ عنہ کی سند میں نکارت اور روایت میں ضعف و رکاکت ثابت کی ہے اور پھر حدیثِ طلق رضی اللہ عنہ کو منسوخ اور حدیثِ بسرہ رضی اللہ عنہ کو ناسخ ثابت کیا ہے، اس نسخ کو یہ بات اور بھی یقینی کر دیتی ہے کہ خود حضرت طلق رضی اللہ عنہ ہی سے مس فرج سے نقض وضو کی حدیث بھی مروی ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت طلق رضی اللہ عنہ دونوں حالتوں کے شاہد ہیں، انھوں ہی نے ناسخ حدیث بیان کی ہے، جب کہ انھوں نے پہلے والی منسوخ حدیث بھی بیان کی تھی۔

امام حازمی کے جس کلام کا خلاصہ ہم نے ذکر کیا ہے، اسے نقل کرنے کے بعد علمائے احناف میں سے علامہ عبدالحی لکھنوی نے شرح وقایہ کے حاشیہ شرح ”السعیاء“ میں لکھا ہے:

”هَذَا تَحْقِيقٌ حَقِيقٌ بِالْقَبُولِ“

”یہ تحقیق اس بات کی مستحق ہے کہ اسے قبول کیا جائے۔“

موصوف مزید لکھتے ہیں:

”جائین کے دلائل پر نظر ڈالنے کے بعد یہ بات متحقق ہو جاتی ہے کہ نقض وضو پر دلالت کرنے والی احادیث، عدم والی احادیث سے اکثر اور اقویٰ ہیں اور رخصت یا عدم نقض والی احادیث پہلے کی ہیں۔ اگرچہ اس بات کا یقینی ثبوت کوئی نہیں کہ حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کی مرویات مراسل صحابہ میں سے ہیں، لیکن ظاہر وہی ہے۔ لہذا نقض وضو کو اختیار کرنے ہی میں زیادہ احتیاط ہے اور اگرچہ یہ مسئلہ ہر اعتبار سے قیاس کے خلاف ہے، لیکن جب حدیث آجائے تو پھر وہاں قیاس کی مجال ہی کیا ہے؟“

آگے علامہ لکھنوی رضی اللہ عنہ لکھتے ہیں:

”بعض کبار صحابہ مثلاً حضرت عبد اللہ بن عباس، علی اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کا عدم نقض کا قائل ہونا مرفوع احادیث کے صحیح سند سے ثابت ہو جانے کے بعد قادر نہیں رہتا۔ ان کی طرف سے یہ عذر ہو سکتا ہے کہ انھیں حضرت طلق رضی اللہ عنہ والی حدیث اور اسی مفہوم کی

① دیکھیں: المغنی (۱/ ۲۴۲) تحفة الأوحی (۱/ ۲۷۹)

دیگر روایات تو پہنچی ہوں، لیکن اس حکم کو منسوخ کرنے والی احادیث نہ پہنچی ہوں۔ اگر انہیں یہ ناسخ حدیث پہنچی ہوتی، تو وہ ضرور اسی حکم کو اختیار فرما لیتے اور یہ ناسخ حدیث کا نہ پہنچنا کوئی بعید از امکان بات بھی نہیں ہے، کیوں کہ نماز میں بہ وقت رکوع دونوں ہاتھوں کو باہم جوڑ کر گھٹنوں کے مابین رکھنا، جسے تطبیق کہا جاتا ہے، اس کے منسوخ ہو جانے کی خبر صحابہ کی ایک جماعت کو پہنچ گئی، لیکن حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو نہیں پہنچی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ کثرت سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں رہنے کے باوجود عمر بھر وہ تطبیق پر قائم رہے (یعنی رکوع کے وقت گھٹنوں کو پکڑ کر رکھنے کے بجائے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر دونوں گھٹنوں کے درمیان رکھا کرتے تھے)۔ لہذا احادیث نقض کا ان تک نہ پہنچنا کوئی انہونی بات بھی نہیں ہے۔^[۱]

محلی ابن حزم میں لکھا ہے کہ حدیث طلق رضی اللہ عنہ سند کے اعتبار سے تو صحیح ہے، لیکن اس میں قائلین عدم نقض کے لیے کئی وجوہات کی بنا پر کوئی دلیل و حجت نہیں ہے۔ ان میں سے پہلی وجہ یہ ہے کہ حدیث طلق رضی اللہ عنہ میں مس فرج سے وضو ٹوٹنے پر دلالت کرنے والی حدیث سے پہلے کے زمانے میں لوگوں کے عمل کا ذکر ہے (کہ پہلے وہ اس سے وضو کا ٹوٹنا نہیں جانتے تھے) اور اس میں کوئی شک نہیں اور اگر ایسا ہی ہے تو پھر اس حدیث کا حکم منسوخ ہو چکا ہے اور نسخ پر وہ ارشاد دلیل ہے، جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کرنے کا حکم فرمایا ہے۔ جب ایک چیز کے ناسخ اور دوسری کے منسوخ ہونے کا یقین ہو تو پھر یقینی ناسخ کو ترک کرنا اور یقینی منسوخ کو اختیار کرنا ہرگز جائز و حلال نہیں ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ: «هَلْ هُوَ إِلَّا بِضْعَةَ مَنْكَ؟» «کیا وہ تیرے جسم کا ہی ایک حصہ نہیں؟» اس بات کی بین دلیل ہیں کہ یہ حکم وضو کرنے کے حکم سے پہلے کا ہے، کیونکہ اگر یہ کلام بعد کا ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا ہرگز نہ فرماتے، بلکہ یہ بیان کرتے کہ اس کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد تو اس بات کی دلیل ہے کہ اس معاملے میں پہلے اصلاً کوئی حکم تھا ہی نہیں۔

آگے چل کر علامہ ابن حزم نے ان لوگوں کی بھی تردید کی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ مس فرج سے جس وضو کا حکم دیا گیا ہے، اس سے مراد لغوی وضو یعنی صرف ہاتھوں کو دھونا ہے۔ ان کے نزدیک اور

[۱] دیکھیں: تحفة الأحوذی (۱/ ۲۷۷-۲۸۰)

ایسے ہی دیگر محدثین کے نزدیک بھی یہ واجب ہے کہ شرعی الفاظ کو ان کے شرعی معانی پر محمول کیا جائے نہ کہ لغوی مفہوم پر، پھر سنن بیہقی اور محلی ابن حزم میں حضرت بسرہ بنت صفوان رضی اللہ عنہا سے اور سنن دارقطنی میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی احادیث میں: «فَلْيَوْضَأُ وَضُوءَهُ لِلصَّلَاةِ» کے الفاظ ہیں، جن کا معنی یہ ہے کہ ”وہ نماز کے لیے کیے جانے والے وضو کی طرح وضو کرے۔“^(۱)

(5) حدیث بسرہ رضی اللہ عنہا کی ترجیح کی وجوہات میں سے پانچویں وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے، جسے امام حازمی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ صحیح سند کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دائیں ہاتھ سے شرم گاہ کو چھونے سے منع فرمایا ہے، جیسا کہ آداب استنجا میں حدیث گزر چکی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شرم گاہ عام اعضاء جسم، انگوٹھے، ناک اور کان کی طرح نہیں ہو سکتی۔ اگر ایسی ہی ہوتی تو پھر اسے چھونے میں کوئی حرج نہیں تھا، لیکن ایسا نہیں ہے۔^(۲)

ان پانچوں وجوہات ترجیح کو سامنے رکھا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ جمہور اہل علم کا مسلک ہی راجح ہے کہ مس فرج پر وضو وجوباً کیا جائے اور اسی میں احتیاط بھی ہے۔

بچے کا پاخانہ دھونا:

فرج کے معاملے میں مرد و زن، بچے بڑے، محرم و غیر محرم، اپنے پرانے اور زندہ یا مردہ کا بھی کوئی فرق نہیں، جس کی تفصیل علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ”المحلی“ (۱/۱) اور امام محمد بن سعود رحمۃ اللہ علیہ اسلامک یونیورسٹی ریاض کے ڈائریکٹر ڈاکٹر عبداللہ عبدالرحمن التركي اور ان کے ایک ساتھی کی تحقیق و تخریج کے ساتھ شائع ہونے والی امام ابن قدامہ کی کتاب ”المغنی“ (۱/۲۴۰)، میں دیکھی جاسکتی ہے۔ جب شہوت کا داعیہ بھی شامل ہو تو پھر اس سے نقص وضو اور بھی متاثر ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ البانی رحمۃ اللہ علیہ جیسے کبار اہل علم نے تو اسی داعیہ کو پیش نظر رکھ کر حدیث بسرہ رضی اللہ عنہا اور حدیث طلق رضی اللہ عنہ میں تطبیق و مطابقت پیدا کی ہے کہ حدیث بسرہ رضی اللہ عنہا میں اس داعیہ کا دخل نہیں، جب کہ حدیث طلق رضی اللہ عنہ: «إِنَّمَا هُوَ بَضْعَةٌ مِّنْكَ» کے الفاظ میں ایک لطیف اشارہ موجود ہے، جو اس داعیہ کی موجودگی میں وضو ٹوٹنے کا پتا دیتا ہے۔^(۳)

(۱) المحلی و تحقیقہ لأحمد شاکر (۱/۲۳۹) و تحفة الأحوذی (۱/۲۷۶)

(۲) تحفة الأحوذی (۱/۲۷۹) مختصراً

(۳) تمام المنة (ص: ۱۰۳) و تحقیق مشکاة المصابیح (۱/۱۰۳-۱۰۴)

یہ مطابقت بھی اگرچہ کبار علما کی طرف منسوب ہے، لیکن اس سے بھی بہتر مطابقت وہ ہے، جس میں کپڑے کے حائل ہونے پر عدم نقض اور بغیر حائل کے نقض کا کہا گیا ہے اور راجح مسلک بھی جمہور ہی کا ہے کہ کپڑا حائل نہ ہو تو مس فرج سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

جب اس معاملے میں بڑے اور چھوٹے میں کوئی فرق نہیں کیا گیا تو پھر یہاں ایک بات خواتین بطور خاص ذہن نشین کر لیں کہ اگر وہ وضو سے ہوں اور اسی حالت میں انھیں بچی یا بچے کو نہلانا یا ان کے پاخانہ کرنے پر انھیں دھونا پڑے تو اس کے بعد وہ اپنا وضو ختم سمجھیں اور نماز وغیرہ کے لیے از سر نو وضو کر لیں۔ ”المحلی“ اور ”المغنی“ کی عبارات سے تو محسوس ہوتا ہے کہ امام عطاء، شافعی، ابو ثور اور احمد رضی اللہ عنہم کے نزدیک وہ وجوباً وضو کریں اور چھوٹے بڑے میں امام اوزاعی و زہری کے بقول اگر فرق مانا ہی جائے تو پھر بھی اس اختلاف سے نکلنے کے لیے احتیاطاً یہی بہتر ہے کہ وہ بچے کو دھونے کے بعد نماز وغیرہ کے لیے از سر نو وضو کر لیا کریں کہ یہ نہ صرف زیادہ قرین احتیاط ہے، بلکہ افضل بھی ہے۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ فرق پر دلالت کرنے والی جو روایت ہے، اسے ذکر کرنے کے بعد امام ابن قدامہ رضی اللہ عنہ نے اسے غیر ثابت قرار دیا ہے اور ”المغنی“ کے محققین نے لکھا ہے کہ ہماری متداول کتب میں یہ روایت سرے سے کسی میں موجود ہی نہیں ہے۔^①

9- نیند:

وہ امور جن سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، انہی میں سے ایک نیند بھی ہے کہ اگر کوئی شخص وضو سے ہو اور سو جائے تو اس کا وضو ٹوٹ جائے گا۔ بیدار ہونے پر اسے دوبارہ وضو کر کے نماز وغیرہ ادا کرنا ہوگی اور اس کے متعدد دلائل ہیں۔ چنانچہ سنن ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، صحیح ابن خزیمہ، ابن حبان، مسند احمد، شافعی، سنن دارقطنی اور سنن بیہقی میں ایک حدیث ہے، جسے امام بخاری رضی اللہ عنہ نے ”أحسن شیئ فی الباب“ قرار دیا ہے اور امام ترمذی، خطابی اور نووی نے اسے صحیح کہا ہے۔ اس حدیث میں حضرت صفوان بن عسال رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

«أَمَرَنَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا كُنَّا [مُسَافِرِينَ] أَوْ سَفَرًا أَنْ لَا نَنْزِعَ حِفَافَنَا ثَلَاثَةَ

① المغنی بتحقیق التركي (1/ 243-244)

﴿١﴾ أَيَّامٌ وَلَيَالِيَهُنَّ إِلَّا مِنْ جَنَابَةٍ وَلَكِنْ مِنْ غَائِطٍ أَوْ بَوْلٍ أَوْ نَوْمٍ﴾^(١)
 ”نبی اکرم ﷺ نے ہمیں حکم فرمایا کہ دورانِ سفر ہم تین دن اور تین راتیں موزے نہ اتاریں
 سوائے جنابت ہو جانے کے، لیکن پیشاب، پاخانہ اور نیند سے (یہی حکم ہے)۔“ یعنی ان
 تینوں امور سے وضو تو ٹوٹ جاتا ہے، مگر ان سے موزے اتارنے واجب نہیں ہوتے۔

اس حدیث شریف کی رو سے نیند مطلقاً ناقضِ وضو ہے اور چونکہ یہاں نیند کا ذکر مطلقاً آیا
 ہے، نماز میں ہو یا نماز کے باہر، کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر، ٹیک لگا کر ہو یا لیٹ کر، سجدے کی حالت میں
 ہو یا رکوع کی حالت میں؛ ہر شکل میں نیند مطلقاً ناقضِ وضو ہے۔^(٢)

علامہ ابن حزم رحمہ اللہ کی طرح ہی ابو عبید قاسم بن سلام کا میلان بھی اسی طرف ہے کہ نیند
 مطلقاً ناقضِ وضو ہے۔

ایک عجیب واقعہ:

اس سلسلے میں علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے موطا امام مالک کی شرح ”التمہید“ میں امام ابو عبید
 سے ایک عجیب واقعہ بھی نقل کیا ہے، جو مذکورہ موضوع کو سمجھنے کے لیے یقیناً مفید ہے۔ موصوف
 فرماتے ہیں:

”میں یہ فتویٰ دیا کرتا تھا کہ اگر کوئی شخص بیٹھا بیٹھا سو جائے تو اس پر وضو کرنا واجب نہیں
 ہے، یعنی اس کا وضو ایسی حالت کی نیند سے نہیں ٹوٹتا اور میں اس رائے پر اس وقت تک
 قائم رہا، جب تک یہ واقعہ رونما نہ ہوا کہ ایک شخص جمعہ کے دن میرے ساتھ بیٹھا بیٹھا
 سو گیا۔ نیند کے دوران میں اس کی ہوا خارج ہو گئی۔ میں نے کہا کہ جاؤ وضو کرو۔ اس نے
 کہا کہ میں تو سویا ہی نہیں۔ (غالباً اس کی مراد لیٹ کر سونے سے تھی) میں نے کہا: کیوں
 نہیں! تم سو گئے تھے اور تمھاری ہوا بھی خارج ہو گئی ہے، جو ناقضِ وضو ہے۔ اس پر اس
 نے اللہ کی قسم کھائی کہ میں سویا ہوں نہ مجھ سے ہوا خارج ہوئی ہے اور الٹا مجھے کہنے لگا کہ

﴿١﴾ سنن الترمذی مع التحفة (١/ ٣١٨) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (١٢٢، ١٢٣) سنن ابن ماجہ، رقم
 الحدیث (٤٧٨) موارد الظمان (١٧٩) التلخیص الحبیبر (١/ ١٥٧) المجموع (١/ ٥١٦) الإرواء (١/ ١٤٠)
 ﴿٢﴾ المحلی لابن حزم (١/ ٢٢٢-٢٢٣-٢٣٦)

تمھاری ہوا خارج ہوئی ہے، اس واقعہ کے بعد میں نے بیٹھے بیٹھے سونے والے شخص کے بارے میں اپنی رائے بدل لی۔ (یعنی یہ رائے اختیار کر لی کہ اس طرح سونے سے بھی وضو ٹوٹ جاتا ہے اور اصل رعایت نیند کے غلبے اور اس کے دل پر قابو پانے کی کرنے لگا) ^(۱)

محدث عصر علامہ البانی نے بھی یہی موقف اختیار کیا ہے اور ”تمام المنة في التعليق علىٰ فقه السنة“ (ص: ۱۰۰) میں لکھا ہے:

”فَالْحَقُّ أَنَّ النَّوْمَ نَاقِضٌ مُّطْلَقًا، وَلَا دَلِيلٌ يَصْلُحُ لِتَقْيِيدِ حَدِيثِ صَفْوَانَ“
 ”حق بات یہی ہے کہ نیند مطلقاً ناقض وضو ہے اور حضرت صفوان رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کے اطلاق کو مقید کرنے والی کوئی دلیل نہیں ہے۔“

بلکہ اس حدیث کی تائید تو اس حدیث سے بھی ہوتی ہے، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے، جس کی سند کو امام منذری، نووی اور ابن صلاح نے حسن قرار دیا ہے، جس کی تفصیل صحیح سنن ابو داؤد میں حدیث نمبر (۱۹۸) کے تحت ذکر کی گئی ہے۔ اس حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مطلقاً ہر سونے والے کو وضو کرنے کا حکم فرمایا۔ ^(۲)

اُس حدیث میں حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«الْعَيْنَانِ وَكَاءِ السَّهِّ، فَمَنْ نَامَ فَلْيَتَوَضَّأْ»

”آنکھیں جاے پاخانہ کا سر بند ہیں، پس جو شخص سو جائے اسے (ازسرنو) وضو کرنا چاہیے۔“
 یہ حدیث سنن ابو داؤد، ابن ماجہ، دارقطنی اور مسند احمد میں وارد ہوئی ہے۔ ^(۳)

مطلق نیند کے بارے میں دیگر علما کے اقوال:

نیند مطلقاً ناقض وضو ہے۔ اس سلسلے میں بعض دیگر علما کے اقوال بھی ہیں، چنانچہ ”فتح الباری“ میں حافظ ابن حجر نے ”باب الوضوء من النوم“ کے تحت آنے والی حدیث کی شرح بیان کرتے

(۱) التمهيد (.....)

(۲) تمام المنة (ص: ۱۰۰)

(۳) صحيح أبي داود، رقم الحديث (۱۸۸) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۴۷۷) مسند أحمد (۱/ ۱۱۱) الإرواء (۱/ ۱۴۸) مشکاة المصابيح (۱/ ۱۰۳) و صححه الألباني.

ہوئے لکھا ہے کہ امام مزنی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے:

”يَنْتَقِضُ قَلِيلُهُ وَكَثِيرُهُ“، ”معمولی اور گہری ہر طرح کی نیند ناقضِ وضو ہے۔“

امام اسحاق بن راہویہ کا بھی یہی قول ہے اور امام ابن منذر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت صفوان رضی اللہ عنہ والی حدیث جسے امام ابن خزیمہ اور دیگر محدثین نے صحیح قرار دیا ہے۔ اس کے عموم کے پیش نظر میرا قول بھی یہی ہے کہ معمولی اور گہری نیند ناقضِ وضو ہے۔^①

حضرت انس، ابو ہریرہ اور ابو رافع رضی اللہ عنہم اور عروہ بن زبیر، عطا، حسن بصری، سعید بن المسیب، عکرمہ اور زہری رحمۃ اللہ علیہم اور حنابلہ سمیت علما کی ایک جماعت کا بھی یہی مسلک ہے۔^②

دیگر اقوال:

بعض اہل علم نے نیند کی مختلف حالتوں کے مختلف احکام ذکر کیے ہیں، حتیٰ کہ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے ”شرح صحیح مسلم“ میں، علامہ یحییٰ امیر صنعانی رحمۃ اللہ علیہ نے ”سبل السلام“ میں اور امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے ”نیل الأوطار“ میں ذکر کیا ہے کہ نیند کے بارے میں علما کے آٹھ اقوال ہیں، پھر آٹھوں اقوال اور ان کے دلائل بھی ذکر کیے ہیں، جن میں سے پہلا قول تو یہی ہے، جس میں نیند کو مطلقاً ناقض کہا گیا ہے۔ انھوں نے خود اسے ہی ”أقرب الأقوال“ قرار دیا ہے اور تین اقوال نماز کے اندر اور خصوصاً قیام، رکوع اور سجدہ کی حالت میں سونے سے تعلق رکھتے ہیں، ان کا استدلال خلائیاتِ بیہتی اور بعض دیگر کتب کی اس روایت سے ہے، جس میں مروی ہے:

« إِذَا نَامَ الْعَبْدُ فِي سُجُودِهِ بَاهِي اللَّهُ بِهِ الْمَلَائِكَةَ وَيَقُولُ: أَنْظِرُوا إِلَيَّ عَبْدِي، رُوحَهُ عِنْدِي وَجَسَدَهُ سَاجِدًا بَيْنَ يَدَيَّ »

”جب کوئی شخص حالتِ سجدہ میں سو جائے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کے سامنے فخر کرتا ہے اور کہتا ہے: دیکھو! میرے بندے کی روح میرے پاس ہے اور اس کا جسم میرے سامنے سجدہ ریز ہے۔“

لیکن امیر صنعانی کے بقول یہ استدلال اولاً تو اس لیے صحیح نہیں کہ یہ حدیث ہی ضعیف اور

① فتح الباری (۱/۳۱۴)

② شرح صحیح مسلم للنووی (۲/۷۳۴) الإرواء (۱/۱۴۱) تحقیق صلاة الرسول (ص: ۱۳۵)

ناقابلِ حجت ہے۔ دوسرے اس لیے کہ اس روایت میں اس بندے کو سجدہ ریز اس کی حالت و ہیئت کی بنا پر یا پھر محض اوّل الامر والی طہارت کی بنا پر کہا گیا ہے، جو اس بات کی دلیل ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اس طہارت کے باقی ہونے کی وجہ سے اسے سجدہ ریز قرار دیا گیا ہے۔^(۱)

اسی مفہوم پر دلالت کرنے والی بعض دیگر روایات ہیں، جن کو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ”التلخیص“ میں اور امام شوکانی نے ”نبیل الأوطار“ میں نقل کر کے انھیں ضعیف قرار دیا ہے۔ البتہ ایک روایت کی سند کو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے جید کہا ہے، مگر وہ بھی مرفوع نہیں، بلکہ موقوف ہے، یعنی وہ الفاظ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہیں۔^(۲)

پانچویں قول میں قلیل و کثیر میں فرق کیا گیا ہے، جس کی کوئی صریح دلیل ہے نہ قلیل و کثیر کا کوئی معیار ذکر کیا ہے کہ قلیل کیا ہے اور کثیر کیا ہے؟ چھٹے قول میں شافیہ کے نزدیک نیند بہ ذاتِ خود تو ناقض نہیں، البتہ نقض کا ظن پیدا کرنے والی چیز ہے۔

ساتویں قول میں کہا گیا ہے کہ نیند مطلقاً ناقض ہے ہی نہیں، ان کا استدلال حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی اس حدیث سے ہے، جو صحیح مسلم اور سنن ابی داؤد میں مذکور ہے، جس میں وہ بیان فرماتے ہیں:

«إِنَّ أَصْحَابَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ يَنْتَظِرُونَ الْعِشَاءَ فَيَنَامُونَ قُعُودًا، ثُمَّ يُصَلُّونَ وَلَا يَتَوَضَّئُونَ»^(۳)

”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نمازِ عشا کے وقت انتظار میں بیٹھے بیٹھے سو جایا کرتے تھے، پھر وہ اٹھ کر نماز پڑھ لیتے اور دوبارہ وضو نہیں کیا کرتے تھے۔“

سنن ابوداؤد کی روایت میں ”علیٰ عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم“ کے الفاظ بھی ہیں کہ یہ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات ہے، مگر صحیح مسلم میں یہ الفاظ نہیں ہیں۔ ایک دوسری روایت جو صحیح سند کے ساتھ مسند بزار، محلی ابن حزم اور مسائل الامام احمد لابی داؤد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اس میں وہ فرماتے ہیں:

(۱) دیکھیں: سبل السلام (۱/ ۱) / ۶۲ شرح صحیح مسلم للنووی (۲/ ۴/ ۱۷۳) التلخیص الحبیب (۱/ ۱) / ۱۲۱
النبیل (۱/ ۱) / ۱۹۰-۱۹۱

(۲) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: التلخیص الحبیب (۱/ ۱) / ۱۱۹-۱۲۰ نبیل الأوطار (۱/ ۱) / ۱۹۰

(۳) صحیح مسلم مع شرح النووی (۲/ ۴/ ۷۳) صحیح سنن ابی داؤد، رقم الحدیث (۱۸۴) فتح الباری (۱/ ۱) / ۳۱۵ التلخیص الحبیب (۱/ ۱) / ۱۱۹ عون المعبود (ص: ۳۳۹-۳۴۰)

«إِنَّهُمْ كَانُوا يَضَعُونَ جُنُوبَهُمْ فَيَنَامُونَ، مِنْهُمْ مَنْ يَتَوَضَّأُ وَمِنْهُمْ مَنْ لَا يَتَوَضَّأُ»^(۱)

”وہ پہلو کے بل لیٹ کر سو جایا کرتے تھے۔ پھر ان میں سے کوئی وضو کر لیتا اور کوئی وضو نہ کرتا (یعنی پہلے وضو ہی سے نماز پڑھ لیتا تھا)۔“

فتح الباری میں حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری و ابن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ نیند کو مطلقاً ناقض نہیں سمجھتے تھے۔^(۲)

”التلخیص الحبیر“ میں موصوف نے ان کبار ائمہ کے اقوال ذکر کیے ہیں، جنہوں نے ان احادیث کو بیٹھ کر سونے پر محمول کرتے ہوئے غیر ناقض قرار دیا ہے۔ چنانچہ امام ابن المبارک، عبدالرحمن بن مہدی اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یہی موقف اختیار کیا ہے۔ امام ابن القطان نے کہا ہے کہ صحیح مسلم میں اس حدیث کا جو سیاق ہے، اسے بیٹھ کر سونے والے کی نیند پر محمول کیا جاسکتا ہے اور اکثر ائمہ نے ایسا ہی کیا ہے، لیکن مسند بزار اور محللی والی روایت کے الفاظ «كَانُوا يَضَعُونَ جُنُوبَهُمْ» اس تاویل کی اجازت نہیں دیتے، کیوں کہ یہ تو لیٹ کر سونے پر صریح دلالت کرتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ وضو نہیں کیا کرتے تھے۔^(۳)

علامہ ابن دقیق العید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حدیث انس رضی اللہ عنہ کی «كَانُوا يَضَعُونَ جُنُوبَهُمْ» والی روایت کو خفیف اور ہلکی سی نیند پر محمول کیا جائے گا، جب کہ یہ تاویل سنن دارقطنی والی حدیث کے منافی ہے، جس میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کے غطیط یعنی خراٹے سننے والے الفاظ بھی ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ خراٹے تو ہلکی نیند میں نہیں سنے جاسکتے۔ یاد رہے کہ خراٹوں والی حدیث کو علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے ترمذی کی طرف بھی منسوب کیا ہے، مگر یہ اس میں ہمیں نہیں ملی۔^(۴)

(۱) فتح الباری (۱/۳۱۵) و صححہ، المحلی (۱/۱/۲۲۴) تمام المنۃ (ص: ۱۰۰) و صححہ.

(۲) فتح الباری (۱/۳۱۵)

(۳) التلخیص الحبیر و فتح الباری (۱/۳۱۵) ملاحظہ فرمائیں۔

(۴) دیکھیں: سنن الترمذی مع التحفة (۱/۲۵۱-۲۵۵) سنن الدارقطنی (۱/۱۳۱) التلخیص الحبیر (۱/۱۱۹)

سبل السلام (۱/۷۲)

تعارض اور اس کا حل:

حضرت صفوان رضی اللہ عنہ والی حدیث: «وَلَكِنْ مِنْ غَائِطٍ وَبَوْلٍ وَنَوْمٍ» کی رو سے نیند مطلق ناقض وضو ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ والی حدیث کی رو سے نیند مطلق ناقض وضو نہیں ہے۔ ان دونوں حدیثوں میں باہم تضاد و تعارض واضح ہے، جسے اہل علم نے یوں حل کیا ہے کہ اولاً تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا نیند سے اٹھ کر وضو نہ کرنا، اس بات کے امکان کا پتا دیتا ہے کہ یہ نیند سے وضو واجب ہونے کے حکم سے پہلے کا واقعہ ہوگا۔ لہذا علامہ ابن حزم رحمہ اللہ کے بقول حدیث صفوان رضی اللہ عنہ اس پہلے حکم کو منسوخ کرنے والی ہے۔^(۱) اگر ایسا نہیں ہے تو پھر ان دونوں حدیثوں میں سے ایک (حدیث صفوان رضی اللہ عنہ) صحیح سند والی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع ہے، جب کہ دوسری حدیث انس رضی اللہ عنہ ایسی نہیں ہے۔^(۲) لہذا حضرت صفوان رضی اللہ عنہ والی حدیث پر عمل ہی اولیٰ ہے۔

البتہ امام شوکانی رحمہ اللہ نے ”نیل الأوطار“ میں لکھا ہے کہ مطلق نیند کو ناقض ظاہر کرنے والی احادیث کو لیٹ کر سونے والی نیند پر محمول کیا جائے گا، پھر اس جمع و تطبیق کی تائید میں تین روایات بھی پیش کی ہیں، جنہیں ایک دوسرے کے لیے باعث قوت قرار دیا ہے۔ علامہ مبارکپوری نے بھی ”تحفة الأحوذی“ میں یہی موقف اختیار کیا ہے۔ جب کہ محدث البانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ احادیث تینوں ہی اتنی ضعیف ہیں کہ ان کے مجموعے میں بھی کوئی قوت پیدا نہیں ہوتی اور نہ ان کا ضعف ہی زائل ہوتا ہے۔ لہذا انھوں نے جمع و تطبیق کی تردید کی ہے۔ اس کی تفصیل ”نیل الأوطار“ (۱/۱) / (۱۹۱) ”تحفة الأحوذی“ (۱/۲۵۵) اور ”تمام المنة“ (ص: ۱۰۱، ۱۰۳) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

نیند اور اونگھ کا فرق و حکم:

صرف لیٹ کر سونے والی نیند کے ناقض ہونے کی تائید کرنے والی امام شوکانی رحمہ اللہ کی پیش کردہ تینوں احادیث ضعیف ہیں، جیسا کہ اشارہ گزرا ہے اور صحیح بخاری و مسلم والی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث: «إِذَا أُغْمِيتُ يَأْخُذُ بِشَحْمَةِ أُذُنِي» میں ”أُغْمِيتُ“ سے مراد گہری نیند ہو ہی نہیں سکتی، بلکہ وہاں اونگھ مراد ہے، جیسا کہ ”القاموس المحيط“ میں ”الإغماء“ کا معنی دیکھا

(۱) المحلى لابن حزم (۱/۲۲۹)

(۲) تمام المنة (ص: ۱۰۰)

جا سکتا ہے۔ لہذا وہ حدیث بھی موید نہ رہی۔ یوں معلوم ہوا کہ قولِ اوّل (نیند کے متعلق ناقض وضو ہونے کی رائے) ہی راجح ہے۔ البتہ یہاں اگر نیند اور اونگھ کے فرق کو بھی اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو اس مسئلے میں پائے جانے والے بہت سارے اشکالات زائل ہو جاتے ہیں، چنانچہ فتح الباری میں لکھا ہے کہ جس کے حواس قائم رہیں، حتیٰ کہ وہ اپنے ساتھی کی بات سن سکتا ہو، مگر اس کا معنی نہ سمجھ سکے تو یہ حالت اونگھ ہے اور اگر اس سے بھی بڑھ جائے (معنی کجا بات بھی نہ سن رہا ہو) تو یہ حالت نیند ہے۔^①

امام خطابی کی ”غریب الحدیث“ سے نقل کرتے ہوئے صاحب ”تمام المنّة“ لکھتے ہیں:

”نیند کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک گہری غشی ہے، جو دل پر چھا جاتی ہے اور اسے ظاہری امور کی معرفت سے منقطع کر دیتی ہے، جبکہ اونگھنے والا شخص وہ ہے، جسے طبیعت کے بوجھل ہونے نے ایسا کر رکھا ہو کہ وہ احوالِ باطنہ کی معرفت سے قاصر ہو۔“^②

مغفل کہتے ہیں:

”السَّنَةُ فِي الرَّأْسِ، وَالنَّوْمُ فِي الْقَلْبِ“^③

”اونگھ کا اثر سر پر اور نیند کا اثر دل پر پڑتا ہے۔“

نیند اور اونگھ کے اس فرق نے یہ مسئلہ بھی حل کر دیا ہے کہ اونگھ کی وجہ سے اگر کسی کا سر جھکا جائے اور اسے جھٹکا سا محسوس ہو تو ایسی اونگھ سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ اگر خفیف یا ہلکی سی نیند سے مراد یہی اونگھ ہو تو وہ مسئلہ بھی حل ہو گیا کہ کون سی ہلکی سی نیند غیر ناقض ہے۔ چنانچہ امام ابن المنذر نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انھوں نے فرمایا:

”وَجَبَ الْوُضُوءُ عَلَى كُلِّ نَائِمٍ إِلَّا مَنْ خَفَقَ خَفَقَةً“^④

”ہر سونے والے پر وضو واجب ہے، سوائے اس کے جسے (اونگھ کی وجہ سے) جھٹکا لگے۔“

یعنی اس پر وضو واجب نہیں۔

خفقه یا جھٹکا کا معنی ابن التین نے اونگھ ہی کیا ہے اور اہل لغت اونگھ میں سر کو حرکت دینے

① فتح الباری (۱/۳۱۴)

② تمام المنّة (ص: ۱۰۱)

③ غریب الحدیث بحوالہ تحقیق المشکاة (۱/۱۰۴)

④ دیکھیں: فتح الباری (۱/۳۱۴)

والے ہی کو کہتے ہیں:

”خَفَقَ بِرَأْسِهِ مِنَ النَّعَاسِ: أَمَّالَهُ“

”یعنی اونگھ سے اپنے سر کو خفقہ دینے سے مراد سر کو ایک طرف مائل کرنا ہے۔“

ہروی کہتے ہیں:

”مَعْنَى: تَخْفِقُ رُؤُوسَهُمْ، تَسْقُطُ أَدْفَانُهُمْ عَلَى صُدُورِهِمْ“

”ان کے سروں کا خفقہ کھانا، ان کی ٹھوڑیوں کا ان کے سینوں پر گر جانا ہے۔“

خفقانِ راس اور اونگھ کے متعلق اس تفصیل سے ”قیام اللیل للمروزی“ میں حضرت

انس رضی اللہ عنہ والی اس روایت کا مفہوم بھی واضح ہو گیا، جس میں ان کے الفاظ ہیں:

«كَانَ أَصْحَابُ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ يَنْتَظِرُونَ الصَّلَاةَ فَيَنْغَمِسُونَ حَتَّى تَخْفِقَ

رُؤُوسُهُمْ، ثُمَّ يَقُومُونَ إِلَى الصَّلَاةِ»^①

”نبی اکرم ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نماز کے انتظار میں اونگھ جاتے، حتیٰ کہ ان کے سر جھک

جاتے، پھر وہ اٹھتے اور نماز ادا کرتے۔“

یوں اب بات واضح ہو گئی کہ وہ حالت جو اونگھ کے دائرے میں آتی ہے، اس میں وضو نہیں

ٹوٹتا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں جو سر جھکانے کی روایات ملتی ہیں، ان میں یہی اونگھ مراد ہے اور ان

کے لیٹ کر سو جانے اور خراٹے سنے جانے کے باوجود ان کے تجدید وضو کے بغیر ہی نماز میں شامل ہو

جانے سے مراد نیند سے وضو کے واجب ہونے کے حکم سے پہلے کی حالت کا بیان ہے، اس کا اظہار شیخ

ابن باز اور ان کے ساتھی علمائے ”فتح الباری“ کی تحقیق و تعلیق میں کیا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

”اس مسئلے میں صحیح بات یہ ہے کہ نیند نقض وضو (حدث) کا ظن پیدا کرنے والی چیز ہے۔

اس کی (ابتدائی حالت یا) اونگھ اور بالکل معمولی (خفیف) حالت وضو نہیں توڑتی۔ وضو

صرف وہ نیند توڑتی ہے، جو شعور (واحساس) کو مطلقاً زائل کر دے۔ اس طرح اس موضوع

① فتح الباری (۱/۳۱۶) قال: إسناده صحيح و أصله عند مسلم. نیز دیکھیں: صحيح سنن أبي داود، رقم

الحديث (۱۸۴) شرح مع النووي (۲/۴/۷۳) فتح الباری (۱/۱/۳۱۵) تلخیص الحبیبر (۱/۱/۱۱۹) عون

المعبود (ص: ۳۳۹-۳۴۰)

کے بارے میں وارد شدہ تمام احادیث میں جمع و تطبیق بھی ہو جاتی ہے۔^① واللہ اعلم۔
یہیں امام نووی رحمہ اللہ کی تحقیق بھی ذکر کرتے جائیں کہ نیند اور اوگھ کے سلسلے میں وہ کیا فرماتے ہیں؟ چنانچہ صحیح مسلم شریف کی شرح میں موصوف امام شافعی رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب و رفقا سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ”نعاس یا سبتہ یعنی اوگھ سے وضو نہیں ٹوٹتا۔“
آگے فرماتے ہیں:

”نیند کی علامت یہ ہے کہ اس میں عقل پر غلبہ ہو جاتا ہے اور آنکھوں کی بصارت اور دیگر حواس ساقط (و معطل) ہو جاتے ہیں، جب کہ اوگھ عقل پر غلبہ نہیں پاتی، بلکہ اوگھ کے دوران میں حواس میں صرف معمولی سا فتور آ جاتا ہے، لہذا وہ ساقط (و معطل) نہیں ہوتے۔“
آگے موصوف نے بڑے کام کی بات کی ہے:

”اگر کسی کو شک ہو جائے کہ وہ سو گیا تھا یا محض اوگھ رہا تھا، تو اس شک کی حالت میں اس پر وضو واجب نہیں ہوگا۔ ہاں یہ مستحب ہے کہ ایسا شخص وضو کر لے۔“^②
ظاہر ہے کہ احتیاط بھی اسی میں ہے۔

خصائصِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم:

شرح صحیح مسلم میں امام نووی اور انہی سے نقل کرتے ہوئے امام شوکانی ”نیل الأوطار“ میں لکھتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص میں سے یہ بات بھی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وضو لیٹ کر سوجانے سے بھی نہیں ٹوٹتا تھا، کیوں کہ ایک صحیح حدیث حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

((نَامَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ حَتَّى سَمِعْتُ غَطِيطَهُ، ثُمَّ صَلَّى وَكَمْ يَتَوَضَّأُ))^③

”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سو گئے، حتیٰ کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خراٹے سنے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی اور وضو نہیں کیا۔“

① حاشیہ فتح الباری (۱/۳۱۴)

② شرح صحیح مسلم للنووی (۲/۴/۷۴)

③ شرح صحیح مسلم للنووی (۲/۴/۷۴) نیل الأوطار (۱/۱۹۱-۱۹۲)

10- زوالِ عقل یا بے ہوشی:

نواقضِ وضو میں سے دسواں ناقضِ زوالِ عقل ہے، چاہے وہ کسی طرح بھی ہو اور کسی حالت میں بھی ہو، چنانچہ اس سلسلے میں امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے ”المنہاج شرح صحیح مسلم بن الحجاج“ میں لکھا ہے:

”اہلِ علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ دیوانگی، غشی، شراب، نیند، بخ یا کلوروفارم یا کسی بھی دوا سے نشہ ہونے پر عقل زائل ہونا یا بے ہوش ہو جانا ناقضِ وضو ہے۔ یہ بے ہوشی اور زوالِ عقل تھوڑے عرصے کے لیے ہو یا زیادہ وقت کے لیے ہو۔“^(۱)

امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے ”البحر الرائق“ سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نشہ کا حکم بھی اکثر اہلِ علم کے نزدیک جنون و دیوانگی والا ہی ہے اور ”سبل السلام شرح بلوغ المرام“ میں علامہ صنعانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ان امور کو نیند سے ملحق کیا گیا ہے۔ علامہ مغربی کی ”البدر التمام شرح بلوغ المرام“ (جو ”سبل السلام“ کی اصل ہے) سے نقل کیا ہے کہ اہلِ علم کا ان امور کے ناقضِ وضو ہونے پر اتفاق ہے اور اگر یہ اتفاق کی بات صحیح ہے تو پھر ان کے ناقض ہونے کی دلیل اجماع ہے۔^(۲) علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی موجباتِ وضو کے ضمن میں دیوانگی، غشی اور نشہ کو ذکر کیا ہے، مگر ان کے ناقض ہونے اور انہیں نیند پر قیاس کرنے اور اس کی دلیل اجماع ہونے کا انکار کیا ہے۔^(۳) تاہم اس معاملے میں جیسا کہ ظاہر ہے، جمہور اہلِ علم کا قول ہی زیادہ قرینِ صواب ہے۔

11- اونٹ کا گوشت کھانا:

نواقضِ وضو میں سے گیارھواں اور آخری ناقضِ اونٹ کا گوشت کھانا ہے، اگرچہ جمہور اہلِ علم، خلفائے راشدین (چاروں) اور اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین اور ائمہ میں سے امام شافعی، امام مالک اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہم کا مسلک تو یہ ہے کہ اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو نہیں ٹوٹتا، لیکن امام نووی رحمۃ اللہ علیہ

(۱) شرح صحیح مسلم للنووی (۲/۴/۷۴) نیل الأوطار (۱/۱/۱۹۱)

(۲) سبل السلام (۱/۱/۶۳)

(۳) المحلی لابن حزم (۱/۱/۲۲۱-۲۲۲)

فرماتے ہیں کہ اونٹ کے گوشت کا ناقض وضو ہونا ہی دلیل کے اعتبار سے زیادہ قوی ہے۔^①
اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو کے ٹوٹ جانے کے قائلین میں سے بقول امام نووی،
امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، یحییٰ بن معین، ابن المنذر اور ابن خزیمہ رحمہم اللہ ہیں۔ امام بیہقی کا
اختیار بھی یہی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت اور عام علمائے حدیث سے بھی یہی مروی ہے۔
امام شوکانی رحمہ اللہ نے ”البحر الرائق“ سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک قول کے مطابق امام شافعی
کا بھی یہی مسلک ہے اور ایک قول کی رو سے امام محمد بن حسن (شاگرد امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ) بھی اونٹ کا
گوشت کھانے سے نقض وضو کے قائل تھے۔

امام بیہقی رحمہ اللہ نے امام شافعی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا:
”اگر اونٹوں کے گوشت سے وضو ٹوٹنے کے بارے میں کوئی حدیث صحیح ثابت ہو جائے تو
میں اسی کے مطابق فتویٰ دوں گا۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا یہ قول نقل کر کے امام بیہقی رحمہ اللہ لکھتے
ہیں کہ اس مسئلے میں ایک نہیں، بلکہ دو حدیثیں سند سے ثابت ہیں۔“^②
علامہ ابن حزم رحمہ اللہ بھی نقض ہی کے قائل ہیں، جیسا کہ ”المحلی“ (۱/۱/۲۴۱) میں ہے
اور ”القواعد النورانیة“ میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی تحقیق بھی یہی ہے کہ وضو ٹوٹ جاتا ہے۔^③

قائلین نقض کے دلائل:

① نقض وضو کے قائلین کا استدلال جن احادیث سے ثابت ہے، ان میں سے پہلی حدیث صحیح مسلم
اور مسند احمد میں حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں کہ کسی آدمی
نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا:
«أَتَتَوَضَّأُ مِنْ لُحُومِ الْغَنَمِ؟ قَالَ: إِنْ شِئْتَ تَوَضَّأُ وَإِنْ شِئْتَ فَلَا تَتَوَضَّأُ»
”کیا ہم بکری کا گوشت کھانے کے بعد وضو کیا کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر چاہو تو
وضو کر لو اور اگر چاہو تو نہ کرو (یعنی تمہیں اختیار ہے)۔“

① شرح صحیح مسلم للنووي (۲/۴/۴۹)

② نیل الأوطار (۱/۱/۲۰۰) طبع بیروت.

③ دیکھیں: تمام المنة (ص: ۱۰۵)

پھر اسی آدمی نے پوچھا:

«أَتَتَوَضَّأُ مِنْ لُحُومِ الْيَابِلِ؟ قَالَ: نَعَمْ»^①

”کیا ہم اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضو کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں۔“

② اسی موضوع کی دوسری حدیث سنن ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، مسند احمد، صحیح ابن خزیمہ اور ابن حبان

میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ

سے اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضو کرنے کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ ﷺ

نے فرمایا:

«تَوَضَّأُوا مِنْهَا» ”اس کے بعد وضو کر لو۔“

آپ ﷺ سے بکری کے گوشت کے بعد وضو کے بارے میں استفسار کیا گیا تو آپ ﷺ

نے فرمایا:

«لَا تَوَضَّأُوا مِنْهَا»^② ”اس کے بعد وضو نہ کرو۔“

امام ابن خزیمہ رضی اللہ عنہ اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں:

«كَمْ أَرَخِلَافًا بَيْنَ عُلَمَاءِ الْحَدِيثِ أَنَّ هَذَا الْخَبَرَ صَحِيحٌ مِنْ جِهَةِ النَّقْلِ
لِعَدَالَةِ نَاقِلِيهِ»^③

”میرے نزدیک علمائے حدیث میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ حدیث از روے نقل صحیح ہے،

کیوں کہ اس کے تمام روایات عدول ہیں۔“

③ ان دونوں صحیح احادیث کے علاوہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی بعض آثار ثابت ہیں کہ وہ اونٹ کا

گوشت کھانے کے بعد وضو کیا کرتے تھے، چنانچہ مصنف ابن ابی شیبہ میں صحیح سند کے ساتھ

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ مروی ہے:

① صحیح مسلم مع شرح النووي (۱۷۴/۴/۲) المنتقى مع النيل (۲۰۰/۱/۱)

② صحیح سنن ابی داؤد (۳۷/۱) سنن ابی داؤد مع العون (۳۱۵-۳۱۶) سنن الترمذی مع التحفة (۱/۱)

۲۶۲-۲۶۳) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۴۹۴) موارد الظمان، رقم الحدیث (۲۱۵) التلخیص الحبیبر

(۱۱۵/۱/۱) المنتقى مع النيل (۲۰۲/۱/۱) و صححه الألبانی فی الإرواء (۱۵۲/۱/۱)

③ سلسلة الأحاديث الصحيحة (۲۲/۱)

«كُنَّا نَتَوَضَّأُ مِنْ لُحُومِ الْبَابِلِ، وَلَا نَتَوَضَّأُ مِنْ لُحُومِ الْغَنَمِ»^①

”ہم اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضو کیا کرتے تھے اور بکری کا گوشت کھانے کے بعد وضو نہیں کیا کرتے تھے۔“

اب آئیے اس سلسلے میں دوسرا مسلک اور اس کے دلائل بھی دیکھیں۔

قائلین عدم نقض کے دلائل:

① اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو کے عدم نقض کے قائلین کی ایک اہم دلیل تو یہ ہے کہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم عدم نقض کے قائل تھے، جیسا کہ امام نووی رحمہ اللہ نے شرح صحیح مسلم میں ذکر کیا ہے۔ یہ بات واقعی ایک وقیح دلیل ہوتی، اگر صحیح سند سے ثابت ہوتی، لیکن ایسا نہیں ہے، بلکہ یہ امام نووی رحمہ اللہ کا تسامح ہے، جیسا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ”القواعد النورانية“ میں ذکر کیا ہے کہ خلفائے راشدین اور جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم سے جو نقل کیا گیا ہے کہ وہ اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضو نہیں کیا کرتے تھے، یہ فعل ان کی طرف غلطی سے منسوب کیا گیا ہے، اس وہم کا سبب دراصل وہ بات ہے کہ وہ کچی ہوئی اشیاء خوردنی کو کھانے کے بعد وضو نہیں کیا کرتے تھے۔ (یہ مسئلہ تو اپنی جگہ صحیح ہے) لیکن اس سے مراد صرف یہ ہے کہ ہر کچی ہوئی چیز کا کھانا ان کے نزدیک وضو کرنے کا سبب نہیں تھا اور جو نبی اکرم ﷺ نے اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضو کرنے کا حکم فرمایا، اس کا سبب اس کا پکا ہوا ہونا نہیں ہے.... الخ۔

صاحب ”تمام المنة“ لکھتے ہیں:

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی اس تحقیق کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ امام طحاوی و بیہقی نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق و عمر رضی اللہ عنہما نے روٹی گوشت کھایا اور نماز ادا کی، لیکن از سر نو وضو نہیں کیا۔

آگے امام طحاوی و بیہقی ہی نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی اسی طرح روایت بیان کی ہے۔ سنن بیہقی میں ایک روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی ایسی ہی ہے، لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان آثار میں اونٹ کے گوشت کا قطعاً ذکر نہیں ہے، بلکہ صرف مطلق گوشت کا ذکر

① تمام المنة (ص: ۱۰۶) و صححہ.

ہے۔ اگر ایسی کوئی روایت نبی اکرم ﷺ کے بارے میں ہوتی تو بھی ضروری تھا کہ اسے اونٹ کے علاوہ کسی دوسرے گوشت پر محمول کیا جاتا، تاکہ تعارض رفع کیا جاسکے۔ جب یہ آثار نبی اکرم ﷺ کے بجائے صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں ہیں تو انہیں دوسرے گوشت پر محمول کرنا بلاوہی واجب ہے، تاکہ ان کے اعمال کو شریعت کی موافقت پر محمول کیا جاسکے نہ کہ مخالفت پر، یہی وجہ ہے کہ امام طحاوی اور بیہقی رحمہما نے ان آثار کو ”آگ سے پکی ہوئی چیزوں سے وضو کے باب“ میں ذکر کیا ہے اور امام بیہقی نے سنن کبریٰ میں ”اونٹ کے گوشت سے وضو کے باب“ میں یہ آثار ذکر نہیں کیے، بلکہ وہاں صرف یہ کہا ہے کہ ہمیں حضرت علی و ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت پہنچی ہے:

”الْوُضُوءُ مِمَّا خَرَجَ وَلَيْسَ مِمَّا دَخَلَ، وَإِنَّمَا قَالَا ذَلِكَ فِي تَرْكِ الْوُضُوءِ مِمَّا مَسَّتِ النَّارُ“^(۱)

”وضو خارج ہونے والی چیز سے ہے نہ کہ داخل ہونے والی چیز سے اور ان کا یہ کہنا آگ پر پکی چیزوں سے وضو نہ کرنے کے بارے میں ہے۔“

پھر انہوں نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے اونٹ کا گوشت کھایا اور وضو نہ کیا۔ اس روایت کو نقل کرنے کے بعد خود ہی لکھا ہے کہ یہ اثر منقطع اور موقوف ہے اور کسی ایسی دلیل کی بنا پر اس بات کو ترک نہیں کیا جاسکتا، جو نبی اکرم ﷺ سے ثابت ہے۔^(۲)

عدم وجوب کے قائلین کی تیسری دلیل سنن اربعہ، صحیح ابن خزیمہ اور ابن حبان میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں:

«كَانَ آخِرُ الْأَمْرَيْنِ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ تَرْكُ الْوُضُوءِ مِمَّا غَيَّرَتِ النَّارُ»^(۳)

”نبی اکرم ﷺ کا عمل آخر میں یہ تھا کہ آگ پر پکی چیز کھانے کے بعد آپ ﷺ وضو

(۱) وقد ضعفه الحافظ في التلخيص (۱/ ۱۱۸)

(۲) القواعد النورانية لابن تيمية (ص: ۹) الطحاوي (۱/ ۴۱) سنن البيهقي (۱/ ۱۵۷) بحواله تمام المنة (ص ۱۰۵، ۱۰۶)

(۳) سنن أبي داود (۱/ ۳۲۷) سنن الترمذي (۱/ ۲۵۸) مفصلاً، و صحیح سنن النسائي، رقم الحديث (۱۷۹) و سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۴۸۹) التلخيص الحبير (۱/ ۱۱۶) مختصراً، موارد الظمان، رقم الحديث (۲۱۸، ۲۲۰، ۳۳۱) بألفاظ مختلفة.

نہیں کیا کرتے تھے۔“

یہ مسئلہ تو صحیح ہے کہ آگ پر پکی اشیا کھانے کے بعد وضو کرنا واجب نہیں، جیسا کہ صحیح بخاری اور دیگر کتب حدیث میں یہ بات ثابت ہے، اس کی تفصیل بھی آگے چل کر آئے گی، اسی مسئلے کی دلیل یہ حدیث مذکور بھی ہے، جس سے اونٹ کے گوشت کے بعد وضو کے عدم وجوب پر استدلال صریح نہیں، بلکہ دور کی کوڑی لانے کے مترادف ہے، جیسا کہ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے کلام اور امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے انداز سے معلوم ہوتا ہے، جو ہم نے (پچھلی سطور میں) ذکر کیا ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح مسلم کی شرح میں اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ حدیث عام ہے اور اونٹ کے گوشت کے بعد وضو کرنے کے حکم پر دلالت کرنے والی صحیح مسلم اور مسند احمد کی حدیث خاص ہے اور خاص کو عام پر مقدم رکھنا ضروری ہے، جیسا کہ امام شافعی اور دیگر ائمہ اصول رحمۃ اللہ علیہم کا مذہب ہے اور امام شوکانی نے اس اصول کو حق قرار دیا ہے۔^①

امام ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ نے ”المغنی“ میں لکھا ہے کہ اونٹ کا گوشت کھانے سے بہر حال وضو ٹوٹ جاتا ہے، پھر انھوں نے نقض وضو کی رائے کے راجح ہونے کے متعدد عقلی و نقلی اور اصولی دلائل ذکر کیے ہیں، جو جامعۃ الامام کی طرف سے شائع کردہ ”المغنی“ (۱/ ۲۵۰، ۲۵۴) میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ موطا امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے حاشیے ”التعلیق الممجد“ میں علامہ عبدالحی حنفی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی نقض وضو والے مسلک ہی کو قوی مذہب قرار دیا ہے۔^②

بعض اہل علم نے وضو کو واجب تو نہیں، البتہ مستحب قرار دیا ہے۔ بہر صورت وضو کرنا ہی زیادہ قرین احتیاط ہے۔



① شرح صحیح مسلم للنووی (۲/ ۴/ ۴۹) نیل الأوطار (۱/ ۱/ ۲۰۱)

② دیکھیں: تحفۃ الأحوذی (۱/ ۲۶۴) علامہ مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ نے اس مقام پر بڑے اہم مباحث رقم کیے ہیں اور بذل الجہود کے حنفی مولف کی تردید کی ہے۔

غیر نواقض وضو

(جن اشیا سے وضو نہیں ٹوٹتا)

وضو توڑنے والے ان دس امور کے بعد اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعض وہ امور بھی ذکر کر دیے جائیں، جن کے بارے میں شک ہو سکتا ہے کہ وہ نواقض وضو میں سے ہیں، بلکہ ان میں سے بعض کے بارے میں تو کچھ اہل علم نے ناقض ہونے کا کہا بھی ہے حالانکہ تحقیقی نقطہ نظر سے صحیح یہ ہے کہ وہ نواقض وضو نہیں ہیں۔

1 آگ پر پکی ہوئی اشیا کا کھانا:

ان میں سے سب سے پہلے تو یہی آگ پر پکی ہوئی اشیا کا کھانا ہے، جس کا ذکر ضمنی طور پر چل رہا ہے۔ یہ شروع اسلام میں تو نواقض ہی میں سے تھا، کیوں کہ اس سلسلے میں متعدد احادیث وارد ہوئی ہیں:

1 صحیح مسلم، سنن اربعہ اور مسند احمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

«تَوَضَّأُوا مِمَّا مَسَّتِ النَّارُ»¹ ”ہر اس چیز کے بعد وضو کرو، جو آگ پر پکائی گئی ہو۔“

2 اسی طرح صحیح مسلم، سنن نسائی، ابن ماجہ اور مسند احمد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہی الفاظ مروی ہیں اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اس موضوع کی احادیث حضرت ام حبیبہ، ام سلمہ، زید بن ثابت، ابو طلحہ، ابو ایوب اور ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں، جن میں سے پانچ کی تخریج علامہ مبارکپوری نے تحتہ الاحوذی میں کی ہے، جن میں سے

1 صحیح مسلم مع شرح النووی (۲/ ۴ / ۴۳) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (۱۷۸) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۶۸) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۱۶۵) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۴۸۵) صحیح ابن حبان (الموارد)، رقم الحدیث (۲۱۷) المنتقى مع النيل (۱/ ۱ / ۲۰۸)

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ والی حدیث بھی صحیح مسلم کی حدیث ہے، جس کے الفاظ بھی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی احادیث والے ہیں۔

چنانچہ امام ترمذی رضی اللہ عنہ لکھتے ہیں کہ بعض اہل علم نے آگ پر پکی چیز کھانے کے بعد وضو کرنے کی رائے ہی اختیار کی ہے۔ کتاب الاعتبار حازی کے حوالے سے تحفۃ الاحوذی میں اور حازی کی طرح ہی امام شوکانی رضی اللہ عنہ نے ”نبیل الأوطار“ میں وضو کرنے کے قائلین میں سے متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین کے اسماء گرامی بھی ذکر کیے ہیں، پھر امام شوکانی رضی اللہ عنہ نے خود بھی یہی موقف اختیار کیا ہے اور انہی کی پُر زورتائید کی ہے۔^(۱)

جب کہ امام ترمذی کے بقول اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین و اہل علم کے نزدیک آگ پر پکی چیز کھانے کے بعد وضو کرنا ضروری نہیں ہے، محض مستحب ہے۔ ترک وضو کے قائلین میں چاروں خلفائے راشدین سمیت بیس معروف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، جمہور تابعین اور ائمہ اربعہ سمیت جمہور اہل علم، اہل حجاز اور اہل کوفہ رضی اللہ عنہم سب شامل ہیں۔^(۲)

علامہ مبارکپوری رضی اللہ عنہ نے بھی اکثر اہل علم کے اس مسلک ہی کو راجح قرار دیا ہے کہ پکی ہوئی چیز کے کھانے کے بعد وضو ضروری نہیں ہے۔ ان کے دلائل میں سے ایک تو صحیح بخاری و مسلم میں اُمّ المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث ہے، جس میں وہ بیان فرماتی ہیں:

«أَكَلَ النَّبِيُّ ﷺ مِنْ كَتِفِ شَاةٍ، ثُمَّ قَامَ فَصَلَّى، وَلَمْ يَتَوَضَّأْ»^(۳)

”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بکری کے کندھے کا گوشت کھایا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے اور نئے سرے سے وضو کیے بغیر نماز ادا فرمائی۔“

دوسری حدیث بھی صحیح بخاری و مسلم ہی میں حضرت عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں

وہ فرماتے ہیں:

«رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَحْتَزُّ مِنْ كَتِفِ شَاةٍ، فَأَكَلَ مِنْهَا، فَدَعِيَ إِلَى الصَّلَاةِ

(۱) شرح صحیح مسلم (۲/۴/۴۳) نیل الأوطار (۱/۱/۲۰۱، ۲۰۸) تحفۃ الاحوذی (۱/۲۵۷)

(۲) تحفۃ الاحوذی (۱/۲۵۸) و نیل الأوطار (۱/۲۰۸ مفصلاً)

(۳) صحیح البخاری مع الفتح (۱/۳۱۲) صحیح مسلم مع شرح النووی (۲/۴/۴۵)

فَقَامَ وَطَرَحَ السَّكِّينَ وَصَلَّى وَلَمْ يَتَوَضَّأْ^①

”میں نے دیکھا کہ نبی اکرم ﷺ بکرے کے کندھے کا گوشت کاٹ کاٹ کر کھا رہے تھے۔ پھر آپ ﷺ نماز کے لیے پکارے گئے تو آپ ﷺ کھڑے ہو گئے اور چھری پھینک دی، نئے سرے سے وضو کیے بغیر نماز ادا فرمائی۔“

اس حدیث کی شرح میں امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ چھری سے کاٹ کر گوشت کھانا جائز ہے، کیوں کہ کبھی ہو سکتا ہے کہ گوشت سخت ہو یا بکرا بڑا ہو۔ اس ضرورت سے تو پکے ہوئے گوشت کو کاٹ کر کھانا جائز ہے، ورنہ بلا ضرورت ایسا کرنے کو اہل علم نے مکروہ کہا ہے۔^② تاہم حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ”فتح الباری“ میں ممانعت والی سنن ابو داؤد کی حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے اور بہ صورتِ صحت جواز کو صرف ضرورت پر محمول کیا ہے۔^③

❑ وضو کے عدم وجوب کی تیسری دلیل سنن اربعہ، صحیح ابن خزمیہ اور ابن حبان میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی وہ حدیث ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

((كَانَ آخِرُ الْأَمْرَيْنِ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ تَرَكَ الْوُضُوءَ مِمَّا غَيَّرَتِ النَّارُ^④))

”آگ پر پکی ہوئی اشیا کو کھانے کے بعد وضو کرنے یا نہ کرنے کے دونوں امور میں سے نبی اکرم ﷺ کا آخری امر ترک وضو تھا۔“

ان احادیث کی رو سے معلوم ہوا کہ کھانا کھانے کے بعد وضو کرنا ضروری نہیں، بشرطیکہ اونٹ

کا گوشت نہ ہو۔ اگر وہ ہو تو پھر وضو واجب ہے۔ فتح الباری میں ہے:

”امام دارمی سے نقل کرتے ہوئے امام بیہقی لکھتے ہیں کہ جب کسی موضوع کی احادیث مختلف و متعدد اور صحیح ہوں اور ان میں سے راجح کا پتا بھی نہ چلے تو پھر ہم دیکھیں گے کہ

① صحیح البخاری (۳۱۱/۱) صحیح مسلم (۴۵/۴/۲)

② شرح صحیح مسلم للنووی (۴۵/۴/۲)

③ فتح الباری (۳۱۲/۱)

④ سنن أبي داود (۳۲۷/۱) سنن الترمذی (۲۵۸/۱) مفصلاً، و صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۱۷۹)

و سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۴۸۹) التلخیص الحبیر (۱/۱/۱۱۶) مختصراً، موارد الظمان، رقم

الحدیث (۳۲۱، ۲۲۰، ۲۱۸)

نبی اکرم ﷺ کے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا عمل کیا تھا؟ پھر ان کے عمل والی جانب کو راجح قرار دیں گے (اور وہ ترک وضو ہے)۔“

”المجموع شرح المہذب“ میں امام نووی رحمہ اللہ نے اسی بات پر رضا مندی کا اظہار کیا ہے اور شرح مسلم میں وہ فرماتے ہیں کہ صحابہ و تابعین کے مابین یہ اختلاف رائے معروف تھا۔ پھر اس بات پر اجماع ہو گیا کہ آگ پر پکی چیز سے وضو واجب نہیں، سوائے اونٹ کے گوشت کے کہ وہ مستثنیٰ ہے۔ امام خطابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جن احادیث میں وضو کرنے کا حکم ہے، انہیں استحباب پر محمول کیا جائے نہ کہ وجوب پر۔ امام ابوالبرکات الحداد ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی ”منتقى الأخبار“ میں کچھ ایسی ہی بات فرمائی ہے کہ جن احادیث میں ترک وضو کا ذکر ہے، وہ وجوب کی نفی کرتی ہیں نہ کہ استحباب کی۔^(۱)

ہاتھ دھونا اور کلی کرنا:

یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ اہل جاہلیت صفائی ستھرائی پر زیادہ توجہ دینے کے عادی نہیں تھے۔ لہذا شروع اسلام میں کھانا کھانے کے بعد وضو کا حکم دیا گیا تھا اور جب اسلامی تعلیمات نے نظافت اور صفائی کی اہمیت لوگوں کے دلوں میں جاگزیں کر دی تو پھر کھانا کھانے کے بعد وضو کا وجوب بھی منسوخ کر دیا گیا اور چکناہٹ والی اشیا کھانے پینے کے بعد پورا وضو استحباباً بھی کیا جائے تو حرج نہیں، لیکن بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم کلی کر لی جائے اور ہاتھ دھولے جائیں۔ چنانچہ صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

«إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ شَرِبَ لَبَنًا فَمَضْمَضَ، وَقَالَ: إِنَّ لَهُ دَسْمًا»^(۲)

”نبی اکرم ﷺ نے دودھ پیا اور کلی کی اور فرمایا کہ اس کی چکناہٹ ہوتی ہے۔“

امام نووی رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ اس سے دودھ پینے کے بعد کلی کرنے کے استحباب کا پتا چلتا ہے اور اہل علم نے کہا ہے کہ دودھ کی طرح ہی دوسری اشیاے خور و نوش کو

(۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: شرح صحیح مسلم للنووي (۲/ ۴/ ۴۳) فتح الباري (۱/ ۳۱۱) المنتقى مع

النبيل (۱/ ۲۰۹) تحفة الأحمدي (۱/ ۲۶۱)

(۲) صحیح البخاری مع الفتح (۱/ ۳۱۳) صحیح مسلم مع النووي (۲/ ۴/ ۴۶) صحیح سنن أبي داود، رقم

الحديث (۱۸۰) صحیح سنن الترمذی (۷۷) صحیح سنن النسائي، رقم الحديث (۱۸۱) سنن ابن ماجہ،

رقم الحديث (۴۹۸)

کھانے یا پینے کے بعد بھی کلی مستحب ہے۔^①

سنن ابن ماجہ میں مذکورہ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

«مَضْمُضُوا مِنَ اللَّبَنِ»^② ”دودھ پی کر کلی کرو۔“

سنن ابن ماجہ ہی میں حضرت اُم سلمہ اور سہل بن سعد رضی اللہ عنہما سے بھی حسن سند کے ساتھ یہی الفاظ مروی ہیں، جن سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ دودھ پینے کے بعد کلی کرنا واجب ہے، کیوں کہ ان میں امر کا صیغہ ہے، جو عموماً وجوب کے لیے ہوتا ہے، لیکن فتح الباری میں حافظ ابن حجر رضی اللہ عنہ نے لکھا ہے کہ یہاں استحباب کے لیے ہے، جس کی دلیل یہ ہے کہ اسی حدیث مذکور کے راوی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت امام شافعی رضی اللہ عنہ نے بیان کی ہے کہ انھوں نے دودھ پیا اور کلی کی اور یہ بھی فرما دیا:

”لَوْ لَمْ أَمْتَمِضْ مَا بَالَيْتُ“ ”اگر میں کلی نہ کروں تو بھی پروا نہیں۔“

مذکورہ الفاظ کے استحباب پر دلالت کرنے کی دوسری دلیل سنن ابو داؤد میں حسن سند کے ساتھ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث بھی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ شَرِبَ لَبَنًا فَلَمْ يَتَمَضْمَضْ»^③

”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ پیا اور کلی نہیں کی۔“

اسی مقام پر صاحب فتح الباری لکھتے ہیں:

«إِنَّ لَهُ دَسْمًا» ”اس میں چکناہٹ ہوتی ہے۔“ کے الفاظ میں کلی کی وجہ بتائی گئی ہے، جو اس

بات کی دلیل ہے کہ ہر چکنی چیز کھانے یا پینے کے بعد کلی کرنا مستحب ہے اور اسی سے یہ استنباط بھی کیا جاسکتا ہے کہ ہر چکنی چیز کھانے کے بعد نظافت و صفائی کی غرض سے ہاتھوں کا دھونا بھی مستحب ہے۔^④

امام نووی رضی اللہ عنہ نے شرح صحیح مسلم میں لکھا ہے کہ کھانا کھانے سے پہلے اور بعد میں ہاتھوں کو دھونے کے مستحب ہونے کے بارے میں اہل علم کے مختلف اقوال ہیں، جن میں سے صحیح ترین یہی ہے کہ کھانا کھانے سے پہلے ہاتھوں کا دھونا مستحب ہے۔ سوائے اس کے کہ اسے یقین ہو کہ اس کے ہاتھ

① شرح صحیح مسلم للنووی (۲/۴/۴۶)

② سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۴۹۸) صحیح الجامع، رقم الحدیث (۵۸۷۴)

③ صحیح سنن أبي داؤد، رقم الحدیث (۱۸۱)

④ فتح الباری (۱/۳۱۳)

گندگی اور میل کچیل سے پاک و صاف ہیں اور کھانا کھانے کے بعد بھی یہ مستحب ہے، سوائے اس کے کہ کھانا وغیرہ خشک ہونے کی وجہ سے اس کا کوئی اثر اس کے ہاتھوں پر باقی نہ رہا ہو۔^(۱)

یہ مسئلہ کھانے پینے کے آداب سے متعلقہ ہے۔ جو یہاں ضمنی طور پر آگیا ہے، لہذا اس کی تفصیل اس کے اصل مقام پر آئے گی۔ ان شاء اللہ

2 عورت کو چھونا:

وہ امور جن سے وضو نہیں ٹوٹتا، ان میں سے دوسرا ہے عورت کا چھو جانا، اس کے متعدد دلائل ہیں، جن میں سے پہلی دلیل وہ واقعہ ہے، جو صحیح مسلم، سنن ترمذی اور بیہقی میں مذکور ہے، جس میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں:

«فَقَدْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ لَيْلَةً مِنَ الْفِرَاشِ فَالْتَمَسْتُهُ فَوَقَعَتْ يَدِي عَلَى بَاطِنِ قَدَمَيْهِ وَهُوَ فِي الْمَسْجِدِ وَهُمَا مَنْصُوبَتَانِ»

”ایک دن رات میں نے نبی اکرم ﷺ کو بستر پر نہ پایا۔ میں آپ ﷺ کو تلاش کرنے لگی تو میرا ہاتھ آپ ﷺ کے قدموں پر لگا، جب کہ آپ ﷺ سجدے کی حالت میں تھے اور آپ ﷺ کے دونوں پاؤں کھڑے تھے۔“

اسی حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے وہ دعا بھی مروی ہے، جو اس وقت آپ ﷺ سجدے

میں فرما رہے تھے اور وہ یہ ہے:

«اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخِطِكَ، وَبِمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوبَتِكَ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنْكَ، لَا أُحْصِي ثَنَاءً عَلَيْكَ، أَنْتَ كَمَا أَثْنَيْتَ عَلَيَّ نَفْسِكَ»^(۲)

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ عورت کو چھونا ناقض وضو نہیں ہے۔ یہ بات ایک دوسری حدیث میں اور بھی واضح تر ہے، جو صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتب حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

(۱) شرح صحیح مسلم مع النووي (۲/۴/۴۶)

(۲) صحیح مسلم مع شرح النووي (۲/۴/۲۰۳) صحیح سنن أبي داود، رقم الحديث (۷۸۲) صحیح الجامع، رقم الحديث (۱۲۸۰) یہ حدیث صحیح سنن الترمذی، رقم الحديث (۱۸۲۴) سنن ابن ماجہ، رقم الحديث (۱۱۷۹) میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اس میں مذکور ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ یہ دعا وتر میں پڑھا کرتے تھے۔ المنتقى مع النيل (۱/۱/۱۹۶)

سے مروی ہے، جس میں وہ بیان فرماتی ہیں:

« كُنْتُ أَنَامُ بَيْنَ يَدَيْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَرِجْلَايَ فِي قِبْلَتِهِ، فَإِذَا سَجَدَ غَمَزَنِي فَقَبَضْتُ رِجْلِي »

”میں نبی اکرم ﷺ کے سامنے سو جاتی اور میرے پاؤں نبی اکرم ﷺ کی جاے سجدہ پر ہوتے تھے۔ جب آپ ﷺ سجدہ کرتے تو چوکا فرماتے، تب میں اپنے پاؤں سمیٹ لیتی۔“

آگے اسی طرح سونے کی وجہ بیان کرتی اور فرماتی ہیں:

« وَالْبَيُوتُ يَوْمَئِذٍ لَيْسَ فِيهَا مَصَابِيحُ^① »

”ان دنوں گھروں میں چراغ نہیں ہوا کرتے تھے۔“

اس حدیث کے اطراف کو امام بخاری رحمہ اللہ اپنی صحیح میں تیرہ مقامات پر لائے ہیں اور اس سے متعدد مسائل کا استنباط کیا گیا ہے۔ مثلاً:

① سب سے پہلے ”کتاب الصلاة، باب الصلاة على الفراش“ کے تحت لائے ہیں کہ اپنے بستر پر نماز پڑھی جاسکتی ہے اور ظاہر ہے کہ بستر سے مراد بیڈ یا چارپائی نہیں، زمین پر ڈالا ہوا بستر ہے۔

② اسی سے یہ استدلال بھی کیا جاتا ہے کہ عورت کو چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ فتح الباری میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کئی احتمال ذکر کیے ہیں کہ شاید اس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاؤں ننگے نہ ہوں، بلکہ کوئی کپڑا حائل ہو یا پھر یہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ہی خاص ہو، لیکن امام شوکانی رحمہ اللہ نے ان کے احتمالات کو ظاہری الفاظ کی خلاف ورزی اور تکلف محض قرار دیا ہے۔^②

صحیح بخاری کے اسی باب میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سونے کے طریقے کی وضاحت بھی موجود ہے، جو حضرت عروہ بن زبیر رحمہ اللہ کے الفاظ میں یوں ہے:

« إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يُصَلِّي، وَعَائِشَةُ مُعْتَرِضَةٌ بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْقِبْلَةِ، عَلَى الْفِرَاشِ الَّذِي يَنَامَانِ عَلَيْهِ »

① صحیح البخاری مع الفتح (۱/ ۴۹۱) صحیح مسلم مع شرح النووي (۲/ ۴/ ۲۲۹) صحیح سنن أبي داود، رقم الحديث (۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸) صحیح سنن النسائي، رقم الحديث (۱۶۲)

② نیل الأوطار (۱/ ۱/ ۱۹۵)

”نبی اکرم ﷺ نماز ادا فرماتے، جب کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کے اور قبلے کے مابین اس بستر پر ہوتیں، جس پر وہ سویا کرتے تھے۔“

دوسری حدیث میں ہے:

«وَهِيَ بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْقِبْلَةِ عَلَى فِرَاشٍ أَهْلِهِ إِعْتِرَاضِ الْجَنَازَةِ»^①

”جب کہ وہ آپ ﷺ کے اور قبلے کے مابین اسی طرح ہوتیں، جیسے کسی کے سامنے جنازہ پڑا ہو۔“

اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اگر سامنے کوئی سویا یا لیٹا ہوا ہو تو نماز ہو جاتی ہے، مگر وہ نہیں، جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے اور اس کراہت پر دلالت کرنے والی احادیث کو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ضعیف قرار دیا ہے، اگر بالفرض وہ صحیح ثابت بھی ہو جائیں تو ان کو اس صورت پر محمول کیا جائے گا کہ اگر نمازی کی سوچ و فکر کے مشغول ہو جانے کا غالب خدشہ ہو تو پھر ایسا نہ کرے۔^②

③ تیسرا مسئلہ ”صحیح البخاری، باب الصلاة إلى السرير“ میں مذکور ہے کہ سامنے چارپائی پر کوئی سویا یا لیٹا ہوا ہو تو اس جگہ نماز ادا کی جاسکتی ہے، جیسا کہ اس باب میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے الفاظ میں ہے:

«لَقَدْ رَأَيْتَنِي مُضْطَجِعَةً عَلَى السَّرِيرِ فَيَجِيءُ النَّبِيُّ ﷺ فَيَتَوَسَّطُ السَّرِيرَ فَيُصَلِّي»^①

”میں چارپائی پر لیٹی ہوتی تو نبی اکرم ﷺ آتے اور چارپائی کو اپنے سامنے رکھ کر اس کے وسط میں کھڑے ہو کر نماز پڑھتے تھے۔“

④ آگے ایک باب میں چوتھا مسئلہ یہ اخذ کیا گیا ہے کہ نمازی کے سامنے اس کا کوئی ساتھی ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں، وہ اس کی نماز منقطع نہیں کرتا اور اس سے آگے ”باب الصلاة خلف النائم“ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے الفاظ ہیں:

① صحیح البخاری (۴۹۲/۱) صحیح مسلم مع شرح النووي (۲/۴/۲۲۸، ۲۲۹)

② فتح الباری (۴۹۲/۱)

③ صحیح البخاری (۵۸۷، ۵۵۱/۱)

«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُصَلِّي وَأَنَا رَاقِدَةٌ مُعْتَرِضَةٌ عَلَى فِرَاشِهِ فَإِذَا أَرَادَ أَنْ يُؤْتِرَ
أَيَقْظَنِي فَأُوتِرْتُ»^(۱)

”نبی اکرم ﷺ نماز ادا فرماتے، جب کہ میں سامنے آپ ﷺ کے بستر پر سو رہی ہوتی تھی
اور جب آپ ﷺ وتر پڑھنا چاہتے تو مجھے بھی بیدار کر دیتے اور میں بھی وتر پڑھ لیتی۔“

⑤ ان الفاظ سے یہ بھی استدلال کیا گیا ہے کہ سامنے کوئی سویا ہوا ہو تو نماز ہو جاتی ہے۔ اس حدیث
کی شرح میں صاحب فتح الباری لکھتے ہیں کہ امام بخاری نے یہ باب قائم کر کے اس بات کی طرف
اشارہ کر دیا ہے کہ سوئے ہوئے شخص کے سامنے نماز پڑھنے کی ممانعت کا پتا دینے والی احادیث
ضعیف ہیں۔ ان میں سے ایک حدیث سنن ابو داؤد اور ابن ماجہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے
مروی ہے، جس کے بارے میں خود امام ابو داؤد نے کہا ہے کہ اس کے تمام طرق وہی ہیں۔ اسی
طرح ”الکامل لابن عدی“ میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اور ”المعجم الأوسط“ میں
حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی روایات بھی ہیں، مگر ان دونوں کی اسانید بھی وہی ہیں۔^(۲)

⑥ آگے چل کر ”باب التطوع خلف المرأة“ میں چھٹا مسئلہ یہ اخذ کیا گیا ہے کہ سامنے
عورت لیٹی ہو تو نفلی نماز پڑھی جاسکتی ہے۔

⑦ ”باب من قال: لا يقطع الصلاة شيء“ میں ساتواں مسئلہ یہ اخذ کیا گیا ہے کہ کوئی چیز
نماز نہیں توڑتی۔

⑧ ایک باب میں آٹھواں مسئلہ یہ اخذ کیا گیا ہے کہ نماز کے دوران میں اگر عورت کے پاؤں وغیرہ
سے چھو جائے تو اس کی نماز صحیح ہے۔ یہاں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جب اس کی نماز صحیح ہے اور
سجدے میں وہ عورت کو ہاتھ سے چھو کر پاؤں سینے کا کہہ سکتا ہے اور نماز جاری رکھ سکتا ہے تو
پھر عورت کو چھونا ناقض وضو بھی نہیں ہو سکتا۔

⑨ آگے چل کر ایک باب میں اسی حدیث سے اخذ کیا گیا ہے کہ آدمی نماز تہجد کے وقت اپنی اہلیہ کو
جگا سکتا ہے، جیسا کہ ”باب إيقاظ النبي ﷺ أهله بالوتر“ سے پتا چلتا ہے۔^(۳)

① صحیح البخاری (۱/۵۸۷)

② فتح الباری (۱/۵۸۷)

③ فتح الباری (۲/۴۸۷)

- ⑩ اسی حدیث سے یہ بھی اخذ کیا گیا ہے کہ نماز کے دوران میں اتنے فعل سے نماز پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔^①
- ⑪ بخاری شریف کے ایک باب میں اس حدیث سے گیارہواں مسئلہ یہ لیا گیا ہے کہ چارپائی کا استعمال جائز ہے، یہ تقوے اور پرہیزگاری کے خلاف نہیں۔^②
- ⑫ بارہواں مسئلہ یہ ہے کہ شوہر کے جاگتے ہوئے بیوی سو سکتی ہے۔
- عورت کے چھونے کے ناقض وضو نہ ہونے کی تیسری دلیل سنن اربعہ اور مسند احمد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، وہ فرماتی ہیں:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَبْلَ بَعْضِ نِسَائِهِ، ثُمَّ خَرَجَ إِلَى الصَّلَاةِ، وَلَمْ يَتَوَضَّأْ»

”نبی اکرم ﷺ نے اپنی کسی زوجہ محترمہ کا بوسا لیا اور پھر نماز کے لیے گئے اور وضو نہ کیا۔“

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرنے والے راوی ان کے بھانجے حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ہیں، جو حضرت اسماء بنت صدیق رضی اللہ عنہا کے بیٹے تھے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے ان سے یہ بات سن کر کہا:

”مَنْ هِيَ إِلَّا أَنْتِ؟ قَالَ: فَضَحِكْتُ“^③

”آپ کے سوا وہ کون ہو سکتی ہے؟ کہتے ہیں: وہ ہنس دیں۔“

امام ابو داؤد رضی اللہ عنہ نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد اسے مرسل کہا ہے اور امام نسائی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مرسل ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے موضوع کی یہ بہترین حدیث ہے۔ امام ترمذی رضی اللہ عنہ نے امام بخاری رضی اللہ عنہ سے اس روایت کی تضعیف نقل کی ہے، لیکن امام شوکانی رضی اللہ عنہ کے بقول اس حدیث کا ضعف دوسری صحیح احادیث کی وجہ سے زائل ہو جاتا ہے، گویا اس حدیث کی سند ضعیف ہے تو پھر بھی کوئی مضائقہ نہیں، کیوں کہ صحیحین کی دوسری احادیث شاہد ہیں کہ عورت کو چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ یہ حدیث معرض استدلال نہ سہی، صرف تائید کے لیے ہی سہی، مگر صحیح احادیث جو موجود ہیں۔

ایک چوتھی حدیث بھی صحیح بخاری و مسلم اور دوسری کتب میں موجود ہے۔ شرح السنہ میں امام بغوی رضی اللہ عنہ

① فتح الباری (۳/۸۰)

② فتح الباری (۱۱/۶۷)

③ صحیح سنن أبي داود (۱/۳۶) سنن أبي داود مع العون (۱/۳۰۱) سنن الترمذی مع تحفة الأحوذی (۱/۲۸۱)

صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۷۵) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۱۶۴) سنن ابن

ماجه، رقم الحدیث (۵۰۲) المنتقى مع النيل (۱/۱۹۵)

نے اس سے بھی استدلال کیا ہے کہ کسی محرم عورت کے چھو جانے سے وضو نہیں ٹوٹتا، اگرچہ اس حدیث میں جوان عورت نہیں، بلکہ بچی کا ذکر ہے، چنانچہ صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتب حدیث میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ حضرت ابو قتادہ انصاری رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يُصَلِّي وَهُوَ حَامِلٌ أُمَامَةَ بِنْتَ زَيْنَبَ بِنْتِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَأَبِي الْعَاصِ بْنِ رِبْعَةَ بْنِ عَبْدِ شَمْسٍ، فَإِذَا سَجَدَ وَضَعَهَا وَإِذَا قَامَ حَمَلَهَا»^①

”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ادا فرمائی، جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نواسی حضرت زینب رضی اللہ عنہا اور ابو العاص رضی اللہ عنہ کی بیٹی امامہ رضی اللہ عنہا کو اٹھائے ہوئے تھے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں جاتے تو اسے بٹھا لیتے اور جب کھڑے ہوتے تو اسے اٹھا لیتے۔“

امام ابن دینق العید رضی اللہ عنہ نے بھی دیگر مسائل کے علاوہ اس حدیث سے اخذ کیا ہے کہ چھوٹے بچوں کو چھونا وضو پر کوئی اثر انداز نہیں ہوتا۔ اس حدیث کی شرح میں حافظ عسقلانی رضی اللہ عنہ نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بچی کو کپڑوں کے اوپر ہی سے چھوتے ہوں گے۔ لیکن یہ احتمال بھی بلاشبہ تکلف محض ہے، کیوں کہ امام بغوی کے بقول بچی کے جسم کا کوئی حصہ تو کپڑے کے بغیر بھی ہوگا، جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی لگتا ہوگا، لہذا کپڑے وغیرہ کا حائل ہونا یہاں بھی ویسا ہی ہوا، جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا والی حدیث میں ہے۔ یاد رہے کہ اسی حدیث والے امامہ رضی اللہ عنہا سے متعلق واقعہ کو سامنے رکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ جب سجدے سے اٹھتے ہوئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم امامہ رضی اللہ عنہا کو اٹھا لیتے تھے تو اگر کسی کے سر سے ٹوپی گر جائے تو وہ بھی اٹھا کر سر پر رکھ سکتا ہے۔ ٹوپی یا عمامہ اٹھانا کیا حضرت امامہ رضی اللہ عنہا کو اٹھانے سے کوئی بڑا فعل ہے؟ ہرگز نہیں۔

ان تمام احادیث کی بنا پر حضرت علی، ابی بن کعب اور ابن عباس رضی اللہ عنہم اور امام عطاء، طاؤس، ثوری، مجاہد، حسن بصری، عبید بن عمیر، سعید بن جبیر، شععی، قتادہ، مقاتل بن حیان، امام ابو حنیفہ اور ابو یوسف رضی اللہ عنہم کا مسلک یہ ہے کہ عورت کو چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔^②

① صحیح البخاری (۱/ ۵۹۰) صحیح مسلم مع شرح النووي (۲/ ۳۱، ۳۲) صحیح سنن أبي داود، رقم

الحدیث (۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۶۸۷) شرح السنة للبغوي (۳/ ۲۶۵)

② تفسیر الطبري (۸/ ۳۸۹، ۳۹۲) بتخریج أحمد شاکر طبع مصر) نیل الأوطار (۱/ ۱) فتح القدير

للسوکاني (۱/ ۴۷۰) بیروت) عون المعبود (۱/ ۳۰۲) تحفة الأحوذی (۱/ ۲۸۲)

تاکلینِ نقض کے دلائل اور ان کا جائزہ:

حضرت عمر بن خطاب، عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، امام زہری، شافعی اور ان کے اصحاب، نیز ربیعہ اور زید بن اسلم رضی اللہ عنہما کے نزدیک عورت کو چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ ان کا استدلال بعض احادیث اور قرآن کریم کی ایک آیت سے ہے۔

پہلی دلیل:

آیت تیمم یعنی سورۃ النساء (آیت: ۴۳) اور سورۃ المائدہ (آیت: ۶) میں جو یہ الفاظ ہیں:

﴿أَوْ لَمَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا﴾

”یا تم عورتوں سے ہم بستر ہوئے ہو اور تمہیں پانی نہ ملے تو پاک مٹی لو اور منہ اور ہاتھوں کا مسح (کر کے تیمم) کر لو۔“

اس آیت کے ان الفاظ میں جو لفظ ﴿لَمَسْتُمُ﴾ ہے، اس کا لغوی معنی لمس کرنا اور چھونا ہے، عورت کو چھونے کے نواقض وضو ہونے کی رائے رکھنے والوں نے اس سے یہی استدلال کیا اور کہا ہے کہ قرآن کریم کے مذکورہ مقام پر اس ”لمس“ کا یہی معنی ہے۔ جبکہ پہلے مسلک والوں نے وہاں اس لفظ کا مجازی معنی صحبت و جماع مراد لیا ہے اور صرف مس کرنے کو ناقض نہیں کہا۔

لمس کا معنی:

تاکلینِ نقض کی دلیل اول سورۃ النساء و سورۃ المائدہ کی آیت تیمم ہے اور اگر قرآن کے ان مقامات پر ﴿أَوْ لَمَسْتُمُ النِّسَاءَ﴾ میں لمس کو اس کے لغوی و حقیقی معنوں پر ہی محمول کیا جائے تو بات بن جاتی ہے، لیکن وہاں حقیقی معنی مراد نہیں، بلکہ مجازی معنی مراد ہے اور لمس یا چھونا جماع کرنے سے کنایہ ہے۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر مفسرین کرام رضی اللہ عنہم کی آرا:

رئیس المفسرین حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر سے پتا چلتا ہے اور یہ وہی مفسر ہیں، جو ”ترجمان القرآن“ کے نام سے معروف ہیں اور صحیح بخاری و مسلم اور مسند احمد میں مذکور حدیث کی رو سے ان کے لیے نبی اکرم ﷺ نے یہ دعا فرمائی تھی:

«اللَّهُمَّ فَتَقِهِ فِي الدِّينِ»^① ”اے اللہ! انہیں دین کی سمجھ عطا فرما۔“

صحیح بخاری ہی کی ایک دوسری حدیث میں ہے:

«اللَّهُمَّ عَلِّمَهُ الْكِتَابَ»^② ”اے اللہ! انہیں قرآن کا علم عطا فرما۔“

امام ابن کثیر اور طبری رحمہما اللہ:

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں سورۃ النساء کی آیت کے تحت لکھا ہے کہ مفسرین اور ائمہ کرام کے اس لفظ ﴿لَمَسْتُمْ﴾ کے معنی کے سلسلے میں دو الگ الگ قول ہیں، جن میں سے ایک تو یہ ہے کہ یہاں لمس سے مراد جماع ہے، کیوں کہ قرآن کریم ہی کے دوسرے دو مقامات پر بھی مس کرنے یا چھونے سے جماع ہی مراد لیا گیا ہے، جیسا کہ سورۃ البقرہ (آیت: ۲۳۷) میں ارشاد الہی ہے:

﴿وَإِنْ طَلَقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمْسُوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً

فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوا الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ﴾

”اور اگر تم عورتوں کو ان کے پاس جانے سے پہلے طلاق دے دو، لیکن مہر مقرر کر چکے ہو تو آدھا مہر دینا ہوگا، ہاں اگر عورتیں بخش دیں یا مرد جن کے ہاتھ میں عقد نکاح ہے (اپنا حق) چھوڑ دیں۔“

اس آیت میں مس سے مراد جماع ہے۔ اسی طرح سورۃ الاحزاب (آیت: ۴۹) میں ارشاد الہی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ

تَمْسُوهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُونَهَا﴾

”مومنو! جب تم مومن عورتوں سے نکاح کر کے ان کو ہاتھ لگانے (ان کے پاس جانے) سے پہلے طلاق دے دو، تو تم کو کچھ اختیار نہیں کہ ان سے عدت پوری کرواؤ۔“

اس آیت میں بھی مس بہ معنی جماع ہی ہے۔ تفسیر القرآن بالقرآن کے طور پر یہ دو آیتیں ذکر

کرنے کے بعد امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے متعدد اسانید کے ساتھ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے اقوال

① صحیح البخاری مع الفتح (۱/ ۲۴۴) مختصر صحیح مسلم للمنذري، رقم الحديث (۱۶۹۰) المعجم المفهرس (۵/ ۱۹۰ لیڈن)

② صحیح البخاری مع فتح الباری (۱/ ۱۶۹)

ذکر کیے ہیں، جن میں سے ہر ایک میں انھوں نے اس جگہ لمس یا مس کا معنی جماع ہی کیا ہے اور لکھا ہے کہ حضرت علی، ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، امام مجاہد، طاؤس، حسن بصری، عبید بن عمیر، سعید بن جبیر، شعبی، قتادہ اور مقاتل بن حیان رضی اللہ عنہم سے بھی یہی معنی مروی ہے۔ آگے لمس کو چھونے کے معنی میں لینے والوں کا تذکرہ کرنے کے بعد امام ابن جریر رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں لکھا ہے:

”وَأَوْلَى الْقَوْلَيْنِ فِي ذَلِكَ بِالصَّوَابِ قَوْلُ مَنْ قَالَ عَنِ اللَّهِ بِقَوْلِهِ: ﴿أَوْ لَمَسْتُمُ النِّسَاءَ﴾ الْجَمَاعَ دُونَ غَيْرِهِ مِنْ مَعَانِي اللَّامِسِ لِصِحَّةِ الْخَبَرِ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ أَنَّهُ قَبَّلَ بَعْضَ نِسَائِهِ ثُمَّ صَلَّى، وَلَمْ يَتَوَضَّأْ“^①

”ان دونوں مذکورہ اقوال میں سے صحیح تر قول انہی کا ہے، جو اس ارشادِ الہی ﷺ ﴿أَوْ لَمَسْتُمُ النِّسَاءَ﴾ میں لمس کو جماع سے کنایہ قرار دیتے ہیں اور لمس کے دوسرے معانی میں سے کوئی معنی نہیں لیتے، ان کے قول کے صحیح تر ہونے کی دلیل یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی کسی زوجہ محترمہ کا بوسا لینے کے بعد نماز پڑھی، مگر وضو نہیں کیا۔“

پھر آگے وہ احادیث بھی ذکر کی ہیں، جو ہم بالتفصیل ذکر کر چکے ہیں۔

امام طبری رضی اللہ عنہ نے ”جامع البیان عن تأویل آی القرآن“ (۵۱ / ۸) میں سورۃ النساء (آیت: ۲۳) کی تفسیر بیان کی ہے۔ جب کہ صفحہ (۳۸۹ تا ۳۹۹) پر مسئلہ زیر بحث ہے۔ انھوں نے دونوں اقوال سے متعلقہ احادیث و آثار باسناد ذکر کیے ہیں اور ترجیح اسی کو دی ہے کہ یہاں مس سے مراد جماع ہے اور محض چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا ہے۔^②

تفسیر مجاہد:

مولانا عبدالرحمن سورتی نے امام مجاہد رضی اللہ عنہ کی جو تفسیر جمع کی ہے اور حاکم قطر کے اخراجات پر شائع ہوئی ہے، اس (ص: ۱۵۹) میں تفسیر طبری کے حوالے سے امام مجاہد اور حسن بصری رضی اللہ عنہما سے بھی ملامت سے مراد جماع ہی لکھا ہے۔^③

① تفسیر ابن کثیر (۱/۵۰۲، ۵۰۴) دار المعرفۃ، بیروت.

② طبری (۸/۳۸۹، ۳۹۹)

③ تفسیر مجاہد (ص: ۱۵۹) طبع قطر.

زاد المسیر:

علامہ ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر ”زاد المسیر“ میں سورۃ النساء کی آیت (۴۳) کے تحت لکھا ہے کہ ملامت سے مراد کے بارے میں دو قول ہیں، پھر ان دونوں کو ذکر کیا ہے، جب کہ ترجیح جماع والی مراد ہی کو دی ہے۔^①

تفسیر قرطبی:

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر ”الجامع لأحكام القرآن“ میں سورۃ النساء کی آیت (۴۳) کے تحت بڑی تفصیل بیان کی ہے۔ اس آیت سے انھوں نے اکتالیس مسائل کا استنباط و استخراج کیا ہے، جو اکتالیس صفحات پر محیط ہیں اور مسئلہ (۲۶) اسی لمس سے تعلق رکھتا ہے، جس کے بارے میں انھوں نے مختلف اقوال ذکر کیے ہیں اور دونوں معروف مذاہب یعنی مطلقاً نقض وضو یا عدم نقض کے بجائے ایک تیسرے مسلک کی بھرپور تائید کی ہے:

ایک درمیانی راہ:

امام مالک، احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ اور لیث بن سعد رحمۃ اللہ علیہم سے ایک تیسرا مسلک مروی ہے، جس میں مذکورہ دونوں مذاہب کی نسبت درمیانی راہ اختیار کی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص شہوت کے داعیے سے عورت کو چھوئے تو وضو ٹوٹ جاتا ہے اور اگر اس کے بغیر ہو تو پھر نہیں ٹوٹے گا۔ اس مسلک کو امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے سب سے شدید ترین قرار دیا ہے۔^②

فی ظلال القرآن:

دور حاضر کی معروف کتب تفسیر میں سے ایک کتاب ”فی ظلال القرآن“ ہے، جس میں سید قطب شہید رحمۃ اللہ علیہ نے بھی لمس کے بارے میں چار قسم کے اقوال ذکر کیے ہیں اور آخر میں لکھا ہے کہ ہمارے نزدیک ﴿أَوْ لَمَسْتُمُ النِّسَاءَ﴾ میں لمس سے مرادی معنیٰ وہی ہے، جس سے غسل واجب ہوتا ہے، یعنی جماع، پھر وہ کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک ترجیح اسی معنیٰ کو حاصل ہے۔^③

① زاد المسیر (۲/۹۲، ۹۳) طبع المکتب الإسلامی .

② تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: تفسیر القرطبی (۳/۵، ۲۲۳، ۲۲۸) طبع قاہرہ.

③ فی ظلال القرآن (۲/۶۶۸، ۶۶۹) دار الشروق، بیروت و قاہرہ.

فتح القدير:

امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر ”فتح القدير“ میں اس مسئلے سے متعلق متعدد اقوال ذکر کیے ہیں اور لکھا ہے کہ ہر قول والے کے پاس دلائل ہیں اور وہ سمجھتا ہے کہ اسی کا قول سب سے زیادہ صحیح ہے، حالانکہ دوسرے اقوال کے صحیح ہونے کا بھی احتمال موجود ہے۔ خود اُن کا اپنا رجحان اسی طرف ہے کہ عورت کو چھونے سے وضو واجب نہیں ہوتا۔ انھوں نے وجوب والوں کے دلائل کا بڑے علمی انداز سے رد کیا ہے، جس کی تفصیل ”فتح القدير“ (۱/ ۴۷۰-۴۷۴) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

تفسیر روح المعانی:

علامہ آلوسی نے سورۃ النساء کی آیت (۴۳) کے تحت اپنی تفسیر ”روح المعانی“ (۳/ ۵/ ۴۱، ۴۲ طبع بیروت) میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ﴿لَمَسْتُمْ﴾ سے مراد جماع ہی لی ہے، مگر تصریح کے بجائے کنائے سے کام لیا ہے، پھر انھوں نے اپنی تفسیر میں مختلف اقوال بھی بیان کیے ہیں اور ان کے دلائل بھی نقل کیے ہیں۔ البتہ ان کے نزدیک بھی اولیت اسی بات کو حاصل ہے کہ چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔

تفسیر المنار:

ماضی قریب کے مشہور محقق علامہ محمد رشید رضا مصری اپنی تفسیر ”المنار“ میں لکھتے ہیں کہ یہاں عورتوں کو چھونا جماع اور صحبت کرنے سے کنایہ ہے، آگے چل کر علامہ رشید رضا اپنے استاذ الامام محمد عبدہ کی جامع ازہر میں بیان کردہ اس آیت کی تفسیر کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا: ”میں نے اس کی تفسیر معلوم کرنے کے لیے تفسیر کی پچیس کتابوں کا مطالعہ کیا، لیکن میری تسلی نہیں ہوئی اور نہ ان سب میں سے کوئی ایک بھی قول ایسا ملا جو تکلف سے پاک ہو، پھر میں نے صرف قرآن کریم کو لیا اور اس کا گہری نظر سے مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ اس آیت کا معنی بڑا واضح اور جلی ہے۔“

اپنے استاد کی گفتگو کو مختصر کرتے اور سمیٹتے ہوئے علامہ موصوف لکھتے ہیں: ”جب انھیں پچیس کتب تفسیر میں سے بھی تکلفات سے بالا کوئی قول نہ ملا، تو میں نے

اس مقام کی تفسیر لکھتے وقت ”روح المعانی“ آلوسی رحمہ اللہ کے سوا دوسری کوئی تفسیر نہیں دیکھی اور یہ تالیف کے اعتبار سے سب سے آخری تفسیر ہے۔ اس کے مولف بڑے وسیع المطالعہ بھی ہیں، مگر روح المعانی کے حوالے سے معلوم ہوا کہ انھوں نے اس آیت کو معضلات القرآن میں سے شمار کیا ہے، حالانکہ واللہ یہ آیت معضل ہے نہ مشکل اور نہ قرآن میں کوئی دوسری آیت ہی معضل ہے۔“

آگے موصوف نے قرآن کو اپنی مرضی کے معانی پہنانے والوں اور قرآن کو اپنے نظریات و مذاہب کے مطابق ڈھالنے کا خوب نوٹس لیا ہے، جو قابل مطالعہ ہے مگر ہمارے موضوع سے خارج ہے، اگر کوئی چاہے تو تفسیر المنار (۵/ ۱۱۹-۱۲۱) طبع دار المعرفہ بیروت کو دیکھ سکتا ہے۔ غرض کہ علامہ رشید رضا نے مذہبی تعصب اور تکلفات سے پاک ہو کر قرآن کریم کا مطالعہ کرنے کی شکل میں ﴿أَوْ لِمَسْتَمُّ النَّسَاءِ﴾ میں چھونے کو جماع سے کنایہ قرار دیا ہے۔ خود ہم نے بھی جب ”روح المعانی“ کا مطالعہ کیا تو دیگر تفصیلات سے قطع نظر یہی لکھا ہے کہ علامہ آلوسی نے بھی چھونے کو جماع و صحبت سے کنایہ قرار دینے ہی کو اولیت دی ہے، اگرچہ دیگر اقوال بھی ذکر کیے ہیں، جن کا تذکرہ مختصراً گزر چکا ہے۔ تفصیل کے لیے ”روح المعانی“ (۳/ ۵، ۴۱، ۴۲) طبع بیروت) دیکھ سکتے ہیں۔

تیسیر الکریم الرحمن:

علامہ عبد الرحمن بن ناصر السعدی ماضی قریب میں سعودیہ کے معروف عالم گزرے ہیں۔ انھوں نے اپنی تفسیر ”تیسیر الکریم الرحمن فی تفسیر کلام الرحمن“ (۱/ ۲، ۳۵) میں اسی مسئلے کو بیان کیا ہے اور چھونے سے جماع مراد ہونے کو اولیت دی ہے۔

احسن التفاسیر:

برصغیر کے کبار علما میں سے ایک علامہ سید احمد حسن محدث دہلوی رحمہ اللہ بھی ہیں، جن کی ”تنقیح الرواۃ شرح المشکاة“ اور ”بلوغ المرام“ کا حاشیہ بہ نام ”حاشیۃ الدہلوی“ دونوں تالیفات عربی میں ہیں اور نہایت اعلیٰ پائے کی کتب ہیں۔ انھوں نے محدثین کے قبول روایت

کے عمدہ معیار کو سامنے رکھتے ہوئے صحیح و حسن درجے کی احادیث۔ الا ماشاء اللہ۔ پر مشتمل تفسیر قرآن مرتب کی ہے، جس کا نام ”أحسن التفسیر“ ہے۔ مکتبہ سلفیہ لاہور کے طبع کردہ ایڈیشن (۱/۳۲۵) میں لکھا ہے کہ اس آیت میں چھونے سے مراد جماع ہے اور یہ حضرت عباس رضی اللہ عنہما کا اختیار ہے، جب کہ بعض دیگر مفسرین نے یہاں لمس سے عام چھونا مراد لیا ہے۔ موصوف نے لکھا ہے کہ ہم اس تفسیر کے مقدمے میں وضاحت کر چکے ہیں کہ اگر کسی آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر صحابہ و مفسرین کی آرا میں اختلاف ہو تو ترجیح اسی کو ہوگی، جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہوگا۔ یہی بات امام شوکانی رحمہ اللہ نے بھی کہی ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اس آیت کی رو سے عورت کو محض چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا، کیونکہ نقض وضو والی رائے تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہما کے خلاف اور مرجوح ہے۔

معارف القرآن:

حنفی دیوبندی مکتب فکر کے معروف حنفی عالم مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر ”معارف القرآن“ میں سورۃ النساء کی آیت (۴۳) کی تفسیر میں اس مسئلے کی طرف توجہ نہیں دی۔ البتہ معارف و مسائل سے پہلے خلاصہ تفسیر جو انھوں نے مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی ”بیان القرآن“ سے لیا ہے، اس میں لمس سے مراد قربت (اور صحبت) ہی مذکور ہے۔ معارف القرآن میں آیات کا جو تحت السطور ترجمہ ہے، جو دراصل شاہ عبدالقادر محدث دہلوی رحمہ اللہ کا ہے، البتہ اس میں مولانا محمود الحسن المعروف شیخ الہند نے کچھ لغوی تہذیب و تجدید کی ہے، جیسا کہ خود ان کا اور مولف معارف القرآن کا بیان ہے، اس میں بھی لمس سے مراد قربت ہی مذکور ہے۔ ان کے الفاظ میں:

”یا پاس گئے ہوان عورتوں کے“^(۱)

ترجمہ شاہ رفیع الدین رحمہ اللہ:

مترجمین قرآن میں سے شاہ رفیع الدین محدث دہلوی رحمہ اللہ نے بھی ﴿أَوْ لَمَسْتُمُ النِّسَاء﴾ کا ترجمہ ”یا صحبت کرو عورتوں سے“ کیا ہے۔ اس ترجمہ والے قرآن کریم کے حاشیے میں طہارت کی

(۱) معارف القرآن (۲/۴۲۲) طبع ادارہ معارف کراچی۔ مقدمہ ترجمہ قرآن شیخ الہند (ص: ۷) طبع مغربی جرمنی۔

ضرورت پیش آنے کی دو صورتیں ذکر کی ہیں، ان میں بھی چھونے سے مراد صحبت کرنا ہی مذکور ہے۔^①

تفسیری فوائد مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ:

مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ قرآن ”موضح فرقان“ پر سورت آل عمران کے بعد تا آخر قرآن تفسیری فوائد مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے رقم کردہ ہیں۔ چنانچہ علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے سورۃ النساء کی آیت (۴۳) کے تحت فائدہ (۴) کے ضمن میں جو تفصیل بیان کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بھی چھونے سے صحبت کرنا ہی مراد لیا ہے۔^②

ترجمہ بریلوی و حاشیہ مراد آبادی:

حنفی بریلوی مکتب فکر کے بانی احمد رضا خان فاضل بریلوی کے ترجمہ ”کنز الإیمان“ میں ﴿أَوْ لَمَسْتُمُ النِّسَاءَ﴾ کے تحت لکھا ہے: ”یا تم نے عورتوں کو چھوا۔“ اس پر نعیم الدین مراد آبادی کے تفسیری حواشی خزائن العرفان میں فائدہ: ۱۳۰ کے تحت چھونے سے مراد جماع کرنا لکھا ہے۔^③

تفہیم القرآن:

صاحب تفہیم القرآن مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے لمس کے مراد کی معنی کی تعیین کے سلسلے میں دو معروف اقوال یعنی جماع و مباشرت کرنے اور محض چھونے کی رائے رکھنے والوں کے علاوہ ایک تیسری اور درمیانی راہ اختیار کرنے والوں یعنی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ و حنابلہ کا تذکرہ بھی کیا ہے، جن کے نزدیک محض چھونا بھی اگر شہوت سے ہو تو ناقض وضو ہے، ورنہ نہیں۔^④

خلاصہ کلام:

ان تمام تراجم، تفسیری فوائد و حواشی اور کتب تفسیر کے اقتباسات سے یہ بات واضح طور پر سامنے آگئی کہ مذکورہ آیت کے الفاظ میں چھونا جماع سے کنایہ ہے، اس سے مراد محض چھونا نہیں اور اس سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ اس آیت سے عورت کو چھونے سے وضو ٹوٹ جانے پر استدلال صحیح

① ترجمہ و حاشیہ شاہ رفیع الدین (ص: ۱۴) تاج کمپنی.

② ترجمہ قرآن شیخ الہند (ص: ۱۰۹، ۹۴) طبع مغربی جرمنی.

③ کنز الإیمان (ص: ۱۲۶) طبع چاند کمپنی لاہور.

④ تفہیم القرآن (۱/۳۵۵) لاہور

نہیں ہے اور نہ یہ آیت ان کی دلیل بن سکتی ہے۔

اس مسئلے میں علامہ ابن حزم رحمہ اللہ کا رجحان شافعیہ کی طرح نقض کی طرف ہے اور ”المحلی“ میں انھوں نے بڑے زور و شور سے اس بات کو ثابت بھی کیا ہے۔^①

لیکن پوری تفصیل میں جانے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے میں احناف والا مسلک ہی

راجح ہے۔

بداية المجتهد:

فقہ مقارن کی مشہور و معتبر کتاب ”بداية المجتهد“ میں علامہ ابن رشد کا کہنا ہے کہ لمس کی دلالت اگرچہ دونوں معنوں یعنی محض چھونے اور جماع کرنے ہر دو کے لیے برابر کے قریب ہے، لیکن میرے نزدیک زیادہ ظاہر دلالت جماع کے لیے ہے، اگرچہ یہ مجازی معنی ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے مباشرت اور لمس کے الفاظ کے ساتھ ہی جماع سے کنایہ کیا ہے۔ مذکورہ آیت کی اس تفسیر سے وہ تعارض و اختلاف بھی ختم ہو جاتا ہے، جو اس آیت کی دوسری تفسیر اور احادیث میں پیدا ہوتا نظر آتا ہے۔ اپنی اس رائے کو ذکر کرنے سے پہلے علامہ ابن رشد نے مذکورہ مسئلے میں ائمہ و فقہاء کے مختلف اقوال ذکر کرنے کے بعد اس بات کی وضاحت بھی کی ہے کہ ان کے اختلاف کا سبب کلام عرب میں لفظ لمس کا دونوں معنوں کے مابین مشترک ہونا ہے، کیوں کہ اہل عرب اس لفظ کو کبھی تو محض ہاتھ سے چھونے کے لیے استعمال کرتے ہیں اور کبھی اس لفظ سے جماع کے لیے کنایہ کرتے ہیں۔

آگے بھی علامہ موصوف نے اس موضوع پر بڑی عمدہ بحث کی ہے، جسے - مؤسسۃ الناصر للثقافة - کی چار الگ الگ چھوٹے سائز کے چار اجزا والی کتاب ”بداية المجتهد“ کے (۱/ ۵۴، ۵۵، ۵۶) پر یا پھر دو جلدوں پر مشتمل دار المعرفہ بیروت والی معروف طباعت (۱/ ۳۷، ۳۸، ۳۹) میں دیکھا جاسکتا ہے، مختصر یہ کہ علامہ ابن رشد نے بھی عورت کو چھونے سے وضو نہ ٹوٹنے ہی کو ترجیح دی ہے۔

قائلین نقض کی دوسری دلیل:

جن ائمہ و فقہاء نے کہا ہے کہ عورت کو محض چھونے سے بھی وضو ٹوٹ جاتا ہے، ان کا استدلال بعض احادیث سے بھی ہے، مگر جس طرح ان کے اس مذکورہ آیت سے استدلال کرنے کی پوزیشن ہے،

① المحلی (۱/ ۱، ۲۴۴، ۲۴۹) طبع المكتبة التجارية، بیروت.

بالکل یہی معاملہ احادیث سے استدلال کا بھی ہے کہ وہ بھی اس مسئلے میں ان کی دلیل نہیں بن سکتیں، جیسا کہ سنن ترمذی، نسائی، دارقطنی، بیہقی، مسند احمد اور مستدرک حاکم میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے عرض کی کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ اس آدمی کے بارے میں کیا فرماتے ہیں، جو اپنی پہچان والی کسی غیر محرم عورت سے ملا اور صرف جماع کو چھوڑ کر اس سے ہر وہ فعل کیا، جو کوئی شوہر اپنی بیوی سے کرتا ہے؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے سورت ہود کی آیت (۱۱۴) نازل فرمائی، جس میں فرمایا:

﴿وَأَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفِي النَّهَارِ وَزُلْفًا مِّنَ اللَّيْلِ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ﴾
 ”اور دن کے دونوں سروں (صبح اور شام کے اوقات میں) اور رات کی چند (پہلی) ساعات میں نماز پڑھا کرو، کچھ شک نہیں کہ نیکیاں گناہوں کو دور کر دیتی ہیں۔“

تب نبی اکرم ﷺ نے اس آدمی سے فرمایا:

«تَوَضَّأْتُمْ صَلَّيْ»^(۱) ”وضو کرو اور پھر نماز پڑھو۔“

تاکلمین نقض کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے اس آدمی کو وضو کرنے کا حکم فرمایا، حالانکہ اس نے جماع کی نفی کی تھی، جو اس بات کی دلیل ہے کہ عورت کو چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا یہ استدلال کئی لحاظ سے صحیح نہیں:

❖ اس لیے کہ یہ حدیث ”عبدالملک بن عمر عن عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ عن معاذ“ کی سند سے مروی ہے اور اس سند میں انقطاع پایا جاتا ہے، کیوں کہ عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ کا حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں اور سنن نسائی میں ہے:

”شعبة عن عبد الرحمن قال: إن رجلاً... فذكر الحديث“

یہ روایت مرسل ہے، کیوں کہ اس میں عبدالرحمن نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا ذکر ہی نہیں کیا، بلکہ تابعی نے صحابہ کے واسطے کے بغیر ہی قصہ نقل کر دیا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ یہ واقعہ تو صحیحین میں بھی مذکور ہے، مگر وہاں وضو کرنے اور نماز ادا کرنے کے سرے سے الفاظ ہی مذکور نہیں ہیں۔

❖ اس لیے بھی اس حدیث سے استدلال درست نہیں، کیوں کہ یہ ثابت نہیں ہے کہ نبی اکرم ﷺ

(۱) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۲۴۸۷) سنن ابن ماجہ (۱۳۹۸) المنتقى مع النبل (۱/ ۱) (۱۹۴)

کے اس شخص کو وضو کا حکم دینے سے پہلے وہ وضو سے تھا اور نہ یہ بات ثابت ہے کہ اس عورت سے ملنے سے پہلے وہ وضو کیے ہوئے تھا جو ٹوٹ گیا، جب اس کا وضو ہی ثابت نہیں تو ٹوٹنے پر استدلال کیسے کیا جاسکتا ہے؟

❖ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اس آدمی کو وضو کرنے کا حکم محض اس لیے فرمایا ہو کہ وضو گناہوں کو مٹانے والا عمل ہے، نہ اس لیے کہ وہ وضو سے تھا اور اس کا وضو ٹوٹ گیا تھا۔
المختصر ایسے ہی بعض دیگر روایات اور آثار سے بھی استدلال کیا جاتا ہے، مگر ان کا حال بھی یہی ہے، جو اس حدیث سے استدلال کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام شوکانی، علامہ ابن رشد اور علامہ عبدالرحمن مبارکپوری رحمہم جیسے کبار محققین نے اسی کو ترجیح دی ہے کہ عورت کو چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔

3 قہقہہ:

وہ امور جو بعض فقہاء کے نزدیک نوافض وضو میں سے ہیں، مگر ان کے نوافض ہونے کی کوئی صحیح دلیل نہیں، ان میں سے تیسری چیز ہے: قہقہہ مار کر ہنسنا۔

امام احمد، شافعی اور امام مالک رحمہم اور ان کے اصحاب سبھی کا مسلک یہ ہے کہ قہقہہ مار کر ہنسنا نوافض میں سے نہیں ہے، چنانچہ سنن دارقطنی کے حوالے سے فتح الباری میں لکھا ہے کہ ایک مرفوع حدیث میں نبی اکرم ﷺ سے مروی ہے کہ نماز کے دوران میں ہنسنے سے وضو نہیں ٹوٹتا، لیکن وہ حدیث نقل کرنے کے بعد خود امام دارقطنی رحمہم نے اسے ضعیف کہا ہے۔ البتہ اس مرفوع حدیث کے راوی حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے موقوفاً، صحیح بخاری کے ایک ترجمہ الباب میں تعلقاً اور سنن دارقطنی و سنن سعید بن منصور میں صحیح سند سے موصولاً مروی ہے، فرماتے ہیں:

«إِذَا ضَحِكَ فِي الصَّلَاةِ أَعَادَ الصَّلَاةَ وَلَمْ يُعِدِ الوُضُوءَ»^(۱)

”اگر کوئی نماز میں ہنس دے تو وہ نماز دہرائے، لیکن وضو نہ دہرائے۔“

اس صحیح سند والے اثر سے معلوم ہوا کہ نماز کے دوران میں ہنسنے سے نماز تو باطل ہو جاتی ہے،

(۱) نیل الأوطار (۱/۱)، ۱۹۴، ۱۹۵

(۲) صحیح البخاری مع الفتح (۱/۲۸۰)

البتہ وضو پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ علامہ ابن رشد نے ”بداية المجتهد“ میں لکھا ہے کہ اس سلسلے میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے شاذ مسلک اختیار کیا ہے اور نماز کے دوران میں ہنسنے والے کے لیے وضو کرنا واجب قرار دیا ہے، ان کی دلیل طبرانی کی ابو العالیہ سے مروی ایک مرسل روایت ہے (یعنی ابو العالیہ والی روایت میں تابعی کسی صحابی کا حوالہ دیے بغیر ہی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کو روایت کرتا ہے، جب کہ ایسی روایت جمہور کے نزدیک حجت نہیں ہوتی اور جمہور نے دوسرا جواب یہ دیا ہے کہ ہنسنے سے وضو کو واجب قرار دینا اصول کے خلاف ہے، کیوں کہ ایک چیز جو نماز سے باہر ناقض وضو نہیں، وہ نماز کے دوران میں ناقض کیسے ہو سکتی ہے؟^①

امام ابن المنذر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس بات پر تو اجماع ہے کہ نماز کے باہر ہونے کی صورت میں ہنسنے ناقض وضو نہیں ہے، البتہ نماز کے دوران ہو تو اس میں اختلاف ہے۔ جو نماز کے دوران میں وضو کے لیے ہنسنے کو ناقض کہے، وہ ایک تو قیاس جلی کی مخالفت کرتا ہے، جیسا کہ سابق میں جمہور کی طرف سے جواب گزرا ہے کہ یہ اصول کے خلاف ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کے لیے انھوں نے وہ روایت دلیل بنائی ہے، جو صحیح نہیں اور یہ بھی ناممکن ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ خیر القرون کے لوگ تھے، وہ دربار الہی میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے کھڑے ہو کر دوران نماز ہنسنے لگیں، جیسا کہ اس مرسل روایت میں ہے۔^②

لہذا جمہور کا مسلک ہی قوی ہے کہ نماز کے دوران ہنسنے سے نماز تو فاسد ہو جاتی ہے، مگر وضو نہیں ٹوٹتا۔

④ میت کو اٹھانا:

جن امور سے وضو نہیں ٹوٹتا، ان میں سے چوتھی چیز میت کو اٹھانا ہے۔ علامہ ابن رشد نے ”بداية المجتهد“ میں لکھا ہے کہ ایک قوم نے یہ شاذ موقف اختیار کیا ہے کہ جو شخص میت کو اٹھائے وہ وضو کرے، ان کے اس موقف کو شاذ کہنے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ اس سلسلے میں جو اثر یا حدیث ہے، وہ ضعیف ہے، پھر انھوں اس اثر کی نص بھی ذکر کی ہے۔^③ چنانچہ سنن اربعہ، سنن بیہقی، صحیح ابن حبان،

① بداية المجتهد (۵۸/۱) طبع مؤسسہ الناصر، نصب الراية (۱/۴۷-۵۴) طبع المجلس العلمي.

② فتح الباري (۱/۲۸۰)

③ بداية المجتهد (۵۸/۱)

مسند احمد اور بزار میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ غَسَلَ مِيْتًا فَلْيَغْتَسِلْ وَمَنْ حَمَلَهُ فَلْيَتَوَضَّأْ»^(۱)

”جو شخص میت کو غسل دے، وہ خود غسل کرے اور جو اسے اٹھائے، وہ وضو کر لے۔“

حافظ ابن حجر رضی اللہ عنہ اسی حدیث کو ”بلوغ المرام“ میں نقل کرنے کے بعد امام احمد رضی اللہ عنہ کا

قول نقل کرتے ہیں:

”لَا يَصِحُّ فِي هَذَا الْبَابِ شَيْءٌ“ ”اس موضوع کی کوئی حدیث صحیح نہیں۔“

جب کہ امیر صنعانی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ امام احمد نے یہ بات اس لیے فرمائی ہے کہ انھوں نے جس سند سے یہ حدیث بیان کی ہے، اس میں ضعف ہے، لیکن امام ترمذی نے اسے حسن اور ابن حبان رضی اللہ عنہ نے صحیح کہا ہے، کیوں کہ اس کے کئی طرق ایسے بھی ہیں، جن میں ضعف نہیں ہے۔ امام ماوردی نے تو یہاں تک کہا ہے کہ بعض محدثین نے اس حدیث کے ایک سو بیس طرق کی تخریج کی ہے۔

امام علی بن مدینی اور علامہ ابن رشد نے کہا ہے کہ اس موضوع کی کوئی حدیث صحیح نہیں ہے۔ امام ذہبی اور ابن المنذر نے بھی کہا ہے کہ اس موضوع کی کوئی حدیث ثابت نہیں ہے۔ امام ابن ابی حاتم، امام بخاری، بیہقی اور رافعی نے اسے موقوف قرار دیا ہے۔ البتہ امام ترمذی کی تحسین، ابن حبان کی تصحیح اور دارقطنی کی توثیق کی طرح علامہ ابن حزم رضی اللہ عنہ نے بھی اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے، انھوں نے تو غسل وضو بھی واجب قرار دیا ہے، جب کہ حافظ ابن حجر، علامہ صنعانی اور امام شوکانی رحمہم اللہ نے طرق کی کثرت کے پیش نظر اسے کم از کم حسن درجے کی قرار دیا ہے۔

اس حدیث کی صحت و ضعف میں اختلاف کی بنا پر اس سے وضو کا وجوب تو ثابت نہیں ہو سکتا اور نہ غسل دینے والے کے لیے غسل کا وجوب ثابت ہوتا ہے، تاہم بعض دیگر احادیث ایسی بھی ہیں، جن کی موجودگی میں جمع و تطبیق ضروری ہو جاتی ہے اور وہ اس حدیث میں جو امر ہے، اسے وجوب کے بجائے استحباب پر محمول کرنے کی گنجائش پیدا کرتی ہیں۔ علامہ صنعانی نے وضاحت کی ہے کہ میت کو اٹھانے سے مراد تکفین سے پہلے اس کے جسم کے اعضا سے کپڑا اٹھانا ہے اور اس صورت میں بھی

(۱) المنتقى مع النيل (۱/۱) ۲۳۷، بلوغ المرام مع السبيل (۱/۱) ۶۹، المحلى (۱/۱) ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷/۱، ۲۳/۱ و

الإرواء (۱/۱) ۱۷۳، ۱۷۵

اٹھانے پر وضو واجب نہیں اور بقول صنعانی اس حدیث پر عمل کرتے ہوئے محض ہاتھوں کو دھولینا صرف مستحب ہے، واجب یہ بھی نہیں، کیوں کہ میت پاک ہوتی ہے، جیسا کہ سنن بیہقی میں حدیث ہے:

«إِنَّ مَيِّتَكُمْ يَمُوتُ طَاهِرًا فَحَسْبُكُمْ أَنْ تَغْسِلُوا أَيْدِيَكُمْ»^①

”تمہاری میت پاک ہوتی ہے، لہذا تمہارے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ ہاتھ دھولو۔“

اس حدیث کی سند کو حافظ عسقلانی رحمہ اللہ نے حسن کہا ہے۔ الغرض میت کو ہاتھ لگا کر اٹھانے سے وضو واجب نہیں ہوتا اور اگر وضو کیا ہوا ہو تو وہ نہیں ٹوٹتا۔ اس موضوع کی متعلقہ احادیث اور فقہی تفصیلات کے لیے ”بداية المجتهد“، ”نیل الأوطار“، ”تمام المنة“ (ص: ۱۱۲، ۱۱۳) ”سبل السلام“، ”التلخیص الحبیبر“، ”المحلی“، اور دیگر کتب حدیث و فقہ دیکھی جاسکتی ہیں۔

⑤، ⑥ سر یا مونچھوں کے بال کاٹنا اور ناخن تراشنا :

اگر کسی نے وضو کیا ہوا ہو اور اسی حالت میں وہ ناخن تراشنے لگے یا مونچھوں اور سر کے بال کاٹ لے تو اس سے بھی وضو نہیں ٹوٹتا، چنانچہ صحیح بخاری کے ایک ترجمہ الباب میں تعلقاً اور سنن سعید بن منصور میں صحیح سند کے ساتھ موصولاً حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے مروی ہے:

«إِنْ أَخَذَ مِنْ شَعْرِهِ أَوْ أَظْفَارِهِ [أَوْ خَلَعَ خُفَّيْهِ] فَلَا وَضُوءَ عَلَيْهِ»^②

”اگر کوئی بال کاٹے یا ناخن تراشے تو اس پر وضو نہیں ہے۔“

امام مجاہد، حکم بن عتیہ اور حماد رحمہم اللہ سے منقول ہے کہ وہ ان دونوں کاموں پر وضو کا کہا کرتے تھے، جب کہ امام ابن المنذر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اجماع اس کے خلاف ہے، یعنی وضو ضروری نہ ہونے پر علمائے امت کا اجماع ہے۔^③

⑦ قے کرنا:

وہ امور جن سے وضو نہیں ٹوٹتا، ان میں سے ساتویں چیز خود بہ خود آنے والی قے بھی ہے۔ ایسی قے بھی ناقض وضو نہیں، کیوں کہ اس کے ناقض ہونے پر دلالت کرنے والی کوئی صریح حدیث

① التلخیص الحبیبر (۱/۱۳۷-۱۳۸) نیل الأوطار (۱/۱/۲۳۸)

② صحیح البخاری مع الفتح (۱/۲۸۰، ۲۸۱)

③ فتح الباری (۱/۲۸۱)

نہیں ہے۔ امام شافعی، امام مالک، شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر محققین کا یہی مسلک ہے کہ قے ناقض وضو نہیں ہے، جب کہ حنابلہ کے نزدیک مطلقاً اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بعض شرائط کے ساتھ یہ قے بھی ناقض وضو ہے۔ قے کے ناقض وضو ہونے پر جن احادیث سے استدلال کیا جاتا ہے، ان میں سے پہلی تو سنن ابن ماجہ، دارقطنی اور مسند احمد میں مروی ہے، جس میں اُم المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتی ہیں:

«مَنْ أَصَابَهُ قَيْءٌ أَوْ رُعَافٌ أَوْ قَلَسٌ أَوْ صَدَىٌّ فَلْيَنْصَرِفْ فَلْيَتَوَضَّأْ ثُمَّ لِيَبْنِ عَلَى صَلَاتِهِ، وَهُوَ فِي ذَلِكَ لَا يَتَكَلَّمُ»^①

”جسے قے آئے یا نکسیر پھوٹے یا ڈکار کے ساتھ کھانا منہ میں آجائے (یعنی استفراغ ہو) یا ندی نکل آئے تو اسے چاہیے کہ پھر جائے اور جا کر وضو کرے اور جہاں سے نماز چھوڑی تھی، وہیں سے آکر شروع کر لے اور اس دوران میں کسی سے کوئی بات نہ کرے۔“

اگر یہ حدیث صحیح اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوعاً ثابت ہوتی تو اس سلسلے میں یہ نص تھی، لیکن ایسا نہیں ہے، بلکہ اسے امام احمد، ابن معین، حاتم اور دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔ امام احمد اور بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ یہ روایت مرسل ہے اور جمہور اہل علم محدثین کے نزدیک مرسل روایت حجت نہیں ہوتی۔

لہذا جب یہ حدیث صحیح ثابت ہی نہیں ہے تو وضو کا حکم اپنی اصل حالت پر قائم رہے گا اور وہ ہے عدم نقض، اس حکم کو عدم نقض سے نقض کی طرف لے جانے کے لیے کسی قوی دلیل کی ضرورت ہے، جو یہاں نہیں ہے۔^②

یاد رہے کہ اس روایت میں مذکور دیگر اشیا میں سے ندی کے ناقض وضو ہونے کے دلائل تو صحیحین کی احادیث میں مذکور ہیں، جو ذکر کیے جا چکے ہیں اور استفراغ یعنی ڈکار کے ساتھ پیٹ سے کھانا منہ میں آجانے کا حکم قے والا ہی ہے کہ یہ ناقض وضو نہیں ہے۔ نکسیر کے بارے میں تفصیل بعد

① سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۱۳۲۱) المنتقى مع النيل (۱/ ۱) / ۲۲۲ (مصری) بلوغ المرام مع السبل (۱/

۱/ ۶۷) ضعیف الجامع (۵۴۳۴)

② تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: سبل السلام (۱/ ۱) / ۲۷) نیل الأوطار (۱/ ۱) / ۲۲۲، ۲۲۳) إرواء الغلیل (۱/

۱۴۸) التلخیص الحبیر (۱/ ۱) / ۲۷۵)

میں ذکر کی جائے گی کہ یہ ناقضِ وضو ہے یا غیر ناقض۔

زیر بحث موضوع یعنی قے کے ناقضِ وضو ہونے کے بارے میں ایک اور حدیث ہے، جو صحیح بھی ہے اور مرفوع بھی، مگر وہ صریح نہیں، چنانچہ ترمذی اور مسند احمد میں حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَاءَ فَأَفْطَرَ فَنَوَضَّ»^(۱)

”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قے کی، روزہ افطار کیا اور پھر وضو کیا۔“

لیکن اس حدیث کے الفاظ محفوظ نہیں، جیسا کہ ”تحفة الأحوذی“ میں تفصیل مذکور ہے، جبکہ یہی حدیث سنن ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ، منشی ابن جارود، صحیح ابن حبان و ابن مندہ، سنن دارقطنی، سنن بیہقی، معجم طبرانی اور مستدرک میں ایک دوسرے طریق سے بھی مروی ہے، جس کے محفوظ الفاظ یہ ہیں:

«إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَاءَ فَأَفْطَرَ»^(۲)

”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قے کی اور پھر روزہ افطار کیا۔“

مسند احمد کے الفاظ ہیں:

«إِسْتَقَاءَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَأَفْطَرَ»^(۳) ”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قے کی اور روزہ افطار کر لیا۔“

اس حدیث سے بھی قے کے ناقضِ وضو ہونے پر استدلال کیا جاتا ہے، لیکن اس حدیث میں

یہ دلالت کہاں ہے؟

أَوَّلًا:

زیادہ سے زیادہ یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل ہے، جو کسی چیز کے وجوب پر دلالت نہیں کرتا۔ وجوب کے لیے کوئی خاص دلیل چاہیے، جو کوئی بھی صحیح نہیں اور اس فعل سے زیادہ سے زیادہ یہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اسوۂ حسنہ کو دیکھتے ہوئے قے کرنے کے بعد وضو کرنا مشروع و مستحب ہے، لیکن یہ واقعہ وجوب کی دلیل نہیں بن سکتا۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا اختیار بھی استحباب ہی ہے۔^(۴)

(۱) سنن الترمذی مع التحفة (۲۸۷/۱) المنتقى مع النيل (۲۲۱/۱/۱) صححه الألباني في الإرواء (۱/۱۴۷)

(۲) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (۲۰۸۵) صحيح سنن الترمذی، رقم الحديث (۵۷۷) سنن الدارمی، رقم الحديث (۱۷۲۸) موارد الظمان، رقم الحديث (۹۰۸)

(۳) إرواء الغلیل (۴۷/۱) و نيل الأوطار (۲۲۲/۱/۱) و تحفة الأحوذی (۲۸۸، ۲۸۹)

(۴) مجموعة الرسائل الكبرى بحواله تمام المنة (ص: ۱۱۲)

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کے بقول یہ بھی تب ہے، جب کوئی شخص جان بوجھ کر قے کر لے۔ خود بہ خود قے آنے سے تو روزہ بھی نہیں ٹوٹتا، وضو کیسے ٹوٹ جائے گا؟ وہ لکھتے ہیں کہ اس حدیث کی سند اس قدر مضطرب ہے کہ یہ حجت ہی نہیں بن سکتی اور صحیح ثابت بھی ہو تو اسے صرف عمداً قے کرنے پر محمول کیا جائے گا۔^①

ثانیاً:

قے کے ناقض وضو ہونے کے قائلین جو یہ کہتے ہیں:

① وہ معدے سے ہو۔ ② منہ بھر کر ہو۔ ③ ایک ہی مرتبہ اتنی ہو۔

تو یہ ناقض وضو ہے، جب کہ ان حدود و قیود یا شرائط کا سرے سے کسی بھی حدیث میں ذکر نہیں ہے۔ ہاں امیر صنعانی نے ”سبل السلام“ میں حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے مروی کسی روایت کی طرف اشارہ کیا ہے، جس میں منہ بھر کر قے کے الفاظ ہیں اور ساتھ ہی لکھ دیا ہے کہ وہ روایت ضعیف ہے۔^②

ثالثاً:

ان احادیث میں سے کسی ایک میں بھی مذکور نہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہو کہ جو شخص قے کرے، وہ وضو کرے اور نہ کسی حدیث میں یہ وضاحت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو صرف قے کرنے کی وجہ ہی سے کیا ہو کہ اس سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم با وضو ہوں اور قے آنے سے وضو ٹوٹنے کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا ہو۔ علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے ”المحلی“ میں قے کو ناقض وضو قرار دینے کی بڑی سختی سے تردید کی ہے۔^③

اس ساری تفصیل سے معلوم ہوا کہ قے آنے سے وضو تو نہیں ٹوٹتا، ہاں یہ الگ بات ہے کہ کوئی وضو کر لے تو بہر حال یہ بہتر ہے، کیوں کہ اس میں فضیلت بھی ہے اور احتیاط بھی۔

⑧ نکسیر:

وہ اشیا جن کے ناقض وضو ہونے کی کوئی صحیح دلیل نہیں، ان میں سے آٹھویں چیز نکسیر ہے،

① نیل الأوطار (۱/۱) (۲۲۲) و الإرواء (۱/۱) (۱۴۸)

② سبل السلام (۱/۱) (۶۷) نیل الأوطار (۱/۱) (۱۲۲)

③ المحلی لابن حزم (۱/۱) (۲۵۵-۲۵۸)

اس سے بھی وضو نہیں ٹوٹتا، کیوں کہ کسی صحیح و صریح اور مرفوع حدیث میں نکسیر سے وضو ٹوٹنے کا ذکر نہیں ملتا اور جن میں اس سے وضو ٹوٹنے کا ذکر ہے، وہ صحیح نہیں یا پھر مرفوع نہیں، بلکہ مرسل ہیں اور جمہور اہل علم کے نزدیک مرسل روایت کسی مسئلے میں حجت نہیں ہوتی۔

نکسیر کے ناقض وضو ہونے پر دلالت کرنے والی ایک روایت تو وہی ہے، جو سنن ابن ماجہ، دارقطنی اور مسند احمد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«مَنْ أَصَابَهُ قَيْءٌ أَوْ رُعَافٌ... الخ»

یہ مکمل روایت ترجمہ سمیت ہم نے کے ضمن میں ذکر کر چکے ہیں اور یہ بھی وضاحت کی جا چکی ہے کہ متعدد ائمہ و محدثین نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ بعض نے اس کا مرسل ہونا اقرب الی الصواب لکھا ہے، جب کہ جمہور کے نزدیک مرسل روایت حجت نہیں ہوتی، لہذا جب یہ حدیث مرفوعاً ثابت ہی نہیں تو نکسیر کا حکم بھی اپنی اصل حالت پر رہے گا اور وہ ہے عدم نقض اور اس حکم سے اسے نقض کی طرف لے جانے کے لیے کسی قوی دلیل کی ضرورت ہے، جو یہاں نہیں ہے۔

اسی طرح سنن دارقطنی، الکامل لابن عدی اور معجم طبرانی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

«إِذَا رَعَفَ أَحَدُكُمْ فِي صَلَاتِهِ فَلْيَنْصِرْ فَلْيَغْسِلْ عَنهُ الدَّمَ، ثُمَّ لِيُعِدْ وَضُوءَهُ وَ لِيَسْتَقْبِلْ صَلَاتَهُ»^①

”تم میں سے جب کسی کی نماز کے دوران میں نکسیر پھوٹ پڑے تو اسے جا کر خون دھونا اور وضو دہرانا چاہیے، پھر نماز کی طرف آنا چاہیے۔“

یہ روایت ضعیف ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی سند میں سلیمان بن ارقم نامی راوی متروک ہے۔ ایسے ہی سنن دارقطنی میں حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت میں بھی تے اور نکسیر سے وضو کرنے کا ذکر آیا ہے، مگر اس کی سند کے ایک راوی ابوبکر کو متروک، کذاب اور وضاع قرار دیا گیا ہے، اس سند کے دوسرے راوی حجاج بن ارطاة پر کلام معروف ہے۔ لہذا ضعیف ہونے کی وجہ سے وہ بھی قابل استدلال نہ ہوئی۔ البتہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے موقوفاً مصنف عبدالرزاق میں ایک قول مروی ہے، جس کی سند کو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے حسن قرار دیا ہے۔ ایسے ہی حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے بھی

① بحوالہ نیل الأوطار (۱/۱/۲۲۳) نصب الراية (۱/۴۲) و الضعيفة (۲۵۳۱) ضعيف الجامع، رقم الحديث (۶۲۰)

مروی ہے۔ ان دونوں کے ان اقوال یا آثار میں تے اور نکسیر کو ناقض وضو کہا گیا ہے۔ موطا امام مالک میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں مروی ہے کہ وہ نکسیر سے وضو کیا کرتے تھے۔ امام شافعی رضی اللہ عنہ نے اس سلسلے میں ان کا ایک قول بھی نقل کیا ہے۔^[1]

اسی طرح علامہ ابن حزم رضی اللہ عنہ نے ”المحلی“ میں حضرت علی اور ابن عمر رضی اللہ عنہما کے علاوہ متعدد تابعین رضی اللہ عنہم کے اسماء گرامی بھی ذکر کیے ہیں اور لکھا ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ لوگ نکسیر اور ہر پہنے والے خون سے نقض وضو کے قائل تھے تو ہم کہیں گے کہ ٹھیک ہے یہ قائل ہیں تو ہوتے رہیں، حجت صرف ارشاد نبوی ہے نہ کہ اقوال صحابہ و تابعین، پھر اسی پر بس نہیں، بلکہ خود انہی صحابہ و تابعین سے ایسے آثار بھی ملتے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نکسیر پھوٹنے اور خون نکلنے سے وضو ٹوٹنے کے قائل نہیں تھے، پھر آگے انہوں نے وہ آثار بھی ذکر کیے ہیں اور نکسیر کو خون استحاضہ پر قیاس کرنے کی تردید کی ہے۔^[2]

جب صحابہ و تابعین سے دونوں طرح کے اقوال ملتے ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ناقض ہونا صحیح سند سے ثابت نہیں تو اس کا حکم اپنی اصل حالت پر ہی قائم رہا کہ یہ ناقض نہیں ہے۔

مرسل روایت کی حیثیت:

تے اور نکسیر کے غیر ناقض وضو ہونے کے ضمن میں ایک بات بار بار گزری ہے کہ سنن ابن ماجہ اور دارقطنی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث مرفوعاً ضعیف ہے۔ البتہ بعض محدثین کرام نے اسے مرسل صحیح قرار دیا ہے۔ اس کے باوجود وہ نقض کی دلیل نہیں بن سکتی، کیوں کہ جمہور محدثین کرام کے نزدیک مرسل روایت حجت نہیں ہوتی۔

مرسل روایت کیا ہوتی ہے؟ یہ بات تو آپ کے سامنے رکھی جا چکی ہے کہ ”شرح نخبۃ الفکر للعسقلانی“ کے مطابق جس روایت کو کوئی چھوٹا یا بڑا تابعی، جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا یا ان سے سنا نہیں ہوتا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کر دے، وہ مرسل کہلاتی ہے۔^[3]

ایسی روایت کی حیثیت کیا ہوتی ہے؟ اور محدثین نے اسے ناقابل حجت کیوں قرار دیا ہے؟ یہ

[1] نصب الراية (۱/ ۳۹) نیل الأوطار (۱/ ۲۲۳)

[2] المحلی (۱/ ۱/ ۲۵۹-۲۶۰)

[3] دیکھیں: شفاء الغلل فی شرح کتاب العلل للمبارکفوری مع التحفة (۱۰/ ۵۱۰)

بات اگرچہ عوام الناس کے لیے کوئی اتنی زیادہ مناسب حال نہیں، لیکن اگر تھوڑی سی توجہ دی جائے تو بہ آسانی سمجھ میں آسکتی ہے۔ اس سے کئی مسائل حل ہو جاتے ہیں، چنانچہ صحیح مسلم میں امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک اور دیگر محدثین کے یہاں مرسل روایات قابلِ حجت نہیں۔^(۱)

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ ”کتاب العلل“ میں فرماتے ہیں کہ مرسل روایت اکثر محدثین کے نزدیک صحیح نہیں اور کئی محدثین نے اسے ضعیف کہا ہے۔^(۲)

یہ ضعیف و ناقابلِ حجت کیوں ہے؟ اس کی تفصیل تو موطا امام مالک کی شرح ”التمہید لابن عبد البر“، ”شرح نخبة الفكر للعسقلاني“، ”شفاء الغلل في شرح كتاب العلل“ علامہ مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر کتب میں دیکھی جاسکتی ہے، جس کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ مرسل روایت کی سند سے جو راوی محذوف ہے، اس کا صحیح علم نہیں ہو سکتا کہ وہ صحابی ہے یا کوئی تابعی، کیوں کہ کبھی کوئی تابعی دوسرے تابعی سے سنتا ہے۔ لیکن اگر محذوف راوی صحابی ہو، تو پھر کسی چیز کا خدشہ اور ضرورت نہیں رہ جاتی، کیوں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم سبھی عدول ہیں۔ ہاں اگر تابعی کسی دوسرے تابعی کے حوالے سے بیان کرے تو اس بات کا واضح احتمال ہوتا ہے کہ وہ دوسرا تابعی، جو محذوف ہے، وہ ثقہ ہونے کے بجائے ضعیف ہو، کیوں کہ کثیر تابعین سے ثابت ہے کہ انھوں نے ثقہ اور ضعیف دونوں قسم کے راویوں سے روایات لی ہیں اور اہل علم کا اس بات پر اجماع ہے کہ کسی خبر کو قبول کرنے کے لیے خبر دینے والے راوی کی عدالت و ثقاہت کا علم ہونا ضروری ہے، چونکہ مرسل روایت کی صورت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور تابعی کے درمیان والے واسطے کی عدالت و ثقاہت کا علم ہونا ناممکن ہے، لہذا مرسل روایت ناقابلِ حجت قرار دی گئی ہے۔^(۳) نئے اور نکسیر کے بارے میں مرسل روایات اسی وجہ سے ناقابلِ حجت ہیں۔

9 خون:

یہیں یہ بات بھی واضح کر دیں کہ نکسیر پھوٹنے سے خون ناک سے نکلے یا جسم کے کسی بھی حصے

(۱) صحیح مسلم مع شرح النووي (۱/۱۳۲)

(۲) العلل في آخر سنن الترمذي مع التحفة (۱/۵۰۹)

(۳) التمهيد (۱/۶ طبع مراکش) شرح نخبة الفكر بحواله شفاء الغلل (۱۰/۵۱۰)

سے نکلے، تھوڑا ہو یا زیادہ، ٹھہرا ہو یا بہہ نکلے، حلق سے نکلے یا مسوڑھوں سے، تھوک پر اس کا رنگ غالب ہو یا نہ ہو، سینگی یا فصد لگوانے سے نکلے یا زخم آنے سے یا کسی زخم کے دکھ جانے سے، انجکشن کے ذریعے سے سرنج بھر کر خون نکالا جائے یا سرنج سے ٹیکا لگانے کے بعد اس جگہ سے کوئی ایک دو قطرے خون نکل آئے؛ ان تمام شکلوں میں خون کے بارے میں حکم معلوم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس بات کا پتا چلایا جائے کہ بھلا خون ناقض وضو ہے یا نہیں؟

اس سلسلے میں بنیادی بات یہ ہے کہ جن احادیث میں خون کے ناقض وضو ہونے کا ذکر ہے، وہ ضعیف ہیں، لہذا ناقابل حجت ہیں۔ ایسی صورت میں حکم براءتِ اصلیہ ہی پر رہے گا کہ وضو نہیں ٹوٹتا۔ اس پر مستزاد یہ کہ متعدد واقعات سے پتا چلتا ہے کہ صحابہ و تابعین خون نکلنے سے وضو نہیں کیا کرتے تھے، جو عدم نقض کے قائلین کی تائید ہے۔ چنانچہ نکسیر کے سلسلے میں جو احادیث و آثار گزر رہے ہیں، ان کا ضعف اور حجیت کی عدم صلاحیت ذکر کی جا چکی ہے، لہذا انھیں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ بعض دیگر روایات میں سے ایک سنن دارقطنی میں حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«الْوُضُوءُ مِنْ كُلِّ دَمٍ سَائِلٍ»^① ”ہر بہنے والے خون سے وضو ہے۔“

اس روایت کو ”نصب الراية“ میں نقل کر کے علامہ زیلیعی حنفی نے امام دارقطنی کا قول ذکر کیا ہے کہ اس کی سند کے ایک راوی عمر بن عبدالعزیز ہیں، جن کا حضرت تمیم رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں اور دوسرے راوی یزید بن خالد اور تیسرے یزید بن محمد دونوں ہی مجہول ہیں، تیسری علت ایک مدلس راوی بقیہ کا عنعنہ ہے۔^②

انہی الفاظ کی ایک اور روایت مروی ہے، جس کے بارے میں خود امام ابن عدی نے کہا ہے کہ اس روایت کو ہم صرف احمد بن فرج کے حوالے سے جانتے ہیں، جب کہ وہ ایسا راوی ہے، جس کی روایت قابل حجت نہیں ہے، اگرچہ بعض محدثین نے اس کی توثیق بھی کی ہے۔^③

نکسیر کے ضمن میں ایک روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی بیان کی جا چکی ہے جو

① دیکھیں: نصب الراية (۱/۳۷) سلسلۃ الأحادیث الضعیفة (۴۷۰) ضعیف الجامع، رقم الحدیث (۶۱۷۶)

② تحقیق مشکاة المصابیح (۱/۱۰۸)

③ نصب الراية (۱/۳۷، ۳۸ مع حاشیہ)

سنن دارقطنی کے حوالے سے تھی اور ضعیف ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

«كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذْ أَرَعَفَ فِي صَلَاتِهِ تَوَضَّأَ، ثُمَّ بَنَى عَلَيَّ صَلَاتِهِ»^①

”نبی اکرم ﷺ کو نماز میں جب نکسیر پھوٹ پڑتی تو آپ ﷺ وضو کرتے اور جہاں سے نماز چھوٹی ہوتی، وہیں سے شروع فرماتے۔“

”نصب الراية“ میں علامہ زلیعی رحمہ اللہ نقل کرتے ہیں کہ اس روایت کی سند کے ایک راوی عمر بن رباح کے بارے میں ابن عدی نے ”الکامل“ میں لکھا ہے کہ وہ اپنے سے اوپر کے راوی عبداللہ بن طاؤس سے باطل روایات بیان کرتا ہے، جن پر اس کی کسی نے متابعت نہیں کی، نیز امام بخاری نے اسے ”دجال“ کہا ہے، جب کہ ”التحقیق لابن الجوزی“ میں ہے کہ امام دارقطنی نے اسے متروک کہا ہے۔ امام ابن حبان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ ثقہ راویوں کے نام سے من گھڑت روایات بیان کیا کرتا تھا۔ اس کی بیان کردہ روایت لکھنے کے قابل بھی نہیں ہوتی، سوائے اس کے کہ اسے اظہارِ تعجب و عبرت کے لیے لکھ لیا جائے۔^②

اس طرح خون کے ناقض وضو ہونے سے تعلق رکھنے والی ان احادیث اور آثار کی استنادی حیثیت معلوم ہوگئی کہ وہ کیوں ناقضِ حجت ہیں؟ ان احادیث و آثار کے ضعف کی وجہ ہی ہوگی کہ علامہ زلیعی رحمہ اللہ نے ”الخلاصة“ سے امام نووی رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

«لَيْسَ فِي نَقْضِ الْوُضُوءِ وَعَدَمِ نَقْضِهِ بِالِدَّمِ وَالْقَيْءِ وَالضَّحْكِ فِي الصَّلَاةِ حَدِيثٌ صَحِيحٌ»^③

”خون، قے اور دورانِ نماز ہنسنے سے وضو کے ٹوٹ جانے یا نہ ٹوٹنے کے بارے میں کوئی ایک بھی حدیث صحیح نہیں۔“

جب صراحت کے ساتھ کوئی ایک بھی صحیح حدیث ان اشیا کے ناقض ہونے پر دلالت کرنے والی نہیں تو پھر وضو کا حکم براءتِ اصلیہ پر رہے گا کہ وہ نہیں ٹوٹے گا۔

① دیکھیں: نصب الراية (۱/ ۴۱)

② دیکھیں: نصب الراية (۱/ ۴۲)

③ نصب الراية (۱/ ۴۲)

اس موضوع کی بعض دیگر روایات بھی ہیں، لیکن وہ بھی ضعیف ہیں، ان سب کا تذکرہ باعثِ طوالت ہوگا، لہذا انہیں ”نصب الرایۃ“ (۱/ ۳۷ تا ۴۲) ”التلخیص الحبیر“ (۱/ ۱۱۳، ۱۱۷، ۲۷۵) اور دیگر کتب میں دیکھا جاسکتا ہے۔ البتہ ایک حدیث صحیح بھی ہے، جس کے مفہوم پر قیاس کرتے ہوئے خون کو ناقض وضو قرار دیا گیا ہے، یعنی اس میں یہ تو مذکور نہیں کہ عام خون ناقض وضو ہے، بلکہ اس میں بات تو کوئی اور ہے، لیکن قائلینِ نقض نے اس کے مفہوم پر قیاس کرتے ہوئے عام اعضاے جسم سے نکلنے والے خون کو بھی ناقض کہا ہے۔ وہ حدیث پہلے بھی گزر چکی ہے، جو صحیح بخاری و مسلم، سنن اربعہ اور دیگر کتب میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتی ہیں کہ حضرت فاطمہ بنت ابی حیش رضی اللہ عنہا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض گزار ہوئیں کہ میں مرض استحاضہ میں مبتلا ہوں اور خون جاری رہنے کی وجہ سے پاک نہیں رہتی تو کیا میں نماز چھوڑ دوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا، اِنَّمَا ذَلِكْ عِرْقٌ، وَكَيْسَتْ بِالْحَيْضَةِ»

”نہیں، یہ ایک رگ ہوتی ہے، یہ خونِ حیض نہیں ہوتا۔“

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بتایا کہ جب ایامِ حیض ہوں تو نماز چھوڑ دیں اور جب ان کے برابر ایام گزر جائیں، تب غسل کر لیں۔ ہشام کہتے ہیں کہ میرے والد (عروۃ) نے کہا:

”پھر آئندہ ایامِ حیض آنے تک ہر نماز کے ساتھ وضو کر لیا کریں۔“^①

اس حدیث کے الفاظ: «اِنَّمَا ذَلِكْ عِرْقٌ» ”یہ خونِ حیض نہیں، بلکہ ایک رگ ہے۔“ ان پر عام خون کو قیاس کیا گیا ہے، چونکہ ایسی عورت کو ہر نماز کے ساتھ از سر نو وضو کرنے کا حکم ہے تو ان کے نزدیک اس کا خون ہی ناقض وضو ہے اور اسی خون پر قیاس کرتے ہوئے جسم کے ہر حصے سے نکلنے والے خون کو ناقض ہی ہونا چاہیے۔ یہ ہے وجہ استدلال لیکن یہ محض قیاس ہے، جسے علامہ ابن عبدالبر نے ”التمہید شرح موطأ الإمام مالک“ میں ضعیف کہا ہے اور علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے تو

① صحیح البخاری مع الفتح، رقم الحدیث (۲۲۸) صحیح مسلم مع شرح النووي (۲/ ۴، ۱۶، ۱۷) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (۲۵۸) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۱۰۸) صحیح سنن النسائی للآلبانی (۱/ ۶) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۶۲۴) سنن الدارمی، رقم الحدیث (۷۷۹)

”المحلی“ میں اسے باطل قرار دیا ہے۔ علامہ ابن حزم رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

”یہ قیاس باطل ہے، کیوں کہ خون استحاضہ کو تو خون حیض پر بھی قیاس کرنا جائز نہیں، حالاں کہ ان دونوں کا مخرج بھی ایک ہی ہے، کیوں کہ خود اللہ تعالیٰ نے ان دونوں طرح کے خون کا الگ الگ حکم بیان فرمایا ہے۔“

یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ علامہ موصوف نے دونوں طرح کے خون کے الگ الگ حکم کا جو اشارہ فرمایا ہے، اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ حائضہ عورت کے لیے نماز پڑھنا جائز ہے اور نہ روزہ رکھنا اور ان ایام میں وہ اپنے شوہر کے لیے بھی مباشرت کے لیے حلال نہیں ہوتی، جب کہ مستحاضہ عورت نماز بھی پڑھے گی اور روزہ بھی رکھے گی اور استحاضہ کی حالت والی عورت سے اس کے شوہر کا مباشرت کرنا بھی حلال ہے۔ ان دونوں طرح کی عورتوں کے خون کا مخرج اگرچہ ایک ہی ہے، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کا حکم الگ الگ رکھا ہے۔ آگے علامہ موصوف لکھتے ہیں:

”جب ان دونوں میں یہ فرق کیا گیا ہے تو یہ ایک باطل بات ہوگی کہ جسم کے تمام اعضا سے نکلنے والے خون کو فرج سے نکلنے والے خون پر قیاس کیا جائے، جب کہ یہ بات تو اور بھی زیادہ باطل ہے کہ زخم سے نکلنے والے خون سے خالی پیپ کو خون پر قیاس کیا جائے، اس بات پر اجماع کا دعویٰ بھی یہ قائلین نہیں کر سکتے، کیوں کہ صحیح سند سے ثابت ہے کہ حضرت حسن بصری اور ابو جلیز رحمہما اللہ خون اور پیپ کے مابین فرق کیا کرتے تھے“^①

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ کسی صحیح و صریح حدیث سے ثابت نہیں کہ خون نکلنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، نہ تھوڑا خون نکلنے سے اور نہ زیادہ سے اور نہ عام خون کو خون استحاضہ پر قیاس کرنا صحیح ہے، جب کہ اس کے برعکس بعض احادیث و آثار ایسے بھی ملتے ہیں، جن میں مذکور ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خون نکلنے کو ناقض وضو نہیں سمجھتے تھے۔

❑ پہلا واقعہ ”صحیح البخاری، کتاب الوضوء، باب من لم یر الوضوء إلا من المخرجین من القبل والدبر“ میں تعلیقاً اور مغازی ابن اسحاق میں موصولاً اور ابن اسحاق کے طریق ہی سے سنن ابی داؤد، مسند احمد، سنن دارقطنی، صحیح ابن حبان، ابن خزیمہ اور

① المحلی (۱/۱، ۲۵۸، ۲۵۹) التمهید (۱/۱۹۰)

مستدرک حاکم میں بھی موصولاً مروی ہے، جس میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ غزوہ ذات الرقاع کے موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور لشکرِ اسلامی نے ایک جگہ پڑاؤ ڈالا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ يَحْرُسُنَا اللَّيْلَةَ؟»^(۱) ”آج رات (جاگ کر) کون ہماری چوکیداری کرے گا؟“

انصار اور مہاجرین میں سے ایک ایک صحابی اٹھا اور عرض کی کہ ہم چوکیداری کریں گے۔ پڑاؤ کی جگہ ایک پہاڑی گھاٹی تھی، لہذا ان دونوں صحابیوں نے رات کو آدھا آدھا وقت بانٹ لیا کہ آدھی رات ایک جاگے گا اور گھاٹی کے منہ پر پہرہ دے گا اور آدھی رات دوسرا۔ چنانچہ پہلے مہاجر صحابی سو گیا اور انصاری صحابی نماز پڑھنے لگے۔ اتنے میں دشمن کے کسی فوجی نے انصاری صحابی کو نماز پڑھتے دیکھ لیا۔ اس نے تیر پھینکا، جو اس انصاری صحابی کو آ کر لگا۔ اس نے وہ تیر نکالا اور نماز کو جاری رکھا۔ پھر اس دشمن نے دوسرا تیر مارا۔ صحابی نے وہ بھی نکالا اور نماز میں مشغول رہے، پھر اس ظالم نے تیسرا تیر مارا۔ اس صحابی نے وہ بھی نکالا، رکوع کیا، سجدہ کیا اور اپنی نماز مکمل کی، پھر اس صحابی نے اپنے دوسرے ساتھی کو جگایا۔ اس ساتھی نے جب اسے خون میں غلطاں و پچاں دیکھا تو کہا:

«لِمَ لَا أَنْبَهْتَنِي أَوَّلَ مَا رَمَى؟»

”تم نے مجھے اس وقت کیوں نہ جگایا، جب اس نے پہلا ہی تیر مارا تھا؟“

اس صحابی نے جواب دیا:

«كُنْتُ فِي سُورَةٍ فَأَحْبَبْتُ أَنْ لَا أَقْطَعَهَا»^(۲)

”میں ایک سورت کی تلاوت کر رہا تھا، جسے میں منقطع نہیں کرنا چاہتا تھا۔“

”دلائل النبوة“ امام بیہقی میں ایک دوسرے طریق سے یہی واقعہ مروی ہے، جس میں یہ تفصیل بھی مذکور ہے کہ ان دونوں صحابیوں میں سے انصاری صحابی کا نام حضرت عباد بن بشر رضی اللہ عنہ اور مہاجر صحابی کا نام حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ تھا اور جس سورت کی وہ دوران نماز تلاوت کر رہے تھے، وہ سورۃ الکہف تھی۔^(۳)

(۱) صحیح سنن أبي داود، رقم الحديث (۲۱۸۳) عن سهل بن الحنظلية.

(۲) صحیح البخاری مع الفتح (۱/۲۸۰، ۲۸۱) التلخیص الحبير (۱/۱۱۵)

(۳) فتح الباری (۱/۲۸۱)

اس واقعہ کو صحیح بخاری شریف کے ترجمہ الباب میں ذکر کرنے اور اس کے بعد دیگر آثار نقل کرنے کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بھی خون کا نکلنا ناقض وضو نہیں، خون کو ناقض وضو نہ ماننے والوں کا اس واقعہ سے استدلال اس طرح ہے کہ اس صحابی کے جسم اطہر سے تین تیروں کے نتیجے میں ظاہر ہے، خون بہنے لگا۔ بایں ہمہ وہ اپنی نماز میں پوری طرح مشغول رہے اور یقیناً اس واقعہ کی خبر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی ہی ہوگی، کیوں کہ یہ تو ناممکن ہے کہ اتنا بڑا واقعہ رونما ہو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر نہ پہنچے۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو خون کے ناقض وضو ہونے کی شکل میں ضروری تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی وضاحت کرتے اور اسے اس کی نماز کے فاسد ہونے کا بتاتے اور اگر ایسا ہوتا تو یقیناً صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظ کو ضرور ہی نقل فرماتے، جو امت اسلامیہ تک پہنچ جاتے، لیکن ان سب امور میں سے کسی کا بھی واقع نہ ہونا، اس بات کی دلیل ہے کہ خون نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا، خون تھوڑا ہو یا زیادہ۔ اس واقعہ کے سامنے مسوڑوں کے خون کی حقیقت ہی کیا ہے؟ جب کہ پھنسی کے خون سے وضو نہ ٹوٹے پر دلالت کرنے والے آثار بھی موجود ہیں۔

۲ خون تھوڑا ہو یا زیادہ، ناقض وضو نہیں ہے، اس مسلک پر استدلال کرنے کے لیے دوسرا واقعہ موطا امام مالک، سنن دارقطنی اور بعض دیگر کتب حدیث میں مذکور رہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو زخمی کیا گیا تو وہ اس زخمی حالت میں نماز میں مشغول رہے، جب کہ زخمی ہونے کی وجہ سے ان کے جسم مبارک سے خون جاری تھا۔ اس واقعہ کی سند بھی فتح الباری میں حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے بقول صحیح ہے۔^①

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خون سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ اگر ایسا ہوتا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس حالت میں نماز نہ پڑھتے رہتے اور یہ بات تو بعید از قیاس ہے کہ نماز پنج گانہ سے متعلق ایسا عام فہم مسئلہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے اوجھل رہ گیا ہو۔

۳ خون کے ناقض وضو نہ ہونے پر دلالت کرنے والا تیسرا واقعہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کا ہے، جو صحیح بخاری کے مذکورہ ترجمہ الباب میں تعلیقاً اور سنن

① موطاً الإمام مالك مع تنوير الحوالك للسيوطي (١/ ٦٢) سنن الدارقطني مع التعليق المغني (١/ ٤٠٠) فتح الباري (١/ ٢٨١)

بیہقی و مصنف ابن ابی شیبہ میں صحیح سند کے ساتھ موصولاً مروی ہے، جس کا تذکرہ علامہ ابن حزم نے بھی ”المحلی“ میں کیا ہے، اس اثر میں ہے:

”عَصَرَ ابْنُ عُمَرَ بَثْرَةً فَخَرَجَ مِنْهَا الدَّمُّ وَلَمْ يَتَوَضَّأْ“^(۱)

”حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے پھنسی پھوڑی تو اس میں سے خون نکلا، مگر انہوں نے وضو نہیں کیا۔“

یہ صحیح بخاری کے الفاظ ہیں، جب کہ مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے:

”ثُمَّ صَلَّى وَلَمْ يَتَوَضَّأْ“

”(پھنسی پھوڑنے کے بعد) انہوں نے نماز ادا کی، مگر اس سرِ نو وضو نہیں کیا۔“

”المحلی“ ابن حزم وغیرہ میں ہے کہ اس خون کو انہوں نے دو انگلیوں کے مابین مل دیا، پھر اٹھے اور نماز پڑھی۔ اس طرح امام طاؤس کا اثر صحیح بخاری میں تعلیقاً اور مصنف ابن ابی شیبہ میں صحیح سند سے موصولاً مروی ہے:

”إِنَّهُ كَانَ لَا يَرَى فِي الدَّمِّ وَضُوءًا يَغْسِلُ عَنْهُ الدَّمَ ثُمَّ حَسَبَهُ“^(۲)

”وہ خون سے وضو کرنا ضروری نہیں سمجھتے تھے، خود سے خون دھو دیں، بس یہی کافی ہے۔“

حضرت ابو جعفر باقر رضی اللہ عنہ کے والد محمد بن حسین بن علی رضی اللہ عنہما کا اثر صحیح بخاری میں تعلیقاً اور فوائدِ حافظ ابو بشر میں موصولاً مروی ہے، جس میں اعمش بیان کرتے ہیں کہ میں نے ابو جعفر باقر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ نکسیر بہنے والے خون کا کیا حکم ہے؟ تو انہوں نے فرمایا:

”لَوْ سَالَ نَهْرٌ مِّنْ دَمٍ ، مَا أَعَدْتُ مِنْهُ الْوَضُوءَ“^(۳)

”اگر خون کی نہر بھی جاری ہو جائے تو میں اس سے وضو نہیں دہراؤں گا۔“

مشہور تابعی و فقیہ امام عطاء بن ابی رباح کا اثر صحیح بخاری میں تعلیقاً اور مصنف عبدالرزاق میں موصولاً مروی ہے، حضرت ابن جریج ان سے بیان کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک خون نکلنے سے وضو

(۱) صحیح البخاری مع الفتح (۲۸۱/۱) المحلی (۲۶۰/۱) التلخیص الحبیبر (۱۱۴/۱)

(۲) صحیح البخاری مع الفتح (۲۸۰/۱، ۲۸۱، ۲۸۲)

(۳) نفس المرجع.

نہیں تھا۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے عام صحابہ رضی اللہ عنہم اور علمائے حجاز کا یہی مسلک ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے، جب کہ شرح بخاری میں حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

”امام طاؤس، محمد بن علی اور عطاء رضی اللہ عنہم بھی حجازی ہیں، جب کہ مصنف عبد الرزاق میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور سعید بن جبیر اور سعید بن مسیب رضی اللہ عنہم کے طریق سے یہی مروی ہے، نیز اسماعیل القاضی نے ابو زناد کے طریق سے اہل مدینہ کے فقہائے سبعہ سے بھی یہی روایت بیان کی ہے اور امام مالک و شافعی رضی اللہ عنہما کا بھی یہی قول ہے۔“^(۱)

حلق یا مسورھوں سے خون بہنے سے بھی وضو ٹوٹنے کے بارے میں صحیح بخاری میں تعلقاً اور جامع سفیان ثوری اور ”معرفة السنن و الآثار للبيهقي“ میں موصولاً صحیح سند سے مروی اثر ہے:

«بَزَقَ ابْنُ أَبِي أَوْفَى دَمًا فَمَضَى فِي صَلَاتِهِ»^(۲)

”ابن ابی اوفی رضی اللہ عنہ نے خون تھوکا اور اپنی نماز میں مشغول رہے۔“

یاد رہے کہ ابن ابی اوفی رضی اللہ عنہ کا اسم گرامی عبداللہ رضی اللہ عنہ تھا، جو صحابی تھے اور ان کے والد ابو اوفی رضی اللہ عنہ بھی صحابی تھے، گویا انھیں صحابی ہونے کا شرف حاصل تھا۔ صحیح بخاری میں تعلقاً اور مصنف ابن ابی شیبہ و مسند شافعی میں موصولاً حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں مروی ہے:

”كَانَ إِذَا احْتَجَمَ غَسَلَ مَحَاجِمَهُ“^(۳)

”وہ جب سیکنگی لگواتے تو بس صرف اس مقام (جہاں سیکنگی لگواتے) کو دھوتے تھے۔“

حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ سے صحیح بخاری میں تعلقاً اور مصنف ابن ابی شیبہ میں موصولاً مروی ہے کہ جب ان سے پوچھا گیا کہ سیکنگی لگوانے والا کیا کرے؟ تو انھوں نے فرمایا:

”يَغْسِلُ أَثَرَ مَحَاجِمِهِ“^(۴) ”اپنے اس مقام (سر) کو دھو ڈالے۔“

صاحب ”فتح الباري“ لکھتے ہیں کہ امام لیث کے بارے میں تو یہ روایت بھی ملتی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ سیکنگی لگوانے والے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ سیکنگی والی جگہ کو اچھی طرح پونچھ کر

(۱) فتح الباري (۱/۱۸۲)

(۲) صحيح البخاري مع الفتح (۱/۲۸۰، ۲۸۲) التلخيص الحبير (۱/۱۱۴)

(۳) صحيح البخاري مع الفتح (۱/۲۸۰، ۲۸۲) التلخيص الحبير (۱/۱۱۴)

(۴) صحيح البخاري مع الفتح (۱/۲۸۰، ۲۸۲) التلخيص الحبير (۱/۱۱۴)

صاف کر دے، اسے دھونے کی ضرورت نہیں۔ امام شافعی نے امام لیث اور طاؤس رضی اللہ عنہما کے طریق ہی سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی ایک اثر بیان کیا ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

”اغْسِلْ أَثَرَ الْمَحَاجِمِ عَنكَ، وَحَسْبُكَ“^①

”سینگی کے آثار (خون وغیرہ) دھولو اور بس۔“

جیسا کہ امام طاؤس رضی اللہ عنہ کا قول بھی گزرا ہے۔ علامہ ابن حزم رضی اللہ عنہ نے لکھا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے صحیح سند سے ثابت ہے کہ انھوں نے ناک میں انگلی ڈالی تو اس پر خون لگا ہوا نکلا، اسے انھوں نے انگلی سے مل دیا، نماز پڑھی اور از سر نو وضو نہیں کیا۔ اسی موضوع کی ایک موقوف روایت ”معرفة السنن والآثار للبيهقي“ میں بھی ہے۔ یاد رہے کہ سینگی لگوانے کے بعد محض اس مقام کو دھو دینے اور وضو نہ کرنے کا مفہوم رکھنے والی تو ایک مرفوع روایت بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جو سنن دارقطنی اور بیہقی میں ہے، لیکن وہ ضعیف السند ہے، لہذا وہ محل استدلال تو نہیں ہو سکتی، لیکن اسے بطور شاہد لیا جاسکتا ہے، جب کہ ”منتقى الأخبار“ میں المجہد ابن تیمیہ رضی اللہ عنہ اسی مرفوع مگر ضعیف حدیث کے تحت فرماتے ہیں کہ اس کو تھوڑے خون پر محمول کیا جائے۔ یہی طریقہ امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ اور ان کے دوسرے موافقین نے بھی اختیار کیا ہے۔

امام شوکانی رضی اللہ عنہ ”منتقى الأخبار“ کی شرح ”نبیل الأوطار“ میں لکھتے ہیں:

”اس جمع و تطبیق کی تائید سنن دارقطنی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی اس روایت سے بھی ہوتی ہے، جس میں مروی ہے کہ ایک دو قطروں سے وضو نہیں الا یہ کہ خون بہنے والا ہو۔ لیکن اس کی سند میں ایک راوی محمد بن فضل بن عطیہ ہیں، جو متروک ہیں اور حافظ ابن حجر رضی اللہ عنہ نے ”التلخیص الحبیر“ میں اس روایت کی سند کو سخت ضعیف کہا ہے۔“^②

اس ساری تفصیل سے خون کے بارے میں تین مسلک معلوم ہوئے:

① خون کا مطلقاً ناقض وضو نہ ہونا، جو امام مالک، امام شافعی، طاہر یہ اور جمہور محدثین کا مسلک ہے۔

② خون کا مطلقاً ناقض وضو ہونا، جو احناف کا مسلک ہے۔

① التلخیص الحبیر (۱/۱۱۴)

② نبیل الأوطار مع منتقى الأخبار (۱/۱۸۹) تلخیص الحبیر (۱/۱۱۳)

۳ امام احمد اور حنابلہ کا مسلک کہ خون کم ہو تو ناقض وضو نہیں، بہت زیادہ ہو تو ناقض ہے۔ جب کہ دلائل کے اعتبار سے قوی تر اور صحیح ترین مسلک اول ہی ہے۔ عساکرِ اسلامیہ کے مجاہدین کی تاریخ میں ان کا زخمی ہونا اور اسی حالت میں نمازیں ادا کرنا بالترتیب ثابت اور مسلک اول ہی کا موید ہے۔ حدیث جابر بھی اس کی شاہد ہے اور کثیر و قلیل کے فرق والے مسلک کی تائید میں کوئی بھی صحیح حدیث نہیں ہے۔ احناف کے مسلک کے بارے میں علمائے احناف میں سے علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

”ہمارے اصحاب نے جس قوی اور صحیح ترین حدیث سے استدلال کیا ہے، وہ حضرت فاطمہ بنت ابی حمیش رضی اللہ عنہا والی حدیث استحاضہ ہے، جو بخاری میں مروی ہے، مگر اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ وہ عذر والے لوگوں کے ساتھ خاص ہے، جیسے سلس البول وغیرہ ہے۔ لہذا اس حدیث میں بھی حجت نہیں ہے۔“^۱

لہذا نتیجہ یہ ہوا کہ قلیل و کثیر خون سے وضو نہیں ٹوٹتا، سوائے اس خون کے جو سیلیں سے نکلے۔

10 ایذاے مسلم:

وہ امور جنہیں بعض اہل علم نے ناقض وضو کہا ہے اور بعض لوگوں سے اس کی روایات بھی ملتی ہیں، مگر قرآن و سنت کی کسی صحیح دلیل سے ان کا ناقض ہونا ثابت نہیں ہوتا، ایذاے مسلم بھی ہے۔ یہاں اس بات کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کہ کسی دوسرے مسلمان کو ایذا پہنچانا کتنا بڑا گناہ ہے، حتیٰ کہ سورۃ الاحزاب (آیت: ۵۸) میں ارشادِ الہی ہے:

﴿وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بَغَيْرِ مَا كَتَبْنَا فَقَدْ احْتَمَلُوا
بُهْتَانًا وَ اِثْمًا مُّبِينًا﴾

”اور جو لوگ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ایسے کام (کی تہمت) سے جو انہوں نے نہ کیا ہو ایذا دیں تو انہوں نے بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اپنے سر پر رکھا۔“

حتیٰ کہ صحیح بخاری و مسلم میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح مسلمان ہی اسے قرار دیا ہے، جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں، جیسا کہ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

﴿التلخیص الحبیر (۱/ ۱۱۵)﴾

«الْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ»^(۱)

”مسلمان وہ ہے، جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔“

صحیح بخاری و مسلم ہی کی ایک دوسری حدیث میں ارشادِ نبوی ہے:

«سَبَابُ الْمُسْلِمِ فَسُوقٌ وَقِتَالُهُ كُفْرٌ»^(۲)

”کسی مسلمان کو گالیاں دینا فسق اور اس سے لڑائی کرنا کفر ہے۔“

یہ سب اپنی جگہ بجا لیکن اس سے وضو پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں؟ کسی صحیح حدیث سے اس کا ناقض ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ البتہ بعض صحابہ و تابعین کے آثار سے پتا چلتا ہے کہ اگر کسی سے ایذا رسانی سرزد ہو جائے تو وہ شخص وضو کر لے۔ مثلاً حضرت عائشہ، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم، اسی طرح حضرت ابراہیم نخعی اور عبیدہ سلمانی رضی اللہ عنہما سے ایذا رسانی پر وضو کرنا منقول ہے، لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سلسلے میں کوئی بھی صحیح حدیث نہیں ملتی، اس بات کا انسانی معاشرے میں بہت عام ہونا اور اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسے ناقض وضو یا غیر ناقض قرار نہ دینا، اس بات کا متقاضی ہے کہ اس کا حکم براءتِ اصلیہ ہی پر قائم رہے گا، لہذا ایذاے مسلم کے سخت گناہ اور ناجائز ہونے کے باوجود اس سے وضو نہیں ٹوٹے گا۔ اس موضوع کی ایک مرفوع حدیث امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے ”المحلی“ میں ذکر کی ہے، جس میں حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَتَوَضَّأُ مِنَ الْحَدَثِ وَأَذَى الْمُسْلِمِ»^(۳)

”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حدت اور ایذاے مسلم سے وضو کیا کرتے تھے۔“

لیکن اس کی سند کے ایک راوی داود بن محیر کو کذاب، دروغ گو اور احادیث گھڑنے میں شہرت یافتہ قرار دیا گیا ہے، لہذا یہ روایت من گھڑت ہے۔ شیخ احمد شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے ”المحلی“ کے

[۱] صحیح البخاری مع الفتح، رقم الحدیث (۱۰) صحیح مسلم مع شرح النووي (۱/۲/۱۰، ۱۲) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (۲۱۶۸) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۲۱۹، ۲۱۸) صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (۴۶۲۳)

[۲] صحیح البخاری، رقم الحدیث (۴۸) صحیح مسلم مع شرح النووي (۱/۳/۵۴) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۶۱۰، ۲۱۲۳) صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (۳۳۸۳۱) سنن ابن ماجه (۶۹) [۳] المحلی (۱/۱/۲۶۱)

حاشیے میں لکھا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی طرف ایذاے مسلم کی نسبت کرنے والی اس روایت کا من گھڑت ہونا بڑا واضح اور ظاہر ہے۔ غرض ایذاے مسلم کا ناقض وضو ہونا ثابت نہیں، البتہ اگر کوئی شخص وضو کر لے تو اچھا ہے، جیسا کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کے عمل سے پتا چلتا ہے، لیکن یہ واجب نہیں ہے۔

11 صلیب اور صنم کو چھونا:

جن امور سے وضو نہیں ٹوٹتا اور نہ ان سے وضو ٹوٹنے کی کوئی دلیل ہے، ان میں سے گیارہویں اور آخری چیز صلیب اور صنم کو چھونا ہے، یعنی اگر کوئی شخص عیسائیوں کے مخصوص مذہبی شعار یعنی صلیب یا سولی کو چھولے، جسے کراس بھی کہا جاتا ہے یا پھر بت پرستوں کے کسی بت یا مورتی کو ہاتھ لگالے، تو اس سے بھی وضو ٹوٹنے کی کوئی صریح دلیل نہیں ملتی، اگرچہ ان اشیا کو نجس قرار دیا گیا ہے، لیکن ان کی نجاست معنوی ہے، حسی اور ظاہری نہیں، البتہ مصنف عبدالرزاق رحمہ اللہ کے حوالے سے علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ ذکر کیا ہے کہ انھوں نے مستورد عجمی کو توبہ کرائی تو اس کے گلے میں جو صلیب تھی اسے چھوا، پھر جب نماز شروع کی تو کسی دوسرے آدمی کو آگے بڑھایا اور خود وضو کرنے چلے گئے، بعد میں لوگوں کو بتایا کہ انھوں نے یہ وضو کسی حدیث کی وجہ سے نہیں کیا، بلکہ دراصل انھوں نے اس نجس چیز کو چھوا تھا:

”فَأَحَبَّ أَنْ يُحَدِّثَ مِنْهَا وَضُوءًا“^①

”تو انھیں یہ محبوب معلوم ہوا کہ اس سے وہ از سر نو وضو کر لیں۔“

اس اثر کے الفاظ سے بھی بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ ناقض وضو نہیں، بلکہ یہ محض ان کا اپنا اجتہاد و استحباب تھا، اگرچہ علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے نماز منقطع کر کے جانے کی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نظریہ وجوب ہی محسوس کیا ہے۔

اس سلسلے میں ایک مرفوع روایت بھی ہے، جس میں حضرت ابن بریدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

«إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَمَرَ بِرَيْدَةَ، وَقَدْ مَسَّ صَنَمًا، فَتَوَضَّأَ»^②

”نبی اکرم ﷺ نے حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا تو انھوں نے وضو کیا، کیوں کہ انھوں

① المحلی (۱/۱/۲۶۲)

② حوالہ سابقہ.

نے ایک بت کو چھوا تھا۔“

اس روایت کی سند کے ایک راوی صالح بن حیان ہیں، جو ضعیف اور ناقابلِ حجت ہیں، لہذا قرآن و سنت کی کوئی واضح نص نہ ہونے کی وجہ سے صلیب یا صنم اور بتوں یا دیوی و دیوتاؤں کو ہاتھ لگانے سے وضو نہیں ٹوٹتا، ہاں اگر استجباً کوئی وضو کر لے تو یہ الگ بات ہے۔

غسل اور وضو کے لیے پانی میں احتیاط:

اس کے ساتھ ہی غسل و وضو کے احکام اور مسائلِ طہارت میں سے تمام ضروری ضروری امور مناسب تفصیل کے ساتھ اختتام پذیر ہوئے۔

چلتے چلتے ایک اور بات بھی ذکر کرتے جائیں اور اس پہلو کی طرف توجہ دلانا، اس لیے ضروری لگتا ہے کہ ہمارے بعض اصحاب مساجد کی ٹوٹیوں پر بیٹھ جائیں تو اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ پانی کھلا ہے اور باتیں شروع ہیں۔ کچھ ایسا ہی معاملہ عموماً غسل میں بھی ہوتا ہے، حالاں کہ نبی اکرم ﷺ غسل اور وضو کے لیے پانی کے استعمال میں کافی احتیاط فرمایا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں عدم احتیاط کو اسراف یا فضول خرچی ہی کہا جائے گا۔ یہ بات تو سنن ابن ماجہ اور مسند احمد کی ایک مرفوع حدیث میں بھی مذکور ہے، جو حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہما کو فرمایا:

«مَا هَذَا السَّرْفِ يَا سَعْدُ؟» «اے سعد! یہ کیا فضول خرچی ہے؟»

تو انھوں نے عرض کی:

«أَفِي الْوُضُوءِ سَرَفٌ؟» «کیا وضو میں بھی اسراف ہے؟»

جواب ملا:

«نَعَمْ، وَإِنْ كُنْتَ عَلَى نَهْرٍ جَارٍ»^① «ہاں، اگرچہ تو بہتی نہر پر ہی کیوں نہ ہو۔»

لیکن یہ روایت ضعیف ہے، کیوں کہ اس کی سند میں ایک راوی ابن لہیعہ ہے، جو ضعیف میں

معروف ہے۔^②

① بحوالہ مشکاة المصابیح (۱/ ۱۳۳) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۴۲۵)

② تحقیق المشکاة المصابیح (۱/ ۱۳۳)

تاہم اس مفہوم پر ایک دوسری صحیح حدیث بھی دلالت کرتی ہے کہ پانی میں احتیاط برتی جائے اور کم از کم پانی سے غسل وضو کیا جائے، چنانچہ صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتب حدیث میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَتَوَضَّأُ بِالْمُدِّ، وَيَغْتَسِلُ بِالصَّاعِ إِلَى خَمْسَةِ أَمْدَادٍ»^①

”نبی اکرم ﷺ ایک مد پانی سے وضو فرمایا کرتے تھے اور ایک صاع یعنی چار مدوں سے لے کر پانچ مدوں تک پانی سے غسل فرمایا کرتے تھے۔“

”القاموس المحيط“ میں علامہ فیروز آبادی نے ”مد“ پیمانے کے بارے میں لکھا ہے:

”مِكْبَالٌ مِلُّءُ كَفِّي الْإِنْسَانِ الْمُعْتَدِلِ إِذَا مَلَأَهُمَا وَ مَدْيَدَهُ بِهِمَا، وَبِهِ سُمِّيَ مَدًّا“^②

”ایک پیمانہ جو درمیانے قد کے انسان کے دونوں خوب کھلے ہوئے ہاتھوں سے بنائے گئے، چلو کے برابر ہوتا ہے۔ ہاتھوں کو خوب پھیلا کر کھولنے کی وجہ ہی سے اس پیمانے کا نام ”مد“ ہے (کیوں کہ لغت میں مد کا معنی ہی کھینچنا یا پھیلا نا ہے)۔“

اس حدیث سے مسنون مقدار تو معلوم ہوگئی۔ اب پانی کی فراوانی کی وجہ سے کچھ زیادہ استعمال کی گنجائش تو ہے، لیکن پوری ٹینگی بہا دینے کی تو اجازت نہیں ہو سکتی۔ بعض احادیث میں تو دو تہائی مد سے وضو کا بھی پتا چلتا ہے، جیسا کہ مسند احمد اور صحیح ابن حبان میں حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، ایسے ہی ایک انصاری صحابیہ حضرت أم عمارہ رضی اللہ عنہا سے بھی سنن ابی داؤد میں دو تہائی مد آیا ہے۔ اس حدیث کو امیر صنعانی نے ”سبل السلام“ میں حسن قرار دیا ہے اور امام بخاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”اہل علم زیادہ پانی استعمال کرنے کو مکروہ خیال کرتے ہیں۔“^③

بعض لوگوں کو وسواس کا مرض ہوتا ہے کہ وہ اس بات کا یقین ہی نہیں کر پاتے کہ ان کے ہاتھ اب پاک ہو گئے ہیں یا نہیں؟ لہذا تا دیر وہ ہاتھوں ہی کو دھوتے چلے جاتے ہیں۔ ایسے ہی دیگر

① صحیح البخاری مع الفتح، رقم الحدیث (۲۱۰) صحیح مسلم مع شرح النووی (۸، ۷ / ۴ / ۲)

② دیکھیں: سبل السلام (۱ / ۱ / ۴۷) تحقیق المشکاة المصابیح (۱ / ۱۳۷)

③ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: المغنی لابن قدامة (۱ / ۲۰۵، ۲۰۸) بلوغ المرام مع سبل السلام (۱ / ۴۸، ۵۴، ۵۵)

اعضا اور پاؤں کا معاملہ بھی ہوتا ہے، بلکہ ایک حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو وسواس میں مبتلا کرنے پر ایک شیطان متعین ہے، جیسا کہ سنن ترمذی و ابن ماجہ اور مستدرک حاکم میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے:

«إِنَّ لِلْوُضُوءِ شَيْطَانًا، يُقَالُ لَهُ: وَلِهَانٌ، فَاتَّقُوا وَسْوَاسَ الْمَاءِ»^①

”وضو کا ایک شیطان ہے، جسے ”ولہان“ کہا جاتا ہے، پس تم پانی کے وسواس سے بچو۔“
لیکن یہ روایت سخت ضعیف ہے۔^②

اس کے علاوہ سنن ابو داؤد، ابن ماجہ اور مسند احمد کی ایک صحیح حدیث میں حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے جب اپنے بیٹے کو یہ دعا کرتے ہوئے سنا کہ اے اللہ! میں تجھ سے جنت کے دائیں حصے میں سفید رنگ کا محل مانگتا ہوں تو انھوں نے فرمایا: بیٹا! اللہ سے جنت مانگو اور نارِ جہنم سے پناہ طلب کرو (یعنی دعا کرنے میں اتنی باریکیوں اور تکلفات سے کام نہ لو)، کیوں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

«إِنَّهُ سَيَكُونُ فِي هَذِهِ الْأُمَّةِ قَوْمٌ يَعْتَدُونَ فِي الطُّهُورِ وَالِدُّعَاءِ»^③

”میری امت میں ایک قوم پیدا ہوگی، جو طہارت اور دعا میں زیادتی (حدود سے تجاوز) کریں گے۔“

اس حدیث کی رو سے بھی غسل اور وضو کے لیے پانی میں احتیاط برتنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔



① دیکھیں: سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۴۲۱) المغنی (۲۱۸/۱)

② ضعیف الجامع الصغیر (۱۸۷/۲/۱) و تحقیق المشکاة (۱۳۱/۱)

③ صحیح سنن أبي داؤد، رقم الحدیث (۸۷) مشکاة المصابیح (۱۳۱/۱) وقال الألبانی: إسناده صحیح وصححه جماعه، وليس عند ابن ماجه الاعتداء في الطهور.

اوقاتِ نماز

غسل و طہارت، وضو اور تیمم کا مسنون طریقہ اور تقریباً تمام متعلقہ ضروری مسائل تو آپ کے سامنے آچکے ہیں، لہذا اب آئیے اسی انداز سے قدر سے تفصیل کے ساتھ نماز کے فضائل و مسائل اور احکام کا سلسلہ بھی شروع کریں۔

اوقاتِ نماز پنج گانہ؛ قرآن کریم کی روشنی میں:

نماز کے احکام و مسائل میں سب سے پہلے اوقاتِ نماز کا موضوع آتا ہے، لہذا قرآن و سنت کی رو سے ان اوقات کی تعیین کر لینا ضروری ہے۔ قرآن کریم چونکہ اصول احکام کی کتاب ہے، لہذا اس میں پنج گانہ نمازوں کا بالترتیب اور نام بہ نام تو ذکر نہیں، لیکن متعدد مقامات پر نمازوں اور ان کے اوقات کی طرف اشارے کیے گئے ہیں۔ مثلاً سورت ہود (آیت: ۱۴) میں ارشادِ الہی ہے:

﴿وَأَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلْفًا مِّنَ اللَّيْلِ﴾

”اور نماز قائم کرو، دن کے دونوں کناروں پر اور رات کی کچھ ساعتوں میں۔“

یہاں دن کے دونوں کناروں پر نماز قائم کرنے سے مراد نمازِ مغرب اور نمازِ فجر ادا کرنا ہے اور رات کی کچھ ساعتوں میں (یا کچھ رات گزارنے پر) نماز قائم کرنے سے عشا کو ادا کرنے کی طرف اشارہ ہے۔^①

سورة الاسراء یا بنی اسرائیل جسے سورت سبحان بھی کہا جاتا ہے، اس میں ارشادِ الہی ہے:

﴿أَقِمِ الصَّلَاةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلَى غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْآنِ الْفَجْرِ إِنَّ قُرْآنَ

الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا﴾ [الاسراء: ۷۸]

”نماز قائم کرو اور سورج ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک اور فجر کے وقت قرآن کریم

① تفسیر ابن کثیر مترجم (۵۵۵/۲) طبع مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور

کی تلاوت کرنے کا بھی اہتمام کرو۔ (کیوں کہ) بے شک فجر کے وقت قرآن پڑھنے پر
(اللہ کے فرشتے) گواہ بنتے ہیں۔“

اس آیت میں ظہر سے لے کر عصر، مغرب، عشا اور فجر پانچوں نمازیں ہی آجاتی ہیں۔^(۱) جب
کہ تین نمازوں یعنی ظہر، عشا اور فجر کا تو نمایاں طور پر ذکر ہے۔ سورت طہ (آیت: ۱۳۰) میں
ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ
غُرُوبِهَا وَمِنْ أَنَايِ الْأَيْلِ فَسَبِّحْ وَأَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضَىٰ ﴾
”یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں، ان کی باتوں پر صبر کریں اور اپنے رب کی حمد و ثنا کے ساتھ اس
کی تسبیح کرو، سورج نکلنے سے پہلے اور سورج غروب ہونے سے پہلے اور رات کے کچھ
اوقات میں بھی تسبیح کرو اور ان کی حدوں (یا کناروں) پر، شاید کہ تم راضی ہو جاؤ۔ (یعنی
اس لیے کہ آپ آخرت میں اس کا ثواب پا کر خوش ہو جائیں)۔“

اس آیت میں پہلے فجر، عصر اور عشا، پھر فجر، ظہر، پھر فجر، ظہر اور مغرب پانچوں ہی نمازوں
کے اوقات کا اجمالی تذکرہ آگیا ہے۔^(۲) ان آیات کے ساتھ ہی سورۃ الروم کی آیت (۱۷، ۱۸) کو بھی ملا
کر پڑھا جائے تو نماز پنجگانہ کے اوقات کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ارشادِ الہی ہے:

﴿ فَسُبْحَانَ اللَّهِ حِينَ تُمْسُونَ وَ حِينَ تُصْبِحُونَ ﴿۱۷﴾ وَ لَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمَاوَاتِ
وَ الْأَرْضِ وَ عَشِيًّا وَ حِينَ تُظْهِرُونَ ﴿۱۸﴾ ﴾

”پس اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتے رہو، جس وقت کہ شام ہوتی ہے اور جس وقت کہ صبح
ہوتی ہے اور وہی ہر قسم کی تعریف کے لائق ہے آسمان اور زمین میں اور اس کی پاکی بیان
کرو، تیسرے پہر اور دو پہر کو۔“

علمائے تفسیر نے لکھا ہے کہ یہاں تسبیح سے مراد نماز ہے اور اس آیت میں پانچوں ہی نمازوں کا
ذکر آگیا ہے۔ امام رازی اور حافظ ابن کثیر رحمہم اللہ لکھتے ہیں کہ صبح سے مراد نماز فجر ہے، شام سے مغرب

(۱) تفسیر ابن کثیر (۳/ ۲۴۹)

(۲) تفسیر ابن کثیر (۲/ ۴۰۶، ۴۰۷)

وعشاء، تیسرے پہر سے عصر اور دوپہر سے نمازِ ظہر مراد ہے۔^(۱)

ان آیات کے علاوہ بھی قرآن کریم کے کئی مقامات پر نمازوں کے ناموں اور اوقات کا اجمالی تذکرہ موجود ہے، مثلاً سورۃ الاسراء (آیت: ۷۸) میں ارشادِ الہی ہے:

﴿وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدُ بِهِ نَافِلَةً لَكَ عَسَىٰ أَنْ يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُودًا﴾
 ”اور رات کو کسی وقت جاگ اٹھیں (تہجد کی نماز پڑھیں) یہ آپ ﷺ کے لیے نافلہ (زائد) ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ (اس کی برکت سے) آپ ﷺ کا رب آپ ﷺ کو (قیامت کے دن) مقامِ محمود تک پہنچا دے۔“

اس آیت میں نمازِ تہجد کا ذکر ہے، اگرچہ یہ نماز نفل نماز ہے اور نمازِ پنج گانہ میں یہ شمار نہیں ہوتی، جب کہ سورۃ الجمعہ (آیت: ۹) میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾
 ”اے ایمان والو! جمعہ کے دن جب نماز کے لیے پکارا (اذان دی) جائے تو اللہ کے ذکر (نماز) کی طرف چل دو اور خرید و فروخت (کاروبار) چھوڑ دو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے، اگر تم سمجھو۔“

اس آیت میں نمازِ جمعہ کا ذکر ہے، جب کہ ہر آٹھ دن میں ایک مرتبہ ہر عاقل و بالغ مسلمان پر باجماعت نمازِ جمعہ فرض ہے، جس کے بلا عذر ترک کرنے پر سخت وعید آئی ہے۔ سورۃ البقرہ (آیت: ۱۸۷) اور سورۃ القدر (آیت: ۵) میں نمازِ فجر کا ذکر آیا ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرہ کی مذکورہ بالا آیت میں روزے کے احکام کے دوران میں ارشادِ الہی ہے:

﴿وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ [البقرہ: ۱۸۷]

”اور کھاتے پیتے رہو، یہاں تک کہ فجر (صبح) کی سفید دھاری رات کی کالی دھاری سے تم کو صاف دکھائی دینے لگے۔“

(۱) ویکیپس: أشرف الحواشي یعنی فوائد سلفية (ص: ۴۸۶، حاشیہ ۲)

سورة الفجر کے شروع میں ہے:

﴿ وَالْفَجْرِ ﴿١﴾ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ﴿٢﴾ وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ﴿٣﴾ ﴾ [الفجر: ۱ تا ۳]

”قسم ہے فجر کی۔ اور دس راتوں کی۔ اور جفت و طاق (یوم نحر اور یوم عرفہ) کی۔“

سورة القدر میں اسی مبارک رات کے فضائل بیان کرتے ہوئے آخری آیت میں فرمایا ہے:

﴿ سَلَّمَ هِيَ حَتَّىٰ مَطْلَعِ الْفَجْرِ ﴾ [القدر: ۵]

”یہ شب امن و سلامتی والی ہے طلوع فجر (صبح نکلنے) تک۔“

اسی پر بس نہیں، بلکہ قرآن کریم کے دیگر کئی مقامات بھی ایسے ہیں، جہاں کسی نہ کسی انداز میں ان نمازوں کا ذکر آیا ہے۔ مثلاً سورة النور (آیت: ۳۶ اور ۵۸) سورة الانعام (آیت: ۵۲) سورة الکہف (آیت: ۲۸) سورة الرعد (آیت: ۱۵) سورة ق (آیت: ۳۹) سورة یوسف (آیت: ۱۶) سورة آل عمران (آیت: ۳) سورة ص (آیت: ۱۸) سورة الغافر (آیت: ۵۵) اور سورة مریم (آیت: ۱۱) میں دیکھا جاسکتا ہے۔ سورة العصر کی پہلی آیت میں ہے: ﴿ وَالْعَصْرِ ﴿١﴾ ﴾ یہاں زمانے کے ساتھ نماز عصر بھی مراد ہے۔

قرآن کریم کے ان دس مقامات کا تھوڑی سی توجہ سے مطالعہ کیا جائے تو ہماری پنج گانہ نمازوں کے نہ صرف یہ کہ کسی حد تک نام مل جاتے ہیں، بلکہ ان کے اوقات کا بھی پتا چل جاتا ہے، جس کی تفصیل کتب تفسیر میں موجود ہے۔ مفسرین کرام نے ان آیات کی تفسیر میں نمازوں کے اوقات وغیرہ پر کس طرح استدلال کیا ہے اور ان کے قوی دلائل کون کون سے ہیں؟ اگر ان سب امور سے متعلقہ اقتباسات بھی ذکر کیے جائیں تو بات لمبی ہو جاتی ہے، لہذا ہم ان اشاروں ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔

اوقات نماز پنج گانہ؛ حدیث شریف کی روشنی میں:

قرآن کریم کے متعدد مقامات کے حوالے سے نماز پنج گانہ کے اوقات کا اجمالی سا تذکرہ ہو چکا ہے، جب کہ اس اجمال کی تفصیل نبی اکرم ﷺ نے اپنے ارشادات میں فرمادی ہے۔ ہر نماز کا نام، اس کا اول و آخر وقت اور دیگر مسائل بھی تعلیم فرمائے ہیں، جو آج کتب حدیث کے بیش بہا خزانون کی شکل میں تقریباً ہر زبان میں ترجمے کے ساتھ موجود ہیں۔ ان میں سے سنن ترمذی، نسائی، دارقطنی، بیہقی، مسند احمد، صحیح ابن حبان اور مستدرک حاکم میں ایک حدیث ہے، جس کے بارے میں امام ترمذی رحمہ اللہ

نے اپنی سنن میں امیر المؤمنین فی الحدیث حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد نقل کیا ہے:

”أَصْحَحُ شَيْئًا فِي الْمَوَاقِفِ حَدِيثُ جَابِرٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ“^(۱)

”اوقات نماز کی تعیین کے بارے میں صحیح ترین حدیث وہ ہے، جسے حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے

نبی اکرم ﷺ سے بیان کیا ہے۔“

”قوت المغتذي“ سے نقل کرتے ہوئے علامہ مہارکپوی نے ”تحفة الأحوذی“ میں

امام ابن القطان کا قول ذکر کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ انصاری صحابی تھے اور

مدینہ طیبہ ہی میں صحابی ہوئے تھے، جس رات نبی اکرم ﷺ کو اسرا و معراج کا سفر درپیش ہوا اور یہ

نمازیں فرض کی گئیں، اس رات کی صبح کو (مکہ میں) حضرت جابر رضی اللہ عنہ نہیں تھے، لہذا ضروری ہے کہ یہ

حدیث مرسل ہو، یعنی انھوں نے کسی دوسرے صحابی سے سنی ہو اور اس کا واسطہ ذکر کیے بغیر بیان کی ہو۔^(۲)

لیکن صاحب ”الإمام“ کے بقول یہ جرح موثر نہیں، کیوں کہ اگر صحابی کا واسطہ ذکر نہ بھی ہو تو

کوئی فرق نہیں پڑتا، کیوں کہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم عدول ہیں اور یہ بات تو بعید از قیاس ہے کہ انھوں نے

کسی تابعی سے یہ حدیث سنی ہو۔ ایسی حدیث کا شمار مراسیل صحابہ رضی اللہ عنہم سے ہوتا ہے، جس کی حجیت

میں کوئی کلام نہیں۔ ”نصب الرایة“ میں ہے:

”قَالَ فِي الْإِمَامِ: وَهَذَا الْمُرْسَلُ غَيْرُ ضَارٍّ، فَمِنْ أْبَعَدِ الْبُعْدِ أَنْ يَكُونَ جَابِرٌ

سَمِعَهُ مِنْ تَابِعِيٍّ عَنْ صَحَابِيٍّ، وَقَدْ اِشْتَهَرَ أَنَّ مَرَايِلَ الصَّحَابَةِ مَقْبُولَةٌ

وَجَهَالَةٌ عَيْنِهِمْ غَيْرُ ضَارَّةٍ“^(۳)

”الامام میں ہے کہ یہ مرسل مضر نہیں ہے، کیوں کہ یہ بات بعید از قیاس ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ

نے یہ حدیث صحابی کے علاوہ کسی تابعی سے سنی ہو اور یہ بات عام ہے کہ مراسیل صحابہ رضی اللہ عنہم

مقبول (حجت) ہیں اور ان میں سے کسی کی جہالت کوئی نقصان دہ نہیں ہے۔“

یہ حدیث ان مراسیل میں سے نہیں، جن کا ذکر ہم کر چکے ہیں کہ ان میں مخذوف راوی کے

(۱) سنن الترمذی مع التحفة (۱/ ۴۶۸) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۱۲۸)

(۲) تحفة الأحوذی (۱/ ۴۶۹) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۱۲۸) صحیح سنن النسائی، رقم

الحدیث (۴۹۰، ۵۰۰، ۵۱۲) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (۳۷۹، ۳۸۴، ۳۸۶) موارد الظمان (۲۷۸)

(۳) نصب الرایة (۱/ ۲۳)

تابعی ہونے کا امکان ہوتا ہے، جن میں ضعیف بھی ہیں۔ غرض کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ امام بخاری کے مذکورہ قول کے علاوہ امام ترمذی اور حاکم نے بھی اسے صحیح کہا ہے۔ امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے ”تلخیص المستدرک“ میں امام حاکم کی موافقت کی ہے۔^①

چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ اس حدیث میں بیان فرماتے ہیں:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ جَاءَهُ جَبْرِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَقَالَ لَهُ: قُمْ فَصَلِّهِ، فَصَلَّى الظُّهْرَ، حِينَ زَالَتِ الشَّمْسُ، ثُمَّ جَاءَهُ الْعَصْرَ فَقَالَ: قُمْ فَصَلِّهِ فَصَلَّى الْعَصْرَ، حِينَ صَارَ ظِلُّ كُلِّ شَيْءٍ مِثْلَهُ، ثُمَّ جَاءَهُ الْمَغْرِبَ فَقَالَ: قُمْ فَصَلِّهِ، فَصَلَّى الْمَغْرِبَ حِينَ وَجَبَتِ الشَّمْسُ، ثُمَّ جَاءَهُ الْعِشَاءَ فَقَالَ: قُمْ فَصَلِّهِ فَصَلَّى الْعِشَاءَ، حِينَ غَابَ الشَّفَقُ، ثُمَّ جَاءَهُ الْفَجْرَ، فَقَالَ: قُمْ فَصَلِّهِ، فَصَلَّى الْفَجْرَ حِينَ بَرَقَ أَوْ قَالَ: سَطَعَ الْفَجْرُ»

”نبی اکرم کے پاس حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے اور فرمایا: اٹھیے نماز پڑھیے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ان کے ساتھ) ظہر کی نماز اس وقت پڑھی، جب کہ سورج سر سے ڈھل گیا، پھر وہ عصر کے وقت آئے اور فرمایا: اٹھیے نماز پڑھیے۔ تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کی نماز اس وقت پڑھی، جب کہ ہر چیز کا سایہ اس کے برابر ہو گیا تھا، پھر وہ مغرب کے وقت نازل ہوئے اور فرمایا: اٹھیے نماز پڑھیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز مغرب اس وقت ادا کی، جب سورج غروب ہو گیا۔ پھر وہ عشا کے وقت نازل ہوئے اور فرمایا: اٹھیے نماز پڑھیے۔ تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز عشا اس وقت پڑھی، جب کہ شفق (غروب آفتاب کے بعد والی سرخی) غائب ہو چکی تھی۔ پھر جبرائیل علیہ السلام فجر کے وقت آئے اور فرمایا: اٹھیے نماز پڑھیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر کی نماز اس وقت پڑھی، جب کہ فجر طلوع ہوئی۔“

اس طرح ایک دن کی پانچ نمازیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ساتھ ادا فرمائیں، جب کہ اسی حدیث کے اگلے حصے میں دوسرے دن کی پانچ نمازیں پڑھنے کا ذکر ہے، البتہ دوسرے دن کے اوقات مختلف ہیں۔ چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

① إرواء الغلیل (۱/۲۷۰، ۲۷۱) و صححہ.

«ثُمَّ جَاءَهُ مِنَ الْغَدِ لِلظُّهْرِ، فَقَالَ: قُمْ فَصَلِّهِ فَصَلَّى الظُّهْرَ حِينَ صَارَ ظِلُّ كُلِّ شَيْءٍ مِثْلَهُ ثُمَّ جَاءَهُ الْعَصْرَ حِينَ صَارَ ظِلُّ كُلِّ شَيْءٍ مِثْلِيهِ، ثُمَّ جَاءَهُ الْمَغْرِبَ وَقَتًا وَاحِدًا، لَمْ يَزُلْ عَنْهُ، ثُمَّ جَاءَهُ الْعِشَاءَ حِينَ ذَهَبَ نِصْفُ اللَّيْلِ أَوْ قَالَ: ثُلُثُ اللَّيْلِ، فَصَلَّى الْعِشَاءَ، ثُمَّ جَاءَ حِينَ أَسْفَرَ جَدًّا فَقَالَ لَهُ: قُمْ فَصَلِّهِ، فَصَلَّى الْفَجْرَ، ثُمَّ قَالَ: مَا بَيْنَ هَذَيْنِ وَقْتُ»⁽¹⁾

”اگلے دن جبرائیل علیہ السلام ظہر کے لیے تشریف لائے اور فرمایا: اٹھیے نماز پڑھیے۔ آپ ﷺ نے نماز ظہر اس وقت پڑھی، جب کہ ہر چیز کا سایہ اس سے برابر ہو گیا۔ پھر وہ عصر کے لیے اسی وقت آئے، جب کہ ہر چیز کا سایہ اس کے دوگنا ہو گیا۔ پھر وہ مغرب کے لیے اس وقت آئے، جس وقت پہلے دن آئے تھے۔ اس کا وقت نہیں بدلا۔ پھر جبرائیل علیہ السلام نماز عشا کے لیے آپ ﷺ کے پاس آئے، جب کہ نصف رات گزر گئی یا کہا کہ ایک تہائی رات گزر گئی، تب نماز عشا پڑھی، پھر وہ اس وقت آئے، جب فجر کی روشنی خوب پھیل چکی تھی اور فرمایا: اٹھیے نماز پڑھیے، تو آپ ﷺ نے نماز فجر پڑھی۔ تب فرمایا: ان دونوں اوقات کے مابین ان نمازوں کا وقت ہے۔“

اس طرح حکم الہی سے حضرت جبرائیل علیہ السلام نے نبی اکرم ﷺ کو دو دن پانچوں وقت کی نماز پڑھا کر ان کے اول و آخر دونوں وقت بتا دیے کہ یہاں سے شروع ہو کر یہاں تک نماز کا وقت ہے۔ اس حدیث کی رو سے تو نماز مغرب کا صرف ایک ہی وقت ہے۔ جب کہ صحیح مسلم و سنن ابی داؤد، نسائی، صحیح ابی عوانہ، سنن دارقطنی اور مسند احمد میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز مغرب کا بھی اول و آخر وقت ہے۔⁽²⁾

یعنی دوسری نمازوں کی طرح ہی نماز مغرب کو بھی ایک خاص وقت تک موخر کیا جاسکتا ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے پاس کوئی آدمی آیا اور اس نے نمازوں کے اوقات کے بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے اسے کوئی جواب نہیں دیا، بلکہ دو دن

(1) صحیح سنن الترمذی للالبانی (۵۰/۱) إرواء الغلیل (۲۷۰/۱، ۲۷۱) المنتقى مع النيل (۱/۱، ۳۵۱، مصر)

(2) مختصر صحیح مسلم للمندری، رقم الحدیث (۲۰۶) صحیح سنن ابی داؤد، رقم الحدیث (۳۸۱)

صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۵۰۹)

پانچوں نمازیں اول و آخر اوقات میں پڑھائیں اور آخر میں فرمایا:

«الْوَقْتُ فِيمَا بَيْنَ هَذَيْنِ»

”ہر نماز کے ان دو وقتوں کے مابین ہی اس کا وقت ہے۔“

اسی حدیث میں دوسرے دن کی نمازوں کے اوقات کے سلسلے میں نمازِ مغرب کے بارے میں

وہ فرماتے ہیں:

«ثُمَّ آخَرَ الْمَغْرِبَ حَتَّىٰ كَانَ عِنْدَ سُقُوطِ الشَّفَقِ»

”پھر آپ ﷺ نے نمازِ مغرب میں اتنی تاخیر کی کہ مغرب کی سرخی (شفق) ختم ہونے

والی تھی۔“

ایک دوسری روایت کے الفاظ ہیں:

«فَصَلَّى الْمَغْرِبَ قَبْلَ أَنْ يَغِيبَ الشَّفَقُ»^①

”آپ ﷺ نے شام کی سرخی غائب ہونے سے پہلے مغرب کی نماز ادا فرمائی۔“

اسی مفہوم کی ایک حدیث صحیح مسلم، سنن اربعہ اور دیگر کتب میں حضرت بریدہ السلمیؓ سے اور

صحیح مسلم، ابو داؤد، نسائی اور مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ سے بھی مروی ہے، جو

مغرب کے اول و آخر وقت کی دلیل ہے۔

نمازِ پنج گانہ کے اوقات سے متعلق بعض دیگر تفصیلات بھی ارشاداتِ رسول ﷺ سے ملتی ہیں،

لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ترتیب اور ان کا تذکرہ بھی کسی حد تک کر دیا جائے، تاکہ کوئی کوئی تشنگی

باقی نہ رہے۔

نمازِ فجر:

نمازِ پنج گانہ کے اوقات کے سلسلے میں جو احادیث ذکر کی جا چکی ہیں، ان میں نمازِ فجر کا اول

وقت یہ مذکور ہے کہ جب فجر (یا صبح صادق کا نور) طلوع ہو، پھر دوسرے دن کی نماز میں فجر کا آخری

① المنتقی مع النیل (۱/۱، ۳۵۹، ۳۶۰) إرواء الغلیل (۱/۲۷۱)

② صحیح مسلم مع شرح النووی (۲/۵، ۱۰۹، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (۳۸۳)

صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۵۰۵، ۵۰۸) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۱۳۰) مشکاة

المصابیح (۱/۱۸۴) المنتقی مع النیل (۱/۱، ۳۶۰)

وقت یہ بتایا گیا ہے کہ جب فجر کی روشنی خوب پھیل جائے، تب تک نماز فجر ادا کی جاسکتی ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے مروی ایک حدیث کے الفاظ ہیں:

«وَقْتُ صَلَاةِ الصُّبْحِ مِنْ طُلُوعِ الْفَجْرِ مَا لَمْ تَطْلُعِ الشَّمْسُ»^①

”صبح کی نماز کا وقت طلوع صبح صادق سے لے کر طلوع آفتاب تک ہے۔“

جب کہ صحیح بخاری و مسلم، صحیح ابی عوانہ، سنن ترمذی، نسائی، بیہقی، دارمی، مسند احمد اور موطا امام

مالک اور معانی الآثار طحاوی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«مَنْ أَدْرَكَ رَكْعَةً مِنَ الصُّبْحِ قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ فَقَدْ أَدْرَكَ الصُّبْحَ»^②

”جو شخص طلوع آفتاب سے قبل فجر کی ایک رکعت پڑھ لے تو اس نے نماز فجر کو پالیا۔“

جب کہ بخاری شریف میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ بھی ہیں:

«وَإِذَا أَدْرَكَ سَجْدَةً مِنَ صَلَاةِ الصُّبْحِ قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ فَلَيْتِمَّ صَلَاتَهُ»^③

”جس نے طلوع آفتاب سے پہلے پہلے ایک سجدہ بھی کر لیا، پس اسے چاہیے کہ اب اپنی

نماز مکمل پڑھ لے۔“

ان الفاظ میں سے «فَقَدْ أَدْرَكَ» اس کے بارے میں امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان

الفاظ کا ظاہری معنی مراد نہیں، کیوں کہ اس بات پر پوری امت اسلامیہ کا اجماع ہے کہ ایک رکعت کو

پانے والا پوری نماز کو پانے والا نہیں کہ اسے صرف اسی ایک رکعت سے پوری نماز مل جائے اور اسے

صرف ایک رکعت کافی ہو، بلکہ یہاں ان الفاظ کی تاویل کی گئی ہے اور یہاں بعض الفاظ کو محذوف

تسلیم کیا گیا ہے، جو شامل ہوں تو اصل عبارت یوں ہو جاتی ہے:

«فَقَدْ أَدْرَكَ حُكْمَ الصَّلَاةِ أَوْ وُجُوبَهَا أَوْ فَضْلَهَا»^④

① مختصر صحیح مسلم للمنذري، رقم الحديث (۲۰۵) مشکاة شریف (۱/۱۸۴)

② صحیح البخاری مع الفتح، رقم الحديث (۵۷۹) صحیح مسلم مع شرح النووي (۲/۵/۱۰۴، ۱۰۵)

صحیح سنن الترمذی، رقم الحديث (۳۴۷) صحیح سنن النسائی، رقم الحديث (۵۰۳) و سنن

الدارمی، رقم الحديث (۱۲۲۲) مشکاة المصابیح (۱/۱۹) المنتقی مع النیل (۱/۲۴/۲۴) الإرواء (۱/۲۷۳)

③ صحیح البخاری مع الفتح (۲/۵۶)

④ شرح صحیح مسلم للنووي (۳/۱۰۵/۱۰۵)

”اس نے نماز کے حکم کو یا وجوب کو یا (ادا کرنے کی) فضیلت کو پالیا۔“

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس عبارت کو ان الفاظ پر محمول کیا جائے گا:

”إِنَّهُ أَدْرَكَ الْوَقْتَ“ ”اس نے وقت کو پالیا۔“

فتح الباری میں حافظ عسقلانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہ جمہور کا قول ہے۔^(۱)

نسائی شریف میں اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

«فَقَدْ أَدْرَكَ الصَّلَاةَ كُلَّهَا إِلَّا أَنَّهُ يَقْضِي مَا فَاتَهُ»

”اس شخص نے پوری نماز کو پالیا، البتہ بقیہ فوت شدہ نماز قضا (کمل) کر لے گا۔“

ایک روایت میں یہ الفاظ بھی مروی ہیں کہ جس نے طلوع آفتاب سے پہلے ایک رکعت پڑھ لی

اور بقیہ نماز کو طلوع آفتاب کے بعد پڑھ کر مکمل کر لیا، اس کی نماز فوت نہیں ہوئی، جب کہ صحیح بخاری

شریف اور دیگر کتب کے یہ سب الفاظ اس کی تائید کرتے ہیں۔ تاہم امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”اگر کسی کی نماز فجر کو ادا کرنے کے دوران میں اس پر سورج طلوع ہو جائے تو اس کی

نماز باطل ہو جائے گی۔“^(۲)

انھوں نے دلیل کے طور پر وہ احادیث پیش کی ہیں، جن میں طلوع آفتاب کے وقت نماز

ادا کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ بعض نے تو یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ جواز والی احادیث منسوخ ہیں اور

ممانعت والی نسخ، لیکن صاحب فتح الباری لکھتے ہیں:

”یہ دعویٰ دلیل کا محتاج ہے۔ محض کسی احتمال کی بنا پر نسخ و منسوخ کے چکر میں نہیں پڑ جانا

چاہیے۔ یہاں تو دونوں طرح کی احادیث میں جمع و تطبیق بھی ممکن ہے اور وہ اس طرح کہ

جواز والی احادیث کو سبھی نمازوں پر اور ممانعت والی احادیث کو بلا سبب یعنی عام نفلی

نمازوں پر محمول کیا جائے۔ شیخ ابن باز رحمہ اللہ نے امام شافعی، احمد بن حنبل، ابن تیمیہ اور

ابن قیم رحمہم اللہ کا یہ مسلک لکھا ہے اور اسے ہی اصح الاقوال قرار دیا ہے۔“^(۳)

امام شوکانی رحمہ اللہ ”نیل الأوطار“ میں لکھتے ہیں:

(۱) فتح الباری (۵۶/۲)

(۲) نیل الأوطار (۲۵/۲/۸)

(۳) فتح الباری (۵۶/۲) و حاشیہ الفتح (۵۹/۲)

”یہ طریقہ جمع و تطبیق بھی محض ان کے اپنے مذہب کے موافق ہے، جب کہ حق یہ ہے (یعنی حقیقی جمع و تطبیق یہ ہے) کہ ممانعت والی احادیث عام ہیں اور تمام نمازوں کو شامل ہیں۔ (فرض ہوں یا نفلی اور سببی ہوں یا بلا سبب) جب کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ والی حدیث زیر بحث خاص ہے۔ لہذا عام کو خاص کے ساتھ مقید کیا جائے گا، لہذا اس وقت کوئی بھی نماز جائز نہیں، سوائے اس کے جسے کوئی دلیل خاص دے، وہ چاہے سببی ہو یا غیر سببی۔^①

امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے جو تفصیل بیان کی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جو حقیقی جمع و تطبیق ہے، اس کی رو سے جس نماز کو کوئی حدیث خاص کر دے، وہ پڑھی جاسکتی ہے، دوسری نہیں، جب کہ طلوع آفتاب کے وقت ادا کرنے کے جواز کو صحیحین و سنن کی زیر بحث حدیث خاص کرتی ہے، لہذا اس کو اس وقت ادا کرنا جائز ہے اور بعینہ یہی معاملہ نماز عصر کا بھی ہے، جس کا اسی حدیث اور دیگر احادیث میں تذکرہ موجود ہے، مگر اس کے بارے میں اس کے موقع پر تفصیل ذکر کی جائے گی۔ ان شاء اللہ۔

صحیح مسلم، سنن نسائی، ابن ماجہ، بیہقی اور مسند احمد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک حدیث میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«مَنْ أَدْرَكَ مِنَ الْعَصْرِ سَجْدَةً قَبْلَ أَنْ تَغْرُبَ الشَّمْسُ أَوْ مِنَ الصُّبْحِ قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ فَقَدْ أَدْرَكَهَا»^②

”جس نے غروب آفتاب سے پہلے نماز عصر کا ایک سجدہ یا طلوع آفتاب سے پہلے نماز فجر کا ایک سجدہ بھی پالیا تو اس نے نماز کو پالیا۔“

یہاں سجدے سے مراد بھی رکعت ہی ہے، جیسا کہ ”منتقى الأخبار“ میں علامہ مجد الدین نے لکھا ہے اور علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ نے ”معالم السنن“ میں لکھا ہے:

”سجدے سے مراد رکوع و سجود سمیت پوری رکعت ہے اور رکعت مکمل ہی سجدوں کے ساتھ

① عون المعبود (۲/۸۳) و نیل الأوطار (۲/۲۵)

② صحیح مسلم مع شرح النووي (۳/۵/۱۰۵) الإرواء (۱/۲۷۲) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۵۳۶) عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ، سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۷۰۰) لیکن اس میں «رکعة» کے الفاظ ہیں۔

المنتقى مع النيل (۱/۲۴)

③ فتح الباري (۲/۳۸) المنتقى مع النيل (۱/۲۵)

ہوتی ہے، لہذا اُسے سجدہ کہا گیا ہے۔^(۱)

یہ آخری وقت محض مجبوری کی حالت میں ہے، ورنہ امام نودی نے اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ جان بوجھ کر ان اوقات تک نماز کو موخر کرنا جائز نہیں ہے۔^(۲)

یہ بھی اللہ کی اپنے بندوں پر رحمت ہے۔ اگر کبھی بعض ناگزیر حالات اور مجبوری میں اول وقت گزر جائے تو اس کے بعد آخری وقت تک نماز پڑھ لی جائے، محض لیٹ ہو جانے کی بنا پر چھوڑ نہ دی جائے، لیکن مسنون اور افضل طریقہ یہی ہے کہ نماز فجر اور دیگر نمازیں ان کے اول وقت ہی میں ادا کی جائیں، کیوں کہ نبی اکرم ﷺ کا عمل مبارک یہی تھا کہ آپ ﷺ نے تمام نمازیں ہمیشہ ہی اول وقت میں ادا فرمائی ہیں، سوائے ایک مرتبہ کے اور وہ بھی صرف جواز بتانے کے لیے تھا۔ چنانچہ سنن ترمذی اور مسند احمد میں ایک حدیث ہے، جس کی سند کے بارے میں امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ”وہ متصل نہیں، اور اسے حسن غریب کہا ہے۔ جب کہ وہی حدیث مستدرک حاکم میں بھی ہے اور ہے بھی موصولاً۔ امام حاکم نے اس کی سند کو صحیح بخاری و مسلم کی شرائطِ صحت کے مطابق صحیح قرار دیا ہے۔“^(۳) علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ان کی موافقت کی ہے، لہذا سنن ترمذی کی سند میں جو کمی تھی، وہ مستدرک حاکم والی سند سے پوری ہوگئی۔ اسے امام زیلعی رحمۃ اللہ علیہ نے ”نصب الرایۃ“ میں سنن دارقطنی اور بیہقی کی طرف بھی منسوب کیا ہے اور بعض محدثین کا کلام جرح ذکر کیا ہے۔^(۴)

اس حدیث میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

« مَا صَلَّى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ صَلَاةً لَوْ قَتَلَهَا الْآخِرُ مَرَّتَيْنِ حَتَّى قَبِضَهُ اللَّهُ تَعَالَى »^(۴)

”نبی اکرم ﷺ نے کسی نماز کو اس کے آخری وقت میں دو مرتبہ ہرگز نہیں پڑھا۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ کی روح کو اللہ تعالیٰ نے قبض کر لیا۔“

(۱) ویکس: نیل الأوطار (۲۲/۲/۱) طبع بیروت.

(۲) تحقیق مشکاة المصابیح (۱/۱۹۳)

(۳) نصب الرایۃ (۱/۲۴۴)

(۴) سنن الترمذی مع التحفة (۱/۵۲۱، ۵۲۲) التلخیص (۱/۱۸۳) مشکاة المصابیح (۱/۱۹۳) نصب الرایۃ

(۱/۲۴۴)

یعنی صرف مرتبہ بیان جواز کے لیے آخری وقت میں نماز پڑھی، پھر دوبارہ کبھی نہیں پڑھی۔
خاص نماز فجر کے بارے میں تو صحیح بخاری و مسلم، سنن اربعہ، دارمی، بیہقی، مسند احمد و طیالسی،
معانی الآثار طحاوی، صحیح ابی عوانہ اور مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«كُنَّ نِسَاءَ الْمُؤْمِنَاتِ يَشْهَدْنَ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ صَلَاةَ الْفَجْرِ مُتَلَفَعَاتٍ
بِمُرُوطِهِنَّ ثُمَّ يَنْقَلِبْنَ إِلَى بُيُوتِهِنَّ حِينَ يَقْضِينَ الصَّلَاةَ، لَا يَعْرِفُهُنَّ أَحَدٌ
مِنَ الْعَلَسِ»^①

”مومن عورتیں یعنی صحابیات رضی اللہ عنہن اپنی چادروں میں لپیٹی ہوئی نبی اکرم ﷺ کی اقتدا میں
نماز فجر ادا کرنے کے لیے آتی تھیں اور نماز ادا کر چکنے کے بعد جب وہ اپنے گھروں کو
جاتیں، تو اتنا اندھیرا ہوتا تھا کہ انھیں کوئی پہچان نہیں سکتا تھا۔“

غلس یا اندھیرے ہی میں نماز فجر ادا کرنے کے مسنون ہونے پر دلالت کرنے والی ایک
دوسری حدیث حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، چنانچہ صحیح بخاری، مسلم، ابی عوانہ، سنن نسائی و بیہقی، مسند
احمد و طیالسی اور مصنف ابن ابی شیبہ میں جہاں وہ نمازوں کے اوقات بیان فرماتے ہیں، وہیں وہ
فرماتے ہیں:

«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُصَلِّيهَا بِغَلَسٍ»^②

”نبی اکرم ﷺ فجر کی نماز اندھیرے میں پڑھا کرتے تھے۔“

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بیان کرنے والے راوی فرماتے ہیں کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے یا تو یہ فرمایا
کہ صحابہ رضی اللہ عنہم اندھیرے میں نماز فجر پڑھا کرتے تھے یا پھر یہ فرمایا کہ نبی اکرم ﷺ اندھیرے میں
نماز فجر پڑھا کرتے تھے۔

سنن ابی داؤد، دارقطنی، بیہقی، صحیح ابن حبان اور مستدرک حاکم میں حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ

① صحیح البخاری مع الفتح (۵۴/۲) صحیح البخاری، رقم الحدیث (۵۷۸) صحیح مسلم مع شرح

النووی (۱۴۳/۵/۲، ۱۴۴) صحیح سنن أبی داؤد، رقم الحدیث (۴۰۸) صحیح سنن الترمذی، رقم

الحدیث (۱۳۱) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۵۳۱، ۵۳۲) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۶۶۹) و

سنن الدارمی، رقم الحدیث (۱۲۱۶) إرواء الغلیل (۲۷۸/۱)

② صحیح مسلم مع شرح النووی (۱۴۴/۵/۲) إرواء الغلیل (۲۷۵/۱)

سے مروی حدیث میں ہے:

«وَصَلَّى الصُّبْحَ مَرَّةً بَغْلَسٍ، ثُمَّ صَلَّى مَرَّةً أُخْرَى فَأَسْفَرَ بِهَا، ثُمَّ كَانَتْ صَلَاتُهُ بَعْدَ ذَلِكَ التَّغْلِيسَ حَتَّى مَاتَ وَلَمْ يَعُدْ إِلَى أَنْ يُسْفَرَ»⁽¹⁾

”نبی اکرم ﷺ نے ایک مرتبہ نماز فجر اندھیرے میں پڑھی اور پھر ایک مرتبہ روشنی میں، پھر آپ ﷺ ہمیشہ اندھیرے ہی میں پڑھتے رہے، یہاں تک کہ وفات پائی اور وفات پانے تک دورباہ روشنی میں کبھی نہیں پڑھی۔“

خلفائے راشدین اور عام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے آثار سے بھی پتا چلتا ہے کہ وہ اندھیرے ہی میں فجر کی نماز ادا فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ سنن ابن ماجہ و بیہقی اور معانی الآثار طحاوی میں مغیث بن سہمی بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے ساتھ فجر کی نماز اندھیرے میں پڑھی (جب کہ وہ روشنی پھیلنے پر پڑھتے تھے) جب وہ سلام پھیر چکے تو میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی طرف متوجہ ہوا اور ان سے کہا: یہ کیا نماز ہوئی؟ تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

”هَذِهِ صَلَاتُنَا كَانَتْ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَأَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ“

”نبی اکرم ﷺ، حضرت ابوبکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے ساتھ ہماری فجر کی نماز اسی وقت ہوا کرتی تھی۔“

آگے فرماتے ہیں:

”فَلَمَّا طُعِنَ عُمَرُ، أَسْفَرَ بِهَا عُثْمَانُ“⁽²⁾

”جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو (نماز فجر کے دوران) زخمی کر دیا گیا تو اس کے بعد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے روشنی میں نماز پڑھنا شروع کر دی۔“

یہاں اس بات کی وضاحت بھی کر دیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ابتدائے خلافت میں روشنی ہو جانے پر نماز فجر پڑھی تھی، کیوں کہ حالات ہی کچھ ایسے تھے، جن میں حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کو زخمی کیا

(1) صحیح سنن أبي داود (۸۰/۱) و حسنه الألباني، موارد الظمان، رقم الحديث (۲۷۹) نصب الراية (۱/۲۴۰) وقال في الإرواء (۱/۲۷۰) وقال الحاكم: صحيح، و وافقه الذهبي، و صحيحه الخطابي، و حسنه النووي، وهو الصواب.

(2) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۶۷۱) إرواء الغليل (۱/۲۷۹) نصب الراية (۱/۲۴۰)

گیا، جن کی شہادت بھی اسی حادثے کے نتیجے میں رونما ہوئی اور زخمی کرنے والا بد بخت مسجد کے محراب ہی میں چھپا بیٹھا تھا۔ ان حالات میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جب حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کے بعد خلیفہ مقرر ہوئے تو احتیاطاً کچھ عرصے کے لیے ذرا روشنی (اسفار) میں فجر پڑھنے لگے، لیکن جب حالات سدھر گئے تو انھوں نے بھی معروف سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرتے ہوئے اندھیرے ہی میں نماز ادا کرنا شروع کر دیا، جس کا ثبوت مصنف ابن ابی شیبہ میں مذکور دو آثار سے ملتا ہے، جن میں سے پہلے میں ابوسلمان (یزید بن عبدالملک) بیان کرتے ہیں:

”خَدِمْتُ الرَّكْبَ فِي زَمَانِ عُثْمَانَ فَكَانَ النَّاسُ يُغْلِسُونَ بِالْفَجْرِ“^①

”میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں ایک قافلے کی خدمت کی، وہ لوگ اندھیرے میں نماز فجر پڑھا کرتے تھے۔“

اس کی تائید اس اثر سے بھی ہوتی ہے، جسے عبداللہ بن ایاس اپنے والد کے حوالے سے بیان

کرتے ہیں، جس میں ایاس فرماتے ہیں:

”كُنَّا نَصَلِّي عُثْمَانَ الْفَجْرَ فَنَنْصَرِفُ وَمَا يَعْرِفُ بَعْضُنَا وَجُوهَهُ بَعْضٌ“^②

”ہم حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے ساتھ نماز فجر پڑھا کرتے تھے، پھر جب (نماز کے بعد) ہم لوگ چلتے تو ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کے چہرے کو نہیں پہچان سکتا تھا۔“

ان اور ایسی ہی دیگر احادیث و آثار کے پیش نظر امام ترمذی رضی اللہ عنہ کے بقول صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

میں حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما اور کثیر صحابہ و تابعین کا یہی اختیار ہے کہ منہ اندھیرے ہی نماز فجر ادا کی جائے اور ائمہ میں سے امام شافعی، امام احمد، امام داود، امام ابو ثور اور اسحاق بن راہویہ رضی اللہ عنہم کا بھی یہی قول ہے کہ اندھیرے میں نماز فجر پڑھنا ہی مستحب فعل ہے۔^③

امام ابن قدامہ نے ”المغنی“ میں لکھا ہے کہ صحیح کی نماز اندھیرے میں پڑھنا ہی

افضل ہے۔ امام مالک، امام شافعی اور اسحاق رضی اللہ عنہم کا یہی قول ہے۔ علامہ ابن عبدالبر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں

کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات ابو بکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم سے صحیح سند سے ثابت ہے کہ وہ اندھیرے میں

① مصنف ابن ابی شیبہ بحوالہ إرواء الغلیل (۱/ ۲۷۹)

② حوالہ سابقہ أيضاً.

③ سنن الترمذی مع التحفة (۱/ ۴۷۴، ۴۷۵) بدایة المجتہد (۱/ ۱۳۹، ۱۴۰)

نماز فجر پڑھا کرتے تھے۔^(۱)

یہ محال ہے کہ وہ افضل فعل کو نہ کریں اور ادنیٰ کو اختیار کریں، جب کہ فضائل کو اختیار کرنا تو ان پر بس ہے۔ یہی بات ”کتاب الاعتبار“ میں امام حازمی نے بھی لکھی ہے، جسے دیگر علما کے علاوہ امام زبیلی حنفی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ”نصب الراية“ میں نقل کیا ہے۔^(۲)

امام حازمی رحمۃ اللہ علیہ نے خلفائے ثلاثہ کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اسم گرامی بھی ذکر کیا ہے۔ ایسے ہی حضرت ابن مسعود، ابو موسیٰ اشعری، ابو مسعود انصاری، عبداللہ بن زبیر، عائشہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہم اور تابعین میں سے حضرت عمر بن عبدالعزیز اور عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کا بھی یہی مسلک لکھا ہے کہ یہ سب اندھیرے میں نماز فجر پڑھنے کے قائل تھے۔

اس اندھیرے کا اندازہ کرنے کے لیے کتب حدیث میں ایک مادی وحسی قسم کی دلیل بھی ہے، جس سے فجر کے مستحب وقت (غسل) کو سمجھنے میں کافی آسانی ہو جاتی ہے، چنانچہ بخاری و مسلم، سنن نسائی اور بعض دیگر کتب حدیث میں، حضرت انس اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہما کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سحری کھانا مذکور ہو ہے، اس حدیث میں مذکور ہے کہ جب ان سے پوچھا گیا کہ سحری کھانے سے فراغت اور نماز شروع کرنے کے مابین کتنا وقت تھا تو حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«قَدَرُ مَا يَقْرَأُ الرَّجُلُ خَمْسِينَ آيَةً»^(۳)

”اتنا وقت تھا کہ جس میں کوئی شخص پچاس آیات کی تلاوت کرتا ہے۔“

اس حدیث کی رو سے نماز فجر کا آغاز سحری کا کھانا بند کرنے کے بعد جلد ہی ہو جاتا ہے۔ صرف اتنا فرق کیا گیا ہے کہ جس میں کوئی پچاس آیتیں تلاوت کر سکے اور اسے یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ سحری کھانے کے بعد تقریباً وضو کر سکنے کے بقدر وقت گزرنے کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز فجر ادا فرمائی۔ گویا طلوع فجر کے ساتھ ہی غلّس اندھیرے میں نماز کا ادا کرنا ہی افضل ہے، اسی حدیث سے رمضان یا عام روزے کے لیے سحری سے امساک یا سحری کھانا بند کرنے کے وقت کا بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

(۱) المغنی (۴۴/۲) التمهید (۴/۳۴۰)

(۲) ویکس: نصب الراية (۱/۲۳۹، ۲۴۰) تحفة الأوحدي (۱/۴۷۵)

(۳) صحيح البخاري مع الفتح (۲/۵۴) مختصر صحيح مسلم، رقم الحديث (۵۸۱) صحيح سنن النسائي،

رقم الحديث (۲۰۳۶) المنتقى مع النيل (۲/۱۹)

وقتِ فجر کے سلسلے میں احناف کا مسلک:

نمازِ فجر کے سلسلے میں یہ تو جمہور ائمہ کا مسلک ہے، جب کہ امام ابو خلیفہ رحمۃ اللہ علیہ روشنی ہو جانے پر نمازِ فجر پڑھنے کو افضل سمجھتے ہیں۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کے بقول کئی صحابہ و تابعین بھی اس کے قائل تھے اور سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی قول ہے۔^①

ان کا استدلال سنن ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، دارمی، معجم طبرانی کبیر، مصنف ابن ابی شیبہ، معانی الآثار طحاوی اور مسند احمد میں متعدد طرق اور ملتے جلتے الفاظ سے مروی حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«أَسْفِرُوا بِالْفَجْرِ فَإِنَّهُ أَكْبَرُ لِلْأَجْرِ»^②

”صبح کی نمازِ روشنی میں پڑھو، کیوں کہ یہ زیادہ اجر والی ہے۔“

غسل میں نماز پڑھنے پر دلالت کرنے والی احادیث کے کئی جوابات دیے گئے ہیں، جو سبھی مخدوش ہیں۔ مثلاً یہ کہنا کہ شروع اسلام میں اندھیرے میں نماز پڑھنے کا حکم تھا۔ پھر یہ منسوخ ہو گیا، جیسا کہ معانی الآثار میں امام طحاوی نے لکھا ہے۔^③ لیکن یہ دراصل محض ایک دعویٰ ہے، جس کی کوئی دلیل نہیں، بلکہ غلص میں نماز پڑھنے کی حدیث ثابت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عمر مبارک کے آخری وقت تک اسی پر عمل کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم غیر افضل فعل پر ہیبتگی نہیں کرتے تھے۔ اندھیرے میں نماز پڑھنے پر تادم واپسین ہیبتگی کرنے پر دلالت کرنے والی احادیث ذکر کی جا چکی ہیں۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارک روشنی میں نماز پڑھنے کی تھی اور اس پر صحیح بخاری و مسلم میں مذکور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے استدلال کیا جاتا ہے، جس میں فرماتے ہیں:

«مَا رَأَيْتُ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم صَلَّى صَلَاةً بغيرِ مِيقَاتِهَا إِلَّا صَلَاتَيْنِ، جَمَعَ بَيْنَ

① سنن الترمذی مع التحفة (۱/ ۴۷۹)

② سنن الترمذی مع التحفة (۱/ ۴۷۸) الفتح الرباني (۲/ ۲۷۹) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (۴۰۹)

سنن (۵۳۴) سنن ابن ماجه (۶۷۲) و سنن الدارمي (۱۲۱۷) مشکاة المصابيح (۱/ ۱۹۴) الإرواء (۱/ ۲۸۱، ۲۸۳)

③ نصب الراية (۱/ ۲۳۹، ۲۴۰)

الْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ، بِجَمْعٍ، وَصَلَّى الْفَجْرَ قَبْلَ مَبْقَاتِهَا^(۱)

”میں نے نبی اکرم ﷺ کو دو نمازوں کے سوا بے وقت نماز پڑھتے نہیں دیکھا۔ آپ ﷺ

نے مغرب و عشا کو مزدلفہ میں جمع کر کے پڑھا اور فجر کو اس کے وقت سے پہلے پڑھا۔“

یہاں آپ ﷺ کا نماز فجر کو عام ایام سے ذرا جلدی ادا کرنا مراد ہے، مگر یہ بھی نہیں کہ آپ ﷺ

نے طلوع فجر سے بھی پہلے پڑھ لی، بلکہ آغاز طلوع میں پڑھی گئی اور اس حدیث سے روشنی میں نماز ادا

کرنے کو عام عادت شمار کرنے پر استدلال کرنا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔^(۲)

یہ بھی کہا گیا ہے کہ روشنی کر کے نماز ادا کرنے پر صحابہ کا اجماع ہو گیا تھا۔ اس بات پر حضرت

ابراہیم نخعی رضی اللہ عنہ کا قول بطور دلیل پیش کیا جاتا ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

”مَا اجْتَمَعَ اصْحَابُ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ عَلَى شَيْءٍ مَا اجْتَمَعُوا عَلَى التَّنْوِيرِ^(۳)

”صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کسی معاملے میں اس طرح اکٹھے نہیں ہوئے، جس طرح وہ فجر کو روشنی

میں پڑھنے پر اکٹھے ہوئے۔“

اجماع صحابہ کا یہ دعویٰ بھی باطل ہے، کیوں کہ امام ترمذی رضی اللہ عنہ نے اپنی جامع میں لکھا ہے کہ

اندھیرے میں نماز فجر ادا کرنا کئی صحابہ رسول ﷺ کا اختیار ہے، جن میں صدیق و فاروق رضی اللہ عنہما بھی

شامل ہیں۔ امام ابن قدامہ کی ”المغنی“ اور ”التمہید“ کے حوالے سے ذکر کیا جا چکا ہے کہ

علامہ ابن عبد البر نے لکھا ہے کہ صحیح سند سے ثابت ہے کہ نبی اکرم ﷺ، ابوبکر صدیق، عمر فاروق اور

عثمان غنی رضی اللہ عنہم اندھیرے میں نماز فجر پڑھا کرتے تھے۔ ”کتاب الاعتبار للحازمی“ میں حضرت

علی اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی اندھیرے میں نماز فجر ادا کرنے کا ذکر ہے تو پھر روشنی پر صحابہ کے

اجماع کے دعوے کی کیا حیثیت رہ گئی؟

اسی پر بس نہیں، بلکہ امام طحاوی حنفی نے ”معانی الآثار“ میں حضرت صدیق و فاروق اور

(۱) صحیح البخاری، کتاب الحج، باب من یصلی الفجر بجمع، صحیح مسلم کتاب الحج، باب

استحباب زیاده التغلیس بصلاة الصبح یوم النحر، فتح الباری (۲/ ۵۵) المنتقى (۲/ ۱۹) تحفة

الأحوذی (۱/ ۴۷۹)

(۲) فتح الباری (۲/ ۵۵) تحفة الأحوذی (۱/ ۴۷۹)

(۳) نصب الرایة (۱/ ۳۳۷، ۳۳۸)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے آثار بھی ذکر کیے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اسفار یعنی روشنی میں نہیں، بلکہ غلس (اندھیرے) میں نماز فجر پڑھتے تھے۔^①

اس طرح اجماع صحابہ کے دعوے کا بطلان اور امام بخاری کے قول کا ضعف واضح ہو گیا ہے۔

جمع و تطبیق:

ان دونوں اقوال میں اس بات پر تو سب کا اتفاق ہے کہ نماز فجر کا وقت طلوع فجر ہی سے شروع ہو جاتا ہے اور غلس میں نماز پڑھ لینا جائز ہے اور اسفار میں بھی۔ اختلاف صرف اس بات میں ہے کہ ان دونوں اوقات میں سے افضل کون سا ہے؟ دلائل و براہین آپ کے سامنے آچکے ہیں، جنہیں سامنے رکھنے پر بہ آسانی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اندھیرے میں نماز ادا کرنے کے افضل ہونے پر دلالت کرنے والی احادیث تعداد میں زیادہ اور سند و متن کے اعتبار سے صحیح تر اور قوی ہیں۔ علامہ مبارکپوری رضی اللہ عنہ کے بقول اکثر اہل علم کا یہی مذہب ہے، جیسا کہ ”تحفة الأحوذی“ میں انہوں نے بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے اور اسفار والی حدیث بھی حدیث صحیح ہے، جس کے اہل علم نے متعدد جوابات دیے ہیں۔ امام ترمذی کے بقول امام شافعی، امام احمد اور اسحاق رضی اللہ عنہم نے اسفار کا معنی یہ کیا ہے کہ طلوع فجر کا یقین کر لے، حتیٰ کہ اس میں کوئی شک نہ رہ جائے، مگر کئی روایات سے اس کی نفی ہوتی ہے۔^②

ان ہر دو طرح کی احادیث میں جمع و تطبیق اس طرح ممکن ہے کہ اسفار سے مراد نماز فجر کا آغاز کرنا نہیں، بلکہ صحیح احادیث کی رو سے آغاز تو غلس ہی میں مسنون ہے، البتہ دونوں رکعتوں میں قراءت اتنی طویل ہو کہ نماز کا اختتام اسفار پر ہو۔ «أَسْفَرُوا بِالْفَجْرِ» اور ایسی ہی دیگر احادیث کے الفاظ سے یہی معنی معلوم ہوتا ہے۔ امام طحاوی رضی اللہ عنہ نے معانی الآثار میں اسی مفہوم کی تائید کی اور لکھا ہے کہ امام ابو حنیفہ، ابو یوسف اور امام محمد رضی اللہ عنہم کا یہی قول ہے۔^③

اس تطبیق کا تائید کئی احادیث سے بھی ہوتی ہے، جن میں سے ایک صحیح بخاری اور مسلم، سنن ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ، بیہقی، مسند احمد، مصنف ابن ابی شیبہ اور معانی الآثار طحاوی میں حضرت

① معانی الآثار (ص: ۱۰۴) بحوالہ تحفة الأحوذی (۱/ ۴۸۰)

② ویکس: تحفة الأحوذی (۱/ ۴۸۱) نصب الرایة (۱/ ۲۳۹) الإرواء (۱/ ۲۸۶، ۲۸۷)

③ ویکس: تحفة الأحوذی (۱/ ۴۸۲) إرواء الغلیل (۱/ ۲۸۷)

ابو برزہ سلمیؓ سے مروی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

«كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَنْصَرِفُ مِنَ الصُّبْحِ فَيَنْظُرُ الرَّجُلَ إِلَى وَجْهِ جَلِيسِهِ
الَّذِي يَعْرِفُهُ فَيَعْرِفُهُ»⁽¹⁾

”نبی اکرم ﷺ نماز فجر سے اس وقت فارغ ہوتے کہ آدمی اپنے ساتھ والے جانے
پہچانے آدمی کو دیکھتا تو پہچان سکتا تھا۔“

اس حدیث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ دوسرے ساتھی کو پہچان سکنے والا وقت نماز سے فراغت
کا ہے نہ کہ نماز کے آغاز کا۔ ایک دوسری حدیث سنن نسائی، مسند احمد اور مسند ابویعلیٰ میں حضرت انس
بن مالکؓ سے مروی ہے، جس میں پانچوں نمازوں کے اوقات مذکور ہیں، جن میں نبی اکرم ﷺ
انھیں پڑھا کرتے تھے اور نماز فجر کے سلسلے میں وہ فرماتے ہیں:

«وَالصُّبْحَ إِذَا طَلَعَ الْفَجْرُ إِلَى أَنْ يَنْفَسِحَ الْبَصَرُ»⁽²⁾

”اور صبح کی نماز آپ ﷺ طلوع فجر سے لے کر اس وقت تک ادا فرماتے، جب کافی دور
تک چیزیں دیکھی جاسکتیں، یعنی روشنی پھیل جانے تک۔“

اس حدیث کے الفاظ بھی اس بات کی صریح دلیل ہیں کہ نماز کا آغاز تو اندھیرے میں ہی کرنا
چاہیے، البتہ اس سے فراغت روشنی پھیل جانے پر ہو۔ «أَسْفِرُوا بِالْفَجْرِ» کا یہی معنی ہے۔ امام
طحاوی کے بقول امام ابو حنیفہ اور ان کے دونوں صاحبین کا بھی یہی مسلک ہے، جو سنت رسول ﷺ
کے موافق بھی ہے، پھر معلوم نہیں کہ متاخرین احناف نماز کا آغاز تاخیر سے کیوں کرتے ہیں؟ جب کہ
”المبسوط للسرخسي“ میں بھی مذکور ہے:

«يُسْتَحَبُّ الْغَلَسُ وَتَعْجِيلُ الظُّهْرِ إِذَا اجْتَمَعَ النَّاسُ»⁽³⁾

”جب لوگ اکٹھے ہو جائیں تو فجر کو اندھیرے میں اور ظہر کو جلدی ادا کرنا مستحب ہے۔“

(1) صحیح البخاری مع الفتح، رقم الحدیث (۵۴۷) صحیح مسلم مع شرح النووی (۲/ ۵ / ۴۵، ۱۴۶)

صحیح سنن أبی داود، رقم الحدیث (۲۸۵) إرواء الغلیل (۱/ ۲۸۰)

(2) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۵۳۸) إرواء الغلیل (۱/ ۲۸۰) صحیحہ الألبانی و إسناده أبی یعلیٰ

حسنہ الہیثمی فی مجمع الزوائد (۱/ ۳۰۴)

(3) ویکھیں: تحفة الأحوذی (۱/ ۴۸۳)

”العرف الشذی“ کے مولف نے ”المبسوط“ کے یہ الفاظ ذکر کیے ہیں۔ معانی الآثار میں امام ابو حنیفہ اور صاحبین رضی اللہ عنہم کا قول بھی یقیناً ان کی نظروں سے گزرا ہوگا اور صحیحین و سنن کی احادیث و آثار بھی سامنے ہوں گے، جن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کا عمل مذکور ہے کہ وہ سب غلَس میں نماز کے قائل و فاعل تھے۔ اس کے باوجود ان کا یہ کہنا کہ ترجیح احناف کے مذہب کو حاصل ہے محل نظر ہے۔

البتہ اس کی انہوں نے جو دلیل دی ہے، وہ یہ ہے کہ غلَس والی احادیث فعلی ہیں اور اسفار والی احادیث قولی ہے اور قولی و فعلی اختلاف کی شکل میں قول حدیث مقدم ہوتی ہے، لیکن اہل علم جانتے ہیں کہ یہ اصول صرف اس وقت اختیار کیا جاتا ہے، جب قولی و فعلی حدیث میں جمع و تطبیق ممکن ہی نہ ہو، جب کہ مسئلہ زیر بحث میں تو ایسا نہیں ہے، بلکہ امام طحاوی رضی اللہ عنہ نے وضاحت کی ہے کہ ان ہر دو طرح کی احادیث میں موافقت ممکن ہے۔ کبار علمائے تحقیق میں سے علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ”أعلام الموقعین“ میں اسی موافقت کا ذکر کیا ہے کہ نماز کا آغاز غلَس میں ہو اور اس کی تکمیل اسفار میں، جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل مبارک تھا۔ اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے موافق ہوتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ گمان کیسے کیا جاسکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی ایسے عمل پر مواظبت اور ہمیشگی کی ہو، جس میں اجر عظیم نہ ہو، بلکہ اجر عظیم اس خلاف عمل میں ہو۔^(۱)

اس ساری تفصیل سے نماز فجر کے وقت کی تعیین واضح ہوگئی اور خوب روشنی ہو جانے پر جماعت کھڑی کرنا افضل ہونا ثابت نہیں، بلکہ غلَس یا اندھیرے میں جماعت کھڑی کرنا ہی افضل و اولیٰ ہے۔^(۲) واللہ ولی التوفیق.

نمازِ ظہر:

نمازِ ظہر کا وقت زوالِ آفتاب سے شروع ہو جاتا ہے اور اس وقت تک رہتا ہے، جب تک ہر چیز کا سایہ اس کے برابر یعنی ایک مثل نہ ہو جائے، جیسا کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام والی حضرت جابر رضی اللہ عنہ

(۱) ویکس: تحفة الأحمدي (۱/ ۴۸۲)

(۲) ویکس: معالم السنن للخطابي (۱/ ۲۴۴) سبل السلام (۱/ ۱۰۹) فقہ السنة (۱/ ۱۰۴، ۱۰۵) بداية المجتهد (۱/

۱۳۹، ۱۴۰) نیل الأوطار (۱/ ۲، ۱۷، ۲۰)

سے مروی حدیث میں پہلے دن کی نمازِ ظہر کے بارے میں مروی ہے:

«فَصَلَّى الظُّهْرَ حِينَ زَالَتِ الشَّمْسُ»

”آپ ﷺ نے نمازِ ظہر اس وقت پڑھی، جب کہ سورج سر سے ڈھل گیا۔“

دوسرے دن کی نماز کے بارے میں مروی ہے:

«فَصَلَّى الظُّهْرَ حِينَ صَارَ ظِلُّ كُلِّ شَيْءٍ مِثْلَهُ»

”آپ ﷺ نے ظہر اس وقت پڑھی، جب کہ ہر چیز کا سایہ اس کے مثل یعنی اس کے

برابر ہو گیا تھا۔“

عام حالات میں نمازِ ظہر ہو یا دیگر نمازیں، ان سب کا اوّل وقت میں ادا کرنا ہی افضل ہے، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتب حدیث میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم ﷺ سے پوچھا:

«أَيُّ الْعَمَلِ أَحَبُّ إِلَيَّ اللَّهُ» «اللَّهُ تَعَالَى كَوْزِيَادَهُ مَجْبُوبٌ عَمَلٌ كَوْنُ سَائِبَةٍ؟»

تو نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«الصَّلَاةُ عَلَيَّ وَقْتَهَا»^① ”نماز کو اس کے اول وقت میں ادا کرنا۔“

یہ تو عام حالات کا حکم ہے، البتہ شدید گرمی کے موسم میں نمازِ ظہر کو تھوڑی تاخیر کر کے ادا کرنا

مستحب ہے، کیوں کہ صحیح بخاری شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا اشْتَدَّ الْبَرْدُ، بَكَرَ بِالصَّلَاةِ إِذَا اشْتَدَّ الْحَرُّ أَبْرَدَ بِالصَّلَاةِ»^②

”جب سردی بہت سخت ہو جاتی تو نبی اکرم ﷺ نمازِ ظہر جلدی پڑھ لیتے اور جب گرمی

شدید ہو جاتی تو نمازِ ظہر کو تھوڑی ٹھنڈی کر کے ادا فرماتے تھے۔“

اسی طرح صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما دونوں سے مروی ارشادِ نبوی ہے:

① صحیح البخاری مع الفتح، رقم الحدیث (۵۲۷) صحیح مسلم مع شرح النووي (۱/ ۲/ ۷۳، ۷۴) صحیح

سنن أبي داود، رقم الحدیث (۴۱۱) و لكن عن أم فروة. صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۱۴۵) صحیح

سنن النسائي، رقم الحدیث (۵۹۴) نیل الأوطار (۱/ ۳۰۴) السلسلة الصحيحة، رقم الحدیث (۱۴۸۹)

② صحیح البخاری مع الفتح، رقم الحدیث (۳۳-۵۳۴)

«إِذَا اشْتَدَّ الْحَرُّ فَأَبْرِدُوا بِالصَّلَاةِ فَإِنَّ شِدَّةَ الْحَرِّ مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ»^①

”جب گرمی شدید ہو جائے تو نمازِ ظہر کو دوپہر کے ٹھنڈے ہو جانے پر ادا کرو، کیوں کہ گرمی کی یہ شدت جہنم کے (باہر کو) سانس نکالنے سے ہوتی ہے۔“

صحیح بخاری شریف ہی میں اس مفہوم کی ایک حدیث حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے بھی مروی

ہے، جس میں فرمانِ نبوی:

«أَبْرِدُوا بِالظُّهْرِ فَإِنَّ شِدَّةَ الْحَرِّ مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ»

”نمازِ ظہر کو ٹھنڈا کر کے پڑھو، کیوں کہ گرمی کی یہ شدت جہنم کے سانس لینے سے ہے۔“

صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم لوگ ایک سفر میں

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے۔ موذن نے ظہر کی اذان کہنا چاہی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَبْرِدُوا أَوْ قَالَ: «إِنْتَظِرُوا إِنْتَظِرُوا»

”ٹھنڈا کرو۔“ یا فرمایا: ”انتظار کرو، یعنی گرمی کم ہونے دو۔“

ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ یہی حکم فرمایا:

«حَتَّىٰ رَأَيْنَا فِي التُّلُولِ» ”یہاں تک کہ ہم نے دیکھا کہ ٹیلوں کا سایہ نظر آنے لگا ہے۔“

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ گرمی کی شدت جہنم کے سانس لینے سے ہے، لہذا جب گرمی شدید

ہو جائے تو نمازِ ظہر کو ذرا ٹھنڈا کر لیا کرو، یعنی وقت سے ذرا موخر کر لیا کرو۔^② یہاں ٹھنڈا کرنے کا مطلب کچھ تاخیر کرنا ہے، مگر اس کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں کہ نماز کو اتنا موخر کر دیا جائے کہ اس پر عصر کا گمان ہونے لگے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے ”فتح الباری شرح صحیح البخاری“ میں ظہر کو ٹھنڈا

کر کے پڑھنے کی حدود کے بارے میں ائمہ و علما کے مختلف اقوال ذکر کیے ہیں:

❁ کسی نے کہا ہے کہ زیادہ سے زیادہ کسی چیز کا سایہ اس کے ذاتی سائے کے علاوہ ایک ہاتھ ہو جائے۔

❁ کسی نے قد کا چوتھائی۔

① صحیح البخاری مع الفتح (۱۵ / ۲)

② صحیح البخاری مع الفتح (۲ / ۱۸، ۲۰)

کسی نے ایک تہائی۔

امام مازری کے بقول ان میں سے مختلف اوقات و حالات میں مختلف حدود مراد لی جاسکتی ہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ یہ حدود نمازِ ظہر کے آخری وقت کو نہ جا پہنچیں کہ وہ ظہر کے بجائے عصر محسوس ہونے لگے (جیسا کہ ہمارے پاک و ہند میں عموماً دیکھنے میں آتا ہے)

گرمی کے ایام میں نمازِ ظہر کو تھوڑا تاخیر سے ادا کیا جائے اور عام حالات میں اسے اول وقت میں ادا کرنا ہی افضل ہے اور اس کا اول وقت سورج کا سر سے ڈھل جانا ہے۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام والی حدیث اور دیگر احادیث میں جو زوالِ آفتاب کے ساتھ ہی اول وقت کے آغاز اور کسی چیز کے سائے کے ایک مثل ہو جانے تک اس کے آخری وقت کا ذکر ہے، ان کے پیش نظر امام مالک، شافعی، احمد بن حنبل اور عام محدثین کرام رحمہم اللہ نے اسی مسلک کو اختیار کیا ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے دونوں شاگردوں امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ کا بھی یہی مسلک ہے اور ایک روایت کی رو سے تو خود امام صاحب کا بھی یہی مسلک ہے، لیکن مشہور قول کے مطابق امام صاحب کا مسلک یہ ہے کہ ظہر کا وقت تب تک رہتا ہے، جب تک ہر چیز کا سایہ دو گنا نہ ہو جائے۔ ان کا استدلال حضرت انس و ابو ذر رضی اللہ عنہما سے مروی ان احادیث سے ہے، جن میں نمازِ ظہر کو ٹھنڈا کر کے ادا کرنے کا حکم ہے، مگر وہ روایات چونکہ مخصوص حالات اور صرف شدید گرمی کے ایام کے بارے میں ہیں، لہذا ان سے اس مسئلے پر استدلال کرنا صحیح نہیں ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ خود علمائے احناف مثلاً حضرت مولانا محمد زکریا سہارنپوری رحمہ اللہ نے ”الکوکب الدری“ میں لکھا ہے کہ احتیاط یہ ہے کہ ظہر کو ایک مثل سے پہلے پہلے ہی پڑھ لیا جائے۔^(۱)

نمازِ ظہر کو موسمِ گرما میں کتنا موخر کیا جاسکتا ہے؟ اس کا کچھ اندازہ سنن ابی داؤد و نسائی اور مستدرک حاکم میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے ہوتا ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

« كَانَتْ قَدْرُ صَلَاةِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ الظُّهْرَ فِي الصَّيْفِ ثَلَاثَةَ أَقْدَامٍ إِلَى خَمْسَةِ أَقْدَامٍ وَفِي الشِّتَاءِ خَمْسَةَ أَقْدَامٍ إِلَى سَبْعَةِ أَقْدَامٍ »^(۲)

”نبی اکرم ﷺ کی نمازِ ظہر کا اندازہ یہ ہوتا ہے کہ گرمیوں میں انسان کا سایہ تین قدم

(۱) الکوکب الدری (۱/۹۰، ۹۱) بحوالہ فقہ السنۃ اردو، محمد عاصم (۱/۱۰۷)

(۲) سنن ابی داؤد مع العون (۲/۷۲، ۷۳) المشکاة مع المرعاة (۲/۳۷) صحیح سنن النسائی للالبانی

حدیث (۴۸۹)

سے لے کر پانچ قدم تک کے مابین ہوتا تھا اور موسم سرما میں پانچ سے سات قدم تک کے مابین ہوتا تھا۔“

امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ سندھی نے حاشیہ سنن ابو داؤد و نسائی میں وضاحت فرمائی ہے کہ جس انسان کا سایہ دیکھنا ہو تو وہ اسی کے قد کا ٹھ اور قدم کی لمبائی کے مطابق ہوگا اور اصل و زائد دونوں سایوں کا مجموعہ اتنا ہو، جب کہ اصلی سایہ (فنی) سے مراد وہ سایہ ہے جو سورج کے عین سر پر ہوتے اور عام طور عام پر مشاہدہ میں آنے والی بات بھی ہے کہ موسم سرما میں سایہ لمبا ہوتا ہے بنسبت گرما کے۔ امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مختلف اقلیم و ممالک میں سائے کی یہ مقدار کم و بیش ہوتی ہے، کیوں کہ جن ممالک میں سورج جتنا بلند ہوگا، اتنا ہی وہاں سایہ کم ہوگا اور جہاں سورج جتنا سر سے دور ہوگا، وہاں سایہ لمبا ہوگا اور مکہ و مدینہ اقلیم ثانی میں شمار ہوتے ہیں اور سائے کی اس مقدار کا اندازہ بھی وہیں کا ہے اور دوسری اقلیم میں یہ کم و بیش ہوگا۔^(۱)

اور ہر ملک میں زوال معلوم کرنے کے لیے علامہ شمس الحق ڈیانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ”عون المعبود شرح سنن أبي داؤد“ میں ایک ضابطہ بھی وضع کیا ہے، جس کی تفصیل مذکورہ مقام پر دیکھی جاسکتی ہے۔ ”المراقبة شرح المشكاة“ میں ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ سبکی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

”ابو داؤد اور نسائی کی حدیث کے معنی میں علما کے مابین اختلاف ہے اور میرے نزدیک اس کا معنی یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم موسم گرما میں نمازِ ظہر کو اس کا آدھا وقت گزر جانے کے بعد ادا فرمایا کرتے تھے۔“^(۲)

اس کا معنی یہ ہوا کہ ان کے نزدیک نمازِ ظہر کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اتنا انتظار کیا جائے کہ کسی بھی چیز کا سایہ اس سے آدھا ہو جائے۔ بالفاظ دیگر چھ فٹ کی چیز کا سایہ تین فٹ ہو جائے، مگر یہ صرف انتہائی شدید گرمی کے دو تین ماہ کے لیے ہے۔ عام حالات میں نہیں۔

ظہر و عصر کا وقت معلوم کرنے کا طریقہ:

ظہر و عصر کا وقت معلوم کرنے کے بارے میں احادیث میں جو کسی چیز کے سائے کے ایک

(۱) عون المعبود (۲/ ۵۳)

(۲) مصدر سابق.

مش یا دو مش ہو جانے کا ذکر آتا ہے تو اس سے وقت معلوم کرنا کوئی مشکل امر نہیں ہے۔ آج اگرچہ گھڑی اور کیلنڈر کا زمانہ ہے۔ سایہ ناپنے کی کے ضرورت ہو سکتی ہے؟ مگر درحقیقت کیلنڈروں پر جو اوقاتِ ظہر و عصر لکھتے ہیں، وہ بھی تو اسی طریقے سے وقت دیکھ دیکھ کر مہینوں اور سالوں کے تجربات کے نتائج ہی سے لکھے جاتے ہیں۔ بہر حال وقت دیکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ زوالِ آفتاب سے پہلے پہلے کسی کھلی اور ہموار جگہ پر کوئی لکڑی وغیرہ گاڑ دیں۔ اس لکڑی کا سایہ آہستہ آہستہ کم ہونا شروع ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ نصف النہار یعنی عین دوپہر کے وقت بالکل معمولی سا رہ جائے گا۔ یہ دراصل اس چیز کا اصل سایہ کہلاتا ہے۔ جب یہ سایہ دوسری جانب بڑھنا شروع ہو جائے تو وہ اس بات کی علامت ہے کہ زوالِ آفتاب شروع ہو گیا ہے یا بالفاظِ دیگر نماز کے اول وقت کا آغاز ہو گیا ہے۔ پھر جب یہ سایہ اس قدر بڑھ جائے کہ زوال کے وقت والا لکڑی کا اصل سایہ منہا کرنے کے بعد اس لکڑی کے برابر ہو گیا تو یہ ایک مشل وقت ہو جائے گا، جو نمازِ ظہر کا آخری وقت ہے، یعنی اس سے پہلے ظہر پڑھ لینی چاہیے۔

نمازِ عصر کا وقت اور ایک اشکال کا حل:

ایک مشل سے جب سایہ بڑھنا شروع ہوگا تو نمازِ عصر کا اول وقت شروع ہو جائے گا اور جب دو گنا یا دو مشل ہوگا تو جبرائیل علیہ السلام والی حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کی رو سے یہ نمازِ عصر کا آخری وقت ہوگا۔

یہاں ایک اشکال یا شبہہ پیش آتا ہے، جو اس طرح ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے دن جب نمازِ عصر پڑھی تو ہر چیز کا سایہ اس کے برابر یعنی ایک مشل تھا اور دوسرے دن جب ظہر کا آخری وقت دکھانے کے لیے نمازِ ظہر پڑھی، تو وہ بھی اسی وقت تھی، جب کہ سایہ ایک مشل تھا تو گویا دونوں نمازوں کے اول و آخر وقت میں اشتراک ہو گیا اور کوئی حد فاصل نہ ہوئی۔ امام نووی اور شوکانی رحمۃ اللہ علیہما نے لکھا ہے کہ اکثر اہل علم کے نزدیک نمازِ ظہر و عصر کے اوقات میں باہم کوئی اشتراک نہیں ہے، اس پر صحیح مسلم، سنن ابو داؤد، نسائی اور مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث سے استدلال کیا گیا ہے، جس میں وہ بیان فرماتے ہیں:

”وَقُتُّ الظُّهْرَ إِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ، وَكَانَ ظِلُّ الرَّجُلِ كَطَوِيلِهِ مَا لَمْ

يَحْضُرُ الْعَصْرُ^①

”ظہر کا وقت زوالِ آفتاب سے لے کر آدمی کا سایہ اس کے برابر ہو جانے تک ہے، جب کہ ابھی ظہر نہ ہوئی ہو۔“

اس طرح «مَا لَمْ يَحْضُرِ الْعَصْرُ» کے الفاظ نے مسئلہ واضح کر دیا کہ نمازِ ظہر و عصر کے اوقات میں کوئی اشتراک نہیں ہے۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام والی حدیثِ جابر رضی اللہ عنہ کا جواب بھی دیا گیا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ دوسرے دن آپ ﷺ نمازِ ظہر سے اس وقت فارغ ہو گئے، جب کسی چیز کا سایہ اس کے برابر ہوا اور پہلے دن آپ ﷺ نے اس وقت نمازِ عصر کا آغاز فرمایا، جب کسی چیز کا سایہ اس کی ایک مثل کے برابر تھا۔^②

اس طرح دونوں نمازوں کے اوقات میں کوئی باہمی اشتراک نہ رہا اور یہ شبہہ زائل ہو گیا۔ حدیثِ جابر رضی اللہ عنہ کی رو سے نمازِ عصر کا آخری وقت کسی چیز کے سائے کا دو مثل ہو جانا ذکر ہوا ہے، جب کہ صحیح مسلم، سنن ابو داؤد، نسائی اور مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث کی ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں:

«وَقْتُ صَلَاةِ الْعَصْرِ مَا لَمْ تَصْفَرَ الشَّمْسُ»^③

”نمازِ عصر کا وقت اس وقت تک ہے، جب تک سورج کا رنگ زرد نہ ہو جائے۔“

ایک دوسری روایت میں ہے:

«وَوَقْتُ صَلَاةِ الْعَصْرِ مَا لَمْ تَصْفَرَ الشَّمْسُ وَيَسْقُطْ قَرْنُهَا الْأَوَّلُ»^④

”اور عصر کا وقت تب تک ہے، جب تک سورج کا رنگ زرد نہ پڑ جائے اور اس کا پہلا

کنارہ (انق میں) نہ بیٹھ جائے۔“

① صحیح مسلم مع شرح النووي (۱۱۲/۵/۳) صحیح سنن أبي داود، رقم الحديث (۳۸۳) صحیح سنن النسائي، رقم الحديث (۵۰۸) النيل (۱/۱/۳۰۳)

② شرح صحیح مسلم للنووي (۱۱۰/۵/۳) نيل الأوطار (۱/۱/۲۰۲، ۳۰۳)

③ صحیح مسلم مع شرح النووي (۱۱۲/۵/۲) صحیح سنن أبي داود، رقم الحديث (۳۸۳) صحیح سنن النسائي، رقم الحديث (۵۰۸)

④ صحیح مسلم مع شرح النووي (۱۱۳/۵/۲) مع النيل (۱/۱/۳۰۶)

صحیح بخاری و مسلم، صحیح ابی عوانہ، سنن ترمذی، نسائی، بیہقی، دارمی، مسند احمد، موطا امام مالک اور

معانی الآثار طحاوی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«وَمَنْ أَدْرَكَ رَكْعَةً مِنَ الْعَصْرِ قَبْلَ أَنْ تَغْرُبَ الشَّمْسُ فَقَدْ أَدْرَكَ الْعَصْرَ»^①

”اور جس نے غروب آفتاب سے پہلے نماز عصر کی ایک رکعت بھی پڑھی، اس نے عصر

کی نماز پالی۔“

صحیح بخاری میں ارشاد نبوی کے الفاظ ہیں:

«وَإِذَا أَدْرَكَ أَحَدُكُمْ سَجْدَةً مِنْ صَلَاةِ الْعَصْرِ قَبْلَ أَنْ تَغْرُبَ الشَّمْسُ

فَلَيْتِمَّ صَلَاتَهُ»^②

”جس نے غروب آفتاب سے پہلے ایک سجدہ بھی کر لیا، پس اسے چاہیے کہ اب اپنی نماز

پوری کر لے۔“

جب کہ صحیح مسلم، سنن نسائی، ابن ماجہ، مسند احمد، منقلی ابن الجارود، سنن بیہقی اور معانی الآثار

میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی ایک حدیث اسی مفہوم کی مروی ہے، جس میں ارشاد نبوی ہے:

«مَنْ أَدْرَكَ مِنَ الْعَصْرِ سَجْدَةً قَبْلَ أَنْ تَغْرُبَ الشَّمْسُ أَوْ مِنَ الصُّبْحِ قَبْلَ

أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ فَقَدْ أَدْرَكَهَا»^③

”جس نے غروب آفتاب سے پہلے نماز عصر کا ایک سجدہ یا طلوع آفتاب سے پہلے نماز فجر

کا ایک سجدہ کر لیا تو اس نے نماز کو پالی۔

ان الفاظ کے بارے میں امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان کا ظاہری معنی مراد نہیں اور اس پر

پوری امت کے علما کا اتفاق ہے کہ ایک رکعت کو پانے والا پوری نماز کو پانے والا نہیں کہ اسے صرف

ایک ہی رکعت سے پوری نماز ملی جائے اور وہی ایک رکعت اسے کافی ہو، ایسا ہرگز نہیں، بلکہ یہاں

① صحیح البخاری مع الفتح، رقم الحدیث (۵۷۹) صحیح مسلم مع شرح النووي (۲/ ۵ / ۱۰۴، ۱۰۵)

صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۳۴۷) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۵۰۳) و سنن الدارمی،

رقم الحدیث (۱۲۲۲) مشکاة المصابیح (۱۹ / ۱) المنتقی مع النیل (۱ / ۲۴ / ۱) الإرواء (۱ / ۲۷۳)

② صحیح البخاری مع الفتح (۲ / ۵۶)

③ مصنف ابن أبي شيبة بحواله إرواء الغلیل (۱ / ۲۷۹)

ان الفاظ کی تاویل ضروری ہے۔ مذکورہ الفاظ کے ساتھ ہی بعض دیگر الفاظ کو یہاں محذوف کیا گیا ہے، جنہیں شامل کرنے سے عبارت یوں ہوئی:

”فَقَدْ أَدْرَكَ حُكْمَ الصَّلَاةِ أَوْ وُجُوبَهَا أَوْ فَضْلَهَا“^(۱)

”اس نے نماز کے حکم کو یا وجوب کو یا (ادا کرنے کی) فضیلت کو پایا۔“

یہ بھی کہا گیا ہے:

”إِنَّهُ أَدْرَكَ الْوَقْتَ“ ”اس نے (اس نماز کے) وقت کو پایا۔“

شرح بخاری میں لکھا ہے کہ یہ جمہور کا قول ہے۔ نسائی شریف میں اس حدیث کے الفاظ ہیں:

»فَقَدْ أَدْرَكَ الصَّلَاةَ كُلَّهَا إِلَّا أَنَّهُ يَقْضِي مَا فَاتَهُ«^(۲)

”اس شخص نے پوری نماز کو پایا۔ البتہ وہ فوت شدہ نماز قضا (کمل) کر لے گا۔“

ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ جس نے غروب آفتاب سے پہلے ایک رکعت پڑھ لی اور

بقیہ رکعتیں غروب آفتاب کے بعد پڑھ کر نماز کو مکمل کر لیا، اس کی عصر فوت نہیں ہوئی۔ الفاظ یہ ہیں:

»مَنْ صَلَّى رُكْعَةً مِنَ الْعَصْرِ قَبْلَ أَنْ تَغْرُبَ الشَّمْسُ، وَصَلَّى مَا بَقِيَ بَعْدَ

غُرُوبِ الشَّمْسِ لَمْ تَفْتَهُ صَلَاةُ الْعَصْرِ«^(۳)

”جس نے غروب آفتاب سے پہلے عصر کی ایک رکعت پڑھ لی اور باقی نماز (تین رکعتیں)

غروب آفتاب کے بعد پڑھی (مکمل کر لیں) تو اس کی نماز عصر فوت نہیں ہوئی۔“

نماز فجر کی طرح ہی جمہور ائمہ و فقہاء کے نزدیک تو اس طرح نماز عصر صحیح و مکمل ہو جاتی ہے،

حتیٰ کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک اگرچہ یہ ہے کہ نماز عصر کا آخری وقت سورج کے زرد پڑ جانے

تک ہے، جب کہ ان کے نزدیک بھی ایسی نماز، جس کے دوران ہی سورج غروب ہو جائے، وہ نماز

باطل نہیں ہوتی۔^(۴)

(۱) شرح صحیح مسلم مع النووی (۱۰۵ / ۵ / ۳)

(۲) فتح الباری (۵۶ / ۲)

(۳) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۵۴۴)

(۴) مسند أحمد (۲۵۴ / ۲) بحوالہ المعجم الفہرس لا الفاظ الحدیث (۲۰۵ / ۵)

(۵) شرح صحیح مسلم للنووی (۱۰۶ / ۵ / ۳)

یاد رہے کہ ان احادیث میں جو ایک سجدہ پالینے کا ذکر ہے، اس سے مراد ایک رکعت ہے، جیسا کہ ”المنتقی“ میں علامہ المجد ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے لکھا ہے اور علامہ خطابی رحمہ اللہ نے ”معالم السنن“ میں لکھا ہے کہ سجدے سے مراد رکوع و سجود سمیت پوری رکعت ہے اور ایک رکعت مکمل ہی دوسرے سجدے سے ہوتی ہے۔ لہذا رکعت کو سجدہ کہا گیا ہے۔^(۱)

یاد رہے کہ غروب آفتاب کے وقت نماز عصر ادا کرنا محض مجبوری کی شکل میں ہے، ورنہ امام نووی رحمہ اللہ نے اس بات پر اجماع نقل ہے کہ جان بوجھ کر اس وقت نماز موخر کرنا جائز نہیں ہے۔^(۲) بلکہ بلا عذر و مجبوری نماز عصر کو غروب آفتاب کے قریب تک موخر کرنا منافق کی نماز شمار کیا گیا ہے، جیسا کہ صحیح مسلم، سنن ابو داؤد، ترمذی، نسائی، موطا امام مالک اور مسند احمد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

«تِلْكَ صَلَاةُ الْمُنَافِقِ يَجْلِسُ حَتَّىٰ إِذَا كَانَتِ الشَّمْسُ بَيْنَ قَرْنَيْ الشَّيْطَانِ قَامَ فَتَقَرَّ أَرْبَعًا لَا يَذْكُرُ اللَّهَ فِيهَا إِلَّا قَلِيلًا»^(۳)

”یہ منافق کی نماز ہے کہ بیٹھا رہے اور سورج کا انتظار کرتا رہے۔ یہاں تک کہ جب سورج شیطان کے دو سینگوں کے مابین (ڈوبنے کے قریب) ہوتا ہے تو وہ اٹھتا ہے اور چار ٹھونگے مار لیتا ہے اور کم ہی اللہ کا ذکر کرتا ہے۔“

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بلا عذر غروب آفتاب کے قریب تک نماز کو موخر کرنا مکروہ ہے اور ایسی نماز کو منافق کی نماز کہا گیا ہے، کیوں کہ وہ خشوع، خضوع اور سکون و اطمینان سے خالی نماز ادا کرے گا، جس میں مناسب ذکر الہی بھی نہیں کر پائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے آدمی کی مذمت آئی ہے۔

نماز عصر کو جلدی ادا کرنا:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز عصر بہت جلدی ادا فرمایا کرتے تھے۔

(۱) فتح الباری (۲/۳۸) المنتقی (۱/۲۲)

(۲) شرح صحیح مسلم للنووی (۳/۱۰۶/۵) المنتقی (ص: ۳۰۸، ۲۲)

(۳) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۱۳۷) و صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۴۹۷) صحیح مسلم (۱۲/۳/۵۳) صحیح سنن أبي داؤد، رقم الحدیث (۳۹۹) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۱۳۷) المغنی (۲/۱۶) المنتقی مع النيل (۱/۳۰۷)

چنانچہ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«كُنَّا نَصَلِّي مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ الْعَصْرَ ثُمَّ تَنَحَّرُ الْجَزُورُ فَتُقَسَّمُ عَشْرُ قِسْمٍ ثُمَّ تُطْبَخُ فَنَأْكُلُ لَحْمًا نَضِيجًا قَبْلَ مَغِيبِ الشَّمْسِ»⁽¹⁾

”ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز عصر پڑھتے، پھر اونٹ ذبح کرتے اور اس کے گوشت کو دس حصوں میں تقسیم کرتے، پھر ہم گوشت پکاتے اور کھاتے، جب کہ ابھی سورج غروب نہ ہوا ہوتا۔“

ایک دوسری حدیث صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان فرماتے ہیں کہ ہمیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز عصر پڑھائی۔ تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بنی سلمہ کا کوئی آدمی آیا اور کہنے لگا: اے اللہ کے رسول! ہم اونٹ ذبح کرنا چاہتے ہیں اور ہماری خواہش ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ٹھیک ہے۔ چل دیے۔ ہم بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ ہم نے دیکھا کہ ابھی اونٹ ذبح کیے گئے اور پھر (ہمارے پہنچنے پر) انھیں ذبح کیا گیا۔ انھیں کاٹا گیا، یعنی گوشت بنایا گیا، پھر ان کا گوشت پکایا گیا، پھر ہم نے وہ کھایا، جب کہ ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا۔⁽²⁾

ان دونوں حدیثوں میں مذکور ہے کہ عصر کے بعد اونٹ ذبح کیے، گوشت کو بنایا پکایا اور کھایا، جب کہ سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کتنی جلدی اول ہی وقت میں عصر ادا فرمایا کرتے تھے۔ نماز عصر جلدی ادا کرنے پر دلالت کرنے والی احادیث صحیح بھی ہیں اور صریح بھی۔ مثلاً صحیحین میں اور سنن ترمذی کے علاوہ سنن اربعہ میں بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يُصَلِّي الْعَصْرَ، وَالشَّمْسُ مُرْتَفِعَةٌ حَيْثُ فَيَذْهَبُ الدَّاهِبُ إِلَى الْعَوَالِي فَيَأْتِيهِمْ، وَالشَّمْسُ مُرْتَفِعَةٌ»⁽³⁾

”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز عصر اس وقت ادا فرماتے، جب کہ سورج ابھی بلند خوب روشن ہوتا

(1) صحیح مسلم مع شرح النووي (۱۲۵/۵/۳) مختصر صحیح البخاری للألبانی، رقم الحدیث (۱۱۳۹)

و المنتقى مع النيل (۳۱۰/۱/۱) مشکاة المصابيح تحقيق الألباني، رقم الحدیث (۶۱۵)

(2) صحیح مسلم مع شرح النووي (۱۲۴/۵/۳) والمنتقى أيضاً (۳۱۰/۱)

(3) صحیح البخاری مع الفتح، رقم الحدیث (۵۵۰) صحیح مسلم مع شرح النووي (۱۲۱/۵/۲) صحیح

سنن أبي داود، رقم الحدیث (۳۹۱) صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (۳۹۳) سنن ابن ماجه، رقم

الحدیث (۶۸۲) سنن الدارمي، رقم الحدیث (۱۲۰۸)

تھا اور جانے والا (عصر پڑھ کر) عوالی مدینہ کی طرف جاتا اور ان کے پاس پہنچ جاتا، جب کہ سورج ابھی بلند ہوتا تھا۔“

بخاری شریف میں یہ الفاظ بھی ہیں:

”وَبَعْضُ الْعَوَالِي مِنَ الْمَدِينَةِ عَلَى أَرْبَعَةِ أَمْيَالٍ أَوْ نَحْوِهِ“^①
 ”بعض عوالی مدینہ طیبہ سے چار میل یا اس سے کم و بیش کے فاصلے پر تھیں۔“

یاد رہے کہ عوالی مدینہ سے مراد وہ دیہات یا بستیاں ہیں، جو مدینے کے مضافات میں نجد کی جانب واقع تھیں، جن میں سے بعض سنن دارقطنی کی حدیث کے مطابق چھ میل پر اور مصنف عبدالرزاق کی ایک روایت کی رو سے دو میل پر تھیں، جب کہ قاضی عیاض، علامہ ابن عبد البر اور امام ابن الاثیر رحمہم نے سب سے زیادہ مسافت والی ہستی کو مدینے سے آٹھ میل کہا ہے۔^② اس حدیث سے بھی بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ آپ ﷺ کتنی جلدی نماز عصر پڑھ لیا کرتے تھے۔

مختلف احادیث میں تطبیق:

پچھلے اوراق میں ایک حدیث ذکر کی گئی ہے، جس کی رو سے غروب آفتاب کے قریب تک تاخیر کر کے ادا کی جانے والی نماز کو ”منافق کی نماز“ قرار دیا گیا ہے اور اس کے بعد چند اور احادیث بھی ذکر کی گئی ہیں، جن میں منقول ہے کہ نبی اکرم ﷺ جلدی نماز عصر پڑھا کرتے تھے اور ان میں سے پہلے کی احادیث میں سے ایک میں نماز عصر کا آخری وقت کسی چیز کے سائے کا دو مثل ہو جانا مذکور ہوا ہے۔ ایک دوسری روایت میں سورج کے زرد ہو جانے تک اور تیسری روایت میں سورج کا ایک کونا ڈوبنے تک اور ایک چوتھی روایت میں غروب آفتاب سے پہلے کم از کم ایک رکعت پڑھ لینے تک ہے۔

ان متعدد روایات میں مذکور مختلف تین شکلوں کا امکان ہے:

(1) پہلی یہ کہ بعض کوناخ اور بعض دیگر کو منسوخ مانا جائے، مگر یہ شکل صرف اس صورت میں اپنائی جاسکتی ہے، جب کہ مختلف احادیث میں مطابقت ممکن نہ ہو اور یہاں مطابقت ممکن ہے۔

① صحیح البخاری مع الفتح (۲۸ / ۲) المنتقى مع النيل (۱ / ۱) / ۳۰۹ صحیح مسلم (۳ / ۵ / ۱۲۱، ۱۲۲)

② فتح الباری (۲ / ۲۸، ۲۹)

﴿2﴾ دوسری شکل یہ ہے کہ بعض احادیث کو رائج اور بعض دوسری احادیث کو مرجوح قرار دیا جائے، لیکن اس کی بھی یہاں ضرورت نہیں، بلکہ اس سے بھی اولیٰ یہ ہے کہ ان احادیث میں مطابقت پیدا کی جائے۔

﴿3﴾ اور یہ تیسری شکل ممکن بھی ہے، بلکہ اس کے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں اور وہ یوں ہے کہ حدیث جبرائیل جس میں عصر کا وقت کسی چیز کا سایہ ایک مثل ہو جانے سے لے کر دو مثل ہو جانے تک بیان ہوا ہے، اس میں صرف ”وقت اختیار“ کا ذکر آیا ہے۔ اس حدیث میں ”وقت جواز“ اور ”وقت اضطرار“ یا مجبوری سب کا استیعاب نہیں کیا گیا، اس جمع و تطبیق کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے، جس میں آخری وقت کی نماز کو منافق کی نماز کہا گیا ہے، جب کہ وہ معذور و مجبور نہ ہو، لیکن معذوری اور مجبوری والے کی نماز ایک رکعت پڑھ سکے تو گویا جو شخص معذور و مجبور ہو، اس کے لیے تو نماز عصر کا وقت اس حد تک ہے اور ایسا نہیں، اس کے لیے وقت صرف کسی چیز کے سائے کے دو مثل ہو جانے تک ہی ہے، جب کہ سورج ابھی سفید اور شفاف ہو اور اگر وہ بلا عذر ہی اسے سورج کے زرد ہونے تک یا اس سے بھی بعد تک مؤخر کر دے گا، تو پھر وہ منافق کی نماز ہو جائے گی۔^①

اسی قسم کی مطابقت امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح مسلم شریف کی شرح میں بھی ذکر کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہمارے اصحاب کے نزدیک نماز عصر کے پانچ اوقات ہیں:

- ① وقت فضیلت، جو نماز عصر کا اول وقت ہے۔
- ② وقت اختیار، جو کسی چیز کا سایہ دو گنا ہو جانے تک ہے۔
- ③ وقت جواز بلا کراہت، جو سورج کے زرد پڑ جانے سے پہلے پہلے تک ہے۔
- ④ جواز مع الکراہت، جو سورج زرد پڑ جانے سے لے کر غروب آفتاب تک ہے۔
- ⑤ وقت عذر، یہ وقت اس شخص کے لیے ہے جو سفر یا بارش کے عذر کی بیان پر نماز ظہر و عصر کو جمع کر کے ادا کرنا چاہے۔ (جب کہ جمع تقدیم ہوگی کہ نماز عصر کو مقدم کر کے، یعنی اس کے وقت سے پہلے نماز ظہر کے ساتھ اسی کے وقت میں اسے ادا کیا جائے)۔

① نیل الأوطار (۱/ ۳۰۶)

ان پانچوں اوقات میں نماز ادا ہوگی۔ اگر ان میں سے کوئی بھی نہ ہو، بلکہ سورج غروب ہو گیا ہو تو پھر وہ قضا ہوگی۔^(۱)

امام ابن قدامہ نے ”المغنی“ میں لکھا ہے کہ جب کسی چیز کا سایہ دوگنا ہو جائے تو عصر کا وقت اختیار ختم ہو گیا اور صحیح تر روایت کی رو سے امام احمد رحمہ اللہ کا قول یہ نقل کیا ہے کہ ان کے نزدیک عصر کا آخری وقت اختیار سورج زرد ہونے تک ہے اور غروب آفتاب سے پہلے ایک رکعت پانا وقتِ اضطرار ہے۔^(۲)

نماز عصر کا اوّل وقت:

یہیں یہ بات بھی ذکر کر دیں کہ جمہور اہل علم کے نزدیک نماز عصر کا اوّل وقت کسی کے سائے کا ایک مثل ہو جانا ہے۔ امام احمد، امام مالک اور امام محمد رحمہم اللہ بھی ان میں شامل ہیں اور صحیح احادیث سے اسی مسلک اوّل کی تائید ہوتی ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک بھی ایک مثل والا ہی ہے۔ البتہ وہ ایک مثل سے تھوڑا زیادہ سایہ ہو جانے کا اوّل وقت کہتے ہیں۔ قاضی ابو یوسف جو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے معروف اور ارشد تلامذہ میں سے ہیں، ان کا مسلک بھی جمہور والا ہی ہے اور ایک روایت کے مطابق تو خود امام صاحب رحمہ اللہ کا بھی یہی مسلک ہے، لیکن مشہور روایت کی رو سے امام صاحب کا مسلک یہ ہے کہ عصر کا وقت اس وقت شروع ہوتا ہے، جب کسی چیز کا سایہ اس سے دوگنا ہو جائے۔^(۳) اس قول کی تائید کسی حدیث سے نہیں ہوتی اور جو بعض روایات ملتی ہیں، وہ محدثین کرام کے نزدیک ضعیف اور ناقابلِ حجت ہیں۔ چنانچہ سنن ترمذی میں امام صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ عصر کو مؤخر کر کے پڑھنے کے بارے میں حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے ایک مرفوع حدیث مروی ہے، مگر وہ صحیح نہیں۔^(۴) ترمذی شریف کی شرح میں علامہ مبارکپوری نے وضاحت کی ہے کہ حضرت رافع رضی اللہ عنہ والی وہ حدیث سنن دارقطنی و بیہقی میں مروی ہے، جس کے بارے میں انھوں نے امام دارقطنی، بیہقی اور بخاری رحمہم اللہ

(۱) شرح صحیح مسلم للنووی (۳/۵/۱۱۰، ۱۱۱)

(۲) المغنی (۲/۱۵، ۱۶)

(۳) الكواکب الدرّی (۱/۱۹۰) بحوالہ فقہ السنّة اردو (۸/۱۰۸)

(۴) سنن الترمذی مع التحفة (۱/۴۹۴)

کی شدید جرح بھی نقل کی ہے، لہذا وہ قابلِ حجت نہ ہوئی۔^①

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے موطا میں لکھا ہے کہ ہمارے نزدیک عصر کو موخر کر کے پڑھنا جلدی پڑھنے سے افضل ہے، جب کہ سورج ابھی سفید و شفاف ہو اور اس میں زردی داخل نہ ہوئی ہو۔ عام آثار میں یہی آیا ہے اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی مسلک ہے۔ صاحب ہدایہ وغیرہ نے اس تاخیر کے افضل ہونے کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ اس طرح نوافل زیادہ پڑھے جاسکتے ہیں۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے ان الفاظ اور اس وجہ پر تعاقب کرتے ہوئے علامہ عبدالحی حنفی رحمۃ اللہ علیہ "التعلیق الممجد علیٰ موطا الإمام محمد رحمۃ اللہ علیہ" میں لکھتے ہیں کہ صحاح ستہ اور دیگر کتب حدیث میں ایسی احادیث مروی ہیں، جو نماز عصر کو جلد ادا کرنے کی فضیلت پر دلالت کرتی ہیں اور یہ مذکورہ وجہ یا علت صحیح نصوص کے مقابلے میں (ان کے خلاف) ہے۔

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے "البنایۃ شرح الہدایۃ" میں عصر کو تاخیر سے پڑھنے کی فضیلت پر چار روایات سے استدلال کیا ہے، جن میں سے ایک تو یہی ہے، جس کی طرف ابھی ہم نے اشارہ کیا ہے کہ وہ ضعیف ہے اور دوسری حدیث سنن ابو داؤد میں ہے، جس میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وہ مدینے میں آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم تاخیر سے نماز عصر پڑھتے تھے، جب کہ اس حدیث کے ایک راوی یزید کو تقریب، الخلاصہ اور میزان الاعتدال میں مہول کہا گیا ہے، لہذا یہ حدیث ضعیف اور ناقابلِ استدلال ہے۔^②

تیسری حدیث سنن ترمذی میں امّ المؤمنین حضرت امّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔^③ چوتھی حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ علامہ عبدالحی حنفی رحمۃ اللہ علیہ نے "التعلیق الممجد" میں ان دونوں یعنی تیسری اور چوتھی حدیث کو بھی تاخیر عصر کی فضیلت کی دلیل ہونے میں صریح قرار نہیں دیا اور صحیح و صریح احادیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نماز کو جلد پڑھنا ثابت ہے۔ ایسے ہی بعض دیگر روایات و آثار بھی ہیں، جو یا صحیح نہیں یا صریح نہیں۔ جس کی تفصیل "التعلیق الممجد" یا "تحفۃ الأحوذی" (۱/ ۴۹۴، ۵۰۲) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

① تحفۃ الأحوذی (۱/ ۴۹۵)

② ویکس: تحفۃ الأحوذی (۱/ ۴۹۵)

③ سنن الترمذی مع التحفۃ (۱/ ۴۹۸)

وقتِ مغرب:

نمازِ فجر و ظہر اور عصر کے اوقات کے بارے میں تفصیل ذکر کی جا چکی ہے اور اب آئیے وقتِ مغرب بھی دیکھیں تو نمازِ مغرب کا اول وقت اور آخر وقت حدیثِ جبرائیل میں تو غروبِ آفتاب ہی ہے، کیوں کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کی آمد پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں دن ایک ہی وقت پر نمازِ مغرب ادا کی تھی، جیسا کہ تفصیل گزر چکی ہے، لیکن جیسا کہ یہ بات بھی ذکر کی جا چکی ہے کہ اس حدیث میں صرف ”وقتِ اختیار“ کا بیان ہے۔ وقتِ جواز اور وقتِ اضطرار اس میں شامل نہیں، جس کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، نسائی اور مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ پنجگانہ کے جو اوقات ذکر فرمائے ہیں، وہاں نمازِ مغرب کے بارے میں ارشادِ نبوی ہے:

«وَوَقْتُ صَلَاةِ الْمَغْرِبِ مَا لَمْ يَغِبِ الشَّفَقُ»^(۱)

”نمازِ مغرب کا وقت اس وقت تک ہے، جب تک شفق غائب نہ ہو جائے۔“

ایسے ہی حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث صحیح مسلم، سنن ابی داؤد، نسائی، صحیح ابی عوانہ، سنن دارقطنی اور مسند احمد میں ہے۔ اس میں بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سائل کو دو دن کی نمازیں پڑھ کر بتائی تھیں اور ہر نماز کے دو یعنی اول و آخر وقت بتائے تھے۔ اس حدیث میں بھی نمازِ مغرب کے آخری وقت کے بارے میں وضاحت موجود ہے کہ دوسرے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے آخری وقت میں ادا فرمایا تھا۔ چنانچہ اس حدیث میں ہے:

«ثُمَّ آخَرَ الْمَغْرِبَ حَتَّىٰ كَانَ عِنْدَ سُقُوطِ الشَّفَقِ»^(۲)

”پھر (دوسرے دن) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب کو اتنا موخر کر دیا کہ شفق غائب ہونے کے

قریب پڑھی۔“

(۱) صحیح مسلم (۲/۵/۱۲) المشكاة مع المراجعة (۲/۱۷) صحیح سنن ابی داؤد، رقم الحدیث (۳۸۳)

صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (۵۰۸)

(۲) صحیح مسلم مع شرح النووي (۲/۵/۱۱۶) صحیح سنن ابی داؤد، رقم الحدیث (۳۸۱) صحیح سنن

النسائي، رقم الحدیث (۵۰۹)

شفق اس سُرخی کو کہتے ہیں، جو غروبِ آفتاب کے بعد کچھ وقت کے لیے آسمان پر باقی رہتی ہے۔ اس کے بارے میں ایک حدیث بھی ہے، جو سنن دارقطنی میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

«الشَّفَقُ الحُمْرَةُ» ^(۱) ”شفق سُرخی ہے۔“

یہ حدیث امام بیہقی نے اپنی سنن میں بھی روایت کی ہے اور مرفوع کے بجائے اس کا موقوف ہونا صحیح قرار دیا ہے کہ یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نہیں، بلکہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ نیز امام بیہقی نے کہا ہے کہ حدیث ابن عباس عبادہ بن صامت، شداد بن اوس اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی (مرفوعاً) مروی ہے، مگر ان میں سے کوئی روایت بھی صحیح نہیں گویا یہ حدیث مرفوعاً ضعیف اور موقوفاً صحیح ہے۔

ذکورہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، امام عطاء، مجاہد، سعید بن جبیر، شافعی، ابن ابی لیلیٰ، ثوری، اسحاق بن راہویہ، زہری، ابو یوسف اور محمد رحمہم اللہ شفق سے سُرخی ہی مراد لیتے ہیں۔ ائمہ لغت میں سے خلیل بن احمد اور فرّاء کا بھی یہی قول ہے اور ”القاموس المحیط“ میں علامہ فیروز آبادی نے بھی شفق کا معنی صرف سُرخی ہی لکھا ہے۔

امیر صنعانی نے ”سبل السلام“ میں لکھا ہے کہ شفق کے معنی کی بحث لغوی ہے اور اس میں رجوع اہل لغت کی طرف ہی جائے گا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اہل لغت تھے، لہذا ان کا کلام اگرچہ موقوف ہے، لیکن حجت ہے۔ علامہ عبید اللہ رحمانی نے ”المرعاة شرح المشکاة“ میں امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ سے بھی شفق کا معنی سُرخی ہی نقل کیا ہے۔ البتہ ”نبیل الأوطار“ میں امام شوکانی نے امام احمد کا قول یوں نقل کیا ہے کہ امام احمد کے نزدیک شفق سے مراد صحراء میں سُرخی ہے اور آبادی میں سفیدی، جب کہ اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے شفق سے مراد سفیدی ہی کیا ہے، لیکن صحیح تر بات حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ہی کی ہے کہ شفق سے مراد سُرخی ہے۔

اس حدیث کی استنادی حیثیت اور شفق کے معنی کی تفصیل ”المغنی“ (۲/ ۷۲۵) ”نبیل الأوطار“ (۱/ ۲/ ۹) ”المرعاة شرح المشکاة“ (۲/ ۱۷، ۱۸) ”سبل السلام شرح بلوغ المرام“ (۱/ ۱/ ۱۱۴، ۱۱۵) اور دیگر کتب میں دیکھی جاسکتی ہے۔ جب کہ ”ضعیف الجامع“ (۱/ ۲/ ۹) المنتقی مع النبیل (۱/ ۲/ ۹)

الصغیر“ (۲/ ۳/ ۲۷۵) میں علامہ البانی نے اس حدیث کو مرفوعاً ضعیف قرار دیا ہے۔ ”المراقبة شرح المشكاة“ میں ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ فتویٰ اسی پر ہے کہ شفق سے مراد سُرخی ہے۔ درمختار میں بھی سُرخی ہی لکھا گیا ہے اور ”صدر الشریعة“ نے بھی یہی فتویٰ دیا ہے۔ ”المواہب“ میں بھی اسی پر فتویٰ بتایا گیا ہے اور ”البرہان“ میں بھی سُرخی کو ترجیح دی گئی ہے اور ”شروح المجمع“ وغیرہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ خود امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنے پہلے قول یعنی سفیدی سے رجوع کر لیا تھا۔ گویا ان کے نزدیک بھی شفق سے مراد سُرخی ہی ہے۔ یوں معاملہ طے ہو گیا کہ چاروں ائمہ مذاہب شفق سے مراد سُرخی ہونے پر متفق ہیں۔ الحمد للہ نمازِ مغرب کا وقت غروبِ آفتاب سے شفق نمایاں ہونے تک ہے، لیکن یہ تاخیر عذر اور مجبوری والے کے لیے روا ہے، ورنہ اول وقت ہی میں نمازِ مغرب پڑھنا افضل ہے، کیوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل مبارک یہی تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم غروبِ آفتاب کے فوراً بعد روشنی ہی میں نمازِ مغرب پڑھ لیا کرتے تھے۔ چنانچہ صحیح بخاری، مسلم، ابوعوانہ، سنن بیہقی، مسند احمد اور مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت رافع رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

« كُنَّا نَصَلِّي الْمَغْرِبَ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَيَنْصَرِفُ أَحَدُنَا وَإِنَّهُ لَيَبْصُرُ مَوَاقِعَ نَبْلِهِ»^(۱)

”ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس وقت نمازِ مغرب پڑھتے کہ نماز پڑھ کر ہم میں سے کوئی نکلتا تو تیر چھینکنے پر وہ اپنے تیر کے گرنے کی جگہ دیکھ سکتا تھا، یعنی ابھی اتنی روشنی ہوتی تھی۔“ صحیح بخاری و مسلم، سنن ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ میں حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَانَ يُصَلِّي الْمَغْرِبَ إِذَا غَرَبَتِ الشَّمْسُ، وَتَوَارَتْ بِالْحِجَابِ»^(۲)

”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مغرب کی نماز اس وقت پڑھا کرتے تھے، جب سورج غروب ہوتا اور اس کی ٹکلیا چھپ جاتی۔“

(۱) صحیح البخاری مع الفتح (۲/ ۴۰) صحیح مسلم مع شرح النووي (۳/ ۱۳۶/ ۵) الإرواء (۱/ ۲۷۷)

(۲) حوالہ جات بالا، صحیح البخاری مع الفتح، رقم الحدیث (۵۵۹) صحیح مسلم مع شرح النووي (۲/ ۱۳۶/ ۵)

(۱/ ۲/ ۳) المنتقى مع النيل

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ دونوں حدیثیں اس بات کی دلیل ہیں کہ غروبِ آفتاب کے بعد نمازِ مغرب کو جلد پڑھ لینا چاہیے، اس بات پر اجماع ہے اور جن احادیث میں شفق کے غائب ہونے پر نمازِ مغرب پڑھنے کا ذکر ہے، وہ بیانِ جواز کے لیے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ کسی سائل کے جواب میں تھیں اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ کے بارے میں ہیں، جن پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل قائم رہے، لہذا ان پر اعتماد نہیں ہوگا۔^(۱)

اہل بیتِ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی احادیث میں سے ایک صحیح بخاری، مسلم، ابی عوانہ، سنن ابی داؤد اور دیگر کتب میں مذکور ہے، جس میں ۷۴ھ میں حجاج بن یوسف ثقفی کے امیر بن کر مدینہ آنے کے وقت کا واقعہ درج ہے۔ چنانچہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے پوتے حضرت محمد بن عمرو بن حسن بن علی رضی اللہ عنہم بیان کرتے ہیں کہ جب حجاج آیا تو ہم نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے نمازوں کے اوقات کے بارے میں پوچھا۔ صحیح مسلم میں حجاج کی موجودگی میں اس سوال کا سبب بھی لکھا ہے:

”كَانَ الْحَجَّاجُ يُؤَخِّرُ الصَّلَاةَ“ ”حجاج نماز میں تاخیر کیا کرتا تھا۔“

لہذا اسے تنبیہ کرنے کے لیے یہ سوال پوچھا گیا تو اس وقت حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کی نماز پنجگانہ کا جو وقت بتایا، اس میں نمازِ مغرب کے بارے میں فرمایا:

«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُصَلِّي الْمَغْرِبَ إِذَا غَرَبَتِ الشَّمْسُ»^(۲)

”نبی اکرم نمازِ مغرب اسی وقت پڑھ لیا کرتے تھے، جب سورج غروب ہوتا۔“

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے سنن ابن ماجہ، صحیح ابن خزیمہ اور مستدرک حاکم میں مروی ایک مرفوع حدیث ہے، جسے امام ترمذی نے موقوفاً صحیح کہا ہے اور بعض محدثین نے اسے منکر بھی کہا ہے، لہذا یہ قابلِ استدلال نہ بھی مانی جائے تو کم از کم صحیحین اور سنن والی پہلی احادیث کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے، جس کے الفاظ ہیں:

«لَا تَزَالُ أُمَّتِي عَلَى الْفِطْرَةِ مَا لَمْ يُؤَخَّرُوا الْمَغْرِبَ حَتَّى تَشْتَبِكَ النُّجُومُ»^(۳)

(۱) شرح النووي (۱۳۶/۵/۳)

(۲) صحیح البخاری مع الفتح (۴۱/۲) صحیح مسلم مع شرح النووي (۱۴۴/۵/۳) سنن ابی داؤد، رقم الحدیث (۳۹۷)

(۳) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۶۸۹) نیل الأوطار (۵۰۴/۲/۱)

”میری امت اس وقت تک فطرتِ سلیمہ پر رہے گی، جب وہ ستاروں کی جھلمل جھلمل کرنے تک نمازِ مغرب کو موخر نہ کیا کریں گے۔“

بالکل اسی مفہوم بلکہ انہی الفاظ والی ایک حدیث سنن ابو داؤد، مسند احمد اور مستدرک حاکم میں بھی ہے، جو حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اس کی سند میں محمد بن اسحاق ہیں، جنہوں نے تحدیث کی بھی صراحت کی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس حدیث میں ہے:

«لَا تَزَالُ أُمَّتِي بِخَيْرٍ» أَوْ قَالَ: «عَلَى الْفِطْرَةِ»^①

”میری امت بہتری سے رہے گی، اور فطرتِ سلیمہ پر رہے گی۔“

اور پہلی میں ہے:

«لَا تَزَالُ أُمَّتِي عَلَى الْفِطْرَةِ» ”میری امت ہمیشہ فطرتِ سلیمہ پر رہے گی۔“

جب کہ اسی موضوع کی کئی اور احادیث بھی ہیں تو پھر اندازہ فرمائیں کہ اہل بیت رضی اللہ عنہم کی مرویات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ غروبِ آفتاب کے فوراً بعد ستاروں کے جگگانے سے پہلے نماز پڑھنا فطرتِ سلیمہ کا تقاضا ہے، مگر آج کچھ لوگ (حبِ اہل بیت رضی اللہ عنہم سے سرشاری کے دعوے دار) اذانِ مغرب کے لیے ستارہ نظر آنے کے منتظر رہتے ہیں!!

وقتِ عشا:

فجر و ظہر اور عصر و مغرب کے اوقات ذکر کیے جا چکے ہیں۔ آئیے اب نمازِ عشا کے اوّل و آخر وقت کی تعیین بھی احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں کریں، چنانچہ حضرت جبرائیل علیہ السلام والی حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں مذکور ہے کہ عشا کا وقت شفق کے غائب ہونے سے شروع ہوتا ہے اور ایک تہائی رات یا نصف شب تک رہتا ہے، چنانچہ اس حدیث میں پہلے دن کی نمازِ عشا کے بارے میں یہ الفاظ ہیں:

«فَصَلَّى الْعِشَاءَ حِينَ غَابَ الشَّفَقُ»

”آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عشا کی نماز تب پڑھی، جب شفق (یعنی شام کی سُرخ) غائب ہوئی۔“

دوسرے دن کی نمازِ عشا کے بارے میں یہ الفاظ ہیں:

① صحیح سنن أبي داود، رقم الحديث (۳۰۴)

«ثُمَّ جَاءَهُ الْعِشَاءَ حِينَ ذَهَبَ نِصْفُ اللَّيْلِ أَوْ قَالَ: ثُلُثُ اللَّيْلِ فَصَلَّى الْعِشَاءَ»

”پھر (دوسرے دن) حضرت جبرائیل علیہ السلام نمازِ عشا کے لیے اس وقت آئے، جب کہ

آدھی رات یا فرمایا کہ ایک تہائی رات گزر چکی تھی۔ تب آپ ﷺ نے نمازِ عشا پڑھی۔“

اس حدیث کے علاوہ بعض دیگر احادیث میں نمازِ عشا کے آخری وقت کی صراحت آئی ہے۔

مثلاً صحیح بخاری و مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«أَخَّرَ النَّبِيُّ ﷺ صَلَاةَ الْعِشَاءِ إِلَى نِصْفِ اللَّيْلِ ثُمَّ صَلَّى»⁽¹⁾

”نبی اکرم ﷺ نے نمازِ عشا کو نصف شب تک موخر کر کے ادا فرمایا۔“

صحیح احادیث میں شطر اللیل، قریب من نصف اللیل اور نصف اللیل الاوسط کے الفاظ ہیں۔ صحیح

مسلم، سنن ابی داؤد، نسائی اور مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما والی حدیث میں بھی یہ

صراحت ہے:

«فَإِذَا صَلَّيْتُمُ الْعِشَاءَ فَإِنَّهُ وَقْتُ إِلَى نِصْفِ اللَّيْلِ»⁽²⁾

”جب تم عشا کی نماز پڑھو تو اس کا وقت نصف رات تک ہے۔“

جب کہ صحیح مسلم، سنن ابی داؤد کے علاوہ سنن اربعہ، مسند احمد اور منشی ابن الجارود میں حضرت

بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں جو نبی اکرم ﷺ کی نمازِ پنجگانہ کے اوقات بیان ہوئے ہیں، ان

میں نمازِ عشا کے بارے میں یہ الفاظ ہیں:

«وَصَلَّى الْعِشَاءَ بَعْدَ مَا ذَهَبَ ثُلُثُ اللَّيْلِ»⁽³⁾

”آپ ﷺ نے نمازِ عشا (دوسرے دن) ایک تہائی رات گزرنے کے بعد ادا فرمائی۔“

اور صحیح مسلم میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے:

«ثُمَّ أَخَّرَ الْعِشَاءَ حَتَّىٰ كَانَ ثُلُثَ اللَّيْلِ الْأَوَّلِ»⁽⁴⁾

(1) صحیح البخاری مع الفتح (۵۱/۲) صحیح مسلم مع شرح النووی (۱۴۰، ۱۳۹/۵/۳)

(2) صحیح مسلم مع شرح النووی (۱۱۳، ۱۱۲، ۱۱۱/۳) نیز دیکھیں: صحیح مسلم مع شرح النووی (۵/۲)

(3) صحیح سنن ابی داؤد، رقم الحدیث (۳۸۳) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۵۰۸)

مشكاة المصابيح (۱۸۴/۱) المنتقى مع النيل (۳۱۰/۱/۱)

(4) صحیح مسلم مع النووی (۱۱۵، ۱۱۴/۵/۳) مشكاة مع المرعاة (۲۰/۲)

(4) صحیح مسلم مع شرح النووی (۱۱۶/۵/۳)

آپ ﷺ نے (دوسرے دن) نمازِ عشا کو اتنا موخر کیا کہ رات کا ایک تہائی حصہ گزر گیا تو نماز پڑھی۔“

ان احادیث میں سے بعض میں نصف اور بعض میں ثلث کا ذکر ہے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح مسلم میں ان کے مابین تطبیق یوں دی ہے کہ ایک رات گزرنے کے بعد آپ ﷺ نے نمازِ عشا کا آغاز کیا اور آدھی رات پر جا کر ختم کی، لہذا دونوں طرح کی احادیث میں کوئی اختلاف نہ رہا، نیز ان کا کہنا ہے کہ صحیح تر قول کے مطابق امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نمازِ عشا کا وقت اختیار نصف شب تک ہی رہتا ہے۔^(۱) پھر حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما والی حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ نصف رات تک تو نمازِ عشا کا وقت اختیار رہے، جب کہ وقتِ جواز طلوعِ فجر ثانی (یا طلوعِ صبح صادق) تک رہتا ہے، کیوں کہ حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ”صحیح مسلم، باب من نسی صلاةً أو نام“ کی حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

«إِنَّهُ لَيْسَ فِي النَّوْمِ تَقْرِبُطٌ، إِنَّمَا التَّقْرِبُطُ عَلَى مَنْ لَمْ يُصَلِّ الصَّلَاةَ حَتَّىٰ يَجِيءَ وَوَقْتُ الصَّلَاةِ الْآخَرَىٰ»^(۲)

نیند میں تقصیر اور گناہ نہیں ہے، گناہ یہ ہے کہ کوئی شخص اگلی نماز کا وقت ہو جانے تک کوئی نماز ہی ادا نہ کرے۔“

یہ الفاظ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت فرمائے تھے، جب آپ ﷺ اور سارا لشکر نمازِ فجر سے سوئے رہ گئے تھے اور صبح سورج کی گرمی نے سب کو اٹھایا تھا۔ یاد رہے کہ یہ حدیث سنن اربعہ اور مسند احمد میں بھی ہے، مگر اس میں اگلی نماز تک کسی نماز کو نہ پڑھنے کا ذکر نہیں ہے۔

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ والی حدیث کے الفاظ: «حَتَّىٰ يَجِيءَ وَوَقْتُ الصَّلَاةِ الْآخَرَىٰ» کی رو سے جمہور علما کا مسلک یہ ہے کہ فجر تک عشا کا وقت رہتا ہے، جب کہ بعض اہل علم و تحقیق نے کہا ہے کہ نصف شب گزرنے کے بعد نماز ادا نہیں، بلکہ قضا ہوگی۔^(۳)

فتح الباری شرح صحیح بخاری میں حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے امام نووی کی یہی بات نقل کی ہے اور

(۱) شرح صحیح مسلم للنووي (۳/ ۵/ ۱۱۶، ۱۱۷)

(۲) شرح صحیح مسلم (۳/ ۵/ ۱۱۱) المرعاة (۲/ ۴۵)

(۳) ویکس: المشكاة مع المرعاة (۲/ ۲۲، ۴۵)

لکھا ہے کہ اس حدیث میں جو عموم ہے، وہ نمازِ فجر کے بارے میں اجماع امت سے مخصوص ہے، یعنی نمازِ فجر کا وقت صرف طلوعِ آفتاب تک رہتا ہے نہ کہ نمازِ ظہر تک۔ طلوعِ آفتاب کے بعد وہ قضا ہوگی اور جن حضرات نے کہا ہے کہ نمازِ عشا کا آخری وقت ادا نصف رات تک ہے، فجر تک نہیں، وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ عشا کی نماز نصف شب والی احادیث کی وجہ سے خاص ہے، لہذا اس کا وقت بھی نمازِ فجر تک نہیں رہتا، جیسا اصطخری نے کہا ہے۔^(۱)

محلّی میں علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس میں اس بات کی دلیل تو نہیں کہ عشا کا وقت نمازِ فجر تک رہتا ہے یا ہر نماز کا وقت اگلی نماز تک رہتا ہے، بلکہ تمام علمائے امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ فجر کا وقت صرف طلوعِ آفتاب تک رہتا ہے، نہ کہ ظہر تک۔^(۲)

یہی معاملہ نمازِ عشا کا بھی ہے کہ نصف شب تک ہی اس کا وقت رہتا ہے۔ امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے ”نبیل الأوطار“ میں تو یہی موقف اختیار کیا ہے کہ عشا کا آخری وقت فجر تک ہے، یعنی وقتِ اختیار نصف شب تک اور وقتِ جواز و اضطرار فجر تک ہے۔^(۳) جب کہ ”السیل الجرار“ (۱/ ۱۸۳) بحوالہ ”تمام المنّة“ (ص: ۱۴۲) میں امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے، اسی طرح انھوں نے ”الدرر البھیة“ میں رات کے نصف تک ہی عشا کا آخری وقت شمار کیا ہے۔ علامہ نواب صدیق حسن خان نے بھی ”الروضۃ الندیة شرح الدرر البھیة“ میں ان کی موافقت ہی ظاہر کی ہے، کیوں کہ انھوں نے ان کے مذکورہ الفاظ پر کوئی تعاقب نہیں کیا۔^(۴)

”بداية المجتهد“ (۱/ ۱۸۳) میں علامہ ابن رشد رحمۃ اللہ علیہ نے امام مالک کا ایک قول یہی روایت کیا ہے، جو اصطخری (یکے از شافعیہ) ابن حزم، شوکانی، علامہ صدیق حسن خان والی بھوپال اور شیخ البانی کا اختیار ہے۔ ثلثُ اللیل، نصف اللیل، شطر اللیل اور قریب من نصف اللیل کے الفاظ والی احادیث جو حضرت جابر، انس، عبداللہ بن عمرو بن عاص، بریدہ اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہم سے

(۱) فتح الباری (۲/ ۵۱، ۵۲) و انظر: المجموع (۳/ ۴۰)

(۲) انظر المحلّی (۲/ ۱۷۸، ۱۷۹)

(۳) ویکیس: نبیل الأوطار (۱/ ۱۱)

(۴) ویکیس: الروضة الندیة (۱/ ۷۰) طبع دار المعرفة، بیروت.

مروی ہیں اور ابھی ہم نے ذکر کی ہیں اور ان کے علاوہ بھی متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی احادیث اسی مفہوم کی کتب حدیث میں موجود ہیں، ان سب سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اگلی نماز تک بچھلی نماز کے وقت کی توسیع کے عموم کو یہ خاص کر دیتی ہیں اور عشا کا آخری وقت نصف شب تک طے کر دیتی ہے۔ علامہ عبدالرحمن مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ نے ترمذی شریف کی بے نظیر شرح ”تحفة الأحوذی“ میں فجر تک نماز عشا کا وقت ماننے والوں کے دلائل کا بھرپور جائزہ لیا ہے اور یہ فیصلہ دیا ہے کہ صحیح و صریح احادیث کی رو سے عشا کا آخری وقت آدھی رات تک ہی ہے۔^(۱)

اس مسلک کی تائید موطا امام مالک، معانی الآثار طحاوی اور محلی ابن حزم میں صحیح سند کے ساتھ مروی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اس مکتوب گرامی سے بھی ہوتی ہے، جس میں انھوں نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو لکھا تھا:

”وَأَنْ صَلَّيَ الْعِشَاءَ مَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ ثُلُثِ اللَّيْلِ، وَإِنْ أَخْرَجْتَ فَإِلَى شَطْرِ اللَّيْلِ وَإِلَّا تَكُنْ مِنَ الْعَافِيْنَ“^(۲)

”نماز عشا ایک تہائی رات تک پڑھ لیا کرو، اگر اس سے بھی تاخیر کرو تو آدھی رات تک پڑھ لیا کرو، وگرنہ تم غافلوں میں سے ہو جاؤ گے۔“

کتب حدیث میں مروی بعض احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اندازہ ہوتا ہے کہ نماز عشا کو موخر کر کے ادا کرنا چاہیے۔ لیکن اس کے اوّل و آخر وقت میں سے کون سا افضل ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ کیا تھی؟ اب اس کا مختصر تذکرہ ملاحظہ فرمائیں۔

نماز عشا کا افضل وقت:

اوقات نماز پنج گانہ کے سلسلے میں نماز عشا کے وقت کی تعیین بھی احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رو سے ذکر کی جا چکی ہے اور یہ بات بھی گزر چکی ہے کہ نماز عشا کا وقت غروب شفق سے شروع ہو جاتا ہے اور نصف شب تک رہتا ہے، جیسا کہ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہے:

(۱) النبیل (۱/۲، ۱۰، ۱۳)

(۲) تحفة الأحوذی (۱/۵۰۴، ۵۰۵)

(۳) المحلی (۲/۳، ۱۸۵) وصححه الألبانی فی تمام المنة (ص: ۱۴۲) موطأ الإمام مالک مع تنویر الحوالک (۱/۲۵) دار الکتب العلمیة.

«كَانُوا يُصَلُّونَ الْعَتَمَةَ فِيمَا بَيْنَ أَنْ يَغِيبَ الشَّفَقُ إِلَى ثُلُثِ اللَّيْلِ الْأَوَّلِ»^①
 ”صحابہ کرام رضی اللہ عنہم غروبِ شفق اور ایک تہائی رات گزرنے کے مابین نمازِ عشا ادا کیا کرتے تھے۔“

جب کہ بعض دیگر احادیث میں نصف اللیل کے الفاظ بھی ہیں۔ اب رہی یہ بات کہ نماز عشا کے اوّل و آخر اوقات میں سے افضل کون سا ہے تو اس سلسلے میں اہل علم کے دو قول ہیں:

اوّل وقت:

علماء کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ نمازِ عشا کے اوّل و آخر اوقات میں سے بھی اوّل وقت ہی افضل ہے اور اس پر ان کا استدلال ان احادیث سے ہے، جن میں اول وقت میں نمازوں کو ادا کرنے کو افضل اعمال میں سے شمار کیا گیا ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم کی متفق علیہ حدیث میں، جو صحیح ابن حبان، ابن خزیمہ اور سنن بیہقی میں بھی مروی ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم ﷺ سے پوچھا:

”أَيُّ الْأَعْمَالِ أَفْضَلُ؟“ ”افضل عمل کون سا ہے؟“

تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«الصَّلَاةُ عَلَى وَفْتِهَا»^② ”نماز کو اس کے وقت پر ادا کرنا۔“

ایک جگہ ہے:

«الصَّلَاةُ فِي أَوَّلِ وَفْتِهَا»^③ ”نماز کو اس کے اوّل وقت میں ادا کرنا۔“

میں نے پوچھا: اس کے بعد؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«بِرُّ الْوَالِدَيْنِ» ”ماں باپ کی خدمت کرنا۔“

میں نے کہا: اس کے بعد؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

① صحیح البخاری مع الفتح، رقم الحدیث (۲۶۹) المنتقى (۱۱/۲/۱) فقہ السنة (۱۰۲/۱)

② صحیح البخاری مع الفتح، رقم الحدیث (۵۲۷) مختصر صحیح مسلم للمنذري، رقم الحدیث (۲۲۶)

موارد الظمان، رقم الحدیث (۲۸۰)

③ فتح الباری (۱۰/۲)

«الْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ»^(۱) ”اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں افضل اعمال میں سب سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان باللہ کو شمار کیا ہے۔ صاحب ”فتح الباری“ لکھتے ہیں کہ ان ہردو میں سے کوئی تضاد تعارض نہیں، کیونکہ امام ابن دقیق العید کے بقول ابن مسعود رضی اللہ عنہ میں بدنی اعمال مذکور ہیں، جب کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ایمان باللہ کا ذکر ہے تو وہ قلبی اعمال میں سے ہے۔^(۲)

ایک حدیث سنن ابو داؤد، نسائی، موطا امام مالک اور صحیح ابن حبان میں مروی ہے، جس میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

« خَمْسٌ صَلَوَاتٍ افْتَرَضَهُنَّ اللَّهُ عَزَّوَجَلَّ، مَنْ أَحْسَنَ وَضُوئَهُنَّ وَصَلَّاهُنَّ لَوْ قَتِهِنَّ وَأَتَمَّ رُكُوعَهُنَّ وَسُجُودَهُنَّ وَخَشُوعَهُنَّ كَانَ لَهُ عَلَى اللَّهِ عَهْدٌ أَنْ يَغْفِرَ لَهُ، وَمَنْ لَمْ يَفْعَلْ فَلَيْسَ لَهُ عَلَى اللَّهِ عَهْدٌ إِنْ شَاءَ غَفَرَ لَهُ وَإِنْ شَاءَ عَذَّبَهُ »^(۳)

”اللہ تعالیٰ نے پانچ نمازیں فرض کی ہیں، جس نے ان کے لیے اچھی طرح (مسنون طریقے سے) وضو کیا اور انھیں ان کے (اوقات اولیٰ) میں ادا کیا۔ ان کے رکوع و سجود اور خشوع و خضوع کا اہتمام کیا تو اس کے لیے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ اسے بخش دے گا اور جس نے ایسا نہ کیا، اس کے لیے اللہ کا کوئی عہد نہیں، اگر وہ چاہے گا تو اسے بخش دے گا اور اگر چاہے گا تو اسے عذاب دے گا۔“

اس مفہوم کی دیگر احادیث سے استدلال کرتے ہوئے نمازِ عشا کے بھی اوّل وقت میں ادا کرنے ہی کو افضل قرار دیا گیا ہے۔

(۱) صحیح البخاری مع الفتح (۹/۲) صحیح ابن خزیمہ (۱/۱۶۹) بتحقیق الأعظمی، صحیح ابن حبان، رقم الحدیث (۲۸۰)

(۲) فتح الباری (۹/۲)

(۳) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (۴۱۰) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۴۴۷) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۴۰۱) موارد الظمان، رقم الحدیث (۲۵۲) صحیح الجامع الصغیر (۲/۳/۱۱۴) و صحیحہ الألبانی و ابن عبد البر و النووي کما فی تحقیق المشکاة (۱/۱۸۰)

نمازِ عشا کے اوّل وقت کے افضل ہونے کی ایک دلیل یہ بھی دی جاتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ آپ ﷺ نے ہمیشہ اوّل وقت میں نماز ادا فرمائی اور بعض اوقات میں آپ ﷺ نے جو عشا کو موخر کر کے ادا فرمایا، وہ کسی کام یا عذر اور بیان جواز کے لیے تھا۔ اگر تاخیر سے عشا کا ادا کرنا افضل ہوتا تو پھر آپ ﷺ اسی پر ہتھیگی فرماتے، چاہے اس میں مشقت بھی ہوتی۔

آخری وقت:

اہل علم کی دوسری جماعت کا کہنا ہے کہ باقی چاروں نمازوں کو تو ان کے اوّل اوقات میں ادا کرنا ہی افضل ہے، لیکن نمازِ عشا کو اس کے آخری وقت میں ادا کرنا زیادہ فضیلت کا باعث ہے۔ اس رائے والے علما اوّل وقت میں نمازوں کو ادا کرنے پر دلالت کرنے والی احادیث کا یہ جواب دیتے ہیں کہ ان میں مطلقاً نمازوں کو اوّل وقت میں ادا کرنے کا حکم ہے، جب کہ نمازِ عشا کو موخر کر کے ادا کرنے کی تو خود نبی اکرم ﷺ نے ترغیب دلائی ہے، جس کا ذکر متعدد احادیث میں وارد ہوا ہے، لہذا عمومی احادیث کی نمازِ عشا کے بارے میں ان احادیث سے تخصیص کی جائے گی۔ یعنی عشا کی تاخیر والی احادیث پر عمل کیا جائے گا۔

نبی اکرم ﷺ کی جو عادت مبارکہ تھی کہ آپ ﷺ نے نمازِ عشا اوّل وقت ہی میں ادا فرمائی، لہذا یہی افضل ہے تو اس بات کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ بات تب قابل قبول ہوتی، جب نبی اکرم ﷺ کا صرف عمل مبارک ہی ہوتا کہ آپ ﷺ نے اوّل وقت میں عشا ادا فرمائی اور اس سلسلے میں کوئی ارشاد نہ ہوتا، جب کہ ایسا نہیں ہے، بلکہ نبی اکرم ﷺ کے متعدد ارشادات سے پتا چلتا ہے کہ آپ ﷺ نے آخری وقت میں نمازِ عشا ادا کرنے کو افضل قرار دیا ہے۔ اوّل وقت میں ادا کرنا صرف اس بنا پر فرمایا کرتے تھے کہ آپ ﷺ امت کو مشقت میں مبتلا نہیں کرنا چاہتے تھے، جیسا کہ بعض احادیث میں واضح طور پر اس بات کا ذکر بھی آیا ہے۔^(۱)

اور آخری وقت میں نمازِ عشا ادا کرنے کو افضل قرار دینے والے علما کا استدلال جن احادیث سے ہے، ان میں سے ایک تو صحیح مسلم، سنن نسائی اور مسند احمد میں مروی ہے، جس میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

(۱) شرح صحیح مسلم للنووی (۳/ ۵ / ۱۳۸) دار إحياء التراث، نیل الأوطار (۱/ ۲ / ۱۰)

«كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يُؤَخِّرُوا الْعِشَاءَ الْآخِرَةَ»^(۱)

”نبی اکرم ﷺ نمازِ عشا کو موخر کر کے ادا کیا کرتے تھے۔“

دوسری حدیث سنن ترمذی وابن ماجہ اور مسند احمد میں مروی ہے، جس میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ

بیان فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«لَوْلَا أَنْ أَشَقَّ عَلَى أُمَّتِي لَأَمَرْتُهُمْ أَنْ يُؤَخِّرُوا الْعِشَاءَ إِلَى ثُلُثِ اللَّيْلِ أَوْ نِصْفِهِ»^(۲)

”اگر میں اس بات کو اپنی امت کے لیے باعثِ مشقت نہ سمجھتا تو انھیں حکم دے دیتا کہ

نمازِ عشا کو ایک تہائی یا نصف رات گزرنے تک موخر کیا کرو۔“

اس مفہوم کی تیسری حدیث صحیح مسلم اور سنن نسائی میں مروی ہے، جس میں اُمّ المؤمنین حضرت

عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

«أَعْتَمَ النَّبِيُّ ﷺ ذَاتَ لَيْلَةٍ حَتَّى ذَهَبَ عَامَّةُ اللَّيْلِ، وَحَتَّى نَامَ أَهْلُ الْمَسْجِدِ،

ثُمَّ خَرَجَ فَصَلَّى، فَقَالَ: إِنَّهُ لَوْ قُتِنَا لَوْلَا أَنْ أَشَقَّ عَلَى أُمَّتِي»^(۳)

”ایک رات نبی اکرم ﷺ نے نمازِ عشا کو اتنا موخر کیا کہ کافی رات گزر گئی، حتیٰ کہ اہل مسجد

سو گئے۔ پھر آپ ﷺ تشریف لائے، نمازِ عشا پڑھی اور فرمایا: اگر میں افرادِ امت کے

لیے اس امر کو باعثِ مشقت نہ سمجھتا تو نمازِ عشا کا وقت تو یہی ہے۔“

اس حدیث کے الفاظ: «حَتَّى ذَهَبَ عَامَّةُ اللَّيْلِ» کی شرح بیان کرتے ہوئے شرح مسلم

میں امام نووی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اس تاخیر سے، جو ان احادیث میں مذکور ہے، ایسی تاخیر بھی مراد

نہیں، جو وقتِ اختیار یعنی تہائی یا نصف رات سے بھی آگے گزر جائے۔ بلکہ عامۃ اللیل سے مراد

اس کا کثیر حصہ گزر جانا ہے نہ کہ اکثر حصہ گزرنا اور اس تاویل کے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں، کیوں کہ

نبی اکرم ﷺ نے «إِنَّهُ لَوْ قُتِنَا» فرمایا ہے کہ یہ اس کا وقت ہے، جس سے اس نصف شب کے بعد کا

حصہ ہرگز مراد نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ علماء میں سے آج تک کسی نے یہ نہیں کہا کہ نصف رات کے بعد

[۱] صحیح مسلم مع النووی (۱۴۲/۵/۳) صحیح سنن النسائي (۱۱۷/۱) المنتقى (۱۱/۲/۱)

[۲] سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۶۹۱) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۱۴۱) مسند أحمد (۲/۲۵۰،

۴۳۳) المنتقى (۱۱/۱/۱)

[۳] مختصر صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۲۴) المنتقى مع النيل (۱۲/۲/۱) صحیح سنن النسائي (۱۱۸/۱)

نمازِ عشا پڑھنا افضل ہے، لہذا عامۃ اللیل سے رات کا کافی حصہ گزرنا مراد ہے اور وہ بھی نصف سے زیادہ نہیں، بلکہ اس کے اندر اندر ہے۔^(۱)

اسی موضوع کی چوتھی حدیث صحیح بخاری و مسلم، سنن ابی داؤد اور نسائی میں حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ پانچوں نمازوں کے اوقات نبی اکرم ﷺ کی نمازوں کے حوالے سے بیان فرماتے ہیں، اس حدیث میں ہے:

«وَالْعِشَاءُ أَحْيَانًا يُؤَخِّرُهَا وَأَحْيَانًا يُعَجِّلُ إِذَا رَأَاهُمْ اجْتَمَعُوا عَجَلًا، وَإِذَا رَأَاهُمْ أَبْطَؤُوا آخِرًا»^(۲)

”آپ ﷺ نمازِ عشا کو کبھی تو موخر کر کے پڑھتے اور کبھی جلدی ادا فرماتے۔ جب آپ ﷺ دیکھتے کہ لوگ اکٹھے ہو گئے ہیں تو جلدی نماز پڑھا دیتے اور اگر آپ ﷺ دیکھتے کہ لوگ لیٹ ہو رہے ہیں تو آپ ﷺ نماز ہی لیٹ کر لیتے تھے۔“

صحیح بخاری و مسلم کی ایک متفق علیہ پانچویں حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں

وہ بیان کرتے ہیں:

«آخَرَ النَّبِيِّ ﷺ صَلَاةَ الْعِشَاءِ إِلَى نِصْفِ اللَّيْلِ، ثُمَّ صَلَّى، ثُمَّ قَالَ: قَدْ صَلَّى النَّاسُ وَنَامُوا، أَمَا إِنَّكُمْ فِي صَلَاةٍ مَا أَنْتَظَرْتُمُوهَا»^(۳)

”نبی اکرم ﷺ نے نمازِ عشا کو نصف شب تک موخر کیا اور پھر پڑھا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: دوسرے لوگوں نے نماز پڑھ لی ہے اور وہ سو بھی چکے ہیں۔ تم لوگ جب تک انتظار میں ہو گویا نماز ہی ادا کر رہے ہو۔“

چھٹی حدیث سنن ابی داؤد، نسائی، صحیح ابن ماجہ، ابن خزیمہ اور مسند احمد میں مروی ہے، جس میں

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

«أَنْتَظَرْنَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ لِكَيْلَةَ بِصَلَاةِ الْعِشَاءِ، حَتَّىٰ ذَهَبَ نَحْوًا مِّنْ شَطْرِ اللَّيْلِ»

(۱) شرح صحیح مسلم للنووی (۳/۵/۱۳۸) نیل الأوطار (۱/۲/۱۲)

(۲) صحیح البخاری مع الفتح (۲/۴۱) صحیح مسلم مع شرح النووی (۳/۵/۱۴۴) صحیح سنن ابی داؤد،

رقم الحدیث (۳۸۴) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۵۱۳)

(۳) صحیح البخاری مع الفتح، رقم الحدیث (۵۸۲) و صحیح مسلم مع شرح النووی (۳/۵/۱۳۹، ۱۴۰)

”ہم نے ایک رات نبی اکرم ﷺ کا نمازِ عشا کے لیے انتظار کیا، حتیٰ کہ تقریباً آدھی رات گزر گئی۔“

آگے فرماتے ہیں:

«فَجَاءَ فَصَلَّى بِنَا» ”پھر آپ ﷺ تشریف لائے اور نماز پڑھائی۔“

پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

«خُذُوا مَقَاعِدَكُمْ فَإِنَّ النَّاسَ قَدْ أَخَذُوا مَضَاجِعَهُمْ وَإِنَّكُمْ لَمْ تَزَلُوا فِي صَلَاةٍ مُنْذُ ائْتَضَرْتُمُوهَا، وَلَوْ لَا ضَعْفُ الضَّعِيفِ وَسَقَمُ السَّقِيمِ وَحَاجَةٌ ذِي الْحَاجَةِ الْأَخْرَتْ هَذِهِ الصَّلَاةَ إِلَى شَطْرِ اللَّيْلِ»⁽¹⁾

”(صفوں میں) اپنی اپنی جگہ پکڑو اور دوسرے لوگ اپنے بستروں میں دراز ہو چکے ہیں اور تم مسلسل اس وقت سے نماز کی حالت میں شمار کیے جا رہے ہو، جب سے تم اس کا انتظار کر رہے ہو۔ اگر مجھے بیمار کی بیماری، کمزور کی کمزوری اور حاجت مند کی حاجت کا پاس نہ ہوتا تو میں نمازِ عشا کو آدھی رات تک موخر کر کے پڑھا کرتا۔“

اسی موضوع کی بعض دیگر احادیث بھی ہیں، جن میں سے ساتویں حدیث صحیح بخاری اور مسلم،

اسی طرح سنن نسائی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، جس میں وہ فرماتی ہیں:

«أَعْتَمَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَيْلَةً بِالْعَتَمَةِ فَنَادَاهُ عُمَرُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ: نَامَ النِّسَاءُ وَالصَّبِيَّانُ»

”نبی اکرم ﷺ نے ایک رات نمازِ عشا کو بہت موخر کیا تب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کو آواز دیتے ہوئے فرمایا کہ عورتیں اور بچے سو گئے ہیں۔“

آپ ﷺ تشریف لائے اور فرمایا:

«مَا يَنْتَظِرُهَا غَيْرُكُمْ»⁽²⁾ ”تمہارے سوا کوئی اس نماز کا انتظار نہیں کر رہا ہے۔“

جب کہ آٹھویں حدیث صحیح بخاری و مسلم اور سنن نسائی میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی

(1) صحیح سنن النسائي (1/ 118) و صحیح سنن أبي داود (407) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (693) المنتقى (1/ 12/ 13) و صححه الشوكاني في النيل.

(2) صحیح البخاري مع الفتح (2/ 47) صحیح مسلم مع شرح النووي (3/ 5/ 137) سنن النسائي (1/ 118) المنتقى (1/ 2/ 10)

ہے، جس میں وہ بیان فرماتے ہیں کہ ہم ایک رات نبی اکرم ﷺ کی نمازِ عشا کے لیے انتظار کر رہے تھے۔ آپ ﷺ ایک تہائی یا اس سے بھی زیادہ رات گزر جانے کے بعد تشریف لائے اور آتے ہی فرمایا:

«إِنَّكُمْ تَنْتَظِرُونَ الصَّلَاةَ مَا يَنْتَظِرُهَا أَهْلُ دِينٍ غَيْرِكُمْ وَلَوْلَا أَنْ يَتَّقَلَ عَلَى أُمَّتِي لَصَلَّيْتُ بِهِمْ هَذِهِ السَّاعَةَ»^(۱)

”تم اس نماز کا انتظار کر رہے ہو، کہ جس کا انتظار دوسرے کسی بھی دین کا کوئی پیروکار نہیں کر رہا۔ اگر میں اپنی امت کے لیے اسے بوجھل نہ سمجھتا، تو انھیں ہمیشہ اسی وقت ہی پڑھایا کرتا۔“ اس ارشاد کے بعد آپ ﷺ نے موذن سے اقامت کہلوائی اور نماز ادا کی۔

جب کہ نویں حدیث سنن ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، دارمی، بیہقی اور مسند احمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں ارشادِ نبوی ہے:

«لَوْلَا أَنْ أَشَقَّ عَلَى أُمَّتِي لَأَمَرْتُهُمْ بِتَأْخِيرِ الْعِشَاءِ وَبِالسُّوَاكِ عِنْدَ كُلِّ وُضُوءٍ»^(۲)

”اگر میں اپنی امت کے لیے اسے باعثِ مشقت نہ سمجھتا تو انھیں حکم دیتا کہ وہ عشا کو موخر کر کے پڑھا کریں اور ہر وضو کے وقت مسواک کیا کریں۔“

جب کہ بخاری شریف میں تعلقاً اور مسند احمد میں مرفوعاً «عِنْدَ كُلِّ وُضُوءٍ» اور «مَعَ كُلِّ وُضُوءٍ» کے الفاظ بھی ہیں کہ ہر وضو کے ساتھ مسواک کرنے کا حکم دیتا۔

ایک دسویں حدیث صحیح بخاری و مسلم اور سنن نسائی میں حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں:

«أَخَّرَ النَّبِيُّ ﷺ الْعِشَاءَ ذَاتَ لَيْلَةٍ حَتَّىٰ ذَهَبَ مِنَ اللَّيْلِ ... الصَّلَاةَ يَا رَسُولَ اللَّهِ! قَدْ نَامَ النَّسَاءُ وَالصَّبِيَّانُ»^(۳)

”نبی اکرم ﷺ نے ایک رات نمازِ عشا کو اتنا موخر کر دیا کہ رات کا کافی حصہ گزر گیا تو

(۱) صحیح البخاری مع الفتح، رقم الحدیث (۵۷۰) صحیح مسلم مع النووی (۳/ ۵/ ۱۳۹) و صحیح سنن ابی داؤد، رقم الحدیث (۴۰۵) صحیح سنن النسائی (۱/ ۱۱۸)

(۲) سنن النسائی (۱/ ۱۱۷) صحیح سنن ابی داؤد، رقم الحدیث (۳۶) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۶۹۰)، (۶۹۱) إرواء الغلیل (۱/ ۱۰۸ تا ۱۱۱)

(۳) صحیح البخاری مع الفتح، رقم الحدیث (۵۷۱) صحیح مسلم مع شرح النووی (۳/ ۵/ ۱۴۱)

حضرت عمرؓ نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! نماز کے لیے تشریف لائیں، اب تو عورتیں اور بچے سو گئے ہیں۔“

آپ ﷺ تشریف لائے۔ آپ ﷺ کے سر اقدس سے پانی ٹپک رہا تھا اور آپ ﷺ فرما رہے تھے:

«إِنَّهُ الْوَقْتُ لَوْلَا أَنْ أَشَقَّ عَلَيَّ أُمَّتِي»

”اگر میں اپنی امت کے لیے اسے باعثِ مشقت نہ سمجھوں تو عشا کا یہی وقت ہے۔“

دوسری روایت میں ہے:

«لَوْلَا أَنْ أَشَقَّ عَلَيَّ أُمَّتِي لَأَمَرْتَهُمْ أَنْ لَا يُصَلُّوهَا إِلَّا هَكَذَا»^(۱)

”اگر یہ افراد امت کے لیے باعثِ مشقت نہ ہوتا تو میں انھیں حکم دے دیتا کہ وہ نمازِ عشا کو صرف اسی طرح ہی ادا کیا کریں۔“

اسی مفہوم کی گیارہویں حدیث سنن ابوداؤد، ترمذی، بیہقی، معانی الآثار اور مسند احمد میں حضرت زید بن خالد جہنیؓ سے مروی ہے، جسے امام ترمذی نے حسن صحیح قرار دیا ہے۔ بارہویں حدیث حضرت علیؓ سے، تیرہویں حدیث مستدرک حاکم، مسند احمد اور سنن کبریٰ بیہقی میں حضرت عباسؓ سے مروی ہے، جسے علامہ احمد شاکر نے صحیح قرار دیا ہے، ایسے ہی حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے معانی الآثار طحاوی میں، حضرت زینب بنت جحیشؓ سے مسند احمد میں، حضرت عبداللہ بن حنظلہ بن ابی عامرؓ سے سنن ابوداؤد اور مستدرک حاکم میں اور ایک صحابی سے مسند احمد و معانی الآثار میں، حضرت معاذؓ سے سنن ابوداؤد میں اور حضرت ابوبکرہؓ سے زوائد مسند احمد میں بھی اسی معنی و مفہوم کی حدیث مروی ہے۔^(۲)

یہ تقریباً انیس حدیثیں ہیں اور بیسوں حدیث صحیحین و سنن اربعہ میں مروی ہے، جس میں حضرت ابو بزرہ اسلمیؓ بیان فرماتے ہیں:

(۱) صحیح البخاری مع الفتح، رقم الحدیث (۵۷۱) صحیح مسلم مع شرح النووی (۳/ ۵/ ۱۴۱) صحیح

سنن النسائي (۱/ ۱۱۷)

(۲) ویکس: نصب الراية (۱/ ۴۶، ۲۴۸) التلخیص الحبیر (۱/ ۱۷۶) نیل الأوطار (۱/ ۲/ ۱۰) الإرواء (۱/ ۱۰۸، ۱۱۱)

«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَسْتَحِبُّ أَنْ يُؤَخَّرَ الْعِشَاءَ الَّتِي يَدْعُوْنَهُ الْعَتَمَةَ، وَكَانَ يَكْرَهُ النَّوْمَ قَبْلَهَا وَالْحَدِيثُ بَعْدَهَا»^①

”نبی اکرم ﷺ نمازِ عشا جسے لوگ عتمہ بھی کہتے تھے، اسے موخر کر کے ادا فرمانا مستحب سمجھتے تھے اور آپ ﷺ عشا سے پہلے سونے کو اور عشا کے بعد باتیں کرنے کو مکروہ سمجھتے تھے۔“

اس حدیث میں نمازِ عشا کے بعد فضول گوئی، قصہ خوانی اور فالتو باتوں کی ممانعت بھی آگئی ہے۔ اس موضوع کی قدرے تفصیل بھی ہم بعد میں ذکر کریں گے، لیکن سرِ دست اس حدیث کا پہلا جز ہی ہمارا محلِ شاہد ہے، لہذا بیس تک پہنچنے والی ان تمام احادیث کی بنا پر اہل علم کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ نمازِ عشا کو موخر کر کے ادا کرنا افضل ہے اور نبی اکرم ﷺ کی اکثر عادتِ مبارکہ اول وقت میں نمازِ عشا ادا کرنے کو مشقت کے خیال پر محمول کیا جائے گا۔

یہاں یہ بات بھی پیش نظر رکھیں کہ نمازِ عشا کا موخر کرنا ہی افضل مان لیا جائے، تب بھی اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں لیا جاسکتا کہ کوئی شخص نمازِ باجماعت کو محض اس بنا پر نہ چھوڑ دیا کرے کہ میں نماز کو موخر کر کے ادا کروں گا، کیوں کہ اس طرح وہ ایک فضیلت کو حاصل کرنے کی فکر میں جماعت میں حاضری کے وجوب کا تارک اور بہت بڑے ثواب سے محروم ہو جائے گا۔



① صحیح البخاری مع الفتح، رقم الحدیث (۵۴۷) و صحیح مسلم مع النووی (۳/ ۵ / ۱۳۵) و صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۵۱۶) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (۳۸۵) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۱۴۲) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (۷۰۱) المنتقى (۱/ ۲ / ۱۳) نصب الراية (۱/ ۲۴۸)

طویل الاوقات علاقوں میں نماز

ان مقامات پر جہاں بعض نمازوں کا وقت ہی ملتا ہو، مثلاً آفتاب کے طلوع و غروب کے درمیان نصف گھنٹے کا فاصلہ رہتا ہو یا چھ ماہ مسلسل دن اور چھ ماہ مسلسل رات رہتی ہو۔ وہاں ان نمازوں کا کیا حکم ہوگا، جن کا وقت ہی نہیں آیا؟ (جیسے قطبین یا ان کے قریبی علاقے ہیں) اس سوال کا جواب مولانا سیف اللہ رحمانی (فاضل دیوبند) نے اپنی کتاب ”جدید فقہی مسائل“ میں یوں دیا ہے:

اس سلسلے میں فقہائے احناف کی آرا مختلف ہیں۔ یہ اختلاف دراصل اس پر مبنی ہے کہ نماز کے لیے وقت کی کیا حیثیت ہے؟

ایک جماعت کے نزدیک اس کی حیثیت شرط کی ہے اور شرط ہی مفقود ہو تو ظاہر ہے کہ وہ چیز واجب ہی نہیں ہوگی۔ اس لیے وہ ایسے مقامات پر ان نمازوں کو ضروری ہی قرار نہیں دیتے جن کا وقت ہی نہیں آیا۔

دوسری رائے یہ ہے کہ وقت شرط نہیں ”علامت“ ہے اور ایک علامت کے نہ پائے جانے سے ضروری نہیں کہ وہ حکم ہی باقی نہ رہے۔ ایک علامت کی جگہ دوسری علامت لے سکتی ہے۔ اس لیے وہ کہتے ہیں کہ چاہے وقت نہ پایا جائے، نماز پھر بھی واجب ہوگی اور اندازے سے وقت متعین کر کے نماز ادا کی جائیں گی۔ (فتح القدیر شرح ہدایہ)

حدیثِ اول:

قرآن و حدیث میں عام طور پر نماز کے ساتھ جس طرح وقت کا ذکر کیا گیا ہے، اس سے وقت کی ان دونوں صورتوں میں کوئی ایک حیثیت غیر مبہم اور دو ٹوک طور پر سامنے نہیں آتی، مگر دو باتیں ایسی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وقت کو علامت ہی کی حیثیت دینی چاہیے۔ ان میں سے ایک یہ کہ نماز کی پانچ وقتوں کی فرضیت بلا تخصیص تمام مسلمانوں کے لیے ہے۔ یہ عموم اسی وقت برقرار رہ سکتا

ہے، جب ایسے مقامات پر اندازے سے پانچوں نمازیں ادا کی جائیں۔
 دوسری بات یہ کہ حضرت نواس بن سمان رضی اللہ عنہ کی وہ روایت، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کے ظہور کے وقت ایسے دن کی پیشین گوئی کی ہے، جو ایک سال کے برابر ہوگا، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ اس میں ایک ہی دن کی نمازیں کافی ہو جائیں گی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
 ”نہیں بلکہ اندازے سے نمازیں ادا کرو گے۔“

اس حدیث کے الفاظ یوں ہیں:

«قُلْنَا: يَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ! فَذَلِكَ الْيَوْمَ الَّذِي كَسَنَتْهُ أَنْتَ كَفِينَا فِيهِ صَلَاةُ يَوْمٍ؟
 قَالَ: لَا، أَقْدُرُوا لَهُ قَدْرَهُ»⁽¹⁾

”ہم نے کہا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اس دن جو ایک سال کے مساوی ہوگا، کیا ایک دن کی نماز کافی ہو جائے گی؟ آپ نے فرمایا: نہیں، بلکہ اس دن نماز کے لیے اندازے سے کام لو۔“
 آگے موصوف لکھتے ہیں:

”اس حدیث نے گویا اس مسئلے کو دو ٹوک حل کر دیا ہے۔“

راقم الحروف کی رائے بھی یہی ہے کہ ایسے مقامات پر نمازیں اندازے سے ادا کی جائیں گی اور ہر چوبیس گھنٹے کو شب و روز تصور کر کے اوقات نماز کے درمیان جو فاصلہ ہے، اس کا تناسب ملحوظ رکھتے ہوئے نمازیں پڑھی جائیں گی۔⁽²⁾

شرح مسلم نووی میں اندازے سے کام لینے کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فجر پڑھیں اور جب طلوع فجر اور ظہر کے درمیانی وقت کا عرصہ گزر گیا تو ظہر پڑھیں اور جب ظہر و عصر کے درمیانی وقت کے مطابق عرصہ گزر گیا تو عصر پڑھیں۔ پھر عصر و مغرب کے درمیانی وقت کا عرصہ گزر گیا تو مغرب پڑھیں اور اسی طرح ہی عشاء، پھر فجر، پھر ظہر، پھر عصر، پھر مغرب اور نمازوں کا یہ سلسلہ اسی طرح اندازے سے چلتا رہے گا، یہاں تک کہ وہ دن ختم نہ ہو جائے۔⁽³⁾

(1) صحیح مسلم مع شرح النووی (9/18، 65، 66) صحیح سنن الترمذی للآلبانی (2/249) طبع مکتبہ

التربیة لدولة الخلیج- الرياض.

(2) جدید فقہی مسائل (ص: 30، 31)

(3) شرح صحیح مسلم للنووی (9/18، 166، 156)

طویل الاوقات علاقوں (قطبین) میں نماز اور روزے کے اوقات سے متعلق بعض اہم اداروں کے فیصلے:

اس سلسلے میں ندوہ بروکسل ہیئت کبار العلماء، سعودیہ اور فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ، جیسے اہم اداروں کی طرف سے بعض قراردادیں اور فیصلے بھی صادر ہوئے ہیں، جنہیں ہم رابطہ عالم اسلامی کی طرف سے شائع کی گئی کتاب ”قرارات المجمع الفقہی الاسلامی“، بلکہ ”الدورة الخامسة“ (ص: ۸۹، ۹۱) [۸/۱۶ ربيع الآخر ۱۴۰۲ھ] سے نقل کر رہے ہیں۔ مذکورہ کتاب میں انتہائی درجے کے خطوط عرض بلد (قطبین) پر واقع (طویل الاوقات) علاقوں میں نماز روزے کے اوقات سے متعلق قرارداد نمبر (۳) میں حمد و ثناءے باری تعالیٰ اور صلوة و سلام بر نبی خیر الانام ﷺ کے بعد لکھا ہے:

”اسلامی فقہ اکیڈمی کے تیسرے اجلاس منعقدہ بروز جمعرات بہ تاریخ ۱۰/۴/۲۰۰۲ھ بہ مطابق ۲/۴/۱۹۸۲ء میں ندوہ بروکسل ۱۴۰۰ھ = ۱۹۸۰ء کی قرارداد اور سعودی عرب کے ادارے ”ہیئت کبار علماء“ کی قرارداد نمبر ۶۱ بہ تاریخ ۱۲/۴/۱۳۹۶ھ پر شرکائے مجلس کو مدعو کیا گیا کہ جن کا تعلق ان علاقوں میں نماز روزے کے اوقات سے ہے، جن میں سال کے کچھ موسموں میں رات بہت ہی زیادہ چھوٹی ہوتی ہے اور بعض موسموں میں دن بہت ہی زیادہ چھوٹا ہوتا ہے، یا پھر جہاں چھ ماہ سورج (دن) اور چھ ماہ غروب آفتاب کی کیفیت (رات) رہتی ہے۔

اس موضوع کے بارے میں قدیم و جدید فقہانے جو لکھا ہے، اس کا جائزہ لینے کے بعد درج ذیل قرارداد پاس ہوئی۔

وہ علاقے (یا سمیتیں) جو عالی درجات (انتہائی بلند درجے کے) خطوط عرض بلد (قطبین) پر واقع ہیں ہیں، انہیں تین حصوں (یا قسموں) میں تقسیم کیا جائے گا:

① وہ علاقے (یا سمیتیں) جن میں موسموں کے اختلاف کے باوجود چوبیس گھنٹے کے برابر دن ہوتا ہے اور چوبیس گھنٹوں کے برابر ہی رات ہوتی ہے (یعنی چوبیس گھنٹے دن اور چوبیس چوبیس گھنٹے رات) یا اس سے بھی زیادہ مدت کے دن اور رات ہوتے ہیں (یعنی کم و پیش چھ ماہ دن اور چھ ماہ رات) دن اور رات کی اس کیفیت میں ان علاقوں (یا جہتوں)

میں نماز اور روزے وغیرہ کے اوقات کا اندازہ ان جہات (یا علاقوں) کے اعتبار سے لگایا جائے گا، جو ان کے سب سے زیادہ قریب ہوں گے اور ان میں دن اور رات (دونوں) کی تمیز چوبیس گھنٹے کے اعتبار سے ہوتی ہو۔ (یعنی ان علاقوں یا جہات میں ہر چوبیس چوبیس گھنٹوں کو ایک شب و روز تصور کر کے اندازہ لگا کر اور اوقات نماز کے درمیان جو فصل ہے، اس کا تناسب ملحوظ رکھتے ہوئے پانچ نمازیں ادا کی جائیں گی)

2] دوسرے وہ علاقے جہاں شفقِ غروب (شام کی سرخی) غائب ہی نہیں ہوتی کہ شفقِ فجر (صبح کا سفیدہ یا سرخی) طلوع ہو جاتی ہے اور ان علاقوں میں شفقِ غروب اور شفقِ شروق میں کوئی فرق بھی نہیں کیا جاسکتا۔ (یعنی پتا نہیں چلتا کہ کون سی شفقِ غروب ہے اور کون سی شفقِ شروق)۔ (جو علاقے ان جہات پر واقع ہوں) ان علاقوں میں نمازِ عشاء، سحری کے آخری وقت اور نمازِ فجر کے اوقات کا اندازہ لگایا جائے گا۔ (یعنی ان کے اوقات کا کام اندازے سے لیا جائے گا) اور یہ اندازہ بھی اس آخری وقت کے اعتبار سے ہوگا، جس میں دونوں شفق (طلوع و غروب کی سرخی) میں کچھ تمیز و فرق ہو سکے۔ (یعنی پہلے اندازہ لگایا کہ یہ شفقِ غروب ہے تو اس کے زائل ہونے (غائب ہونے) پر نمازِ عشاء ادا ہوگی اور پھر اس کے بعد اندازے کے مطابق جتنا وقت نمازِ عشاء سے لے کر طلوعِ صبح صادق تک ہوتا ہے، اس کا اندازہ لگا کر اتنا وقت گزرنے پر سحری کا وقت ہو جائے گا اور پھر صبح کی نماز کا وقت شروع ہو جائے گا اور نمازِ فجر پڑھی جائے گی، اسی طرح ہی اندازے سے دوسری نمازیں ادا کی جائیں گی۔ یہ یاد رہے کہ سورج غروب ہوتے ہی نمازِ مغرب ادا ہوگی۔

3] تیسرے وہ علاقے جہاں دن اور رات دونوں چوبیس گھنٹوں کے ہوتے ہیں اور ان علاقوں میں نمازوں کے اوقات بھی علاحدہ ہوتے ہیں (کہ یہ ظہر کا وقت ہے، یہ عصر کا، یہ مغرب کا اور یہ عشاء کا) اور ان علاقوں میں سال کے کچھ موسموں میں دن بہت زیادہ چھوٹا ہوتا ہے اور بعض موسموں میں رات بہت زیادہ چھوٹی ہوتی ہے۔ جو کوئی ان علاقوں میں مقیم ہو، جہاں رات اور دن کی تمیز و فرق طلوعِ فجر اور غروبِ آفتاب کے اعتبار سے کی جاتی ہو، مگر موسمِ گرما میں ان علاقوں میں دن بہت لمبا اور موسمِ سرما میں دن بہت چھوٹا

ہوتا ہو تو ان علاقوں میں شرعی طور پر پانچوں نمازیں اللہ تعالیٰ کے اس قول کے عموم کے اعتبار سے اپنے اپنے معروف وقت پر ادا کی جائیں گی۔
ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اقِمِ الصَّلَاةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلَى غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْآنِ الْفَجْرِ إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا﴾ [بنی اسرائیل: ۷۸]

”زوال آفتاب سے لے کر رات کے اندھیرے تک نماز قائم کیجیے اور فجر کے وقت قرآن (نماز فجر) کا بھی التزام کیجیے، کیوں کہ قرآن فجر (نماز فجر میں فرشتوں کے) حاضر ہونے کا وقت ہے۔“

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَّوْقُوتًا﴾ [النساء: ۱۰۳]

”یقیناً نماز پابندی وقت کے ساتھ مومنین پر فرض کی گئی ہے۔“

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے بیان کرتے ہیں:

«إِنَّ رَجُلًا سَأَلَهُ عَنْ وَقْتِ الصَّلَاةِ قَالَ: فَقَالَ لَهُ: صَلَّى مَعَنَا هَذَيْنِ يَعْينِي الْيَوْمَيْنِ فَلَمَّا زَالَتِ الشَّمْسُ أَمَرَ بِاللَّيْلِ فَأَذَّنَ ثُمَّ أَمَرَهُ فَأَقَامَ الظُّهْرَ ثُمَّ أَمَرَهُ فَأَقَامَ العَصْرَ، وَالشَّمْسُ مُرْتَفِعَةٌ بِيضَاءٍ نَفِيَّةٍ، ثُمَّ أَمَرَهُ فَأَقَامَ المَغْرِبَ حِينَ غَابَتِ الشَّمْسُ، ثُمَّ أَمَرَهُ فَأَقَامَ العِشَاءَ حِينَ غَابَ الشَّفَقُ، ثُمَّ أَمَرَهُ فَأَقَامَ الفَجْرَ حِينَ طَلَعَ الفَجْرُ، فَلَمَّا كَانَ اليَوْمَ الثَّانِي أَمَرَهُ فَأَبْرَدَ بِالظُّهْرِ فَأَبْرَدَ بِهَا فَأَنْعَمَ أَنْ يُبْرَدَ بِهَا، وَصَلَّى العَصْرَ، وَالشَّمْسُ مُرْتَفِعَةٌ، أَخْرَجَهَا فَوْقَ اللَّيْلِ كَانَ، وَصَلَّى المَغْرِبَ قَبْلَ أَنْ يَغِيْبَ الشَّفَقُ، وَصَلَّى العِشَاءَ بَعْدَ مَا ذَهَبَ ثُلُثُ اللَّيْلِ وَصَلَّى الفَجْرَ فَاسْتَفْرَبَهَا، ثُمَّ قَالَ: أَيْنَ السَّائِلُ عَنْ وَقْتِ الصَّلَاةِ؟ فَقَالَ الرَّجُلُ: أَنَا يَا رَسُولَ اللَّهِ! قَالَ: وَقْتُ صَلَاتِكُمْ بَيْنَ مَا رَأَيْتُمْ^①»

”ایک شخص نے (خدمت نبوی ﷺ میں حاضر ہو کر) رسول اللہ ﷺ سے اوقات نماز کے

① صحیح مسلم مع شرح النووي (۳/ ۱۱۴، ۱۱۵)

بارے میں سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہ دو دن تم ہمارے ساتھ نماز پڑھو۔ جب زوال ہوا تو آپ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اذان کہنے کا حکم فرمایا۔ پھر اقامت کا حکم فرمایا اور نمازِ ظہر پڑھی۔ پھر آپ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو عصر کی اقامت کا حکم فرمایا تو انھوں نے عصر کی اقامت کہی، جب کہ ابھی سورج بلند سفید (اور) صاف تھا۔ (یعنی ابھی تک دھوپ میں زردی نہیں آئی تھی) جب سورج غروب ہو گیا تو آپ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو مغرب کی اقامت کا حکم دیا اور پھر جب شفق (شام کی سرخی) غائب ہو گئی تو آپ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اقامتِ عشا (نمازِ عشا کی تکبیر) کا حکم دیا۔ (نماز پڑھی) اور پھر جب فجر (صبح صادق) طلوع ہوئی تو آپ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اقامت (تکبیر) کہنے کا حکم فرمایا (نماز فجر پڑھی) جب دوسرا دن ہوا تو آپ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو نمازِ ظہر کو ٹھنڈا کرنے کا حکم فرمایا تو انھوں نے ظہر کو ٹھنڈا کیا، یعنی نمازِ ظہر خوب ٹھنڈے وقت میں پڑھائی۔ پھر نمازِ عصر اس وقت پڑھی، جب کہ سورج بلند تھا، لیکن پہلے روز سے ڈھل چکا تھا (یعنی اس روز پہلے روز کی نسبت تاخیر کی) اور شام کی سرخی ہو جانے سے پہلے نمازِ مغرب پڑھی اور ایک تہائی رات گزر جانے کے بعد نمازِ عشا پڑھائی اور صبح کی نماز خوب روشنی پھیل جانے پر پڑھائی، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: نمازوں کے اوقات کے بارے میں سوال کرنے والا کہاں ہے؟ تو اس شخص نے عرض کی: اے اللہ کے رسول ﷺ! میں موجود ہوں تو آپ ﷺ نے فرمایا: جو کچھ تم نے دیکھا ہے، تمہاری نمازوں کا وقت اس کے درمیان ہے۔“

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«وَقْتُ الظُّهْرِ إِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ، وَكَانَ ظِلُّ الرَّجُلِ كَطُولِهِ مَا لَمْ يَحْضُرِ العَصْرُ، وَوَقْتُ العَصْرِ مَا لَمْ تَصْفُرْ الشَّمْسُ، وَوَقْتُ صَلَاةِ المَغْرِبِ مَا لَمْ يَغِبِ الشَّفَقُ، وَوَقْتُ صَلَاةِ العِشَاءِ إِلَى نِصْفِ اللَّيْلِ الأَوْسَطِ، وَوَقْتُ صَلَاةِ الصُّبْحِ مِنْ طُلُوعِ الفَجْرِ مَا لَمْ تَطْلُعِ الشَّمْسُ فَإِذَا طَلَعَتِ الشَّمْسُ

فَأْمْسِكْ عَنِ الصَّلَاةِ فَإِنَّهَا تَطْلُعُ بَيْنَ قَرْنَيْ الشَّيْطَانِ^(۱)

”ظہر کا وقت زوالِ آفتاب سے لے کر آدمی کا سایہ اس کے برابر ہو جانے تک ہے، جب کہ ابھی عصر نہ ہوئی ہو اور نمازِ عصر کا وقت اس وقت تک ہے، جب تک کہ سورج کا رنگ زرد نہ پڑ جائے (یعنی ابھی دھوپ میں زردی نہ آئی ہو) اور نمازِ مغرب کا وقت اس وقت تک ہے، جب تک کہ شفق غائب نہ ہو جائے۔ نمازِ عشا کا وقت ٹھیک آدھی رات تک ہے اور نمازِ فجر کا وقت طلوعِ فجر (صبح صادق) سے لے کر طلوعِ آفتاب تک ہے۔ پس جب سورج طلوع ہو رہا ہو تو تم نماز پڑھنے سے رُک جاؤ، کیوں کہ سورج شیطان کے دو سینگوں کے درمیان طلوع ہوتا ہے۔“

ان دو احادیث کے علاوہ بھی بعض ایسی احادیث ہیں جو قوی و فعلی اعتبار سے پانچوں نمازوں کے وقت کی تحدید کے بارے میں وارد ہوئی ہیں، ان احادیث میں دن رات کے بعض موسموں میں بہت زیادہ بڑے اور چھوٹے ہونے کے اعتبار سے بھی کوئی فرق نہیں کیا گیا، جب کہ وہ اوقات نماز بھی علامات کے ذریعے سے جو رسول اللہ ﷺ نے بیان کی ہیں، علاحدہ علاحدہ ہیں (یعنی وقت کے اعتبار سے ہر نماز کی علامت رسول ﷺ نے واضح طور پر بیان کی ہے، جو اس نماز کو دوسری نماز سے ممتاز کر دیتی ہے)۔

یہ احادیث تو نمازوں کے اوقات کی تحدید کے بارے میں ہیں، جب کہ ماہِ رمضان کے روزوں کے وقت کی تحدید کے بارے میں اپنے اپنے علاقوں میں مکلفین پر واجب ہوگا کہ وہ طلوعِ فجر سے لے کر غروبِ آفتاب تک کھانے، پینے اور ہر اس چیز سے رُکے رہیں جو روزے کے ٹوٹنے یا افطار کا سبب بنے۔ جب تک ان علاقوں میں دن رات سے علاحدہ ہوتا رہے گا (یعنی ان دونوں میں طلوع و غروبِ آفتاب کے لحاظ سے فرق و تمیز ہوتی رہے گی) ان دونوں (دن اور رات) کا مجموعی وقت بھی چوبیس گھنٹوں کا ہوگا تو ان علاقے والوں کے لیے رمضان میں صرف رات کو کھانا، پینا اور اجماع وغیرہ حلال ہوگا، اگرچہ رات کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو، کیوں کہ شریعتِ اسلامیہ تمام بلاد میں بسنے

(۱) صحیح مسلم مع شرح النووی (۳/۵، ۱۱۲، ۱۱۳)

والے لوگوں کے لیے عام ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿كُلُوا وَ اشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ أَتَمُوا الصِّيَامَ إِلَى الْبَيْلِ﴾ [البقرة: ۱۷۸]

”کھاؤ اور پیو، یہاں تک کہ صبح سفید دھاری اندھیرے کی کالی دھاری سے نمایاں نظر آجائے، یعنی علاحدہ ہو جائے، پھر روزے کو رات تک (غروب آفتاب تک) پورا کرو۔“

جو کوئی دن لمبا ہونے کی وجہ سے روزہ پورا کرنے سے یا روزہ رکھنے سے عاجز آجائے، جسے علامات یا تجربہ یا کسی امانت دار ڈاکٹر کے بتانے سے اپنے غالب گمان (ظن غالب) کی وجہ سے یہ یقین ہو جائے کہ روزہ رکھنے سے وہ شدید ترین بیماری میں مبتلا ہو جائے گا یا روزہ رکھنے کی وجہ سے اس کا مرض مزید بڑھے گا یا روزہ رکھنے سے اسے بیماری سے شفا یاب ہونے میں تاخیر ہوگی تو ایسے شخص کے لیے رمضان المبارک میں روزہ چھوڑنے کی اجازت ہے۔ یہ مریض یا ایسا شخص ماہ رمضان میں روزے نہیں رکھے گا، بلکہ دوسرے دنوں میں جس مہینے میں بھی ممکن ہو (رمضان میں چھوڑے ہوئے روزوں کی) قضا دے گا، جیسا کہ ارشاد الہی ہے:

﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ﴾ [البقرة: ۱۸۵]

”پس جو کوئی تم میں سے اس ماہ (رمضان) میں موجود ہو، اسے چاہیے کہ وہ اس میں روزے رکھے اور جو کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرے، یعنی روزوں کی قضا دے۔“

نیز فرمان الہی ہے:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ [البقرة: ۲۸۶]

”اللہ تعالیٰ کسی نفس کو اس کی طاقت (واختیار) سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔“

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ﴾ [الحج: ۷۸]

”اللہ نے تم پر دین میں کوئی تنگی نہیں کی۔“

وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ. وَصَلَّى اللَّهُ عَلَى خَيْرِ خَلْقِهِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ، وَعَلَى آلِهِ وَصَحْبِهِ وَسَلَّمَ.

ممبرانِ فقہ اکیڈمی:

دستخط سماحہ اشخ	دستخط	بیاری کی وجہ سے معذوری
عبدالعزیز ابن باز	نائب رئیس اشخ	رئیس فقہ اکیڈمی
دستخط	محمد علی الحرکان	اشخ عبد اللہ بن حمید
اشخ محمد بن صالح العثیمین	دستخط	دستخط
اشخ محمد محمود الصواف غائب از اجتماع	اشخ محمد عبدالسبیل	اشخ محمد عبدالسبیل
اشخ مسرودک العوادی	دستخط	دستخط
دستخط	اشخ مصطفیٰ احمد الزرقاء	اشخ محمد الشاذلی النیفر
مولانا عبد القدوس ہاشمی	غائب از اجتماع	دستخط
دستخط	مولانا ابوالحسن علی الندوی	اشخ محمد رشیدی
اشخ ابوبکر محمود جرمی	دستخط	غائب از اجتماع
غائب از اجتماع	اشخ محمد رشید قبانی	اشخ حسین محمد الخلوف
اشخ محمود شیت خطاب اشخ محمد سالم عدود	دستخط	دستخط

قراردادیں: اشخ محمد عبدالرحیم الخالد

اوقاتِ نہی یا مکروہہ:

نماز پنج گانہ ادا کرنے کے اوّل و آخر اوقات کی تفصیل کسی حد تک ذکر کی جا چکی ہے اور اب ان اوقات کو بھی ذہن نشین کر لیں، جن میں (عام نفلی) نمازیں ادا کرنا منع ہے اور جنہیں اوقاتِ مکروہہ

﴿﴾ کتاب قرارات المجمع الفقہی الاسلامی مکة المکرمة۔ الدورة الخامسة ۱۶ / ۸ - ربيع الآخر ۱۴۰۲ھ (ص: ۸۹ - ۹۱) طبع رابطہ عالم الاسلامی مکة مکرمة.

کہا جاتا ہے، وہ اوقات پانچ ہیں:

- 1 ان میں پہلا وقت ہے نماز فجر ادا کر لینے کے بعد سے لے کر سورج طلوع ہونے تک۔
- 2 دوسرا وقت ہے نماز عصر ادا کر چکنے سے لے کر غروب آفتاب تک۔
- 3 تیسرا وقت وہ ہے، جب کہ سورج طلوع ہو رہا ہو، یہاں تک کہ وہ افق سے نکل کر بلند نہ ہو جائے۔
- 4 چوتھا وقت وہ ہے، جب نصف النہار یا عین دوپہر ہو، یہاں تک کہ سورج سر سے ڈھل جائے۔
- 5 پانچواں وقت وہ ہے جب سورج غروب ہو رہا ہو، جب تک کہ وہ غروب نہ ہو جائے۔^①

بعد از فجر وعصر:

ان پانچوں اوقات میں سے پہلے دو یعنی نماز فجر سے لے کر طلوع آفتاب تک اور نماز عصر سے لے کر غروب آفتاب تک کے دوران نماز کی ممانعت ہے۔

حدیث اول:

صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داؤد، ترمذی، نسائی، بیہقی اور مسند احمد میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے

مروی ہے:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى عَنِ الصَّلَاةِ بَعْدَ الصُّبْحِ حَتَّى تَشْرُقَ الشَّمْسُ وَبَعْدَ الْعَصْرِ حَتَّى تَغْرُبَ»^②

”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز فجر کے بعد سورج طلوع ہو جانے تک نماز سے منع فرمایا اور نماز عصر کے بعد سے لے کر غروب آفتاب تک کے دوران میں نماز پڑھنے سے بھی منع فرمایا۔“

حدیث ثانی:

اس موضوع کی دوسری حدیث بخاری شریف میں جہاں مذکورہ حدیث عمر رضی اللہ عنہ مروی ہے، اسی

① فتح الباری (۶۲/۲) المرعاة (۵۱/۲)

② صحیح البخاری مع الفتح (۵۸/۲) صحیح مسلم مع شرح النووي (۱۱۱/۶/۳) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (۱۱۳۶) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۱۵۴) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۵۴۸) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۱۲۵۰) الفتح الربانی (۲۹۲/۲) صحیح الجامع (۶/۳/۵۵، ۱۹۴)

باب میں ہے اور اس سے اگلے باب میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی ایک حدیث مروی ہے، جس میں دیگر امور کے علاوہ یہ بھی مذکور ہے:

«إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نَهَى عَنِ الصَّلَاةِ بَعْدَ الْفَجْرِ حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ،
وَبَعْدَ الْعَصْرِ حَتَّى تَغْرُبَ الشَّمْسُ»^(۱)

”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز فجر کے بعد سورج طلوع ہو جانے تک نماز سے منع فرمایا اور عصر کے بعد سے لے کر غروب آفتاب تک کے دوران میں نماز پڑھنے سے بھی منع فرمایا۔“

حدیث ثالث:

صحیح بخاری و مسلم، سنن نسائی، ابن ماجہ، بیہقی اور مسند احمد میں اسی مفہوم کی ایک تیسری حدیث حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

«لَا صَلَاةَ بَعْدَ الصُّبْحِ حَتَّى تَرْتَفِعَ الشَّمْسُ، وَلَا صَلَاةَ بَعْدَ الْعَصْرِ حَتَّى
تَغِيبَ الشَّمْسُ»^(۲)

”نماز فجر کے بعد سورج چڑھ آنے تک کوئی نماز نہیں اور عصر کے بعد بھی کوئی نماز نہیں، جب تک کہ سورج غروب نہ ہو جائے۔“

اسی مفہوم و موضوع کی کئی دیگر احادیث بھی متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں، جن کی بنا پر جمہور اہل علم کا مسلک ہے کہ ان اوقات میں نماز فجر پڑھنا مکروہ ہے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے تو شرح صحیح مسلم میں اس کراہت پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

اس بات پر پوری امت کا اجماع ہے کہ ان اوقات میں کوئی بھی غیر سببی نماز پڑھنا مکروہ ہے، البتہ فرائض کے جواز پر اتفاق ہے۔ سببی نقلی نمازوں کو ادا کرنے کے جواز اور کراہت میں اختلاف ہے، جیسے ”تحیة المسجد“، سجدہ تلاوت، سجدہ شکر، نماز عید، نماز کسوف (سورج گرہن کی نماز) نماز جنازہ اور فوت شدہ نمازوں کی قضا ہے۔

(۱) صحیح مسلم مع النووی (۱۱۰/۶/۳)

(۲) صحیح مسلم مع شرح النووی (۱۱۰/۶/۳) الفتح الربانی (۲۹۱/۲) صحیح الجامع (۱۹۴/۶/۳)

اس سلسلے میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور فقہا و محدثین کے ایک گروہ کا مسلک یہ ہے کہ یہ سب سبھی نمازیں ان اوقات مکروہہ میں بھی جائز ہیں اور وہ بھی بلا کراہت، جب کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور بعض دیگر ائمہ و فقہا کے نزدیک یہ نمازیں بھی ممانعت والی احادیث کے تحت آتیں اور ممنوع ہیں۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے موافقین کا استدلال یوں ہے کہ جب یہ بات ثابت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ ظہر کی بعد والی سنتیں نمازِ عصر کے بعد پڑھی تھیں،^(۱) اور یہ فوت شدہ سنتوں کی قضا کے بارے میں صریح ہے۔ لہذا یہ سنن میں بالاولیٰ جائز ہے اور قضاے فریضہ میں بھی بالاولیٰ ہے اور یہی معاملہ نمازِ جنازہ کا بھی ہے۔^(۲)

یہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ ہیں، جو انھوں نے اختصار کے ساتھ فرمائے ہیں، جب کہ یہاں ہم تفصیل میں نہیں جانا چاہتے، بلکہ ان امور کی قدرے زیادہ تفصیلات مذکور نمازوں کے احکام و مسائل کے ضمن میں ذکر کی جائیں گی۔ یہاں جو امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے غیر سبھی نمازوں کی ان اوقات مکروہہ میں ادا کرنے کی کراہت پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے، اس پر امام عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے تعاقب کرتے ہوئے ”فتح الباری“ میں لکھا ہے کہ یہ اجماع کا دعویٰ صحیح نہیں، کیوں کہ امام داؤد اور اہلِ ظاہر کا کہنا ہے کہ ان اوقات میں بھی مطلقاً نماز جائز ہے اور امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی بات بالجزم کہی ہے۔ حافظ عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سلف صالحین کی ایک جماعت مطلقاً اباحت کی قائل رہی ہے اور وہ ممانعت و کراہت والی احادیث کو منسوخ قرار دیتے ہیں۔^(۳)

اس طرح اجماع کا دعویٰ تو ثابت نہ ہوا۔ یہی بات امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی مذکور کی ہے۔^(۴) البتہ جمہور اہلِ علم کے نزدیک ان اوقات میں نماز اور خصوصاً غیر سبھی نماز ادا کرنا مکروہ ہے۔ ہاں مذکورہ بالا سبھی نمازیں تو الگ بات ہے۔ یہی معاملہ اس صورت میں بھی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے گھر میں کسی وجہ سے نماز پڑھ لے اور مسجد میں چلا جائے، وہاں دیکھے کہ جماعت ہو رہی ہے تو وہ اس جماعت میں شامل ہو سکتا ہے، کیوں کہ اس بات پر دلالت کرنے والی وہ احادیث جن میں سے چار

(۱) صحیح البخاری (۶۴/۲)

(۲) شرح مسلم مع النووی (۱۱۱، ۱۱۰/۶/۳)

(۳) فتح الباری (۵۹/۲)

(۴) كما في الفتح الرباني (۲۹۶/۲)

احادیثِ جماعت کو سنتِ موکدہ کہنے والوں کے دلائل کے ضمن میں اور دو اس کے بعد بھی ذکر کی جا چکی ہیں اور وہ جیسے احادیث ہی مطلق ہیں، ان میں سے کسی میں بھی نبی اکرم ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ فلاں فلاں نماز ہو تو جماعت میں مل جاؤ اور فلاں فلاں ہو تو نہ ملو، بلکہ آپ ﷺ کا حکم عام ہے، جو پانچوں نمازوں ہی کو شامل ہے۔ امام شافعی، احمد، اسحاق بن راہویہ، شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ابن قیم رحمہم اللہ کا یہی مسلک ہے اور شیخ ابن باز نے تحقیق ”فتح الباری“ میں اسے ہی صحیح قول قرار دیا ہے۔^①

جن احادیث میں مذکور ہے کہ نمازِ فجر و عصر کے بعد طلوع آفتاب اور غروب آفتاب تک کوئی نماز نہیں ہوتی، وہ احادیث عام ہیں اور دوسری مرتبہ کسی نماز کو ادا کرنے کے لیے جماعت میں شامل ہو جانے والی احادیث خاص ہیں اور صرف ایسے ہی مواقع سے تعلق رکھتی ہیں۔ لہذا ان میں باہم کوئی تعارض یا تضاد بھی نہیں بنتا، بلکہ اصول میں مذکور تصریحات کی رو سے خاص احادیث کو عام پر مقدم کرنا ضروری ہوتا ہے، بلکہ مطلقاً عام کی خاص پر بنیاد رکھنے کو واجب قرار دیا گیا ہے۔^②

امام شوکانی رحمہ اللہ اور علامہ عبید اللہ رحمانی رحمہ اللہ کی تفصیلات کے علاوہ معروف مصری عالم سید سابق نے ”فقہ السنۃ“ میں ممنوع اوقات کے دوران میں بھی سبھی نمازوں کو ادا کرنے کے بلا کراہت جواز والے مسلک کو ”أقرب إلى الحق“ قرار دیا ہے۔^③

ان اوقات میں نقلی نمازوں کے مکروہ ہونے کے بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے حضرت عمر، علی، ابن مسعود، ابن عمر، خالد بن ولید، ابو ہریرہ اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم کے اقوال ملتے ہیں۔ تابعین میں سے امام حسن بصری اور سعید بن مسیب رضی اللہ عنہما بھی اسے مکروہ سمجھتے تھے۔ جب کہ ائمہ مذاہب میں سے امام ابو حنیفہ اور امام مالک رضی اللہ عنہما بھی کراہت کے قائل تھے۔ امام شافعی سبھی نمازوں کو جائز قرار دیتے تھے اور حنابلہ سبھی وغیر سبھی کی حرمت کے قائل ہیں، سوائے طواف کی دو رکعتوں کے۔ البتہ خود امام احمد رحمہ اللہ سے ایک روایت میں جواز کا قول منقول ہے۔^④

جو استثنائی صورتیں بیان کی گئی ہیں، جن میں وہ نمازیں آتی ہیں، جو ان اوقاتِ مکروہہ میں بھی

① فتح الباری (۲/ ۸۹)

② تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: نیل الأوطار (۱/ ۲۴/ ۲) المرعۃ (۲/ ۱۳۶، ۱۳۷)

③ فقہ السنۃ (۱/ ۱۰۷)

④ معالم السنن (۱/ ۱۶۴) فقہ السنۃ (۱/ ۱۰۷) تحقیق فتح الباری (۲/ ۵۹) المرعۃ (۲/ ۱۳۶)

بلا کراہت جائز ہیں، انہی میں سے فجر کی دو سنتیں بھی ہیں، جنہیں فرضوں کے بعد ہی طلوع آفتاب سے پہلے پڑھا جاسکتا ہے، جس کے ایک دو نہیں بلکہ متعدد دلائل ہیں۔

فجر کی دو سنتیں:

اگر کوئی شخص فرضوں سے پہلے دو سنتیں نہ پڑھ سکا ہو، بلکہ اس کے مسجد آتے ہی مسجد میں اقامت ہوگئی ہو تو وہ اسی وقت جماعت میں شامل ہو جائے اور جب فرضوں کی تکمیل پر سلام پھر جائے تو بعد میں اٹھ کر وہ اپنی دو سنتیں پڑھ لے۔ اسے اب طلوع آفتاب کا انتظار کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں، کیوں کہ اس کا جواز متعدد احادیث و آثار سے ثابت ہے۔

حدیثِ اول:

سنن ابی داؤد، ترمذی، ابن ماجہ، صحیح ابن خزیمہ، صحیح ابن حبان، مصنف ابن ابی شیبہ، مصنف عبدالرزاق، سنن دارقطنی و بیہقی اور مسند احمد میں حضرت قیس بن عمرو رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

«خَرَجَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَأَقِيَمَتِ الصَّلَاةُ فَصَلَّيْتُ مَعَهُ الصُّبْحَ ثُمَّ انْصَرَفَ النَّبِيُّ ﷺ فَوَجَدَنِي أُصَلِّي فَقَالَ: مَهَلًا يَا قَيْسُ! أَصَلَّوْتَانِ مَعًا؟ قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ! إِنِّي لَمْ أَكُنْ رَكَعْتُ رَكَعَتِي الْفَجْرِ»

”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو جماعت کی اقامت ہوگئی، میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز فجر پڑھی، پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کی طرف پھرے تو مجھے نماز پڑھتے ہوئے پایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ٹھہرو! کیا ایک ہی وقت میں دو نمازیں پڑھتے جا رہے ہو؟ میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میں نے (جماعت میں شامل ہونے سے پہلے) فجر کی دو سنتیں نہیں پڑھی تھیں۔“

اس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «فَلَا إِذْنَ»^① ”تب پھر کوئی حرج نہیں۔“

اس «فَلَا إِذْنَ» کا تفصیلی معنی اور دیگر متعلقہ تفصیلات ”تحفة الأحوذی“ (۲/ ۴۸۸) میں

① صحیح سنن ابی داؤد، رقم الحدیث (۱۱۲۸) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۳۴۶) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۱۱۵۴)

ملاحظہ فرمائیں۔^①

اس حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے صراحاً فرضوں کے فوراً بعد دو سنتیں پڑھنے کی اجازت دی ہے، کیوں کہ یہ بات تو آپ ﷺ کے منصبِ نبوت کے ہی خلاف ہے کہ آپ ﷺ کوئی غلط کام ہوتا دیکھیں تو اس پر نکیر کریں اور نہ ٹوکیں، بلکہ اسے بحال رہنے دیں۔ یہ آپ ﷺ کی شان ہی کے خلاف بات ہے اور جب اس صحابی کو آپ ﷺ نے منع نہیں فرمایا، بلکہ «فَلَا إِذْنَ» فرما کر اجازت بخشی تو اس کا معنی یہ ہوا کہ یہ جائز ہے۔ اس حدیث سے کبار محدثین کرام رحمہم اللہ نے بھی یہی مفہوم سمجھا ہے۔ چنانچہ امام ترمذی رحمہم اللہ نے بھی اس حدیث پر یہ باب قائم کیا ہے:

”باب فیمن تَفَوُّتَهُ الرَّكْعَتَانِ قَبْلَ الْفَجْرِ یصلیہما بعد صلاة الصبح“
 ”جس کی فجر سے پہلے والی دو رکعتیں فوت ہو جائیں، تو وہ انھیں فجر کے فرضوں کے بعد پڑھ لے۔“

امام ابو داؤد نے یوں تبویب کی ہے:

”باب من فاتتہ متی یقضیہما“

”جس کی یہ دو رکعتیں رہ جائیں، وہ ان کی قضا کب کرے؟“

اس کے بعد حدیث ذکر کی ہے، جس سے ان کا مقصود واضح ہے کہ وہ فرضوں کے بعد پڑھ

لے۔ امام ابن ماجہ کی تبویب ہے:

”باب ما جاء فیمن فاتتہ الرَّكْعَتَانِ قَبْلَ صلاة الفجر متی یقضیہما“

مفہوم اس کا بھی امام ابو داؤد کی تبویب والا ہے۔ سنن ابی داؤد والی حدیث کے الفاظ کچھ یوں

ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے اس صحابی سے مخاطب ہو کر فرمایا:

«صَلَاةُ الصُّبْحِ رَكْعَتَانِ» ”صبح کی نماز تو دو ہی رکعتیں ہیں۔“

اس پر انھوں نے جواب دیا کہ میں نے پہلی دو رکعتیں نہیں پڑھی تھیں، وہ اب ادا کی ہیں:

«فَسَكَتَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ» ”تو نبی اکرم ﷺ خاموش ہو گئے۔“

① نیز دیکھیں: سنن ابی داؤد مع العون (۴/۴۴) سنن الترمذی مع التحفة (۲/۴۸۷، ۴۸۸) سنن ابن ماجہ (۸/

۳۶۵) صحیح ابن خزيمة (۲/۱۶۴) مصنف ابن ابی شیبہ (۲/۲۵۴)

جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے، آپ ﷺ کی خاموشی رضا کی علامت ہوا کرتی تھی، کیوں کہ ”التمہید لابن عبد البر“ میں سہل بن سعد الساعدي رضى الله عنه کی ایک ضعیف السند روایت میں ہے:

« دَخَلْتُ الْمَسْجِدَ وَرَسُولُ اللَّهِ ﷺ فِي الصَّلَاةِ، وَلَمْ أَكُنْ صَلَّيْتُ الرَّكْعَتَيْنِ فَدَخَلْتُ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فِي الصَّلَاةِ فَصَلَّيْتُ مَعَهُ، وَقُمْتُ أَصَلِّي... أَلَمْ تَكُنْ صَلَّيْتُ مَعَنَا؟ قُلْتُ: بَلَى وَلَمْ أَكُنْ صَلَّيْتُ الرَّكْعَتَيْنِ فَصَلَّيْتُ الْآنَ، فَسَكَتَ »

”میں مسجد میں داخل ہوا تو نبی اکرم ﷺ نماز میں تھے، جب کہ میں نے ابھی پہلی دو سنتیں نہیں پڑھی تھیں۔ میں آپ ﷺ کے ساتھ نماز میں شامل ہو گیا اور نماز پڑھ لی، پھر میں نے اٹھ کر نماز (سنتیں) پڑھیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم نے ہمارے ساتھ نماز نہیں پڑھی؟ میں نے کہا: ہاں پڑھی ہے۔ البتہ میں دو سنتیں نہیں پڑھ سکا تھا، وہ میں نے اب پڑھی ہیں۔ پس آپ ﷺ خاموش ہو گئے۔“

اسی حدیث کے آخر میں یہ الفاظ بھی ہیں:

«وَكَانَ إِذَا رَضِيَ شَيْئًا سَكَتَ»

”آپ ﷺ جب کسی کام پر رضا مند ہوتے تو خاموشی اختیار فرماتے تھے۔“

حدیث دوم:

اسی موضوع کی دوسری حدیث صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ میں ہے، جس میں حضرت قیس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انھوں نے نبی اکرم ﷺ کے ساتھ نماز فجر ادا کی اور سنتیں نہیں پڑھ سکے تھے، جب آپ ﷺ نے سلام پھیرا تو انھوں نے کھڑے ہو کر دو سنتیں پڑھیں۔ آگے الفاظ ہیں:

«وَرَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَنْظُرُ إِلَيْهِ فَلَمْ يُنْكَرْ عَلَيْهِ»^①

”جب کہ آپ ﷺ انھیں دیکھ رہے تھے، مگر آپ ﷺ نے نکیر نہیں فرمائی، یعنی منع نہیں کیا۔“

حدیث سوم:

اسی سلسلے کی تیسری حدیث مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے، جس میں فرضوں کے بعد اٹھ کر سنتیں

① موارد الظمان، رقم الحدیث (۶۲۴)

پڑھنے والے صحابی کا بیان ہے کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! میں آیا تو آپ ﷺ نماز شروع کر چکے تھے، میں نے ابھی سنتیں نہیں پڑھی تھیں اور آپ ﷺ کے نماز پڑھانے کے دوران میں جماعت کے پاس کھڑے ہو کر سنتیں پڑھنا میں نے مکروہ و ناپسندیدہ سمجھا۔ لہذا جب جماعت ختم ہوئی تو میں نے دو سنتیں ادا کیں، یہ سن کر نبی اکرم ﷺ ہنسے۔

«فَلَمْ يَأْمُرْهُ وَلَمْ يَنْهَهُ»^(۱) ”پس آپ ﷺ نے نہ کوئی حکم فرمایا اور نہ منع ہی فرمایا۔“

حدیث چہارم:

محلّی ابن حزم میں امام عطاء اللہ ایک انصاری صحابی سے بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فجر کی فرض نماز کے بعد کسی کو نماز پڑھتے دیکھا، پوچھنے پر اس نے بتایا کہ میں نے سنتیں نہیں پڑھیں تھیں اور اب ادا کی ہیں۔

«فَلَمْ يَقُلْ لَهُ شَيْئًا»^(۲) تو آپ ﷺ نے اسے کچھ نہیں فرمایا۔

اسی طرح ”مجمع الزوائد“ میں علامہ بیہقی ”طبرانی کبیر“ کے حوالے سے ایک متکلم فیہ سند والی روایت لائے ہیں، جسے علامہ شمس الحق عظیم آبادی شارح ابوداؤد اپنی کتاب ”إعلام أهل العصر بأحكام ركعتي الفجر“ میں لائے ہیں اور اس کی تصحیح کی ہے۔ اس میں حضرت ثابت بن قیس بن شماس اپنے باپ کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

«أَتَيْتُ الْمَسْجِدَ، وَالنَّبِيَّ ﷺ فِي الصَّلَاةِ فَلَمَّا سَلَّمَ النَّبِيُّ ﷺ اِلْتَفَتَ إِلَيَّ وَأَنَا أُصَلِّي فَلَمَّا فَرَغْتُ قَالَ: أَلَمْ تُصَلِّبِي؟ قُلْتُ: نَعَمْ»

”میں مسجد میں آیا، جب کہ نبی اکرم ﷺ نماز کی حالت میں تھے، جب نبی اکرم ﷺ نے سلام پھیرا تو میری طرف متوجہ ہوئے، جب کہ میں نماز پڑھ رہا تھا، جب میں نماز سے فارغ ہوا تو آپ ﷺ نے پوچھا: کیا تم نے ہمارے ساتھ نماز نہیں پڑھی تھی؟ میں نے عرض کیا: ہاں۔“

تب آپ ﷺ نے فرمایا:

(۱) مصنف ابن أبي شيبة (۲/ ۲۵۳)

(۲) المحلّي بتحقيق دكتور عبد الغفار سليمان، طبع دار الكتب، بيروت.

«فَمَا هَذِهِ الصَّلَاةُ» ”تو پھر یہ کون سی نماز ہے (جواب تم نے پڑھی ہے)؟“

میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول ﷺ!

«رَكَعَتَا الْفَجْرِ، خَرَجْتُ مِنْ مَنْزِلِي وَلَمْ أَكُنْ صَلَّيْتُهُمَا»

”یہ فجر کی سنتیں تھیں، میں گھر سے نکلا تو میں نے وہ سنتیں نہیں پڑھی تھیں۔“

آگے وہ بیان کرتے ہیں:

«فَلَمْ يَعْزُبْ ذَلِكَ عَلَيَّ»

” (یہ سن کر) آپ ﷺ نے پھر میرے اس فعل کو معیوب نہیں کہا۔“

اس حدیث کو محدث ابو موسیٰ نے روایت کیا اور کہا ہے کہ ابن جریج نے اسے عطاء بن ابی رباح

کے حوالے سے قیس بن سہل رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور یہ صحیح بھی ہے۔^①

آثار:

ایسے ہی بعض آثار سے بھی پتا چلتا ہے کہ فجر کے فرضوں کے بعد طلوع آفتاب سے پہلے فجر

کی سنتیں پڑھی جاسکتی ہیں۔ چنانچہ مصنف عبدالرزاق میں ابن جریج رضی اللہ عنہ امام عطاء رضی اللہ عنہ سے بیان

کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا:

«إِذَا أَخْطَأْتُ أَنْ تَرَكَعَهَا قَبْلَ الصُّبْحِ فَارْكَعْهُمَا بَعْدَ الصُّبْحِ»^②

”اگر فجر کی سنتیں فرضوں سے پہلے نہ پڑھ سکو تو فرضوں کے بعد پڑھ لو۔“

امام طاووس کے فرزند اپنے والد سے بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا:

«إِذَا أُقِيمَتِ الصَّلَاةُ وَلَمْ تَرَكَعْ رَكَعَتِي الْفَجْرِ، صَلِّ مَعَ الْإِمَامِ، فَإِذَا فَرَغَ

إِرْكَعْهُمَا بَعْدَ الصُّبْحِ»^③

”جب جماعت کھڑی ہو جائے اور تم نے ابھی سنتیں نہیں پڑھیں تو امام کے ساتھ مل کر

فرض پڑھ لو اور جب وہ (امام) فرضوں سے فارغ ہو تو تم وہ سنتیں پڑھ لو۔“

① إعلام أهل العصر (ص: ۲۳۱)

② مصنف عبد الرزاق (۲/ ۴۴۲)

③ المصدر السابق.

امام عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”رَأَيْتُ ابْنَ جُرَيْجٍ رَكَعَهُمَا بَعْدَ الصُّبْحِ فِي مَسْجِدِ صَنْعَاءَ بَعْدَ مَا سَلَّمَ الْإِمَامُ“^①
 ”میں نے ابن جریج کو دیکھا کہ انھوں نے مسجد صنعاء میں اس وقت فجر کی دو سنتیں پڑھیں، جب امام نے فرضوں کا سلام پھیرا۔“

حاصل کلام یہ ہوا کہ گذشتہ صفحات میں ذکر کردہ چاروں احادیث اور تینوں آثار سے صراحتاً واضح ہو گیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کئی مرتبہ فرضوں کے بعد اٹھ کر فجر کی پہلی سنتیں پڑھی گئیں، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی پر بھی اعتراض نہیں کیا، بلکہ بعض کا تو «فَلَا إِذْنَ» کہہ کر مثبت میں جواب دیا اور بعض کی وضاحت پر کہ ”یہ سنتیں تھیں، جو میں پہلے نہیں پڑھ سکا“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضامندی کی دلیل ہے، ورنہ ناجائز کام دیکھ کر خاموشی اختیار کر لینا تو شانِ نبوت اور مقامِ رسالت کے منافی ہے۔

اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ایسی مخصوص صورت میں فجر کی نماز کے بعد طلوع آفتاب سے پہلے یہ دو سنتیں پڑھی جاسکتی ہیں اور یہ صورت اس عمومی حکم سے مستثنیٰ ہے، جس کی رو سے یہ وقت: اوقاتِ کراہت میں سے ہے۔ یہاں اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتے جائیں کہ فجر کی سنتوں کا اصل وقت اقامت ہو جانے تک ہے۔ اگر اس وقت تک کسی وجہ سے نہ پڑھی جاسکیں تو پھر اقامت ہو جانے کے بعد جماعت کے پاس کھڑے ہو کر یہ سنتیں نہیں پڑھنی چاہئیں، کیوں کہ اقامت ہو جانے کے بعد اس فرضی نماز کے سوا دوسری کوئی نماز نہیں ہوتی۔ چاہے وہ فجر کی سنتیں ہی کیوں نہ ہوں، اس بات کے متعدد دلائل موجود ہیں، جن میں سے کئی احادیث و آثار بھی ہیں۔ ان کے ذکر و تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ ان کا تذکرہ آگے چل کر سنن موکدہ کی تفصیلات کے ضمن میں آئے گا۔ ان شاء اللہ

فجر کے بعد سے مراد:

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ جن احادیث میں فجر کے بعد سے طلوع آفتاب کے وقت کو وقتِ کراہت شمار کیا گیا، وہاں حضرت سعید بن مسیب، حمید اور اہلِ رائے کے نزدیک نمازِ فجر مراد نہیں، بلکہ ”المغنی لابن قدامة“ میں مذکورہ صراحت کی رو سے طلوع فجر

① المصدر السابق.

یعنی اذانوں کا وقت مراد ہے کہ اذانوں کے وقت سے لے طلوع آفتاب تک کے درمیان کوئی نفل نماز یا سنتیں نہیں ہوتیں، سوائے فجر کی دو سنتوں کے۔^(۱)

جیسا کہ سنن ابی داؤد، ترمذی، دارقطنی، بیہقی اور مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے آزاد کردہ غلام یسار بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے مجھے دیکھا کہ میں فجر طلوع ہو جانے کے بعد (نفل) نماز پڑھ رہا ہوں تو فرمایا: اے یسار! نبی اکرم ﷺ (ایک مرتبہ) گھر سے ہمارے پاس مسجد میں تشریف لائے تو ہم ایسی ہی (نفل) نماز پڑھ رہے تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«لِيُبَلِّغُ شَاهِدُكُمْ غَائِبَكُمْ: لَا تُصَلُّوا بَعْدَ الْفَجْرِ إِلَّا سَجْدَتَيْنِ»^(۲)

”تم میں سے جو شخص موجود ہے، وہ غیر حاضر لوگوں تک یہ بات پہنچا دے کہ فجر کے بعد دو سنتوں کے سوا کوئی (غیر فرض) نماز نہ پڑھو۔“

صاحب ”إرواء الغلیل“ نے اس حدیث کے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے چار دیگر طرق بھی ذکر کیے ہیں اور ان طرق کی بنا پر اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ علامہ احمد شاہ رحمہ اللہ نے بھی محلی ابن حزم کی تحقیق (۳/۳۳۳-۳۴۲) میں اسے صحیح کہا ہے۔ اسی مفہوم پر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی احادیث بھی دلالت کرتی ہیں، جن کی اسانید پر بھی محدثین کرام رحمہم نے کلام کیا ہے، لیکن سابقہ حدیث اور اس کے طرق اور ان دونوں احادیث کے مجموعے پر مبنی حدیث کو صحیح کہا گیا ہے۔^(۳)

بہر حال ان میں سے طبرانی اوسط میں مرفوعاً اور بیہقی میں مرسلماً (بسن صحیح) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ والی حدیث کے الفاظ ہیں:

«إِذَا طَلَعَ الْفَجْرُ فَلَا صَلَاةَ إِلَّا رُكْعَتَيِ الْفَجْرِ»^(۴)

”جب فجر طلوع ہو جائے تو پھر کوئی نماز نہیں سوائے فجر کی دو رکعتوں کے۔“

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما والی مصنف ابن شیبہ، سنن دارقطنی، بیہقی، قیام اللیل مروزی، طبرانی کبیر اور مسند بزار کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

[۱] المغنی (۲/۹۶-۹۷) و الفتح الربانی (۲/۲۹۹-۳۰۰)

[۲] إرواء الغلیل (۲/۲۳۳) صحیح سنن أبی داؤد، رقم الحدیث (۱۱۳۸) قیام اللیل للمروزی (ص: ۱۳۷)

[۳] تفصیل کے لیے دیکھیں: إرواء الغلیل (۲/۲۳۲) و تحقیق المحلی أيضاً.

[۴] تفصیل کے لیے ”المغنی لابن قدامة“ ملاحظہ فرمائیں۔ صحیح الجامع، رقم الحدیث (۶۷۸)

«لَا صَلَاةَ بَعْدَ طُلُوعِ الْفَجْرِ إِلَّا رَكَعَتِي الْفَجْرِ»^(۱)

”طلوع فجر کے بعد فجر کی دو سنتوں کے سوا دوسری کوئی (غیر فرضی) نماز نہیں ہے۔“

البتہ حضرت حسن بصری، امام شافعی اور ایک روایت میں امام احمد کے نزدیک یہ بھی فجر کی نماز سے متعلق ہے، طلوع فجر سے نہیں۔^(۲)

طلوع فجر یا اذان فجر کے بعد عام نوافل:

ان احادیث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ طلوع فجر یا اذان فجر کے بعد کی دو سنتوں اور دو فرضوں کے سوا دوسری کوئی نماز پڑھنا جائز نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص حد سے تجاوز کرتے ہوئے اس وقت عام نماز پڑھنا شروع کر دے تو وہ ثواب کے بجائے عتاب و عذاب کو آواز دینے والا ہوگا۔ چنانچہ سنن کبریٰ بیہقی میں صحیح سند کے ساتھ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ انھوں نے ایک آدمی کو دیکھا، جو طلوع فجر کے بعد دو سنتوں کے علاوہ بھی نوافل پڑھتا ہے اور اس نفل نماز میں بکثرت رکوع و سجود کرتا ہے، تو انھوں نے اسے فعل سے منع کیا۔ اس شخص نے کہا: اے ابو محمد:

”يُعَذِّبُنِي اللَّهُ عَلَى الصَّلَاةِ؟“

”کیا اللہ تعالیٰ مجھے نماز پڑھنے پر عذاب دے گا؟“

تو انھوں نے فرمایا:

”لَا وَلَكِنْ يُعَذِّبُكَ عَلَى خِلَافِ السُّنَّةِ“^(۳)

”نہیں (نماز پڑھنے پر تو نہیں البتہ) سنت کی خلاف ورزی کرنے پر عذاب کرے گا۔“

حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ بڑے فکر انگیز ہیں اور اگر کوئی شخص انھیں اچھی طرح سمجھ کر ذہن نشین کرے تو پھر بدعات و خرافات پر کار بند لوگوں کے بکثرت اعمال کے سلسلے میں فیصلہ کرنا آسان ہو جاتا ہے، کیوں کہ اہل بدعت پہلے کسی عمل کو ایجاد کرتے ہیں، پھر اسے نماز اور ذکر الہی کے طور پر پیش کر کے اس کے جائز ہونے کا ڈنڈھورا پیٹنے لگتے ہیں۔ ایسے تمام لوگوں کو

(۱) قیام اللیل للمروزی (ص: ۱۳۷)

(۲) ویکیس: الإرواء (۲/ ۲۳۶)

(۳) صحیح البخاری مع الفتح، رقم الحدیث (۴۴۴) صحیح مسلم مع شرح النووی (۳/ ۵/ ۲۲۵- ۲۲۶) و

صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (۴۴۲) صحیح الجامع، رقم الحدیث (۴۶۰)

حضرت ابن مسیب رضی اللہ عنہ کی یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ کوئی عمل چاہے نماز اور ذکر الہی کی قبیل ہی سے کیوں نہ ہو، جب وہ اس انداز اور اوقات سنت کے مخالف ہو تو وہ ثواب کے بجائے عذاب کا موجب ہوگا۔

تحیۃ المسجد اذانِ فجر کے بعد:

یہ تو عام نوافل کے بارے میں حکم ہے، البتہ بعض محققین نے ایک شکل میں تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں ادا کرنے کی اس وقت بھی اجازت دی ہے، لیکن اس شکل کو سمجھنے سے پہلے یہ بات ذہن میں رہے کہ اگر فجر کی اذان سن کر کسی نے وضو کیا اور مسجد میں آیا۔ جماعت کھڑی ہونے میں ابھی کچھ وقت باقی ہے تو اسے چاہیے کہ ایسے میں وہ تحیۃ المسجد ادا کرنے میں مشغول نہ ہو، بلکہ وہ فجر کی دو سنتیں پڑھ لے، فجر کی یہی سنتیں تحیۃ المسجد سے بھی کفایت کر جائیں گی، لہذا علاحدہ پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ اس طرح ہے، جیسے حجۃ الوداع کے موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد حرام میں داخل ہو کر طواف شروع کر دیا تھا۔ تحیۃ المسجد کی نماز بھی اس میں شامل ہو گئی تھی۔ البتہ اگر کوئی شخص صبح کی دو سنتیں گھر میں ادا کر کے مسجد میں آتا ہے اور جماعت کھڑی ہونے میں ابھی کچھ وقفہ ہے تو وہ تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں پڑھ کر ہی بیٹھے، کیوں کہ صحیح بخاری مسلم اور سنن ابی داؤد میں حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی ہے:

« إِذَا جَاءَ أَحَدُكُمْ الْمَسْجِدَ فَلْيُصَلِّ سَجْدَتَيْنِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَجْلِسَ »

”جب تم میں سے کوئی شخص مسجد میں آئے تو چاہیے کہ بیٹھنے سے پہلے دو رکعتیں پڑھ لے۔“

اس حدیث کے عموم کی رو سے ایسا شخص اس وقت بھی دو رکعتیں پڑھ سکتا ہے، بلکہ اس حدیث کے عموم کے پیش نظر تمام اوقات مکروہہ میں ان دو رکعتوں کی اجازت دی گئی ہے، اس موضوع کی تفصیل ”تحیۃ المسجد“ کے ضمن میں آتی ہے۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل از فرائض اذانِ فجر کے بعد صرف دو سنتیں ہی ثابت ہیں، لہذا تحیۃ المسجد کی یہ دو رکعتیں اس سنت پر اضافہ ہوں گی، جو صحیح نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ اضافہ اس صورت میں ہوگا، جب نئے سرے سے کوئی یہ دو رکعتیں پڑھنے لگے، یعنی مسجد میں بیٹھا تھا، پھر کھڑے ہو کر دو رکعتیں پڑھنے لگا اور پھر سنتیں پڑھیں، جب کہ اذان ہو چکی ہے۔ اس

طرح توبہ ناجائز ہے، لیکن اگر دخول مسجد کی وجہ سے ادا کرے تو یہ نماز ہوگی جو جائز ہے، جیسے باہر سے آنے والا تحیۃ المسجد ادا کرتا ہے۔

ہمارے استاذ شیخ الحدیث حافظ ثناء اللہ صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ بھی یہی ہے، جو ہفت روزہ ”الاعتصام“ لاہور (جلد ۴۲، شمارہ ۳۹، بابت ۲۸ ستمبر ۱۹۹۰ء الموفق ربیع الاول ۱۴۱۱ھ) میں شائع ہو چکا ہے۔

اور ”الکافی“ لابن عبد البر میں ہے:

”وَمَنْ أَتَى الْمَسْجِدَ وَقَدْ رَكَعَ رُكْعَتِي الْفَجْرِ فِي بَيْتِهِ، فَإِنْ شَاءَ رَكَعَ الرَّكْعَتَيْنِ تَحِيَّةَ الْمَسْجِدِ وَإِنْ شَاءَ جَلَسَ وَكُلُّ ذَلِكَ مَبَاحٌ لَهُ وَقَدْ قِيلَ لَا يَرَكْعُهُمَا، وَكِلَاهُمَا صَحِيحٌ عَنِ مَالِكٍ، وَالْأَوْلَى أَوْلَى وَأَحْفَظُ إِنْ شَاءَ اللَّهُ“^(۱)

”جو شخص گھر میں صبح کی دو رکعتیں، یعنی سنتیں پڑھ کر مسجد میں آئے۔ اگر وہ چاہے تو تحیۃ المسجد پڑھ لے اور اگر چاہے تو بغیر (تحیۃ المسجد) پڑھے (مسجد میں) بیٹھ جائے۔ یہ سب کچھ اس کے لیے مباح و جائز ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ تحیۃ المسجد پڑھ لے۔ یہ دونوں (عمل) امام مالک کے نزدیک صحیح ہیں اور پہلی بات (تحیۃ المسجد کو پڑھنا) زیادہ بہتر اور زیادہ محفوظ ہے، ان شاء اللہ۔“

نماز وتر، طلوع فجر کے بعد:

طلوع صبح صادق کے بعد اور نماز فجر سے پہلے پہلے عام نوافل ادا کرنے میں اگرچہ حضرت حسن بصری، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جائز ہے، لیکن اس سلسلے میں صحیح ترین بات وہی ہے، جو ذکر کی چکی ہے کہ فجر کی سنتوں یا ایک مخصوص شکل میں تحیۃ المسجد کے علاوہ عام نوافل جائز نہیں ہیں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے طلوع فجر کے بعد وتر ادا کرنے کو جائز قرار دیا ہے اور دلیل کے طور پر کئی آثار نقل کیے ہیں، مثلاً: ان کے بلاغات میں سے ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، قاسم بن محمد اور حضرت عبد اللہ بن عامر بن ربیعہ رحمۃ اللہ علیہ نے طلوع فجر کے بعد وتر پڑھے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے:

(۱) الکافی لابن عبد البر (۱/۱۹۶) تحقیق ڈاکٹر محمد محمد موریتانی. طبع مکتبة الرياض الحديثية.

(۲) الموطأ مع التنوير (۱/۱۴۷)

”مَا أَبَالِي لَوْ أُقِيمَتْ صَلَاةُ الصُّبْحِ وَأَنَا أُوتِرُ“^①

”میں اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ صبح کی اقامت ہو جائے، جب کہ میں وتر پڑھ رہا ہوں۔“
یحییٰ بن سعید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

”كَانَ عِبَادَةَ بِنِ الصَّامِتِ يَوْمٌ قَوْمًا فَخَرَجَ يَوْمًا إِلَى الصُّبْحِ فَأَقَامَ الْمُؤَذِّنُ صَلَاةَ الصُّبْحِ فَأَسَكَّتَهُ عِبَادَةُ حَتَّىٰ أَوْتَرَ، ثُمَّ صَلَّى بِهِمُ الصُّبْحَ“^②

”حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ قوم کی امامت کرواتے تھے۔ ایک دن وہ فجر کے لیے آئے تو مؤذن نے اقامت کہہ دی۔ حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ نے اسے خاموش کر دیا اور وتر پڑھے۔ پھر صبح کی نماز پڑھائی۔“

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

”إِنَّ عَبَّاسَ رَقَدَ ثُمَّ اسْتَيْقَظَ فَقَالَ لِخَادِمِهِ: أَنْظِرْ مَاذَا صَنَعَ النَّاسُ؟ وَهُوَ يَوْمَئِذٍ قَدْ ذَهَبَ بَصْرُهُ، فَذَهَبَ الْخَادِمُ، ثُمَّ رَجَعَ فَقَالَ: قَدْ انْصَرَفَ مِنَ الصُّبْحِ فَقَامَ ابْنُ عَبَّاسٍ فَأَوْتَرَ ثُمَّ صَلَّى الصُّبْحَ“^③

”حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سو گئے اور پھر بیدار ہوئے، پھر انھوں نے اپنے خادم سے کہا کہ جاؤ دیکھو! لوگوں نے کیا کیا ہے؟ ان دنوں ان کی آنکھوں کی بصارت ختم ہو چکی تھی۔ خادم گیا اور آ کر اس نے بتایا کہ لوگ فجر کی نماز ادا کر چکے ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اٹھے، انھوں نے پہلے نماز وتر پڑھی اور پھر نماز فجر ادا کی۔“

ایسے ہی بعض مرفوع آثار بھی ہیں۔ مثلاً سنن ابی داود، ترمذی، ابن ماجہ، مسند احمد اور مستدرک حاکم

میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے:

«مَنْ نَامَ عَنِ الْوُتْرِ أَوْ نَسِيَهُ فَلْيُوتِرْ إِذَا ذَكَرَهُ أَوْ إِذَا اسْتَيْقَظَ»^④

① حوالا بالا

② حوالا بالا.

③ حوالہ بالہ.

④ الفتح الرباني (۲/ ۳۱۲) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (۱۲۶۸) صحيح سنن الترمذی، رقم الحديث (۳۸۶) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۱۸۸) وقال حاکم صحيح على شرط الشيخين وصححه العراقي إسناده طريق أبي داود.

”جس کے وتر نیند یا بھول جانے کی وجہ سے رہ جائیں، جب اسے یاد آجائیں یا وہ نیند سے بیدار ہو جائے تو وتر پڑھ لے۔“

اسی طرح مسند احمد اور طبرانی اوسط میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يُصْبِحُ فَيُوتِرُ»

”رسول اللہ ﷺ صبح کے وقت وتر پڑھ لیا کرتے تھے۔“

سنن بیہقی اور مستدرک حاکم (صحیح) میں حضرت ابو داؤد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«رُبَّمَا رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يُوتِرُ وَقَدْ قَامَ النَّاسُ لِصَلَاةِ الصُّبْحِ»^①

کبھی کبار میں رسول اللہ ﷺ کو وتر پڑھتے دیکھتا، جب کہ لوگ نماز فجر کے لیے کھڑے ہو گئے ہوتے۔“

عصر کے بعد قضاے فوائت و فرائض اور سنن راتبہ:

مستثنیٰ صورتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ نماز عصر کے بعد فوت شدہ نمازیں فرض ہوں یا عام، سبھی نمازیں ہوں یا پھر سنن راتبہ، ان کی قضا دی جاسکتی ہے، جیسا کہ نبی اکرم ﷺ سے یہ ثابت ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری ”باب ما صلّیٰ بعد العصر من الفوائت و نحوھا“ کے ترجمہ میں تعلیقاً اور مختصراً، اسی طرح ”باب إذا کلم وهو یصلّی فأشار بیدہ“ میں موصولاً اور تفصیلاً روایت ہے، جو بخاری شریف کے علاوہ صحیح مسلم، سنن ابی داؤد و دارمی اور معانی الآثار طحاوی میں بھی ہے۔ یہ حدیث تو طویل ہے، البتہ اس میں یہ بھی ہے کہ ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کو نماز عصر کے بعد دو رکعتیں پڑھتے ہوئے دیکھا تو ایک لڑکی کو بھیجا کہ پوچھ کر آؤ کہ آپ ﷺ تو ان دو رکعتوں سے روکتے ہیں اور میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ ﷺ خود پڑھ رہے ہیں؟ اس لڑکی نے ام المومنین رضی اللہ عنہا کا یہ پیغام آپ ﷺ کو نماز کے دوران ہی سنا دیا تو آپ ﷺ نے اسے اپنے دست مبارک سے اشارہ کیا تو وہ پیچھے ہٹ گئی۔ جب آپ ﷺ نماز پڑھ چکے تو فرمایا:

«يَا بِنْتُ أَبِي أُمَيَّةَ! سَأَلْتِ عَنِ الرَّكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْعَصْرِ وَإِنَّهُ أَتَانِي نَاسٌ مِنْ

① حوالہ بالا، و الإرواء (۲/۱۵۵)

عَبْدِ الْقَيْسِ فَشَعَلُونِي عَنِ الرَّكْعَتَيْنِ الَّتَيْنِ بَعْدَ الظُّهْرِ فَهَمَّا هَاتَانِ⁽¹⁾
 ”اے ابو امیہ کی بیٹی! تم نے عصر کے بعد دو رکعتوں کے بارے میں پوچھا ہے۔ میرے پاس بنو عبد القیس کے کچھ لوگ آئے تھے تو انھوں نے مجھے ظہر کے بعد والی دو رکعتوں سے مشغول کر دیا تھا۔ یہ دو رکعتیں (جو میں نے اب پڑھی ہیں) وہی تھیں۔“

اس حدیث کا دوسرا طریق سنن نسائی اور مسند احمد میں ہے، جس کی سند کو بھی صحیح قرار دیا گیا ہے۔⁽²⁾ اس طریق روایت میں بنو عبد القیس کے بجائے بنو تمیم ہے اور معانی الآثار طحاوی میں بھی بنو تمیم کی روایت ہے۔ حافظ عسقلانی رحمہ اللہ نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ بنو عبد القیس ہی صحیح ہے اور بنو تمیم کی روایت غلط ہے۔⁽³⁾

اسی موضوع کی ایک حدیث صحیح بخاری و مسلم، سنن نسائی اور مسند احمد میں اُم المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہے، جس میں وہ بیان فرماتی ہیں:

«رَكَعَتَانِ لَمْ يَكُنْ يَدْعُهُمَا سِرًّا وَلَا عَلَانِيَةً رَكَعَتَانِ قَبْلَ صَلَاةِ الصُّبْحِ وَرَكَعَتَانِ بَعْدَ الْعَصْرِ»⁽⁴⁾

”دو رکعتیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم درپردہ اور علانیہ کسی طرح بھی نہیں چھوڑا کرتے تھے۔ دو رکعتیں فجر کے فرضوں سے پہلے اور دو رکعتیں نماز عصر کے بعد۔“

بخاری شریف کی ایک روایت میں وہ فرماتی ہیں:

«وَكَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُصَلِّيهِمَا وَلَا يُصَلِّيهِمَا فِي الْمَسْجِدِ مَخَافَةَ أَنْ يُثَقَّلَ عَلَى أُمَّتِهِ وَكَانَ يُحِبُّ مَا يُخَفِّفُ عَنْهُمْ»⁽⁵⁾

”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے، مگر مسجد میں نہیں پڑھا کرتے تھے، تاکہ

(1) صحیح البخاری مع الفتح (۲/ ۶۳، ۳/ ۱۰۵) صحیح مسلم مع شرح النووی (۳/ ۶، ۱۱۹-۱۲۱) صحیح

سنن أبي داود، رقم الحديث (۱۱۳۴) الإرواء (۲/ ۱۸۷) صحیح الجامع (۳/ ۶، ۶۸۶)

(2) إرواء الغلیل (۲/ ۱۸۸)

(3) فتح الباری (۳/ ۱۰۶)

(4) صحیح البخاری (۲/ ۶۴) صحیح مسلم (۳/ ۶، ۱۲۲) صحیح سنن النسائی، رقم الحديث (۵۶۲)

الإرواء (۲/ ۱۸۸-۱۸۹)

(5) حوالہ بالا

امت کے لیے بوجھ نہ بن جائیں اور آپ ﷺ اس چیز کو پسند فرماتے تھے، جو آپ ﷺ کی امت کے لیے ہلکی پھلکی ہو۔“

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ عصر کے بعد فوت شدہ فرضی نمازوں اور سننِ راتبہ یعنی سننِ موکدہ کی قضا دی جاسکتی ہے اور یہ عصر کے بعد والے وقتِ کراہت سے ایک مستثنیٰ صورت ہے۔

دوامِ عمل یکے از خصائصِ مصطفیٰ ﷺ:

نبی اکرم ﷺ کی یہ دو سنتیں تو ایک بار قضا ہوئی تھیں، لیکن آپ ﷺ ان احادیث کی رو سے پھر ہمیشہ ہی دو رکعتیں عصر کے بعد پڑھا کرتے تھے، اگرچہ اس دن سے پہلے ایسا نہیں کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا والی حدیث سے پتا چلتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جس دن نمازِ ظہر کی آخری دو سنتیں قضا ہوئی تھیں، اس دن تو آپ ﷺ نے ان کی قضا دی، پھر بعد میں کیوں پڑھا کرتے تھے؟ تو اس کا جواب صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں موجود ہے، جس میں وہ ارشاد فرماتی ہیں:

«كَانَ إِذَا صَلَّى صَلَاةً اثْبَتَهَا»^①

”نبی اکرم ﷺ جب کوئی نماز پڑھتے تو پھر اس پر ہمیشگی اختیار کرتے تھے۔“

گویا یہ آپ ﷺ کی عادت مبارکہ اور آپ ﷺ کے خصائص میں سے تھا۔ امام نووی رحمہ اللہ نے شرح صحیح مسلم میں لکھا ہے کہ بعد کی سنتوں کو ادا کرنے پر دوام اور ہمیشگی تو آپ ﷺ کے خصائص میں سے ہے۔ البتہ ایسی موکدہ سنتوں کی اوقاتِ کراہت میں قضا کو آپ ﷺ نے خصائص میں سے نہیں بتایا، بلکہ آپ ﷺ نے یہ بیان فرمایا کہ یہ ظہر کی دو سنتیں ہیں اور یہ نہیں فرمایا کہ یہ فعل صرف میرے ہی ساتھ خاص ہے اور آپ ﷺ کا سکوت فرمانا جوازِ اقتدا کی اظہارِ دلیل ہے۔^②

حافظ ابن حجر نے ”فتح الباری“ میں لکھا ہے کہ ان احادیث کی بنا پر اہل علم کے تین مختلف

نظریات ہیں:

① اوقاتِ مکروہہ میں فوت شدہ نمازوں کی قضا دی جاسکتی ہے۔

① صحیح مسلم (۱۲۲/۶/۳) صحیح الجامع (۲۲۵/۴/۲)

② شرح صحیح مسلم للنووی (۱۲۱/۶/۳)

- ② یہ فعل نبی اکرم ﷺ کے خصائص میں سے ہے۔
- ③ جس شخص کے ساتھ ایسا ہی واقعہ پیش آجائے، جیسا کہ آپ ﷺ کو پیش آیا تھا تو یہ اسی کے ساتھ خاص ہے۔^①

ایک دوسرے مقام ”باب ما یصلیٰ بعد العصر من الفوائت ونحوها“ میں وارد شدہ احادیث بخاری کی شرح میں لکھا ہے کہ ان احادیث کو ان علما نے بھی بنیاد بنایا ہے، جو کہتے ہیں کہ نماز عصر کے بعد مطلقاً نوافل جائز ہیں، جب تک کہ غروب آفتاب کے وقت نماز کا قصد نہ ہو (اور ہم اس سند میں مختلف مذاہب نقل کر چکے ہیں) اور جن کے نزدیک اس وقت مطلقاً نوافل مکروہ ہیں، انہوں نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ آپ ﷺ کا یہ فعل گرامی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اگر سنن موکدہ میں سے کوئی چیز رہ جائے تو اسے بلا کراہت ان اوقات مکروہہ میں قضا کیا جاسکتا ہے۔ رہا آپ ﷺ کا ان دو رکعتوں پر ہیبتی کرنا تو یہ آپ ﷺ کے خصائص میں سے ہے۔ جیسا کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا والی حدیث «كَانَ إِذَا صَلَّى صَلَاةً أَنْبَتَهَا» سے پتا چلتا ہے۔

امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان دو رکعتوں کے عصر کے بعد ادا کرنے پر ہیبتی کرنا تو یہ آپ ﷺ کے خصائص میں سے تھا نہ کہ اصل قضا کرنا اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے آزاد کردہ غلام حضرت ذکوان نے جو روایت بیان کی ہے (جو مسند احمد اور معانی الآثار طحاوی میں مروی ہے) کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے نبی اکرم ﷺ سے پوچھا:

«أَنْقُضِيهِمَا إِذَا فَاتَتَا؟»

”اگر کبھی (ہم سے بھی یہ دو سنتیں رہ جائیں تو کیا ہم بھی ان کی قضا دیں؟“

تو آپ ﷺ نے فرمایا: «لَا» ”نہیں۔“

یہ روایت ضعیف ہے، جس سے حجت قائم نہیں ہوتی۔ امام بیہقی رحمہ اللہ کا یہ کلام نقل کرنے کے بعد حافظ عسقلانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ طحاوی رحمہ اللہ نے یہ روایت بیان کی ہے اور اس سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ یہ (دو سنتیں قضا کرنا) آپ ﷺ کے خصائص میں سے تھا، لیکن اس پر کلام کیا گیا ہے۔^②

① فتح الباری (۳/۶/۱۲۱)

② فتح الباری (۲/۶۴-۶۵)

تحقیق روایت:

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو نقل کر کے ضعیف اور ناقابل حجت قرار دیا ہے اور امام طحاوی کی تخریج کا حوالہ دے کر حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس روایت سے استدلال کے ضعف پر اشارتاً کلام کیا ہے۔ وہ روایت نہ صرف یہ کہ معانی الآثار طحاوی میں ہے، بلکہ صحیح ابن حبان (۶۲۳-الموارد) سے اس کا ضعف واضح کیا ہے۔ مثلاً یہ کہ اس میں اُم المؤمنین حضرت اُم سلمہ اور حضرت ذکوان کے مابین انقطاع پایا جاتا ہے اور دوسرے یہ کہ اس کے ایک راوی حماد سے آگے بیان کیا ہے۔ لہذا یہ الفاظ شاذ ہیں۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ حدیث سنن نسائی اور مسند احمد میں کئی طرق سے حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، لیکن ان میں سے کسی میں بھی یہ اضافی الفاظ نہیں ہیں۔^(۱) ان الفاظ پر مشتمل حدیث کو علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے منکر قرار دیا ہے، کیوں کہ ان کے بقول حماد بن سلمہ کی کتب میں یہ حدیث موجود ہی نہیں ہے، نیز یہ منقطع بھی ہے اور ذکوان نے اُم سلمہ رضی اللہ عنہا سے نہیں سنا، پھر انھوں نے آگے اس کی دلیل بھی ذکر کی ہے۔^(۲)

علامہ ابن باز کی نگرانی میں فتح الباری کی جو تحقیق شائع ہوئی ہے، اس میں لکھا ہے کہ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ذکوان والی حدیث کو ضعیف کہا ہے (جسے حافظ عسقلانی اور علامہ البانی نے بھی ضعیف قرار دیا ہے) وہ ایسے (ضعیف) نہیں ہے، بلکہ اس کی سند حسن درجے کی ہے۔^(۳)

فتح الباری کی اس تحقیق میں جو بات کہی گئی ہے، اس کی کچھ تائید سنن ابوداؤد کی ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے، جس میں حضرت ذکوان ہی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے ان سے کہا:

«إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَانَ يُصَلِّي بَعْدَ الْعَصْرِ، وَيَنْهَى عَنْهَا، وَيُؤَاصِلُ وَيَنْهَى
عَنِ الْوَصَالِ»^(۴)

(۱) إرواء الغلیل (۲/ ۱۸۸)

(۲) المحلی (۲/ ۲۷۱)

(۳) تحقیق فتح الباری (۲/ ۶۵)

(۴) دیکھیں: الإرواء (۲/ ۱۸۹)

”نبی اکرم ﷺ نمازِ عصر کے بعد خود تو (یہ دو رکعتیں) پڑھا کرتے تھے، لیکن دوسروں کو اس سے روکتے تھے اور آپ ﷺ (افطاری ترک کر کے روزوں کے مابین) وصال کیا کرتے تھے، لیکن دوسروں کو وصال کرنے سے روکتے تھے۔“

اس حدیث کی سند کے تمام راوی تو ثقہ ہیں، لیکن محمد بن اسحاق مدلس ہیں اور انھوں نے عنعنہ سے یہ روایت بیان کی ہے۔^①

اگر کوئی مدلس راوی عنعنہ سے روایت بیان کرے تو محدثین اسے ضعیف شمار کرتے ہیں اور اگر وہ تحدیث کی صراحت کر دے تو پھر تدلیس کی وجہ سے پیدا شدہ ضعف ختم ہوتا ہے، لیکن اس حدیث میں ایسا نہیں ہے، بلکہ حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا کو منکر کہا گیا ہے، کیوں کہ خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے صحیح سند کے ساتھ مسند احمد (۶/۱۳۵) میں مروی ہے کہ جب ان سے عصر کے بعد نماز پڑھنے کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے اس کی اجازت دی۔ نیز صحیح بخاری میں یہ ثابت ہے کہ وہ خود عصر کے بعد نماز پڑھا کرتی تھیں۔

یہ امور اس بات کی دلیل ہیں کہ ابن اسحاق والی اس روایت میں خطا اور نکارت پائی جاتی ہے۔ یہ تو عصر کے بعد نماز پڑھنے کی نسبت سے ہے، البتہ اسی حدیث کا دوسرا حصہ جو روزوں میں وصال کرنے کی ممانعت کے بارے میں ہے تو وہ صحیحین میں متعدد صحابہ کرام سے مروی احادیث سے ثابت ہے اور جہاں تک عصر کے بعد نماز کا تعلق ہے تو اس کی ممانعت اس سے ثابت نہیں ہوتی، کیوں کہ یہ منکر اور ناقابلِ حجت ہے، پھر یہ حدیث بتاتی ہے کہ خود نبی اکرم ﷺ کے عصر کے بعد دو رکعتیں پڑھنے کے بعد یہ ممانعت صادر ہوئی، جب کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی وفد بنی عبد القیس والی صحیحین کی سابق میں ذکر کردہ حدیث سے پتا چلتا ہے کہ ممانعت کا صدور پہلے سے تھا اور آپ ﷺ نے وہ دو رکعتیں اس کے بعد پڑھی تھیں۔

اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ عصر کے بعد ظہر کی دو رکعتوں کی قضا کا حکم منسوخ بھی نہیں ہوا ہے۔ ”إعلام أهل العصر بأحكام ركعتي الفجر“ میں علامہ شمس الحق عظیم آبادی نے ان احادیث کے ضعف و انکار کے علاوہ بعض دیگر اسباب و علل بھی ذکر کیے ہیں۔

① حوالہ سابقہ و نیل الأوطار (۲/۳/۹۲)

مختصر یہ کہ نماز عصر کے بعد فوت شدہ نماز کی قضا کی مشروعیت واضح ہے اور از روے دلیل یہی راجح ہے اور خصائص کے ساتھ مربوط کرنے والی مذکورہ دونوں روایات منکر ہیں۔^(۱)

عدم اطلاق:

یہاں یہ بات بھی ذکر کرتے جائیں کہ جن احادیث میں عصر کے بعد نماز کی ممانعت آئی ہے، وہاں بعض محققین کے نزدیک مطلق ممانعت مراد نہیں، بلکہ وہاں سورج کے زرد پڑ جانے اور غروب ہونے کے قریب ہونے کے اوقات کی ممانعت مراد ہے، اس قید کا پتا بھی بعض صحیح احادیث اور آثار صحابہ سے چلتا ہے، جیسا کہ سنن ابو داؤد و نسائی، صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ، مسند احمد و طیالسی، منشی ابن جارود، الاحادیث المختار للضیاء المقدسی، مسند ابی یعلیٰ، سنن کبریٰ بیہقی، مصنف ابن ابی شیبہ اور محلی ابن حزم میں صحیح و قوی سند کے ساتھ امیر المؤمنین حضرت علیؑ سے مروی ہے:

«نَهَى عَنِ الصَّلَاةِ بَعْدَ الْعَصْرِ إِلَّا وَالشَّمْسُ (بِضَاءٍ) مُرْتَفِعَةً»^(۲)

”نبی اکرم ﷺ نے عصر کے بعد (نفل) پڑھنے سے منع فرمایا، سوائے اس کے کہ جب تک سورج سفید اور کافی بلند ہو، یعنی ابھی زردی مائل نہ ہوا ہو تو اس وقت تک گنجائش ہے۔“

اس حدیث کو ”المحلی“ میں علامہ ابن حزمؒ نے، ”طرح التثريب“ میں حافظ عراقیؒ نے اور ”فتح الباری“ میں حافظ ابن حجرؒ نے صحیح قرار دیا ہے۔^(۳) ایسے ہی اس حدیث کا ایک دوسرا طریق بھی ہے جو مسند احمد، صحیح ابن خزیمہ (۲/ ۲۶۵- تحقیق عظمیٰ) اور مسند ابی یعلیٰ میں ہے، جس کی سند کو بعض کبار محدثین نے جید قرار دیا ہے۔ اس سے بھی پہلے طریق کو قوت ملتی ہے۔ اس میں حضرت علیؑ سے مروی حدیث نبوی کے الفاظ یہ ہیں:

① تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة (۲/ ۳۵۱-۳۵۲) اس میں حافظ ابن حزم، ابن حجر اور شوکانی کے کلام پر نقد کیا گیا ہے۔

② صحیح ابن حبان (الموارد) بحوالہ السلسلة الصحيحة (۱/ ۳۴۱) فتح الباری (۲/ ۶۱-۶۳) الإرواء (۲/ ۲۳۷) صحیح ابن خزیمہ (۲/ ۲۶۵) صحیح سنن أبی داؤد، رقم الحدیث (۱۱۳۵) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۵۵۸)

③ السلسلة الصحيحة (۱/ ۳۴۴)

«لَا تَصَلُّوا بَعْدَ الْعَصْرِ إِلَّا أَنْ تَصَلُّوا وَالشَّمْسُ مُرْتَفِعَةٌ»^(۱)

”عصر کے بعد نماز نہ پڑھو، سوائے اس کے کہ سورج ابھی بلند ہو، یعنی زرد نہ ہوا ہو۔“

اس حدیث کی شاہد ایک دوسری حدیث بھی ہے، جو مسند ابی یعلیٰ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے

مروی ہے اور اس کی سند کو حسن قرار دیا گیا ہے۔ اس میں ارشاد نبوی ہے:

«لَا تَصَلُّوا عِنْدَ طُلُوعِ الشَّمْسِ، وَلَا عِنْدَ غُرُوبِهَا فَإِنَّهَا تَطْلُعُ وَتَغْرُبُ عَلَى قَرْنِ شَيْطَانٍ، وَصَلُّوا بَيْنَ ذَلِكَ مَا شِئْتُمْ»^(۲)

”سورج کے طلوع ہوتے وقت اور اس کے غروب ہوتے وقت نماز مت پڑھو، کیوں کہ سورج

شیطان کے سینگوں پر طلوع ہوتا اور غروب ہوتا ہے اور اس کے مابین جو چاہو پڑھو۔“

سورج کے شیطان کے سینگوں پر طلوع یا غروب ہونے سے کیا مراد ہے۔ اس سلسلے میں

اہل علم نے کافی کچھ کہا ہے، مختصر یہ کہ ان اوقات میں شیطان اپنے سینگ افق کے اس مقام پر سورج

کے سامنے کر دیتا ہے، جہاں اس کے غروب یا طلوع ہو جانے کا مقام ہے اور سورج کی پرستش کرنے

والے چونکہ اس وقت سورج کی پوجا کرتے اور اسے سجدہ کرتے ہیں تو شیطان یہ باور کراتا ہے کہ یہ

لوگ مجھے سجدہ کر رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ عین طلوع و غروب کے وقت نماز پڑھنے سے منع کیا گیا

ہے، تاکہ سورج پرستوں سے مشابہت نہ ہونے پائے اور شیطان کی ہوا نہ بندھے۔ یہ وجہ احادیث

میں بھی مذکور ہے، جو آگے چل کر آئے گی۔ البتہ مجبوری کی شکل اس سے مستثنیٰ ہے، جس کی تفصیل بھی

آگے چل کر آئے گی۔ طلوع و غروب جیسا معاملہ تب بھی ہے، جب سورج عین سر پر ہو۔

بہر حال جو احادیث ابھی ہم نے ذکر کی ہیں، ان سے معلوم ہوا کہ عصر کے بعد نماز کی ممانعت

والی احادیث مطلق ہیں اور ان احادیث سے ان کی تقید ہو جاتی ہے، جن میں عصر سے لے کر غروب

تک نماز کی ممانعت آئی ہے، انہیں سورج کے زرد پڑ جانے سے لے کر اس کے غروب ہونے تک کے

وقت پر محمول کرنا پڑے گا۔

حافظ عراقی رحمہ اللہ کے بقول حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا یہی مسلک تھا کہ سورج کے زرد

[۱] السلسلة الصحيحة (۱/۳۴۴) صحيح ابن خزيمة (۲/۲۶۵)

[۲] السلسلة الصحيحة (۱/۵۶)

پڑ جانے تک نماز پڑھی جاسکتی ہے۔ علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی مسلک اختیار کیا ہے اور دیگر محدثین میں سے امام ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ کا بھی اختیار یہی ہے، جیسا کہ ان کی تبویب (۲/۲۶۵) سے ظاہر ہے۔ دورِ حاضر کے معروف محدث علامہ البانی نے بھی اس کی تائید کی ہے۔^①

اس مسلک کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمۃ اللہ علیہم سے ثابت ہے کہ وہ نمازِ عصر کے بعد دو رکعات پڑھا کرتے تھے، حتیٰ کہ علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے ”المحلی“ میں چاروں خلفائے راشدین اور متعدد کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمۃ اللہ علیہم کے اسمائے گرامی ذکر کیے ہیں، جو عصر کے بعد دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔ جسے تفصیل مطلوب ہو، وہ محلی ابن حزم دیکھ سکتا ہے۔^②

یہ تو عصر کے بعد دو رکعتوں سے متعلق ہوا، جب کہ مؤذن رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے ”المحلی“ ہی میں صحیح سند کے ساتھ مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا:
 ”لَمْ يَنْهَ عَنِ الصَّلَاةِ إِلَّا عِنْدَ غُرُوبِ الشَّمْسِ“^③
 ”عصر کے بعد نماز سے منع نہیں کیا گیا، سوائے غروبِ آفتاب کے قریبی وقت کے۔“
 حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے مروی اس اثر سے اصل موضوع کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

عصر کے بعد سے مراد:

اس اطلاق و تقیید کی بحث سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ نمازِ عصر کے بعد والی ممانعت مطلق نہیں ہے، بلکہ سورج کے بلند نہ ہونے یا زرد ہو جانے سے مقید ہے، جیسا کہ بعض کبار ائمہ کا مسلک ہے۔ ہاں اگر اسے معروف فقہی مسلک کے مطابق مطلقاً ممنوع ہی مان لیا جائے کہ عصر کے بعد نوافل وغیرہ مطلقاً منع ہیں، سورج بلند ہو یا زرد ہو چکا ہو تو اس اطلاق و عموم کی صورت میں اس ممانعت کا تعلق نمازِ عصر ادا کرنے سے ہوگا نہ کہ دخولِ وقت سے، کیوں کہ فجر کے ساتھ تعلق رکھنے والی ممانعت کو دخولِ وقت سے متعلق قرار دیا گیا ہے کہ طلوعِ فجر کے بعد نقلی نماز منع ہے۔ سوائے دو سنتوں

① السلسلة الصحيحة (۱/۳۴۴-۵۶۱)

② المحلی (۳/۲-۷)

③ المحلی (۳/۴)

کے، لیکن عصر کے سلسلے میں اہل علم نے وضاحت کی ہے کہ اس کا تعلق وقت کے داخل ہو جانے سے نہیں، بلکہ نماز عصر کے ادا کر لینے سے ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کسی شخص نے ابھی عصر کی نماز نہیں پڑھی، اگرچہ عصر کا وقت کب سے ہو چکا ہے تو وہ شخص تحیۃ الوضوء، تحیۃ المسجد یا عام نوافل پڑھ سکتا ہے اور جب وہ عصر پڑھ لے گا تو پھر اس کے لیے نوافل کی ممانعت ہوگی۔ اس طرح فجر اور عصر سے متعلقہ ممانعت کے مابین فرق ہو گیا۔ عصر سے متعلقہ ممانعت نماز کے ساتھ خاص ہونے کے بارے میں امام ابن قدامہ رحمہ اللہ ”المغنی“ میں لکھتے ہیں کہ اہل علم مطلقاً نماز عصر کے بعد نوافل کی ممانعت کے قائل ہیں۔ اس سلسلے میں علما کا کوئی اختلاف ہمارے علم میں نہیں ہے۔^(۱)

اس کا معنی یہ ہوا کہ امام ابن قدامہ رحمہ اللہ کے نزدیک تمام علما کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اطلاق ممانعت کی شکل میں اس کا حکم نماز ادا کرنے کے بعد سے تعلق رکھتا ہے۔ محض عصر کا وقت ہو جانے سے نہیں۔

نماز طواف:

انہی مستثنیٰ نمازوں میں سے طواف بیت اللہ کے بعد پڑھی جانے والی دو رکعتیں، یعنی نماز طواف بھی ہے، جسے ان ممنوع اوقات میں بھی پڑھا جا سکتا ہے، کیوں کہ سنن اربعہ، صحیح ابن حبان، مستدرک حاکم اور مسند احمد میں حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے متولیان کعبہ بنی عبدمناف سے مخاطب ہو کر فرمایا:

« يَا بَنِي عَبْدِ مَنَافٍ! لَا تَمْنَعُوا أَحَدًا طَافَ بِهَذَا الْبَيْتِ وَصَلَّى آيَةَ سَاعَةٍ
شَاءَ مِنْ لَيْلٍ أَوْ نَهَارٍ »^(۲)

”اے بنی عبدمناف! کسی ایسے شخص کو مت روکو، جو بیت اللہ کا طواف کرے یا نماز پڑھے، دن کا وقت ہو یا رات کا۔“

(۱) المغنی (۱۶/۲) تحقیق محمد خلیل ہراس، طبع مصر.

(۲) صحیح سنن ابی داؤد، رقم الحدیث (۱۶۶۸) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۶۸۸) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۵۷۰) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۱۲۵۴) صحیح ابن حبان (الموارد)، رقم الحدیث (۶۲۶) صحیح الجامع (۳/۶/۲۸۶)

سوئے رہ جانے یا بھول جانے والے کی نماز:

یہی معاملہ اس شخص کا بھی ہے، جو سویا رہ جائے یا اسے سرے سے نماز بھول جائے اور یاد نہ رہے کہ اس نے فلاں نماز ابھی ادا ہی نہیں کی۔ ایسا شخص ان تمام اوقات مکروہہ میں بھی نماز پڑھ سکتا ہے۔ جیسا کہ نبی اکرم ﷺ کے ارشادات سے پتا چلتا ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری و مسلم، صحیح ابن حبان، سنن اربعہ، دارمی، بیہقی، مصنف ابن ابی شیبہ، مسند احمد اور معانی الآثار طحاوی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ نَسِيَ صَلَاةً فَلْيُصَلِّ إِذَا ذَكَرَهَا، لَا كَفَّارَةَ لَهَا إِلَّا ذَلِكَ»

”جو شخص کوئی نماز بھول جائے تو اس کا کفارہ یہی ہے کہ یاد آتے ہی اسے پڑھ لے۔“

آخر میں ہے کہ آپ ﷺ نے سورت طہ (آیت: ۱۴) کی تلاوت کی، جس میں ارشاد الہی ہے:

﴿وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي﴾^① ”اور نماز قائم کر میرے ذکر کے لیے“

یہ بخاری شریف کے الفاظ ہیں، جب کہ مسلم شریف میں ہے:

«إِذَا رَقَدَ أَحَدُكُمْ عَنِ الصَّلَاةِ أَوْ غَفَلَ عَنْهَا فَلْيُصَلِّهَا إِذَا ذَكَرَهَا، فَإِنَّ اللَّهَ يَقُولُ: ﴿وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي﴾»^②

”اگر تم میں سے کوئی نماز سے سویا رہ جائے یا اس سے غافل رہے تو یاد آتے ہی اسے پڑھ لے۔ ارشاد الہی ہے: میرے ذکر کے لیے نماز قائم کرو۔“

صحیح مسلم ہی کی ایک روایت میں ہے:

«مَنْ نَسِيَ صَلَاةً أَوْ نَامَ عَنْهَا، فَكَفَّارَتُهَا أَنْ يُصَلِّيَهَا إِذَا ذَكَرَهَا»

”جو شخص کوئی نماز بھول جائے یا اس سے سویا رہ جائے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ یاد آتے ہی اسے پڑھ لے۔“

اس بات پر اہل علم میں اختلاف رائے ہے کہ قرآن کریم کی آیت کے مذکورہ بالا الفاظ خود نبی اکرم ﷺ پڑھے تھے یا حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کرنے والے راوی حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہے ہیں؟

① صحیح البخاری مع الفتح، رقم الحدیث (۵۱۷)

② صحیح مسلم مع شرح النووي (۱۹۳/۵/۳)

صحیح بخاری کے الفاظ میں تو اس کی صراحت نہیں، البتہ صحیح مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہیں، جب کہ ہم نے جو پہلی روایت ذکر کی ہے، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ الفاظ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے تلاوت فرمائے تھے۔ راوی کی طرف سے نہیں ہیں۔

بخاری شریف والی حدیث کے ترجمہ میں میں نے ان الفاظ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اسی بنا پر منسوب کیا ہے اور صحیح مسلم والی روایت کو ”فتح الباری“ میں نقل کر کے حافظ عسقلانی رضی اللہ عنہ نے بھی یہی رائے اختیار کی ہے کہ ظاہر بات یہی ہے کہ یہ سارے الفاظ (بہ شمول الفاظ آیت) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک ہی سے صادر شدہ ہیں۔^①

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی اس حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ یہی مفہوم اس واقعہ کے بارے میں مروی حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے آخری الفاظ میں بھی ہے، جس میں مذکور ہے کہ غزوہ خیبر سے واپسی پر راستے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور پورا اسلامی لشکر نماز فجر سے سویا رہ گیا، حتیٰ کہ سورج کی گرمی نے انھیں اٹھایا، پھر وہاں سے تھوڑا آگے جا کر باجماعت نماز ادا کی گئی اور جب نماز ادا کر لی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ نَسِيَ الصَّلَاةَ فَلْيُصَلِّهَا إِذَا ذَكَرَهَا، فَإِنَّ اللَّهَ تَعَالَى قَالَ: أَقِمِ الصَّلَاةَ لِدُكْرِي»

معنی اس حدیث کا بھی وہی ہے جو پہلی حدیث انس رضی اللہ عنہ کا ہے۔ یہ حدیث واقعہ صحیح مسلم، سنن ابو داؤد، ترمذی، نسائی، بیہقی، ابن ماجہ اور صحیح ابوعوانہ میں ہے اور امام مالک نے اسے موطا میں سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے مرسل روایت کیا ہے، جب کہ یہ صحیح یہ ہے کہ یہ موصول حدیث ہے۔^②

مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ سے بھی صحیح سند سے یہی واقعہ مروی ہے، مگر

انتہائی اختصار کے ساتھ ہے اور اس کے آخر میں ارشاد نبوی کے الفاظ ہیں:

”جو شخص نماز سے سویا رہ جائے یا بھول ہی جائے تو وہ یاد آنے پر پڑھ لے یا جب سو کر

اٹھے تو پڑھ لے۔“

ایسا ہی واقعہ سنن ابی داؤد، مسند طیالسی، مسند احمد اور مصنف ابن ابی شیبہ میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

سے بھی مروی ہے، جس میں غزوہ حدیبیہ مذکور ہے اور اس کے آخر میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

① فتح الباری (۲/۷۲)

② إرواء الغلیل (۱/۲۹۲)

«وَأَفْعَلُوا كَمَا كُنْتُمْ تَفْعَلُونَ، قَالَ كَذَلِكَ لِمَنْ نَامَ أَوْ نَسِيَ»^①

” (اب بھی) اسی طرح کرو، جس طرح تم کیا کرتے ہو اور فرمایا: اسی طرح ہے، جب کوئی سو جائے یا بھول جائے۔“

اس حدیث میں آپ ﷺ نے وضاحت فرمادی ہے کہ ایسی حالت میں بھی نماز ادا کرنے کا طریقہ وہی ہوگا، جو معمول کے مطابق ہوتا ہے، یعنی اگرچہ اصل وقت گزر چکا تھا، اس کے باوجود آپ ﷺ نے باقاعدہ اقامت و جماعت کے ساتھ نماز ادا فرمائی، جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث والے واقعے کی جزئیات میں بھی یہ بات مذکور ہے۔

اس ساری تفصیل سے معلوم ہوا کہ بھول جانے یا سو جانے کی شکل میں یاد آنے یا جاگ جانے پر جو بھی وقت ہو، اسی وقت نماز ادا کی جاسکتی ہے۔ اس کے لیے کوئی وقت کراہت مانع نہیں ہے، وہ عصر کے بعد سے غروب آفتاب تک کے درمیان میں ہو یا فجر کے بعد سے طلوع آفتاب تک کا وقت ہے۔ احناف کے سوا جمہور علما کا یہی مسلک ہے کہ ان اوقات میں بھی فوت شدہ نمازوں کی قضا جائز ہے۔ البتہ عام نوافل پڑھنا مکروہ ہے۔ جب کہ احناف کا کہنا ہے کہ اوقات مکروہہ میں جا گئے یا بھولی نماز یاد آنے پر کچھ انتظار کرنے کے بعد نماز پڑھے، جب وقت کراہت گزر چکا ہو، لیکن نبی اکرم ﷺ کے عصر کے بعد ظہر کی آخری دو سنتیں پڑھنے اور دیگر احادیث سے جمہور ہی کی تائید ہوتی ہے۔

طلوع اور استواء اور غروب کا وقت:

اوقات مکروہہ میں سے دو کا ذکر ہو چکا ہے اور اب آئیے بقیہ تین اوقات مکروہہ کی طرف، جو طلوع آفتاب، غروب آفتاب اور استواء یعنی زوال یا سورج کے عین سر پر ہونے کے اوقات ہیں۔ ان اوقات میں بھی نماز پڑھنا مکروہہ ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم و ابی عوانہ، سنن بیہقی، طیالسی، مسند احمد اور سنن اربعہ میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا:

«ثَلَاثُ سَاعَةٍ، نَهَانَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنْ نُصَلِّيَ فِيهَا، وَأَنْ نَقْبُرَ فِيهَا مَوْتَانَا، حِينَ تَطْلُعُ الشَّمْسُ بَارِغَةً حَتَّى تَرْتَفِعَ، وَحِينَ يَقُومُ الظُّهَيْرُ

① صحیح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٣٠) الإرواء (١/٢٩٣)

حَتَّى تَمِيلَ الشَّمْسُ، وَحِينَ تَضِيفُ لِلْغُرُوبِ حَتَّى تَغْرُبَ^(۱)

”تین اوقات ایسے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ہمیں ان میں نماز پڑھنے اور مردوں کو دفن کرنے سے منع فرمایا ہے، جب سورج صاف نکل رہا ہو، جب تک کہ وہ چڑھ نہ آئے (یعنی کچھ بلند نہ ہو جائے) اور جب دوپہر کے وقت عین سر پر ہو، یہاں تک کہ سر سے ڈھل نہ جائے اور جب سورج غروب ہو رہا ہو، یہاں تک کہ غروب نہ ہو جائے۔“

نمازِ جنازہ اور تدفین کی کراہت:

ان تین اوقات میں نمازوں کی ممانعت کے علاوہ نبی اکرم ﷺ نے فوت شدگان کو دفن کرنے کی بھی ممانعت کر دی ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ ”شرح صحیح مسلم“ میں لکھتے ہیں کہ بعض علما کا کہنا ہے کہ «أَنَّ نَقْبَ مَوْتَانَا» سے مراد دفن کرنا نہیں، بلکہ اس سے مراد نمازِ جنازہ ہے، لیکن ان کا یہ قول ضعیف ہے، کیوں کہ ان اوقات میں نمازِ جنازہ کے مکروہ نہ ہونے پر اجماع امت ہے، لہذا کسی حدیث کی ایسی تشریح و مراد بیان کرنا، جو اجماع کے خلاف ہو، جائز نہیں ہے، بلکہ صحیح یہی ہے کہ اس سے مراد جان بوجھ کر تاخیر کر کے مردے کو ان اوقات میں دفن کرنا ہے۔ ہاں اگر بلا ارادہ اتفاق سے کسی کو ایسے وقت میں دفن کر دیا جائے، تو پھر یہ مکروہ نہیں ہے۔^(۲)

امام نووی رحمہ اللہ نے یہاں جو قید لگائی ہے کہ اگر جان بوجھ کر ایسا نہ کیا جائے، بلکہ اتفاق سے ہی ایسا ہو جائے تو مکروہ نہیں ہے۔ موصوف کے اس قید لگانے کی کوئی دلیل نہیں، بلکہ حدیث مطلق ہے اور اس کا حکم بھی مطلق ہی رہے گا کہ جان بوجھ کر یا بلا ارادہ کسی بھی صورت میں ان اوقات میں تدفین ممنوع ہے، لہذا واجب ہے کہ ان اوقات کو گزار کر تدفین عمل میں لائی جائے، البتہ اگر لاش کے کسی وجہ سے پھٹنے یا خراب ہونے کا خطرہ ہو تو پھر یہ جائز ہوگا کہ وقتِ کراہت ہی

(۱) صحیح مسلم مع شرح النووی (۱۱۴/۶/۳) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (۲۷۳۳) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۸۲۲) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۵۵۱) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۱۵۱۹) فقہ السنۃ (۱/۱۰۶-۵۴۴) أحكام الجنائز (ص: ۱۲۰)

(۲) شرح صحیح مسلم (۱۱۴/۶/۳) مختصراً

میں تدفین عمل میں لائی جائے۔^①

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے جو یہ دعویٰ کیا ہے کہ ان اوقات میں نماز کے جواز پر اجماع ہے، ان کا یہ دعویٰ بھی صحیح نہیں، کیوں کہ یہ ایک معروف اختلافی مسئلہ ہے۔ بلکہ بعض کبار محدثین نے حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ والی اسی اوقات مکروہہ والی حدیث کے عموم سے ان اوقات میں نماز جنازہ پڑھنے کے بھی مکروہ ہونے پر استدلال کیا ہے اور اس حدیث سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی یہی بات سمجھی تھی، یہی وجہ ہے کہ بعض آثار صحابہ سے پتا چلتا ہے کہ وہ اوقات مکروہہ میں نماز جنازہ نہیں پڑھتے تھے۔ جیسا کہ موطا امام مالک اور سنن کبریٰ بیہقی میں روایت ہے کہ زینب بنت ابی سلمہ رضی اللہ عنہا فوت ہو گئیں، جب کہ مدینہ طیبہ کے گورنر طارق تھے، جنازہ، نماز فجر کے بعد لایا گیا اور بقیع میں رکھ دیا گیا۔ طارق نماز کو (غسل) اندھیرے میں پڑھا کرتے تھے۔ محمد بن ابو حرمہ راوی حدیث بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

”إِمَّا أَنْ تَصَلُّوا عَلَيَّ جَنَازَتِكُمْ الْآنَ، وَإِمَّا أَنْ تَتْرُكُوها حَتَّى تَرْتَفِعَ الشَّمْسُ“^②

”یا تو اپنے جنازے پر ابھی نماز پڑھ لو یا پھر سورج چڑھ آنے تک جنازہ پڑا رہنے دو۔“

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ ہی نے موطا میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ اثر بھی روایت کیا ہے کہ

انہوں نے کہا:

”يُصَلِّي عَلَى الْجَنَازَةِ بَعْدَ الْعَصْرِ وَبَعْدَ الصُّبْحِ إِذَا أُصَلِّتَا لَوْ قَتِيهِمَا“^③

”نماز فجر و عصر کے بعد نماز جنازہ صرف اسی شکل میں پڑھی جاسکتی ہے، جب کہ ان

نمازوں کو ان کے اوّل اوقات میں پڑھا جائے۔“

اگر یہ نمازیں اپنے اصل اول وقت سے کچھ موخر کر کے وقت اختیار میں پڑھی جائیں اور سورج

کی روشنی اور سہ پہر کی زردی پھیل جائے تو پھر ان کے بعد نماز جنازہ ٹھیک نہیں، بلکہ اسے مکروہ سمجھا

گیا ہے۔ ہاں اگر اول وقت میں پڑھی گئی ہو تو فوراً بعد میں ممکن ہے، جیسا کہ پہلے اثر میں وضاحت

① محلی ابن حزم (۵/۱۱۴-۱۱۵) تمام المنة (ص: ۱۴۳) أحكام الجنائز (ص: ۱۳۴)

② تنوير الحوالك (۱/۱/۲۲۸) وقال الألباني: و سنده صحيح على شرط الشيخين. (أحكام الجنائز، ص: ۱۳۱)

③ موطأ الإمام مالك (۱/۲۲۹) رقم الحديث (۲۱)

ہے کہ یا تو منہ اندھیرے (غلس میں) پڑھ لویا پھر سورج نکلنے دو۔ اس سے بھی زیادہ واضح طور پر یہ بات سنن کبریٰ بیہتی میں مروی ایک دوسرے اثر میں ہے، جس میں حضرت جرجان بیان کرتے ہیں کہ حضرت زیاد رضی اللہ عنہ نے انھیں بتایا کہ انھیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خبر دی کہ اہل بصرہ کے قبرستان میں جنازہ لا کر رکھا گیا۔ جب کہ (عصر کے بعد) سورج زور پڑ چکا تھا تو انھوں نے اس پر نماز جنازہ نہیں پڑھی، یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا، تب حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے منادی کرنے والے کو حکم دیا کہ لوگوں میں منادی کر دو (اذان کہہ دو) پھر انھوں نے نماز مغرب کی جماعت کرائی، جب کہ اس جماعت میں حضرت انس بن مالک اور دوسرے حضرت ابو ہریرہ انصاری رضی اللہ عنہ صحابی رسول موجود تھے، پھر نماز مغرب کے بعد انھوں نے نماز جنازہ پڑھی۔^①

غرض کہ امام خطابی رضی اللہ عنہ ”معالم السنن“ (۴ / ۳۲۷) میں لکھتے ہیں کہ ان تینوں اوقات میں نماز جنازہ پڑھنے اور مردے کو دفن کرنے کے جواز میں اختلاف ہے۔ اکثر اہل علم ہی امام عطاء، ابراہیم نخعی، اوزاعی، سفیان ثوری، اصحابِ رائے یعنی فقہائے احناف اور اسحاق بن راہویہ رضی اللہ عنہ سے مکروہ قرار دیتے ہیں۔ البتہ امام شافعی رضی اللہ عنہ کی رائے یہ ہے کہ جنازہ و تدفین دن یا رات کے کسی بھی وقت ہوں، بلا کراہت جائز ہیں، لیکن اول الذکر جماعتِ علما والا کراہت کا قول ہی حدیث کے موافق ہونے کی وجہ سے اولیٰ ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ان اوقات مکروہہ میں نماز جنازہ پڑھنا اور مردے کو دفن کرنا، اکثر کے نزدیک مکروہ ہے اور یہی قول اقرب الی السنۃ ہے۔

امام ابو حنیفہ، شافعی، احمد اور جمہور کے نزدیک تو سورج کے عین سر پر ہونے کے وقت نماز مکروہ ہے۔ البتہ امام مالک رضی اللہ عنہ اس وقت نماز کے جواز کے قائل ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ میں نے جتنے بھی اہل علم و فضل (اہل مدینہ) کو پایا ہے، وہ عبادت میں محنت کرتے تھے اور نصف النہار یعنی سورج کے سر پر ہونے کے وقت بھی نماز پڑھتے تھے۔

علامہ ابن عبدالبر رضی اللہ عنہ نے امام مالک رضی اللہ عنہ کے اس قول جواز کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے خود اپنے موطا میں حضرت صنابحی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث روایت کی ہے۔ (جس میں اس وقت

① قال الألبانی: روی البيهقي بسند جيد (الجنائز، ص: ۱۳۱)

نماز کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔ اس کے باوجود ان کی طرف سے جواز کے قول کی توجیہ یہی ممکن ہے کہ (یا تو وہ حدیث ان کے نزدیک صحیح نہیں۔ پھر انھوں نے اہل مدینہ کے جس عمل کی طرف اشارہ کیا ہے، اس کی بنا پر حدیث کو نہیں اپنایا۔

بہر حال یہ بات پیش نظر رکھیں کہ ائمہ ثلاثہ اور جمہور والا مسلک کراہت ہی اقرب الی السنۃ ہے، کیوں کہ اس پر دلالت کرنے والی متعدد صحیح احادیث موجود ہیں۔ مثلاً ایک حدیث تو وہی ہے، جسے صحیح مسلم و ابی عوانہ، سنن اربعہ و بیہقی، مسند طیالسی اور مسند احمد کے حوالے سے ہم بیان کر چکے ہیں، جو حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں وہ بیان کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین اوقات میں نماز پڑھنے اور میت کو دفن کرنے سے منع فرمایا، جن میں سے: پہلا وقت: جب سورج طلوع ہو رہا ہو۔

دوسرا وقت: ”حِينَ يَتَوَمُّ قَائِمُ الظَّهْرِ حَتَّى تَمِيلَ الشَّمْسُ“ ”جب دوپہر کے وقت سورج عین سر پر ہو، یہاں تک کہ وہ سر سے ڈھل نہ جائے۔“

تیسرا وقت: جب سورج غروب ہو رہا ہو، یہاں تک کہ وہ اچھی طرح غروب نہ ہو جائے۔^①

حدیث ثانی:

اسی سلسلے کی ایک دوسری حدیث صحیح مسلم، سنن نسائی، ابن ماجہ، بیہقی اور مسند احمد میں حضرت عمرو بن عتبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں ان کے اسلام لانے کے واقعے اور کئی دیگر احکام دین کی تفصیلات بھی ہیں، اسی حدیث میں اوقات نماز بھی مذکور ہیں، جن کے ضمن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عین دوپہر کے موقع پر جب سورج نصف النہار پر ہو، نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ اس حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ سورج کے طلوع ہو جانے کے بعد نماز (نوافل) وغیرہ) پڑھو۔ بلاشبہ نماز پڑھنے پر فرشتے حاضر ہوتے ہیں۔ آگے فرمایا کہ نماز پڑھ سکتے ہو:

« حَتَّى يَسْتَقِلَّ الظِّلُّ بِالرُّمْحِ، ثُمَّ أَقْصِرْ عَنِ الصَّلَاةِ فَإِنَّ حَيْثُ تَسْجُرُ جَهَنَّمُ »

”یہاں تک کہ نیزے کا سایہ اس کے مقابل ہو جائے (یعنی سورج سر پر ہو) تب تم نماز

① صحیح مسلم مع شرح النووی (۳/ ۴/ ۱۱۴) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۵۶۹) فقہ السنۃ (۱/

۱۰۴- ۱۰۷، ۵۵۴) أحكام الجنائز للآلبانی (ص: ۱۳۰)

سے رک جاؤ، کیوں کہ اس وقت جہنم کو بڑھکایا اور گرمایا جاتا ہے۔“

آگے فرمایا:

«فَإِذَا أَقْبَلَ الْفَيْءُ فَصَلِّ»^①

”جب سایہ بڑھ جائے (سورج ڈھل جائے) تو نماز پڑھو۔“

امام نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم میں اس حدیث کے تحت لکھا ہے کہ اس حدیث میں اس بات کی تصریح کر دی گئی ہے کہ سورج کے سر پر ہونے یعنی زوال کے وقت نماز پڑھنا منع ہے، یہاں تک کہ سورج سر سے ڈھل نہ جائے۔^②

حدیثِ ثالث:

ایک تیسری حدیث سنن اربعہ و بیہقی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«حَتَّى تَسْتَوِيَ الشَّمْسُ عَلَى رَأْسِكَ كَالرُّمْحِ فَإِذَا زَالَتْ فَصَلِّ»^③

”طلوع آفتاب کے بعد سے لے کر اس وقت تک نماز پڑھو (یہاں تک کہ سورج عین

نیزے کی طرح تمہارے سر پر آجائے) (تب رک جاؤ) اور جب سورج سر سے ڈھل

جائے تو پھر نماز پڑھ سکتے ہو۔“

حدیثِ رابع:

چوتھی حدیث موطا امام مالک، سنن نسائی و ابن ماجہ میں ہے، جس کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ صابحی رضی اللہ عنہ سے مروی مرسل حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، جس میں ہے کہ جب سورج طلوع ہوتا ہے تو شیطان اپنے سینگ اس کے ساتھ (یا سامنے) کر دیتا ہے اور جب سورج بلند ہو جاتا ہے تو وہ سینگ ہٹا لیتا ہے:

«ثُمَّ إِذَا اسْتَوَتْ قَارَنَهَا وَإِذَا زَالَتْ فَارْقَهَا»

① صحیح مسلم مع شرح النووی (۱۱۶/۶/۳) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۱۲۵۱) سنن أبي داود، رقم

الحدیث (۱۱۳۷)

② شرح صحیح مسلم (۱۱۶/۶/۳)

③ سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۱۲۵۲)

”پھر جب سورج سر پر آتا ہے تو وہ دوبارہ سینگ و ہیں کر دیتا ہے اور جب سورج ڈھل جاتا ہے تو پھر سینگ الگ کر لیتا ہے۔“

پھر جب سورج غروب ہونے لگتا ہے تو پھر وہیں کر لیتا ہے، اس حدیث کے آخر میں ہے:

«نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنِ الصَّلَاةِ فِي تِلْكَ السَّاعَاتِ»⁽¹⁾

”نبی اکرم ﷺ نے ان اوقات میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔“

”إرواء الغلیل“ میں علامہ البانی نے استوائے شمس کے وقت شیطان کے سینگوں کو سورج کے سامنے کرنے والے الفاظ کو منکر قرار دیا ہے، کیوں کہ یہ صحیح مسلم اور دیگر کتب والی حدیث عمرو بن عبسہ کے الفاظ: «فَإِنَّ حَيْثُ تَسَجَّرُ جَهَنَّمُ» کے خلاف ہیں۔ اس حدیث کے بارے میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ مرسل ہے۔ اگرچہ اس کی سند کے تمام راوی قوی ہیں۔⁽²⁾

اس حدیث کے مرسل ہونے کا سبب امام سیوطی رحمہ اللہ نے ”تنویر الحوالک شرح موطأ الإمام مالک“ میں علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ کے حوالے سے ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت عبداللہ صنّاحی رحمہ اللہ کی نبی اکرم ﷺ سے ملاقات ثابت نہیں ہے۔⁽³⁾

مرسل حدیث چونکہ ضعیف کی اقسام میں شمار کی جاتی ہے اور اسے حجت نہیں مانا جاتا ہے، یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ نے اپنے موطا میں اس روایت کو ذکر کرنے کے باوجود سورج کے سر پر ہونے کے وقت نماز کے کراہت کے قول کو اختیار نہیں کیا، بلکہ وہ جواز کے قائل تھے اور ساتھ ہی وہ اہل مدینہ کا عمل بھی جواز ہی بتاتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اگر صرف یہی ایک مرسل روایت ہی ہوتی تو پھر امام مالک رحمہ اللہ کا مسلک بلاشبہ صحیح ہوتا، لیکن اب جب کہ تین دیگر احادیث بھی ہیں، جن سے کراہت کا پتا چلتا ہے، جن میں صحیح مسلم کی احادیث بھی ہیں تو پھر کہا جاسکتا ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ کی نسبت دیگر ائمہ ثلاثہ اور جمہور کا مسلک ہی اقرب الی السنۃ ہے اور حسن ظن کا تقاضا یہ ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ کے بارے میں یہ سمجھ لیا جائے کہ انھیں وہ صحیح احادیث نہیں پہنچی ہوں گی اور صرف ان

(1) صحیح سنن النسائي، رقم الحديث (545) الموطأ مع تنویر الحوالک للسیوطی (۱/۲۲۰) الإرواء (۲/

۲۳۸) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۱۲۵۳)

(2) فتح الباري (۲/۶۳)

(3) تنویر الحوالک (۱/۲۲۰)

احادیث پر ہی بس نہیں، بلکہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے آثار سے بھی کراہت کا پتا چلتا ہے، چنانچہ صاحب فتح الباری نے تین آثار ذکر کیے ہیں:

پہلا اثر:

امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:
 ”فَنَهَى عَنِ الصَّلَاةِ نِصْفَ النَّهَارِ“^①
 ”عین دوپہر کے وقت نماز پڑھنے سے روکتے تھے۔“

دوسرا اثر:

دوسرے اثر میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:
 ”كُنَّا نُنْهَى عَنْ ذَلِكَ“ ”ہم اس سے روکے جاتے تھے۔“

تیسرا اثر:

تیسرے اثر میں حضرت ابوسعید مقبری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:
 ”أَدْرَكْتُ النَّاسَ وَهُمْ يَتَّقُونَ ذَلِكَ“^②

”میں لوگوں کو اس حال میں پایا کہ وہ اس (عین دوپہر کے وقت نماز پڑھنے) سے بچتے تھے۔“
 ان آثار سے بھی جمہور کے مسلک ہی کی تائید ہوتی ہے کہ عین دوپہر یا زوال آفتاب کے وقت پر نماز پڑھنا مکروہ ہے۔

استثنائی صورتیں:

یہاں اس بات کی وضاحت بھی کر دیں کہ فقہائے احناف کے نزدیک تو ان تینوں اوقات میں مطلقاً نماز منع ہے، فرض ہو یا واجب، چاہے نفل ہو اور ادا ہو یا قضا، البتہ اس دن کی عصر کو اس سے مستثنیٰ کیا گیا ہے اور امام ابو یوسف رضی اللہ عنہ کے ایک قول کی رو سے فجر کی نماز بھی طلوع آفتاب سے فاسد نہیں ہوتی۔ ایسے ہی نماز جنازہ اور ان اوقات میں تلاوت کی گئی آیات پر سجدہ تلاوت بھی مستثنیٰ

① فتح الباری (۲/۶۳)

② فتح الباری (۲/۶۳)

ہیں۔ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک جمعہ کے دن عین دوپہر میں سورج کے سر پر ہونے کے وقت نوافل پڑھنا اس حکم کراہت میں نہیں آتا اور شافعیہ کے نزدیک ان اوقات ثلاثہ میں غیر سببی نوافل پڑھنا مکروہ ہے۔ البتہ فرض مطلقاً اور سببی نوافل، جمعہ کے دن عین سورج کے سر پر ہونے کے وقت نوافل اور حرم مکہ میں نوافل بلا کراہت جائز ہیں۔

مالکیہ کے نزدیک طلوع آفتاب اور غروب کے وقت نوافل پڑھنا (نہ صرف مکروہ بلکہ) حرام ہے، اگرچہ وہ سببی ہی کیوں نہ ہوں۔ نذر والی نماز اور سجدہ تلاوت کا بھی یہی حکم ہے اور نماز جنازہ بھی اسی میں شامل ہے، سوائے اس کے کہ لاش کے خراب ہونے کا خطرہ ہو تو پھر یہ جائز ہے۔ انھوں نے ان دونوں اوقات میں فرائض ادا کرنے کو مباح قرار دیا ہے، خواہ وہ ادا ہوں یا قضا۔

اسی طرح سورج کے عین سر پر ہونے کے وقت بھی انھوں نے مطلقاً نماز کو مباح کہا ہے، فرض ہوں یا نفل (یعنی اس وقت ان کے یہاں جمعہ کے دن اور حرم مکہ کی شرط بھی نہیں) علامہ باجی موطا امام مالک کی شرح میں المبسوط کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ ابن وہب سے مروی ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ سے عین دوپہر کے وقت نماز پڑھنے کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا:

”میں نے لوگوں کو پایا کہ وہ جمعہ کے دن سورج کے سر پر ہونے کے وقت نماز پڑھتے تھے اور بعض احادیث میں اس کی ممانعت بھی وارد ہوئی ہے۔ میں اسے منع نہیں کرتا، کیوں کہ میں نے لوگوں (اہل مدینہ) کو اس وقت نماز پڑھتے پایا ہے اور نہ میں اس وقت نماز پڑھنے کو محبوب رکھتا ہوں، کیوں کہ اس کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔“

حنا بلکہ کے نزدیک ان تینوں اوقات یعنی طلوع و غروب اور نصف النہار کے وقت میں کوئی نفل نماز نہیں ہوتی، وہ سببی ہو یا غیر سببی، مکہ مکرمہ میں ہو یا کسی دوسری جگہ پر اور جمعہ کا روز ہو یا کوئی دوسرا دن۔ ہاں البتہ انھوں نے جمعہ کے دن تحیۃ المسجد کی دو رکعتوں کو بلا کراہت جائز قرار دیا ہے۔ وہ چاہے عین دوپہر کے وقت واقع ہوں اور خطبے کے دوران ہی کیوں نہ پڑھی جائیں۔

ان کے نزدیک نماز جنازہ بھی ان تینوں اوقات میں حرام ہے۔ ہاں اگر لاش کے بگڑ جانے کا خدشہ ہو تو پھر بلا کراہت جائز ہے اور ان تینوں اوقات میں ان کے نزدیک فوت شدہ فرضی نمازوں کی

قضا، نذر مانی ہوئی نماز اور طواف کی دو رکعتیں پڑھ لینا بھی جائز ہے۔^①

یہ چاروں معروف فقہی مکاتب فکر کے ائمہ و فقہاء کی آرا ہیں اور ان میں سے بعض امور ایسے بھی ہیں، جنہیں مکروہ و ممنوع بتایا گیا ہے، حالانکہ ان کے استثنا و جواز کے دلائل صحیح احادیث میں موجود ہیں۔ مثلاً:

❶ بھولی ہوئی۔

❷ نیند کی وجہ سے رہ جانے والی فرض نماز کے یاد آنے پر، یا نیند سے بیدار ہونے کے وقت اس کو ادا کرنے کے جواز کے دلائل ذکر کیے جا چکے ہیں۔

❸ حرم کی میں طواف کی دو رکعتوں، یعنی نماز طواف وغیرہ تمام اوقات میں، کے جواز کی دلیل پر مشتمل حدیث بھی ذکر کی جا چکی ہے۔

❹ عام سببی نقلی نمازوں کے جواز کی طرف بھی اشارہ گزرا ہے۔

❺ نماز جنازہ اور تدفین کی کراہت کے راجح ہونے کا تذکرہ بھی ہو چکا ہے، سوائے اس کے کہ لاش کے بگڑنے کا خطرہ ہو تو پھر بلا کراہت نماز و تدفین جائز ہے۔

اس دن کی فجر و عصر:

احناف کی طرف سے، یہ جو کہا گیا ہے کہ ان تینوں اوقات میں نماز پڑھنا منع ہے، فرض ہو یا واجب یا نقل ہو، ادا ہو یا قضا اور صرف اس دن کی نماز عصر کو اس سے مستثنیٰ کیا گیا ہے تو اس کی دلیل بھی موجود ہے، البتہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی طرح اس کے ساتھ ہی اس دن کی نماز فجر کو بھی مستثنیٰ کر لینا چاہیے، کیوں کہ اس کے بھی دلائل موجود ہیں۔ ایسے ہی عین سر پر ہونے کے وقت نوافل کے جواز کا معاملہ بھی ہے اور اس کے بھی دلائل موجود ہیں۔

بعض احادیث ایسی ہیں، جو خاص انہی دو مواقع سے تعلق رکھتی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی عذر کی وجہ سے اگر فجر کی نماز موخر ہو جائے، حتیٰ کہ سورج طلوع ہو رہا ہو تو عذر و مجبوری میں ان اوقات کے دوران میں بھی نماز پڑھی جاسکتی ہے اور یہ طلوع و غروب کے وقت نماز ادا کرنا تو صرف اس دن کی فجر و عصر کے ساتھ خاص ہے، البتہ کسی بھی نماز کے آخری وقت میں ایک رکعت ادا کرنا اور

① دیکھیں: فقہ السنۃ (۱/۷ / ۱۰۸)

بقیہ نماز کے اگلی نماز کو پالینے کا معاملہ ہر نماز کے لیے عام ہے، جیسا کہ ارشادِ نبوی سے پتا چلتا ہے:

«مَنْ أَدْرَكَ رُكْعَةً مِنَ الصَّلَاةِ فَقَدْ أَدْرَكَ الصَّلَاةَ»^①

چنانچہ صحیح بخاری و مسلم، سنن اربعہ، مسند احمد اور دیگر کتب حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے

مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ أَدْرَكَ مِنَ الصُّبْحِ رُكْعَةً قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ فَقَدْ أَدْرَكَ الصُّبْحَ،
وَمَنْ أَدْرَكَ رُكْعَةً مِنَ الْعَصْرِ قَبْلَ أَنْ تَغْرُبَ الشَّمْسُ فَقَدْ أَدْرَكَ الْعَصْرَ»^②

”جس نے فجر کی ایک رکعت طلوع آفتاب سے پہلے پڑھ لی، اس نے فجر کی نماز پالی اور

جس نے غروب آفتاب سے پہلے عصر کی ایک رکعت پڑھ لی، اس نے عصر کو پالیا۔“

یہاں عصر یا فجر کو پالیا سے مراد یہ نہیں ہے کہ محض ایک رکعت پڑھ لینا ہی کافی ہو گیا، بلکہ مراد

یہ ہے کہ وہ اپنی نماز مکمل کر لے۔ اس نے نماز کو پالیا ہے۔ فوت نہیں ہونے دی۔ البتہ وہ بقیہ نماز

پڑھ کر رکعتیں مکمل لے، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم اور سنن بیہقی کی ایک دوسری روایت میں اس کے نماز

کو پالینے کا ذکر ہے:

«مَنْ أَدْرَكَ رُكْعَةً مِنَ الصَّلَاةِ فَقَدْ أَدْرَكَ الصَّلَاةَ»^③

”جس نے کسی نماز کی ایک رکعت پالی تو اس نے وہ نماز پالی۔“

بقیہ نماز پڑھ کر رکعتیں پوری کر لینے کا ذکر بھی ایک دوسری روایت میں آیا ہے، چنانچہ صحیح

بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«إِذَا أَدْرَكَ أَحَدُكُمْ سَجْدَةً مِنْ صَلَاةِ الْعَصْرِ قَبْلَ أَنْ تَغْرُبَ الشَّمْسُ

① صحیح البخاری (۷۵/۲) مختصر صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۲۸) صحیح سنن ابی داؤد، رقم الحدیث

(۹۹۱) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۵۴۱) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۱۱۲۲) نیل الأوطار (۲۲/۲/۱)

② صحیح البخاری مع الفتح (۱۵۶/۲) صحیح مسلم مع شرح النووی (۱۰۴/۵ - ۱۰۵) صحیح سنن ابی

داؤد، رقم الحدیث (۳۹۸) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۱۵۷) صحیح سنن النسائی، رقم

الحدیث (۵۰۲، ۵۰۱) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۶۹۹) المنتقی مع النیل (۲۱/۲/۱)

③ صحیح البخاری (۵۷/۲) مختصر صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۲۸)

فَلْيُتِمَّ صَلَاتَهُ، وَإِذَا أَدْرَكَ سَجْدَةً مِنْ صَلَاةِ الصُّبْحِ قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ
الشَّمْسُ فَلْيُتِمَّ صَلَاتَهُ^(۱)

”جب تم میں سے کوئی شخص غروب آفتاب سے پہلے نماز عصر کا ایک سجدہ ایک رکعت،
(جیسا کہ امام مسلم، امام خطابی رحمہم اللہ اور الحجد ابن تیمیہ رحمہم اللہ نے تشریح کی ہے۔ فتح الباری:
۲/۳۸) پالے، اسے چاہیے کہ اپنی نماز مکمل کر لے اور جب کوئی شخص صبح کی نماز کی ایک
رکعت طلوع آفتاب سے پہلے پالے تو اسے چاہیے کہ وہ اپنی نماز کو مکمل کر لے۔“

ان احادیث سے یہ بات واضح ہو گئی کہ جو شخص عذر و مجبوری کی وجہ سے ان اوقات میں سے
ایک رکعت بھی پالے اور بقیہ نماز طلوع یا غروب کے بعد پڑھ لے تو اس کی نماز مکمل ہو گئی، اس بات
کی صراحت بھی بعض دیگر روایات میں آئی ہے۔ مثلاً سنن کبریٰ بیہقی میں ہے:

«مَنْ أَدْرَكَ مِنَ الصُّبْحِ رَكْعَةً قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ فَقَدْ أَدْرَكَ الصَّلَاةَ^(۲)»

”جس نے فجر کی ایک رکعت طلوع آفتاب سے پہلے پالی اور ایک رکعت طلوع آفتاب
کے بعد پڑھ لی تو اس نے نماز پالی۔“

اس سے بھی زیادہ صریح روایت دوسری ہے، جس میں ہے:

«مَنْ صَلَّى رَكْعَةً مِنَ الْعَصْرِ قَبْلَ أَنْ تَغْرُبَ الشَّمْسُ، ثُمَّ صَلَّى مَا بَقِيَ
بَعْدَ غُرُوبِ الشَّمْسِ فَلَمْ يَفْتَهُ الْعَصْرُ^(۳)»

”جس نے عصر کی ایک رکعت غروب آفتاب سے پہلے پڑھ لی اور بقیہ نماز غروب آفتاب
کے بعد پڑھ لی تو اس کی عصر فوت نہیں ہوئی۔“

یہی بات نماز فجر کے بارے میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی

نسائی شریف کی روایت میں ارشاد نبوی کے الفاظ ہیں:

«مَنْ أَدْرَكَ رَكْعَةً مِنَ الصَّلَاةِ فَقَدْ أَدْرَكَ الصَّلَاةَ كُلَّهَا إِلَّا أَنَّهُ يَفْضِي مَا فَاتَهُ^(۴)»

(۱) صحیح البخاری مع فتح الباری (۵۶/۲)

(۲) فتح الباری (۵۶/۲)

(۳) حوالہ بالا و نیل الأوطار (۲۱/۲/۱)

(۴) ویکس: صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۵۴۴) عن سالم، فتح الباری (۵۶/۲)

”جس نے نماز کی ایک رکعت پالی، اس نے ساری نماز ہی پالی، البتہ اسے چاہیے کہ وہ
بقیہ رکعتوں کو پورا کر لے۔“

سنن بیہقی کی ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«مَنْ أَدْرَكَ رَكْعَةً مِنَ الصُّبْحِ قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ فَلْيَصِلْ إِلَيْهَا أُخْرَى»^①

”جس نے سورج نکلنے سے پہلے ایک رکعت پالی، اسے چاہیے کہ وہ اس رکعت کے ساتھ
ایک اور رکعت ملائے (یعنی نماز مکمل کر لے)۔“

اسی مفہوم کی ایک حدیث اُم المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی صحیح مسلم، سنن نسائی، ابن ماجہ

اور مسند احمد میں مروی ہے، جس میں ارشاد نبوی ہے:

«مَنْ أَدْرَكَ مِنَ الْعَصْرِ سَجْدَةً قَبْلَ أَنْ تَغْرُبَ الشَّمْسُ أَوْ مِنَ الصُّبْحِ قَبْلَ
أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ فَقَدْ أَدْرَكَهَا»^②

”جس نے غروب آفتاب سے پہلے ایک رکعت عصر پڑھ لی یا طلوع آفتاب سے پہلے فجر
کی ایک رکعت پالی، اس نے نماز پالی۔“

حضرت عائشہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث اور اس کی متعدد روایات کے الفاظ

سے اصل موضوع تو واضح ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو گیا کہ امام شافعی، احمد بن حنبل اور

اسحاق بن راہویہ رضی اللہ عنہم کا یہی مسلک اس سلسلے میں اقرب الی السنۃ ہے۔ امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ نے دوسری

رائے اختیار کی ہے کہ اگر کسی کے فجر پڑھنے کے دوران ہی سورج طلوع ہو جائے تو اس کی نماز باطل

ہو جاتی ہے، لیکن مذکورہ حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اس کے خلاف ہے، جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ خود امام

صاحب کے شاگرد امام ابو یوسف رضی اللہ عنہ کو بھی اپنے استاذ گرامی کی اس رائے سے اتفاق نہیں تھا، بلکہ وہ

دیگر ائمہ کی طرح جواز کے قائل تھے اور عصر کے بارے میں تو عام احناف بھی جواز ہی کے قائل ہیں۔

امام صاحب رضی اللہ عنہ جو نماز کے دوران میں سورج طلوع ہو جانے سے اس کے باطل ہو جانے

① حوالہ سابقہ.

② صحیح مسلم مع شرح النووي (۳/ ۱۰۵-۱۰۶) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۵۳۷) سنن ابن

ماجہ، رقم الحدیث (۷۰۰) المنتقى مع النيل (۱/ ۲/ ۲۱)

کے قائل ہیں، ان کا استدلال ان احادیث سے ہے، جن میں طلوع آفتاب کے وقت نماز ادا کرنے کی ممانعت وارد ہوئی ہے، لیکن حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں استدلال صحیح نہیں رہتا، پھر یہ معاملہ صرف نماز فجر کے ساتھ ہی خاص کیوں کیا جائے، جب کہ ممانعت والی احادیث ہی میں غروب آفتاب کے وقت نماز عصر کی ممانعت بھی آئی ہے، لیکن اسے احناف نے مستثنیٰ مانا ہے تو پھر فجر کو مستثنیٰ ماننے میں کیا چیز مانع ہے؟

بعض حنفی اہل علم نے جو یہ دعویٰ کیا ہے کہ ممانعت والی احادیث سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ والی روایت منسوخ ہوگئی ہے، ان کا یہ دعویٰ محتاج دلیل ہے اور کوئی قطعی دلیل نہ ہونے کی صورت میں محض احتمال کی بنا پر ناسخ تو نہیں مانا جاسکتا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کے بقول ان دونوں کی احادیث سے بعض کو ناسخ اور بعض کو منسوخ ماننے کے بجائے اور ہر دو طرح کی احادیث کے مابین جمع و تطبیق ممکن ہے اور وہ اس طرح کہ ممانعت والی احادیث کو غیر سببی نقلی نمازوں کی ممانعت پر محمول کیا جائے نسخ ماننے سے یہ تخصیص ہی اولیٰ ہے۔^①

اسی سببی و غیر سببی والے فرق کو نقل کر کے امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ یہ بھی حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کی رو سے ہے، جب کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ ممانعت کی احادیث عام ہیں اور ہر نماز ہی کو شامل ہیں، جب کہ جواز والی یہ حدیث خاص ہے، پس عام کی خاص پر بنیاد رکھی جائے گی (اور کہا جائے گا کہ) اس وقت کوئی نماز ہی جائز نہیں، چاہے وہ سببی ہو یا غیر سببی۔ سوائے اس کے کہ کوئی دلیل موجود ہو جو کسی نماز کو خاص کر دے تو اسے ادا کرنا ہوگا، جیسا کہ یہاں فجر و عصر کا معاملہ ہے) ہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کے بقول اس بات پر تمام علما کا اتفاق ہے کہ جان بوجھ کر فجر کو طلوع آفتاب تک اور عصر کو غروب آفتاب تک موخر کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ یہ صرف مجبوری کی حالت کے لیے خاص ہے۔^②

سورج کے عین سر پر ہونے کے وقت نماز کی کراہت ہونے سے جمعہ کے دن کا استثنا:
یہ تو ہوا طلوع و غروب کے سلسلے میں اور اب آئیے سورج کے عین سر پر ہونے کے وقت نماز کی

① فتح الباری (۲/۵۶)

② نیل الأوطار (۱/۲۲)

کراہت و استثنائی صورت کی طرف۔

بقول علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ ”زاد المعاد“ (۱/ ۳۸۰) محقق) سورج کے عین سر پر ہونے کے وقت نماز کے مکروہ ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں اہل علم کے تین اقوال ہیں:

پہلا قول:

یہ وقت، وقتِ کراہت ہے ہی نہیں۔ یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک ہے۔ ہم سابق میں ذکر کر آئے ہیں کہ ان کا یہ مسلک مرجوح ہے اور احادیث سے اس کی تائید نہیں ہوتی، حتیٰ کہ خود امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے اپنے موطن میں حدیث موجود ہے، جس سے اس وقت کے وقتِ کراہت ہونے کا پتا چلتا ہے، جیسا کہ تفصیل گزر چکی ہے۔

دوسرا قول:

سورج کے عین سر پر ہونے کا وقت روزانہ ہی وقتِ کراہت ہے۔ اس میں جمعہ یا غیر جمعہ کا بھی کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور مشہور روایت کی رو سے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک ہے (اگرچہ ایک دوسری روایت کی رو سے وہ جمعہ کے دن کو مستثنیٰ مانتے ہیں) لیکن دلائل کی رو سے یہ مسلک بھی موجود ہے۔

تیسرا قول:

تیسرا راجح قول یا اقرب الی السنہ مسلک امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ وقت تو واقعی وقتِ کراہت ہے، لیکن جمعہ کا وقت اس سے مستثنیٰ ہے۔

امام عطاء، مکحول، طاؤس، حسن بصری اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہم کا بھی یہی مسلک ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ و ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کا اختیار بھی یہی ہے اور بعض دیگر کبار محدثین و علما نے بھی اس کی تائید کی ہے۔^①

دلائل کی رو سے زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ جمعہ کے دن وقتِ زوال میں بھی نوافل پڑھے جاسکتے ہیں یا بالفاظ دیگر جیسا کہ عموماً کہا جاتا ہے کہ جمعہ کے دن زوال ہوتا ہی نہیں، گویا یہ ایک عامی تعبیر

① ویکس: زاد المعاد (۱/ ۳۷۸، ۳۸۰) فتح الباری (۲/ ۳۷۲) تمام المنہ (ص: ۱۴۳) فقہ السنۃ (۱/ ۱۰۷، ۱۰۸)

ہے، ورنہ زوال تو ہر روز ہی ہوتا ہے۔ البتہ جمعہ کے دن زوال کے وقت بھی نوافل کے جواز کا پتا چلتا ہے۔ چنانچہ ”زاد المعاد فی ہدیٰ خیر العباد“ میں علامہ ابن قیمؒ نے جمعہ کے ۳۳ خصائص ذکر فرمائے ہیں اور ہر خصوصیت پر سیر حاصل بحث کی ہے جو محقق طباعت کے باسٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ ان خصائص میں سے گیارہویں خصوصیت یہی لکھی ہے کہ جمعہ کے دن امام شافعیؒ اور ان کے موافقین کے نزدیک زوال کے وقت بھی نوافل مکروہ نہیں ہیں اور ہمارے استاد ابو العباس ابن تیمیہؒ کا اختیار بھی یہی ہے اور ان کا اعتماد ”لیث عن مجاہد عن أبي الخليل عن أبي قتادة عن النبي ﷺ“ کی سند سے مروی حدیث پر بھی نہیں تھا۔^①

جس میں ہے کہ نصف النہار یا زوال کے وقت نماز مکروہ ہے سوائے جمعہ کے دن کے اور اس

میں ہے:

«إِنَّ جَهَنَّمَ تُسَجَّرُ إِلَّا يَوْمَ الْجُمُعَةِ»^②

”ہر روز دوپہر کے وقت جہنم کو بھڑکایا جاتا ہے، سوائے جمعہ کے دن کے۔“

اس کے برعکس امام ابن تیمیہؒ کا اعتماد اس بات پر تھا کہ جو شخص جمعہ کے لیے آئے، اس کے لیے مستحب یہ ہے کہ وہ امام کے نکلنے (خطبہ کے شروع کرنے) تک نوافل اور سنتیں پڑھے اور صحیح بخاری ”کتاب الجمعة، باب الدهن للجمعة“ اور ”باب لا يفرق بين اثنين يوم الجمعة“ دو مقامات پر (یہی ہی مسند احمد و سنن دارمی کی ایک صحیح حدیث میں ارشاد نبوی ہے:

«لَا يَغْتَسِلُ رَجُلٌ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَيَتَطَهَّرُ مَا اسْتَطَاعَ مِنْ طَهْرٍ، وَيَدَّهْنُ مِنْ دُهْنِهِ أَوْ يَمَسُّ مِنْ طِيبِ بَيْتِهِ، ثُمَّ يَخْرُجُ، فَلَا يُفْرَقُ بَيْنَ اثْنَيْنِ، ثُمَّ يُصَلِّي مَا كُتِبَ لَهُ ثُمَّ يَنْصِتُ إِذَا تَكَلَّمَ الْإِمَامُ إِلَّا غُفِرَ لَهُ مَا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجُمُعَةِ الْأُخْرَى»^③

① اس حدیث پر امام ابن تیمیہؒ کا اعتماد نہ ہونے کی وجہ دراصل یہ ہے کہ امام ابو داؤد کی یہ روایت سند کے اعتبار سے ایک تو منقطع ہے اور دوسرے ”لیث بن ابی سلیم“ کے ضعیف راوی ہونے کی وجہ سے ناقابل حجت ہے۔

دیکھیں: تحقیق الزاد (۱/ ۳۷)

② سنن أبي داود، رقم الحديث (۱۰۸۳)

③ صحيح البخاري مترجم اردو (۱/ ۴۲۲)

”جو شخص جمعہ کے دن غسل کرے اور حسبِ امکان طہارت و نظافت کا اہتمام کرے، تیل لگائے یا اپنے گھر سے خوشبو لگائے اور پھر جمعہ کے لیے نکلے اور (مسجد میں بیٹھے ہوئے) دو آدمیوں میں تفریق نہ کرے (یعنی اکٹھے بیٹھے ہوؤں کے درمیان گھس کر انھیں الگ الگ نہ کر دے) پھر وہ جتنی اس کی قسمت میں لکھا ہے، نفلی نماز پڑھے اور پھر جب امام خطبہ شروع کرے تو اسے خاموشی سے بہ غور سنے تو اس کے دوسرے جمعہ تک تمام گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔“

اس حدیث میں دلیل ہے کہ مسجد میں پہنچنے والے کے لیے جتنی استطاعت ہو، نماز پڑھنا مندوب ہے اور اس سے ممانعت اس وقت تک نہیں، جب تک کہ امام خطبہ کے لیے نہ آئے۔ کئی حضرات، جن میں سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور ان کی متابعت میں، امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ بھی ہیں، کا کہنا ہے کہ امام کا لوگوں کے سامنے نکل آنا نماز سے منع کرتا ہے اور اس کا خطبہ شروع کرنا بات چیت سے مانع ہوتا ہے، گویا سلف صالحین نے امام کے نکلنے کو نماز سے مانع قرار دیا ہے نہ کہ سورج کے سر پر آنے کو (یعنی زوال کا وقت ہونے کو نماز سے مانع نہیں قرار دیا گیا)۔

دوسری دلیل:

جمعہ کے دن زوال کے وقت بھی نوافل کے جائز ہونے کی دوسری دلیل یہ ہے کہ مسجد میں لوگ چھتوں کے نیچے ہوتے ہیں اور انھیں زوال کے وقت کا پتا نہیں چل سکتا اور وہ آدمی جو نفلی نماز میں مشغول ہے، اسے کیا معلوم کہ کب زوال کا وقت ہو گیا اور اس کے لیے یہ بھی ممکن نہیں کہ لوگوں کی گردنوں کو پھلانگتا ہوا باہر نکلے، سورج کو دیکھے اور پھر لوٹ جائے اور نہ یہ اس کے لیے مشروع ہے۔

جمعہ کے دن زوال کی عدم کراہت کی دلیل سنن ابی داؤد والی حضرت ابوقنادہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث بھی بن سکتی ہے، کیوں کہ اگرچہ امام ابو داؤد رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ یہ مرسل ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ ابو خلیل کا حضرت ابوقنادہ رضی اللہ عنہ سے سماع (سننا) ثابت نہیں ہے، لیکن جن کی مرسل کے مطابق صحابہ رضی اللہ عنہم کا عمل بھی ہوا اور قیاس سے بھی اس تائید ہوتی ہو، یا کسی صحابی کا قول اس کا مؤید ہو یا ارسال کرنے والا راوی اساتذہ کے اختیار میں اور ضعفا و متروکیں سے روایت بیان نہ کرنے میں معروف ہو یا ایسی ہی کوئی دوسری صورت ہو، جس سے اسے قوت ملتی ہو تو ایسی مرسل روایت پر بھی عمل کیا جائے گا۔

نیز حضرت ابوقادہ رضی اللہ عنہ والی اس مرسل روایت کی تائید میں کئی دوسرے شواہد بھی ہیں، مثلاً مسند امام شافعی اور انہی کی کتاب ”اختلاف الحدیث“ اور ”کتاب الجمعة“ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَىٰ عَنِ الصَّلَاةِ نِصْفَ النَّهَارِ حَتَّىٰ تَزُولَ الشَّمْسُ إِلَّا يَوْمَ الْجُمُعَةِ»^(۱)

”نبی اکرم ﷺ نے زوال کے وقت نماز پڑھنے سے منع فرمایا، سوائے جمعہ کے دن کے۔“
اس روایت کی سند میں دو راوی ابراہیم بن محمد اور اسحاق بن عبد اللہ ہیں، جنہیں تحقیق زاد المعاد میں متروک بتایا گیا ہے اور امام شوکانی رضی اللہ عنہ کے حوالے سے فتح الربانی کی شرح میں شیخ احمد عبدالرحمن البتاء نے بھی کہا ہے کہ اس کی سند پر کلام کیا گیا ہے۔ یہی روایت سنن اثرم اور بیہقی کی ”معرفة السنن“ میں بھی مروی ہے، جہاں حضرت ابوسعید اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما دونوں بیان کرتے ہیں:

«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَنْهَىٰ عَنِ الصَّلَاةِ نِصْفَ النَّهَارِ إِلَّا يَوْمَ الْجُمُعَةِ»^(۲)

”نبی اکرم ﷺ عین دوپہر کے وقت نماز پڑھنے سے روکا کرتے تھے، سوائے جمعہ کے دن کے۔“

زاد المعاد میں علامہ ابن قیم امام بیہقی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اس روایت کی سند میں بعض راوی ایسے ہیں، جو قابل حجت نہیں، لیکن اگر ان احادیث کو حضرت ابوقادہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کے ساتھ ملا لیا جائے تو کچھ قوت اختیار کر جاتی ہیں۔ فتح الباری میں حافظ ابن حجر نے بھی لکھا ہے کہ حضرت ابوقادہ رضی اللہ عنہ والی حدیث کی سند میں انقطاع ہے اور امام بیہقی نے اس کے کچھ ضعیف شواہد ذکر کیے ہیں، جنہیں ملانے سے حدیث قوی ہو جاتی ہے۔^(۳)

امام شافعی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ لوگ جمعہ کی دن جلد مسجد پہنچ جاتے ہیں اور امام کے خطبے کے لیے نکلتے تک نوافل پڑھتے رہتے ہیں۔ امام بیہقی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ امام شافعی رضی اللہ عنہ نے جو یہ بات

(۱) صحیح البخاری مع الفتح الربانی (۲/۳۷۰، ۳۹۲) عن سلمان فارسی رضی اللہ عنہ، صحیح الجامع (۳/۶/۲۴۱)

بحوالہ زاد المعاد (۱/۳۷۹) و شرح الفتح الربانی (۲/۳۰۰) فتح الباری (۲/۶۳)

(۲) حوالہ جات بالا.

(۳) فتح الباری (۲/۶۳)

کہی ہے، وہ صحیح احادیث میں موجود ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے لوگوں کے جلد مسجد کی طرف جانے اور بلا استثنائے زوال امام نکلنے تک نماز پڑھنے کی ترغیب دلائی ہے۔ یہ بات جمعہ کے زوال کے وقت نماز کے جواز پر دلالت کرنے والی احادیث کے موافق و مفید ہے اور اس رخصت کی روایت امام عطاء، طاؤس، حسن بصری اور مکحول رحمہم سے بھی ملتی ہے۔^①

امام شافعی رحمہ اللہ نے ثعلبہ بن ابی مالک کے حوالے سے عام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں روایت بیان کی ہے:

”إِنَّهُمْ كَانُوا يُصَلُّونَ نِصْفَ النَّهَارِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ“^②

”صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جمعہ کے دن زوال کے وقت بھی نفل نماز پڑھا کرتے تھے۔“

ان احادیث و آثار کا مجموعی مفاد یہ ہے کہ جمعہ کے دن زوال کے وقت یعنی جب سورج عین سر پر ہو، نفل نماز جائز ہے، لیکن عام حالات میں یہ اوقات مکروہہ میں سے ہے۔ البتہ جمعہ اس سے مستثنیٰ ہے۔

بعض دیگر مواقع کراہت:

یہ پانچ اوقات تو نمازوں کے مکروہ ہونے کے معروف ہیں اور نماز پنج گانہ کے اصل اوقات کی مناسبت سے ہیں۔ البتہ اہل علم نے بعض دیگر مواقع بھی ذکر کیے ہیں، جن میں نماز مکروہ ہے اور وہ مواقع بھی پانچ ہیں:

- ① جب نماز کی اقامت ہو رہی ہو یا ہو چکی ہو۔
- ② جب خطبہ جمعہ کے لیے امام و خطیب منبر پر پہنچ جائے۔
- ③ اس فرض نماز کی جماعت ہونے کے دوران میں جو اس نے ابھی پڑھنی ہو۔
- ④ صرف مالکیہ کے نزدیک وہ وقت کہ جمعہ کی نماز ختم ہو، مگر لوگ ابھی مسجد سے گئے نہ ہوں۔ تب ان کے نزدیک نفل نماز مکروہ ہے۔
- ⑤ صرف احناف کے نزدیک وہ وقت جو مغرب کی اذان اور جماعت کے درمیان تھوڑا سا وقفہ ہے

① زاد المعاد (۱/۳۷۸، ۳۸۰)

② ویکس: شرح الفتح الربانی (۲/۳۰۰)

(جس میں لوگ دو رکعت نماز پڑھتے ہیں اور صحیح بخاری و دیگر کتب حدیث میں ان دو رکعتوں کے جواز کا ثبوت موجود ہے)۔^①

بہر حال اصلی اوقات نماز کی مناسبت سے جو مکروہ اوقات ہیں، ان کی طرح ہی ان مکروہ مواقع کی تفصیل میں جانا شاید سردست باعثِ ثقل ہو، لہذا ہم صرف اتنا کہنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں کہ نماز کی اقامت اور جماعت کے دوران میں سنتیں پڑھنا یقیناً مکروہ ہے۔ اس وقت فوراً جماعت میں شامل ہو جانا چاہیے۔ اس کی کچھ تفصیل تو نماز فجر کے بعد والے وقت کراہت کے ضمن میں گزری ہے اور مزید تفصیل کا موقع نماز پنجگانہ کی سنتوں کے موضوع میں آئے گا۔ اسی مقام پر خصوصاً نماز پنجگانہ سے متعلقہ غیر موکدہ سنتوں کے ضمن میں اذان مغرب اور جماعت کے مابین دو رکعتوں کے جواز کی تفصیل بھی ذکر کی گئی ہے۔

جب خطیب خطبہ شروع کر چکا ہو تو بھی عام نفل نماز شروع کرنا مکروہ ہے۔ ہاں تحیۃ المسجد کے طور پر صرف مختصر سی دو رکعتیں پڑھ لینا چاہیے، کیوں کہ ان دو رکعتوں کو کثیر فقہاء کے نزدیک وجوب کا درجہ حاصل ہے، اس بات کے دلائل اور تفصیل ”مسائل و احکام جمعہ“ اور ”تحیۃ المسجد“ کے موضوعات میں ہیں۔ نماز جمعہ کے بعد اٹھ کر چار یا دو رکعتیں پڑھی جاسکتی ہیں۔ لوگوں کے چلے جانے تک نوافل کی کراہت کے واضح دلائل ہمیں نہیں مل سکے کہ جن سے یہ کراہت ثابت ہوتی ہو۔

کراہت میں تفاوت:

اوقات مکروہہ کا موضوع ختم کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس بات کی وضاحت بھی کر دی جائے کہ نماز پنجگانہ کے اصل اوقات کی مناسبت سے جو پانچ اوقات مکروہہ ہیں، ان میں نماز پڑھنے کی کراہت ایک جیسی نہیں ہے، بلکہ ان کے مابین تفاوت ہے۔ بعض اوقات میں نماز کی ممانعت دوسرے تین اوقات کی نسبت زیادہ شدید ہے۔^②

خوابوں کی تعبیر بیان کرنے کے ماہر و محدث امام محمد بن سیرین، امام المفسرین ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ اور بعض دیگر اہل علم نے نماز فجر و عصر کے بعد نماز کی ممانعت میں پائی جانے والی حکمت کے

① فتح الباری (۲/۶۳)

② الفتح الربانی و شرحہ (۲/۲۹۹)

ما بین فرق کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ پہلے دو اوقات میں نماز مکروہ ہے اور دوسرے دونوں اوقات میں نماز حرام ہے، اس تفاوت اور فرق پر ان کی دلیل یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے یہ ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے عصر کے بعد نماز پڑھی تھی۔ (جس کی تفصیل ذکر کی جا چکی ہے)

اس سے معلوم ہوا کہ عصر کے بعد نماز پڑھنا حرام نہیں، گویا انھوں نے آپ ﷺ کے ظہر کی دو سننیں عصر کے بعد پڑھنے کو بیانِ جواز پر محمول کیا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک روایت ملتی ہے کہ ان کے نزدیک نماز فجر کے بعد سے لے کر طلوع آفتاب تک ما بین نماز پڑھنا حرام تھا اور وہ عصر کے بعد سے لے کر سورج کے زرد پڑ جانے تک ما بین نماز پڑھنا مباح سمجھتے تھے۔ جب کہ علامہ ابن حزم رحمہ اللہ (اور بعض دیگر علما و محدث کا) بھی یہی مسلک تھا۔ (جیسا کہ تفصیل ذکر کی جا چکی ہے)

ان کی دلیل کے سلسلے میں سنن ابی داؤد کی وہ حدیث بھی ذکر کی گئی تھی، جسے کبار محدثین میں سے کسی نے صحیح اور کسی نے قوی کہا ہے، جس میں مذکور ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے عصر کے بعد نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے، سوائے اس وقت کے جب کہ سورج ابھی کافی بلند اور صاف شفاف ہو، یعنی زردی مائل نہ ہو۔

بہر حال بعض اہل علم کی رائے ہے کہ بعض اوقات میں نماز مکروہ اور بعض میں حرام اور بعض میں مباح ہے، جب کہ مشہور بات یہ ہے کہ ان تمام اوقات میں نماز مکروہ ہے، اس کراہت کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ کراہت تحریمی ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ نہیں بلکہ وہ کراہت تزیہی ہے۔ یعنی بچنا افضل و اولیٰ ہے۔^① ظاہر ہے کہ سب اوقات ان پانچوں نمازوں کو بر وقت ادا کرنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ ادائیگی وقت اختیار میں یا چاہے وقت اضطرار میں ہو۔ بہر حال ان اوقات میں پڑھی گئی نمازیں ادا شمار ہوں گی، قضا نہیں۔

فرضوں کی قضا:

فرضی نمازوں کی قضا یا عدم قضا کے سلسلے میں اہل علم کی آرا مختلف ہیں۔ اس سلسلے میں ہم صرف اتنا کہنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں کہ جو شخص بھول کر یا سویا رہ کر کسی نماز کو قضا کر دے تو اس پر اس نماز کی قضا ضروری ہے، اس پر پوری امت کا اتفاق ہے۔^②

① فتح الباری (۲/۶۳)

② بدایۃ المجتہد (۱/۱۴۲)

جیسا کہ نماز سے نبی اکرم ﷺ کے سوئے رہ جانے والی احادیث سے پتا چلتا ہے اور اگر کوئی شخص قصداً کوئی نماز چھوڑ دے تو ائمہ اربعہ سمیت جمہور اہل علم کے نزدیک گناہ گار ہوگا اور اس کے لیے ان نمازوں کی قضا کرنا ضروری ہے۔

البتہ امام داود طاہری، علامہ ابن حزم اور امام شافعی کے بعض اصحاب رحمہم کا مذہب یہ ہے کہ ایسا شخص گناہ گار تو ہے، لیکن وہ قضا نہیں کر سکتا۔ اسے چاہیے کہ توبہ و استغفار کے ذریعے اور مختلف نیک کاموں کی بدولت کفارے کی کوشش کرتا رہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہم، علامہ ابن قیم رحمہم، العز بن عبدالسلام، امام شوکانی رحمہم اور شیخ البانی کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔^①

الغرض اہل علم کے مابین یہ ایک طویل بحث ہے، جس کی تفصیلات میں جانے سے بہتر یہی ہے کہ ائمہ اربعہ اور جمہور کے مسلک پر عمل کرتے ہوئے کسی شکل میں بھی اپنے وقت سے رہ جانے والی نماز کو قضا ہی کر لیا جائے۔^②

دیکھیں! عذر و مجبوری نہ ہونے اور محض کاہلی کے نتیجے میں موخر کرنے پر اس کی قضا بھی کی جائے اور توبہ و استغفار کر کے اس کوتاہی پر اللہ سے معافی بھی مانگی جائے، یہی احوط ہے۔

کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کسی عذر و مجبوری کی وجہ سے کسی نماز کا وقت ادا گزر ہی جائے، اول رہے نہ اختیار اور نہ اضطرار ہی، بلکہ نماز فوت ہو جائے تو اسے قضا کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ اگر کبھی ایک سے زیادہ نمازیں یکے بعد دیگرے رہ جائیں یا فوت ہو جائیں تو ان کی قضا کیسے کی جائے گی؟ کیا قضا نماز کے لیے اذان و اقامت بھی کہی جاسکتی ہے یا نہیں؟ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان سوالوں کا تفصیلی جواب بھی ذکر کر دیا جائے، کیوں کہ ان کا تعلق بھی اوقات نماز ہی سے ہے، تاکہ یہ موضوع تشنہ تکمیل نہ رہے تو اس سلسلے میں سب سے پہلے موضوع ہے: قضا نماز کے لیے اذان۔

قضا نماز کے لیے اذان:

بعض صحیح احادیث میں مذکور نبی اکرم ﷺ کے اپنے عمل مبارک سے پتا چلتا ہے کہ قضا نماز

① تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: بداية المجتهد (۱/۱۴۲) نیل الأوطار (۱/۲۵، ۲۶) کتاب الصلاة لابن القيم (ص: ۷۲) السلسلة الصحيحة (۱/۹۹-۱۰۲، ۶۸۱-۶۸۳) مجموع فتاویٰ ابن تیمیہ (۲۲/۱۰۳) شرح

صحیح مسلم للنووي (۳/۵/۱۸۳) مشکاة المصابيح (۱/۱۹۱)

② دیکھیں: السلسلة الصحيحة (۱/۱۰۲) شرح صحیح مسلم للنووي (۳/۵/۱۸۳)

کے لیے بھی اذان کہی جاسکتی ہے، بلکہ کہی جانی چاہیے۔ قدیم قول کے مطابق امام شافعی، اسی طرح امام ابوحنیفہ، امام احمد، ابو ثور اور امام ابن المنذر رحمہم اللہ کا یہی مسلک ہے کہ فوت شدہ نماز کے لیے بھی اذان دی جائے، جب کہ امام اوزاعی، مالک اور جدید قول کی رو سے امام شافعی کے نزدیک قضا کے لیے اذان نہ کہی جائے گی۔ البتہ امام شافعی رحمہم اللہ کے کثیر اصحاب کے نزدیک بھی مذہب مختار یہی ہے کہ اذان کہی جائے، کیوں کہ اس کی دلیل صحیح حدیث ہے۔^①

تاکلینِ اذان کے دلائل میں سے ایک تو وہ حدیث ہے، جو صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتب حدیث میں حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ ہم ایک رات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر میں تھے۔ کسی نے کہا: اے اللہ کے رسول! ہم سب کچھ دیر آرام کر لیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «أَخَافُ أَنْ تَنَامُوا عَنِ الصَّلَاةِ» «میں ڈرتا ہوں کہ کہیں تم نماز سے سوئے نہ رہ جاؤ۔» حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں سب کو جگا دوں گا، پس سب لوگ لیٹ گئے اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے پشت کی ٹیک اپنی سواری سے لگائی تو ان پر بھی نیند غالب آگئی اور وہ بھی سو گئے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت بیدار ہوئے جب سورج کا کنارہ افق سے نکل آیا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

«يَا بِلَالُ! أَيْنَ مَا قُلْتَ؟» «اے بلال! تم نے جو وعدہ کیا تھا، اس کا کیا ہوا؟»

تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«مَا الْقَيْتُ عَلَيْ نَوْمَةً مِثْلَهَا قَطُّ» «مجھے تو ایسی گہری نیند آج تک کبھی نہیں آئی تھی۔»

تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّ اللَّهَ قَبَضَ أَرْوَاحَكُمْ حِينَ شَاءَ وَرَدَّهَا عَلَيْكُمْ حِينَ شَاءَ، يَا بِلَالُ! قُمْ فَادِّئِ النَّاسَ بِالصَّلَاةِ»

”بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہاری روئیں جب چاہا قبض کر لیں اور جب چاہا تمہیں لوٹا دیں۔ اے بلال! اٹھو اور لوگوں کو نماز کی طرف بلانے کے لیے اذان کہو۔“

بخاری شریف میں آگے یہ الفاظ ہیں:

① صحیح مسلم مع شرح النووي (۳/ ۵/ ۱۸۴ تا ۱۷۸) فتح الباری (۲/ ۶۸) نیل الأوطار (۱/ ۲۰/ ۶۰)

«فَتَوَضَّأَ فَلَمَّا ارْتَفَعَتِ الشَّمْسُ وَابْيَضَّتْ قَامَ فَصَلَّى»^①

”پس نبی اکرم ﷺ نے وضو کیا اور جب سورج سفید ہو گیا (کچھ اوپر چڑھ آیا) تو آپ ﷺ اٹھے اور نماز پڑھی۔“

سنن ابوداؤد میں ہے:

«فَصَلَّى بِالنَّاسِ»^② ”پھر آپ ﷺ نے لوگوں کو نماز پڑھائی۔“

جب کہ مستخرج ابونعیم میں نبی اکرم ﷺ کے وضو کے ذکر کے بعد یہ بھی ہے:

«فَتَوَضَّأَ النَّاسُ» ”اور لوگوں نے بھی وضو کیا۔“

صحیح بخاری میں کتاب التوحید میں ہشیم بن حصین کے طریق سے جو حدیث مروی ہے، اس

میں الفاظ یوں ہیں:

«فَقَضَوْا حَوَائِجَهُمْ فَتَوَضَّأُوا إِلَى أَنْ طَلَعَتِ الشَّمْسُ»^③

”اور (بیدار ہونے کے بعد) لوگوں نے قضاے حاجت کی اور پھر وضو کیا، یہاں تک کہ

سورج طلوع ہو گیا۔“

کچھ ایسے ہی الفاظ سنن ابی داؤد میں خالد عن حصین کے طریق سے مروی روایت میں بھی

موجود ہیں۔

وقتِ کراہت میں قضا:

صحیح بخاری اور سنن ابی داؤد کے ان الفاظ سے پتا چلتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے سورج کے

طلوع ہونے اور اس کے بلند ہو جانے (خوب صاف و روشن ہو جانے) تک جو نماز کو موخر کیا تھا، اس

کا اصل سبب درحقیقت یہ تھا کہ لوگ قضاے حاجت سے واپس نہ ہوئے تھے (جیسا کہ ان الفاظ سے

پتا چل رہا ہے) ورنہ یہ سبب ہرگز نہیں تھا کہ وقتِ کراہت گزر جائے۔^④

① صحیح البخاری مع الفتح (۲/ ۶۶، ۶۷)

② صحیح سنن ابی داؤد، رقم الحدیث (۴۲۳)

③ صحیح البخاری مع الفتح (۱۳/ ۴۴۷) رقم الحدیث (۷۴۷۱)

④ فتح الباری (۲/ ۶۷)

اس طرح ان الفاظ نے وہ اختلافی مسئلہ بھی حل کر دیا، جو اوقاتِ نماز اور اوقاتِ مکروہہ سے تعلق رکھتا ہے، یعنی اگر کبھی کسی کے سوئے رہ جانے یا بھول جانے سے کسی کی نماز رہ جائے تو محض یاد آتے ہی یا بیدار ہوتے ہی پڑھ سکتا ہے۔ وہ چاہے وقتِ کراہت ہی کیوں نہ ہو، جس کے دلائل قریب ہی گزرے ہیں۔ فقہا (احناف) میں سے جو لوگ کہتے ہیں کہ وقتِ کراہت کو گزرنے دیا جائے، وہ اس پر اسی واقعے سے استدلال کرتے ہیں تو ان کے استدلال کا ضعف صحیح بخاری اور سنن ابی داؤد کی حدیث کے ان الفاظ نے واضح کر دیا ہے۔

الغرض اس واقعے پر مشتمل حدیث سے معلوم ہو گیا کہ وقت گزر جانے کے بعد قضا کی جانے والی نماز کے لیے بھی اذان کا کہنا ثابت ہے، اس حدیث پر امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں یوں تبویب کی ہے:

”باب الأذان بعد ذهاب الوقت“

یعنی کسی نماز کا اصل وقت گزر جانے کے بعد اذان کہنے کا بیان۔

صحیح بخاری میں امام موصوف کی یہ عادت ہے کہ کسی اختلافی مسئلے میں حکم پر مشتمل ایسی تبویب نہیں کرتے، سوائے اس کے کہ ان کے نزدیک کسی حکم کے دلائل قوی و راجح ہوں۔ حافظ عسقلانی شارح بخاری کے نزدیک یہاں ایسا ہی ہے کہ مولف کے نزدیک اذان کہنے کے دلائل قوی ہیں، لہذا امام بخاری نے تبویب ہی میں حکم بیان کر دیا ہے۔

ایسے ہی بعض احادیث میں آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقام پر نماز نہیں پڑھی تھی، بلکہ اس سے آگے نکل گئے تھے اور وہاں جا کر فجر کی نماز پڑھی تھی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس جگہ سے کوچ کر جانے اور آگے کہیں جا کر نماز پڑھنے سے بھی استدلال کیا جاسکتا ہے کہ یہ وقتِ کراہت کے گزارنے کے لیے تھا، لیکن یہ استدلال بھی درست نہیں ہے، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس جگہ سے کوچ کر جانے کا سبب خود ان احادیث میں مذکور ہے، جیسا کہ صحیح مسلم، سنن نسائی، بیہقی اور مسند احمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لِيَأْخُذَ كُلُّ رَجُلٍ بِرَأْسِ رَأِحَتِهِ فَإِنَّ هَذَا مَنْزِلٌ حَضَرْنَا فِيهِ الشَّيْطَانُ»^①

① الفتح الرباني ترتيب مسند أحمد (٢/ ٣٠٧) و اللفظ لأحمد، صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١٨٣/٥) المنتقى مع النيل (١/ ٥٩/٢) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٦٠٦)

”ہر شخص اپنی سواری پکڑ لے (اور آگے چل نکلے) بے شک یہ مقام ایسا ہے کہ جہاں ہمارے پاس شیطان پہنچ گیا ہے۔“

تو گویا اس وادی یا مقام پر شیطان کا ڈیرہ ہونے کی وجہ سے نبی اکرم ﷺ نے وہاں سے کوچ کیا تھا۔ شرح مسلم میں امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کے تحت لکھا ہے کہ اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ شیطان کے ڈیروں میں (جہاں شیطان کا تسلط ہو) سے اجتناب کرنا مستحب ہے۔^(۱) شیطان کے ڈیرے کن کن مقامات کو قرار دیا گیا، یہ ایک الگ اور مستقل موضوع ہے، جو آگے چل کر زیر بحث آئے گا۔ ان شاء اللہ۔ بہر حال قضاے نماز کے لیے اذان کا ثبوت اس واقعے میں موجود ہے، اس صحیح حدیث کی رو سے یہی راجح مسلک ہے اور اس کے دلائل پر مشتمل دیگر احادیث بھی ہیں، جن سے ہم صرف نظر کر رہے ہیں۔

مانعین اذان کے دلائل کا جائزہ:

بعض دیگر احادیث میں اذان کا ذکر نہیں آتا، جیسا کہ صحیحین کی ان دونوں حدیثوں میں نمازوں کو ان کے اوقات کے بعد پڑھنے کا ذکر ہے، لیکن ان میں اذان کا تذکرہ نہیں آیا اور نہ صحیح مسلم میں حدیث ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ میں ہے۔^(۲) ایسے ہی سنن ابی داؤد و بیہقی اور مسند احمد میں حضرت عمرو بن امیہ العمری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے۔^(۳) اس میں صرف اتنا مذکور ہے کہ ہم سفر میں نبی اکرم ﷺ کے ہمراہ تھے کہ آپ ﷺ نماز فجر سے سوئے رہ گئے، حتیٰ کہ سورج نکل آیا تو نبی اکرم ﷺ نے دو رکعتوں (سنتوں) سے نماز شروع کی، پھر نماز کی اقامت کہلوائی اور نماز پڑھی۔

ایسے ہی ایک دوسری حدیث سنن نسائی، مسند امام شافعی، صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ اور مسند احمد میں ہے، جس میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ غزوہ خندق کا واقعہ بیان فرماتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ایک دن ہماری نماز ظہر و عصر اور مغرب قضا ہو گئیں تو مغرب کے بعد نبی اکرم ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا تو انھوں نے ظہر کی اقامت کہی۔ آپ ﷺ نے اس طرح ظہر کی نماز پڑھی، جیسے

(۱) ویکس: شرح النووي (۳/ ۵/ ۱۸۳) و شرح الفتح الرباني (۲/ ۳۰۷)

(۲) صحیح البخاری مع الفتح (۲/ ۶۸) و نیل الأوطار (۱/ ۲/ ۶۰)

(۳) الفتح الرباني (۲/ ۳۰۶) وقال البناء ”وسنده جيد“

آپ ﷺ اس کے وقت پر اسے پڑھتے تھے، پھر عصر کی اقامت ہوئی اور اسے بھی ایسے ہی پڑھا، جیسے کہ اس کے وقت میں پڑھتے تھے۔^①

ان احادیث میں نمازوں کو ان کے اوقات کے بعد پڑھنے کا ذکر ہے، لیکن ان میں اذان کا تذکرہ نہیں آیا۔ ایسی احادیث سے استدلال کرتے ہوئے امام اوزاعی، مالک اور جدید قول کے مطابق امام شافعی رحمہ اللہ نے ایسے موقع پر اذان نہ کہنے کی رائے اختیار کی ہے، لیکن یہ رائے مرجوح ہے۔ جیسا کہ صحیح حدیث سے ثابت کیا گیا ہے اور جن احادیث میں اذان کا ذکر نہیں آیا، ان کے بارے میں امام نووی رحمہ اللہ نے ان حضرات کو دو طرح سے جواب دیا ہے:

پہلا جواب:

ان احادیث میں اذان کا ذکر نہ آنے سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ آپ ﷺ نے اذان کہلوائی ہی نہ ہو، بلکہ ہو سکتا ہے کہ آپ ﷺ نے اذان کہلوائی ہو، مگر راوی نے اس کا ذکر نظر انداز کر دیا ہو یا پھر اذان کا راوی کو علم نہ ہوا ہو۔ یہ جواب فتح الباری میں بھی دیا گیا ہے۔^②

دوسرا جواب:

ممکن ہے کسی مرتبہ آپ ﷺ نے اذان نہ کہلوائی ہو، بلکہ اسے ترک کر دیا ہو، تاکہ اذان ترک کر دینے کا جواز بیان کر دیں اور اس بات کی طرف اشارہ کر دیں کہ قضا نماز کے لیے اور خصوصاً جب کہ سفر میں بھی ہو عام حالات کی طرح اذان واجب نہیں رہتی۔ یعنی اس کے وجوب میں کچھ نرمی آجاتی ہے۔^③

سری و جہری نمازوں کی قضا:

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی غزوہ خندق والی اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اگر دن کی کوئی سری نماز قضا ہو جائے اور اسے رات کے وقت پڑھا جائے تو رات ہونے کے باوجود

① المنتقی مع النیل (۱/۲۹، ۲۰) ونقل الشوکانی عن المعمری: وهذا إسناد صحيح جليل (۱/۲۰، ۳۰، ۶۱) فتح الباری (۲/۶۹) مختصراً الفتح الرباني (۲/۳۰۹) وقال: رجال إسناده رجال الصحيح، و صححه ابن السکن.

② الفتح الرباني (۲/۷۰)

③ ویکیس: شرح صحيح مسلم للنووي (۳/۱۸۳) و نيل الأوطار (۱/۶۰) الفتح الرباني (۲/۳۱۱)

اسے سرّی ہی پڑھا جائے گا، یعنی اس میں قراءت جہری یا بلند آواز سے نہیں کی جائے گی، جیسا کہ حضرت ابوسعیدؓ کے الفاظ ظہر و عصر کے بارے میں ہیں:

«فَصَلَّاهَا كَمَا يُصَلِّيهِمَا فِي وَقْتِهَا»^①

”آپ ﷺ نے اسے اس طرح پڑھا، جس طرح اسے اس کے وقت پر پڑھا کرتے تھے۔“
ایسے ہی فجر وغیرہ میں دن کے وقت بھی قراءت جہری ہوگی، جیسا کہ آپ ﷺ کے قضاے فجر سے پتا چلتا ہے۔^②

قضا نماز کی اقامت و جماعت:

قضا نماز کے لیے اقامت و جماعت کے حکم کے سلسلے میں امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں مستقبل ایک باب باندھا ہے:

”بابٌ من صلّى بالناس جماعةً بعدَ ذهابِ الوقتِ“
”جس نے وقت گزر جانے کے بعد کسی نماز کو جماعت کے ساتھ لوگوں کو پڑھائی۔“
اس باب کے تحت جو حدیث لائے ہیں، وہ صحیح مسلم، ترمذی اور دیگر کتب حدیث میں بھی مروی ہے، جس میں غزوہ خندق یا خواب کا ایک واقعہ مذکور ہے کہ حضرت جابر بن عبد اللہؓ بیان کرتے ہیں کہ امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ غزوہ خندق کے دن غروب آفتاب کے بعد آئے، جب کہ وہ کفارِ قریش کو برا بھلا کہہ رہے تھے اور نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کی، اے اللہ کے رسول ﷺ! ”مَا كِدْتُ أُصَلِّي الْعَصْرَ حَتَّى كَادَتِ الشَّمْسُ تَغْرُبُ“ ”میں نماز عصر اس وقت تک نہیں پڑھ سکا، جب تک کہ سورج غروب ہونے کے قریب نہیں ہو گیا۔“ تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«وَاللَّهِ مَا صَلَّيْتَهَا» ”اللہ کی قسم! میں نے بھی ابھی تک نہیں پڑھی۔“

آگے وہ بیان فرماتے ہیں:

«فَقُمْنَا إِلَى بَطْحَانَ فَتَوَضَّأَ لِلصَّلَاةِ وَتَوَضَّأْنَا لَهَا، فَصَلَّى الْعَصْرَ بَعْدَ مَا غَرَبَتِ الشَّمْسُ، ثُمَّ صَلَّى بَعْدَهَا الْمَغْرِبَ»

① الفتح الرباني ترتيب، مسند أحمد (۳/ ۴۹، ۲۵، ۶۷) صحيح سنن النسائي (۶۳۸) نصب الراية (۲/ ۱۶۵)

② نيل الأوطار (۸/ ۲۷) منتقى الاخبار.

”پس ہم سب وادی بطنان کی طرف گئے۔ نبی اکرم ﷺ نے نماز کے لیے وضو کیا اور ہم سب نے بھی اسی غرض کے لیے وضو کیا تو سورج غروب ہو جانے کے بعد آپ ﷺ نے نماز عصر پڑھی، پھر اس کے بعد آپ ﷺ نے مغرب کی نماز پڑھی۔“

اس حدیث سے امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ بات اخذ کی ہے کہ وقت گزرنے کے بعد بھی جب کوئی نماز پڑھی جائے تو اس کی جماعت کرانا نبی اکرم ﷺ سے ثابت ہے، کیوں کہ حدیث مذکور کی رو سے نبی اکرم ﷺ نے عصر کی نماز غروب آفتاب کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ مل کر جماعت سے پڑھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ فتح الباری میں شارح بخاری لکھتے ہیں:

”اس حدیث میں قضا نمازوں کو باجماعت ادا کرنے کے استحباب کی دلیل ہے۔ اکثر اہل علم کا یہی قول ہے، سوائے لیث کے۔ اگرچہ وہ بھی نماز جمعہ کی قضا کی صورت میں اسے باجماعت ادا کرنے کے قائل ہیں اور ہر قضا نماز کے لیے اقامت کو بھی روا سمجھتے ہیں۔ (البتہ وہ ہر قضا کے لیے جماعت کے حق میں نہیں) جب کہ یہ حدیث اور بعض دیگر احادیث جماعت کے استحباب کے قائلین کی مؤید اور امام لیث کی رائے کے سراسر خلاف ہیں، جن میں سے ایک حدیث تو وہی ہے، جو صحیحین اور بعض دیگر کتب حدیث کے حوالے سے ”قضا نماز کے لیے اذان“ کے موضوع کے ضمن میں گزر چکی ہیں، جس میں حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے نماز فجر سے نبی اکرم ﷺ اور لشکر اسلامی کے سوئے رہ جانے کا واقعہ بیان کیا ہے اور وہ نماز سب نے طلوع آفتاب کے بعد باقاعدہ اذان اور اقامت کے ساتھ باجماعت ادا کی تھی۔

”فجر سے سوئے رہ جانے والا واقعہ بھی کسی ایک حدیث میں نہیں، بلکہ متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی احادیث میں آیا ہے اور سوائے دو ایک میں اذان کا ذکر نہ ہونے کے (جیسا کہ اس کا جواب بھی ذکر کیا جا چکا ہے) سبھی صحابہ رضی اللہ عنہم کی مرویات میں اذان و اقامت اور جماعت کا ذکر ہے۔ اگر سوئے رہ جانے والے واقعہ کو صرف ایک مرتبہ ہی شمار کیا جائے تو یہ کہا جائے گا کہ متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس واقعہ کو اپنے اپنے انداز سے بیان فرمایا ہے، جب کہ یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ وہ واقعہ ایک ہی مرتبہ پیش آیا ہو، بلکہ عین امکان

ہے کہ ایسا واقعہ کئی مرتبہ پیش آیا ہو اور احادیث سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایسا واقعہ متعدد پیش آیا تھا اور امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے تعدد واقعہ کے قول ہی کو ترجیح دی ہے،^(۱) تو اس شکل میں یہ واقعہ سے متعلق حدیث مستقل ایک حجت و دلیل ہے کہ قضا نماز کو باجماعت ادا کرنا ہی مستحب ہے اور واقعہ خندق یا غزوہ احزاب کے دوران میں حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی صحیحین کی حدیث کی رو سے تو صرف نماز عصر ہی قضا ہوئی تھی، جب کہ سنن نسائی، مسند شافعی، صحیح ابن حبان و خزیمہ اور مسند احمد کی حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث (جو ابھی قریب ہی گزری ہے) کی رو سے غزوہ خندق کے موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب کی یکے بعد دیگرے تین نمازیں ظہر، عصر اور مغرب سبھی قضا ہو گئی تھیں، جب کہ سنن ترمذی، نسائی اور مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں وہ بیان کرتے ہیں:

«إِنَّ الْمَشْرِكِينَ شَغَلُوا النَّبِيَّ ﷺ يَوْمَ الْخَنْدَقِ عَنْ أَرْبَعِ صَلَوَاتٍ حَتَّى ذَهَبَ مِنَ اللَّيْلِ مَا شَاءَ اللَّهُ»

”مشرکین نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو غزوہ خندق کے دن چار نمازوں سے روک رکھا، حتیٰ کہ رات کا ایک حصہ گزر گیا، جتنا کہ اللہ نے چاہا۔“

آگے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

«فَأَمَرَ بِأَلَّا فَاذَنْ ثُمَّ أَقَامَ فَصَلَّى الظُّهْرَ، ثُمَّ أَقَامَ فَصَلَّى العَصْرَ، ثُمَّ أَقَامَ فَصَلَّى المَغْرِبَ، ثُمَّ أَقَامَ فَصَلَّى العِشَاءَ»^(۲)

”آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا تو انھوں نے اذان کہی، پھر اقامت کہی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز پڑھی، پھر انھوں نے اقامت کہی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کی نماز پڑھی، پھر انھوں نے اقامت کہی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب کی نماز پڑھی، پھر انھوں نے اقامت کہی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عشاء کی نماز پڑھی۔“

(۱) ویکس: شرح الفتح الرباني (۲/ ۳۰۹)

(۲) الفتح الرباني (۲/ ۳۰۹، ۳۱۰) سنن الترمذی مع التحفة (۱/ ۵۲۳) المنتقى مع النيل (۱/ ۲/ ۶۰) صحیح

سنن النسائي، رقم الحديث (۶۳۹)

اس حدیث کو نقل کر کے علامہ مجد الدین ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے ”منتقى الأخبار“ میں امام ترمذی نے جامع میں کہا ہے کہ اس کی سند میں کوئی خاص قابل گرفت علت نہیں، ”لیس باسنادہ باس“ سوائے اس کے کہ اس کے دوسرے راوی ابو عبیدہ کا اپنے والد حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے سماع (سننا) ثابت نہیں۔ امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے ”نیل الأوطار“ میں لکھا ہے کہ اس کے تمام راوی صحیح کے راوی ہیں اور اس کی سند میں کوئی علت نہیں، سوائے ابو عبیدہ کے اپنے والد سے عدم سماع کے اور حفاظ حدیث نے عدم سماع کو ہی یقینی قرار دیا ہے اور ”الفتح الربانی“ میں اس کی سند کو جدید قرار دیا گیا ہے۔

موطا امام مالک میں واقع ایک طریق ایسا بھی ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ ان کی دو نمازیں یعنی نمازِ ظہر و عصر قضا ہوئی تھیں۔^① اس طرح کی چار روایات ہیں اور سوئے رہ جانے والی احادیث کی طرح ہی سب قضا نماز کو باجماعت ادا کرنے کی دلیل ہیں۔

ایک اشکال اور اس کا حل:

اب رہی یہ بات کہ ایسا کیوں ہے کہ بعض صحابہ نے غزوہ خندق کے موقع پر ایک نمازِ عصر قضا ہونے کا ذکر کیا ہے، بعض نے دوکا، کسی نے تین کا اور کسی نے چار کا؟

اس اشکال کے حل کی طرف ہم ”صلاة الوسطی“ کی تعیین کے ضمن میں بھی اشارہ کریں گے کہ اہل علم میں سے بعض نے ترجیح کو اختیار کیا ہے اور معمری نے کہا ہے کہ صحیحین یعنی بخاری و مسلم میں جو ہے وہ راجح ہے۔ یعنی ترجیح اس بات کو ہے کہ صرف ایک نمازِ عصر ہی قضا ہوئی تھی، اس بات کی تصریح کرتے ہوئے امام ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ صحیح یہی ہے کہ مشرکین و کفار قریش نے جس نماز سے روکا تھا، وہ صرف ایک ہی نمازِ عصر تھی۔ شارح بخاری حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ ”فتح الباری“ میں لکھتے ہیں کہ امام ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کی تائید صحیح مسلم (اور دیگر کتب حدیث) میں مروی حضرت علی رضی اللہ عنہ والی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے، جس میں ہے:

«شَغَلُونَا عَنِ الصَّلَاةِ الْوَسْطَىٰ صَلَاةِ الْعَصْرِ»^②

”کفار نے ہمیں نمازِ وسطی یعنی نمازِ عصر سے روک رکھا۔“

① بحوالہ فتح الباری (۲/ ۶۹)

② صحیح مسلم مع شرح النووی (۳/ ۵/ ۱۲۸) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۴۵۹)

یہ تو اس اشکال کا ایک حل ہوا کہ بخاری و مسلم کی احادیث چونکہ صحیح تر اور شکوک و شبہات سے بالا ہیں، لہذا یہی کہا جائے کہ صرف نماز عصر قضا ہوئی تھیں، جب کہ بعض اہل علم نے دوسری رائے اختیار فرمائی ہے اور ترجیح کے بجائے جمع و تطبیق سے اس اشکال کو حل کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ واقعہ خندق صرف ایک ہی دن پر نہیں، بلکہ کئی دنوں پر مشتمل ہے اور یہ مختلف صورتیں، مختلف ایام میں الگ الگ پیش آئیں۔ (یعنی یہ سبھی واقع ہوئیں، لیکن کوئی کسی دن اور کوئی کسی دوسرے دن) امام ابن سید الناس جیسے بعض اہل علم نے اس جمع و تطبیق سے رفع اشکال کو اولیٰ قرار دیا ہے۔^①

امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے ”نبیل الأوطار“ میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ والی حدیث میں نمازوں کے قضا ہونے کے ذکر پر مشتمل حدیث کی شرح بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

”اگرچہ صحیحین کی حدیث میں صرف ایک نماز عصر کا ذکر ہے، لیکن اس حدیث اور ایسی ہی دیگر احادیث، جن میں سے کسی میں دو نمازوں کے قضا ہونے کا ذکر ہے تو کسی میں چار کا، ان میں صحیحین کی حدیث کی نسبت اضافی بات وارد ہوئی ہے اور اس اضافے کو لینا ضروری ہے۔ (خصوصاً جب کہ اس کی سند بھی قابلِ حجت ہو) اور کسی راوی نے اگر صرف نماز عصر کے ذکر پر ہی اکتفا کیا ہے تو یہ دوسرے (زیادہ نمازوں کو ذکر کرنے والے) راویوں کے لیے ذریعہ تردید و تنقید نہیں بن سکتا، جنہوں نے ظہر و عصر یا چار نمازیں کہی ہیں، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ جس نے صرف ایک نماز عصر کا ذکر کیا ہے، اس نے اپنے علم کے مطابق ذکر کیا ہے اور جو اسے معلوم نہیں ہو سکا، وہ اس نے ترک کر دیا ہے (اور جنہیں ایک سے زیادہ نمازوں کی تاخیر و قضا کا علم ہوا، انہوں نے زیادہ بیان کر دیا) اور معروف قاعدہ ہے:

”مَنْ عَلِمَ حُجَّةً عَلَيَّ مَنْ لَمْ يَعْلَمْ“

”جسے کسی بات کا علم ہو گیا، وہ اس پر حجت ہے، جسے اس بات کا علم نہ ہو سکا۔“

اس طرح اس واقعہ کے کئی دنوں میں متعدد بار وقوع پذیر ہونے والی جمع و تطبیق کی بھی

ضرورت نہیں رہ جاتی۔^②

① فتح الباری (۲/۶۹، ۷۰) الفتح الربانی (۲/۳۱۱)

② نبیل الأوطار (۱/۳۰۲)

الغرض اس واقع کو ایک شمار کر لیں تو یہ ایک دلیل ہے کہ قضا نماز کی جماعت بھی مستحب ہے اور اگر اسے چار مختلف اوقات میں واقع ہونے والی صورتیں شمار کریں تو یہ چاروں الگ الگ دلائل ہیں کہ قضا کے لیے نبی اکرم ﷺ نے جماعت کرائی تھی۔

قضا نمازوں کو پڑھنے میں ترتیب:

قضا نمازوں کے لیے اذان و اقامت اور جماعت کے شرعی حکم کے بعد اب آئیے ایک تیسرے سوال کی طرف اور یہ سوال صرف اس صورت میں سامنے آتا ہے، جب کسی کی صرف ایک نماز قضا نہ ہوئی ہو، بلکہ متعدد نمازیں قضا ہو جائیں۔ ایسی شکل میں اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان نمازوں کو ان کی اصل ترتیب کے مطابق ہی پڑھا جائے، جس ترتیب سے وہ قضا ہوئی ہیں یا قضا نمازوں کو پڑھتے وقت ترتیب کا خیال رکھنا واجب نہیں ہے اور کسی وقت کی ادا نماز اور قضا شدہ نماز میں ترتیب کا حکم کیا ہے؟

اس سلسلے میں بنیادی بات یہ ہے کہ قضا نمازوں کو پڑھتے وقت ان کی ترتیب کا خیال رکھنا ہی افضل اور اولیٰ ہے، تاکہ وہ جس ترتیب سے قضا ہوئی تھیں، اسی ترتیب ہی سے پڑھی جاسکیں۔ یہ حکم بعض صورتوں میں استحباً ہے، وجوباً نہیں، کیوں کہ بعض صورتوں میں ترتیب ساقط ہو جاتی ہے اور وجوب کی رائے رکھنے والے فقہانے جو دلائل ذکر کیے ہیں، ان سے استدلال میں بعض اہل علم نے ضعف واضح کیا ہے۔

قضا اور ادا میں ترتیب:

ائمہ و فقہانے میں سے امام ابو حنیفہ، مالک، لیث، زہری، نخعی اور ربیعہ رحمہم نے قضا نماز کو کسی وقت کی ادا نماز سے پہلے پڑھنے کو واجب قرار دیا ہے۔ اگرچہ ان کے مابین بھی بعض تفصیلات میں اختلاف ہے۔ پہلے قضا پڑھنے اور پھر اس وقت کی ادا یا حاضر نماز پڑھنے والی ترتیب کے وجوب پر غزوہ خندق میں نماز عصر کے قضا ہونے اور غروب آفتاب کے بعد نماز مغرب سے پہلے پڑھنے اور پھر مغرب پڑھنے کے واقعہ پر مشتمل صحیحین اور دیگر کتب حدیث میں مروی حدیث سے استدلال کیا گیا ہے، جب کہ امام شافعی رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ قضا و ادا میں سے پہلے قضا پڑھنا واجب نہیں ہے۔

وجوب کے قول والوں کا جواب دیتے ہوئے ”فتح الباری“ میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے اور ”نیل الأوطار“ میں امام شوکانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ غزوہ خندق والی حدیث وجوب کی دلیل نہیں بن سکتی، سوائے اس کے کہ یہ مانا جائے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل محض امت کے حق میں وجوب کی دلیل ہے، جب کہ معروف قاعدہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل محض اس فعل کے وجوب پر دلالت نہیں کرتا۔ ہاں اگر معروف حدیث بخاری: «صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي»

”تم بھی اسی طرح نماز پڑھو، جیسے تم نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔“

اس ارشاد نبوی کے عمل سے استدلال کرتے ہوئے وجوب کا کہیں تو بات قوی ہو جاتی ہے، جب کہ اس مسئلے پر بحث کے سوا دیگر امور میں خود شافعیہ نے بھی اس کا اعتبار کیا ہے۔^(۱)

”نیل الأوطار“ میں آگے چل کر یہ بھی لکھا ہے کہ قائلین وجوب کا استدلال اس بات سے بھی ہے کہ یاد آنے والی نماز، جو اصل وقت سے نکل چکی ہو، اب یاد آنے پر اس کا وقت بہت تھوڑا ہے، جب کہ وقتی نماز کا وقت کھلا ہے، لہذا تھوڑے اور تنگ وقت والی قضا نماز کو پہلے پڑھنا واجب ہے۔^(۲)

تنگ وقت والی حاضر نماز پہلے یا قضا پہلے؟:

فتح الباری کے ایک دوسرے مقام پر شارح بخاری حافظ عسقلانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اس بات میں اختلاف ہے کہ اگر کسی کو کسی حاضر نماز کے تنگ سے وقت ہی میں کوئی قضا نماز یاد آجائے تو وہ قضا کو پہلے پڑھے، چاہے حاضر نماز کا وقت گزر ہی کیوں نہ جائے یا حاضر نماز کو پہلے پڑھے یا اسے اختیار ہے کہ وہ ان دونوں میں سے جسے چاہے پہلے پڑھے؟

① پہلا قول ہے کہ قضا ہی کو پڑھے، چاہے حاضر کا وقت گزر ہی کیوں نہ جائے۔ یہ امام مالک رحمہ اللہ کا قول ہے۔

② امام شافعی، اصحاب رائے یعنی احناف اور اکثر اہل حدیث کا مسلک یہ ہے کہ (اس صورت میں) حاضر نماز کو پہلے پڑھے (تاکہ کہیں اس کا بھی وقت نہ نکل جائے)۔

③ امام اہلب رحمہ اللہ نے تیسرے قول کو اختیار کیا ہے کہ ان میں سے جسے چاہے پہلے پڑھے اور

① فتح الباری (۷۲/۲) نیل الأوطار (۲۹/۲/۱)

② نیل الأوطار (۲۹/۲/۱)

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ اختلاف صرف اس وقت ہے، جب قضا نمازیں زیادہ نہ ہوں اور اگر قضا نمازیں (کثیر) زیادہ ہوں تو پھر اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ پہلے موجودہ وقت کی حاضر نماز ہی کو ادا کیا جائے گا، پھر نمازوں کی قلیل و کثیر کی حد میں بھی اختلاف ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ اگر صرف ایک ہی نماز قضا ہوئی ہو تو قلیل ہے۔ (اور زیادہ ہو جائیں تو کثیر) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر چار نمازیں قضا ہوں تو قلیل ہیں (اس سے زیادہ ہو جائیں تو کثیر)۔ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول سے اس بات کی وضاحت تو ہوگئی ہے کہ اگر قضا نماز قلیل ہو، یعنی دو ایک ہو تو پہلے اسے پڑھ لیا جائے اور پھر وقتی نماز کو۔ قلیل و کثیر کے سلسلے میں دو ایک نماز کو قلیل شمار کرنا ہی مناسب لگتا ہے اور یہی وہ صورت ہے، جس میں انھیں پڑھنے کی شکل میں وقتی نماز کا تنگ سا وقت نہیں گزرنے پائے گا۔ اگر وقت بھی تنگ ہو اور قلیل کی مقدار چار شمار کرتے ہوئے چار نمازوں کو یکے بعد دیگرے پڑھنے لگیں تو ظاہر ہے کہ پھر تو پانچویں حاضر نماز کے بھی قضا ہو جانے کا خدشہ ہے۔ ہاں اگر حاضر نماز کا وقت تنگ نہ ہو تو پھر دوسری بات ہے، تب چاروں یا تینوں ہی کو پہلے پڑھ لیں۔

جب حاضر نماز کی جماعت کھڑی ہو؟

یہ بھی اس وقت ہے جب کہ حاضر نماز کا وقت کافی ہو اور قضا پڑھنے والے صرف آپس ہی میں ہوں اور اگر قضا والا اکیلا ہے اور حاضر نماز کا وقت بھی بہت کم ہے، بلکہ ابھی ابھی شروع ہی ہوا ہے، لیکن جب وہ مسجد میں پہنچتا ہے تو دیکھتا ہے کہ حاضر یا وقتی نماز کی جماعت کھڑی ہو چکی ہے تو وہ کیا کرے؟ اسی سے ملتا جلتا سوال شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی کیا گیا، جو ان کے مجموعہ فتاویٰ (۲۲/۱۰۶) میں مذکور ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ ایک شخص کی نماز عصر قضا ہوگئی۔ جب وہ مسجد میں پہنچا تو دیکھا کہ مغرب کی جماعت ہو رہی ہے تو کیا وہ قضا نماز مغرب سے پہلے پڑھے یا نہیں؟ حمد و ثناء باری تعالیٰ کے بعد موصوف نے جواب دیا کہ وہ (عصر پہلے نہ پڑھے) بلکہ وہ امام کے ساتھ شامل ہو کر پہلے مغرب کی نماز پڑھے، پھر عصر کی نماز پڑھے، اس پر علما کا اتفاق ہے، لیکن کیا وہ عصر کی نماز کے بعد مغرب کی نماز کو پھر دہرائے گا یا نہیں؟ اس سلسلے میں ہمارے علما کے دو قول ہیں:

1) دہرائے گا۔ یہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما، امام مالک، ابو حنیفہ اور مشہور روایت کے مطابق امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔

(2) وہ نمازِ مغرب کو نہیں دہرائے گا۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما امام شافعی اور ایک قول میں امام احمد رضی اللہ عنہما کا مذہب ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ ان دونوں اقوال کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں، اگر کوئی شخص حسب استطاعت اللہ کا تقویٰ اختیار کرتا ہے تو:

”فَإِنَّ اللَّهَ لَمْ يُوجِبْ عَلَى الْعَبْدِ أَنْ يُصَلِّيَ الصَّلَاةَ مَرَّتَيْنِ“⁽¹⁾

”بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے کسی بندے پر یہ واجب نہیں کیا کہ وہ کسی نماز کو دو مرتبہ پڑھے۔“

اس سے اگلے سوال کے ضمن میں انھوں نے لکھا ہے کہ ترتیب کو واجب قرار دینے والوں کا بھی اس میں اختلاف ہے کہ وقت کی تنگی میں ترتیب ساقط ہو جاتی ہے یا نہیں؟ امام احمد کے مشہور ترین قول میں ہے کہ ایسی ترتیب ساقط ہو جاتی ہے، جیسا کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب کا قول بھی ہے۔ البتہ ان کے ایک غیر معروف قول کی رو سے اسی طرح امام مالک کے نزدیک ایسے وقت میں بھی ترتیب ساقط نہیں ہوتی اور زیادہ مشہور ہی زیادہ صحیح بھی ہے۔ واللہ اعلم⁽²⁾

قضا نماز اور خطبہ جمعہ:

ایک صورت یہ بھی ہے کہ کوئی شخص جمعہ کے دن دوپہر کے وقت مسجد میں اس وقت داخل ہو، جب کہ خطبہ جمعہ شروع تھا اور اسے یاد آیا کہ اس پر تو ابھی ایک نماز قضا بھی ہے تو اس نے دورانِ خطبہ ہی وہ قضا نماز پڑھ لی، جب کہ وہ خطبہ کی آواز بھی نہیں سن پا رہا۔ کیا اس کا فعل صحیح ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا فتویٰ ہے کہ وہ خطبے کی آواز سن پا رہا ہو یا نہ سن پا رہا ہو، اسے چاہیے کہ اگر وہ قضا نماز پڑھ لینے کے بعد بھی جمعہ کو پاسکتا ہے تو پہلے قضا نماز ہی پڑھے، بلکہ جمہور علما کے نزدیک ایسا کرنا ہی اس پر واجب ہے۔

کیوں کہ خطبے کے دوران میں جو نماز پڑھنے کی ممانعت ہے وہ علما کے صحیح تر قول کی رو سے فریضے کو شامل نہیں ہے اور قضا نماز فریضہ ہے، بلکہ وہ ممانعت تو تحیۃ المسجد کو بھی شامل نہیں ہے، کیوں کہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

(1) مجموع الفتاویٰ (۱۰۶/۲۲)

(2) مجموع الفتاویٰ (۱۰۸/۲۲)

«إِذَا دَخَلَ أَحَدُكُمْ الْمَسْجِدَ، وَالْإِمَامُ يَخْطُبُ فَلَا يَجْلِسُ حَتَّىٰ يُصَلِّيَ رَكَعَتَيْنِ»

”جب تم میں سے کوئی شخص مسجد میں داخل ہو اور امام خطبہ دے رہا ہو تو پھر بھی وہ دو رکعت پڑھے بغیر نہ بیٹھے۔“

ایسے ہی قضا نماز کو ممنوع وقت میں پڑھنا صحیح حدیث سے ثابت ہے، کیوں کہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

«مَنْ أَدْرَكَ رَكَعَةً مِّنَ الْفَجْرِ قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ فَقَدْ أَدْرَكَ الْفَجْرَ»^①
 ”جس نے طلوع آفتاب سے پہلے فجر کی ایک رکعت بھی پڑھ لی، تو اس نے فجر کی نماز پالی (جیسا کہ اس کی تفصیل ذکر کی جا چکی ہے)۔“

متعدد قضا نمازوں کے پڑھنے میں ترتیب:

اب آئیے اس سلسلے کے آخری موضوع کو بھی حل کر لیں کہ اگر متعدد نمازیں قضا ہو گئی ہوں تو کیا انھیں پڑھتے وقت ترتیب واجب ہے یا نہیں؟ دراصل یہ مسئلہ بھی اہل علم کے مابین مختلف فیہ ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور بعض دیگر فقہاء نے کہا ہے کہ ان کے مابین بھی ترتیب واجب ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور بعض فقہائے محدثین کے نزدیک قضا نمازوں کو پڑھتے وقت ان کے مابین ترتیب واجب نہیں ہے۔

تاکلمین وجوب کا استدلال تو غزوہ خندق والی احادیث سے ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں ”باب قضاء الصلاة الأولى فالأولى“ میں اسی طرف اشارہ کیا ہے اور اس باب کے تحت غزوہ احزاب سے متعلق حضرت جابر رضی اللہ عنہ والی حدیث وارد کی ہے، جس میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا کفارِ قریش کو برا کہنا اور غروب آفتاب کے بعد نمازِ عصر اور پھر مغرب پڑھنے کا ذکر ہوا ہے۔ اس تبویب سے بظاہر یہی محسوس ہوتا ہے کہ قضا نمازوں کو ترتیب ہی سے پڑھنا چاہیے، لیکن شارح بخاری

① صحیح مسلم مع شرح النووي (۱۰۴/۵/۳) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (۳۹۸) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۵۰۴) الإحسان فی تقریب صحیح ابن حبان، رقم الحدیث (۱۸۲) و مجموع الفتاویٰ (۱۰۷/۲۲)

لکھتے ہیں کہ اس حدیث سے قائلینِ وجوب کا دلیل حاصل کرنا صحیح نہیں، سوائے اس کے کہ جب یہ کہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے افعال امت کی نسبت وجوب کے لیے ہوتے ہیں۔ ہاں اگر ارشادِ نبوی:

«صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي»

”تم اسی طرح نماز پڑھو، جیسے مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔“

کے عموم سے استدلال کریں تو بات میں قوت آجاتی ہے اور خود شافعیہ نے بھی اس مسئلے کے سوا کئی امور میں اس کا اعتبار کیا ہے۔^①

امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ترتیب کا عدم وجوب ہی ظاہر ہے، کیوں کہ نبی اکرم ﷺ کا محض کوئی فعل امت کے حق میں وجوب کے لیے نہیں ہوتا۔ اور «صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي» والی حدیث سے استدلال بھی اعتراض سے خالی نہیں ہے۔

قائلینِ وجوب کے بعض دیگر دلائل کا جائزہ:

ترتیب کے وجوب کو مزید قوی بنانے کے لیے بعض دیگر احادیث سے بھی استدلال کیا جاتا ہے کہ اگر وہ صحیح ہوتیں تو بات بن جاتی، لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں، جو قابلِ استدلال ہو۔ مثلاً معجم کبیر طبرانی اور مسند احمد میں ایک حدیث ہے، جس میں حضرت ابو جعبہ حبیب بن سباع رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ عَامَ الْأَحْزَابِ صَلَّى الْمَغْرِبَ فَلَمَّا فَرَغَ قَالَ: هَلْ عَلِمَ أَحَدٌ مِنْكُمْ إِنِّي صَلَّيْتُ الْعَصْرَ؟ قَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ مَا صَلَّيْتَهَا فَأَمَرَ الْمُؤَذِّنَ فَأَقَامَ الصَّلَاةَ فَصَلَّى الْعَصْرَ، ثُمَّ أَعَادَ الْمَغْرِبَ»

”نبی اکرم ﷺ نے غزوہ احزاب کے موقع پر مغرب کی نماز پڑھی، جب آپ ﷺ نمازِ مغرب سے فارغ ہو گئے تو لوگوں سے پوچھا: کیا تم میں سے کوئی یہ بات جانتا ہے کہ میں نے عصر کی نماز پڑھی تھی یا نہیں؟ صحابہ نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ نے عصر نہیں پڑھی، تب آپ ﷺ نے مؤذن کو حکم فرمایا اور اس نے اقامت کہی تو آپ ﷺ نے عصر کی نماز پڑھی اور پھر مغرب کی نماز دہرائی۔“

① نیل الأوطار (۳۰/۲/۱) الفتح الرباني (۳۱/۲)

اس روایت میں نمازِ مغرب کو دہرانے کے الفاظ سے ترتیب کے وجوب کو کافی تقویت مل سکتی تھی، بشرطیکہ یہ حدیث قابلِ حجت ہو، لیکن ایسا نہیں، اس حدیث کے متن اور سند دونوں پر کلام کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس کے بارے میں ”فتح الباری“ (۲/ ۶۹) میں لکھا ہے کہ اس حدیث کا صحیح ہونا محلِ نظر ہے، کیوں کہ یہ صحیح بخاری و مسلم میں وارد شدہ حدیث کے مخالف ہے اور وہ اس طرح کہ یہاں تو آپ ﷺ کی طرف یہ منسوب کیا جا رہا ہے کہ آپ ﷺ نے مغرب کے بعد لوگوں سے پوچھا کہ میں نے عصر پڑھی ہے یا کہ نہیں اور بخاری و مسلم میں صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے کفارِ قریش کو برا بھلا کہتے ہوئے آنے اور عصر کے غروبِ آفتاب کے قریب پڑنے کا سن کر حلفیہ فرمایا تھا:

«وَاللَّهِ مَا صَلَّيْتُهَا» ”اللہ کی قسم! میں نے بھی عصر کی نماز نہیں پڑھی۔“

گویا نبی اکرم ﷺ ہرگز نہیں بھولے تھے، بلکہ مشرکین سے مقابلہ جاری ہونے کی وجہ سے عصر رہ گئی تھی۔ جب کہ اس روایت سے یہ اثر ملتا ہے کہ آپ ﷺ عصر ہی کو بھول گئے تھے اور آپ ﷺ نے مغرب کی نماز پڑھ لی تھی، پھر مغرب پڑھ چکنے کے بعد شک گزرا کہ میں نے تو شاید عصر نہیں پڑھی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے لوگوں سے پوچھا تو پتا چلا کہ آپ ﷺ نے عصر نہیں پڑھی تھی۔ صحیحین کی حدیث کے خلاف ہونے کی وجہ سے اس روایت کے متن کو غیر صحیح قرار دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی سند کو بھی ضعیف قرار دیا گیا ہے، جس کی دو وجوہات ہیں:

① اس کا ایک راوی ”محمد بن یزید“ جو ”ابن ابی زیاد فلسطینی“ ہے، اسے ابن ابی حاتم نے اپنے والد گرامی کے حوالے سے مجہول قرار دیا ہے اور اس کے بارے میں یہی بات امام دارقطنی رضی اللہ عنہ نے کہی ہے، ان دونوں کی طرح علامہ ذہبی رضی اللہ عنہ نے بھی اسے مجہول کہا ہے۔

② اس روایت کے ضعیف ہونے کی دوسری علت، اس کا ایک دوسرا راوی ابن لہیعہ ہے، جن کے بارے میں کلام معروف ہے کہ وہ خرابیِ حفظ کی وجہ سے ضعیف ہے۔ ”الدرایۃ فی تخریج أحادیث الهدایۃ“ میں حافظ عسقلانی رضی اللہ عنہ نے اسی وجہ سے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے اور ”نصب الرایۃ“ میں علامہ زیلیعی رضی اللہ عنہ حنفی نے اس روایت کو ان دونوں وجوہات کی بنا پر معلول قرار دیا ہے۔ علامہ بیہقی رضی اللہ عنہ نے ”مجمع الزوائد“ میں روایت کو نقل کر کے لکھا ہے

کہ امام احمد رضی اللہ عنہ نے (مسند میں) اور طبرانی نے ”المعجم الكبير“ میں روایت کیا ہے اور اس کی سند میں ابن لہیعہ ہے، جس میں ضعف پایا جاتا ہے۔ دورِ حاضر کے معروف محدث علامہ البانی رضی اللہ عنہ نے بھی اس روایت کو اپنی کتاب ”إرواء الغلیل“ میں ضعیف قرار دیا ہے۔^① اس ساری تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ روایت مفید مطلب نہیں ہے۔

ایسے ہی ایک روایت سنن کبریٰ بیہقی و دارقطنی میں مرفوعاً اور موطا امام مالک رضی اللہ عنہ میں موقوفاً حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

«مَنْ نَسِيَ صَلَاةً فَلَمْ يَذْكُرْهَا إِلَّا وَهُوَ مَعَ الْإِمَامِ فَإِذَا سَلَّمَ الْإِمَامُ فَلْيَصِلْ صَلَاتَهُ الَّتِي نَسِيَ، ثُمَّ لْيُصَلِّ بَعْدَهَا الصَّلَاةَ الْأُخْرَى... وَفِي لَفْظٍ: ثُمَّ لْيُعِدَّ الَّتِي صَلَّى مَعَ الْإِمَامِ»^②

”کوئی شخص اپنی نماز پڑھنا بھول گیا اور اسے وہ اس وقت یاد آئی جب کہ وہ (کسی دوسری نماز کے لیے) امام کے ساتھ جماعت میں کھڑا تھا۔ اسے چاہیے کہ جب امام سلام پھیرے تو وہ اسی نماز کو پڑھ لے، جسے وہ بھول کر نہیں پڑھ سکا تھا اور پھر اس نماز کو دوبارہ پڑھ لے جو اس نے امام کے ساتھ پڑھی تھی۔“

اس روایت کو نقل کرنے کے بعد حافظ عسقلانی رضی اللہ عنہ نے لکھا ہے کہ اس حدیث کو دارقطنی و بیہقی نے مرفوعاً حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور امام دارقطنی نے کہا ہے کہ اس کے ایک راوی ابو ابراہیم ترجمانی کو وہم ہو گیا ہے کہ اس قول کو مرفوعاً بیان کیا ہے (ابو ابراہیم کا وہم واضح ہو گیا) اور یہ موقوف روایت سنن دارقطنی و موطا امام مالک میں موجود ہے۔ امام نسائی نے اس روایت کے بارے میں ”الکنی“ میں کہا ہے کہ اس کا مرفوعاً بیان ہونا غیر محفوظ ہے اور ابو زرہ نے کہا ہے کہ اس کا مرفوعاً بیان ہونا غلط ہے۔^③

ایسے ہی ایک تیسری حدیث بھی ہے، جس میں ہے:

① تفصیل کے لیے دیکھیں: نصب الراية (۶۴/۲) مجمع الزوائد (۳۲۴/۱) إرواء الغلیل (۲۹/۱)

② سنن الدارقطني (ص: ۱۶۲) و سنن البيهقي (۲/۲۲۱) بحواله نصب الراية (۲/۱۶۲)

③ الدراية بحواله تحفة الأحوذی (۱/۵۳۲)

﴿لَا صَلَاةَ لِمَنْ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ﴾^(۱)

”اس کی کوئی نماز نہیں، جس پر کوئی پہلی نماز واجب الاداء ہو۔“

جب کہ علامہ عینی حنفی نے اس روایت کے بارے میں کہا ہے کہ ابوبکر کے بقول یہ روایت باطل ہے اور بعض نے اس کی تاویل یہ کی ہے کہ جس پر کوئی فرض نماز باقی ہو، اس کی کوئی نفل نماز نہیں ہوتی۔ علامہ ابن الجوزی نے کہا ہے کہ اس روایت کو ہم لوگوں کی زبان سے سنتے تو ہیں، لیکن مجھے اس کی کوئی اصل معلوم نہیں ہو سکی۔ یعنی یہ روایت بے اصل اور من گھڑت ہے۔^(۲)

اس سے معلوم ہوا کہ یہ روایت نہ صرف ناقابل استدلال ہے، بلکہ بے اصل اور جعلی ہے۔

خلاصہ کلام:

قضا نمازوں اور ان میں ترتیب سے متعلق گفتگو کا لب لباب اور خلاصہ یہ ہے کہ عذر و مجبوری کی وجہ سے جو نمازیں قضا ہو جائیں، ان کو باقاعدہ اذان و اقامت اور جماعت کے ساتھ ادا کیا جائے اور ایک سے زیادہ قضا ہونے کی صورت میں انہیں ترتیب ہی سے پڑھنا بہتر ہے۔ حتیٰ کہ بعض اہل علم نے اسے واجب کہا ہے۔ بعض دیگر نے عدم وجوب کی رائے اختیار کی ہے اور اکثر محققین نے اسے ظاہر قرار دیا ہے۔ اگر کوئی مسجد میں پہنچے اور وہاں جماعت کھڑی ہو تو اسے چاہیے کہ پہلے وہ جماعت سے مل کر وہ حاضر نماز پڑھ لے اور بعد میں قضا نمازوں کو ترتیب وار پڑھ لے اور اس ادا شدہ نماز کو دہرانے کی بھی ضرورت نہیں، کیوں کہ دہرانے پر دلالت کرنے والی روایات ناقابل حجت ہیں۔

وتر اور سنتوں کی قضا:

قضا نمازوں کے سلسلے میں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ کسی نماز کے قضا ہو جانے کی صورت میں کیا اس نماز کے صرف فرض ہی پڑھے جائیں گے یا اس کی سننِ راتبہ یا موکدہ سنتیں بھی پڑھنی چاہئیں؟ تو اس سلسلے میں ”فتح الباری“ (۶۸۰/۲) میں حافظ ابن حجرؒ نے اور شیخ احمد عبدالرحمن بن البناء نے ”الفتح الربانی“ (۳۱۲/۲) میں فجر کی نماز قضا ہو جانے والے واقعہ پر مشتمل حدیث کی شرح کے ضمن میں لکھا ہے کہ اس حدیث میں اس بات کی دلیل موجود ہے کہ قضا نماز کی موکدہ سنتیں بھی

[۱] مصدر سابق.

[۲] ویکس: تحفة الأحوذی (۱/۵۳۲)

پڑھنی چاہیں، کیوں کہ صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتب والی اس صحیح حدیث کی رو سے سورج طلوع ہونے کے بعد فجر پڑھنے کی صورت میں بھی نبی اکرم ﷺ نے سنتیں پڑھی تھیں۔ اس سلسلے میں امام محمد بن قدامہ نے ”المغنی“ میں سنتوں کے بیان کے ضمن میں بڑی عمدہ بحث کی ہے، وہ فرماتے ہیں:

”وہ سنتیں جو فرضوں سے پہلے پڑھی جاتی ہیں (جیسے فجر و ظہر کی پہلی سنتیں ہیں) ان کا وقت نماز کے وقت کا آغاز ہونے سے لے کر نماز پڑھ چکنے کے درمیان ہے اور وہ سنتیں جو فرضوں کے بعد پڑھی جاتی ہیں (جیسے ظہر و مغرب اور عشا کی سنتیں ہیں) ان کا وقت نماز پڑھ چکنے سے لے کر اس نماز کا وقت گزر جانے تک ہے۔ اگر کوئی سنتیں اپنے ان اوقات سے رہ جائیں (قضا ہو جائیں) تو امام احمد رحمہ اللہ کا کہنا ہے:

”فجر کی دو سنتوں کو قضا کرنے اور عصر کے بعد (ظہر کی آخری دو رکعتوں کو) قضا کرنے کے سوا کسی دوسری سنتوں کو قضا کرنا ہمیں نبی اکرم ﷺ سے معلوم نہیں ہو سکا (یعنی امام احمد کے نزدیک فجر کی پہلی دو سنتوں اور ظہر کی آخری دو سنتوں کی قضا کرنا ثابت ہے)۔“

ابن حامد رحمہ اللہ کہتے ہیں:

”تمام موکدہ سنتوں کو اوقات مکروہہ کے سوا تمام اوقات میں قضا کیا جائے گا، کیوں کہ نبی اکرم ﷺ نے بعض نمازوں کی موکدہ سنتوں کو قضا کیا ہے اور باقی نمازوں کی موکدہ سنتوں کو ہم انہی پر قیاس کرتے ہیں۔“

آگے امام ابن قدامہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

”ہمارے بعض اصحاب کا کہنا ہے کہ ضحیٰ یا چاشت کے وقت تک فجر کی دو سنتوں کو اور ظہر کی (آخری) دو سنتوں کے سوا کوئی سنتیں قضا نہیں کی جائیں گی۔“

امام احمد رحمہ اللہ نے کہا ہے:

”فجر کے بعد میں وتروں کی قضا کو جانتا ہوں اور فجر کی سنتیں ضحیٰ کے وقت تک قضا کی جاسکتی ہیں۔“

امام مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے:

”فجر کی سنتوں کو دوپہر یعنی وقتِ زوال تک قضا کیا جاسکتا ہے، پھر اس کے بعد نہیں۔“

امام ابراہیم نخعی، سعید بن جبیر اور حسن بصری رضی اللہ عنہم کا کہنا ہے:

”جب سورج طلوع ہو جائے تو پھر کوئی وتر نہیں۔“

بعض دیگر اہل علم کا کہنا ہے:

”جس نے فجر کی نماز پڑھ لی، اب اس پر کوئی وتر نہیں ہے۔ جب کہ پہلا قول ہی زیادہ

صحیح ہے، جس کی وجہ ہم نے ذکر کر دی ہے۔“

امام احمد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ آدمی کے لیے کچھ ایسے نوافل ہوں، جس کی وہ پابندی

کرتا ہو، جو اگر کبھی فوت ہو جائیں تو انھیں قضا کر لے۔“^(۱)

آگے چل کر امام ابن قدامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ امام احمد رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:

”وتر فرض کے درجے کی نماز تو نہیں، لہذا اگر کوئی شخص صرف فرض نماز ہی پڑھ لے تو

جائز ہے اور وتر و سنن فجر سنتِ موکدہ ہیں، اگر کوئی چاہے تو وتر کی قضا کر لے اور نہ چاہے

تو نہ کرے اور پھر فجر کی سنتوں اور وتر میں موازنہ کرتے ہوئے زیادہ بہتر اس بات کو قرار

دیا گیا ہے کہ وتر فجر کی سنتوں سے زیادہ تاکید والے ہیں۔“^(۲)

سنتوں کی قضا ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رضی اللہ عنہ سے بھی ایک سوال کیا

گیا تھا کہ ایک آدمی کی ایک سے زیادہ نمازیں قضا ہوگئی ہیں تو کیا اب وہ موکدہ سنتوں سمیت انھیں

پڑھے یا ان کی صرف فرض رکعتیں پڑھے گا اور کیا شب و روز کے تمام اوقات میں قضا نمازوں کو پڑھ

سکتا ہے؟ اس پر موصوف نے جواب دیا تھا:

”قضا نمازیں زیادہ ہوں تو سنتوں یا نوافل میں مشغول ہونے سے بہتر یہ ہے کہ جلد از

جلد قضا نمازوں کے فرائض پڑھ لے اور اگر قضا نمازیں قلیل ہوں تو انھیں سنتوں سمیت

پڑھنا اچھا ہے، کیوں کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم غزوہ حنین

(۱) المغنی لابن قدامة بتحقیق ڈاکٹر ترکی (۲/ ۵۴۴)

(۲) المغنی لابن قدامة بتحقیق ڈاکٹر ترکی (۲/ ۵۹۵)

کے موقع پر (راستے میں) نمازِ فجر سے سوئے رہ گئے تھے تو انھوں نے سنتیں اور فرض سبھی قضا کیے تھے اور غزوہٴ خندق کے موقع پر جب نبی اکرم ﷺ کی متعدد نمازیں رہ گئیں تو آپ ﷺ نے انھیں سنتوں کے بغیر صرف فرض قضا کیے تھے۔“

دوسرے حصے کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ قضا شدہ فرض نمازیں تمام اوقات میں (بلا تفریق اوقاتِ مکروہہ وغیر مکروہہ) پڑھی جاسکتی ہیں، کیوں کہ صحیح حدیث میں نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

«مَنْ أَدْرَكَ رَكْعَةً مِنَ الْفَجْرِ قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ فَلْيَصِلْ إِلَيْهَا أُخْرَى»^①
 ”جس نے طلوعِ آفتاب سے پہلے فجر کی ایک رکعت پالی تو اسے چاہیے کہ اس کے ساتھ ہی دوسری رکعت بھی ملا لے۔“

اس حدیث کے ان الفاظ میں اگرچہ صرف نمازِ فجر کا ذکر ہے، لیکن موصوف کا استدلال اس طرح ہے کہ اوقاتِ مکروہہ میں (جو طلوعِ آفتاب کا وقت ہے) اس میں فجر کی نماز قضا کی جاسکتی ہے تو دوسرے اوقاتِ مکروہہ میں کوئی بھی فرض نماز قضا کی جاسکتی ہے، جیسا کہ اوقاتِ مکروہہ سے استثنائی صورتیں ذکر کی جا چکی ہیں۔

الغرض موصوف کا یہ فتویٰ انتہائی معتدل ہے کہ اگر قضا نمازیں زیادہ ہوں تو صرف فرض پڑھ لیں اور اگر قضا نماز صرف ایک آدھی ہو تو موکدہ سنتیں بھی پڑھ لیں۔
 یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ صحیح مسلم، سنن کبریٰ بیہقی اور مسند احمد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک حدیث ہے:

«إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَانَ إِذَا غَلَبَتْهُ عَيْنُهُ أَوْ وَجَعُ فَلَمْ يُصَلِّ بِاللَّيْلِ صَلَّى بِالنَّهَارِ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ رَكْعَةً»^②
 ”نبی اکرم ﷺ جب غلبہ نیند یا کسی تکلیف کی وجہ سے رات کو (تہجد کی) نماز نہ پڑھ پاتے تو دن چڑھنے پر بارہ رکعتیں پڑھ لیتے تھے۔“

① مجموع الفتاویٰ (۲۲/۱۰۴) الإحسان فی تقریب صحیح ابن حبان، رقم الحدیث (۵۸۱)

② صحیح مسلم مع شرح النووی (۳/۶/۲۸) الفتح الربانی (۲/۳۱۲)

ایسے ہی سنن ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، مسند احمد اور مستدرک میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً

مروی ہے:

«مَنْ نَامَ عَنِ الْوُتْرِ أَوْ نَسِيَهُ فَلْيُوتِرْ إِذَا ذَكَرَهُ أَوْ اسْتَيْقَظَ»^①

”جو شخص وتر سے سویا رہ جائے یا بھول جائے تو اسے چاہیے کہ بیدار ہونے پر یا یاد آنے

پر پڑھ لے۔“

اسی طرح مسند احمد اور طبرانی اوسط میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يُصْبِحُ فَيُوتِرُ»^②

”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صبح ہونے پر وتر پڑھ لیتے تھے۔“

سنن بیہقی اور مستدرک حاکم (صحیح) میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«رُبَّمَا رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يُوتِرُ وَقَدْ قَامَ النَّاسُ لِصَلَاةِ الصُّبْحِ»^③

”بعض دفعہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت بھی وتر پڑھتے دیکھا، جب لوگ نماز فجر

پڑھنے کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے۔“

فجر و ظہر کی سنتوں کی قضا سے متعلقہ احادیث سے احکام اخذ کرتے ہوئے شیخ عبدالرحمن البنا

لکھتے ہیں:

”ان احادیث میں موکدہ سنتوں، وتر اور تہجد وغیرہ کی قضا کی مشروعیت کا ثبوت ہے۔

ائمہ اربعہ سمیت بعض دیگر ائمہ اور صحابہ و تابعین کی ایک جماعت کا اس بات پر اتفاق ہے

کہ وتر قضا ہو جائیں تو ان کی قضا ہے، لیکن اس بات میں اختلاف ہے کہ کب تک قضا

ممکن ہے؟“

اس سلسلے میں تین اقوال ہیں:

① صحیح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٢٦٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١١٨٨) سنن الترمذي مع

التحفة (٥٦٨ / ٢) الإرواء (١٥٣ / ٢) و مشكاة (١ / ٣٩٧ - ٣٩٩) و حاله، صحيح الجامع، رقم الحديث

(٦٥٦٢)

② شرح الفتح الرباني (٣١٢ / ٢)

③ حواله سابقه. و الإرواء (١٥٥ / ٢)

❶ فجر پڑھنے سے پہلے پہلے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، امام عطاء، مسروق، حسن بصری، نخعی، مکحول، قتادہ، مالک، شافعی، احمد، اسحاق، ابویوب اور ابوحنیفہ رضی اللہ عنہم کا مسلک ہے، جیسا کہ قیام اللیل للمروزی میں منقول ہے۔

❷ دن یا رات کو جب بھی موقع ملے، قضا کر لے۔ شافعیہ کا فتویٰ اسی پر ہے۔

❸ سونے یا بھولنے کی شکل اور جان بوجھ کر چھوڑنے کی شکل میں تفریق۔

امام ابن حزم رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ سونے یا بھولنے کی شکل میں دن یا رات کے کسی وقت میں جاگے یا یاد آئے تو پڑھ لے اور جان بوجھ کر چھوڑنے کی صورت میں جب اس پر فجر طلوع ہو جائے تو وہ اسے قضا کر ہی نہیں سکتا۔

وتر کے علاوہ دیگر نوافلِ راتہ یعنی سنن مؤکدہ کی قضا کے بارے میں بھی اہل علم کے کئی اقوال ہیں:

❶ عذر سے قضا ہوں یا بلا عذر، مطلقاً ان کی قضا مستحب ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما، عطاء، طاؤس، قاسم بن محمد، ابن جریج، اوزاعی، قول جدید میں امام شافعی، احمد، اسحاق، محمد بن حسن (تلمیذ امام ابوحنیفہ) اور مزنی رضی اللہ عنہم کا یہی مسلک ہے۔

❷ ان کی قضا نہیں ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ، مالک، مشہور روایت کے مطابق ابو یوسف، قدیم کے مطابق امام شافعی اور ایک روایت کی رو سے امام احمد رضی اللہ عنہم کا بھی مسلک ہے۔ امام مالک کا مشہور مسلک یہ ہے کہ فجر کی سنتوں کو طلوع آفتاب کے بعد قضا کیا جائے۔

❸ مستقل بالذات اور تابع لغیر میں تفریق۔ یعنی نمازِ عید و نمازِ ضحیٰ وغیرہ کی قضا ہے اور فرض نمازوں کی سنن مؤکدہ کی قضا نہیں ہے۔ یہ امام شافعی رضی اللہ عنہم کا ایک قول ہے۔

❹ اختیار ہے، چاہے تو قضا کر لے اور چاہے تو نہ کرے۔ یہ احناف اور امام مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

❺ نیند و بھول کے عذر اور بلا عذر قضا میں تفریق، عذر پر قضا ہے۔ بلا عذر یعنی عمداً پر قضا نہیں ہے۔ یہ علامہ ابن حزم رضی اللہ عنہ کا مذہب ہے اور جمہور کا کہنا ہے کہ جب عذر پر قضا ہے تو عمداً بلا عذر پر بالاولیٰ قضا ہے۔^❶ واللہ اعلم

❶ شرح الفتح الربانی (۲/۳۱۳، ۳۱۴) موطأ الإمام مالك (۱/۱۴۷) نیل الأوطار (۲/۳/۴۷-۴۸) تحفة الأحوذی (۲/۷۶۸-۵۷) بذل المجہود (۴/۳۳۷) طبع ثالث بیروت.

الغرض فجر اور ظہر کی دو سنتوں کی اہمیت ذکر کی جا چکی ہے اور نبی اکرم ﷺ کا انہیں قضا کرنا بھی ثابت ہے۔ وتروں کو فجر کی سنتوں سے بھی زیادہ موکد شمار کیا گیا ہے، لہذا کم از کم مذکورہ رکعتوں کو تو قضا کر لینا ہی زیادہ بہتر ہے۔

عشا سے پہلے سونا اور بعض استثنائی صورتیں:

اب نماز پنج گانہ کے اوقات کا موضوع ختم کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نماز عشا سے پہلے سونے اور نماز عشا کے بعد فضول باتیں کرنے کے بارے میں شرعی نقطہ نظر کی بھی تھوڑی سی وضاحت کر دی جائے، اس سلسلے میں صحیحین اور سنن اربعہ کے حوالے سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث گزر چکی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَسْتَحِبُّ أَنْ يُؤَخِّرَ الْعِشَاءَ الَّتِي يَدْعُوْنَهُ الْعَتَمَةَ، وَكَانَ يَكْرَهُ النَّوْمَ قَبْلَهَا وَالْحَدِيثَ بَعْدَهَا»^(۱)

”نبی اکرم ﷺ نماز عشا جس کو لوگ ”عتمة“ بھی کہتے تھے، اسے موخر کرنے کو مستحب سمجھتے اور اس سے پہلے سونے اور اس کے بعد باتیں کرنے کو مکروہ جانتے تھے۔“

امام ترمذی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اکثر اہل علم نماز عشا سے پہلے سونے کو مکروہ شمار کرتے ہیں اور بعض نے اس کی رخصت دی ہے خصوصاً ماہ رمضان میں۔ حافظ ابن حجر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جن سے رخصت منقول ہے، ان سے بھی اس شرط کے ساتھ رخصت منقول ہے کہ سونے والے کے پاس ایسا شخص موجود ہو، جو اُسے نماز کے لیے جگا دے یا وہ خود سے اٹھ جاتا ہو اور یہ شرط مناسب بھی ہے، کیوں کہ نماز عشا سے پہلے سونے کی ممانعت کا سبب اس کا وقت نکلنے کا خدشہ ہے۔ امام طحاوی نے رخصت کو عشا کا وقت ہونے سے پہلے پہلے پر اور ممانعت کو عشا کا وقت ہو جانے کے بعد پر محمول کیا ہے۔^(۲)

تاکلمین کراہت کا استدلال تو اسی مذکورہ حدیث اور ایسی ہی بعض دیگر احادیث سے ہے، جب

(۱) صحیح البخاری مع الفتح (۲/ ۴۹، ۷۳) صحیح مسلم (۳/ ۵/ ۴۵- ۱۴۶) نصب الرایة (۱/ ۲۴۸) المنتقی

مع النیل (۱/ ۱۳/ ۲) الفتح الربانی (۲/ ۲۷۲) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (۳۸۵) صحیح سنن

الترمذی، رقم الحدیث (۱۴۲) صحیح سنن النسائی (۵۱۶) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۷۰)

(۲) الفتح الربانی (۲/ ۴۹) نیل الأوطار (۱/ ۱۳)

کہ قائلین جواز کا استدلال صحیح بخاری کی اس حدیث سے ہے، جس میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک رات نمازِ عشا کو بہت موخر کر دیا تو اس وقت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کو آواز دیتے ہوئے فرمایا:

«الصَّلَاةُ! نَامَ النِّسَاءُ وَالصَّبِيَانُ»^①

”نماز کے لیے تشریف لائیں کہ اب تو عورتیں اور بچے سو گئے ہیں۔“

امام بخاری رضی اللہ عنہ نے اس حدیث پر یوں باب باندھا ہے:

”بَابُ النَّوْمِ قَبْلَ الْعِشَاءِ لِمَنْ غَلِبَ“

”عشا سے پہلے غلبہ نیند کی وجہ سے سونے کے جواز کا بیان۔“

گویا ان کے نزدیک عشا سے پہلے سونا تب مکروہ ہے، جب آدمی کی اپنی مرضی و احتیاط سے ہو، ورنہ نہیں، کیوں کہ عورتوں اور بچوں کے سوجانے کا سن کر بھی آپ ﷺ نے ان پر نکیر نہیں کی تھی۔

شارح بخاری فرماتے ہیں:

”اگر ایسی حالت میں نماز کے انتظار کے لیے بیٹھے بیٹھے سونے اور اپنے گھر میں غلبہ نیند

کی وجہ سے سونے میں فرق کیا جائے تو یہ زیادہ اولیٰ ہے۔“

امام شوکانی رضی اللہ عنہ نے ابن سید الناس سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

”نماز کے انتظار میں بیٹھے بیٹھے سونا تو کوئی ممنوع نہیں ہے اور نہ اس کا نیند سے کوئی تعلق

ہے، بلکہ وہ نیند کی ابتدائی حالت اونگھ ہے۔ یعنی اس حالت میں اونگھنے کی ممانعت کیسے

ہو سکتی ہے اور اس سے نیند کے جواز کا استدلال کیسے کیا جاسکتا ہے؟“^②

مختصر یہ کہ امام ترمذی رضی اللہ عنہ کے بقول اکثر اہل علم کے نزدیک عشا سے پہلے سونا مکروہ ہے اور ابن سید الناس کہتے ہیں کہ صحابہ کی ایک جماعت نے اسے مکروہ قرار دیا ہے اور شدت سے ممانعت بیان کی ہے۔ جب کہ ان میں سے حضرت عمر، ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم بھی ہیں۔ امام مالک رضی اللہ عنہ کا اختیار بھی کراہت ہی ہے اور امام عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں کہ اکثر احادیث کراہت ہی پر دلالت کرتی ہیں۔

① صحیح البخاری مع الفتح، رقم الحدیث (۵۶۹)

② نیل الأوطار (۱۴/۲/۱)

حضرت علی اور ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما اور فقہائے کوفہ جواز کے قائل تھے اور بعض نے اس میں جگانے والے کی موجودگی شرط عائد کی ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ مروی ہے اور امام طحاوی رحمہ اللہ سے بھی۔ امام ابن العربی رحمہ اللہ نے کہا ہے:

”کوئی جگانے والا موجود ہو یا خود سے جاگ جانے کی عادت ہو تو پھر سونا جائز ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے اقوال کی تفصیل آپ کے سامنے ہے۔ اکثریت کا مسلک کراہت کا ہے اور زیادہ احتیاط پر بھی یہی مبنی ہے۔“^(۱)

اب آئیے اس حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے آخری حصے میں مذکور مسئلے کی طرف۔

عشا کے بعد باتیں کرنے کی کراہت اور استثنائی صورتیں:

نماز عشا کے بعد باتیں کرنے کے بارے میں بھی اہل علم کے دو گروہ ہیں۔ بعض علما کا کہنا ہے کہ نماز عشا کے بعد باتیں کرنا مکروہ ہے اور ان کا استدلال ایک تو اسی حدیث سے ہے، جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اسی بات کی دلیل وہ حدیث بھی ہے، جس کی طرف امام ترمذی رحمہ اللہ نے اشارہ کیا ہے، جو سنن ابن ماجہ اور مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

«جَدَبَ لَنَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ السَّمَرَ بَعْدَ الْعِشَاءِ»^(۲)

”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نماز عشا کے بعد باتیں کرنے سے منع فرمایا۔“

اسی مفہوم کی دیگر احادیث کے پیش نظر نماز عشا کے بعد باتیں کرنے کو مکروہ قرار دیا گیا ہے، جب کہ بعض علما نے بھلائی کی باتوں کو جائز قرار دیا ہے اور اس کے دلائل بھی موجود ہیں، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ والی حدیث کی شرح بیان کرتے ہوئے امام نووی رحمہ اللہ نے ”المنہاج شرح صحیح مسلم بن الحجاج“ میں لکھا ہے:

”نماز عشا کے بعد باتیں کرنے کی کراہت کا سبب یہ ہے کہ وہ رات کو طویل وقت تک جگائے رکھیں گی، جس کے نتیجے میں وہ شخص تہجد یا ذکر و تلاوت سے رہ جائے گا، یا نماز فجر

[۱] شرح صحیح مسلم للنووی (۳/ ۱۴۲- ۱۴۷) نیل الأوطار (۲/ ۱۳- ۱۴)

[۲] المنتقی (۱/ ۱۴) الفتح الربانی (۲/ ۲۷۱) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۷۰۳)

کو اس کے جائز و مختار یا افضل وقت میں ادا نہیں کر سکے گا اور رات کو باتوں میں جاگنا اسے دن کے وقت سست کر دے گا، جس سے وہ حقوقِ دین، امورِ اطاعت اور دنیوی مصلحتوں سے بھی محروم ہو سکتا ہے۔“

پھر امام نووی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

”نمازِ عشا کے بعد باتیں کرنے کے مکروہ ہونے پر علمائے امت کا اتفاق ہے، سوائے ان باتوں کے جو خیر پر مبنی ہوں۔ مثلاً حصولِ علم کی غرض ہو، مہمان آجائے، ذہن کا دل بہلانا ہو، شفقت و محبت میں اپنے بچوں اور اہلیہ سے کچھ باتیں ہوں، اصلاح بین الناس اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی باتیں ہوں تو ان میں کوئی کراہت نہیں ہے اور ان میں سے بعض امور کے بارے میں صحیح احادیث میں اجازت وارد ہوئی ہے۔“^(۱)

جن احادیث و دلائل کی بنا پر نمازِ عشا کے بعد باتوں کو جائز قرار دیا گیا ہے، خصوصاً جب کہ وہ باتیں بھلائی اور دین و آخرت کی ہوں، علم سے تعلق رکھتی ہیں یا پھر وہ باتیں ہوں جو حوائجِ ضروریہ میں شمار ہوتی ہیں، مثلاً اہلیہ، بچوں اور مہمان سے گفتگو، ان امور کے جواز پر اس حدیث سے استدلال کیا جاتا ہے جو سنن ترمذی، نسائی اور مسند احمد میں ہے، جس میں امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَسْمُرُ هُوَ وَ أَبُو بَكْرٍ فِي الْأَمْرِ مِنَ الْأُمُورِ الْمُسْلِمِينَ وَأَنَا مَعَهُمَا»^(۲)

”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ مسلمانوں کی فلاح کے امر میں سے کسی امر میں (نمازِ عشا کے بعد) باتیں کرتے تھے اور (میں بھی) ان کے ساتھ ہوتا تھا۔“

جواز کی دوسری دلیل صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں ام المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر مہمان بن کر گیا اور یہ اس رات تھا جب کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

(۱) شرح صحیح مسلم للنووي (۲/۳-۱۴۶-۱۴۷)

(۲) الفتح الرباني (۲/۲۷۲) فتح الباري (۲/۷۴) و (۱/۲۱۳) المنتقى (۲/۱۴) صحیح سنن الترمذی، رقم

الحدیث (۱۴۳)

ان کے گھر میں تھے، تاکہ میں دیکھوں کہ نبی اکرم ﷺ رات کو نماز تہجد کیسے پڑھتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

«فَتَحَدَّثَ النَّبِيُّ ﷺ مَعَ أَهْلِهِ سَاعَةً ثُمَّ رَقَدَ...»^(۱)

”نبی اکرم ﷺ نے اپنی زوجہ محترمہ سے باتیں کیں اور پھر سو گئے۔“

اس حدیث سے یوں استدلال کیا جاتا ہے کہ آپ ﷺ نماز عشا کے بعد گھر تشریف لے گئے تھے اور گھڑی بھر کے لیے گھر والوں سے باتیں کی تھیں۔

صاحب ”نیل الأوطار“ تو لکھتے ہیں:

”اس حدیث کو انھوں نے اپنے لیے دلیل بنایا ہے، جو نماز عشا کے بعد مطلقاً باتوں کے

جواز کے قائل ہیں، وہ خیر و طاعت کی ہوں یا عام باتیں ہوں۔ ممکن ہے کہ یہ واقعہ جواز

کے لیے ہی ہو۔ تاکہ ممانعت والی احادیث کو نہی تحریمی پر محمول نہ کیا جائے۔“^(۲)

یہاں یہ بات بھی واضح کر دیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے

بھانجے تھے اور بھانجے کا خالہ کے گھر میں اس طرح رات رہنا بلاشبہ ممکن ہے، کیوں کہ خالہ محرمات

میں سے ہوتی ہے اور وہ تو ان کی صرف خالہ ہی نہیں، بلکہ اُمّ المومنین بھی تھیں۔ امام بخاری رضی اللہ عنہ نے

اپنی صحیح کے کتاب العلم کے باب (۴۰ اور ۴۱) میں اسی طرح ”کتاب مواقیت الصلاة“ کے باب

(۴۰ اور ۴۱) میں خیر و بر اور تعلیم و تعلم کے لیے باتیں کرنے کے جواز پر دلالت کرنے والی احادیث

ذکر کی ہیں۔ جب کہ ”کتاب مواقیت الصلاة“ کے باب (۳۹) میں حضرت ابو ہریرہ سلمی رضی اللہ عنہ

والی حدیث نقل کی ہے اور اس طرح باب باندھا ہے:

”بَابُ مَا يُكْرَهُ مِنَ السَّمْرِ بَعْدَ الْعِشَاءِ“

اس طرح امام بخاری رضی اللہ عنہ نے واضح کر دیا کہ عام مباح باتوں میں راتوں کو جاگتے رہنا تو مکروہ

ہے، البتہ خیر و بر کی باتوں کے لیے یہ جائز ہے۔ چنانچہ کتاب العلم کے چالیسویں باب میں اُمّ المومنین

حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک حدیث لائے ہیں، جس میں وہ فرماتی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ

{۱} المنتقى مع النيل (۱/۲/۱۵) في فتح الباري (۱/۱۳۳) صحيح البخاري (۱/۲۱۲) صحيح مسلم مع شرح

النووي (۳/۶/۵۰، ۵۱)

{۲} نيل الأوطار (۲/۱۵)

ایک رات نیند سے بیدار ہوئے تو فرمایا:

«سُبْحَانَ اللَّهِ مَا ذَا أَنْزَلَ اللَّيْلَةَ مِنَ الْفِتَنِ، وَمَا ذَا فَتَحَ مِنَ الْخَزَائِنِ،
أَيَقْظُوا صَوَاحِبَ الْحُجَرِ فَرُبَّ كَاسِيَةٍ فِي الدُّنْيَا عَارِيَةٍ فِي الْآخِرَةِ»⁽¹⁾

”اللہ پاک ہے، آج رات کتنے ہی فتنے نازل ہوئے ہیں اور کتنے ہی خزان کھلے ہیں!
پھر فرمایا: ان حجروں میں موجود تمام امہات المؤمنین کو جگا دو، کتنی ہی عورتیں دنیا میں تو
لباس پہنے ہوئے ہیں، مگر آخرت میں عریاں ہوں گی۔“

اس حدیث کو ”باب العلم والعظة باللیل“ میں لاکر امام بخاری رحمہ اللہ نے اس بات پر تنبیہ
کرنا چاہی ہے کہ نمازِ عشا کے بعد جن باتوں کی ممانعت ہے، وہ ایسی باتیں ہیں، جن میں کوئی خیر نہ ہو۔⁽²⁾
بخاری شریف کے کتاب العلم کے اکتالیسویں باب ”باب السمر فی العلم“ میں حضرت
عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی وہ مشہور حدیث لائے ہیں، جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
نے اپنی حیات مبارکہ کے آخری ایام میں ایک رات ہمیں عشا کی نماز پڑھائی، سلام پھیرنے کے بعد
آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو گئے اور (خطبہ دیتے ہوئے) فرمایا:

«رَأَيْتُكُمْ لَيْلَتِكُمْ هَذِهِ فَإِنَّ رَأْسَ مِائَةِ سَنَةٍ مِنْهَا لَا يَبْقَى مِمَّنْ هُوَ عَلَى ظَهْرِ
الْأَرْضِ أَحَدٌ»⁽³⁾

”یہ آج کی رات تم نے دیکھی ہے؟ آج سے ایک سو سال تک کوئی ذی روح، جو اس
وقت روے زمین پر ہے، نہیں رہے گا۔“

اس روایت ابن عمر رضی اللہ عنہما میں تو اس ارشاد کی تاریخ مطلق آخری ایام ہے، جب کہ یہی واقعہ
حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے بھی بیان فرمایا ہے۔ اس میں انھوں نے بیان کیا ہے کہ یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے
وفات سے ایک ماہ پہلے بیان فرمائی تھی۔⁽⁴⁾

نمازِ عشا کے بعد ایسی علمی گفتگو کا ذکر بکثرت احادیث میں آیا ہے، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ

(1) صحیح البخاری مع الفتح (۱/۲۱۰)

(2) فتح الباری أيضاً (۱/۲۱۰)

(3) صحیح البخاری (۱/۲۰۲، ۲۱۱/۷۴)

(4) فتح الباری أيضاً.

وعظ و نصیحت اور درس و تدریس ہو تو یہ بلا کراہت جائز اور ثابت ہے۔ چنانچہ وعظ و درس کے جواز پر دلالت کرنے والی ایک حدیث امام بخاری رحمہ اللہ اپنی کتاب کے مواقیح الصلاة کے ”باب السمر فی الفقہ والخیر بعد العشاء“ میں لائے ہیں، جس میں حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے دیکھا کہ ایک دفعہ آدھی رات سے زیادہ گزر گئی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور ہمیں نماز پڑھائی، پھر خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

«أَلَا إِنَّ النَّاسَ قَدْ صَلَّوْا ثُمَّ رَقَدُوا وَإِنَّكُمْ لَمْ تَزَالُوا فِي صَلَاةٍ مَا أَنْتَظَرْتُمْ
الصَّلَاةَ»^(۱)

”لوگوں نے نماز پڑھ لی ہے اور وہ سو بھی چکے ہیں اور تم اس وقت تک نماز ہی میں ہو، جب تک کہ اس کے انتظار میں ہو۔“

اس حدیث سے اور خصوصاً اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ ارشاد فرمانے سے امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ بات اخذ کی ہے کہ اگر علم و فقہ اور خیر و برکی بات ہو تو وہ نماز عشا کے بعد بھی جائز ہے، اس مفہوم پر دلالت کرنے والی متعدد احادیث ہیں۔^(۲)

جبکہ مہمان اور اہل خانہ سے گفتگو کے جواز کے بارے میں بھی امام بخاری رحمہ اللہ نے مستقل ایک باب قائم کیا ہے: ”بَابُ السَّمْرِ مَعَ الضَّيْفِ وَالْأَهْلِ“ اور اس باب کے تحت وہ حدیث لائے ہیں، جس میں حضرت عبدالرحمن بن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ اصحاب صفہ فقرا لوگ تھے (یعنی ان کے پاس کھانے پینے کی اشیا کی قلت تھی، لہذا اپنے دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے مخاطب ہو کر) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ كَانَ عِنْدَهُ طَعَامٌ أَثْنَيْنِ فَلْيَدِّهْهُ بِثَالِثٍ، وَإِنْ أَرْبَعٍ فَخَامِسٌ أَوْ سَادِسٌ»

”جس کے پاس دو آدمیوں کا کھانا ہو، وہ اپنے ساتھ ایک تیسرے کو بھی لے جائے، جس کے پاس چار اشخاص کا کھانا ہو، وہ پانچواں یا چھٹے کو بھی لے جائے۔“

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے ساتھ تین آدمیوں کو لائے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھ دس

(۱) صحیح البخاری مع الفتح (۲/ ۷۳)

(۲) ویکس: فتح الباری (۱/ ۲۱۳)

افراد کو لے گئے۔ ہمارے گھر میں ایک خود میں، میرے والد اور والدہ یا انھوں نے بیوی کہا۔ میرے اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کے گھر میں کام کرنے والا خادم بھی تھا۔ اس طرح حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانا کھا لیا اور نمازِ عشا تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں ہی رہے۔ نمازِ عشا کے بعد وہ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر ہی پہلے گئے۔

پھر رات کا ایک حصہ گزرنے کے بعد وہ اپنے گھر آئے تو ان کی اہلیہ نے پوچھا کہ آپ کو مہمانوں کی مہمان نوازی کرنے سے کس نے روک لیا تھا؟ انھوں نے پوچھا:

”کیا تم لوگوں نے ابھی تک مہمانوں کو کھانا نہیں کھلایا؟ ان کی اہلیہ نے بتایا کہ انھوں نے آپ کے شامل ہوئے بغیر کھانا کھانے سے انکار کر دیا تھا، ہم نے تو کھانا پیش کیا تھا، مگر وہ نہ مانے۔“

یہ حدیث طویل ہے، جس میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے انھیں کھانا کھلایا۔ وہ کھاتے جاتے، مگر کھانا کم ہونے کے بجائے بڑھتا گیا، حتیٰ کہ ان مہمانوں کے کھالینے کے باوجود کھانا ان کی بیوی کے بقول تیار کیے گئے کھانے سے تین گنا زیادہ ہو گیا۔ وہ کھانے والا برتن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر بھیج دیا گیا، صبح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر سے وہ فوج کے بارہ دستوں کو بھیجا گیا تو ان سب نے بھی وہ کھانا کھلایا۔

اس حدیث کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ”کتاب مواقیب الصلاة“ کے علاوہ ”باب علامات النبوة“ یعنی کتاب المناقب میں بھی لائے ہیں، کیوں کہ اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی علامت و معجزہ بھی ہے، اگرچہ اس میں حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی فضیلت و کرامت بھی ہے۔ حافظ عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ، اسی طرح علامہ عینی صاحب ”عمدة القاري شرح صحيح البخاري“ کے بقول امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے نمازِ عشا کے بعد مہمان اور اہل خانہ سے گفتگو کے جواز کا جواب قائم کیا تو ان کا استدلال حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے اپنی اہلیہ اور پھر مہمانوں سے بات کرنے کے الفاظ سے ہے۔ یاد رہے کہ یہ حدیث صحیح بخاری کے متعدد مقامات کے علاوہ صحیح مسلم، کتاب الاطعمۃ اور سنن ابی داؤد میں بھی مروی ہے۔^①

① صحیح البخاری مع الفتح (۲/۷۵، ۷۶) و مع عمدة القاري (۵/۹۸ دار الفکر، بیروت) و (۸/۱۶، ۱۲۴)

خلاصہ کلام:

ان احادیث سے حاصل شدہ تفصیلات کا خلاصہ یہ ہوا کہ نمازِ عشا کے بعد معمول کے ذکر اذکار کر کے سو جانا چاہیے۔ بلاوجہ داستان گوئی، قصہ خوانی، فحش کلامی اور لالی یعنی گفتگو میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ ہاں اگر کوئی قرآن و سنت پر مشتمل درس و تدریس، وعظ و ارشاد، پند و نصیحت ہو، مہمان آجائے اور اس کی خدمت مطلوب ہو، مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے کاموں میں مشورہ مقصود ہو یا اہل خانہ اور بچوں سے ضروری امور پر گفتگو کرنا ہو تو پھر جائز ہے۔



نماز میں پابندی وقت قرآن کریم کی روشنی میں

نماز پنج گانہ کے اوقات سے تعلق رکھنے والی تفصیلات، تمام نمازوں کے اوقات کی تعیین اور اوّل وقت میں نمازوں کو ادا کرنے کی فضیلت پر دلالت کرنے والی احادیث سے معلوم ہو جاتا ہے کہ نمازوں کو ادا کرنے میں پابندی وقت بھی ضروری ہے۔ یہ نہیں کہ جب چاہا نماز پڑھ لی، بلکہ اصل یہ ہے کہ جب نماز کا وقت ہو جائے تو اسے ادا کرنے میں تاخیر اور سُستی نہیں ہونی چاہیے۔ یہاں تک کہ دورانِ جنگ بھی نماز کا وقت ہو جائے تو اگرچہ اس کا طریقہ ادا بدل جاتا ہے، مگر بلا وجہ اس کے وقت میں تقدیم و تاخیر کی اس حالت میں بھی اجازت نہیں دی گئی، یہاں تک کہ سورۃ البقرۃ (آیت: ۲۳۹) میں ارشادِ الہی ہے:

﴿فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا عَلَّمَكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ﴾ [البقرۃ: ۲۳۹]

”اگر (دشمن کا) خوف ہو تو پیدل چلتے چلتے یا سواری پر بیٹھے ہی نماز ادا کر لو۔ ہاں جب تم (دشمن کے خوف سے) امن پا لو تو پھر اللہ تعالیٰ کو اسی طرح یاد کرو، جیسا کہ اس نے تمہیں سکھلایا ہے، جو تم پہلے نہیں جانتے تھے۔“

سورۃ النساء (آیت: ۱۰۳) میں صلاۃ الخوف کا طریقہ ذکر کرنے کے بعد ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِذَا اطْمَأْنَنْتُمْ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَّوْقُوتًا﴾

”اور جب تم (دشمن کے خوف سے) مطمئن ہو جاؤ تو پھر (مقررہ اوقات ہی میں) نماز قائم کرو، کیوں کہ اہل ایمان پر مقررہ اوقات میں نماز کا ادا کرنا فرض ہے۔“

سورة البقرة میں طلاق وغیرہ کے مسائل کے تذکرے کے درمیان (آیت: ۲۳۸) میں اللہ تعالیٰ

کا فرمان ہے:

﴿حَفِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ﴾

”سب نمازوں کو بروقت ادا کرنے پر محافظت کرو اور خاص طور پر درمیانی نماز کی اور

دوران نماز اللہ کے سامنے ادب و عاجزی سے کھڑے ہوا کرو۔“

مسائل طلاق کے درمیان نماز کی پابندی و اہتمام کا ذکر کرنا، اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ

معاشی، معاشرتی یا عائلی، کسی بھی قسم کی مصروفیات میں نمازوں کے اوقات کا پورا پورا خیال رکھو اور اس

میں تقدیم و تاخیر نہ کرو۔

نمازِ وسطیٰ:

مذکورہ آیت میں ﴿وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ﴾ یعنی درمیانی نماز سے کون سی نماز مراد ہے؟

خصوصی اہمیت کی مالک اس نماز کی تعیین میں اہل علم کے متعدد اقوال ہیں:

- ① اس سے مراد نمازِ فجر ہے۔
 - ② کچھ کا کہنا ہے کہ یہ نمازِ ظہر ہے۔
 - ③ ایک قول کے مطابق اس سے مراد نمازِ مغرب ہے۔
 - ④ کسی نے نمازِ عشا کہا ہے۔
 - ⑤ بعض نے کہا ہے کہ پانچوں میں سے کوئی ایک ہے، مگر اسے لیلۃ القدر کی طرح مبہم رکھا گیا ہے۔
 - ⑥ کسی نے نمازِ باجماعت کو وسطیٰ قرار دیا ہے۔
 - ⑦ نمازِ جمعہ، نمازِ خوف، عید الفطر، عید الاضحیٰ، نمازِ وتر اور نمازِ ضحیٰ یا چاشت کو بھی نمازِ وسطیٰ کہا گیا ہے۔
 - ⑧ یہ بھی منقول ہے کہ پانچوں نمازوں کے مجموعے کو نمازِ وسطیٰ کہا گیا ہے۔
 - ⑨ نمازِ عصر نمازِ وسطیٰ ہے اور یہی ازروئے دلیل صحیح تر ہے۔
- جبکہ ان میں سے اکثر اقوال بلا دلیل ہیں۔ خصوصاً نمازِ جمعہ، نمازِ خوف، نمازِ عید الفطر و عید الاضحیٰ، نمازِ وتر اور نمازِ ضحیٰ کو ﴿وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ﴾ کہنے والوں کے پاس قرآن و سنت کی واضح مرفوع اور صحیح دلیل کوئی نہیں ہے۔

امام ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے جو روایت بیان کی ہے کہ نماز پنجگانہ کے مجموعے کا نام نمازِ وسطیٰ ہے، اس روایت کو امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے محل نظر قرار دیا اور لکھا ہے کہ امام ماوراء النہر علامہ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ پر تعجب ہے کہ انہوں نے کثیر الاطلاع اور قوی الحافظہ ہونے کے باوجود نماز پنجگانہ کے مجموعے والے اسی قول کو اختیار کیا ہے، حالانکہ قرآن و سنت اور آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کوئی بھی اس کی دلیل نہیں ہے۔ نیز یہ جو حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے منقول ہے اور حضرت سعید بن مسیب، قاضی شریح، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے آزاد کردہ غلام حضرت نافع، ربیع بن خثیم، امام قرطبی اور امام الحرمین جوینی رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ لیلۃ القدر کی طرح نمازِ وسطیٰ کو بھی مبہم رکھا گیا ہے۔^(۱) یہ قول بھی اس بنا پر صحیح نہیں کہ نمازِ وسطیٰ کی تعیین باقاعدہ صحیح احادیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، جیسا کہ ہم ان احادیث کو بھی ذکر کرنے والے ہیں۔

معروف تفسیر واحدی کے مولف نے نمازِ عشا کے نمازِ وسطیٰ ہونے کے قول کو اختیار کیا ہے اور امام ابن جریر طبری نے حضرت قبیصہ بن ذویب رضی اللہ عنہ سے نمازِ مغرب کے بارے میں نمازِ وسطیٰ ہونے کا قول نقل کیا ہے، لیکن قبیصہ رضی اللہ عنہ والی ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کی روایت غیر ثابت ہے۔^(۲) یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے، مگر اس کی سند بھی امام ابن کثیر کے بقول محل نظر ہے۔^(۳) محض یہ کہہ دینا کہ مغرب سے پہلے ظہر و عصر ہیں اور بعد میں عشا و فجر ہیں، لہذا یہ وسطیٰ ہوئی، یہ بات نصوص کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

علمائے تفسیر کی تصریحات:

اب نمازِ وسطیٰ کے بارے میں صرف تین قول باقی ہیں اور وہ ہیں: فجر، ظہر اور عصر۔ تو آئیے ان میں سے راجح ترکی تعیین کے لیے احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اقوالِ شارحین سے پہلے علمائے تفسیر کی تصریحات ملاحظہ کریں:

(۱) تفسیر ابن جریر الطبری (۲۲۰/۵)

(۲) تحقیق تفسیر ابن جریر (۲۱۵-۲۱۴/۵)

(۳) تفسیر ابن کثیر (۲۹۰/۱-۲۹۴) و نیل الأوطار (۳۱۱/۱/۱) وحسنہ فی فتح القادیر ولکنہ موقوف بتحقیق

ابن جریر (۲۲۰، ۲۱۵، ۲۱۴/۵)

امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ:

سورۃ البقرہ کی اس مذکورہ آیت (۲۳۸) کی تفسیر بیان کرتے ہوئے امام المفسرین ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر (۵/ ۱۶۷ تا ۲۲۷) میں مختلف اقوال اور ان کے دلائل ذکر کیے ہیں۔ ۶۰ صفحات میں دی گئی تفصیلات کا خلاصہ صفحہ (۲۲۱) پر ذکر کیا اور لکھا ہے:

”وَالصَّوَابُ مِنَ الْقَوْلِ عَنْ ذَلِكَ مَا تَطَاهَرَتْ بِهِ الْأَخْبَارُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ الَّتِي ذَكَرْنَاهَا قَبْلُ، وَهُوَ أَنَّهَا الْعَصْرُ“^(۱)

”ہماری ذکر کردہ احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مجموعے سے ثابت ہوتا ہے کہ مختلف اقوال میں سے صحیح تر قول یہ ہے کہ نمازِ وسطیٰ سے مراد نمازِ عصر ہے۔“

امام قرطبی رحمہ اللہ:

امام قرطبی رحمہ اللہ نے مذکورہ آیت کے تحت لکھا ہے کہ نمازِ وسطیٰ کی تعیین کے سلسلے میں اہل علم کے دس اقوال ہیں، پھر کچھ تفصیل و دلائل بھی ذکر کیے ہیں، جب کہ نمازِ عصر والے قول کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ حضرت علی، ابن عباس، ابن عمر، ابو ہریرہ اور ابو سعید خدری رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کا بھی یہی اختیار ہے۔ امام شافعی اور اکثر علمائے حدیث نے بھی یہی کہا ہے۔ مالکی علما میں سے ابن حبیب، ابن العربی اور ابن عطیہ کی بھی یہی رائے ہے۔

ابن عطیہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ جمہور اہل علم کا یہی قول ہے۔ آگے صحیح مسلم، سنن ترمذی اور دیگر کتب کے بعض دلائل ذکر کیے اور بعض کی طرف اشارہ کیا ہے، جس سے امام قرطبی کا دلی رجحان بادی النظر میں یہی نظر آتا ہے کہ وہ بھی کسی حد تک نمازِ عصر ہی کے نمازِ وسطیٰ ہونے کے قائل ہیں، لیکن انھوں نے صحیح تر قول اسے قرار دیا ہے کہ وہ نمازِ غیر معین اور مبہم ہے، کیوں کہ اقوال کے دلائل متعارض ہیں اور ترجیح کی کوئی واضح صورت بھی نہیں۔^(۲)

امام مسلم کا اختیار بھی یہی بتایا ہے اور صحیح مسلم، مسند عبد بن حمید، ابو داؤد فی النسخ، تفسیر ابن جریر، سنن بیہقی، ابن حزم، مستدرک حاکم اور معانی الآثار طحاوی کی وہ حدیث بطور دلیل ذکر کی ہے، جس

(۱) تفسیر ابن جریر طبری (۵/ ۲۲۱) طبع دار المعارف مصر بتحقیق علامہ أحمد شاکر.

(۲) تفسیر القرطبی (۲/ ۳/ ۲۰۹ - ۲۱۳) طبع مصر.

میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پہلے یہ آیت نازل ہوئی:

﴿حِفْظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْعَصْرِ﴾

”نمازوں کی محافظت کرو، خصوصاً نمازِ عصر کی۔“

جب تک اللہ نے چاہا، ہم اس آیت کی اسی طرح تلاوت کرتے رہے، پھر یہ آیت اللہ نے

منسوخ کر دی اور یہ آیت اتاری:

﴿حِفْظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَى﴾ [البقرة: ۲۳۸]

”نمازوں کی محافظت کرو، خصوصاً نمازِ وسطیٰ کی۔“

تب ایک آدمی نے کہا: تو پھر وہ نمازِ عصر ہوئی؟ اس پر حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

”میں نے تمہیں بتایا ہے کہ پہلے یہ آیت کیسے نازل ہوئی اور پھر اللہ نے اسے کیسے

منسوخ کیا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔“^(۱)

امام قرطبی رحمہ اللہ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ”اس سے لازم آتا ہے کہ اس نماز کی پہلے

تعیین تو کی گئی، مگر پھر وہ تعین منسوخ کر دی گئی اور اسے مبہم چھوڑ دیا گیا، لہذا تعین نہ رہی۔“ وَاللَّهُ أَعْلَمُ^(۲)

علامہ آلوسی رحمہ اللہ:

علامہ آلوسی نے اپنی تفسیر ”روح المعانی“ (۱/ ۲/ ۱۵۶، ۱۵۷) میں یہ بحث کی ہے اور لکھا ہے

کہ صحیح مسلم کی یومِ احزاب کے واقعے سے تعلق رکھنے والی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

کی رو سے اکثر اہل علم نے صحیح اسے ہی قرار دیا ہے کہ وہ نمازِ عصر ہے۔ آگے چل کر انہوں نے بعض

محققین کے حوالے سے اس کے نمازِ عصر ہونے پر متعدد احتمالات وارد کیے ہیں اور چند احادیث سے یہ

واضح کیا ہے کہ وہ نمازِ ظہر ہے اور لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی طرف بھی یہ قول منسوب کیا گیا ہے۔

علامہ محمد رشید رضا:

علامہ محمد رشید رضا مصری نے اپنی ”تفسیر المنار“ (۲/ ۴۳۷، ۴۳۸) میں یہ بحث کی ہے

اور احادیث کی رو سے سب سے صحیح تر قول نمازِ عصر والے قول کو قرار دیا ہے۔

(۱) تفسیر القرطبی (۲/ ۳/ ۳۱۲) و تحقیق تفسیر ابن جریر (۵/ ۱۹۳) و فتح القدير للشوكاني (۱/ ۲۵۷)

(۲) تفسیر القرطبی (۲/ ۳/ ۲۱۲)

امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ:

معروف مجتہد امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے ”منتقى الأخبار“ کی شرح ”نبیل الأوطار“ میں بڑی تفصیل ذکر کی ہے اور اس سلسلے کے سترہ اقوال نقل کیے ہیں، پھر ان کے دلائل وغیرہ کے تذکرے کے بعد سب سے راجح تر قول نماز عصر والی رائے ہی کو قرار دیا ہے۔^(۱)

انہی سترہ اقوال کی طرف اشارہ کر کے اپنی تفسیر ”فتح القدیر“ میں بھی مذکورہ آیت کے تحت لکھا ہے:

”أَرْجَحَ الْأَقْوَالَ وَأَصَحَّهَا مَا ذَهَبَ إِلَيْهِ الْجَمْعُ هُورٌ مِنْ أَنَّهَا الْعَصْرُ لِمَا ثَبَتَ عِنْدَ الْبُخَارِيِّ وَمُسْلِمٍ وَأَهْلِ السُّنَنِ وَغَيْرِهِمْ“^(۲)
 ”صحیح بخاری و مسلم اور سنن وغیرہ کتب حدیث میں ثابت شدہ احادیث کے پیش نظر صحیح تر قول جمہور ہی کا ہے، جو کہتے ہیں کہ نماز وسطیٰ نماز عصر ہے۔“

امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ:

انتہائی مشہور و معروف مفسر امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے مذکورہ آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے کافی تفصیل ذکر کی ہے۔ دیگر اقوال سے قطع نظر نماز فجر و ظہر اور عصر کے نماز وسطیٰ ہونے والے اقوال کے دلائل بھی ذکر کیے ہیں اور سب سے زیادہ جگہ نماز عصر سے متعلق دلائل کو دی اور لکھا ہے کہ امام ترمذی و بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور بعد والے علما نے نماز عصر ہی کو نماز وسطیٰ کہا ہے۔ قاضی ماوردی کے بقول جمہور تابعین کا بھی یہی قول ہے اور امام ماوراء النہر علامہ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے کہ اکثر محدثین کرام نے بھی یہی کہا ہے۔ ابن عطیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں کہا ہے کہ جمہور اہل علم کا بھی یہی قول ہے اور حافظ دمیاطی کی کتاب ”کشف الغطاء فی تبیین الصلاة الوسطیٰ“ سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ نماز عصر ہے۔ صحابہ کرام میں سے حضرت عمر فاروق، علی، ابن مسعود، ابویوب، عبداللہ بن عمرو، سمرہ بن جندب، ابوہریرہ، ابوسعید خدری، ام المومنین حضرت حفصہ، ام حبیبہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے بھی نماز عصر ہی کی روایات وارد ہوئی ہیں، جبکہ حضرت عبداللہ بن عمر،

(۱) نبیل الأوطار (۱/۱) ۳۱۱-۳۱۸

(۲) تفسیر فتح القدیر (۱/۲۵۶) دار الفکر بیروت.

ابن عباس اور ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے (اگرچہ بعض دیگر اقوال بھی مروی ہیں لیکن) صحیح تر قول کے مطابق ان کے نزدیک بھی نماز عصر ہی ہے۔

تابعین میں سے حضرت عبیدہ، ابراہیم نخعی، زر بن حبیش، سعید بن جبیر، ابن سیرین، حسن بصری، قتادہ، ضحاک، کلبی، مقاتل، عبید بن مریم اور دیگر حضرات رضی اللہ عنہم سے یہی نماز مروی ہے، جب کہ ائمہ و فقہائے مذاہب اربعہ میں سے امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ کا یہی مذہب ہے اور قاضی ماوردی کے بقول امام شافعی رضی اللہ عنہ کا بھی اور ابن المذہب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ اور ان کے دو ارشد تلامذہ امام ابو یوسف اور امام محمد رضی اللہ عنہما سے (اگرچہ دوسرے اقوال بھی مروی ہیں، لیکن) ان کے صحیح تر قول کے مطابق ان کے نزدیک بھی عصر ہی ہے اور حبیب مالکی رضی اللہ عنہ کا اختیار بھی یہی ہے۔^①

نماز فجر کہنے والوں کے دلائل اور ان کا جائزہ:

نماز فجر کو نماز وسطیٰ کہنے والوں نے جن روایات سے استدلال کیا ہے، ان میں سے کسی ایک بھی مرفوع، صریح اور صحیح روایت سے نماز فجر کے نماز وسطیٰ ہونے کا پتا نہیں چلتا، بلکہ وہ جتنی بھی روایات ہیں یا تو صحابہ رضی اللہ عنہم پر موقوف ہیں یا تابعین رضی اللہ عنہم کے آثار ہیں۔

امام طبری رضی اللہ عنہ نے اپنی تفسیر میں بارہ روایات وہ ذکر کی ہیں، جو صحابہ رضی اللہ عنہم پر موقوف ہیں، ان میں سے نو (۹) تو صرف ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہیں۔ ایک روایت ابو عالیہ رضی اللہ عنہ نے صحابی کا نام لیے بغیر بیان کی ہے اور ایک عام صحابہ سے نام ذکر کیے بغیر نقل کی ہے۔ ایک حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ ان میں سے کسی روایت میں بھی یہ مذکور نہیں کہ یہ بات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے۔^② ہاں ایک تیرھویں روایت سنن نسائی میں مرفوع بھی ہے، لیکن علامہ احمد شاکر کی وضاحت کے مطابق اس روایت کی سند کے صحیح ہونے اور اس کے مرفوع ہونے کے باوجود اس میں نماز وسطیٰ کے تعلق سے آخر میں جو تفسیری الفاظ ہیں، وہ پھر موقوف ہیں، یعنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے الفاظ ہیں، نہ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اور تفسیر ابن کثیر میں حضرت ابن عمر و انس رضی اللہ عنہم کی طرف بھی ایسے اقوال منسوب ہیں۔^④

① تفسیر ابن کثیر (۱/۲۹۱)

② تفسیر الطبری (۵/۲۱۴-۲۱۹) و تفسیر ابن کثیر (۱/۲۹۰)

③ تحقیق تفسیر ابن جریر طبری (۵/۲۱۵) تفسیر ابن کثیر (۱/۲۹۰)

فتح القدیر میں امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ کے بقول (حضرت ابن عباس، ابن عمر اور جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہم) کے علاوہ) حضرت علی اور ابو امامہ رضی اللہ عنہما سے بھی موقوف آثار ہی ملتے ہیں۔^①

امام ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے تابعین میں سے امام عطاء، عکرمہ، عبد اللہ بن شداد اور ربیع رضی اللہ عنہم سے ایک ایک اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے دو (۲) قول نقل کیے ہیں، جن میں ان سب نے نماز فجر کو نماز وسطیٰ کہا ہے۔^② جب کہ ان آثار صحابہ و تابعین کے دلیل کا کام دینے یا دلیل نہ بن سکنے کے سلسلے میں امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ یہ آثار صحابہ رضی اللہ عنہم ان کے اپنے اقوال پر مبنی ہیں اور ان میں سے کوئی ایک اثر بھی ایسا نہیں ہے، جس میں اس بات کی نسبت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی گئی ہو۔ ایسے اقوال دلیل و حجت نہیں بن سکتے، خصوصاً جب کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بات ثابت ہو، جس پر تو اتر کا دعویٰ کرنا بھی ممکن ہو۔ ایسی ثابت شدہ بات کے مقابلے میں آنے والے اقوال تو قطعاً دلیل نہیں ہو سکتے اور کسی ایسے معاملے میں جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال دلیل نہیں بن سکتے تو تابعین اور تبع تابعین سے مروی اقوال بالاولیٰ دلیل نہیں ہوں گے۔^③

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ نماز فجر کو نماز وسطیٰ کہنے والوں کے دلائل میں کوئی جان نہیں ہے۔

نماز ظہر کہنے والوں کے دلائل اور ان کا جائزہ:

اب آئیے دیکھیں کہ نماز ظہر کو وسطیٰ کہنے والوں کے پاس کیا دلائل ہیں اور ان کی حجت کی کیا حیثیت ہے؟ چنانچہ اس کے دلائل ذکر کرتے ہوئے امام ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ نے تیرہ روایات ذکر کی ہیں، جن میں سے آٹھ تو حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے موقوفاً مروی ہیں اور انہی سے ایک روایت ایسی بھی مروی ہے، جسے سند کے اعتبار سے تو ضعیف قرار دیا گیا ہے، لیکن اس کے مرفوع ہونے کو امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے غیر صحیح اور علامہ احمد شاہ نے وہم قرار دیا ہے۔ یعنی وہ الفاظ جو نماز وسطیٰ کی تعیین سے تعلق رکھتے ہیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نہیں، بلکہ وہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ہی کے ہیں۔^④

① فتح القدیر (۱/۲۵۶)

② سنن الطبری (۵/۲۱۹)

③ فتح القدیر (۱/۲۵۶)

④ تحقیق تفسیر الطبری (۵/۲۰۰-۲۰۱) فتح القدیر (۱/۲۵۶)

جبکہ چار روایات حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہیں، جن میں سے ایک میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کا ارشاد بھی شامل ہے، جبکہ انہی دونوں حضرات رضی اللہ عنہما سے دوسری صحیح اسناد والی روایات میں نمازِ ظہر کے بجائے نمازِ عصر بھی مروی ہے، جیسا کہ امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اشارہ کیا ہے اور امام طبری رحمۃ اللہ علیہ نے وہ روایات بھی اسانید کے ساتھ اپنی تفسیر میں درج کی ہیں۔^(۱)

ایسے ہی بعض دیگر آثار ہیں، لیکن صحیح بخاری و مسلم اور سنن وغیرہ کی ان صحیح احادیث کا مقابلہ نہیں کر سکتے، جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع ہیں، یعنی خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ وسطیٰ کی تعیین نمازِ عصر سے فرمائی ہے، جیسا کہ نمازِ فجر کہنے والوں کے دلائل کے جائزے کے ضمن میں بھی ذکر کیا جا چکا ہے۔ ایسے ہی اہمات المؤمنین حضرت حفصہ، ام سلمہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی روایات ملتی ہیں، جن سے نمازِ ظہر پر استدلال کیا جاتا ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ان میں یہ وضاحت نہیں ہے، بلکہ ان سے اس کے برعکس وہ روایات بھی ملتی ہیں، جن میں نمازِ عصر کے نمازِ وسطیٰ ہونے کی صراحت موجود ہے، لہذا ظہر والی روایات سے استدلال کمزور ہے۔^(۲)

نمازِ عصر کہنے والوں کے دلائل:

اکثر صحابہ و تابعین، ائمہ و فقہاء اور محدثین کرام کے نزدیک راجح تر قول یہ ہے کہ نمازِ وسطیٰ سے مراد نمازِ عصر ہے، اس بات کے دلائل میں صرف امام ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں دو چار نہیں، بلکہ چھیا سٹھ احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم اور اقوالِ تابعین روایت کیے ہیں اور علامہ احمد شاکر رحمۃ اللہ علیہ نے درست ہی کہا ہے کہ نمازِ وسطیٰ کی تفسیر میں امام طبری نے ایک سو تیرہ (۱۱۳) احادیث و آثار روایت کیے ہیں اور اس موضوع پر ایسا استیعاب تفسیر طبری کے سوا کسی دوسری کتاب تفسیر و حدیث میں نہیں، انھوں نے اس کا حق ادا کر دیا ہے اور حسبِ عادت انھوں نے دلیل کے اعتبار سے قوی ترین رائے کو راجح قرار دیتے وقت نمازِ عصر ہی کو اختیار کیا ہے اور اسی کو ثابت کرنے کے لیے چھیا سٹھ (۶۶) احادیث و آثار بیان کیے ہیں۔ ان سب کا یکے بعد دیگر ذکر تو باعثِ طوالت ہوگا۔ تشنگانِ علم مذکورہ تفسیر کی جلد پنجم (ص: ۱۶۸) سے لے کر (ص: ۱۹۸) تک یعنی اکتیس (۳۱)

(۱) تفسیر ابن کثیر (۲۹۱/۱) طبری و تحقیقہ (۱۷۲/۵، ۱۷۳، ۱۹۸/۵، ۲۰۴)

(۲) تفصیل کے لیے دیکھیں: تفسیر الطبری (۲۰۵/۵، ۲۱۴) فتح القدیر (۲۵۶/۱، ۲۵۷) نیل الأوطار (۳۱۲/۱)

صفحات کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ ہم یہاں تفسیر طبری اور دیگر کتب حدیث سے چند احادیثِ رسول ﷺ، آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم اور اقوالِ تابعین ذکر کرتے ہیں۔

حدیثِ اول:

ان میں سے پہلی حدیث صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داؤد اور مسند احمد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ غزوہ احزاب کے دن مشرکین کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«مَلَأَ اللَّهُ قُبُورَهُمْ وَ بَيُوتَهُمْ نَارًا كَمَا شَغَلُونَا عَنِ الصَّلَاةِ الْوَسْطَى حَتَّى غَابَتِ الشَّمْسُ»

”اللہ ان کی قبروں اور گھروں کو آگ سے بھر دے، جیسے انہوں نے ہمیں نمازِ وسطیٰ سے روکے رکھا، یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا۔“

جب کہ صحیح مسلم، سنن ابو داؤد اور مسند احمد کے الفاظ یوں ہیں:

«شَغَلُونَا عَنِ الصَّلَاةِ الْوَسْطَى، صَلَاةِ الْعَصْرِ»⁽¹⁾

”انہوں نے ہمیں درمیانی نماز، نمازِ عصر سے روکے رکھا۔“

ان الفاظ میں نمازِ وسطیٰ کی وضاحت و تعیین نمازِ عصر سے کی گئی ہے۔

حدیثِ دوم:

دوسری حدیث سنن ابن ماجہ، بیہقی، مصنف عبدالرزاق، محلی ابن حزم اور تفسیر طبری میں حضرت

علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں:

«كُنَّا نَرَاهَا الصُّبْحَ [أَوِ الْفَجْرَ] حَتَّى سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ يَوْمَ الْأَحْزَابِ: شَغَلُونَا عَنِ الصَّلَاةِ الْوَسْطَى صَلَاةِ الْعَصْرِ مَلَأَ اللَّهُ قُبُورَهُمْ وَأَجْوَأَهُمُ النَّارَ»⁽²⁾

(1) صحیح البخاری (۸/۱۹۵) صحیح مسلم (۳/۵/۱۲۸) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (۳۹۵)

المنتقى مع النيل (۱/۱/۳۱۰-۳۱۱)

(2) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۶۸۴) طبری و تحقیقہ (۵/۱۸۴) و صححہ أحمد شاکر.

”ہم نماز فجر کو ہی وسطیٰ سمجھا کرتے تھے، حتیٰ کہ غزوہ احزاب کے دن میں نے نبی اکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ”انہوں نے ہمیں نماز وسطیٰ نماز عصر سے روک رکھا۔ اللہ ان کے پیٹوں اور قبروں کو آگ سے بھر دے۔“

حدیث سوم:

اسی طرح حدیث اول سے ملتی جلتی ایک حدیث صحیح مسلم، سنن ترمذی و ابن ماجہ، مسند احمد، سنن بیہقی اور طرابلسی میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اس میں بھی نبی اکرم ﷺ نے نماز عصر ہی کو نماز وسطیٰ قرار دیا ہے۔^(۱)

یاد رہے کہ غزوہ احزاب یا غزوہ خندق کے موقع پر بعض احادیث کی رو سے نماز عصر و ظہر اور مغرب و عشاء سبھی میں دیر ہوگئی تھی، جبکہ صحیحین کی حدیث میں صرف نماز عصر مذکور ہے۔ امام ابن العربی نے کہا ہے کہ دونوں طرح کی احادیث ہی صحیح ہیں اور غزوہ خندق کا واقعہ کئی دنوں پر محیط تھا، لہذا ممکن ہے کہ کسی دن چار نمازیں اور کسی دن صرف عصر میں تاخیر ہوگئی ہو۔^(۲)

حدیث چہارم:

صحیح مسلم، سنن ترمذی اور دیگر کتب حدیث میں ایک چوتھی روایت بھی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں ارشاد نبوی ﷺ ہے:

«صَلَاةُ الْوُسْطَى صَلَاةُ الْعَصْرِ»^(۳) ”نماز وسطیٰ نماز عصر ہے۔“

حدیث پنجم:

پانچویں حدیث سنن ترمذی، مسند احمد، سنن بیہقی، تفسیر طبری اور معانی الآثار طحاوی میں حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

(۱) المنتقی (۲۱۴ / ۱ / ۱) طبری و تحقیقہ (۱۸۲ / ۵ - ۱۸۳)

(۲) ویکس: نیل الأوطار (۳۱۳ / ۱ / ۱ - ۳۱۴)

(۳) صحیح مسلم (۱۲۸ / ۵ / ۳) صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۱۵۲) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۶۸۶) المنتقی أيضاً.

«الصَّلَاةُ الْوُسْطَى صَلَاةُ الْعَصْرِ»^① ”نمازِ وسطی نمازِ عصر ہے۔“

حدیثِ ششم:

چھٹی حدیث سنن بیہقی اور معجم طبرانی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ بھی یہی ہیں:

«الصَّلَاةُ الْوُسْطَى صَلَاةُ الْعَصْرِ»^② ”نمازِ وسطی نمازِ عصر ہے۔“

آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم:

اس موضوع و مفہوم کی اور بھی کتنی ہی احادیث ہیں، لیکن ہم نے ان میں سے صرف صحیح اسانید والی یہ چھ احادیث ہی ذکر کی ہیں جو مرفوع ہیں، یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر مشتمل ہیں، جن کی موجودگی میں کسی دوسری دلیل کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ جاتی، تاہم صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رضی اللہ عنہم کے اسی معنی کے بکثرت آثار بھی ملتے ہیں۔

اثرِ اول:

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ملتے جلتے الفاظ سے تفسیر طبری، شعب الایمان بیہقی، مصنف ابن ابی شیبہ اور مسند عبد بن حمید میں مروی ہے، ابو صہباء بکری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ نمازِ وسطی کون سی ہے؟ تو انہوں نے فرمایا:

”هِيَ صَلَاةُ الْعَصْرِ، وَ هِيَ الَّتِي فُتِنَ بِهَا ابْنُ دَاوُدَ“^③

”وہ نمازِ عصر ہے اور یہی وہ نماز ہے، جس سے (حضرت سلیمان) ابن داود علیہ السلام آزمائے

گئے تھے۔“

اثرِ ثانی:

تفسیر طبری، سنن بیہقی اور محلی ابن حزم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

① صحیح سنن الترمذی، رقم الحدیث (۱۵۳) الفتح الربانی (۱/۱۶۲ / ۲ / ۱) المنتقی (۱/۱ / ۳۱۶) تفسیر الطبری (۵/۱۸۰، ۱۹۴)

② تفسیر الطبری و تحقیقہ (۵/۱۸۹) صحیح الجامع، رقم الحدیث (۳۸۳۵)

③ تفسیر الطبری و تحقیقہ (۵/۱۷۰) و صححہ أحمد شاکر.

”الصَّلَاةُ الْوُسْطَى صَلَاةُ الْعَصْرِ“^(۱) ”نمازِ وُسْطَى نمازِ عصر ہے۔“

اثرِ ثالث:

اثرِ ثالث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے تفسیر طبری، مصنف عبدالرزاق، محلّی ابن حزم اور معانی الآثار طحاوی (واللفظ لہ) میں مروی ہے اور اس کے الفاظ بھی من وعن یہی ہیں، جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے ہیں۔^(۲)

اثرِ رابع:

اثرِ رابع ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، جو تفسیر طبری اور دیگر کتب میں مذکورہ آیت کی تفسیر کے ضمن میں وارد ہوا ہے اور انہوں نے بھی نمازِ وُسْطَى کی تفسیر نمازِ عصر سے کی ہے۔^(۳)

اثرِ خامس:

اثرِ خامس تفسیر طبری، مصنف ابن ابی شیبہ اور محلّی ابن حزم میں ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے اور اس کے الفاظ بھی: ”الصَّلَاةُ الْوُسْطَى صَلَاةُ الْعَصْرِ“ ہی ہیں۔ ان آثار سے بھی پتا چلا کہ (نمازِ وُسْطَى) نمازِ عصر ہی ہے، نہ کہ کوئی دوسری نماز۔ آثارِ تابعین رضی اللہ عنہم:

آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرح تابعین کرام رضی اللہ عنہم سے بھی بکثرت آثار ملتے ہیں، جن میں نمازِ وُسْطَى کی تعیین نمازِ عصر ہی سے کی گئی ہے۔ چنانچہ امام ابراہیم نخعی، حسن بصری، قتادہ، زر بن حبیش، ضحاک اور مجاہد رضی اللہ عنہم کے آثار تفسیر ابن جریر طبری اور اس کی تحقیق میں دیکھے جاسکتے ہیں۔^(۴)

خلاصہ کلام:

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ نمازِ وُسْطَى، جس کی محافظت کی قرآن کریم میں سخت تاکید کی گئی ہے، وہ نمازِ عصر ہے اور یہی راجح مسلک ہے۔ حافظ ابن حجر رضی اللہ عنہ نے ”فتح الباری“ (۸/ ۱۹۵ - ۱۹۸) میں بیس (۲۰) اقوال اور ان کے دلائل کا جائزہ لینے کے بعد نمازِ عصر والے قول کو ترجیح دی ہے۔

(۱) تفسیر الطبري و تحقیقہ (۱۷۰/۵) صحیح الجامع، رقم الحدیث (۳۸۳۵)

(۲) تحقیق تفسیر الطبري (۱۷۰/۵) صحیح الجامع، رقم الحدیث (۳۸۳۵)

(۳) تحقیق تفسیر الطبري (۱۷۹/۵ - ۱۸۰)

(۴) تحقیق الطبري (۱۷۷/۵ - ۱۷۹ - ۱۸۰ - ۱۸۲)

نماز میں پابندی وقت حدیث شریف کی روشنی میں

نمازوں کو ادا کرنے میں پابندی وقت کی بات شروع ہوئی اور قرآن کریم کی بعض آیات سے اس موضوع کا آغاز کیا گیا تھا۔ سورۃ البقرہ کی آیت (۲۳۸) میں نمازوں کو ادا کرنے میں پابندی وقت کی تاکید کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے نماز وسطیٰ کی محافظت کا بطور خاص حکم فرمایا ہے اور نماز وسطیٰ کی تعیین بھی ہم نے احادیث و آثار کی روشنی میں قدرے تفصیل کے ساتھ ذکر کر دی ہے کہ وہ نماز عصر ہے۔

ترک عصر پر وعید:

نماز عصر اتنی قدر و منزلت کی حامل ہے کہ اس کی اہمیت صرف اسی بات سے معلوم ہو جاتی ہے کہ صحیح بخاری و مسلم اور سنن اربعہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«الَّذِي تَفُوتُهُ صَلَاةُ الْعَصْرِ كَأَنَّمَا وُتِرَ أَهْلُهُ وَمَالُهُ»^(۱)

”جس کی نماز عصر فوت ہوگئی، وہ ایسے ہے جیسے کسی کے اہل و مال ہی ہلاک و برباد ہو گئے ہوں۔“

اس حدیث پر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی تبویب ”باب اِثْمٍ مِنْ فَاتَتِهِ الْعَصْرُ“ اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی تشریح سے معلوم ہوتا ہے کہ عصر کے فوت ہو جانے سے مراد اس کا بالکل ترک کرنا نہیں، بلکہ اس کے جواز کے وقت سے اس کو ادا کرنے میں تاخیر کرنا مراد ہے۔

اسی طرح صحیح بخاری، سنن نسائی و ابن ماجہ، مصنف ابن ابی شیبہ اور مسند احمد میں حضرت ابو ملیح رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک غزوے کے سلسلے میں ہم حضرت ابو بربیدہ رضی اللہ عنہ کے ہمراہ تھے، جبکہ اس

(۱) صحیح البخاری (۳۰/۲) صحیح مسلم (۱۲۵/۵/۳) صحیح سنن أبی داود (۴۰۰) صحیح سنن الترمذی (۱۴۷) صحیح سنن النسائی (۴۶۴) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۶۸۵) صحیح ابن خزيمة (۱/۱۷۳) صحیح الجامع الصغیر (۱۱۳/۵/۳)

دن آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے تو حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«بَكْرُوا صَلَاةَ الْعَصْرِ لِأَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: مَنْ تَرَكَ صَلَاةَ الْعَصْرِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهُ»^①

”نمازِ عصر ادا کرنے میں جلدی کرو، کیوں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ”جس نے نمازِ عصر

ترک کر دی، اس کے تمام اعمال برباد ہو گئے۔“

یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ اس مقام پر بھی ترک سے مراد بالکل ترک نہیں، بلکہ نماز کو اہمیت نہ دیتے ہوئے اس کے وقتِ جواز سے اسے نکال دینا مراد ہے، جیسا کہ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کے نمازِ عصر کو جلدی ادا کرنے کے حکم سے پتا چلتا ہے۔ مطلق ترک کر دینا یا انکار کر دینا یا انکار تو نہ کرنا، مگر اس کی پروا نہ کرتے ہوئے اس کو ترک کر دینا، جیسے اقوال بھی ملتے ہیں، لیکن ان سب اقوال سے اولیٰ مفہوم وہی ہے، جو اس ارشادِ نبوی ﷺ کے راوی صحابی رضی اللہ عنہ نے بتایا ہے اور تمام اعمال کا برباد ہو جانا، وعید شدید اور سخت زجر و توبیح ہے۔

حافظ عسقلانی رضی اللہ عنہ کے نزدیک تمام اعمال کی بربادی کے ظاہری معنی کے بجائے اقرب تاویل

یہ ہے کہ اس سے مراد زجر شدید ہے۔^②

محافظة عصر و فجر:

بعض احادیثِ رسول ﷺ ایسی ہیں کہ جن میں نمازِ عصر کے ساتھ ہی نمازِ فجر ادا کرنے پر محافظت اور ان دونوں نمازوں کی فضیلت ذکر کی گئی ہے، مثلاً صحیح بخاری و مسلم کی ایک متفق علیہ حدیث میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ صَلَّى الْبُرْدَيْنِ دَخَلَ الْجَنَّةَ»^③

”جس نے دو ٹھنڈی نمازیں (فجر و عصر) پابندی سے ادا کیں، وہ جنت میں داخل ہو گیا۔“

صحیح مسلم، سنن ابی داؤد، نسائی، مسند احمد اور صحیح ابن خزمیہ میں ابو زہیرہ عمارہ بن رویہ رضی اللہ عنہ

① صحیح البخاری (۳۱/۲) صحیح سنن النسائي، رقم الحديث (۴۶۰) سنن ابن ماجه (۶۹۴) صحیح ابن

خزيمة (۱۷۳/۱)

② فتح الباري (۳۲/۲-۳۳)

③ صحیح البخاری (۵۲/۲) و صحیح مسلم (۱۳۵/۵/۳) صحیح الجامع (۳/۵/۳)

سے مروی ہے کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

«لَنْ يَلِجَ النَّارَ أَحَدٌ صَلَّى قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوبِهَا. يَعْنِي:
الْفَجْرَ وَالْعَصْرَ»^(۱)

”وہ شخص ہرگز جہنم میں داخل نہیں ہوگا، جس نے طلوع آفتاب اور غروب آفتاب سے پہلے والی نمازیں (فجر و عصر) پابندی سے ادا کیں۔“

صحیح مسلم، سنن ترمذی، مسند احمد اور معجم طبرانی میں حضرت جناب بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے

کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ صَلَّى الصُّبْحَ فَهُوَ فِي ذِمَّةِ اللَّهِ فَلَا يَطْلُبَنَّكَ اللَّهُ مِنْ ذِمَّتِهِ بِشَيْءٍ فَإِنَّهُ
مَنْ يَطْلُبُهُ مِنْ ذِمَّتِهِ بِشَيْءٍ يُدْرِكْهُ، ثُمَّ يَكْبَهُ عَلَى وَجْهِهِ فِي نَارِ جَهَنَّمَ»^(۲)

”جس نے نماز فجر ادا کی، وہ اللہ کے ذمے میں آگیا۔ اللہ تمہیں اپنے ذمے کو ترک کرنے کے لیے کسی معاملے میں مواخذہ نہ کرے، ورنہ جسے اس نے اپنے ترک ذمہ کے لیے طلب کر لیا تو وہ اسے پکڑے گا اور اس شخص کو منہ کے بل جہنم میں پھینک دے گا۔“

جب کہ صحیحین و سنن اربعہ اور مسند احمد میں حضرت جریر بن عبد اللہ الجلی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

«كُنَّا عِنْدَ النَّبِيِّ ﷺ فَنَظَرَ إِلَى الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ فَقَالَ: إِنَّكُمْ سَتَرُونَ رَبَّكُمْ
كَمَا تَرُونَ هَذَا الْقَمَرَ، لَا تَضَامُونَ فِي رُؤْيَيْهِ فَإِنْ اسْتَطَعْتُمْ إِلَّا تَغْلَبُوا
عَلَى صَلَاةٍ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوبِهَا فَافْعَلُوا»^(۳)

”ہم نبی اکرم ﷺ کے پاس موجود تھے، آپ ﷺ نے چودھویں کے چاند کو دیکھتے ہوئے ارشاد فرمایا: ”تم اپنے پروردگار کو بھی اسی طرح دیکھو گے، جس طرح آج اس چاند کو دیکھ رہے ہو، تمہیں اسے دیکھنے میں کمی کرنے والی کوئی چیز حائل نہیں ہوگی، (لیکن اس کے

(۱) صحیح مسلم (۳/۵/۱۳۵) صحیح سنن أبي داود، رقم الحديث (۴۱۲) صحیح سنن النسائي (۴۵۷)

صحیح ابن خزيمة (۱/۱۶۴) صحیح الجامع (۳/۵/۵۴)

(۲) صحیح مسلم (۵/۱۵۸) صحیح سنن الترمذی (۱۸۴) صحیح الجامع (۵/۳۱۲) و المشكاة مع المرعاة (۲/۶۷)

(۳) صحیح البخاري (۲/۳۳) صحیح مسلم (۵/۱۳۴) صحیح سنن أبي داود (۳۹۵۵) صحیح سنن الترمذی،

رقم الحديث (۲۰۶۷) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۱۷۷) صحیح الجامع، رقم الحديث (۲۳۰۶)

لیے ضروری ہے کہ) اگر ہو سکے تو طلوع آفتاب اور غروب آفتاب سے پہلے والی دو نمازوں (فجر و عصر) کو ادا کرنے سے روکنے میں تم پر کوئی چیز غالب نہ آنے پائے۔“
پھر آپ ﷺ نے سورت ق کی اس آیت (۳۹) کی تلاوت کی، جس میں ارشاد الہی ہے:

﴿وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوبِ﴾

”اور طلوع آفتاب سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے اللہ کی تسبیح کرو۔“

اس حدیث کے ایک راوی اسماعیل فرماتے ہیں:

”افْعَلُوا فَلَا تَفُوتَنَّكُمْ“^(۱) ”یہ کام کر گزرو کہ یہ نمازیں فوت نہ ہونے پائیں۔“

فضیلتِ عصر و فجر کے اسباب:

صحیح مسلم اور سنن نسائی میں حضرت ابو بصرہ غفاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے

ہمیں تمھیں نامی جگہ پر عصر کی نماز پڑھائی اور فرمایا:

«إِنَّ هَذِهِ الصَّلَاةَ عُرِضْتُ عَلَيْكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكَمْ فَضَيَعُوهَا، فَمَنْ حَافَظَ عَلَيْهَا كَانَ لَهُ أَجْرُهُ مَرَّتَيْنِ، وَلَا صَلَاةَ بَعْدَهَا حَتَّى يَطْلُعَ الشَّاهِدُ»^(۲)

”یہ نماز تم سے پہلے لوگوں پر بھی فرض کی گئی، مگر انھوں نے اسے ضائع کر دیا۔ پس جس

نے اس کی نگہداشت کی اُسے دوہرا اجر ملے گا اور اس کے بعد ستارہ نکلنے (غروب

آفتاب) تک کوئی (نفل) نماز نہیں ہے۔“

اس حدیث میں نماز عصر کی فضیلت کا سبب بھی آگیا ہے، جبکہ ایک دوسری حدیث میں نماز فجر

و عصر دونوں کی فضیلت و محافظت کا ایک اور سبب بھی مذکور ہے کہ ان نمازوں کی محافظت کرنے والوں

کے لیے فرشتوں کی اللہ کے حضور گواہی ہے، چنانچہ صحیح بخاری و مسلم، سنن نسائی، صحیح ابن خزیمہ، السنن

لابن ابی عاصم اور مسند احمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«يَتَعَاقَبُونَ فِيكُمْ مَلَائِكَةٌ بِاللَّيْلِ وَمَلَائِكَةٌ بِالنَّهَارِ بَجْتَمَعُونَ فِي صَلَاةِ

الْفَجْرِ وَصَلَاةِ الْعَصْرِ، ثُمَّ يَعْرُجُ الَّذِينَ بَاتُوا فِيكُمْ، فَيَسْأَلُهُمْ رَبُّهُمْ

(۱) صحیح البخاری مع الفتح، رقم الحدیث (۵۵۴)

(۲) صحیح مسلم (۱۱۳/۶/۳) صحیح سنن النسائی، رقم الحدیث (۵۰۷) صحیح الجامع (۲۶۱/۶/۳)

وَهُوَ أَعْلَمُ بِهِمْ: كَيْفَ تَرَكَتُمْ عِبَادِي؟»

”تمہارا نامہ اعمال لکھنے والے) فرشتے دن اور رات کو بدلتے رہتے ہیں، جبکہ نماز فجر اور عصر کے وقت دن اور رات والے فرشتے سب ہی اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ پھر جن فرشتوں نے تمہارے مابین رات گزاری ہوتی ہے، وہ آسمان کی طرف چڑھ جاتے ہیں۔ انہیں اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے، حالانکہ وہ خود زیادہ جاننے والا ہے: تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا ہے؟“

تو فرشتے کہتے ہیں:

«تَرَكَنَاهُمْ وَهُمْ يُصَلُّونَ وَأَتَيْنَاهُمُ وَهُمْ يُصَلُّونَ»^①

”ہم نے انہیں اس حال میں چھوڑا ہے کہ وہ نماز پڑھ رہے تھے اور جب ہم ان لوگوں کے پاس گئے تھے تو بھی وہ نماز ہی پڑھ رہے تھے۔“

سبحان اللہ! فجر و عصر کی پابندی پر مومن کے لیے فرشتوں کی یہ گواہی کیا شان لیے ہوئے ہے۔ اللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِمَّنْ يُحَافِظُونَ عَلَيْهَا وَعَلَى الْآخِرَىٰ. آمِينَ.

محافظة فجر وعشا:

بعض احادیث ایسی بھی ہیں، جن میں صرف فجر اور بعض میں فجر کے ساتھ ہی عشا کا ذکر آیا ہے، جیسا کہ صحیح بخاری شریف اور سنن نسائی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«تَفْضُلُ صَلَاةِ الْجَمْعِ صَلَاةِ أَحَدِكُمْ وَحَدَهُ بِخَمْسٍ وَعِشْرِينَ جُزْءًا وَتَجْتَمِعُ مَلَائِكَةُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ فِي صَلَاةِ الْفَجْرِ»

”تم میں سے کسی اکیلے کے نماز پڑھنے سے نماز باجماعت کا ثواب پچیس (۲۵) حصے زیادہ ہے اور نماز فجر میں رات اور دن کے (نامہ اعمال لکھنے والے) فرشتے جمع ہوتے ہیں۔“

پھر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ چاہو تو سورۃ الاسراء (بنی اسرائیل) کی آیت (۷۸)

① صحیح البخاری (۲/۳۳) صحیح مسلم (۳/۸/۱۳۳) صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (۴۷۱)

صحیح الجامع (۳/۶/۳۱۸)

پڑھ لو، (جس میں ارشاد الہی ہے):

﴿إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا﴾^(۱)

”بے شک فجر کے وقت قرآن پڑھنے پر (اللہ کے فرشتے) گواہ بنتے ہیں۔“

صحیح مسلم اور مسند احمد میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

«مَنْ صَلَّى الْعِشَاءَ فِي جَمَاعَةٍ فَكَأَنَّهُ قَامَ نِصْفَ اللَّيْلِ، وَمَنْ صَلَّى الصُّبْحَ فِي جَمَاعَةٍ فَكَأَنَّهُ صَلَّى اللَّيْلَ كُلَّهُ»^(۲)

”جس نے نمازِ عشا باجماعت ادا کی، اس نے گویا نصف رات قیام کیا اور جس نے فجر کی

نماز بھی جماعت سے پڑھی تو اس نے گویا ساری رات ہی نماز میں گزار دی۔“

سنن ابوداؤد و ترمذی میں بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ صَلَّى الْعِشَاءَ فِي جَمَاعَةٍ كَانَ كَقِيَامِ نِصْفِ لَيْلَةٍ، وَمَنْ صَلَّى الْعِشَاءَ وَالْفَجَرَ كَانَ كَقِيَامِ لَيْلَةٍ»^(۳)

”جس نے نمازِ عشا باجماعت ادا کی، اس نے گویا آدھی رات قیام کیا اور جس نے نمازِ

فجر و عشا دونوں جماعت سے پڑھ لیں، اس نے گویا پوری رات ہی قیام میں گزار دی۔“

صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لَيْسَ صَلَاةٌ أَثْقَلُ عَلَى الْمُنَافِقِينَ مِنْ صَلَاةِ الْفَجْرِ وَالْعِشَاءِ، وَلَوْ يَعْلَمُونَ مَا فِيهِمَا لَأَتَوْهُمَا وَلَوْ حَبْوًا»^(۴)

”منافقین پر نمازِ فجر و عشا سے بھاری کوئی نماز نہیں۔ اگر انھیں معلوم ہو جائے کہ ان

دونوں نمازوں میں کتنا اجر ہے تو پھر یہ ضرور آئیں، چاہے انھیں گھٹنوں کے بل گھسٹ کر

(۱) صحیح البخاری (۱۳۷/۲) صحیح سنن النسائي، رقم الحديث (۴۷۶) صحیح الجامع (۴۹/۳/۲)

(۲) مختصر صحیح مسلم للمنزدي، رقم الحديث (۳۲۴) صحیح الجامع (۱۳۲/۵/۳)

(۳) صحیح سنن أبي داود، رقم الحديث (۵۱۹) صحیح سنن الترمذی، رقم الحديث (۱۸۳) صحیح

الجامع (۳۱۳/۳)

(۴) صحیح البخاری، رقم الحديث (۶۵۷) صحیح مسلم (۱۵۴/۵) و المشكاة مع المرعاة (۲۸/۲)

ہی کیوں نہ آنا پڑے۔“

ایسے ہی صحیح بخاری و مسلم، سنن نسائی، موطا امام مالک اور مسند احمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ

سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لَوْ يَعْلَمُ النَّاسُ مَا فِي النِّدَاءِ وَ الصَّفِّ الْأَوَّلِ، ثُمَّ لَمْ يَجِدُوا إِلَّا أَنْ يَسْتَهْمُوا عَلَيْهِ لَأَسْتَهَمُوا، وَلَوْ يَعْلَمُونَ مَا فِي التَّهَجِيرِ لَأَسْتَبَقُوا لَهُ، وَلَوْ يَعْلَمُونَ مَا فِي الْعَتَمَةِ وَ الصُّبْحِ لَأَتَوْهُمَا وَلَوْ حَبَوًّا»^(۱)

”اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اذان کہنے اور صفِ اوّل میں کھڑے ہو کر نماز ادا کرنے میں کس قدر اجر و ثواب ہے، تو پھر انھیں اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہے کہ ان میں اپنی باری مقرر کرنے کے لیے وہ قرعہ اندازی کیا کریں اور اگر انھیں (نمازِ ظہر کے لیے) مسجد میں بروقت جانے کے ثواب کا پتا چل جائے تو ضرور پہل کر جایا کریں اور اگر انھیں نمازِ عشا و فجر کے فضائل و برکات کا صحیح اندازہ ہو جائے تو وہاں دونوں نمازوں میں ضرور شریک ہوا کریں، چاہے انھیں گھٹنوں (سرینوں) کے بل گھسٹ کر ہی کیوں نہ آنا پڑے۔“

اسی طرح ہی مگر قدرے مختصر الفاظ سے سنن ابن ماجہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہے

کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لَوْ يَعْلَمُ النَّاسُ مَا فِي صَلَاةِ الْعِشَاءِ وَ صَلَاةِ الْفَجْرِ لَأَتَوْهُمَا وَلَوْ حَبَوًّا»^(۲)

”اگر لوگوں کو نمازِ عشا اور فجر کے ثواب کا علم ہو جائے تو وہ ان نمازوں میں ضرور شامل ہوں، چاہے کولہوں (گھٹنوں) کے بل گھسٹتے ہی کیوں نہ آئیں۔“

نمازِ فجر کی عمومی فضیلت کے علاوہ جمعہ کے دن فجر کا خصوصی مقام بتایا گیا ہے، حتیٰ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

نے اسے باجماعت ادا کرنے کی شکل میں تمام نمازوں سے افضل قرار دیا ہے، جیسا کہ شعب الایمان بہیقی

[۱] صحیح البخاری (۹۶/۲) مختصر صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۶۸) صحیح سنن النسائی، رقم

الحدیث (۵۲۶) صحیح الجامع (۷۹/۵)

[۲] سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۷۹۶) صحیح الجامع (۷۹/۵)

اور حلیۃ الاولیاء ابو نعیم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:
 «أَفْضَلُ الصَّلَوَاتِ عِنْدَ اللَّهِ صَلَاةُ الصُّبْحِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فِي جَمَاعَةٍ»^①
 ”اللہ کے نزدیک تمام نمازوں سے افضل ترین نماز، جمعہ کے دن باجماعت ادا کی گئی
 نمازِ فجر ہے۔“

بروز جمعہ نمازِ فجر کو باجماعت ادا کرنے کے افضل ترین نماز ہونے کی وجہ بڑی واضح سی ہے کہ بعض احادیث (جن میں سے بعض ”نمازِ جمعہ“ کے احکام و مسائل اور آداب پر مشتمل اپنی کتاب میں ہم ذکر کر چکے ہیں، جہاں وضاحت بھی قدرے زیادہ ہے) کے پیش نظر اس رات کو لوگ عموماً عام دنوں کی نسبت ازدواجی معاملات میں زیادہ وقت دیتے ہیں، جس کے نتیجے میں صبح کی نماز رہ جانے کا زیادہ خدشہ ہوتا ہے، لہذا جو شخص ازدواجی ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہو اور صبح ہونے پر نمازِ فجر بھی باجماعت ادا کرے تو ایسی نماز کو یقیناً دوسری نمازوں سے افضل ہونا ہی چاہیے۔ آج اکثر عربی و اسلامی ممالک میں جمعہ کے دن کو ہفتہ وار چھٹی ہوتی ہے۔ اس لیے بھی لوگ رات کو زیادہ جاگ لیتے ہیں کہ چلو صبح چھٹی ہے، سو لیں گے۔ نتیجتاً فجر کے رہ جانے کا بھی امکان زیادہ ہو جاتا ہے۔

نمازِ فجر و عشا کی اہمیت کا اندازہ امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی اس ارشاد سے بھی لگایا جاسکتا ہے، جو صحیح ابن خزیمہ، مسند بزار اور معجم طبرانی میں ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:
 ”كُنَّا إِذَا فَقَدْنَا الرَّجُلَ فِي الْفَجْرِ وَالْعِشَاءِ أَسَانًا بِهِ الظَّنُّ“^②
 ”جب ہم کسی شخص کو نمازِ فجر اور عشا سے غائب پاتے تو اس کے بارے میں (نفاق میں مبتلا ہونے) کا بُرا گمان کرتے تھے۔“

ان تمام احادیث میں نمازِ فجر و عشا پر محافظت و پابندی کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی اثر میں یہ بتایا گیا ہے کہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک نمازِ عشا و فجر سے غائب رہنے والے شخص کا ایمان مشکوک ہو جاتا تھا اور وہ اس کے بارے میں بدظن ہو جاتے تھے کہ کہیں وہ منافق تو نہیں ہو گیا۔

① صحیح الجامع (۱/۳۶۶)

② کتاب الصلاة لعبد الملك (ص: ۲۳۳)

نمازِ ظہر کی فضیلت اور اس پر محافظت:

مذکورہ احادیث میں جس طرح نمازِ فجر و عشا اور عصر پر محافظت کی مذکورہ احادیث میں تاکید آئی ہے، ایسے ہی صحیح بخاری و مسلم، سنن نسائی، موطا امام مالک اور مسند احمد میں مروی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ والی حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ ظہر کی محافظت کی بھی ترغیب دلائی اور اُسے اول وقت میں ادا کرنے پر ثواب کی بشارت دیتے ہوئے فرمایا ہے:

«... وَكَلِمَاتٍ يَتْلُوْنَ مَا فِي التَّهَجُّمِ لَا يَسْتَبِقُوْنَ اِلَيْهِ»⁽¹⁾

”اگر ان لوگوں کو نمازِ ظہر بر وقت ادا کرنے کے اجر و ثواب کا پتا چل جائے تو وہ ضرور

اس کی طرف بھاگے بھاگے آئیں اور ایک دوسرے پر سبقت کرنے لگیں۔“

نمازِ مغرب کی فضیلت اور اس پر محافظت:

سابق میں چار نمازوں کی فضیلت اور ان پر محافظت کے سلسلے میں متعدد احادیث آگئی ہیں۔ پانچویں نماز ہے نمازِ مغرب۔ خاص نمازِ مغرب کے نام سے مطلق تو ہمیں کوئی حدیث نہیں ملی، جس میں اس کی فضیلت اور اس پر محافظت کا ذکر ہو۔ البتہ بعض مطلق احادیث میں فرض نمازوں کو بروقت ادا کرنا اور محافظت کا ذکر آیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ نمازِ مغرب بھی ان میں شامل ہے۔ دو ٹھنڈی نمازوں کی فضیلت صحیح بخاری و مسلم کی ایک حدیث میں آئی ہے اور ان ٹھنڈی نمازوں میں سے ایک اس نمازِ مغرب کو بھی شمار کیا گیا ہے، چنانچہ صحیحین میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ صَلَّى الْبُرْدَيْنِ دَخَلَ الْجَنَّةَ»⁽²⁾

”جس نے دو ٹھنڈی نمازیں پابندی سے ادا کیں، وہ جنت میں داخل ہو گیا۔“

ان دونوں نمازوں سے مراد تو فجر اور عصر ہیں اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں ان دونوں کے نام بھی وارد ہوئے ہیں۔ البتہ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نمازِ مغرب بھی اس میں داخل

(1) صحیح البخاری، رقم الحدیث (615) صحیح مسلم مع شرح النووی (4/157) صحیح سنن النسائی،

رقم الحدیث (526) صحیح الجامع (5/79)

(2) صحیح البخاری (2/52) صحیح مسلم (3/135) صحیح الجامع (3/311)

ہے۔ ویسے تو نمازِ عشا وقت کے لحاظ سے اس سے بھی ٹھنڈی ہوتی ہے، مگر اُسے کسی نے اس حدیث میں داخل نہیں کیا، کیونکہ وہ رات کی نماز شمار ہوتی ہے، جب کہ ٹھنڈی نمازوں کو دن کی نمازیں کہا گیا ہے، جیسا کہ امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عصر و فجر کو ٹھنڈی نمازیں اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ دونوں دن کے ٹھنڈے اوقات میں ادا کی جاتی ہیں، جو اس کے اطراف یعنی آغاز و اختتام ہیں۔ جب طلوع آفتاب سے پہلے پڑھی جانے والی نماز کو آغاز شمار کر لیا گیا ہے تو مغرب کو اختتام دن کی نماز شمار کیا جاسکتا ہے۔ ابو عبید رحمۃ اللہ علیہ نے غالباً اسی وجہ سے نمازِ مغرب کو اس حدیث میں داخل قرار دیا ہے۔^①

جب کہ بعض دیگر احادیث سے بھی نمازِ مغرب کی فضیلت اخذ کی جاسکتی ہے، جو اگرچہ نمازِ مغرب کے ساتھ تو خاص نہیں، بلکہ نمازِ پنج گانہ سے متعلق ہیں، لیکن چونکہ یہ بھی نمازِ پنج گانہ میں سے ایک ہے، لہذا یہ بھی اس فضیلت کی حامل ہے جو احادیث میں وارد ہے، جیسا کہ ان احادیث میں سے بعض ہم آگے ذکر کرنے والے ہیں۔



① فتح الباری (۲/۵۳)

مصادر ومراجع

نمبر شمار	اسم الكتاب	طبع
۱	قرآن الکریم	
۲	ابن جریر طبری - تحقیق احمد شاکر - محمد شاکر	دار المعرفة القاهرة
۳	ابن کثیر (عربی)	بیروت
۴	ابن کثیر (اردو)	لاهور
۵	سنن أبي داود	مکتبه ریاض الحدیثہ
۶	سنن أبو داود مع عون المعبود	طبع مدنی
۷	الإجماع لابن المنذر. تحقیق ڈاکٹر ابو حماد صغیر احمد	ریاض
۸	أحكام الجنائز للالباني	بیروت
۹	أحكام القرآن جصاص	طبع بیروت
۱۰	إحياء علوم الدين للغزالي	دمشق
۱۱	آداب الزفاف - الألباني	المکتبہ الإسلامی
۱۲	الأدب المفرد - للبخاري	اوقاف الامارات
۱۳	الأذکار - للنووي	دمشق
۱۴	إرواء الغلیل - للالباني	المکتبہ الإسلامی
۱۵	أضواء البيان - للشنقيطي	القاهره (مصر)
۱۶	الاعتصام للشاطبي - تحقیق و تعریف: علامہ محمد رشید رضا	مصر
۱۷	الإعلام بنقد كتاب الحلال والحرام. ڈاکٹر الفوزان	الریاض
۱۸	أعلام أهل العصر	طبع الهند

- ۱۹ أعلام الموقعين - لابن قيم دار الفكر - بيروت
- ۲۰ إقتضاء الصراط المستقيم - تحقيق دكتور ناصر العقل مطبوع على نفقه امير سلطان بن عبد العزيز آل سعود
- ۲۱ الاقناع مع كشاف الفناع مطبوعه حكوميه مكه
- ۲۲ الأوسط - لامام ابن المنذر، تحقيق دكتور صغير احمد المكرمة - بأمر شاه فيصل
- ۲۳ بخاري مع الفتح الباري مكتبه دار الطيبة - رياض طبع دار الإفتاء- رياض- سعوديه وطبع مكتبه سلفيه مدينه منوره
- ۲۴ بدائع الصنائع - علامه كاساني دار الكتاب العربي
- ۲۵ بدائع الفوائد - ابن قيم دار الكتاب العربي
- ۲۶ بداية المجتهد - لابن رشد مؤسسه ناصر
- ۲۷ بذل المجهود شرح سنن أبي داود طبع ثالث- بيروت
- ۲۸ بلوغ المرام مع سبل السلام - لابن حجر دار إحياء التراث العربي
- ۲۹ بلوغ الأمانى - شرح مسند احمد طبع دار الشهاب - قاهره
- ۳۰ بهشتى زيور (مكمل ومدلل) اشرف على تهانوى تاج كمپنى - لاهور
- ۳۱ تحفة الأحوذى شرح سنن الترمذى - مولانا عبد الرحمان طبع قديم وطبع مدنى مباركپورى
- ۳۲ ترجمة وحاشية قرآن - شاه رفع الدين تاج كمپنى - لاهور
- ۳۳ ترجمه حاشية (قرآن) مولانا مودودى إدارة ترجمان القرآن - لاهور
- ۳۴ ترجمة وحاشية - شيخ الهند مولانا محمود الحسن جرمنى
- علامه شبير احمد عثمانى
- ۳۵ ترمذى شريف مع تحفة الأحوذى طبع مدنى

- ۳۶ الترغیب والترہیب للمنذری تحقیق محی الدین عبد المجید طبع مصر
- ۳۷ تطہیر المجتمعات (عربی) طبع قطر
- ۳۸ تفسیر الکشاف للزمخشری دار المعرفة - بیروت
- ۳۹ تفسیر مجاہد - مولانا عبد الرحمن سورتی طبع قطر
- ۴۰ تفہیم القرآن - مولانا مودودی ادارہ ترجمان القرآن - لاہور
- ۴۱ تقریب التہذیب - لابن حجر نشر السنۃ - لاہور
- ۴۲ تلخیص الحبیر - لابن حجر جامعہ سلفیہ - فیصل آباد
- ۴۳ تمام المنہ - للالبانی دار الراية - ریاض
- ۴۴ التمهید - لابن عبد البر طبع مرائش
- ۴۵ تہذیب معالم السنن لابن قیم علی عون المعبود طبع مدنی وطبع دار المعرفة - بیروت
- ۴۶ جامع الأصول لابن أثیر طبع دار الافناء وطبع اول قاہرہ
- ۴۷ جدید فقہی مسائل . مولانا محمد خالد سیف اللہ مجلس تحقیقات اسلامی حیدر آباد (انڈیا)
- ۴۸ جلالین (تفسیر) طبع دار المعرفة - بیروت
- ۴۹ حاشیہ دهلوی علی بلوغ المرام المکتب الاسلامی
- ۵۰ الحاوی للفتاویٰ - السیوطی طبع بیروت
- ۵۱ حجة اللہ البالغۃ (مترجم اردو) - مولانا عبد الحق طبع کراچی
- حقّانی .
- ۵۲ حجة النب ﷺ . للالبانی المکتب الإسلامی
- ۵۳ الحلال والحرام فی الإسلام - یوسف قرضاوی المکتب الإسلامی
- ۵۴ الحلال والحرام (اردو وترجمہ) مولانا شمس پرزادہ الدار السلفیة - بمبئی

- ۵۵ دار قطنی مع التعليق المغني - عظیم آبادی
نشر السنة - ملتان
- ۵۶ رحمة للعالمين - قاضي سيد محمد سليمان منصور پوری
شيخ غلام على - لاهور
- ۵۷ راه سنّت - أبو عبد السلام مفتي مولانا محمد صديق
سرگودھا
- ۵۸ روح المعاني
طبع بيروت
- ۵۹ الروضة الندية - نواب صديق حسن خان.
دار إحياء التراث العربي
- ۶۰ روضة المحييين - لابن قيم.
دار المعرفة - بيروت
- ۶۱ رياض الصالحين - تحقيق الأرنؤوط.
دار الكتب العلمية
- ۶۲ زاد المسير - لابن قيم
المكتب الإسلامي
- ۶۳ زاد المعاد لابن قيم - تحقيق الأرنؤوط
مؤسسة الرسالة - مكتبة
المنار الإسلامية
- ۶۴ زاد المعاد - بلا تحقيق
طبع قديم
- ۶۵ الزواجر - للهيمشي
طبع بيروت
- ۶۶ سبل السلام شرح بلوغ المرام - للصنعاني
طبع بيروت وطبع مصر
- ۶۷ سلسلة الأحاديث الصحيحة - الألباني
المكتب الإسلامي
- ۶۸ سلسلة الأحاديث الضعيفة - الألباني
المكتب الإسلامي
- ۶۹ سنن ابن ماجه - تحقيق محمد فؤاد عبد الباقي
دار إحياء التراث العربي
- ۷۰ السنن المبتدعات - محمد بن عبد السلام
دار الكتب العلمية
- ۷۱ سونے حرم - محمد منیر قمر
طبع مکتبه کتاب وسنت
ريحان چيمه (سيالكوت)
- ۷۲ شرح السنة - للبعوي
المكتب الإسلامي
- ۷۳ الشرح الصغير - للدردير
طبع على نفقة شيخ راشد -
حاكم دہلی
- ۷۴ شرح صحيح مسلم مع النووي.
دار المعرفة و دار إحياء التراث

- ٤٥ شرح نخبة الفكر. طبع قديم
- ٤٦ شفاء الغلل في شرح كتاب العلل - علامة مبارکپوری مع طبع مدنی التحفة.
- ٤٧ صحيح ابن حبان (الموارد) دار الكتب العلمية
- ٤٨ صحيح ابن خزيمة - تحقيق الأعظمي طبع رياض
- ٤٩ صحيح الجامع الصغير - للألباني المكتب الإسلامي
- ٨٠ صحيح سنن ابن ماجه - للألباني مكتب التربية والتعليم لدول الخليج - الرياض
- ٨١ صحيح سنن أبي داؤد - للألباني مكتب التربية و تعلم لدول الخليج- الرياض
- ٨٢ صحيح سنن الترمذي - للألباني مكتب التربية و تعلم لدول الخليج- الرياض
- ٨٣ صحيح سنن النسائي - للألباني مكتب التربية و تعلم لدول الخليج - الرياض
- ٨٤ صحيح مسلم مع تحقيق و تعليق محمد فواد عبد الباقي دار إحياء التراث العربي
- ٨٥ صلاة الرسول ﷺ (مولانا حكيم محمد صادق سيالكوٹی) مكتبه أشرفية- سند هو تحقيق و تخريج. عبد الرؤف، عبد الحنان) بلوکی
- ٨٦ ضعيف الجامع الصغير - للألباني المكتب الإسلامي
- ٨٧ علل في آخر الترمذي مع التحفة طبع مدنی
- ٨٨ عمدة القارئ شرح صحيح البخاري دار الفكر بيروت
- ٨٩ عمل اليوم و الليلة- للنسائي- تحقيق ڈاکٹر فاروق أحمد مراکش حماده
- ٩٠ عون المعبود شرح أبي داود. طبع قديم و طبع مدنی

- ۹۱ غایة المرام في تخريج أحاديث الحلال والحرام الألباني المكتب الإسلامي
- ۹۲ غنية الطالبین (اردو) مولانا راغب رحمانی نفیس اکیڈمی کراچی
- ۹۳ فتاویٰ ثنائیہ ادارة ترجمان السنۃ لاہور
- ۹۴ فتاویٰ عالمگیری ادراہ نشریات اسلام لاہور
- ۹۵ فتاویٰ علمائے حدیث - مولانا محمد سعیدی مکتبہ سعیدیہ خانیوال
- ۹۶ الفتاویٰ الہندیہ (عالمگیری - عربی) طبع مصر
- ۹۷ فتح الباری شرح صحیح البخاری - لابن حجر دار الافتاء - ریاض
- ۹۸ فتح الربانی دار الشہاب - قاہرہ
- ۹۹ فتح القدر - للشوکانی دار الفکر - بیروت
- ۱۰۰ الفقہ الاسلامی - للزحیلی دار الفکر
- ۱۰۱ فقہ السنۃ - سید سابق دار الکتب العربی
- ۱۰۲ فقہ السنۃ (اردو) محمد عاصم حداد مکتبہ چراغ راہ کراچی
- ۱۰۳ الفقہ علی المذہب الأربعة - للجزیری دار إحياء التراث العربی
- ۱۰۴ فوائد سلفیۃ - اشرف الحواشی (حاشیۃ قرآن) مولانا لاہور
- محمد عبدہ الفلاح
- ۱۰۵ الفوائد المجموعۃ - الشوکانی المكتب الإسلامي
- ۱۰۶ فی ظلال القرآن - سید قطب شہید دار الشروق - بیروت
- ۱۰۷ قاموس المحيط - فیروز آبادی مؤسسہ الرسالۃ - بیروت
- ۱۰۸ قبولیت عمل کی شرائط - محمد منیر قمر طبع مکتبہ کتاب وسنت ریحان
- چیمہ (سیالکوٹ)
- ۱۰۹ قدوری مع اللباب الکتب الاسلامی
- ۱۱۰ قرارات المجمع الفقہ الاسلامی رابطہ عالم اسلامی
- ۱۱۱ قرطبی (تفسیر) الجامع لأحكام القرآن طبع مصر

- ۱۱۲ القواعد النورانية - لابن تيميه
مكتبة المعارف - الرياض
وطبع قديم
- ۱۱۳ الكافي لابن عبد البر
مكتبة الرياض الحديثة
- ۱۱۴ كتاب الصلوة لابن قيم
اداره ترجمان السنة لاهور
- ۱۱۵ كنز الايمان
چاند كمپنى لاهور
- ۱۱۶ اللباب شرح قدوري
الكتاب الإسلامى
- ۱۱۶ مجمع الزوائد للهيثمى
مؤسسة المعارف
- ۱۱۷ المجموع للنووي شرح المذهب
مطبعة الامام - مصر
- ۱۱۸ مجموعة رسائل في الصلوة
طبع دار الافتاء
- ۱۱۹ مجموع فتاوى لابن تيميه
سعوديه
- ۱۲۰ المحلى لابن حزم - تحقيق دكتور عبد الغفار سليمان
دار الكتاب - بيروت
- ۱۲۱ مختار الصحاح - للرازي
دار الكتاب العربي
- ۱۲۲ مختصر ابن كثير - للرفاعي
طبع اولى - بيروت
- ۱۲۳ مختصر بخاري - للألباني
المكتب الإسلامى
- ۱۲۴ مختصر الترغيب - لابن حجر
طبع مالى گاؤن - انڈيا
- ۱۲۵ مختصر الترغيب للشيخ مبارك تميمي - تحقيق دكتور
طبع على نفقه شيخ راشد -
محمد حسن خلوف
حاكم دبئى
- ۱۲۶ مختصر سنن أبي داؤد مع معالم السنن للخطابي و
تهذيب لابن قيم
دار المعرفة - بيروت
- ۱۲۷ مختصر صحيح مسلم للمندري - تحقيق الألباني
المكتب الإسلامى
- ۱۲۸ مختصر طبرى (على المصحف)
دار الشروق
- ۱۲۹ مراسيل أبي داؤد - تحقيق مولانا محمد عبده الفلاح
معهد الشريعة والصناعة
كوٹ ادو

- ۱۳۰ المرعاة شرح مشکوٰۃ - علامہ عبید اللہ رحمانی سانگلہ ہل
- ۱۳۱ مسلم شریف مع شرحہ النووی دار إحياء التراث العربي
- ۱۳۲ مسند أحمد مرتب (الفتح الرباني) دار الشهاب - قاهرہ
- ۱۳۳ مشکوٰۃ شریف - تحقيق الألباني المكتب الإسلامي
- ۱۳۴ مصنف ابن أبي شيبة الدار السلفية - بمبئی
- ۱۳۵ معارف الحديث - مولانا نعماني طبع لكهنؤ
- ۱۳۶ معارف القرآن - مفتي محمد شفيع ادارة المعارف - كراچی
- ۱۳۷ معاشرہ کی مہلک بیماریاں - نصیر احمد ملّی - (اردو ترجمہ تطہیر المجتمعات) الدار السلفية - بمبئی
- ۱۳۸ معالم السنن للخطابي دار المعرفة - بيروت
- ۱۳۹ المعجم المفهرس لألفاظ القرآن - محمد فواد عبد الباقي طبع بيروت
- ۱۴۰ المعجم المفهرس لألفاظ الحديث مستشرقين ليڈن
- ۱۴۱ المعجم الوسيط طبع بيروت
- ۱۴۲ المغني لابن قدامة - تحقيق ڈاکٹر ترکی جامعة الإمام - الرياض
- ۱۴۳ المغني لابن قدامة - تحقيق محمد خليل هراس طبع مصر
- ۱۴۴ المناسك - الألباني المكتب الإسلامي
- ۱۴۵ المنتقى - لابن تيمية (أبو البركات) مع نيل الأوطار طبع مصر و بيروت
- ۱۴۶ مؤطا امام مالك مع تنوير الحوالك للسيوطي دار الكتب العلمية
- ۱۴۷ سنن النسائي مع تعليقات السلفية. المكتبة السلفية - لاهور
- ۱۴۸ نصب الراية - للزيلعي المجلس العلمي
- ۱۴۹ نيل الأوطار - للشوكاني مصر و بيروت

جرائد و مجلات

مقام اشاعت	جرائد و مجلات	نمبر شمار
بنارس - انڈیا		۱ ماہنامہ محدث
لاہور - پاکستان		۲ ماہنامہ محدث
وزارت امور اسلامیہ اوقاف - الامارت العربیہ المتحدہ		۳ ماہنامہ منار الاسلام (عربی)
لاہور - پاکستان		۴ ہفت روزہ الاعتصام
لاہور - پاکستان		۵ ہفت روزہ الہدیث
ابوظہبی		۶ روزنامہ الاتحاد (عربی)
لاہور - پاکستان		۷ روزنامہ جنگ
کراچی - پاکستان		۸ روزنامہ نوائے وقت